

شرعیات

و

طریقیت

مولانا عبدالرحمن کیلانی

مکتبہ المدینہ - مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیاء



معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مَجْلِسُ التَّحْقِيقِ الْإِسْلَامِيِّ کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

🌐 www.KitaboSunnat.com

مِلّتِ عشق از ہمہ مِلّت جداست
عاشقِ اَلِہِند مِلّتِ خداست

شرعیّت و طریقت

مولانا عبدالرحمن کیدانی رحمۃ اللہ علیہ

مکمل سیرتِ سلیم - سٹریٹ ۲۰ سن پتھر لاہور

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: شریعت و طریقت
مصنف: مولانا عبدالرحمان کیلانی
طبع ہفتم: جنوری 2006
تعداد: 1100
زیر سرپرستی: ڈاکٹر حبیب الرحمن کیلانی
زیر اہتمام: پروفیسر نجیب الرحمن کیلانی فون: 7844157
ناشر: ڈاکٹر حافظ شفیق الرحمن کیلانی - انجینئر حافظ شفیق الرحمن کیلانی
مطبع: انٹرنیشنل دارالسلام پرنٹنگ پریس لاہور فون: 7232400
قیمت: 200 روپے

ناشر: مکتبۃ السلام شریعت نمبر: 20، وکن پورہ لاہور
فون: 7844157-7280943

دوسری بید

دارالسلام

کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
ریاض • جدہ • شاہجہ • لاہور
لندن • ہیوسٹن • نیو یارک



ہیڈ آفس و مرکزی شوروم 36 - لوزال، سیکرٹریٹ شاہ، لاہور

فون: 711 1023, 711 0081, 723 2400, 724 0024 فیکس: 735 4072

E-mail: darussalampk@hotmail.com Website: www.dar-us-salam.com

شوروم اُردو بازار اُردو بازار 'غزنی شریٹ' اُردو بازار لاہور فون: 712 0054 فیکس: 732 0703

پیش لفظ

زیر نظر کتاب شریعت و طریقت کے ابتدائی مضامین، جو وحدت الوجود، وحدت الشہود اور حلول سے متعلق تھے جب ترجمان الحدیث ۱۹۹۱ء کی مختلف اشاعتوں میں شائع ہوئے تو اسی وقت سے یہ تقاضے شروع ہو گئے تھے کہ ان مضامین کو چھاپ کر جلد از جلد منظر عام پر لائے۔ چنانچہ اس کتاب کا مسودہ مکمل کرنے کے بعد اس کی بڑھ چڑھ کر کتابت بھی کروائی گئی۔ پھر جب یہ کتاب شدہ کا پیاں چند مقتدر علمائے کرام کے پاس برائے تبصرہ و تنقید بھیجی گئیں تو اس کے مندرجات کو تو بہت سراہا گیا مگر ساتھ ہی اس بات پر زور دیا گیا کہ اس کتاب کی کتابت اس کتاب کے شایان شان نہیں ہے۔ لہذا یہ کتاب کسی بہترین کتاب سے لکھو اگر آرٹ پیپر پر شائع کی جانی چاہیے۔

ایک دہائی سے یہ بھی تھی کہ سردست اسے جوں کا توں شائع کر دیا جائے۔ اور ایسا اہتمام دوسرے ایڈیشن کے وقت کر لیا جائے۔ پورے دو سال اس کشمکش میں گزر گئے کا پیاں جوں کی توں پڑی رہیں۔ بالآخر یہی طے پایا کہ از سر نو کتابت کروائی جائے جس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ کتاب میں چند مفید اضافے کرنے کا موقع مل گیا تاہم ایک طویل عرصہ مسودہ پر نظر ثانی اور اس کی کتابت میں لگ گیا۔ دیرِ اثناء احباب کی طرف سے اشاعت کے لیے تقاضے بھی ہوتے رہے، زیادہ خطوط اس قسم کے آئے کہ اگر کتاب چھپ چکی ہے تو فوراً بھیج دی جائے۔ مگر میرے پاس سوائے خاموشی کے اس کا کچھ جواب نہ تھا۔ اور آج سات سال بعد بفضلہ تعالیٰ اس کتاب کی اشاعت کے سبب مراحل طے ہوتے نظر آ رہے ہیں، فالحمد للہ علی ذلک۔

اس کتاب میں مشہور و معروف مشائخ عظام اور بزرگان دین کا ذکر اکثر و بیشتر مقامات پر آیا ہے۔ اور ان کے اقوال و افعال پر جو کتاب و سنت کے خلاف تھے، تنقید بھی کی گئی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم بزرگان کرام اور ان کی کرامات کے سرے سے قائل ہی نہیں، بلکہ ہماری مخالفت تو صرف وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں سے کتاب و سنت سے ٹکراؤ شروع ہوتا ہے اور یہ دونوں مقامات ہیں نظری می اور عملی بھی۔ اور یہ اعتراضات صرف ہمیں ہی نہیں۔ دین طریقت کے بعض عقیدت مندوں نے بھی ان کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ نظریاتی اختلاف تو اتحاد ثلاثہ (وحدت الوجود، شہود اور حلول) سے تعلق رکھتا ہے جس کے متعلق مشہور تصوف عبد الکریم جلی (م ۸۱۱ھ) مصنف انسان کامل کے مترجم مولانا فضل میرا یوں لفظ لکھتے ہیں کہ "اکثر صوفیہ کرام کے حقائق و معارف مسئلہ وحدت الوجود کے حعلق ہوتے ہیں اور اس مسئلہ نے خلق کثیر کو گمراہ کر رکھا ہے صوفیہ کے اس قسم کے علوم سے اکثر اہل نفس و ہوا لیر ہو کر شرعی قیود سے نکل گئے ہیں۔ اول وہ شخص جس نے دلائل عقلیہ اور براہین نقلیہ سے اس مسئلہ کے متعلق گھٹگو کی ہے۔ وہ محمد الدین ابن عربی ہیں جنہوں نے علاوہ مکشوفات کے عقلی تعریف کو بھی اس میں دخل دیا ہے مصنف انسان کامل کے علوم اسی قبیل سے ہیں... علمائے ظاہر جب دیکھتے ہیں کہ ایسے علوم جن میں مابعد و معبود

کی ایک ہی حقیقت ہے تکلیفِ شرعی کو بالکل ساقط کر دیتے ہیں اور جو آیات و احادیث بطور شواہد کے متعلق وجودِ الہی کی تائید میں پیش کی جاتی ہیں ان میں سے اکثر ایسی ہوتی ہیں جو خالی از تکلفات نہیں ہوتیں تو اکثر علمائے کرام صوفیہ سے یہ اعتقاد ہو جاتے ہیں..... ان صوفیہ کے علوم کے موافق ماخذ اور سرچشمے علومِ نبوت کے موافق اور سرچشمے سے جدا گانہ ہیں۔ شرعی علوم بھی بطریق اعتبار و اشارہ ان کی تائید کرتے ہیں نہ کہ بطریق تفسیر و فحوائض کلام اور یہ شرعی علوم کی ایک اعجازی خاصیت ہے۔ دور نہ تشریعت کی راہ اور سچے اور ان صوفیوں کی راہ اور جو مساکین وحدت الوجود، بقا و فنا، لطائف کا نہ خطر کی تہذیب و ترقیب میں اپنی تصنیفات چھوڑ گئے ہیں۔ (مقدمہ از مترجم انسان کامل ص ۱۰۰۹)

اور علیٰ لحاظ سے اختلاف یہ ہے کہ ان بزرگوں کے عقیدت مندوں نے ان کی طرف بے سرو پا باتیں اور مہیب قسم کی کراتیں منسوب کر کے ان کی ذات کو مشکوک اور ان کے کردار کو مجروح کر دیا ہے۔ جتنی کہ دینِ طریقت کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لیے معنومات تک سے ہی مدیغ نہیں کیا گیا۔ اس قسم کے من گھڑت قصوں اور خود تراشیدہ کرامات سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے جناب پروفیسر حبیب اللہ صاحب تاریخ مشائخِ چشت کے تعارف میں یوں رقمطراز ہیں کہ ۱۔

لیکن اس کتاب (خزینۃ الاصفیاء مصنف غلام سرور قادری لاہوری) کا بڑا نقص یہ تھا کہ مصنف نے عقائد کا سہارا لے کر ان تمام اصول و اسناد کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ جو علمائے اسلام کی نظر میں علم و حکمت کی روح سمجھے جاتے رہے ہیں۔ تنقیدی اصولوں سے چشم پوشی کر کے محض عقائد پر علم کی عمارت تعمیر کرنا نا سہمی نہیں تو کیا ہے؟ اس قسم کی تحریریں متضاد افکار کا مجموعہ بن کے رہ جاتی ہیں اور بالآخر ان کا نتیجہ بدعتیہ کی صورت میں نمودار ہوتا ہے صاحب خزینۃ الاصفیاء نے اپنی کتاب میں ہیبت ناک قسم کی کرامات کی تفصیل دی ہے جن کو پڑھ کر انسانی عقل و خرد کو شرم آ جاتی ہے۔ تاریخ مشائخِ چشت زیر عنوان تعارف از پروفیسر حبیب اللہ صاحب

پھر ان ہیبت ناک قسم کی کرامات ذکر کرنے میں مفتی غلام سرور صاحب منفرد نہیں، اکثر تذکرہ نگاروں کا یہی حال ہے۔ اور یہی وہ صورت حال ہے جس نے مجھے اس کتاب کی تصنیف پر آمادہ کیا۔ گویا جو کام ان بزرگوں کے ہی خواہو گئے ان کی عظمت کو اجاگر کرنے کے لیے کیا تھا۔ اسی کام سے ان بزرگوں سے بدعتیہ کی صورت پیدا ہونے لگی۔ اگرچہ میں نے پوری کوشش کی ہے کہ مشائخِ حق کے ادب و احترام کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے تاہم اگر کہیں لغزش ہو گئی ہو۔ تو اسے بشری تقاضا پر محمول کیا جائے۔

اللھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہم ارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔ آمین

عبد الرحمن کیسلافی دارالسلام۔ بن پورہ۔ لاہور
اکتوبر ۱۹۸۸ء

ہر اے ہر پانی یہ کتاب خریدے اور دوستوں کو ہدیہ کیجیے۔

فہرست

صفحہ	عنوانات	صفحہ	عنوانات
۴۱	عوام میں ربانیت کی مقبولیت کے اسباب	۳	پیش لفظ
"	۱۔ غیب کے حالات سے دلچسپی	۵	فہرست مضامین
۴۲	غیب معلوم کرنے کے ذرائع		
۴۳	۲۔ خوارقِ عادت امور	۱۷	بائبل۔ دینِ طریقت یا ربانیت (ایک فاقی مذاہب)
۴۴	۳۔ تعارف کا عقیدہ	۱۸	خدا کا پیغام ہدایت
۴۵	۴۔ سستیِ نہات کا عقیدہ	۱۹	ایمان بالغیب
"	۵۔ مریدان باصفا کا کردار	۲۰	ربانیت کی ابتداء
۴۶	۶۔ مرنے کے بعد بھی تعارف کا عقیدہ	۲۱	ذنیوی تعلقات سے بیزاری
۴۷	۷۔ نبیوں کی کرامات اور تعارف	۲۵	ربانیت کا طریق کار
۵۰	۸۔ درویشوں سے عقیدت	۲۶	رجال الغیب سے استفادہ کرنے والے گروہ
"	۸۔ تذکرے اور ملفوظات کا وجود	۲۸	کیا دیدارِ الہی ممکن ہے؟
۵۱	۱۔ روحانی افکار	۳۰	دیدارِ الہی یا شیطانِ فریب
"	۲۔ تذکرے اور تاریخی لغزشیں	۳۱	کشف و مشاہدہ کی حقیقت
"	۱۔ حضرت علی جویریؒ	۳۲	دینِ طریقت کے مختلف نظریات
۵۲	۲۔ حسین بن منصور حلاج	۳۳	پیروکاروں میں تکرار و اختلاف
۵۳	۳۔ پیرانِ پیر	"	دینِ طریقت کے نقصانات اور معاشرہ پر اثرات
۵۴	۳۔ زندگی کا دوسرا پہلو	۳۵	اسلام اور ربانیت
۵۵	۴۔ روایتِ کرامات میں اختلاف	۳۷	ربانیت میں کشش کی وجوہات
۵۸	اولیں قرنی کا بیۃ	۳۸	۱۔ آئینہ باطن کی صفائی
۶۹	۵۔ مبالغہ آرائی کی حد	۳۹	۲۔ کشف و کرامات
۶۱	۶۔ الحاقی مضامین	"	۳۔ مشاہدہ حق
۶۳	بائبل۔ دینِ طریقت کے نظریات و عقائد	"	۴۔ معاشرتی ردِ دایاں اور شرعی تکالیف سے نہات
"	۱۔ وحدت الوجود	۴۰	۵۔ شعبہ بازیاں

صفحہ	عنوانات	صفحہ	عنوانات
۸۶	فصوص سے توحش	۶۴	۲۔ وحدت الشہود
۸۸	غنیف الدین تلمسانی	"	۳۔ حلول
۸۹	ابن عربی کے پیشرو	"	۱۔ حلول کا نظریہ
۹۱	امام غزالی کی توحید	۶۶	اسلام میں بنیہ حلول کی ابتداء
۹۲	نظریہ وحدت الوجود کی تاریخ	۶۸	حسین بن منصور علاج
۹۳	فلسفہ وحدت الوجود	۷۰	عبد الکرم جبلی اور عقیدہ حلول
۹۴	تصوف اور وحدت الوجود	۷۱	علاج کا مقام اولیائے کرام کی نظر میں
۹۵	اشرف علی تھانویؒ اور ابن عربی کی تفسیر	"	حضرت علی ہجویریؒ
۹۶	وحدت الوجود پر شرعی دلائل	۷۲	مولانا دومؒ
"	قرآنی دلائل	"	شیخ عبدالقادر جیلانیؒ
۹۷	حدیث سے دلائل	"	خواجہ نظام الدین اولیاء دہلویؒ
۱۰۰	۳۔ وحدت الشہود	۷۴	امام اہل سنت رضا خاں بریلویؒ
"	وجود و شہود کا فرق	۷۵	شکر اور صحو کا امتیاز
۱۰۱	وحدت الشہود کی تاریخ	"	شکر اور صحو کی آڑ میں انبیاء پر اتہام
۱۰۴	وجود و شہود کی ایک دوسرے سے انظار سے تحقیق	۷۷	منصور علاج کی تدریجی ترقی
۱۰۷	شاہ ولی اللہ اور وجود و شہود	۷۸	سید سلیمان ندوی اور علاج
۱۰۸	دین طریقت کے عقائد پر تحقیقی نظر	۸۰	حلول مطلق اور حلول مبین
۱۰۹	روح کی حقیقت	۸۱	نئے نئے خدا
۱۱۰	مہدومت اور نظریہ روح	۸۲	۲۔ نظریہ وحدت الوجود
۱۱۱	دین طریقت کا اسلامی نظریات پر اثر	۸۳	اسلام میں وحدت الوجود کی درآمد
۱۱۵	بابت۔ صوفیاء کے نظریات و عقائد	"	ابن عربی کی توحید اور فتوحات مکیہ
"	زہاد اور صلحاء	۸۵	فصوص الحکم کی تعلیمات
"	غیر اسلامی نظریات کی درآمد	"	دوزخ کی حقیقت
۱۱۷	۱۔ ولایت نبوت سے افضل ہے۔	۸۶	ابن عربی اور کعبۃ اللہ
"	ولایت کا مقام اور ابن عربی	۸۷	ابن عربی اور علمائے حق
۱۱۸	خاتم الاولیاء کی خاتم الانبیاء پر فضیلت	"	ابن عربی اور اشرف علی تھانویؒ

صفحہ	عنوانات	صفحہ	عنوانات
۱۴۲	حصولِ علم کا ذریعہ صرف تعلیم و تعلم ہے	۱۱۸	اگتسابی نبوت اور مرزائے قادیان
۱۴۳	کشفی علوم اور لطائف	۱۲۰	شطیبات بائزید بسطامی
"	باطنی علوم کی کتب اور ان کے مصنفین	"	ولایت کی برتری کا قرآن سے ثبوت
۱۴۴	باطنی علوم کیوں افضل ہیں؟	۱۲۱	قصہ موسیٰ و خضرؑ
"	علم حدیث محمدؐ کا علم ہے	"	مراتب ولایت
۱۴۶	احادیث کو پرکھنے کا معیار	۱۲۳	حضرت خضر کون اور کیا تھے؟
"	برزخی احادیث اور عقیدہ حیات النبیؐ	"	حضرت خضرؑ کی شخصیت
۱۴۸	۵۔ شریعت پر طریقت کی بالادستی	۱۲۵	اولیاء اللہ کی برتری کا دوسرا ثبوت
"	۱۔ شریعت کو جو کر کے طریقت حاصل کرنا	۱۲۶	۲۔ عابد کی عالم پر فضیلت
"	خواجہ نظام الدینؒ اولیاء کا ارشاد	۱۲۷	صوفی کون ہیں؟
۱۴۹	شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور سابقہ علم	۱۲۸	کیا تصوف بدعت ہے؟
۱۵۰	سہمی سہمی کاراہ عام اور خاص	۱۲۹	حدیث تفسیر فقہ وغیرہ بدعت نہیں؟
۱۵۱	برہ علی فارمدی اور امام ششیری	۱۳۱	کیا تصوف دین کا اہم شعبہ ہے؟
۱۵۲	۲۔ شیخ کی غیر مشروط اطاعت	۱۳۳	صحابہ کرامؓ صوفی کیوں نہ کہلائے؟
"	تصوف، سلوک اور اطاعت شیخ	۱۳۴	عالم پر عابد کی فضیلت کی کشفی دلیل
۱۵۳	صادق فرغانی کی زائد شرط	۱۳۵	عابد پر عالم کی فضیلت کے دلائل
"	اللہ کے نئے نئے رسول	۱۳۶	۳۔ عابد کی مجاہد پر فضیلت
۱۵۵	۳۔ غیر شرعی احکام کی تلقین	"	۴۔ باطنی علوم کی شرعی علوم پر فضیلت
۱۵۶	بائزید بسطامی کا طریق تربیت	"	باطنی علوم کے حصول کے ذرائع
"	قرآن و سنت سے دور کرنا	"	۱۔ بذریعہ توبہ
۱۵۹	۶۔ صوفیاء کا باطنی سیاسی نظام	۱۳۷	۲۔ بذریعہ فیضِ عام
"	باطنی نظام کے قیام کی ضرورت	۱۳۸	۳۔ بذریعہ کشف، مشاہدہ یا لدنی علم
"	صدر مقرر اور عہدہ داروں کے مساکن	"	کشفی علوم کی اجتہاد پر فضیلت
۱۶۰	طبقات رجال الغیب	۱۴۰	۴۔ بذریعہ عشق
۱۶۰	منہ صلب اولیاء اللہ کی شرعی بنیادیں	۱۴۰	۵۔ بذریعہ حضرت خضرؑ
۱۶۱	احادیث منطقہ قطبؑ بیدال وغیرہ	۱۴۱	۶۔ بذریعہ باطنی معانی

صفحہ	عنوانات	صفحہ	عنوانات
۱۸۹	اولیاء اللہ والیان اسرار ہوتے ہیں	۱۶۵	اولیاء اللہ کے اعلیٰ مناصب
۱۹۰	ولی کے مفہوم میں تبدیلی کب ہوئی؟	"	منصب داروں کے مساکن اور فیوض
۱۹۱	ذاتی اور عطائی کا فلسفہ	۱۶۶	قیوم یا انسان کامل
"	خداؤں کی تعداد	"	فرد اور قطب وحدت
۱۹۲	ولایت، علمبر اور خاصہ کا عقیدہ	۱۶۸	غوث قطب ابدال کا نبوت پیران پیر کی زبان سے
۱۹۳	اولیاء اللہ کی گستاخی کا انجام	۱۶۹	مناصب کا عزل و نصب
"	۱۔ امام جعفر صادق کی بے ادبی کا انجام	۱۷۰	قاسم ولایت کون؟
۱۹۴	۲۔ امام موسیٰ رضا اور قالین کے شیر	۱۷۱	پیران پیر کا ایک چور کو ابدال بنا دینا۔
۱۹۵	۳۔ جنید بغدادی اور جلوہ گری	۱۷۳	پیران پیر کا ایک کافر کو ابدال بنا دینا
"	۴۔ عبدالواحد کی گستاخی کا انجام	۱۷۴	معین الدین چشتی کو ہندوستان کس نے بھیجا؟
۱۹۶	۵۔ انتقام سے بچنے	۱۷۵	ضرب شدید کے ذریعہ ولایت
۱۹۷	۶۔ جانوروں سے بھی انتقام	۱۷۶	احکام ولایت کو چاک کر ڈالنا
"	۷۔ مردہ ولی کے انتقام سے بھی بچنے	۱۷۷	دور نبویؐ کا باطنی نظام
۱۹۸	۲۔ عشق و مستی	۱۷۸	باطنی نظام کا ثبوت قرآن سے
۱۹۹	عشق اور معرفت الہی	۱۷۹	اولیاء اللہ کی بے بسی
۲۰۰	عشق مجازی اور حقیقی کی تقسیم	۱۸۰	بابا نور محمد تیراہی کی ہجرت
"	عشق مجازی اور آمر و پرستی	۱۸۰	اہل باطن پر علمائے حق کی گرفت
"	اللہ تعالیٰ پر الزام	"	حکومتوں سے سزا دلوانا
۲۰۱	عشق مجازی کے فضائل	۱۸۱	امام مستم اور صالحین
۲۰۲	عاشق الہی کا جنازہ	۱۸۲	صالحین سے حدیث قبول کرنے میں تاخیر
۲۰۳	الْعَشْق نَارُ کی عملی تعبیر	"	صوفیہ کا شجرہ طریقت
۲۰۴	شیخ حسین لاہوری کا عشق	۱۸۴	صوفیاء پر متدین کی گرفت کے اثرات
۲۰۵	ذکر مشوق شیخ فاضل لاہوری	۱۸۵	صوفیاء پر فقہاء کی گرفت
۲۰۶	ساجد محمود قادری نوشاہی	۱۸۶	امام ابن تیمیہؒ اور محمد الف ثانی کے کارنامے
۲۰۷	عاجی محمد قادری نوشاہی	۱۸۸	بلقاء صوفیاء کے مخصوص مسائل (۱)
"	میاں شبیر محمد شریوردی	"	۱۔ اولیاء اللہ اور ان کی گرفت

صفحہ	عنوانات	صفحہ	عنوانات
۲۲۱	صوفیاء اور حضرت خضر کی تاریخ	۲۰۸	عشقِ مجازی اور حیوانات
"	پیرانِ پیر سے پہلی ملاقات	"	۳۔ جہادِ اصغر اور جہادِ اکبر
۲۳۶	حضرت خضر کی اضافی ڈیوٹی	۲۰۹	جہادِ باسیف کی فضیلت
۲۳۳	حضرت خضر اور قطب الدین بختیار کاکی	۲۱۰	صوفیاء کی موضوعِ احادیث
۲۳۳	حضرت خضر سے ایک دعا	"	عبدالکریم حبلی کا فلسفہ جہاد
"	حضرت خضر کی نماز	۲۱۲	جنید بغدادی کے مرید اور جہادِ باسیف
۲۳۵	حضرت خضر کی ابدی زندگی کا عقیدہ	۲۱۴	گوشہ نشین کا رو
"	۸۔ رجال الغیب سے استفادہ	۲۱۵	۴۔ سماع و وجد
۲۳۶	پیرانِ پیر کی ریاضت	"	سرورِ نقص کے دلائل
۲۳۷	پیرانِ پیر کی خدمت میں رجال الغیب	۲۱۶	دلائل کا جائزہ
۲۳۸	جنات سے لڑکی واپس لانا۔	۲۱۸	سماع اور شرعی دلیل
۲۴۰	آسیب کے دورے	"	وجہ اور حال کا علاج
۲۴۱	باب ۱۔ صوفیاء کے مخصوص مسائل (۲)	۲۱۹	سماع کے متعلق صوفیائے حق کا دعویٰ
"	۹۔ شیعیت سے لگاؤ۔	۲۲۰	سماع کی دلدادی
"	۱۔ بارہ اہلِ کافین	۲۲۱	حافظ برغوردار نوٹس ہی کا سماع
۲۴۲	۲۔ حضرت علیؑ پہلے درویش تھے	"	ابوسعید اور ابوالحسن خرقانی کا سماع
۲۴۳	۳۔ تجرِ نبوی کی تاریخ	۲۲۲	۵۔ جامِ دے کی شاعری
"	۴۔ نام اور تعزیر داری کی اہمیت	۲۲۵	شراب کی دلدادی
۲۴۶	۵۔ جہنم کا نام	"	۶۔ تصویرِ شیخ
۲۴۷	۶۔ حضرت حسینؑ اور عوف کوثر	"	تصویرِ شیخ خدا سے دور رکھنے کا ذریعہ ہے
۲۴۸	۷۔ حضرت ام شکر اور خونِ کربلا	۲۲۶	تصویرِ شیخ اور بزرگوں کے اقوال
۲۴۹	۸۔ حضرت زین العابدینؑ کو امامت کیسے ملی؟	۲۲۷	اندھی عقیدت
۲۵۰	۹۔ اشرف ملی تھانوی کی پیدائش	۲۲۸	جنید بغدادی کے مرید کا غلطے کھانا
"	تفتون پر باطنیت کی چھاپ اور موضوعات	"	۷۔ حضرت خضرؑ کی شخصیت
۲۵۲	۱۰۔ خرقہ کی فضیلت	"	حضرت خضر کون ہیں؟
۲۵۳	شیر پر خرقہ کا اثر	۲۳۰	حضرت خضر سے ملاقات

صفحہ	موضوعات	صفحہ	موضوعات
۲۵۱	پیران پیر کے نوافل	۲۵۳	محمود غزنوی اور فتح سومات
"	شیخ محمد میر کی عبادت و ریاضت	۲۵۴	۱۱۔ اولیاء اللہ کے بھوتوں کے کرشمے
۲۵۱	ملاشاہ قادری اور اتباع سنت	۲۵۵	دشمن کی سرکوبی
۲۵۲	۱۴۔ اکل حلال اور احتیاط میں غلو	۲۵۶	شمس الدین محمد غنی کی کھڑاویں
"	اکل حلال کی اہمیت	"	کھڑوں سے قلب جاری ہونا
"	احتیاط کی حدود	۲۵۷	۱۲۔ لوح محفوظ پر نظر
۲۵۳	صوفیاء کی احتیاط	۲۵۸	لوح محفوظ میں تبدیلی کیسے ہوتی ہے؟
"	حضرت سفیان ثوریؒ	۲۵۹	آخر اللہ تعالیٰ نے یارمان لی۔
۲۵۵	حادثہ مماسی	۲۶۰	لوح محفوظ میں تبدیلی کی نئی شکل
"	احمد بن حرب	۲۶۱	اس عقیدہ کی توثیق
"	امام ابن قیم کا فتویٰ	۲۶۲	۱۳۔ عبادات میں غلو اور بدعات
۲۵۶	۱۵۔ پسیلیوں کی زبان اور اسرار و رموز	"	بدعت کی اقسام
"	۱۔ واقعات	۲۶۳	ہر طرح کی بدعت گمراہی ہے۔
"	حسن بصری کا وعظ	۲۶۴	بدعت کا دوسرا پہلو
۲۵۷	راہبہ بصریہ اور گورے کالے کا فلسفہ	"	اولیں قرنی کی عبادت
"	احمد خضرویہ کی جہان نوازی	۲۶۵	عبداللہ خنیف کی عبادت
۲۵۸	سرہن سقطنی کا خواب	۲۶۵	امام جعفر صادق کا صدقہ
۲۵۹	شبلی کا زہد	۲۶۶	ابوالحسن خرقانی کا صدقہ
"	ب۔ اخلاق حسنہ کی تعریفیں	۲۶۷	معروف کرخی کا تیمم
۲۶۱	ج۔ ایمان اور ارکان اسلام کے اسرار و رموز	"	ابوالحسن کے استاد کی غیرت فقر
۲۶۳	بلات۔ آستانے اور مزارات	۲۶۸	پیران پیر کا قیمتی لباس
"	توحید کیا ہے؟	۲۶۹	شیخ ابوالسعود کی قیمتی پگڑی
"	شرک فی العبادت	"	کم خوری کا معیار
۲۶۴	دین طریقت کے اثرات	"	ترک دنیا کا معیار
"	جنت پرستی اور قبر پرستی کی ابتداء	۲۷۰	بازید بن سہامی کا نماز دہرانا
۲۶۵	یہ آستانے اور درگاہیں	"	عبدالقادر جیلانی کا وضو

صفحہ	عنوانات	صفحہ	عنوانات
۳۰۶	کسی فقیر کے پلے باندھنے کے فوائد	۲۸۵	غیر مشروط اطاعت ہی خدائی کا دعویٰ ہے۔
"	شفاعت اولیاء اللہ	۲۸۶	نذار الخیر اللہ، توسل اور استمداد
۳۰۷	ابو الحسن خرقانی سبحات و مہندہ	۲۸۷	سجدہ تنظیمی اور نظام الدین اولیاء
"	پیران پیر سے توسل کے فوائد	۲۸۸	سجدہ تنظیمی اور حرمت
۳۱۱	یہ مزارات اور خانقاہیں	۲۸۹	ولایت یا خدائی
"	قبر پرستی اور بت پرستی میں قدر مشترک	"	۱۔ علم غیب خاصہ خدا ہے
۳۱۲	کیا فوت شدہ بزرگ مٹ سکتے ہیں؟	۲۹۱	رسول اکرم کا علم غیب کئی
۳۱۳	احادیث اور سماع موتی	۲۹۲	۲۔ اولیاء اللہ کے علم غیب کی وسعت اور تصرف
۳۱۶	مردوں کی بد زخی زندگی	۲۹۳	شاہ عبدالرحیم کا علم غیب
۳۱۷	کیا روح کا اس دنیا میں واپس آنا ممکن ہے؟	۲۹۴	میاں جی نور محمد کے شاگرد کا علم غیب
۳۱۸	اولیاء اللہ مرتے نہیں	"	علی جویری کا علم غیب اور اختیار و تصرف
۳۲۰	صاحب قبر کی حاجت براری	۲۹۵	عثمان ہارونی کا تصرف اور طی الارض
"	ایک بزرگ سات قبریں اور حاجت روائیاں	۲۹۶	پیران پیر کی حاجت روائی اور مشکل کشائی
۳۲۱	۱۔ پیران پیر اور شیطانی فریب	"	صلوۃ خورشید کے فائدے
۳۲۲	۲۔ عنید بغدادی کا مرید اور بہشت کی سیر	۲۹۷	عبد القدیس گنگوہی کی کرامات
"	۳۔ مردہ زندہ کرنے والا جنات کا حال	۲۹۸	پیران پیر اور جنس میں تبدیلی
۳۲۳	۴۔ ابو الحسن خرقانی اور سماع کا جواز	۳۰۰	اولیاء اللہ کا موت و حیات پر تصرف
۳۲۵	۵۔ فریب شیطانی کی بعض دوسری شکلیں	۳۰۱	موت کے وقت میں تبدیلی
"	حاجت روائی کیسے ہوتی ہے؟	۳۰۲	کئی تصرف کا ثبوت پیران پیر کی زبان سے
۳۲۸	قبروں کے متعلق ارشادات نبوی	۳۰۳	اس عقیدہ پر علامہ آلوسی کا اظہار فوس
"	قبروں کو سجدہ گاہ بنانا	"	۳۔ توجہ رحمت اور شفاعت
۳۲۹	مزارات ان پر چراغ جلانا۔ مجاہدی کرنا	"	توجہ کے کرشمے
۳۳۰	جلی یا معنوی مزارات	۳۰۴	نظر کرم کی فیوض و برکات
"	سابقہ مزارات کا اہتمام	"	نگاہ و جلالت کی تباہ کاریاں
۳۳۱	قبر کے پاس مسجد بنالینا	۳۰۵	نبیت ہی اخروی نجات کی ضمانت ہے
"	قبرستان میں نماز ناجائز ہے۔		

صفحہ	عنوانات	صفحہ	عنوانات
۳۵۳	۲۔ بنید بغدادی کا طریق تربیت	۳۳۲	صوفیہ اور قہروں کی مجاورت
۳۵۴	شیخ شبلیؒ پر ولایت کے اثرات	"	قہر نبوی سے متعلق موضوعات
۳۵۵	۳۔ نظام الدین عمری کا طریق تربیت	۳۳۴	قہروں سے متعلق صوفیاء کا ذہنی انتشار
۳۵۷	۴۔ ابوسعید گنگوہی کا طریق تربیت	"	شاہ ولی اللہ اور کشف قبور
۳۵۸	۴۔ خضر کی تعلیم سے بننے والے ولی	۳۳۵	ابن حجر مکی کا ذہنی انتشار
"	عبدالحق غجدانی	۳۳۶	بابک ولایت کی تعلیم
۳۵۹	حضرت خضر سے روایت	"	۱۔ تعلیمات ولایت
"	خضر بننے کا طریقہ	۳۳۶	ولایت کا نیا مفہوم
۳۶۰	۵۔ صحبت بزرگان سے بننے والے ولی	۳۳۷	ولایت کی تعلیم
"	۶۔ محمد زین	۳۳۸	چل اکا اور منزل مقصود
۳۶۱	عبدالحق قادری نوشاہی	۳۳۹	بنو کلین کی قوت
۳۶۲	۷۔ عشق مجازی سے حقیقی تک پہنچنے والے ولی	۳۴۰	چلے کاٹنے کا طریقہ
"	۸۔ پاناہ کھانے سے بننے والے ولی	۳۴۱	ولایت اور کشف و کرامات کا تعلق
۳۶۳	۹۔ اولیاء اللہ کی الوہی قسم۔ خدا کی بیوی	۳۴۰	۲۔ اولیاء اللہ کے باہمی مقابلے
۳۶۴	۴۔ تکمیل ولایت کا معیار	۳۴۱	۱۔ اولیائے ہند و افغانستان کا مقابلہ
"	۱۔ امام باقر کا معیار	۳۴۲	۲۔ ربانی الغیب کا مقابلہ
۳۶۵	۲۔ ابراہیمؑ اور ہم کا معیار	۳۴۳	۳۔ عبد القدوس گنگوہی اور محمد غوث کا مقابلہ
"	۳۔ شیخ علی خواجہ کا معیار	"	۴۔ مولانا درویش محمد کا نسبت سلب کرنا
"	۴۔ شیخ شبلیؒ کا معیار	۳۴۴	۵۔ پیر شمس اور بہاؤ الدین زکریا کا مقابلہ
"	۵۔ معین الدین اجمیری کا معیار	۳۴۶	۶۔ شیخ خرقانی اور ابوالعباس کا مقابلہ
۳۶۶	۶۔ قطب الدین گنج شاکر کی کا معیار	"	کشف و کرامات کے حصول کا بہترین نسخہ
"	۷۔ تکمیل ولایت کا الوہی معیار	۳۴۷	۳۔ اولیاء اللہ کی اقسام
۳۶۷	۵۔ اولیاء اللہ اور کیمیا گری	"	۱۔ مادر زاد ولی
"	۱۔ شیخ نظام الدین عمری	۳۵۰	۲۔ اک نگاہ کرم سے بننے والے ولی
"	۲۔ میاں نثار قادری	۳۵۲	۳۔ تربیت یافتہ ولی
"	۳۔ عبد اللہ بلوچ	"	۱۔ بایزید بسطامی کا طریقہ کار

صفحہ	عنوانات	صفحہ	عنوانات
۳۸۷	۱۔ کشف وکرامات	۳۸۸	۴۔ شاہ بلاول، سونے کا لوٹا
۳۸۸	۲۔ قبوری شریعت اور شکر افعال	"	۵۔ میان جی نور محمد، سونے کی دیوار
۳۸۹	۳۔ غیر مسلموں سے مخلوط معاشرت	۳۸۹	۶۔ توکل شاہ انبالوی، سونے کی نہریں
۳۹۱	۱۱۔ صوفیا کی تعلیم و تربیت کا روکل، جنگی تحریک	۳۹۰	۷۔ محمد اسلم طوسی اور سونے کا تراشہ
۳۹۲	۱۔ رامانج	"	۸۔ طحطائی دیناروں کی بارش
"	۲۔ سوامی رامانند	۳۹۱	۶۔ صوفیاء اور اشاعت اسلام کا طریقہ
"	۳۔ سوامی دلچد چاریہ	۳۹۲	۱۔ حضرت علیؑ اور صلوة خمسہ
۳۹۳	۴۔ سوامی جے قتیہ	۳۹۳	۲۔ خواجہ حفیظ المرعشی
"	۵۔ جنگت کبیر	"	۳۔ خواجہ ابوالاحمد
"	۶۔ بابا گوردوانک	۳۹۴	۴۔ خواجہ محمد احمد
۳۹۵	ہفت۔ معجزات، کرامات اور استدراج	"	۵۔ احمد خضر ویر کی کرامت
"	معجزہ کی غرض اور اقسام	"	۶۔ مودودیؒ حشمتی کا جنازہ اڑنا
۳۹۷	کرامت کا مفہوم	"	۷۔ خواجہ عثمان ہارونی اور آگ
۳۹۹	کرامات صحابہ	۳۹۵	۸۔ معین الدین چشتی و شیعہ امیر
"	اول درجہ کی کتب سے	"	۹۔ قسیمیہ البان اور تبدیلی اشکال
۴۰۱	درجہ دوم کی روایات	۳۹۶	۱۰۔ فرید الدین گنج شکر، چھ سال کی عمر میں کرامت
"	تیسرے درجہ کی روایات	"	۱۱۔ غفر الدین گنج شکر، کارمرہ زندہ کرنا
۴۰۲	صحابہ اور تابعین سے کرامات کا صدور کیوں نہ ہوا	"	۱۲۔ عبدالقدوس لنگوی کا پانی پینا
۴۰۶	کرامات اور استدراج	۳۹۷	۱۳۔ امیر کلال کی کشتی کا فلسفہ
"	کرامت کا معیار اور اہمیت	۳۹۸	۱۴۔ پیر حسن کبیر کی دعوت
۴۰۷	جنید بغدادی کا فتویٰ	"	۸۔ اولیاء اللہ کا وعظ اور تاثیر کلام
۴۰۸	التوفیق میں کرامت پر تبصرو	"	جنید بغدادی کا پہلا وعظ
"	مولانا اثر علی تھانوی کا تبصرو	۳۹۹	پیران پیر کا وعظ
۴۰۹	اولیاء اللہ کی کرامات	۴۰۰	۹۔ ہند میں اشاعت اسلام میں صوفیاء کا کردار
"	ارغمرہ کو زندہ کرنا	۴۰۱	صوفیاء کی برصغیر میں آمد
"	حشمت کا معیار ولایت	۴۰۷	۱۰۔ صوفیائے کرام کی تعلیم (خصوصیات)

صفحہ	عنوانات	صفحہ	عنوانات
۴۷۶	۵۔ چند و لحیپ کرامات	۴۱۰	لہذا سے مارنا اور اللہ سے زندہ کرنا
"	۱۔ سونے سے بھرا ہوا ڈول	۴۱۱	پیران پیر کی میحائی
"	۲۔ حضرت عمر اور گرا ہوا دی	۴۱۲	شیخ علی بن ہبیتی اور مقتول کا کلام
۴۲۸	۳۔ تری شقی کی بھگن	۴۱۳	صوف نظر کرنے سے مرده کا زندہ ہو جانا
۴۲۹	۴۔ دروزہ کا علاج	"	پیشترس تبریزی مرده زندہ کرنا سورس قریب لانا
"	۵۔ سانپ کا طواف	۴۱۵	۲۔ ہوا پر حکومت
۴۳۰	بانک۔ دلائل صوفیاء	"	۱۔ حبیب العجی کی حکومت
"	۱۔ مجاہدہ اور ریاضت	۴۱۶	کرامات کے معجزات سے بڑھیا ہونے کا شرعی ثبوت
۴۳۷	۲۔ بیعت	۴۱۷	۲۔ راجہ بھیر پانی اور ہوا پر حکومت
۴۳۳	اویسی نسبت	"	۳۔ ہوائی سفر اور عثمان مارونی
۴۳۴	۳۔ توحید یا تعریف باطنی	۴۱۸	۴۔ خواجہ ابواسحاق چشتی
۴۳۷	۴۔ مشاہدہ حق	۴۱۸	۵۔ حسین لاہوری کا کشف
"	قرآن سے دیدار الہی کا ثبوت	۴۱۹	۶۔ ابوالحسن خزانی قطب عالم
۴۳۸	حدیث قدسی سے دیدار الہی کا ثبوت	۴۲۰	۳۔ حضرت موسیٰ کے معجزات اور اولیاء اللہ
۴۴۰	۵۔ دیدار رسول اللہ	"	بائیں غیبی یا ندائے غیبی
۴۴۳	وفات کے بعد حضور اکرم کی زندگی	"	ید بیضا
۴۴۴	۶۔ ذکر الہی	۴۷۱	لامٹی مارنے سے چشمہ پھوٹنا
"	اقسام ذکر	"	عصائے موسیٰ
۴۴۵	۱۔ ذکر قلندر	"	دریا میں نلک راستہ بننا
"	۲۔ ذکر نور اور کشف قبور	۴۷۲	دریا کو خشک کر دینا
"	۳۔ افضل الذکر کا صحیح مقام	"	حضرت علی اور دریا کی طغیانی
۴۴۶	۷۔ محبت الہی	۴۷۳	۴۔ متفرق کرامات
۴۴۷	محبت الہی بھی اور چلہ ترک بھی	۴۷۴	یانا رکونی بڑا و سلاسا
"	ترک دنیا	"	آگ میں کودنے کی مقابلہ بازی
۴۴۸	۸۔ صحبت بزرگان	۴۷۵	چٹان کا پھینا
۴۴۹	۹۔ معرفت الہی	۴۷۶	

صفحہ	عنوانات	صفحہ	عنوانات
۴۶۹	۱۱-۱۴۔ عشق بازی۔ مجاہدہ۔ شرفہ رجال الغیب سے متعلق موضوعات	۴۵۰	۱۔ الخلق عیال اللہ
"	موضوع واقعات	"	انسانی حقوق
۴۷۰	۱۔ شبِ معراج اور غرقہ	۴۵۱	الخلق عیال اللہ کا صوفیانہ مفہوم
"	۲۔ دورِ نخی بہشتی کے کندھے پر	۴۵۲	۱۱۔ زہد
"	۳۔ کربلا کی سرخ مٹی	"	۱۲۔ اخلاقیات
"	۴۔ حضرت علیؑ اور دُخول کی شہادت	۴۵۳	صوفیائے کرام کا تفسیری انداز
۴۷۱	۵۔ سورج کی واپسی	۴۵۴	۱۔ بنیائی کا تفسیری انداز
"	حاج محمد کو سورج چاند کو ٹھہرانا	۴۵۵	۲۔ شیخ عبدالغنی نابلسی
۴۷۲	۶۔ حضرت علیؑ اور زمین کی سراغ رسانی	۴۵۶	۳۔ عبدالکریم جیلی
۴۷۳	۷۔ حضرت ابراہیمؑ بن محمدؑ کی وفات	۴۵۸	۴۔ شیخ اکبر
"	۸۔ سورج کا گناہ اور حضرت عمرؓ	۴۵۹	۵۔ مولانا اللہ یار خاں
۴۷۴	۹۔ استمدادِ نبویؐ کا ثبوت	"	تجلیات الہیہ کا ثبوت
۴۷۵	گھر پر شہادت	"	معرفت الہیہ کا ثبوت
۴۷۶	۱۰۔ توحید	۴۶۰	موضوعات اور غلط تاویلات کے سہارے
"	معروف کرخی کی وفات پر جھگڑا	۴۶۱	صوفیاء کی اہماتِ قطب
"	حافظ غلام قادر کی شخصیت	"	موضوع احادیث
۴۷۹	۲۔ رسالت	۴۶۲	۱۔ ابتدائے کائنات
۴۸۰	نئے رسول	"	۲۔ نور محمدی
۴۸۱	رسول اکرمؐ کا نور	۴۶۳	۳۔ رسول اللہؐ کی عظمت
۴۸۲	عالم اکبر اور عالم اصغر	۴۶۵	۴۔ قبرِ نبویؐ سے متعلق موضوعات
۴۸۳	نورِ محمدؐ اور قولِ عشرہ	"	۵۔ اولیاء اللہ کی شان
"	عقلِ اول کی مختلف توجہات	"	۶۔ معرفت کے متعلق موضوعات
۴۸۴	۳۔ قرآن	۴۶۷	۷۔ دینِ طریقت اور باطنی علوم
"	فرشتوں کا سجدہ اور تبدلِ الف ثانی	"	۸۔ سماع و وجد کے متعلق موضوعات
"		۴۶۸	۹۔ ہمارے موتی
"		"	۱۰۔ شیعیت سے لگاؤ

صفحہ	موضوعات	صفحہ	موضوعات
۵۰۱	جنت کے خیال سے عبادت حرام ہے	۴۸۶	قرآن کا ثواب
"	بایزید کا جہنم کو ٹھنڈا کر دینا	"	۴۔ اتبایع سنت
۵۰۳	۶۔ ارکان اسلام کا استہزاء	۴۹۰	اولیاء اللہ کے خلاف شرع کام
"	حج بیت اللہ شریف	۴۹۱	۱۔ وصل روزہ
"	خانہ کعبہ راجعہ بصرہ کے طواف کو جانا	"	۲۔ متواتر روزے
"	خانہ کعبہ کا معین الدین کے گرد طواف	"	۳۔ ساتھی رات جاگنا
۵۰۶	خانہ کعبہ کا مودود چشتی کے ہاں جانا	۴۹۱	۴۔ مقرر خوانی
۵۰۷	پیشہ سانی کا حج	۴۹۲	نکاح مسنون اور اس کی اہمیت
"	عبد اللہ بن مبارک کا حج	۴۹۲	نکاح سے گریز
"	عارفوں کی نماز	۴۹۳	نکاح ایک عہد و بیان ہے
۵۰۸	اشرف علی تھانوی کا اعتراف حقیقت اور سوائے	۴۹۳	عبد اللہ خفیف کا نکاح اور طلاق
۵۱۰	شریعت اور طریقت میں موافقت کی کوشش	"	ابو محمد مرتضیٰ کا نکاح اور طلاق
"	۱۔ ذکر کیا ہے؟	۴۹۴	قطب الدین بختیار کاکی کا طلاق دینا
"	۲۔ مجاہدہ	۴۹۵	شیخ اکبر کا فلسفہ نکاح
"	۳۔ زہد کی حقیقت	"	۵۔ اتبایع سنت کن باتوں میں؟
۵۱۱	۴۔ استغراق	۴۹۶	۱۔ اولیں قرنی کا دانت توڑنا
"	۵۔ کشف و کرامات	"	۲۔ بایزید بسطامی اور والدین کا حق
۵۱۲	۶۔ توجہ و تفرقہ کی حقیقت	"	۳۔ معین الدین اور انگلیوں کا غلام
۵۱۳	۷۔ بیعت کی اغراض	"	۴۔ نیچے بیٹھ کر دوا کھانا
۵۱۴	۸۔ بیعت کی ضرورت	۴۹۷	۵۔ میان جی نور محمد
۵۱۵	۹۔ محبت اور عشق	۴۹۷	۶۔ بایزید بسطامی کا تقویٰ
۵۱۶	اشرف علی تھانوی کی مساعی جمید پر تبصرہ	"	۷۔ امیر کمال کا تقویٰ
۵۱۷	غور شید احمد گیلانی اور روح تصوف	۴۹۸	۵۔ جنت اور روزگار کا استہزاء
۵۱۹	شریعت و طریقت میں تقابل کا تقابلی جائزہ	"	علوم شادی جنت سے بے نیازی
۵۲۲	مشائخ عظام سے چند سوالات	۴۹۹	دوزخ مقام لذت ہے۔
۵۲۷	کتابیات	۵۰۰	معروف کرشمی کا جنت میں جانے سے انکار

دین طریقت یا رہبانیت

ایک اتفاقی مذہب

جسم اور روح کے اتصال کا نام زندگی ہے۔ ہر جاندار میں یہ دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں، لیکن انسان اور دوسرے جانداروں میں فرق یہ ہے کہ اسے عقل و شعور اور خیر و شر میں تمیز کی صلاحیت سے بھی نوازا گیا ہے، اسی عقل و شعور ہی کا کرشمہ ہے کہ عقلمند انسان یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ وہ اس کائنات میں اپنا مقام متعین کرے کہ وہ کس حیثیت سے اس کائنات میں زندگی گزار رہا ہے۔ اپنے مقام کی اس تشخیص پر اس کی زندگی اور اعمال و افعال کا انحصار ہوتا ہے۔

لیکن انسان کی عقل محدود ہے۔ زندگی میں بے شمار ایسے مسائل سامنے آتے ہیں جن میں اکثر عقل بھٹک جاتی ہے۔ مثلاً اس کائنات کی ابتدا کیسے ہوئی؟ وہ دنیا میں کس حیثیت سے آیا ہے؟ مرنے کے بعد کیا روح بھی فنا ہو جائے گی؟ اور اگر ایسا نہیں تو پھر اس کی آئندہ زندگی کس طرح کی ہوگی؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا عقل کی کسوٹی پر تجربہ و مشاہدہ نہیں کیا جاسکتا۔

پھر ہر انسان کی عقل کا معیار بھی الگ الگ ہے۔ کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو ہر وقت اسی قسم کے سوالات پر غور و فکر کرنے میں نہمک رہتے ہیں۔ کچھ دوسرے ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں صرف کھانے پینے اور سونے سے غرض ہوتی ہے۔ ان مسائل کی طرف بھول کر بھی کبھی نہیں سوچتے۔ پھر یہ بات بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انسان کی سوچ پر اس کے ماحول کی گہری چھاپ ہوتی ہے، لہذا یہ بھی ضروری نہیں کہ اس

محدود دائرہ میں ہر عقل کی عقل ایک ہی جیسا نتیجہ اخذ کرے۔

بلاشبہ دین کے انتخاب کے معاملہ میں عقل کو ایک مقام حاصل ہے اس کے اصول و مبادیات کی جانچ و تحقیق میں ہر انسان خود مختار ہے۔ چاہے تو اسے قبول کرے، چاہے تو رد کرے، لیکن دین کے اصول، عقائد و احکام کو عقل کے حوالہ نہیں کیا گیا، بلکہ عقل کو وحی کے تابع کر کے غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے خالق کائنات نے اپنے خاص فضل و کرم سے انبیاء پر وحی نازل فرما کر انسان کو کائنات میں اس کے صحیح مقام کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔ بالفاظ دیگر گہری نبی کی صداقت ثابت ہونے کی حد تک تو انسان اپنی عقل سے کام لینے میں مختار ہے۔ لیکن کسی نبی پر ایمان لانے کے بعد اسے یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ اس کی ہر ہر خبر کو اپنی عقل کی کسوٹی پر پرکھے، بلکہ اب نبی کی رہنمائی ہی واجب ہوتی ہے، اسی چیز کا نام دین ہے۔

اللہ نے جب انسان کو دنیا پر اتارا، تو جہاں اس کی مغبوک، پیاس اور صنفی خواہشات کی تکمیل کے لئے خوراک، پانی اور اس کے جوئے کا انتظام کیا

وہاں اس کی روحانی اور اخلاقی متناؤں کی تکمیل کے لئے ایک واضح نظام ہدایت بھی عطا فرمایا چنانچہ البواشر حضرت آدم علیہ السلام جہاں پہلے انسان تھے، جو دنیا میں تشریف لائے۔ وہاں وہ پہلے نبی بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام کی جنت میں رہائش اور وہاں سے نکلنے کا قصہ بیان کر کے حضرت آدم علیہ السلام اور اولاد آدم علیہ السلام سے یوں مخاطب ہوئے ہیں :

فَإِمَّا يَنْتَهِكُم مِّنْهُ مُدًى فَمَنْ هُدًى فَمَنْ
تَبَعَ هُدَايَ فَلَا يَخُوفُ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲۸)

پھر جس طرح انسان کو عقل و شعور سے نوازا گیا ہے۔ وہ جان سے بھی سرفراز کیا گیا ہے جسے قلبی کیفیت بھی کہتے ہیں بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو عقل کی کسوٹی پر تجربہ و مشاہدہ نہیں کیا جاسکتا، لیکن انسان کا دل اس کی صحت پر شہادت دیتا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے موت کے بعد کی زندگی کے ثبوت میں نیند کو بطور تمثیل پیش کیا ہے۔ کیونکہ ان دونوں میں بہت سی باتیں بطور قدر مشترک پائی جاتی ہیں۔ اور ساتھ ہی انسان کو توجہ فرمائی ہے کہ جو خدا انسان کو نیند کے بعد زندہ کر دیتا ہے۔ وہ بھلا مرنے کے بعد زندگی کیوں نہیں عطا کر سکتا۔ تمثیل عقل اور تجربہ کی کسوٹی پر پوری نہ اترنے کے باوجود بھی انسان کے دل میں

جاگزیں ہو جاتی ہے۔ اس قلبی کیفیت کا نام وجدان ہے۔ وحی الہی میں عقل و خرد اور وجدان دونوں کو ملحوظ کیا گیا ہے۔

مذاہبِ عالم میں جب بھی کسی بگاڑ پیدا ہوا ہے۔ انہی دو چیزوں — عقل اور وجدان — کے استعمال میں افراط و تفریط سے ہوا ہے عقل نے جب وحی الہی میں بے جا تنقید و مداخلت کی اور اسے کلام اور فلسفہ کی سان پر چڑھایا، تو اس سے کیا گل کھلے اور کتنے فرقے وجود میں آئے۔ اس مضمون میں تفصیل علاج از بحث ہے۔ سرفہرست ہم اس بگاڑ کا ذکر کرنا چاہتے ہیں، جو وجدان کے استعمال میں افراط و تفریط سے پیدا ہوئے ہیں۔

ایمان بالغیب

تمام اُسیبِ کرام پر جو مختلف ادوار و اوقات میں وحی نازل ہوتی رہی، اس کے اُصول و مبادیات ہمیشہ ایک ہی رہے ہیں اور ان کا بنیادی تصور "ایمان بالغیب" ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ بن دیکھے خدا پر ایمان لانا اور یہ سمجھنا کہ وہی اس کائنات کا خالق و مالک اور رازق ہے اور وہ صرف ایک ہی سستی ہو سکتی ہے۔

۲۔ بن دیکھے مرنے کے بعد کی زندگی، جنت اور دوزخ پر ایمان لانا اور یہ عقیدہ رکھنا کہ ہر انسان کو مرنے کے بعد اُس کے اچھے یا بُرے اعمال کی جزا و سزا ضرور ملے گی اور اُن کے اعمال کے لحاظ سے اُن کا ٹھکانا جنت یا دوزخ ہوگا۔

۳۔ بن دیکھے اس بات پر ایمان لانا کہ نبی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتہ نازل ہوتا ہے جو اللہ کی طرف سے بندوں کے لئے وحی یا پیغامِ ہدایت لاتا ہے اگرچہ نبی ان ہی کا ایک فرد ہوتا ہے۔

انسان اور دیگر موجودات میں دوسرا بنیادی فرق یہ ہے کہ انسان کے علاوہ باقی تمام موجودات اللہ کے طبعی قوانین کی پابند ہیں۔ سوچ، چاند، زمین، آسمان، پانی، آگ، ہوا، بادل وغیرہ کے لئے جو طبعی قانون اللہ نے مقرر فرمادئے ہیں۔ کوئی چیز بھی ان سے سرِ مو تجاوِز نہیں کر سکتی، لیکن انسان طبعی لحاظ سے تو طبعی امور کا پابند ہے۔ وہ چاہے بھی تو بڑھاپے کے بعد جوانی کو واپس نہیں لاسکتا، نہ ہی اپنی موت کو روک سکتا ہے۔ وہ کھانے پینے کے بغیر زندہ بھی نہیں رہ سکتا، یہ اور اس جیسے دوسرے بے شمار مسائل ایسے ہیں جن میں انسان مجبور محض اور طبعی امور کے آگے کبے جس ہوتا ہے، لیکن خیر و شر میں سے کسی ایک کے انتخاب پر اسے کچھ اختیار بھی دیا گیا ہے۔ وحی الہی یا خدا کی طرف سے نازل شدہ ہدایت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان ایسے اختیاری امور میں بھی خود

کو، دوسری تمام موجودات کی طرح، خدا کی فشا و مرضی کے تابع بنائے، تاکہ اس کی ذات بھی کائنات سے ہم آہنگ ہو جائے۔ ایمان بالغیب اس معاملہ میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔

خدا اگر چاہتا تو کائنات کی دوسری اشیاء کی طرح۔ انسان اور اپنے درمیان سے غیب کے یہ پردے ہٹا بھی سکتا تھا۔ لیکن اس طرح انسان کی اطاعت اختیاری نہ رہتی، بلکہ دوسری اشیاء کی طرح اضطراری قسم کی ہوتی۔ اور انسان کی پیدائش اور اس دنیا کے دارالامتحان ہونے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ ایمان بالغیب اور وحی الہی کا فائدہ یہ ہے کہ وہ انسان کے مادی اور روحانی تقاضوں میں کچھ اس قسم کا حسین امتزاج پیدا کر دیتا ہے جس پر عمل پیرا ہو کر انسان روحانی منازل طے کرتا ہوا دنیا اور آخرت کی کامیابیوں اور کامرانیوں سے ہمکنار ہو جاتا ہے اور مرنے کے بعد وہ ان تمام چیزوں کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیتا ہے۔ جن پر وہ مرنے سے پہلے بن دیکھے ایمان لایا تھا۔

رہبانیت کی اہمیت تاریخ مذاہب کے مطالعہ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ مذہب میں جب بھی بگاڑ پیدا ہوتا ہے، تو اس کی ابتداء ہمیشہ مقدس اور نیک آرزوؤں سے ہوتی۔ اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے لئے بھلائی کے تصور سے کبھی سیر نہیں ہوتا اور اس بھلائی کو جلد از جلد حاصل کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان نے سوچا کہ جو باتیں ہم آخرت میں مشاہدہ کریں گے۔ ہمیں کسی نہ کسی طرح ان چیزوں کا پورا یا تھوڑا بہت مشاہدہ اس دنیا میں بھی ہو جائے، تو کیا ہی بہتر ہوگا؟ اس طرح اس نے ان غیبی پردوں کو دور کرنے کے لئے کوششیں شروع کر دیں اس نے یہ بھی سوچا کہ اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اس کا جسم اور اس کے مادی تقاضے ہیں۔ لہذا جب تک ان سے بچھٹکا جاوے تو روحانی منازل طے کرنا ناممکن ہے۔ یہی فکر رہبانیت یا دینِ طریقت کی بنیاد ہے۔ ارشادِ باری ہے :

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانٍ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ

اور انہوں نے لذات سے کنارہ کشی کی خود ایک نئی بات نکالی، جس کا ہم نے ان کو حکم نہیں دیا تھا، مگر انہوں نے اپنے خیال کے مطابق، خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے آپ ہی ایسا کر لیا تھا۔ پھر جیسا اس کو نباہنا پڑا تھا، نباہ بھی نہ سکے۔ پھر جو لوگ ان میں سے ایمان لائے

وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَسِقُونَ
 ان کو ہم نے ان کا اجر دیا اور ان میں سے زیادہ ناسٹن
 ہیں۔ (ترجمہ فتح محمد جالندھری) (۵۶)

مندرجہ بالا آیت سے اس دین طریقت کی بہت سی باتوں پر روشنی پڑتی ہے:

- ۱۔ لذات کو ترک کرنا دوحی الہی کے مطابق نہیں، بلکہ ایک بدعت ہے۔
- ۲۔ ان کے اپنے خیال کے مطابق وہ اللہ کی خوشنودی چاہتے تھے۔ حالانکہ اگر فی الواقع خدا کی خوشنودی کا طریقہ ہوتا، تو ضرور وحی میں مذکور ہوتا۔ تاہم ان کا ابتدائی ارادہ نیکی وغیرہ پر معمول تھا۔
- ۳۔ نصاریٰ سے بہت پہلے یہود نے بھی یہ روش اختیار کر لی تھی۔
- ۴۔ پھر یہ لوگ اپنے ابتدائی ارادوں پر قائم نہ رہے اور مختلف گناہوں پر بھٹکنے لگے۔
- ۵۔ یہ کئی گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ تو ایمان پر قائم رہا اور اسے اس کا اجر ملے گا، لیکن زیادہ تر یہ لوگ نافرمان ہی تھے۔

دنوی تعلقات سے سبزیاری

ان لوگوں کا نظریہ تھا کہ روحانیت کے اس راستے میں حامل سب گناہ ہمارا مادی جسم ہے۔ لہذا اس جسم کو مضلل اور کمزور بنانے کے لئے طرح طرح کے عذاب دیئے جانے لگے۔ کم سے کم کھانا پینا، جس سے صرف روح اور جسم کا تعلق باقی رہے۔ اور کم سے کم سونا، دنیوی لذات، جن سے فائدہ اٹھانے کا خدا نے انہیں حق دیا تھا، اس سے کنارہ کشی کرنا، شدید سردی میں لنگے بدن باہرات گزارنا، کہیں شدید گرمی میں کسی ایک ہی جگہ کھڑے رہنا، چُپ کا روزہ رکھنا، کیچڑ میں پڑے رہنا اور اس طرح کی کئی دوسری صوفی مادی جسم کو کمزور کرنے اور اذیت دینے کے لئے انہوں نے ایجاد کر لی تھیں جتنی کہ تاریخ میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ یہ راہب اپنے جسم پر خود زخم کر لیتے۔ پھر اس میں کیڑے پڑ جاتے اور اگر کوئی کیڑا گر جاتا، تو اٹھا کر اُسے پھر اپنے جسم پر چمٹا دیتے اور کہتے کہ یہ جسم تمہاری خوراک ہے۔ تم اس سے کیوں محروم ہوتے ہو۔ گویا اپنی جان سے دشمنی اُن کا پہلا اصول تھا۔ لہذا جسم کی تعذیب اور اس کے تقاضوں کی تکذیب کے ذریعہ وہ اپنے جسم کو تحلیل کرنے میں مصروف ہو گئے۔

ان لوگوں کا دوسرا اقدام دنیا والوں سے قطع تعلق تھا۔ یہ لوگ اپنے لئے کوئی گوشہ تنہائی منتخب کر

لے جیسے یہ لوگ چھادرک کی تعلیم دیتے ہیں۔ ترک دنیا، ترک جتنے، ترک لاکھ و لوم اور ترک خواہش نفس۔

لیتے یا پھر کسی جنگل کی راہ لیتے۔ ان کے خیال کے مطابق ان کے رشتہ دار اور دوسرے معاشرتی تعلقات رکھنے والے دوست احباب بھی اس راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ تھے۔ لہذا دنیا دہانیا سے الگ ہو کر کسی جنگل میں ایک گنیا بنا کر گیان دھیان میں مصروف ہو جاتے۔ ذیوی علاقے میں سے ان لوگوں کو سب سے زیادہ دشمنی موت سے تھی۔ تاریخ میں ایسے دلہن و زواقات بھی ملتے ہیں کہ کوئی مامتا کی ماری ماں اپنے ایسے ہی بیٹوں کو جنگل میں دیکھنے گئی، لیکن بیٹوں نے اس کی ملاقات سے انکار کر دیا۔ وہ انہیں صرف ایک نظر دیکھنے اور اپنی آنکھیں مٹھنڈی کرنے کے لئے ترستی اور التجائیں کرتی رہی، لیکن ان سنگدل راہبوں نے اس کی التجا کو ذرہ بھر وقعت نہ دی اور اُسے ناکام واپس آنا پڑا۔

تاریخ تو پھر تاریخ ہے جس میں کذب کا احتمال موجود ہوتا ہے۔ یہیں بخاری و مسلم دونوں میں ایک مرفوع حدیث بھی ایسی ملتی ہے جو اس موضوع سے پوری مطابقت رکھتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ابن جریج ایک اہلبیت تھا جس نے اسی طرح جنگل میں گنیا بنا کر کئی مامتا کی ماری اس کی ماں اسے ملنے آئی۔ اور اسے پکارا لیکن راہب مذکور گیان دھیان میں مصروف تھا۔ دل میں یہ ضرور سوچا کہ الہی ادھر تیری عبادت میں مصروف ہوں۔ دوسری طرف ماں پکار رہی ہے، کروں تو کیا کروں؟ بالآخر اس کے دل نے یہ فیصلہ کیا کہ گیان دھیان میں مصروف ہے اور ماں کی اس آرزو کی پرواہ نہ کرے چنانچہ اس نے اپنی ماں سے کوئی بات نہ کی اور اپنی عبادت میں لگا رہا۔ دوسرے دن پھر اس کی ماں آئی۔ پھر بھی اس نے حسب سابق اپنی ماں کی پکار کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ تیسری بار پھر ایسا ہی واقعہ ہوا تو اب اس کی ماں کو اتنا قلق ہوا کہ اس کے منہ سے اپنے اس درویش بیٹے کے حق میں بے اختیار یہ بددعا نکل گئی کہ تیا الہی! جب تک میرا یہ بیٹا کسی فاحشہ عورت کا منہ نہ دیکھ لے اسے موت نہ آئے۔ بھلا مامتا کی ماری دیکھاری ماں کے منہ سے نکلی ہوئی آہ رانیں گلیں کیسے جاسکتی تھی؟ ابن جریج اپنی عبادت اور خدا ترسی میں اتنا مشغور تھا کہ بنی اسرائیل کے اکثر لوگ اس سے خد کرنے لگے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ ابن جریج پر ایسا الزام لگے جس سے اُس کا یہ بلند مقام چھین جائے اور اسی غرض سے خفیہ مشورے بھی ہونے لگے تو ایک بدنام زمانہ فاحشہ عورت نے، جو حُسن و جمال میں اپنی نظیر نہ رکھتی تھی اس خدمت کو سرانجام دینے کا ذمہ لیا اور اسی غرض سے اپنے آپ کو ابن جریج پر پیش کر دیا۔ جسے ابن جریج نے رد کر دیا۔ اب یہ فاحشہ عورت اور بھی سیخ پا ہو گئی اور اس نے بے آبروی کا انتقام لینے پر اتر آئی۔ اب اُس نے اپنے آپ کو ایک چڑیا کے پریش کیا جس سے اُس کو حمل ہو گیا اور جب بچہ پیدا ہوا، تو لوگوں کے پوچھنے پر اُس نے یہ مشہور کر دیا کہ یہ محل

ابن جریج راہب سے ہوا تھا۔ بس پھر کیا تھا؛ لوگ دوڑے آئے۔ ابن جریج کو مارنا پینا شروع کر دیا اور اس کی کتیا کو منہم کر دیا۔ ابن جریج نے اس مار دھاڑ کی وجہ پوچھی تو لوگوں نے بار بار ماجرا بتلادیا۔ ابن جریج نے کہا کہ تھوڑی دیر بٹھرو۔ لوگ رک گئے تو اس نے وضو کیا اور عبادت میں مشغول ہوا اور اللہ سے بعد گریہ و زاری اپنی بریت کی دعا کی، جو اللہ نے قبول فرمائی۔ وہ عبادت سے فارغ ہو کر لوگوں کے پاس آیا۔ وہ فاحشہ عورت سے بچہ موجود تھی۔ ابن جریج نے اس بچہ کے پیٹ میں کچو کا دے کر کہا کہ بتا تیرا باپ کون ہے؛ بچہ بول اٹھا کہ فلاں چڑواہا ہے۔ تب جا کر لوگوں نے ابن جریج کا کلیچا چھوڑا۔ ان میں سے بعض اس سے معافی مانگنے لگے اور کہنے لگے کہ اگر کو تو ہمیں سونے کی کتیا بنا دیں، لیکن ابن جریج نے کہا کہ ”بس مجھے ویسی ہی تھی کی کتیا بنا دو۔“ (مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب تقییم زوال الدین، ۱۰۰)

اس طویل حدیث میں ایسے تین بچوں کا ذکر ہے جنہوں نے مل کی گود میں کلام کیا۔ جن میں سے ایک یہی ابن جریج راہب تھا۔ اہم مسلم نے اس حدیث کو والدین سے حسن سلوک کے باب میں ذکر کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ شرعی احکام کے مقابلہ میں ایسی رہبانیت گناہ ہے۔ حدیث میں اس مذکورہ واقعہ سے اس دور کے طریق رہبانیت پر پوری روشنی پڑتی ہے۔

بیوی کا معاملہ اس سے بھی زیادہ نازک تھا، کیونکہ نکاح سے اور بیوی کی موجودگی میں انسان کا بہت زیادہ معاشی اور معاشرتی ذمہ داریاں آپڑتی ہیں۔ لہذا یہ لوگ متابی زندگی سے سخت نفرت کرتے تھے، گو ان کو رہبانیت کا اللہ تعالیٰ نے حکم نہ دیا تھا۔ تاہم انہیں رہبانیت کی زندگی کی فحشیت کے لئے کچھ اشارے ضرور مل گئے۔ مثلاً حضرت عیسیٰ ؑ نے عود شادی نہ کی۔ ان کی زندگی کے جن چند سائل کے واقعات پر جو روشنی پڑتی ہے وہ یہی ہے کہ انہوں نے تبلیغ کے سلسلہ میں گھوم پھر کر مجرورانہ زندگی گزار دی تھی۔ پھر عیسائیوں میں نکاح ثانی کی بھی گنجائش نہ تھی اور یہودیوں نے رہبانیت کا تصور حضرت موسیٰ ؑ کے اُن چالیس دنوں سے لیا جو انہوں نے تورات ملنے سے قبل کوہ طور کے دامن میں گوشہ نشینی کی حالت میں گزارے تھے۔

یہ تو یہود و نصاریٰ کی بات تھی۔ اب ہندوستان کی طرف آئیے۔ ہندو مت کے راہنماؤں نے انسان کی

لے اہل ہند کو عدالتی راہنمائی ملی تھی یا نہیں۔ اس سوال کے متعلق قرآن کریم سے اس جواب تو قہا ہے کہ :

إِنَّ مِنْ أُمَّةٍ اخْلَعَتْ فِيهَا نَذِيرًا (۲۹) اور کوئی امت نہیں، جس میں ڈرانے والا کوڑہ نہ لگے۔ (باقی صفحہ ۲۴)

زندگی کو سو سال قرار دیا اور اُس کے چار حصے کیے گئے جن میں آخری چوتھا حصہ یا ۲۵ سال رہبانیت (گیان و حیا) کے لیے مختص کیے گئے تھے اور بدھ مت تو خالصتاً اسی راہبانہ زندگی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس مذہب کے بانی مہاتما بُدھ۔ جو ایک شہزادہ تھا۔ نے دُنیا کی بے ثباتی اور اس کے ہنگاموں سے راہ فرار اختیار کر کے راہبانہ زندگی بسر کی، تا آنکہ اس کو وہ روشنی ملی، جس کی تلاش میں وہ نکلا تھا۔ بعد ازاں اُس نے ہندوؤں سے ملحدہ بدھ مت کی بنیاد ڈالی۔ اس مذہب کی تعلیم ہی یہ ہے کہ انسان کی تکلیف یا نجات کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ راہبانہ زندگی گزارے۔ ایسے راہبوں کو وہ اپنی زبان میں بھکشو کہتے تھے۔

غیب کے پردے | غیب کے جس قدر پردے ہٹانے کی ضرورت تھی، تو اللہ تعالیٰ نے خود ہی ہٹا دیئے تھے۔ وحی کے ذریعہ تمام انبیاء کو یہ اطلاع دی جاتی رہی کہ اس کائنات کا خالق و مالک صرف ایک ہی مقتدر ہستی ہو سکتی ہے جو تمام کائنات کا اللہ اور معبود ہے۔ باقی تمام مخلوق اس کی مطیع فرمان اور عاجز بندے ہیں۔ وحی کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ماضی کے حقائق کا بھی انکشاف کیا اور قیامت اور آخری زندگی کا بھی۔ جزا و سزا کے قانون کا بھی اور اس بات کا بھی کہ مرنے کے بعد انسان کے ساتھ کیا کچھ ہونے والا ہے۔ یہ سب غیب کی باتیں تھیں جو اللہ تعالیٰ نے خود ہی بتلا دیں اور اس نظام کائنات یا انسان اور خدا کے درمیان ایسے غیب کے پردے خود ہی اٹھائے دیئے تھے جن کی انسان کو ذہنی اور آخری زندگی میں کامیابی سے ہٹکارا نہ ہو سکے۔ یہ ضرورت تھی اور جن کے انکشاف میں انسان کی عقل یا وجدان گمراہ ہو سکتے تھے۔ اس سے زیادہ پردہ اٹھانے سے چونکہ اس دارالامتحان کا نظام مغل ہو سکتا تھا، لہذا اللہ تعالیٰ نے مصلحتاً ان پردوں کو قائم رکھا۔ اُس نے نہایت کم و صرف اتنا ہی علم غیب عطا فرمایا، جتنا انسان کی نجات کے لئے ضروری تھا۔

مگر چونکہ ایسے رہبان یا گیانی یا صوفی قہم کے لوگوں کا سب سے پہلا ہدف یہی غیب کے پردے ہوتے ہیں لہذا اللہ تعالیٰ نے ایسے افعال کو ایسی بدعت قرار دیا۔ جن کے متعلق انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم نہیں ملا تھا۔ احادیث نبوی میں بھی اس رہبانیت یا دین طریقت اور اس کے طریق غلوئی العبادات کو ناپسند کیا گیا اور اس سے منع کیا گیا ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَشَدُّ دُورًا عَلَى أَنْفُسِكُمْ فَإِنَّ

دُورًا عَاشِرَ غُرْبَةٍ مَعَكُمْ یَا مَنِیْہَا کہ ہندوستانی مذہبی راسخانی اطلاق غیب تھے۔ دُور سے کہہ میں کہا جاتا ہے چھوڑ کر کم کی نیہات اور شریعت کے علاوہ تمام انبیاء کی کتب میں جو کہ ہمیشہ سے رد و بدل ہوتا رہا ہے۔ لہذا ہم اس معجزہ کو کم و کم کے ارشاد کے مطابق نہ تو ان کی تصدیق کرتے ہیں اور نہ تکذیب۔

قَوْمًا يُشَدِّدُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ
فَشَدَّدَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ فَلَمَّا بَقِيََا هُمَا
فِي الصَّوَامِعِ وَالْدِيَارِ وَرَهْبَانِيَّةٍ
أَبْتَدَعُوها مَا كَتَبْنَا هَا عَلَيْهِمْ

کی تو پھر اللہ نے بھی ان پر سختی کی (یعنی ان کا ایسا کر دہ میا
عبادت ہی ان کی جانچ کے لئے مقرر کر دیا) اس قوم کو بقایا
گرجوں اور خانقاہوں میں ہے (پھر آپ نے یہ آیت پڑھی
رہبانیت کو انہوں نے خود ہی ایسا کر دیا تھا جس کا ہم نے
انہیں حکم نہیں دیا تھا۔) (ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی الحمد)

نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

إِنَّ الَّذِينَ يُسَرُّوْنَ وَلَنْ يُشَادَّ
الَّذِينَ أَحَدٌ إِلَّا عَلَيْهِ قَدَدُوا وَ
قَارَبُوا وَأَبْشَرُوا وَاسْتَعِينُوا بِالْعُدْوَةِ
وَالزَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِنَ الدَّلْبَةِ

بلاشبہ دین آسان ہے کوئی شخص دین میں (اپنے آپ پر)
سختی نہ کرے کہ وہ ملے (بدیوں) عاجز کر دے پس
ہر عمل ٹھیک طرح سمجھ لاد اور میا زدی اختیار کر د اور
خوش ہو جاؤ اور صبح و شام اور آخری رات کے کچھ حدیث
اللہ سے مدد طلب کرتے رہو۔ (مشکوٰۃ، کتاب الصلوٰۃ، باب التصدف للعل)

لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کا ایک طبقہ اس میدان میں گھس گیا۔ وہ بھی اس رہبانہ زندگی کے حجاز
کے لئے یہ دلیل پیش کرنے لگا کہ حضور اکرم ﷺ نے نبوت سے چند ماہ پیشتر غار حرا میں گوشہ نشینی
اختیار کر لی تھی اور وہیں آپ پر وحی نازل ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہ زمانہ حضور اکرم ﷺ کی نبوت سے پہلے
کا ہے۔ جو شریعت کا حصہ نہیں ہے۔ علاوہ ازیں جب آپ نے ترک رہبانیت سے متعلق منہ بولا
واضح حکم دے دیا۔ تو پھر اس کے بعد اس مقدمہ سے استدلال کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ پھر کچھ لوگوں
نے زہد اور فقر کے متعلق آیات و احادیث کو غلط فہمی پہنائے اور ان صفات میں انتہا درجہ کا غلو اور
کھینچا تانی کر کے رہبانیت کی راہ ہموار کر لی۔

ان لوگوں کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا کام علم و توجہ اور علم و اختیار و روح و سپر بیچولام ،
رہبانیت کا طریق کار (SPIRITUALISM) سے شروع کرتے ہیں جس طرح ایک مسٹر نیم کا ماہر حال محمول
پرائی تو جہ ڈال کر اس کی روح کو حاضر کرتا اور اس سے کئی طرح کی خبریں حاصل کرتا ہے یا ایک جن نکالنے والا
کچھ آیات قرآنی یا جنتر منتر پڑھ کر جنوں کو حاضر کرتا ہے اور ان کاموں کے لئے پہلے چمکشی اور ریاضت
کی جاتی ہے۔ بعد ازیں یہی طریق ان لوگوں نے اختیار کیا۔ ایسے اعمال و افعال سے تین چیزیں بنیادی حیثیت

رکھتی ہیں۔

① پیکر محسوس، جو غیب کے پردہ میں نہ ہو، جیسے مسمریزم کرنے والے عامل کے سامنے منموں ہوتا ہے اور جن نکالنے والے پیر کے سامنے مریض۔

② توجہ خواہ یہ ظاہری آنکھ کی کشش سے ہو یا قلبی ہو جسے عرف عام میں توجہ، قلبی باؤ، مراقبہ یا ہندی میں گیان دھیان کہتے ہیں اور

③ عزم راسخ یا عقیدہ۔

پیکر محسوس خواہ کوئی جاندار شے ہو یا بے جان۔ جب اس کے متعلق کوئی عقیدہ قائم کر کے مراقبہ کیا جائے گا تو اس کے اثرات حسب پختگی عقیدہ مرتب ہونے شروع ہو جائیں گے۔ ایسے اعمال و افعال سے جہاں انسان نے رُوح کو حاضر کر کے ان سے غیب کی خبریں حاصل کیں۔ وہاں ان سے حسب ضرورت کام بھی لیا۔ انسان کی اس طرح سے حاصل شدہ معلومات کو تصوف کی اصطلاح میں کشف یا مکاشفہ کہا جاتا ہے۔

ریاضت مجاہدہ، چمکشی اور مکاشفات کے ذریعہ انسان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ اس رُوح کی دنیا (عالم ارواح) میں بے شمار قسم کی رُوحیں پائی جاتی ہیں، جو غیر مرنی مخلوق ہیں، مثلاً فرشتے، جن، فوت شدہ انسانوں کی رُوحیں، نیک رُوحیں، شیطانی اور غیبت رُوحیں، سب اس عالم میں پائی جاتی ہیں۔ انسان نے اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق ان رُوحوں کو قابو کرنے کے لئے کئی قسم کے ادراد اور جہتر منتر بھی دریافت کر لئے اور ان کو مسخر کر کے کئی قسم کی شبہ بازیوں کو مٹا کر شروع کیں۔ ایسی رُوحوں کو عام طور پر رجال الغیب کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

دور نبوی میں اس عالم ارواح سے استفادہ کرنے والے مندرجہ ذیل قسم کے گروہوں کا

رجال الغیب سے استفادہ کرنے والے گروہ

پتر چلتا ہے۔

① رہبان۔ جو تارک الدنیا ہو کر جھگوں میں کوئی کٹیا یا خانقاہ بنا کر اس میں مقیم رہا کرتے تھے۔

لے کشف کی حقیقت کے متعلق مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ:

”کشف کوئی ڈھکال نہیں، اگر کافر بھی ریاضت و مجاہدہ کرے تو اس کو بھی ہونے لگتا ہے۔ نیز مجاہدین و مجنونوں، مجذوبوں، دیوانوں، کو بھی کشف ہوتا ہے۔ صاحب شرع اسباب نے لکھا ہے۔ میں نے خود دیکھا۔ ایک مجنون کو اس قدر کشف ہوتا تھا کہ بڑگوں کو بھی نہیں ہوتا تھا۔

لیکن جب اس کا ہل ہوا، تو مادہ کے ساتھ کشف بھی نکل گیا۔“ (اشرف السوانح ص ۲۷، ص ۸۷)

تزکیہ باطن اور دل کو آئینہ بنانے میں مصروف رہتے۔ ان کا اصل مقصد ذات باری کا مشاہدہ کرنا ہوتا تھا۔ وہ لوگوں کو غیب کی خبریں بھی بتلایا کرتے تھے۔ ان کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے، جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

② کاہن — ایسے لوگ چاند کشی ضرور کرتے تھے، لیکن عام آبادیوں میں رہتے تھے۔ ان کا تعلق شیطانِ رحوں سے ہوتا تھا۔ بخاری باب الکھانۃ میں ہے کہ ”کچھ لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا: کاہنوں کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ فرمایا: ان کی باتیں محض لغویں ہیں۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! کبھی تو ان کی بات سچ نکلتی ہے۔ آپ نے فرمایا: ہاں یہ بات وہ ہوتی ہے جو کاہن شیطان سے اڑا لیتا ہے یا شیطان فرشتوں سے اڑا لیتا ہے، پھر وہ اپنے ”ولی“ یعنی دوست کے کان میں چھوٹاتا ہے، تو یہ لوگ اس میں سو جھوٹ ملا لیتے ہیں۔

بخاری و مسلم میں یہ واقعہ بھی موجود ہے کہ مدینہ میں ایک شخص ابن صہامہ نامی کاہن رہتا تھا۔ وہ غیب کی خبریں بتلایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ نے اس سے پوچھا: کیا لوگوں کو ایسا دیتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اس نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو ان پڑھوں کا رسول ہے۔ پھر اس نے حضور اکرم ﷺ سے کہا کیا آپ گواہی دیتے ہیں کہ میں اللہ کا رسول ہوں حضور اکرم ﷺ نے اُسے ٹھوٹکا مارا اور فرمایا: خدا تمہیں تمہاری حد سے آگے نہ بڑھنے دے گا۔ پھر آپ نے پوچھا: اچھا، بتاؤ اس وقت میرے دل میں کیا ہے؟ آپ کو اس وقت سورۃ دخان کا دل میں خیال آیا تھا۔ اس نے کہا: ”دخ“ (یعنی دھواں) اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہ اُسے دجال خیال کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ سے اس کو قتل کرنے کی اجازت بھی طلب کی۔ آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو روک دیا اور فرمایا: کہ اگر یہ دجال ہے تو تیرے ہاتھوں نہیں مارا جائے گا اور اگر یہ دجال نہیں، تو اسے قتل کرنا درست نہیں۔ (بخاری، کتاب اللہ، باب یوم النحر و قہر)

③ جادوگر — ان کا تعلق خاص شیطانی اور خبیث رحوں سے ہوتا تھا۔ یہ لوگ ایسی رحوں کو قابو کر کے

لوگوں کو تنگ کرتے، انہیں نقصان پہنچاتے اور لوگوں میں اپنی ہیبت کا سکہ جھاتے تھے۔ یہ لوگ ان رُوحوں کے فریادِ اشیاء کی ماہیت اور حقیقت تو نہیں بدل سکتے البتہ فضا کو متاثر کرتے اور سببیت ناک بنا دیتے ہیں، چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کرنے والے جادوگروں کے متعلق فرمایا:

سَحَرُوا وَأَعْيَنَ النَّاسَ اِنَّ جَادُوْكَرُوْنَ لَمِنْ خَيْرٍ مِّنْ اَلْمَکْحُوْلُوْنَ عَلٰی مَا کُفِّرُوْا

وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ (۱۱۱) اور اُن کو دہشت ناک کر دیا۔

گویا جادوگروں کی سیماں فی الحقیقت سانپ نہیں بنی تھیں بلکہ لوگوں کو ایسا معلوم ہوتا تھا اور وہ اُن سے ڈر بھی گئے تھے۔

اسی طرح بخاری شریف باب السحر میں واقعہ مذکور ہے کہ لبید بن عامر یہودی نے حضور اکرم ﷺ پر جادو کیا۔ لنگھی سے جھڑے ہوئے سر کے بالوں پر منتر پڑھا، انہیں کھجور کے خوشے کے غلاف میں پیٹ کر دُڑان نامی کنوئیں میں رکھ دیا۔ اس عمل سے کنوئیں کا ماحول اس قدر دہشت ناک ہو گیا تھا کہ جو صحابہ یہ سالن نکالنے کے لئے نیچے گئے۔ اُن کا بیان ہے کہ کنوئیں کا پانی مہندی جیسا سرخ معلوم ہوتا تھا اور کھجوروں کے درخت اتنے مہیب ہو گئے تھے کہ گویا سانپوں کے پھن ہیں۔“

اسلام نے کھانت اور کھر کو تو کفر قرار دیا تھا، لہذا مسلمان باہم اس سے محترز ہے۔ رہبانیت سے بھی منع تو کیا تھا، لیکن اس کے باوجود دیدار

حق کے اشتیاق میں اس پر خطر وادی میں داخل ہو گئے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس دُنیا میں اور ان آنکھوں دظاہری اور باطنی دونوں قسم کی سے دیدار الہی ممکن بھی ہے یا نہیں؟ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَہُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ (۱۱۲) نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے۔

نیز موسیٰ علیہ السلام نے بب دیدار الہی کا اشتیاق فرمایا، تو اللہ نے جواب دیا: ”آپ مجھے ہرگز نہ دیکھ سکیں گے اگر اتنا ہی اشتیاق ہے تو پہاڑ کی طرف دیکھئے اگر یہ اپنی جگہ قائم رہا تو شاید تم مجھے دیکھ سکو۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پر اپنا جلوہ دکھایا تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر زمین بوس ہو گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہو کر گر گئے (۱۱۳)۔“

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر بھی جب دیدار الہی کی تاب نہ لا سکے تو دوسرے کسی کی کیا مجال؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متبعین نے بھی اسی قسم کا مطالبہ کیا، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک ہی کر ڈالا ارشاد باری ہے:

وَإِذْ قُلْنَا لِمُوسَىٰ لَنْ نُّؤْتِيَكَ
لَاكَ حَتَّىٰ نَرَىٰ اللَّهَ جَهْدَةً فَأَخَذَتْكُمُ
الصَّعِيقَةُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ثُمَّ
بَعَثْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ (۵۸-۵۹)

اور (۱۰ یہود) جب تم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہم اس وقت تک تمہاری بات نہ مانیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کو آنکھ مار نہ دیکھ لیں، تو تمہیں کرکڑ نے آدھو چاؤ تم دیکھ رہے تھے۔ پھر ہم نے تمہاری موت کے بعد تمہیں زندہ کیا۔

اب احادیث کی طرف آئیے صحیح مسلم میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ان الفاظ میں ملتا ہے:

عَبَابُهُ الشَّوْرُ لَوْ كَشَفَهُ لَأَحْرَقَتْ
سَبْعَاتُ وَجْهِهِ مَا أَنْتُمْ إِلَيْهِ
بَصَرُهُ مِنْ خَلْقِهِ (مسلم کتاب الامار)

اللہ کا حجاب نور ہے۔ اگر وہ اس حجاب کو ہٹا دے تو اس کے چہرے کے انور سے وہ ساری مخلوق جل کر رہ جائے گی۔

حضور اکرم ﷺ کے متعلق گویا بعض علماء نے اختلاف کیا ہے اور کہتے ہیں کہ آپؐ نے معراج کی رات اللہ تعالیٰ کا دیدار فرمایا تھا۔ لیکن اس مسئلہ میں قطعی فیصلہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وہ حدیث ہے، جو امام بخاری کتاب التفسیر سورۃ البقرہ کے تحت لائے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا: کیا حضور اکرم ﷺ نے اپنے پروردگار کو دیکھا تھا؟ انہوں نے کہا تیری اس بات پر میرے روتیں کھڑے ہو گئے۔ تین باتیں جو شخص بھی بیان کرے وہ جھوٹا ہے۔ جو کوئی تمہارے یہ کہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اللہ کو دیکھا، اُس نے جھوٹ بولا۔ اس کے بعد یہ آیت پڑھی لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ إِلَى الْآخِرِ

البتہ بخاری کتاب التوحید میں یہ صراحت موجود ہے کہ قیامت کے دن سلمان اللہ تعالیٰ کو ایسے دیکھ سکیں گے جیسے اس دنیا میں چاند کو دیکھتے ہیں اور انہیں کوئی اڑچن محسوس نہیں ہوگی۔ گویا دیدار الہی آخری زندگی میں ممکن ہے اس زندگی میں نہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس دنیا میں دیدار الہی ممکن ہی نہیں تو یہ لوگ کس بات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور کیوں پڑے ہوئے ہیں؟ پھر جو یہ لوگ دیدار الہی سے مشرف ہونے کا دعوے کرتے ہیں تو اس کی کیا حقیقت ہے؟ اس سوال کے جواب سے پیشتر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تجلی ڈالنے، ہمکلام

ہونے یا وحی بھیجنے سے دونوں یقینی طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان اس میں لذت حقیقی محسوس کرتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ جب حضرت موسیٰ ﷺ سے ہمکلام ہوئے تو صرف اتنا پوچھا کہ موسیٰ! تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ تو حضرت موسیٰ ﷺ نے اس مختصر سے سوال کا اچھا خاصا المبا جواب دیا۔ کیونکہ حضرت موسیٰ ﷺ ان لذت کے لمحات کو طویل سے طویل تر بنانا چاہتے تھے۔ یا جب حضور اکرم ﷺ پر کچھ عرصہ کے لئے وحی رک جاتی، تو آپ بے قرار رہتے اور جبرائیل ﷺ کا انتظار کرتے رہتے تھے۔

اور دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی طبیعت پر خاصا بوجھ پڑتا محسوس ہوتا ہے جو بعض دفعہ ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔ جیسے حضرت موسیٰ ﷺ تنہی کو برداشت نہ کر سکے اور بیہوش ہو گئے اور پہاڑ تو خیر، ریزہ ریزہ ہی ہو گیا تھا۔ اسی طرح حضور اکرم ﷺ پر ایک دفعہ سفر میں وحی نازل ہوئی تو اس بوجھ کا اثر اتنا شدید تھا کہ آپ کی اونٹنی بھی زمین پر بیٹھ گئی۔ اور بعض دفعہ تو آپ کو نزل وحی کے وقت پسینہ تک آجاتا تھا پہلی دفعہ جب غار حرا میں آپ پر وحی نازل ہوئی تو اس وقت اتنا شدید بوجھ محسوس کر رہے تھے کہ گھرا کر لیٹ گئے اور حضرت خدیجہ رحمہا ﷺ سے فرمایا: زَمِّلُونِي زَمِّلُونِي (مجھ پر چادرو! اور چادرو! مجھ پر چادرو! اور چادرو!)

اب یہ بزرگ یا اولیاء جو مشاہدہ حق یا ہمکلام ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو ان میں اور انبیاء میں جو بنیادی فرق ہے وہ یہ ہے کہ:

دیدارِ الہی یا شیطانی فریب

انبیاء کے ساتھ جو واقعہ پیش آتا ہے وہ نبی بر حقیقت ہوتا ہے، لیکن دوسروں سے جو ایسے واقعات پیش آتے ہیں وہ بسا اوقات شیطانی فریب کے سوا کچھ حقیقت نہیں رکھتے جیسا کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اپنے کشف کا ایک ذاتی واقعہ ارشاد فرماتے ہیں:

”ایک مرتبہ ایک عظیم الشان روشنی ظاہر ہوئی۔ جس سے آسمان کے کنارے بھر گئے۔ اس سے ایک صُوت ظاہر ہوئی۔ اُس نے مجھ سے خطاب کر کے کہا کہ ”اے عبدالقادر! میں تمہارا رب ہوں میں نے تمہارے لئے سب محرمات حلال کر دیئے۔“ میں نے کہا: ”دُور ہو مر دود!“ یہ کہتے ہی وہ روشنی ظلمت سے بدل گئی اور وہ صُوت دھواں بن گئی۔ اور ایک آواز آئی کہ ”اے عبدالقادر! خدا نے تم کو تمہارے علم و تقویٰ کی وجہ سے بچالیا۔ ورنہ اس طرح میں تیرے جیسے ستر صفویوں کو لگوارہ کر چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”محض اللہ کی مہربانی سے۔“ کسی نے کہا کہ ”حضرت! آپ کیسے سمجھے کہ یہ شیطان ہے؟“ فرمایا: ”اس کے کہنے سے کہ میں نے

حرام چیزوں کو تمہارے لئے حلال کر دیا۔“ (الطبقات البکری للشرانی، ج ۱، ص ۱۳۰، و طبقات الحافظ ابن حجر بکوال تاریخ دعوت و عزیمت جلد ۱، ص ۱۳۰، مصنف ابو الحسن علی ندوی)

دوسرا فرق یہ ہے کہ انبیاء پر ایسے اوقات میں بوجھ تو پڑتا ہے اور لذت بھی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن ان پر نوعیت کا عالم دہے تصوف کی اصطلاح میں شکوہ کہتے ہیں طاری نہیں ہوتا۔ وہ اپنے حواس کو میٹھتے ہیں، کیونکہ وہ ماعلان اللہ تعلقے ہیں، لیکن یہ بزرگ حضرات عموماً ایسے مواقع پر ہوش و حواس کو کمر بستہ ہی غلط سبط باتیں بھی کہہ جاتے ہیں جو شریعتِ مطہرہ کے سراسر خلاف ہوتی ہیں اور جن کا بسا اوقات بعد میں انہیں خود بھی افسوس ہوتا ہے اور ایسے واقعات بے شمار ہیں۔

پھر یہ بات تو کتابِ مہنت کی نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہے کہ وحی الہی کا سلسلہ رسول اللہ ﷺ کے بعد منقطع ہو چکا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی ثابت شدہ ہے کہ اس دنیا میں یدِ ابراہیمی ممکن نہیں۔ اب جو کچھ حضرات دیکھتے ہیں یا جن سے ہم کلام ہوتے ہیں وہ رجال الغیب ہی ہو سکتے ہیں۔ شریعت کی رو سے اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت نظر نہیں آتی یہی رجال الغیب ان متصفین سے ہم کلام ہوتے ہیں اور یہی اپنی نجیات سے نوازتے ہیں اور ہمارے اس دعوے کی قوی دلیل پیرانِ پیر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا وہ اقتباس ہے جسے ہم اوپر بیان کرتے ہیں اور جس کی تفصیل آگے چل کر بیان ہوگی۔

حضرت موسیٰ ﷺ پر تمہلی کے وقت جو بیہوشی طاری ہوتی (حالانکہ آپ نے اس حالت میں کوئی نازیبا بات بھی نہیں کہی) تو اس کی وجہ محض یہ تھی کہ ان کا یہ مطالبہ رضائے الہی کے خلاف تھا۔ ورنہ یہ صورتِ حال کبھی پیش نہ آتی۔ اور تاریخِ انبیاء میں صرف یہی ایک استثنائی واقعہ ہے۔ جبکہ ہمارے صوفی اور رہبان ہر وقت ایسے مناسکے ایزدی کے خلاف واقعات کی جستجوئیں لگے رہتے ہیں اور اگر کچھ بن نہ پڑے تو فخل سماع و قفس منتقد کے اپنے آپ پر مصنوعی قسم کے وجد و حال کو مسند کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جو بذاتِ خود ایک غیر شرعی فعل ہے یہ مصنوعی وجد و حال اور سماع وغیرہ ایسے نمود کے ابطال کی دوسری دلیل ہے۔

ایسی راہبازہ زندگی اختیار کرنے سے شریعت کے کن کن احکامات پر زور پڑتی ہے۔ یہ تو ہم کسی دوسرے مقام پر جائزہ لیں گے۔ سرِ دست ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ان بزرگوں کے مشاہدات و مکاشفات میں کچھ حقیقت بھی ہے یا نہیں؛ اور اگر ہے تو وہ کس قدر ممکن ہے؟

جس طرح انسان کی عقل ایک محدود دائرہ میں کام کر سکتی ہے، بعینہ یہی حال اس کے وجدان اور قلبی واردات کا بھی ہے۔ پھر جس

کشف و مشاہدہ کی حقیقت

لے صوفیہ نے اپنی اصطلاح میں شطیحات اور علما، ایسی باتوں کو مہفوات سے تعبیر کرتے ہیں۔

طرح ہر انسان میں عقل کم اور زیادہ ہوتی ہے۔ ایک عقلندہ کسی واقعہ سے جو نتیجہ نکالتا ہے ایک کم عقل یا بیوقوف کی سوچ اس کے الٹ نتائج اخذ کرے گی یا مبہوت رہ جائے گی۔ یہی حال وجدان کا بھی ہے۔ علاوہ ازیں عقل کی کارکردگی میں انسان کے اپنے میلانات، تصورات اور تجربات کو بھی دخل ہوتا ہے۔ بعینہ اسی طرح وجدان یا کشف پر بھی صاحب کشف کے میلانات اور رجحانات کا کافی اثر ہوتا ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ ہر صاحب کشف کے رجحانات اور میلانات بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ لہذا سب لوگوں کے کشف میں بھی یکسانیت اور اتفاق ناممکن ہے اور ان سے محض ظنی مسلم ہوتا ہے۔ جو صرف صاحب کشف کو تو شاید کسی حد تک مطمئن کر سکتا ہو۔ دوسرے لوگوں کو اس کا قائل نہیں کر سکتا۔ ان کے پاس ان کے اپنے رکاشات ہوتے ہیں جو اس سے الگ نوعیت کے ہوتے ہیں۔

اس کی مثال نیوں سمجھئے، جیسا کہ مشہور کہانی ہے کہ ایک دفعہ چار اندھے ہاتھی کا ملاحظہ و مشاہدہ کرنے گئے۔ ظاہر ہے کہ وہ دیکھ تو نہ سکتے تھے۔ ٹٹول کر اندازہ ہی لگا سکتے تھے کہ ہاتھی کیا ہوتا ہے۔ ایک نے اس کی ٹانگوں پر ہاتھ پھیر کر اندازہ لگایا۔ دوسرے نے ہاتھ اونچا کر کے اس کے پیلوپر ہاتھ پھیرا۔ تیسرے نے اس کے کان پر ہاتھ پھیرے اور چوتھا اس کی ٹونڈ ملاحظہ کر رہا تھا۔ اب جو اپنے اپنے ملاحظات کے نتائج پیش کرنے بیٹھے، تو ٹانگوں پر ہاتھ پھیرنے والے نے کہا کہ ہاتھی تو ٹھم یا ستون کی مانند ہوتا ہے۔ پیلوپر ہاتھ پھیرنے والے نے کہا کہ تو غلط کہتا ہے، ہاتھی تو پہاڑ کی مانند تھا۔ تیسرے نے کہا کہ ہاتھی تو چھانچ کی مانند ہے اور ہر دم متحرک چیز ہے اور تم دونوں غلط کہتے ہو۔ چوتھے نے کہا کہ تم سب غلط کہتے ہو، ہاتھی تو خدا اور چکرا ہوتا ہے۔ اب ان اندھوں میں سے ہر ایک کا یہی تکرار تھا کہ اُس کا ملاحظہ صحیح ہے باقی سب کچھ غلط ہے۔

دین طریقت کے مختلف نظریات

بعینہ یہی صورت حال ان مشاہدین حق کی ہے۔ وہ اندھے اس لحاظ سے ہیں کہ نصوص شرعیہ سے یہ ثابت ہے کہ اس ذات باری کا اس دنیا میں نہ تو دیدار ممکن ہے اور نہ ہی کوئی اُس کی کنہ کو پا سکتا ہے۔ مگر یہ حضرت بضد ہیں کہ ہم ضروریہ ملاحظات و مشاہدات کر کے رہیں گے۔ پھر جس طرح ان اندھوں میں تکرار اور جھگڑا ہوا بعینہ یہی صورتحال یہاں بھی پیدا ہوگئی۔ ایک نے کہا کہ میں خدا کے اتنا قریب ہو گیا کہ بالآخر ہم دونوں ایک ہو گئے۔ دوسرے نے کہا کہ میں جذب و متی میں انسا منہمک ہوا، اور آتش عشق اتنی تیز بھڑکی کہ خود خدا اپنے نبی اتر کر میرے جسم میں اتر گیا۔ پھر میں ہی خدا تھا۔ تیسرے نے کہا کہ تم دونوں غلط کہتے ہو، بھلا خدا کوئی مخصوص جسم ہے

جس میں تم مدغم ہو گئے تھے۔ یا وہ تمہارے جسم میں داخل ہو سکے۔ وہ تو ہر شے میں پہنچے ہی سے موجود ہیں اور ہر چیز میں داخل ہے۔ ہر چیز خدا کی ذات کا حصہ ہے۔ چوتھے نے کہا تم سب غلط ہو۔ خدا توفی اللواحق ایک الگ سستی ہے تاہم یہ کائنات کی جملہ اشیاء اس کا لباس مجاز ہیں۔ یہ ہیں وہ مختلف نظریات جو اس دین طریقت کے مختلف اعیان نے پیش کئے اور جن کا تفضیلی جائزہ ہم الگ باب میں لیں گے۔

اس خود ساختہ دین طریقت کے پیروکاروں میں شدید اختلافات ہیں، رفاہی کہتا

دین طریقت کے پیروکاروں میں تکرار و اختلافات

ہے، قادری غلط ہے۔ قادری کہتا ہے رفاہی کے پاس کچھ نہیں۔ ایک کہتا ہے میرے پیر نے حضرت عزرائیل علیہ السلام سے ارواح کی زمیں چھین کر سب ارواح کو ان کے جسموں میں داخل کر دیا۔ دوسرا کہتا ہے میرا پیر جہنم کے پاس سے گزرا اور اس نے اپنی پھونک سے اسے بھانا چاہا مگر درمیان میں فرشتے حاضر ہو گئے۔ عبد دوسی کا ایک مرید کہتا ہے :

الْعَبْدُ دُوسِي كَانَ يُحْيِي مِنَ الْمَوَاتِ مَنْ قَدْ مَاتَ دَهْرًا

(ترجمہ) عبد دوسی ایسے مردوں کو زندہ کر دیتے، جن کو مرے ہوئے عرصہ گزر گیا ہے (اردو ترجمہ غایۃ الامانی ص ۳۴)

ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ جس طرح عقل نے وحی سے بے نیاز ہو کر بے شمار ٹھوکریں کھائیں اور امت میں افتراق و انتشار کا باعث بنتی رہی ہے۔ اس طرح کشف و وجدان نے بھی وحی الہی سے علیحدہ ہو کر ٹھوکریں ہی کھاتی ہیں اور انتشار ہی کا بیج بویا ہے۔ طریقت کے سینکڑوں سلسلے چل سکے جن کے طریقہ کار کا آپس میں اختلاف ہے (مز تفضیل کے لئے دیکھئے، دائرۃ المعارف الاسلامیہ ج ۱۲، زیر عنوان طریقت) آخر میں ہم اس مشاہدہ الہی کے امکان کی بحث کو مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی، جو صوفیہ کی کائنات کے درخشندہ آفتاب ہیں، کے فیصلہ پر ختم کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں :

”کشف سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے، وہ شہود ہی شہود ہے اور تحقیقت نہیں بلکہ غایت فی الباب یہ ہے کہ خدا کا شہود ہو ہی نہیں سکتا۔ پس ایمان بالغیب کے سوا چارہ نہیں۔“ (مختوبات دفتر ثانی، کتاب ۱، ج ۱، بحوالہ مبداء الف ثانی کا نظریہ توحید، از عبدالمکرم انصاری ۱۹۵ء)

اہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ اس رہبانیت یا دین طریقت کے

دین طریقت کے نقصانات اور معاشرہ پر اثرات

وہ کون سے مُضر اثرات ہیں جن کی بنا پر شریعتِ مطہرہ نے اسے ناپسند فرمایا ہے؟ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب کبھی رہبانیت کا دور دورہ ہوا تو :

۱۔ معاشرہ میں جو لوگ خدا ترس قسم کے تھے۔ وہ اپنی اس غلط روش کی بنا پر معاشرتی ذمہ داریوں اور دوسرے انسانی تعلقات سے ایک طرف ہو گئے تو اس سے اخلاق و تمدن، معاشرت، معیشت، سیاست اور اجتماعیت کی جڑیں ہل گئیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی زمام کار عیار اور ناخدا ترن آدمیوں نے سنبھال لی۔ دنیا میں "فساد فی الارض" کا دور دورہ ہو گیا اور خدا کے پیچھے ہونے پرینام ہدایت اور ضابطہ حیات کی انہی "بزرگانِ دین" کے ہاتھوں بیخ کنی ہوئی۔

۲۔ راہبوں کی اس روش کا دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ عام لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ دین اور دنیا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ دین یا مذہب تو محض پوجا پاٹ اور گیان دھیان کا نام ہے اور مذہب کا تعلق بس اسی حد تک ہے۔ رہا دنیا کا روبرو تو اس میں ہر شخص آزاد ہے معاشرتی تعلقات یا ضابطہ اخلاق کی اگر کچھ اہمیت ہوتی تو یہ خدا رسیدہ لوگ اس سے کیوں منہ موڑ لیتے۔ پھر چونکہ ان راہبوں کی روش شریعتِ الہیہ کے احکام سے متصادم ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب کا شیرازہ پارہ پارہ ہو گیا۔

۳۔ خدا کے حضور میں عبادت، عاجزی اور تذلل اور زہد و تقویٰ محمودہ صفات ہیں، لیکن ان راہبوں نے ان صفات میں اس قدر غلو کیا اور انکارِ ذات اور خود شکنی اتنے جوش سے کی کہ خود نگری اور خود شناسی، جو قومی زندگی کے لئے روحِ رواں ہے، ایک جُرم سمجھا جانے لگا۔ انسان کو اپنی انسانیت سے شرم آنے لگی۔ وہ اپنی ترقی انسانیت میں نہیں، بلکہ ترکِ انسانیت میں سمجھنے لگا۔ وہ انسان جس کو خدا نے احسن تقویم پر پیدا کیا۔ اور اشرف المخلوقات بنا کر باقی کائنات اس کے لئے مسخر کر دی تھی۔ وہ اس قد بے اعتماد، افسردہ اور دل شکستہ ہو گیا کہ با اوقات حیوانات اور جمادات پر بھی رشک کرنے لگا اور ان چیزوں کو اپنے آپ پر ترجیح دینے لگا۔

۴۔ اور چوتھا اثر یہ ہوا کہ معاشرہ میں باقی لوگ جن میں کچھ خدا ترسی اور دینداری کے اثرات پائے جاتے تھے۔ انہوں نے بھی ان راہبوں، اور پیر و پل فقیروں کے آتانوں کا رخ کر لیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مسجدیں آہستہ آہستہ ویران ہونے لگیں اور خانقاہوں، مزاروں اور آستانوں کی رونق بڑھنے لگی۔

اسلام اور رہنمائی

چهار ترک اور ارشادات نبویؐ

انہی بیان کردہ مفاسد کی بنا پر اسلام نے رہبانیت کو مذموم قرار دیا ہے۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ جس طرح نفس کی خواہش کے خلاف راہب لوگ بدن کو بھوکوں اور فاقوں سے مارتے، اور ساری ساری استقامت فرماتے ہیں۔ اس سلسلہ میں شریعت ہماری کیا رہنمائی کرتی ہے بخاری، کتاب الصوم، باب حق الاجل فی الصوم میں مخرج ذیل حدیث ملاحظہ فرمائیے :

انہوں نے عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے سنا، انھیں رضی اللہ عنہما
کو بیچہ پہنچ گئی کہ میں لگانا روکنے رکھنا چاہوں اور اس
بھر نماز پڑھا کرتا ہوں، یا تو آپ نے مجھے بلایا، یا میں خود
آپ سے ملا آپ نے فرمایا: ”مجھ کو خبر پہنچی ہے کہ تو
روکنے رکھتا ہے اور افطار نہیں کرتا اور نماز پڑھ جاتا ہے
ایسا کہ روزہ رکھ اور افطار بھی کر۔ قیام بھی کر اور سو بھی کیونکہ
تیری آنکھوں کا بھی مجھ پر حق ہے۔ تیری جان کا بھی تجھ پر حق
ہے اور تیری بی بی بال بال بچوں کا بھی تجھ پر حق ہے۔ میں نے
عزم کیا۔ مجھ میں اس سے زیادہ طاقت ہے۔ آپ نے
فرمایا کہ حضرت اؤدہ رضی اللہ عنہ کا روزہ رکھ ”میں نے پوچھا،
وہ کیا ہے؟ فرمایا: ”وہ ایک دن روزہ رکھتے ایک دن افطار
کرتے اور دشمن کے مقابلہ میں نہ بھاگتے۔ میں نے کہا:

۱۔ ان الفاظ میں واضح اشارہ ہے کہ مسلسل روزے انسان کو تائیف کر دیتے ہیں کہ جہاد فی سبیل اللہ کے قابل نہیں ہوتا، گویا اس حدیث سے رہبانیت یا تصوف کے دو نظریات بدو و پرقی ہے (۱) نفس کشی اور بدن کو تائیف و تزار بنانے پر اور (۲) صوفیوں کے اس نظریہ پر کہ جہاد فی سبیل اللہ سے نفس کا جہاد افضل ہے۔ یہ نظریہ بھی اپنے مقام تفصیل سے پیش کیا جائے گا۔

مولانا اشرف تھانوی مجاہدہ کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

نفس کے مطالبات و دقلم کے ہوتے ہیں۔ ایک حقوق، دوسرے حقوق۔ حقوقِ دہ میں جن سے قوامِ بدن اور بقائے حیات اور حقوقِ دہ میں جو ان سے زائد ہوں۔ مجاہدہ کی صریح صکت یہ ہے کہ حقوق کا خیال رکھا جائے اور صرف حقوق کو ترک کیا جائے۔

یا رسول اللہ! اس بات کی میری طرف سے کون فترہ داری
 لے سکتا ہے۔ عطا کہتے ہیں، میں نہیں جانتا کہ ہمیشہ روزہ
 رکھنے کی نسبت اس حضرت ﷺ نے کیا کچھ فرمایا، بس
 اتنا جانتا ہوں کہ آپ نے دوبار فرمایا: جس نے ہمیشہ روزہ
 رکھا، اس نے روزہ نہیں رکھا۔“ (ترجمہ: علامہ وحید الزمان)

وَلَا يَفِرُّ إِذَا لَاقَ قَالَ مَنْ لِي
 بِهَذَا يَا نَبِيَّ اللَّهِ! قَالَ عَطَا
 أَدْرِي كَيْفَ ذَكَرَ صِيَامَ الْأَبَدِ
 قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
 لَأَصَامَ مَنْ صَامَ الْأَبَدَ مَرَّتَيْنِ

یہ حدیث بخاری میں کئی طرح سے مذکور ہے ایک روایت میں تیرے بدن اور تیرے مہانوں
 کا بھی حق ہے۔ (باب حق الضیف) کے الفاظ زیادہ ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ
 نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کو دائمی روزہ سے منع فرمایا، تو انہوں نے جواب دیا کہ مجھ میں روزہ
 رکھنے کی طاقت ہے، تو پہلے آپ نے فرمایا کہ اچھا تم مہینے میں تین روزے رکھ لیا کرو، خدا کس گنا
 اجر دیتا ہے، تو تیرہارے پورے مہینے کے روزے ہو جاتیں گے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ
 نے دوبارہ کہا کہ مجھ میں اس سے زیادہ طاقت ہے۔ پھر آپ نے فرمایا: اچھا حضرت داؤد
 ﷺ کی طرح ایک دن روزہ رکھو۔ دوسرے دن افطار کرو اور آخر میں فرمایا: کہ جو دائمی روزہ رکھتا ہے
 اس کا کوئی روزہ نہیں۔“ (کیونکہ وہ میری سنت کی مخالفت کرتا ہے)۔

اب بخاری کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح کی درج ذیل روایت بھی ملاحظہ فرمائیں :
 عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ
 عَنْهُ يَقُولُ: جَاءَ ثَلَاثَةٌ رَهْطٌ
 إِلَى بَيْتِ أَبِي رَاحٍ النَّبِيِّ
 صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْأَلُونَ عَنْ
 عِبَادَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
 فَلَمَّا أَخْبَرُوا أَنَّهُمْ تَقَالَوْهَا
 فَقَالُوا: وَآيِنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ
 صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ غُفِرَ لَهُ
 مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَمَا تَأَخَّرَ

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: تین آدمی حضور
 اکرم ﷺ کی بی بیوں کے گھر آئے حضرت علی، حضرت
 عبداللہ بن عمرو، اور حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہم
 آنحضرت ﷺ کی عبادت کے متعلق پوچھتے تھے۔
 جب انہیں بتلایا گیا، تو انہوں نے گویا حضور اکرم ﷺ
 کی اتنی عبادت کو کم سمجھا اور کہنے لگے کہاں ہم اور کہاں
 حضور اکرم ﷺ جن کے پہلے اور پچھلے سب گناہ معاف
 کیے جا چکے ہیں (یعنی ہم ان سے زیادہ عبادت کئی چاہئے)
 پھر ایک نے کہا: میں ہمیشہ رات بھر نماز پڑھوں گا، دوسرے

نے کہا: میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور کبھی روزہ نہ چھوڑوں گا۔
اور میرے لئے کہا: کہ میں ہمیشہ عورتوں سے کندہ کش رہوں
گا اور کبھی نکاح نہ کروں گا۔

اتنے میں حضور اکرم ﷺ تشریف لے آئے اور ان
لوگوں سے پوچھا: کیا تم نے یہ باتیں کی ہیں؟ خدا کی قسم!
میرے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور پرہیزگار ہوں،
اس کے بعد جو دس روزہ رکھتا بھی ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں
رات کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے
نکاح بھی کرتا ہوں، تو جو کوئی میری سنت کو ناپسند کرے
اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔

قَالَ أَحَدُهُمْ: أَمَّا أَنَا فَأَصَلْتُ
اللَّيْلَ أَبَدًا وَقَالَ آخَرُ أَنَا أَصُومُ
الدَّهْرَ وَلَا أَفْطِرُ وَقَالَ آخَرُ أَنَا
أَعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلَا أَتَزَوَّجُ أَبَدًا
فَجَاءَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ فَقَالَ: "أَنْتُمْ أَلَدَيْنَ قُلْتُمْ كَذًا
وَكَذًا" أَمَّا وَاللَّهِ إِنِّي لَأَخْشَاكُمْ لِلَّهِ
وَأَتَقَاهُمْ لَهُ لَكِنِّي أَصُومُ وَأَفْطِرُ وَ
أُصَلِّي وَأَرْقُدُ وَاتَزَوَّجُ النِّسَاءَ مَنْ
رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي

ان احادیث سے صاف واضح ہے کہ:

۱۔ مجھ زندگی گزارنا، مدد شرعی زندگی سے گریز (تاکہ کیسوی سے عبادت کی جائے) بدن کو فاقوں مار کر
تزکیہ نفس کرنا، اور عبادت خواہ کیسی ہی افضل کیوں نہ ہو، اس میں سنت نبوی سے آگے بڑھنا، یہ باتیں شریعت
مطہرہ کے خلاف ہیں۔ اگر صرف یہی چیزیں رہبانیت سے نکال دی جائیں، تو رہبانیت کی عمارت از خود
زمین بوس ہو جاتی ہے۔

۲۔ حضور اکرم ﷺ نے سنت کی آخری حد سے مطلع فرمادیا۔ اب جو شخص زہد، تقویٰ و عبادت کے
میدان میں حضور اکرم ﷺ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرے گا۔ وہ بدعت و فضالت اور کفر ہی ہو گا۔ یہ بات
یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بدعت ہمیشہ نیک ارادوں اور ثواب کی نیت سے ہی شروع کی جاتی ہے۔
۳۔ سنت کا نازک گنہگار ہونا ہے، لیکن سنت سے زیادہ عمل کرنے والا، جو شریعت کی حدود کو کم سمجھ کر
اس میں اضافہ کر رہا ہے۔ وہ بدعتی، گمراہ اور گمراہ کنندہ ہے۔ بعد میں جو لوگ اس بدعت پر عمل پیرا ہوں گے جتنے
صدی اس کا گناہ بدعت جاری کرنے والے کو بھی پہنچا رہے گا۔

رہبانیت میں شریعت کی وجوہات

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ایسے واضح احکام کی موجودگی میں رہبانیت نے اسلام میں کیسے راہ پائی۔ آخر

رہبانیت میں وہ کیا کش اور جاہانیت ہے کہ شرعی احکام و حدود کو پھلانگ کر لوگ اس میں جا داخل ہوئے؛ یہ کہنا سراسر غلط ہو گا کہ قرآن و حدیث میں زندہ اور دنیا سے بے غبتی کے بارے میں جو ارشادات پاتے جاتے ہیں۔ وہ رہبانیت کی بنیاد ہیں۔ کیونکہ ان ارشادات کو سمجھنے والے سب سے پہلے حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے۔ لیکن ان میں ایسی رہبانیت کا کوئی اثر نہیں پایا جاتا۔ بلاشبہ دنیا اور اس کے مال و اسباب سے بے غبتی دین کا ایک حصہ ہے، لیکن یہ پورا دین نہیں۔ معاشرتی، معاشی اور عالمی حقوق کی ذمہ داریاں، جو زندگی کا نہایت ہی اہم حصہ ہیں، ان بھی ارشادات سے ساقط نہیں ہو سکتیں۔

رہبانیت کو اختیار کرنے کے اسباب کچھ اور بھی ہیں، جو ہمارے خیال کے مطابق درج ذیل ہیں:

اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ دنیا کے جھیلوں میں چھن کر کبھی کیسوی کے ساتھ روحانی ترقی

۱۔ روحانی ترقی یا آئینہ باطن کی صفائی

نہیں کی جاسکتی۔ ان کے خیال میں روحانی ترقی کا کوئی ایسا راستہ نہیں، جو دنیا کے اندر سے ہو کر جاتا ہو، لہذا درویش و عجم کے لوگوں نے اسے نیکی سمجھ کر اختیار کر لیا۔ جب کہ اسلام نے ایسی روحانی ترقی اور رہبانیت ہی کو مردود قرار دیا ہے۔ اسلام صرف ایسی روحانی ترقی کا قائل ہے جس کا راستہ دنیا کے اندر سے ہو کر آگے بڑھتا ہو۔ یہ روحانی ترقی تھوڑی ہو یا بہت، سب کچھ مقبول ہے، لیکن شریعت کی حدود کے اندر رہ کر ہونی چاہئے۔ اگر کوئی مسلمان زندگی کی بنیادی اور اہم ذمہ داریوں یا عبادات کو پس پشت ڈال کر ایسی روحانی ترقی کرتا ہے، تو اس کی حیثیت ہندو جوگیوں اور سادھوؤں سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی اور ایسی رہبانیت کو اسلام نے مردود قرار دیا ہے۔

یہ روحانی ترقی خواہ شرعی طریق سے ہو یا غیر شرعی طریق سے نتیجہ انسان کا دل آئینہ کی مثل بن جانا

لے زندہ اور رہبانیت (تصوف) میں فرق؛ اگر ہر ایک اسلامی عقیدہ ہے اور اس سے مراد اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ دنیا کی محبت کو دل میں جاگزیں نہ ہونے دیا جائے۔ عیب کی بات حصر لایا نہیں بلکہ حُجَّتِ نیا ہے، لیکن تصوف کا زہد یہ ہے کہ نفس کو اذیتوں سے بھکاریا جائے لوگوں سے الگ تھک رہ کر اور دنیوی تعلقات سے منور ہو کر مجاہدہ، ریاضتوں اور چنگیزی میں مشغول رہا جائے تاکہ عیب کے پردوں سے کشف حاصل ہو۔ یہ تصوف فلسفہ ہی کی ایک شکل ہے جس کا دھرم یا انبیاء کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ فلسفہ اسلام سے مذکور پہلے ہندوستان اور ایران میں پایا جاتا رہا ہے۔ اس فلسفہ کا حاصل یہ ہے کہ کائنات میں صرف اللہ کا وجود ہے۔ ہر چیز خدا ہے۔ انسان بھی خدا ہے اور خدایہ انسان ہے۔ پھر اس کشفی عقیدہ نے کئی صورتیں اختیار کی ہیں۔ جن کا تفصیلی ذکر آئندہ اس کتاب میں آئے گا۔

ہے۔ ایسے لوگ جب توجہ کریں تو اپنے مخاطب کے احوال سے کسی نہ کسی حد تک مطلع ہو جاتے ہیں۔ یہی ان کی غیب دانی اور کرامت ہوتی ہے، جو عوام کے لئے بڑی باعث کشش ہوتی ہے۔ اس طرح ان لوگوں کو عوام پر حکومت کرنے، اُن پر دھاک بٹھانے اور خدائی منوالے کا ایسا موقعہ ہاتھ آ جاتا ہے۔ جو عام حالات میں ناممکن ہوتا ہے اور ذیوی منفعت کے لحاظ سے ان کی دکان ایسی چمکتی ہے۔ جو عام حالات میں ان کی ریاضت و مجاہدہ سے بدرجہا زیادہ محنت اور جدوجہد کا تقاضا چاہتی ہے۔ اسی حقیقت کو علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

خداوند اتیرے یہ سادہ دل بندے کہ ہر جائیں کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطان بھی عیاری
جس طرح سلطان لوگوں سے اپنے مالی حقوق ٹیکسوں کی صورت میں وصول کرتے ہیں۔ یہ لوگ
نذر و نیاز اور چڑھا دوں کی صورت میں وصول کرتے ہیں، بلکہ اس لحاظ سے پیر فقیر سلطان سے بڑھ
جانتے ہیں کہ سلطان کی حکومت تو محض اجسام پر ہوتی ہے، لیکن یہ لوگ دلوں پر اپنی دھاک بٹھاتے ہیں۔
اسی صفائی قلب کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ لوگ عالم ارواح
۲۔ **کشف و مشاہدات** | یا رجال الغیب سے اپنا تعلق قائم کرتے، چاند کشی کے ذریعہ

انہیں قابو میں لاتے، قبروں پر متکلف ہو کر صاحبِ قبر کی رُوح یا اس کے متماثل کسی رُوح سے ملاقات
کرتے، ان کے احوالی معلوم کرتے اور غیب کی خبریں حاصل کر کے لوگوں کو بتلاتے ہیں۔ اگرچہ ان میں
بیشتر کام شیطانی قسم کے ہوتے ہیں، لیکن عوام کیا، خواص میں بھی اتنی تمیز نہیں ہوتی کہ وہ اس حقیقت کو
سمجھ سکیں۔ یہ مقام انہیں عوام میں اور بھی زیادہ پروقا اور پُرہیبت بنا دیتا ہے۔

۳۔ **مشاہدہ حق** | یہ بات ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ ان لوگوں پر کچھ نہ کچھ تجلّی ہوتی ضرور ہے
خواہ وہ شیطان ہی کی طرف سے کیوں نہ ہو اور اس تجلّی میں کیفِ مِسْرور بھی
ہوتا ہے بعض لوگ اس مستی کی کیفیت کے حصول کے لئے بھی یہ راستہ اختیار کرتے ہیں۔ پھر اس
کیفیت کے حصول کے لئے اتنے یتاب ہو جاتے ہیں کہ سماعِ دُقس جیسے مصنوعی طریقوں سے اپنے
آپ پر یہ کیفیت طاری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۴۔ **معاشرتی ذمہ داریوں اور شرعی تکالیف سے نجات** | یہ لوگ چونکہ اپنے آپ کو خود
بھی خدائی صفات کے حامل

لے آج کے ماہرین علم النفس (PSYCHOLOGISTS) نے پینائٹزم سے تیسرے کرتے ہیں۔

اور کوئی بالآخر حقوق سمجھنے لگتے ہیں، لہذا وہ اپنے معتقدین سے خدا کی بجائے اپنی پرستش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ پرستش سے ہماری مراد پوجا پاٹ نہیں، بلکہ حاجت وائی، مشکل کشائی اور نذر و نیاز وغیرہ ہیں۔ پھر کسی کی کیا مجال کہ وہ پیر صاحب کی معاشرتی ذمہ داریوں کی عدم ادائیگی پر معترض ہو اور اس طرح ان کے خلاف شرع اعمال و افعال سے متعلق کچھ کہہ کر ماندہ درگاہ بن جائے۔

بعض حضرات ٹسکر کی حالت میں شرعی تکالیف کے رفع ہونے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جس طرح کوئی بے ہوش یا دیوانہ آدمی۔ جب تک کہ وہ اس حالت میں رہے۔ شرعی احکام کا پابند نہیں ہوتا۔ اسی طرح صاحب وجد و حال پر سے بھی شرعی تکالیف اٹھالی جاتی ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ دلیل قیاس مع الذوق سے زیادہ کچھ وقعت نہیں رکھتی۔ وجہ یہ ہے کہ عام آدمی کی دیوانگی یا بے ہوشی اضطراری یا غدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ جب کہ ان لوگوں کی یہ محویت خود پیدا کردہ بدعت ہے جس کا سنت رسولؐ اور آئنا صحابہ میں کوئی سراغ نہیں ملتا، تو پھر اس اختیاری محویت پر اضطراری کیفیت کو منطبق کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے۔

ان لوگوں میں ایک کثیر طبقہ ایسا بھی ہے جو نہ تو اہل دل ہوتا ہے نہ صاحب حال، وہ محض اپنے لباس اور سیمت کی تبدیلی سے

۵۔ شعبہ بازیال

ہی اس عالم رہبانیت کے معزز رکن تصور کیے جاتے ہیں، جیسے اکثر گدی نشین، مجاور اور ان کے خلیفہ یہ لوگ محض شعبہ بازیوں سے عوام پر اپنی خدائی کی دھاک بجالا رکھتے ہیں۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کو دفاعی فرقہ کے ایسے ہی شعبہ بازیوں سے سابقہ پڑا تھا۔ یہ لوگ سیاہ کپڑے پہنتے، ہاتھوں اور گلے میں لوہے کے کڑے یا طوق پہنتے تھے۔ آگ میں کود جاتے، انگاروں اور سانپوں سے کھینٹتے تھے اور یہی ان کے اہل حق ہونے کی سب سے بڑی دلیل تھی۔ نماز، روزہ اور دوسرے شرعی احکام سے یکسر غافل اور بے پڑاہ تھے۔ اطراف و اکناف میں ان کے بے شمار معتقدین پھیل گئے تھے۔ اُمراء سلطنت پر بھی ان لوگوں کا اثر تھا۔ امام موصوف نے بیان کیا کہ اہل یہ اعلان کر دیا کہ یہ لوگ محض شعبہ بازی ہیں اور رجال غیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان لوگوں نے شتمل ہو کر حاکم وقت امیر اُرم سے شکایت کی۔ امیر اُرم نے فریقین کو بلایا اور طے یہ پایا کہ فریقین آگ میں کود جائیں، پھر جو جل جائے گا وہ جھوٹا اور جو بچ کر نکل آئے گا اسے سچا سمجھا جائیگا۔ امام موصوف نے فیصلہ منظور کیا، مگر شرط یہ لگائی کہ فریقین آگ میں داخل ہونے سے پہلے سر کر اور

گرم پانی سے خوب بدن مل کر نہالیں۔ امیر ارفم نے وجہ دریافت کی تو آپ نے کہا کہ یہ لوگ میٹھک کی چربی، نارنج کے اندونی پھلکے اور طلق کے پتھر وغیرہ میں کرپنے بدن پر مل لیتے ہیں جس کی وجہ سے آگ کا آن پر اثر نہیں ہوتا۔

امیر ارفم نے امام صاحب سے پوچھا کہ اگر یہ لوگ غسل کرنے کی شرط مان جائیں، تو آپ آگ میں کودنے کو تیار ہیں؟ اس وقت امام صاحب نے جو جواب زیادہ سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہے جو آپ کے اللہ پر توکل، عزم راسخ اور یقینی ایمان کی ایک نذہ جاوید مثال ہے۔ آپ نے فرمایا:

ہاں! میں نے خدا سے استغاثہ کیا ہے اور میرے دل میں جہات ڈال دی گئی ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو میں بھی آگ میں کود جاؤں۔ اور اگر ایسا کر دل گا، تو یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی کیونکہ نبی کریم ﷺ کے سچے جانشینوں سے اس قسم کے خوارق عادات کا ظہور کئی مرتبہ ہو چکا ہے اور ہمیشہ ہوتا ہی رہتا ہے جب یہ لوگ اپنے رموز و اشارات اور خوارق عادات اموی سے اللہ اور اس کے رسول کی شریعت کو باطل کرنا چاہتے ہیں، تو ہم پر فرض ہے کہ اس کی حمایت میں اپنے جان و مال کی قربانی سے دریغ نہ کریں، خدا ہم کو ضرور ایسی نشانیاں عطا فرمائے گا جن سے ہم ان کے خوارق عادات کا بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں۔“

جب اس فرقہ رفاہیہ کے پیروں نے امام موصوف کی یہ شرط اور ایسا جواب سنا، تو ان کے حوصلے پست ہو گئے اور صلح کی درخواست کی کہ اس معاملہ کو یہیں پر ختم کر دیا جائے اور معافی مانگ لی اور کہا کہ آئندہ ہم بدعتوں کو چھوڑ کر شریعت محمدیہ کا اتباع کریں گے (امام ابن ہبیر، مرتبہ، پروفیسر محمد یوسف کوکن، مدراس یونیورسٹی ص ۱۵۵ تا ۱۶۰) اور (تاریخ دعوت و عمریت، حصہ دوم، مرتبہ، ابوالحسن علی ندوی، ص ۱۵)

عوام میں رہبانیت کی مقبولیت کے اسباب

صفا فی باطن کی بنا پر یا کسی دوسرے ذریعہ سے اگر کوئی پیر صاحب کسی کو اس کے دل کے حال سے مطلع کر دیں، تو یہ اس کے لئے سب سے بڑا معجزہ ہے اور یہی اس کی حقانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے یہی وجہ ہے کہ بہت سے مسلمان ہندو جوگیوں، سادھوؤں اور عیسائی راہبوں کے بھی معتقد ہو جاتے ہیں۔ پھر کچھ پیر ایسے ہوتے ہیں، جو کسی بھی مذہب کے پیرو نہیں ہوتے، تاہم ان کی ادائیائی شکتی بڑے بالا تر سمجھی جاتی ہے جیسے بابا گونانک، جس کی وفات پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ جھگڑا پیدا ہوا کہ کون اس کی سرگ باشی

کے فرائض سر انجام دے یا با باگوراندہ جس کا مزار مسلمانوں کے لئے بھی مرجع خاص و عام بنا ہوا ہے یا
ماحولال حسین وغیرہ۔ (ماحولال حسین کا تذکرہ آگے چل کر تفصیل سے پیش کیا جائے گا)

شاہ ولی اللہؒ اپنے مقالہ ”وصیۃ فی النصیحة و
الوصیۃ“ میں تیسری وصیت کے تحت لکھتے ہیں:

غیب معلوم کرنے کے ذرائع

”اس زمانہ کے کرامات فروش (الّا ماشاء اللہ) طلسمات اور فریب سازیوں کو کرامات سمجھ جوتے
ہیں۔ خرق عادت امور کی مشہور قمیں اشرف (دوسروں کے دلوں کے ارادے معلوم کرنا) اور آئندہ کے واقعات
کا انکشاف ہے اور اس اشرف و انکشاف کے بے شمار طریقے ہیں۔ ازاں جملہ نجوم اور رمل کا علم بھی ہے۔
اور اپنی مختلف قسموں میں کہانت بھی ہے اور یہ فن بہت وسیع ہے، کبھی جنوں کی حاضری سے اور کبھی
ان کی حاضری کے بغیر بھی اور ازاں جملہ ایک طلسم کا باب بھی ہے اور جوگ کے عمل بھی ہیں کہ جوگیوں کی کہن
نظروں میں اشرف اور کشف کے سلسلہ میں پوری خاصیت ہے۔ کسی کام پر توجہ دینا، کسی مہینہ شکل
میں ظاہر ہونا، اپنے دل کا دباؤ کسی کے دل پر ڈالنا اور طالب کو مستحضر کرنا، یہ سب فریب آفرین فنون
میں سے ہیں۔ ایسی چند رنگا میں اور ملاحظیات ہیں جو اس مقام تک پہنچا جیتے ہیں۔ صلاح و فساد، سعادت و
شقاوت اور مقبول یا مردود ہونا یہاں کوئی فرق پیدا نہیں کرتا اور ایسے ہی حاضرین میں وجد اور شوق، بے قراری
اور مسرت کوئی وزن نہیں رکھتی۔ ان کوائف کا منشاء اور محرک قوتِ بہیمہ (حیوانیت) ہے، لہذا جس
کی حیوانیت قوی تر ہے اس کا وجد بھی پرجوش ہوتا ہے، البتہ یہ اعمال اور ایسے افعال بعض نیک لوگ بھی
کسی نیک نیت پر کرتے ہیں اور یہ چیز ان اعمال کو کرامات نہیں بنا دیتی۔ ہم نے بہت سے سادہ لوحوں
کو دیکھا ہے کہ جب ایسے اعمال کسی شیخ میں دیکھ پاتے ہیں، تو ان کو عین ”کرامت“ یقین کر لیتے ہیں۔
شاہ صاحب کے درج بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ:

۱۔ مندرجہ ذیل علوم و فنون ایسے ہیں جن سے غیب کے حالات کا علم ہو جاتا ہے:

۱۔ علم نجوم یا جوئش — ۲۔ علم رمل — ۳۔ کہانت اور اس کی مختلف اقسام —

۴۔ علم طلسمات یا جادوگری — ۵۔ جوگ اور اس کی مختلف اقسام یعنی توجہ ڈالنا یا

علم سمریزم اور ہیناٹزم وغیرہ۔

۲۔ ان علوم میں جنات یا رجال الغیب کا عمل دخل ہوتا ہے۔

۳۔ یہ سب علوم و فنون غیر شرعی ہیں اور اکتساب سے حاصل کئے جاتے ہیں۔

۴۔ ان غلوں و فنون کے ذریعہ اگر غیبی حالات معلوم ہو بھی جائیں، تو یہ کرامت نہیں کہلا سکتے۔
 ۲۔ خوارق عادت امور | ان کو تین بڑی قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، معجزہ کرامت اور استدراج یا شبہہ بازی۔

انبیاء سے اگر ایسے واقعات کا صدور ہو تو اسے معجزہ کہتے ہیں، لیکن قرآن نے اس کے لئے معجزہ کی بجائے ”آیت یا نشانی“ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ پھر یہ معجزات بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو باطل کے مقابلہ میں احقاقِ حق کے لئے اللہ تعالیٰ انبیاء کو عطا فرماتا ہے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کا سانپ بن جانا یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مردوں کو زندہ کرنا اور بعض دفعہ ایسے معجزات کفار کے مطالبہ کی بناء پر انبیاء کو عطا کئے جاتے ہیں جیسے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا ظہور اور حضور ﷺ سے اشفاقِ قمر کا ظہور۔ ایسے معجزات چونکہ انبیاء کی حقانیت کو ثابت کرنے اور کفار کو لا جواب کر دینے کے لئے عطا کئے جاتے ہیں، لہذا ایسے واقعات کا صدور غیر نبی سے ناممکن ہوتا ہے۔ ایسے واقعات کا عند الضرورت نبی دعویٰ تو کر سکتا ہے، لیکن اس کی نسبت ہمیشہ خدا کی طرف ہی کرتا ہے اور یہ معجزات نبی کو نبوت کے ابتدائی دور میں عطا کئے جاتے ہیں جب کہ باطل زوروں پر ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایسے معجزات دیکھنے کے بعد بھی کفار کم ہی ایمان لاتے ہیں اور ایسی صورت میں ان پر عذاب بھی نازل ہوا۔

معجزات کی دوسری قسم وہ ہے جو اولیاء کی کرامت سے بہت حد تک مشابہت رکھتی ہے اور انہیں معجزہ صرف اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کا صدور نبی سے ہوتا ہے۔ ان کا نبی کو پہلے سے کوئی علم نہیں ہوتا اور یہ عموماً کسی اشد دینی یا دنیوی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے عطا کئے جاتے ہیں تاکہ حق یا اہل حق کی مدد کی جاسکے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دریا پر عصا مارنا اور اس سے دریا کا پھٹ کر سر مل کی مانند راستہ بن جانا یا حضرت ایوب علیہ السلام کا زمین پر پاؤں مارنے سے چشمہ ابل پڑنا۔ یا حضور اکرم ﷺ کا جنگِ بدر کے دوران کفار کی طرف ریت کی مٹی پھینکنا اور اس سے کفار کا اندھا ہونا۔ ایسے معجزات یا تاہم غیبی کا نبی کو نہ پہلے سے علم ہوتا ہے نہ ہی وہ اس کا دعویٰ کر سکتا ہے، کیونکہ بسا اوقات نبی کی شدید دینی یا دنیوی ضرورت کے باوجود بھی انبیاء کو ایسی غیبی تائید حاصل نہیں ہوتی جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام کا حضرت یوسف علیہ السلام کی جدائی میں مدتوں پریشان رہنا، حالانکہ وہ پاس ہی کنوئیں میں پڑے تھے یا خود حضور اکرم ﷺ کا واقعہ ان کے معاملہ میں ایک ماہ تک پریشان رہنا۔

اسی دوسری قسم کے معجزات کا صدور اگر کسی حامل شریعت بزرگ سے ہو تو اسے کرامت کہا جاتا ہے، اس کے لئے لازمی شرط یہ ہے کہ وہ شریعت کا پورا پابند ہو اور اسے نہ تو کسی ایسے واقعہ کے صدور کا دعویٰ ہو اور نہ پہلے سے علم ہو، پھر جب کبھی ایسے واقعہ کا صدور ہو جائے تو اس بزرگ پر لازم ہے کہ اسے محض اللہ کی مہربانی اور تائید غیبی سمجھے اور اس واقعہ کی اپنی بزرگی جتانے کی خاطر تشہیر نہ کرے۔ معجزہ کی طرح کرامت بھی وہی چیز ہے اکتسابی نہیں۔

اور جو بزرگ علی الاعلان تعجیلی پر پرسوں جاکر دکھا دیتے ہیں کہ ادھر ہاتھ بڑھایا ادھر انگور کا خوشہ ہاتھ میں آگیا اور اسے بزرگی کے دعویٰ کے طور پر پیش کرتے ہیں، تو یہ خالص شیطانی عمل ہے۔ جسے اصطلاح عام میں استدراج کہتے ہیں۔ یہ کرامت نہیں بلکہ شعبہ بازی ہے۔ ان لوگوں کا تعلق رجال غیب سے ہوتا ہے اور بعض دفعہ مکر و جیلہ سے کام لیا جاتا ہے اور یہ کسی چیز ہے، وہی نہیں۔ جب کہ معجزہ اور کرامت دونوں وہی ہوتی ہیں۔

یہ تو خیر معجزہ، کرامت اور استدراج کے فرق کی ایک ضمنی بحث چل پڑی مقصد یہ ہے کہ ہر طرح کے خوارق عادت امور میں عوام کے لئے بے حد شش ہوتی ہے، بلکہ ان کے نزدیک ولایت کا اصل معیار ہی یہ خوارق عادت امور ہیں۔ اس لئے جہلا کی اکثریت عموماً ایسے لوگوں کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ تصرف کا تعلق محض ان معتقدین سے ہے، جو ایسے بزرگوں کی کرامات دیکھ کر کشاکش ان کے دربار میں حاضر ہو جاتے ہیں اور ان کے

۳۔ تصرف کا عقیدہ

مرید یا چیلے بن جاتے ہیں۔ ان سے غیر مشروط اطاعت پر عہد پیمان باندھے جاتے ہیں اور ان کو یہ ذہن نشین کرایا جاتا ہے کہ جو بزرگ ایسے مافوق العادت امور پر قادر ہے وہ ان کی بگڑی کو سنوار بھی سکتا ہے۔ اور ان کی حاجات پوری کرنے کی بھی استعداد رکھتا ہے۔ پھر جب کسی مرید کو کسی تجربہ کی بناء پر اس کا یقین ہو جاتا ہے، تو آہستہ آہستہ اس کا یہ یقین واسخ عقیدہ کی شکل اختیار کر جاتا ہے حتیٰ کہ ایک وقت ایسا بھی آ جاتا ہے کہ ہر مرید اپنے آپ کو اپنے پیر کے تصرف کی زنجیروں میں جکڑا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کوئی کام مشیت ایزدی کے بغیر سرانجام نہیں پاسکتا۔ نہ کوئی ایسا انسان پایا جاتا ہے جس کی تمام آرزوئیں اور تمنائیں پوری ہو جائیں اور نہ ہی ایسے آدمی کا وجود ممکن ہے جس کی کوئی تمنا پوری نہ ہوئی ہو۔ اب اگر کسی پیر یا بزرگ کے وسیلہ سے بھی کوئی حاجت پوری ہوتی نظر آتی ہو

لے یہی بحث مرتبہ تفصیل سے کرامات اولیاء اللہ میں آئے گی۔

تو وہ خدا کی مشیت ہی کی وجہ سے پوری ہوتی ہے۔ جس کو یہ مرید اپنے پیر کا تصرف سمجھ رہا ہوتا ہے۔ اس قسم کے مرید اپنے پیر کی بزرگی اور عوام میں رہبانیت کو ہر دلعزیز بنانے میں موثر کردار ادا کرتے ہیں۔

۴۔ **ستی نجات کا عقیدہ** | جب پیر اور مرید اس تصرف کے عقیدہ کی بنا پر معبود

اور عبد کے مقام پر پہنچ جاتے ہیں، تو نہ تو پیر اپنے آپ کو شرعی احکام کا پابند ہونے کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور نہ ہی مرید میں یہ جرأت باقی رہ جاتی ہے کہ وہ اپنے پیر کے غیر شرعی اعمال و افعال پر کچھ گرفت کر سکے۔ پھر یہ بات یہیں تک محدود نہیں رہتی۔ یہ پیر اپنے مریدوں کو یہ بھی ذہن نشین کراتے ہیں کہ جیسے اس دنیا میں انہیں تصرف و اقتدار حاصل ہے۔ ویسے ہی انہیں اخروی زندگی میں بھی حاصل ہوگا۔ مرید پر شرعی احکامات کی پابندی کی بجائے پیر کی غیر مشروط اطاعت اور نذر و نیاز کے ذریعہ اس کی رضا اور خوشنودی ہی لازم ہے۔ رہا اخروی نجات کا معاملہ، تو ان مریدوں کی شفاعت کر کے بہشت میں لے جانا ان پر ول کی ذمہ داری ہے۔

اب مریدوں نے سمجھا کہ سال میں صرف چند بار پیر صاحب کی قدم بوسی کرنے، نذر و نیاز دینے، یا ان کے نام چڑھائے چڑھانے سے اخروی زندگی میں نجات کی ذمہ داری ملتی ہے اور شرعی حدود و قیود کے جھنجھٹ سے بھی چھٹکارا ہو جاتا ہے، تو اس سے زیادہ سستا اور یکساں سودا ہو سکتا ہے؟ اس سستی نجات کے عقیدہ نے بھی جہاں پیروں فقیروں کے کاروبار کو چار چاند لگائے، وہاں عوام میں رہبانیت کو مقبول بنانے میں بھی کافی فروغ بخشا۔

مشہور قول ہے ظ

”پیراں نمی پرند مریدان ہی پرانند“

۵۔ **مریدان با صفا کا کردار**

یعنی پیر خود اگر کسی بلند مقام پر فائز نہیں ہوتے، بلکہ مرید انہیں اس مقام پر پہنچاتے ہیں۔ چونکہ ان مریدان خاص کا مفاد بھی پیر صاحب کے مفاد سے وابستہ اور مشترک ہوتا ہے۔ لہذا اس کاروبار کو چلانے کا اصل ذریعہ ہی لوگ ہوتے ہیں۔ اکثر کرامتیں اور شعبہ بازیائیں انہیں کے ہاتھوں اور انہیں کے مکر و جمل سے سرانجام پاتی ہیں۔ پھر یہی لوگ ”پراپیگنڈہ سیکرٹری“ کے فرائض سرانجام دینے پر مامور ہوتے ہیں۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ پیر صاحب کی چھوٹی سی کرامت کو لوگوں میں بڑھا چڑھا کر پھیلاتیں یا خود کسی کرامت کا افسانہ وضع کر کے اس کی تشہیر کریں۔ اور ظاہر ہے کہ پروپیگنڈہ خواہ کیسی ہی غلط بات کا کیوں نہ ہو، اپنا اثر

دکھلا کے رہتا ہے۔

ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ان بزرگوں پر موت
بس اک آن کے لئے وارد ہوتی ہے۔ اس کے

۶۔ مرنے کے بعد بھی تصرف کا عقیدہ

بعد ان کی رُوحيں مریڈوں کی دُعاؤں سننے اور ان کی حاجت برآری میں مشغول ہو جاتی ہیں، بلکہ اب وہ
پہلے سے زیادہ تصرف رکھتی ہیں، کیونکہ اب وہ عالم ارواح میں ہیں اور باطنی اسباب پر ان کا تصرف
پہلے سے زیادہ ہے۔ یہیں سے نذر فی اللہ کے عقیدہ کی ایجاد ہوئی۔

اس عقیدہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگرچہ یہ رُوحيں اپنے ہر مرید کی ہر جگہ سے فریاد سنتی ہیں اور حاجت
برآری کرتی ہیں، تاہم ان کی قبر سے اُن کی روح کا سلسلہ سبباً زیادہ قائم ہوتا ہے، لہذا قبروں سے نسبتاً
حاجت برآری اور مشکل کشائی کا بھی زیادہ امکان ہے۔ اس عقیدہ نے دین طریقت یا رہبانیت کو لا ذوال
شہرت بخشی۔ قبروں کو آباد رکھنے کے لئے ”سرفک“ ”روصن“ تعمیر کیے گئے۔ کیونکہ یہاں سے تاقیات
حاجت برآریوں اور مشکل کشائیوں کی ضرورت تھی۔ پھر نئے پیروں کے مزارات سے ان میں اضافہ
ہوتا گیا۔ ان کی نگہداشت کے لئے مجاوروں اور گدی نشینوں اور خلیفوں کی ایک فوج ظفر موج پیدا ہو
گئی۔ نذر و نیاز اور چڑھاؤں کا دائرہ وسیع ہوا۔ مجاوروں اور گدی نشینوں کے وارے نیا سے ہو گئے۔
دنیا کا بھی وافر حصہ مل گیا اور دین بھی ہاتھ سے نہ گیا۔ اس سے زیادہ ان لوگوں کی اور کیا خوش بختی ہو سکتی
تھی، پھر اس کا دوبارہ کو مزید وسعت دینے کے لئے سالانہ عرسوں یا میلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، تاکہ مریدوں
سے باقاعدہ سالانہ نیازیں وصول کی جاسکیں اور ان عرسوں کو حج کا درجہ دیا گیا اور وہاں وہ تمام ارکان ادا کئے
جانے لگے، جو حج کے موقع پر ادا کئے جاتے ہیں، مثلاً دعا، نداء، طواف اور سعی وغیرہ۔ ان مزاروں کی
بھی زمین حرم کی حدود مقرر کی گئیں، وہاں روشنی، صفائی اور غلاف وغیرہ کا بھی اہتمام ہونے لگا جس طرح
بیت اللہ کا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض عاملوں نے ”مناسک حج المشاہد“ جیسی کتابیں لکھ کر ان سب مناسک
کا شرعی جواز بھی ثابت کر دیا۔ پھر معاملہ اس سے بھی آگے بڑھا۔ اب یہ ضرورت بھی نہ رہی کہ قبر میں کوئی ٹلی
یا کوئی عام انسان دفن ہو۔ گدھوں اور گھوڑوں کی ہڈیوں اور عام لکڑیوں پر مزارات تعمیر ہوئے، تو وہ بھی مزج
خاص و عام بن گئے۔ وہاں سے بھی لوگوں کی حاجتیں پوری ہونا شروع ہو گئیں، وہاں بھی وہ سب کچھ

نہ ایک شبہ عالم ابو عبد اللہ محمد بن نعمان الملقب بالمفید کی اسی نام کی ایک مفصل تصنیف ہے جس میں بہت سی بے سرو پا
روایات درج ہیں۔ (الروای البکری ص ۲۹۵، ابن تیمیہ، (تذکرۃ دعوت مصریت، حصہ دوم، ص ۱۹۶)

ہونے لگا جو ایک "بزرگ" کی قبر پر ہوتا تھا اور ایسے واقعات اس کثرت سے موجود ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کے تاریخی حوالہ دینے کی ہم ضرورت محسوس نہیں کرتے، کیا اس سے زیادہ بھی انسانیت کی تزیین ہو سکتی ہے؟

مزارات، آستانوں اور بعض دفعہ زندہ پیروں سے ایسی کرامات کے ظہور کے متعلق امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"بعض لوگوں نے اپنے شیخ کی دہائی دی اور ان کو ان کی صورت نظر آئی اور بعض دفعہ انہوں نے اس کا کوئی کام بھی کر دیا۔ اس سے ان کا یہ عقیدہ ہوا کہ شیخ خود آئے یا یہ کوئی فرشتہ تھا، جو ان کی صورت میں ظاہر ہوا اور یہ ان کی کرامت ہے۔ اس سے ان کا مشرکانہ عقیدہ مزید راسخ ہو جاتا ہے۔ ان کو معلوم نہیں کہ اس طرح کی باتیں اور معاملات شیاطین بت پوچھنے والوں کے ساتھ بھی کرتے رہتے ہیں۔ وہ ان بت پرستوں کے سامنے اکثر ظاہر ہوتے ہیں اور بعض غیبی باتیں ان کو بتلاتے ہیں اور ان کے بعض مطلب بھی پورے کر دیئے جاتے ہیں، لیکن یہ سب امور دورِ اخیر کی پیداوار ہیں۔ جن کا خیر القرون میں کوئی وجود نہ تھا۔" (تفسیر سورۃ اعراس، ص ۱۱۸)

ایک دوسرے مقام پر وہ لکھتے ہیں کہ یہ معاملہ صرف صاحبین تک محدود نہیں بلکہ ستارہ پرستوں کو بھی ایسے ہی احساسات اور فتوحات حاصل ہوتے ہیں، فرماتے ہیں:

"موجود کو اکب سے دعا کرتے ہیں ان پر ایسی صورتیں نازل ہوتی ہیں جن کو کو اکب کی روحانیت کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ شیطان ہوتا ہے جو اس کے شرک کی بناء پر اس کو گمراہ کرنے کے لئے نازل ہوتا ہے جیسے کہ بعض اوقات شیاطین بتوں اور مورتیوں کے اندر گھس جاتے ہیں۔ وہ بعض اوقات لوگوں سے باتیں کرتے ہیں اور بعض اوقات مجاوروں اور پوچھ چاٹ کرنے والوں کو دکھائی دیتے ہیں اور دوسروں کو بھی دکھائی دیتے ہیں۔" (کتاب النبوات، ص ۲۷۷، بحوالہ تاریخ دعوت و عربیت، ج ۲، ص ۳۲۷)

ان مزارات میں دمدم اضافے اور عوام کے اس طرف رجحان کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مساجد کی رونق مزارات کی طرف منتقل ہونا شروع ہو گئی۔ مسجدیں بے آباد ہوئیں اور مزارات پر عوام کا ہجوم بڑھنے سے اس دینِ طریقت کو بہت تقویت ملی۔

اہل عرب جاہلیت کے زمانہ میں اپنے بتوں سے باتیں سنتے تھے ابواحد بتوں کی کرامات اور تصرف

حسن بن عبداللہ عسکری نے اپنی کتاب میں ابوسکین سے باند لکھا ہے

کہ حضرموت میں جلد نامی ایک بُت تھا، جس کو اہل کندہ و حضرموت پوجتے تھے۔ اس کے مجب اور بنی شکامہ بن شیب تھے، جو کندہ کی نسل سے تھے۔ پھر بنو علاق مجاور بنے۔ انخر ابن ثابت مجاورت کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ اس بُت کی باقاعدہ ایک چراگاہ تھی جس میں اس کی بکریاں اور دوسرے جانور چرتے اور پلتے تھے۔ اگر کسی اور کی بکریاں اس میں چر لیتیں، تو وہ اپنے مالکوں پر حرام ہو جاتیں وہ سفید پتھر سے بنا ہوا بڑے قد کا ٹھہ کے انسان کی شکل کا بُت تھا۔ اس کے اوپر والا حصہ سر کی مانند سیاہ تھا۔

انخر نے بیان کیا کہ ایک دن جب میں جلد کے پاس تھا بنی الامری بن مرہ کے ایک شخص نے اس بُت کے لئے ایک جانور ذبح کیا۔ اچانک ہم نے بادل کی گرج جیسی آواز سنی۔ ہم نے دھیان سے سنا تو یہ آواز آہی تھی :

شَعَارُ أَهْلِ عَدِمٍ، إِنَّهُ قَضَاءُ مُردوں کی مخصوص بات یہ ہے کہ وہ (مرنا) قطعی فیصلہ
حَتَّىٰ إِنْ بَطِشَ سَهْمٌ ہے۔ اگر تیر پوری قوت سے لگے، تو وہ کامیاب ہو
فَقَدْ قَاَزَ سَهْمٌ جانے گا۔

ہم نے کہا ہمارا بُت بہت خوبصورت اور گورا ہے۔ بُت سے پھر آواز آئی :

فَاءَ نَجْمُ الْعِرَاقِ يَا أَخْزَرَ بْنَ عِلَاقٍ اے انخر بن علاق! عراق کا ستارہ غروب ہو گیا۔ کیا
هَلْ أَحْسَسْتَ جَمَاعَةً وَعَدَدًا جَمًّا تو نے ایک عام لشکر کو محسوس کیا ہے، جو جم غفیر کی شکل میں
يَهْوِي مِنَ الْيَمَنِ وَالشَّامِ إِلَى مین و شام سے قلعوں والے علاقے پر حملہ آور ہو گا۔ روشنی
ذَاتِ الْأَجَامِ نَوْرًا ظَلَّ الظَّلَامِ پھیل جائے گی اور اندھیرا ختم ہو جائے گا بادشاہی
أَفْلَ وَمَلِكُ اسْتَقْدَمَ مِنْ مَحَلِّ إِلَى مَحَلِّ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جائے گی۔

پھر وہ بُت خاموش ہو گیا۔ ہم نے کہا لامحلہ یہ صورت حال پیدا ہو کر ہے گی۔ جب اگلا سال آیا تو بُت کی آواز جو ہم سنا کرتے تھے وہ نہ آئی اور دیر کر دی۔ ہمیں بدگمانی پیدا ہوئی۔ ہم نے قربانی کی، او بُت کو اس کے خون سے ملوث کیا۔ قبل ازیں ہمارا یہی طریقہ عمل ہوتا تھا۔ اچانک پھر آواز آئی۔ ہم نے کہا۔ اے ہمارے رب! ہر صبح کو ہمارے ساتھ گفتگو کیا کرو، کوئی تجھے روکنے ٹوکنے والا نہیں۔ ہم تیرے غضب سے پناہ مانگتے ہیں اور تیرے درگزر کا سہارا چاہتے ہیں۔ اچانک بُت سے پھر آواز آئی۔ اور کچھ سبوح عبارت کہنے کے بعد پھر خاموشی ہو گئی اور اس کا چہرہ چائین کے مختلف صوبوں کے قبائل میں

ہونے لگا۔

لوگوں نے ضمارُت سے بھی باتیں سنی تھیں۔ یہ نبی سلیم کا بُت تھا۔ جب مرد اس مرنے لگا، تو اس نے اپنے بیٹے عباس کو کہا: اے بیٹے! ہمارے عبادت کرو، تیرا نفع و نقصان اس کے اختیار میں ہے۔ عباس بن مرد اس کہتے ہیں کہ ہم اس کی عبادت کرتے تھے اور اس سے باتیں سنا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے اس کے آس پاس جھاڑو دیا۔ پھر اس پر ہاتھ پھیرا تو اس کے پیٹ سے ایک چیخ سنی، پھر یوں کہنے لگا۔

قُلْ لِلْقَبَائِلِ مِنْ قُرَيْشٍ كُفَّهَا هَلَكَ الضَّمَارُ وَفَازَ أَهْلُ الْمَسْجِدِ
هَلَكَ الضَّمَارُ وَكَانَ يَبْعُدُ مَدَّةً قَبْلَ الصَّلَاةِ عَلَى النَّبِيِّ مُحَمَّدٍ
إِنَّ الدِّعَى وَرِثَ النَّبُوَّةَ وَالْهَدَى بَعْدَ ابْنِ مَرْيَمَ مِنْ قُرَيْشٍ مُهْلِكٌ
قریش کے سب قبائل سے کہہ کر ضمار ہلاک ہو گیا اور اہل مسجد کا میاب ہونے سے پوجا بھاتا راہ وہ محکمہ پر صلوٰۃ سے قبل ہلاک ہو چکا ہے، جو ذات اقدس ابن مریم ﷺ کے بعد نبوت و ہدایت کی وارث نبی ہے۔ وہ قریش کا ہدایت یافتہ شخص ہے۔

عباس کہتے ہیں، میں بنی حارثہ کے لوگوں کی محبت میں مدینہ منورہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس مسجد میں پہنچ گیا، جب آپ نے مجھے دیکھا، تو مسکرائے اور فرمایا:

”اے عباس! تیرا اسلام کس طرح ہے؟ میں نے پورا قصہ سنایا، آپ نے فرمایا، تو نے سچ کہا۔ پھر میں اپنی قوم کے ساتھ مسلمان ہو گیا، اور ایک دوسری روایت کے مطابق انہی عباس بن مرد اس نے ضمار بُت کو آگ لگا کر جلا دیا تھا۔ (غایۃ الامانی فی الرد علی الجہانی اردو، ص ۱۴، مصنفہ، علامہ محمد شکی آلوسی)

مندرجہ بالا واقعات و اقتباسات سے درج ذیل باتیں واضح ہوتی ہیں

۱۔ پتھر کے بے جان بتوں سے بھی آوازیں آتی تھیں، وہ اپنے عبادت گزاروں کو غیب کی خبریں بھی دیتے تھے، جو بسا اوقات مہل اور کبھی درست بھی ہوتی تھیں۔ یہ وہی بات ہے جسے اللہ تعالیٰ اِنَ الشَّيَاطِينِ لَيُوحِّوْنَ اِلٰی اَوْلِيَآئِهِمْ سے تعبیر کرتا ہے اور اس کی حقیقت قرآن نے یوں بیان فرمائی کہ یہ شیاطین یا رجال الغیب ملاء اعلیٰ یا تدبیر کائنات پر مامور فرشتوں سے کچھ باتیں سن پاتے ہیں۔ پھر اس حق میں کچھ باطل کی بھی آمیزش کر کے اپنے عبادت گزاروں تک پہنچا دیتے ہیں اور یہ سب شیاطین کا کام ہے۔

۲۔ ہوتا تو وہی ہے جو اللہ کی مشیت میں ہے، لیکن ان غیب کی خبروں کی وجہ سے ان کے عبادت گزار یہی سمجھتے ہیں کہ ان کا نفع و نقصان ان شیاطین (آستانوں یا آستانے والوں) کے تصرف میں ہے۔

امراء اور عام دنیا دار دونوں طبقوں کو علماء و فقہاء سے زیادہ خلاف

۷۔ امراء اور دنیا داروں کی درویشوں سے عقیدت

شرع پیروں اور گانے بجانے والے صوفیوں سے عقیدت و محبت ہوتی ہے اس لئے کہ علماء، اطباء کی طرح ہیں اور دوا میں خرچ کرنا انسان کو بار محسوس ہوتا ہے، لیکن ان پیروں اور قوالوں پر خرچ کرنا ایسا ہی ہے جیسے گانے بجانے والی عورتوں پر خرچ کرنا، یہ بھی گانے والوں اور مداریوں کی طرح سامانِ تفریح پیدا کرتے ہیں۔

امام ابن الجوزیؒ تلمیس ٹیس، ص ۸۹ پر لکھتے ہیں :

”امراء اور دنیا دار لوگ بناوٹی زاہدوں اور تارک الدنیا درویشوں کے بہت جلد مغتہ ہوتے اور علماء پر ان کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ لوگ اگر سب سے بڑے جاہل پر درویشی کا لباس دیکھ لیں تو فوراً اُس کے معتقد ہو جائیں اور اگر وہ مصنوعی طور پر بھی خشوع و خضوع کا اظہار کرنے لگے تو ان لوگوں کو اس پر فریفتہ ہونے میں دیر نہیں لگتی اور کہتے ہیں کہ بھلا اس درویش اور فلاں عالم کا کیا مقابلہ؟ یہ تارک دنیا وہ طالب دنیا درویش لوگ نہ اچھی غذا کھاتے ہیں، نہ شادی کرتے ہیں، حالانکہ میض جہالت ہے اور شریعتِ محمدیؐ کی تحقیر ہے کہ ایسے زہد کو علم پر ترجیح دی جائے، خدا کا بڑا احسان ہے کہ یہ لوگ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں نہ تھے، ورنہ آپ کو شادیاں کرتے، پاک صاف چیزیں کھاتے، میٹھے اور شہد سے رغبت کرتے ہوئے پاتے، تو آپ سے بھی بد اعتقاد ہو جاتے۔“

یہاں حضور اکرم ﷺ کا یہ ارشاد بھی ذہن میں رکھنا چاہئے۔ آپؐ نے فرمایا: ایک عالم کو عابد پر ایسی ہی فضیلت ہے، جیسے تم میں سے ایک ادنیٰ (صحابی) پر مجھے فضیلت ہے۔

۸۔ تذکرے اور ملفوظات کا وجود

رہبانیت کے وجود کو بقائے دوام بخشنے کے لئے ایک طرف تو مزارات کی تعمیر کا سلسلہ

ملے یہ بحث بھی تفصیل سے آگے چل کر بیان ہوگی۔

شروع ہوا، تو دوسری طرف ایسی تصانیف کا آغاز ہوا جو کسی ”بزرگ“ کی وفات کے بعد مرتب کی گئیں جن میں رطب و یابس سب کچھ ہی شامل ہوتا ہے کیونکہ ان کا مقصد صرف کسی بزرگ کی کرامتوں کو بڑھا چڑھا کر اس کی بزرگی کی دھماک بٹھانا اور نصرت فی الامور کو ثابت کرنا ہوتا ہے۔ ایسی کتب ابول کے غیر معتبر ہونے کے دلائل حسب ذیل ہیں :

۱۔ **روایتی انداز** | ایسی کتابیں چونکہ مریدان خاص کی کوشش سے مرتب ہوتی اور بالعموم مریدوں کے مطالعہ کے لیے ہی مرتب کی جاتی ہیں، لہذا وہ عقیدت مندی کی وجہ سے کسی واقعہ کی تحقیق کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ ان واقعات کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔ ”روایت ہے، نقل ہے یا آپ نے فرمایا۔“ اس کے علاوہ وہ کسی سند کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے، لہذا یہ غیر مستند ہوتی ہیں اور اگر کبھی اتفاق سے کہیں حوالہ کی ضرورت پڑ بھی جائے، تو کسی ایسی کتاب کا حوالہ دیا جاتا ہے جس کا شرعی حیثیت سے کوئی مقام نہیں ہوتا۔ اور وہ بھی ان جیسے ہی حضرت کی تصنیف شدہ ہوتی ہیں جن کا ذکر اپنے مقام پر آئے گا۔

۲۔ **تذکرے اور تاریخی لغز نشیں** | اس روایتی انداز کا اثر کرامات کی روایت تک محدود نہیں ہوتا، بلکہ اس کی زوائد بھی روایات پر بھی پڑتی ہے

یہاں ہم چند ایک مثالوں سے اس کی وضاحت پیش کرتے ہیں :

۱۔ **حضرت علی ہجویریؒ** : دنیائے تصوف کی ایک درخشندہ شخصیت ہیں مشہور ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں انہی کی وساطت سے اسلام پھیلا اور لاہور کے مرکزی مقام میں آج تک ان کے مزار سے فیض عام بھی جاری ہے۔ اب دیکھئے ان کی تاریخ وفات میں بھی اختلاف ہے اس بات پر بھی اختلاف ہے کہ ”گنج بخش“ کے لقب سے کب اور کیسے نوازے گئے اور اس بات میں بھی کہ ان کا ورود مسعود لاہور میں کب اور کیسے ہوا۔

۱۔ ان کی تاریخ وفات ۴۶۵ھ مشہور ہے اور یہی کچھ ان کی تاریخ وفات کے کتبوں سے جو مزار پر لگے میں واضح ہوتا ہے لیکن ان کی شہرہ آفاق کتاب کشف المحجوب کی داخلی شہادت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ۴۸۰ھ تک تو بہر حال بقیہ حیات تھے۔ یہ معلوم نہیں کہ وفات کا اصل سن کیا ہے؟

ب۔ عام تذکروں میں یہ بات مندرج ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی نے آپ کے مزار پر اگر حسب دستور چلے کشتی کی اور فیض و برکت سے جب مالا مال ہو کر رخصت ہونے لگے، تو مزار کے رخ کھڑے ہو کر یہ شعر پڑھا:

گنج بخش فیض عالم مظهر نورِ خدا ناقصاں را پیر کامل کا ملاں را رہنما
(تصوف اسلام، ص ۳۳)

معین الدین چشتیؒ کا سن وفات ۶۳۳ھ بتلایا جاتا ہے۔ گویا گنج بخش کا لقب انہیں ۶۳۳ھ سے پہلے مل چکا تھا، لیکن حقیقتہ الاولیاء کے مرتب محمد اقبال مجددی لکھتے ہیں کہ ”قدیم ترین مصنف جس نے سب سے پہلے گنج بخش لکھا ہے، وہ محمد قاسم عبرت لاہوری، مصنف عبرت نامہ، بسال ۱۱۳۵ھ ہے۔“
(حقیقتہ الاولیاء، ص ۱۸۲، حاشیہ ۲)

ج۔ ان کے درویشوں نے لاہور سے متعلق فوائد (منظومات خواجہ نظام الدین سلطان المشائخ، م ۶۴۲۵) میں یہ روایت درج ہے کہ حسین زنجانیؒ اور علی ہجویریؒ دونوں پر بھائی تھے (یعنی حسن ختی خنبیدیؒ کے مرید تھے) جب مرشد نے لاہور جانے کا حکم دیا تو کہنے لگے وہاں حسین زنجانی موجود ہیں، میری کیا ضرورت ہے، مرشد نے مکر یہی حکم فرمایا، جب لاہور پہنچے تو شیخ حسین زنجانی کا جنازہ جاتے دیکھا تو مرشد کی نظر رسا کاظم ہوا۔“ (تصوف اسلام، ص ۳۵۔ حقیقتہ الاولیاء، ص ۱۸۶)

اب دیکھئے حسین زنجانی کی وفات ۶۹۵ھ یا ۶۸۰ھ کے لگ بھگ ہے۔ اقبال مجددی صاحب، مرتب حقیقتہ الاولیاء نے اس اشکال کو دور کرنے کے یہ نوکھ دیا ہے کہ یہ حسین زنجانی دو الگ الگ شخصیتیں ممکن ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات بھی بنانے سے بنتی نہیں، ایک تو ”مرشد کی نظر رسا“ پر زور دیتی ہے۔ دوسرے دنیائے تصوف میں حسین زنجانی کے مرتبہ کی اور اس نام کی کوئی دوسری شخصیت ہمیں کہیں نظر نہیں آتی۔

۲۔ حسین بن منصور حلاج جو دنیا سے تصوف کے آفتاب و ماہتاب ہیں ان کے متعلق شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اپنی کتاب البلاغ المبین فارسی، ص ۸۷ (مطبوعہ مکتبہ سلفیہ، لاہور)

لے فوائد الفوائد کو ”روح تصوف“ کے مصنف خورشید احمد گیلانی نے تصوف کی مستند اور اہم کتب میں شمار کیا ہے اور تصوف کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنے کے لئے جن کتب کی سفارش کی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے، روح تصوف ص ۸)

پر رکھتے ہیں کہ ”سید الطائفہ جنید بغدادیؒ اور دیگر مشائخ وقت نے اس کے قتل کا فتویٰ لکھا اور اسے سولی پر چڑھایا گیا۔“

اب دیکھئے کہ جنید بغدادیؒ کا سن وفات بالاتفاق ۲۹۸ھ ہے اور منصور حلاج ۳۰۹ھ میں مقتول ہوا، تو جنیدؒ فتویٰ کیسے لکھ سکتے تھے۔

پھر شاہ صاحب مذکور اپنے بیان کی تائید میں مزید فرماتے ہیں کہ:

اخبار الاخبار بعد الحق محدث دہلوی، بحوالہ قشیر، ص ۵۹، لکھتا ہے کہ ”نظام الدین اولیاء (م ۲۵ھ) سے سوال کیا گیا کہ ”منصور حلاج کے بارے میں کیا حکم ہے؟“ فرمایا: ”مردود ہے، جنیدؒ نے اس کو رد کیا جنید مقتول وقت تھا، اس کا رد سب کا رد ہے۔“

اب ان تینوں مذکورہ تذکروں کی تاریخی صحت کا اندازہ آپ خود لگا لیجئے۔

۳۔ پیران پیر محمد سیاء اللہ قادری اپنی تصنیف ”غوث الثقلین“ جسے مصنف صاحب نے بزعم خویش نہایت تحقیق سے لکھا ہے۔ کے صفحہ ۱۸۲ پر رقمطراز ہیں کہ:

”حضرت سہل بن عبد اللہ تستری فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ اہل بغداد کی نظر سے حضرت غوث الاعظم کافی عرصہ غائب رہے، ہم لوگوں نے آپ کو تلاش کیا، تو معلوم ہوا کہ آپ کو دجلہ کی جانب جاتے دیکھا گیا ہے جب ان کو تلاش کرتے ہوئے دریائے دجلہ پر پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ آپ پانی پر چلتے ہوئے ہماری طرف آرہے ہیں۔ بکثرت تعداد پھیلیاں آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام عرض کرتی ہیں اور ہم نے پھیلیوں کو آپ کا دست مبارک چومتے ہوئے دیکھا۔ اس وقت نماز ظہر کا وقت ہو گیا تھا۔ اسی اثناء میں ہمیں ایک سبز رنگ کا سونے اور چاندی سے مرقع مصلیٰ دکھائی دیا جو تختِ سلیمانی کی مانند ہوا میں دریائے دجلہ کے اوپر معلق تھا۔۔۔۔۔“ (ظائد الجولہ، ص ۱۶۔ تفریح السامعین، ص ۲۹۰۲۵)

مطبوعہ مصر

سید عبدالقادر جیلانی کا یہ کرامت نامہ خاصا طویل ہے، تاہم اتنے اقتباس میں بھی آپ کی چار کرامتیں تو واضح ہو ہی جاتی ہیں۔ یعنی ① آپ کا پانی پر چلنا ② بکثرت پھیلیوں کی حاضری ③ پھیلیوں کا آپ کے دست مبارک کو چومنا، اگرچہ آپ کا ہاتھ پانی کی سطح سے ڈیڑھ، دو فٹ کی

لہ رسالہ قشیر یہ کو بھی روح تصوف کے مصنف نے اہات کتب میں شمار کیا ہے۔ روح تصوف، ص،

بندی پڑھا اور ۴) آپ کے اوپر ایک طلائی اور نقرئی مرصع مصلیٰ کا ساتھ ساتھ ہوا میں چلتے ہوا
اب مشکل یہ ہے کہ اس واقعہ یا ان کرامتوں کے راوی پہل بن عبداللہ تسری (ولادت ۲۰۳ھ، وفات ۲۸۳ھ)
بحوالہ انسائیکلو پیڈیا اسلامی مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور، جلد ۱۱، ص ۱۲۴، ہیں، جو حضرت عبدالقادر جیلانی
کی پیدائش (۴۰ھ) سے ۸۴ سال پہلے فوت ہو چکے تھے۔ اندیس صورت یہ روایت اور کرامت کیونکر
معتبر سمجھی جاسکتی ہے۔

اب قادری صاحب کا یہ اعلان کہ۔ آپ کی کسی تصنیف میں سے کوئی حوالہ غلط ثابت ہونے
پر ایک صد روپیہ انعام دیا جائے گا، اپنی جگہ درست بھی ہو تو ایسی تحقیق اور محنت کا کیا فائدہ؟ جب کہ
تذکرہ کی اصل تصنیفات میں تاریخی لغزشیں بدستور موجود ہیں۔

۴۔ ”پھر آپ (فرید الدین گنج شکر) نے اس موقع پر فرمایا: ”ایک دفعہ رسول خدا ﷺ صحابہ کے
ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یزید پلید کو کندھے پر بٹھائے ہوئے جارہے تھے
رسول خدا ﷺ نے تبسم کیا اور فرمایا: سبحان اللہ دوزخی بہشتی کے کندھے پر سوار ہوئے جارہا ہے۔“
جب یہ کلمہ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سنا، تو حال پوچھا کہ ”یا رسول اللہ! یہ تو معاویہ
کا لڑکا ہے، دوزخی کہاں سے ہے؟“ کہا۔ ”اے علی رضی اللہ عنہ! یہ یزید وہ بد نصیب لڑکا ہے جو میرے
حسن حسین اور میری ساری آل کو شہید کرے گا۔“ (راختہ القلوب، ص ۲۰۶، محفوظات خواجہ فرید گنج شکر، مرتبہ
خواجہ نظام الدین اولیاء دہلی۔ ترجمہ غلام احمد بیاں مطبع مجتبیٰ دہلی)

یہ پورا اقتباس تو ہم آگے چل کر باب میں شیعیت سے لگاؤ کے عنوان کے تحت بیان کریں گے۔
سر دست ہم یہ بتلانا چاہتے کہ:

- ۱۔ یزید، رسول اللہ ﷺ کی وفات کے پندرہ سال بعد ۶۲ھ میں پیدا ہوئے تھے، تو رسول اللہ
ﷺ یہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ دوزخی بہشتی کے کندھے پر سوا ہے۔
- ۲۔ امام حسنؑ کا سن وفات ۵۰ھ ہے اور کہ بلا کا واقعہ گیارہ سال بعد ۶۱ھ میں پیش آتا ہے۔ پھر یزید
نے امام حسنؑ کو کیسے شہید کیا تھا؟

اب ایسی تاریخی لغزشوں کی تین ہی وجوہ ہو سکتی ہیں:

- ۱۔ خواجہ صاحب موصوف کا تاریخ سے متعلق مبلغ علم ہی اتنا ہو۔

۲۔ اگر یہ علم انہیں باطنی طور پر حاصل ہوا، یا بذریعہ کشف و مشاہدہ معلوم ہوا، تو پھر یہ علم غلط قرار پاتا ہے۔
 ۳۔ تذکرہ نگاروں نے ملفوظات وغیرہ میں سب کچھ رطب و یابس اکٹھا کر دیا ہے۔

پھر جہاں تاریخی واقعات کا یہ حال تھا اور معتقدین تو سبحان اللہ سبحان اللہ کہنے میں مگن اور سرشار ہوں اور مخالفین انہیں خرافات سمجھ کر درخور اعتنا ہی نہ سمجھتے ہوں، تو پھر آخر ان روایات کی صحت کی ضرورت بھی کسے رہ جاتی ہے؟

۳۔ زندگی کا دوسرا پہلو | ہر انسان کی، خواہ وہ نبی ہو، زندگی میں بے شمار ایسے مقام بھی آتے ہیں جب کہ وہ مشیتِ ایزدی کے سامنے بے بس

ہوتا ہے، وہ پریشان بھی ہوتا ہے۔ اپنی تکلیف رفع کرنے سے عاجز بھی ہوتا ہے جس کا اس کے پاس خدا کی ذات پر بھروسہ کے سوا کوئی حل نہیں ہوتا۔ ایسے تذکرے اس پہلو سے بالکل خاموش ہوتے ہیں۔ اگر حضور اکرم ﷺ جیسی مقدس، سستی کو ان کی آرزو کے برعکس موت سے ہجرت کا حکم دیا جاتا ہے یا جنگ میں شکست کا منظر دکھایا جاسکتا ہے یا دندان مبارک شہید اور آپ خود زخمی ہو سکتے ہیں۔ واقعہ افگت میں ایک طویل مدت پریشان رہ سکتے ہیں، موت کے سکرات سے پریشان ہو سکتے ہیں اور ایسے مقامات پر خدا کی ذات پر بھروسہ کے سوا کوئی حل نظر نہیں آتا، تو اور کون انسان ہوگا جو اپنی زندگی میں بے بس نہ ہو، لیکن ان تذکروں میں یہ پہلو عموماً منقوڈ ہوتا ہے۔

۴ روایتِ کرامت میں اختلاف | اگر ایک عقیدت مند کسی بزرگ کی ایک کرامت کو ایک رنگ میں پیش کرتے ہیں تو دوسرے عقیدت مند اسی بزرگ کی اُسی کرامت کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں، جو مبالغہ آرائی کا ایک واضح ثبوت ہوتا ہے۔ مثلاً کتاب ”سرچشمہ حیات“ کے مصنف عبدالعزیز خاوری اس کتاب کے صفحہ ۶ پر حضرت ابراہیم بن ادھم کی ایک کرامت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

”مشہور ولی اللہ ابراہیم ادھم جب بلخ کی حکومت چھوڑ کر فقیری اختیار کر چکے، تو ایک دن دریا کے کنارے گڈری سینے لگے، تو آپ کا ایک سابقہ وزیر پاس سے گزرا، عرض کیا یا حضرت! کہاں وہ شوکتِ شاہانہ اور کہاں یہ رنگِ فقیرانہ۔ آپ نے سوئی دریا میں ڈال دی اور فرمایا: فوج کو بلا کر کہو کہ سب بل کر میری سوئی نکال لائیں۔ اس نے کہا یہ ممکن نہیں۔ آپ نے دریا پر نظر ڈالی۔ پانی کی سطح پر مچھلیاں تھیں،

اور ایک کے منہ میں وہ سوئی تھی۔“

اب اسی واقعہ کو حافظ احمد الدین چشتی اپنی تصنیف ”مقربان حق“ بنظر ثانی پروفیسر بشیر الدین مطبوعہ قرآن سوسائٹی، لاہور کے صفحہ ۹۶ پر یوں لکھتے ہیں:

”نقل ہے ایک بار آپ درجہ کے کنائے بیٹھے تھے۔ ایک مہربان کہنے لگا ”آپ نے بلخ کی شاہی چھوڑ کر کیا پایا؟“ گویا آپ نے ناحی تکلیف اٹھائی آپ نے سوئی دریا میں ڈال دی۔ ہزار ہچکچلا سونے اور چاندی کی سویاں منہ میں لئے ظاہر ہوئیں، آپ نے فرمایا: مجھے اپنی سوئی چاہیے۔ فوراً ایک پھلی آگے بڑھی اور وہ لوہے کی سوئی لے کر آئی۔ آپ نے لے لی، پھر اس امیر سے فرمایا: ”یہ خدا کا ادنیٰ احسان ہے، جو تو نے دیکھا۔“

اب دیکھئے پہلے اقتباس میں سوال و جواب کا ربط ہے اور کرامت بھی اتنی ہی بیان کی گئی ہے جو شافی جواب پر دلالت کرتی ہے اور بوقت ضرورت بعض دفعہ اللہ تعالیٰ مہربانی فرما کر بزرگوں سے ایسی کرامت کا اظہار فرما بھی دیتے ہیں، لیکن دوسرے اقتباس میں محض ایک ”بہت بڑی کرامت“ کا اظہار مقصود ہے۔ بیشتر باتوں کا فاضل واقعہ سے کوئی تعلق بھی معلوم نہیں ہوتا۔

اسی طرح ایک بزرگ حضرت اویس قرنیؓ ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے انہیں خیر التائبین کے لقب سے ملقب فرمایا، مسلم شریف کی یہ روایت ہے ہم مشکوٰۃ مترجم و معجم من فوائد غزنویہ سے مع ترجمہ اور حاشیہ کے نقل کرتے ہیں:

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ
اللهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ”إِنَّ رَجُلًا يَأْتِيكُمْ
مِنَ الْيَمَنِ، يَقَالُ لَهُ أَوَيْتُمْ لِي
يَدْعُ بِالْيَمَنِ غَيْرَ أُمِّ لَهْ، قَدْ كَانَ لَهْ
بَيَاصُ فَدَعَا اللهُ فَأَذْهَبَهُ إِلَّا
مَوْضِعَ الدِّينَارِ أَوِ الذِّرْهَمِ فَمَنْ
لَقِيَهُ مِنْكُمْ فَلْيَسْتَغْفِرْ لَكُمْ“

روایت ہے حضرت عمر بن خطابؓ سے یہ
کہ تحقیق رسول خدا ﷺ نے فرمایا: ”ایک شخص آئے
گا کہنا ہے پاس میں سے، کہا جاوے گا نے ایسے چھوٹے
گاہن میں سولے اپنی ماں کے تحقیق تھی اس کے بدن میں
سفید پیر دھماکی اللہ تعالیٰ سے۔ پس دُور کیا اللہ نے اس کو
مگر مقدار ایک دینار یا درہم کے۔ پس جس کو کہے ایس
تم میں سے، پس چاہئے کہ وہ بخشش طلب کرے
تہا سے لئے۔“

وَفِي رَايَةٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: "إِنَّ خَيْرَ التَّالِبِينَ رَجُلٌ يُقَالُ لَهُ أَوَّلِي، وَلَهُ وَلَدَةٌ وَكَانَ لَهُ يَلْمُزُ فَمَرُوه فَلَيْسَ تَغْفِرُ لَكُمْ" (مسلم)

اور ایک روایت میں ہے کہ کہا حضرت عمرؓ نے، میں نے رسول اللہ ﷺ سے، "تحقیق بہتر تابعین میں سے ایک شخص ہے کہا جائے گا اس کو اویس، اور اس کے لئے ماں ہے اور تھے اس کے برص پس مکم کنا اس کو استغفار کرے تھا اے لئے۔"

اب کتاب سیرۃ خواجہ اویس قرنی مسمی "الاویس" مصنفہ ارشد اویسی مطبوعہ اویس پبلشرز بلال گنج، لاہور کی مبالغہ آرائیاں ملاحظہ فرمائیے:

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ حضور اکرم ﷺ کی زیارت کو گئے، آپ حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں داخل ہو گئے اور پوچھا: "حضور کہاں ہیں اور کب آئیں گے؟" جواب ملا: "تبلیغ کو گئے ہیں اور ظہر کے وقت آئیں گے۔ آپ نے انتظار نہیں کیا اور واپس چلے آئے اور حضرت عائشہؓ کو کہا کہ جب حضور اکرم ﷺ واپس آئیں تو میرا سلام عرض کر دینا۔ چنانچہ جب حضور ﷺ آئے تو حضرت عائشہؓ نے واقعہ بیان کیا اور سلام عرض کیا، آپ نے سلام کا جواب دیا اور پوچھا کیا تم نے اویس کو دیکھا ہے؟"

حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے فرمایا ہاں! دیکھا ہے۔ یہ جواب سن کر حضور پُر نورؐ باہر تشریف لائے اور تمام صحابہ کرامؓ کو بلایا۔ سب کے سب موجود صحابہ کرامؓ بلا واسطہ ہی محبت اقدس میں حاضر ہو گئے، آپ نے فرمایا: "میرے چہرے کی طرف دیکھو،" سب نے حکم کی تعمیل کی اور آپ کے چہرہ اقدس کی طرف دیکھا۔ پھر آپ نے فرمایا:

"اویس قرنی نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی طرف دیکھا وہ بخشنی گئی اور حضرت عائشہ صدیقہؓ نے میری طرف دیکھا، میں بخشنا گیا، اور تم سب نے میری طرف دیکھا، تم سب بخشنے لگے۔" (ص ۳۴)

۱۔ استغفار کرے تھا اے لئے، اس حدیث سے اویس قرنیؓ کی بڑی عود فضیلت ثابت ہوئی، اویس قرنیؓ تابعین میں ہے صحابی نہیں۔ ہر چند حضرت کے وقت میں موجود تھے، لیکن ماں کی خدمت سے فرصت نہ پائی کہ حضرت کے حضور میں حاضر ہوتے۔ اس حدیث سے اویس قرنیؓ کی صحابہؓ پر فضیلت ثابت نہیں ہوتی، کہ تابعی اصحاب سے افضل نہیں ہو سکتا اور صرف دعا کرانے سے فضیلت ثابت نہیں ہوتی اس واسطے کہ خود حضرت نے اپنے واسطے بعض لوگوں سے دعا کروائی ہے، بلکہ پانچوں وقت کی اذان میں تم اتھ سے مقام ممڈ کے محل ہونے کے واسطے دعا کرنے کو فرمایا۔ (مشکوٰۃ، ج ۴، ص ۵۳۰)

غور فرمائیے! یہ واقعہ ایک ”ولی“ کے مقابلہ میں حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کیا تصویر پیش کر رہا ہے۔ نیز بلا اجازت حضرت اولیس کا حجرہ میں داخل ہونے اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی بے حجابی کو بھی۔

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ ”قیامت کے دن حضور اکرم ﷺ خدا تعالیٰ سے درخواست کریں گے کہ سب مومنوں نے مجھے دیکھا اور میں نے انہیں دیکھا مگر اولیس نے نہ مجھے دیکھا ہے اور نہ میں نے اُن کو۔“ بارگاہ الہی سے ارشاد ہوگا۔ ”آپ کو جو کوئی دیکھتا ہے میرے لئے پھر جب مجھے دیکھ لیا جائے تو آپ سے نہ ملنے میں کوئی قباحت نہیں۔“ (ایضاً، ص ۴۲)

غور فرمایا آپ نے، محبت رسول ﷺ، جسے شریعت نے ایمان کا جزو اعظم قرار دیا ہے، کا کیسا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ کہ کوئیلس نے اس دنیا میں دیدار الہی کے امکان کا مسئلہ بھی حل فرمادیا۔

تیسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ ”ہر پیغمبر کے زمانہ میں قطب ہوتے ہیں اور خواجہ اولیس قرنی نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے خصوصی قطب تھے۔“ (ایضاً ص ۴۳)

اولیس قرنی کا جبہ

چوتھے مقام پر فرماتے ہیں: ”جب حضور اکرم ﷺ کے وصال کا وقت ہوا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: آپ کا جبہ کس کو دیا جائے، فرمایا، اولیس قرنی کو۔“ (ایضاً، ص ۴۴)

اب اسی حدیث کے راوی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ سے اولیس قرنی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ آپ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں۔ پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں پھر اپنے زمانہ میں تلاش کرتے رہے۔ ہر شخص سے جو عراق، مصر، شام اور یمن سے آتا۔ خواجہ اولیس کے متعلق پوچھتے مگر بے سود۔“ (ایضاً، ص ۴۴)

”اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی ساتھ لے کر اس مہم کو سر کرنے نکلتے ہیں۔ بعض روایات کے مطابق آپ دونوں کو فز کی طرف، بعض کے مطابق وادی نمرو اور بعض روایات کے مطابق لہ قطب کون جوتا ہے؟ یہ جاننے کے لئے اسی کتاب میں ”طریقہ کا باطنی سیاسی نظام“ ملاحظہ فرمائیے۔

اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غالباً اس لئے ہم پر بھیجا جا رہا ہے کہ وہ حدیث کے راوی ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس لئے کہ وہ اکشر تذکرہ نگاروں کے خیال میں اس میں ”طریقہ“ کے جدِ اعلیٰ ہیں۔ لہذا اس مہم کے لئے یہی دو اشخاص موزوں تر ہو سکتے تھے۔ رہا جبہ والا معاملہ تو اس کے متعلق متضاد روایات آچے ہو تھے با صواب میں بیان کی جا رہی گی۔

وادی عرفات کی طرف گئے۔ وہاں اویس موجود تھے، جو نماز ادا کر رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر نماز جلد ختم کی۔ حضرت عمرؓ نے آپ کے ہاتھ کا نشان دیکھنے کے بعد دعا کی درخواست کی۔ اویسؓ نے پوچھا آپ کون ہیں؟ حضرت علیؓ نے فرمایا: یہ امیر المؤمنین حضرت عمرؓ ہیں۔ اویس علی ابن ابی طالبؓ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے حضور اکرم ﷺ کا پیغام پہنچایا اور فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ میری امت کے لئے مغفرت کی دعا کریں اور ساتھ ہی جُبَّہ مبارک حضور اکرم ﷺ والا پیش کیا خواجہ نے جُبَّہ لیا، سینے سے لگایا، چوما اور پاس رکھ لیا۔ پھر کچھ دوسری باتیں ہوتی رہیں، آخر حضرت عمرؓ نے فرمایا، جُبَّہ مبارک پہن لیجئے اور دعا کیجئے۔ آپ نے جُبَّہ سامنے رکھا اور سجدہ میں گر گئے اور دعا کرنے لگے۔

”اے باری تعالیٰ! یہ جُبَّہ اس وقت تک نہ پہنوں گا جب تک ساری امت کو بخش دے، حضور اکرم ﷺ نے، حضرت عمر فاروقؓ نے، حضرت علیؓ نے اور میں نے سب نے اپنا کام پورا کیا، اب تیرا کام باقی ہے۔“ غائبانہ آواز آئی۔ ”امت بخش دی گئی ہے، جُبَّہ پہن لیں، اب خواجہ نے جواب دیا۔ ”ساری امت کی بخشش چاہتا ہوں“ ابھی اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ آگئے۔ دیکھتے ہیں کہ اتنی دیر کیوں کر دی۔ حضرت خواجہؒ نے آہٹ محسوس کی تو آپ اٹھ بیٹھے اور فرمایا: ”کاش! تم نہ آتے اور میں اس وقت تک جُبَّہ نہ پہنتا، جب تک ساری امت محمدیہؑ کو نہ بخشوا لیتا۔“ (ایضاً، اقتباس، از ص ۴۴ تا ۵۲)

عقیدت اور مبالغہ آرائی کی حد دیکھی آپ نے۔ خواجہؒ کی نظرِ کرم کی وجہ سے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی پھر خود حضور ﷺ کی بخشش ہو رہی ہے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ جیسے خلفائے راشدین آپ کی جستجو میں سرگرداں اور اس مہم کو سر کرنے نہ سکتے ہیں۔ پھر خواجہ اللہ سے ساری امت کی بخشش اس طرح سے چاہتے ہیں کہ اگر نہ کی گئی، تو وہ حضور ﷺ کا جُبَّہ نہ پہنیں گے۔ ایسے تذکرے پڑھ کر عوام یہ تو اندازہ نہیں کر سکتے کہ ان کرامات کی شریعت کے کون کون سے نصوص و احکام پر زرد پڑ رہی ہے۔ البتہ ان خرافات کو حقیقت سمجھ کر سبحان اللہ سبحان اللہ کے نعرے لگاتے اور انہیں بزرگوں کو حاجت و آواز اور مشکل کشا سمجھ کر ان کے حلقہٴ دام کے ایسیر بن جاتے ہیں۔

ہم یہاں پیرانِ پیر کی وسعتِ علم کا ایک واقعہ بطور مثال پیش کریں گے۔ اس طرح کے بہت سے واقعات آپ کو اس کتاب

۵۔ مبالغہ آرائی کی حد

میں مناسب مقام پر مل جائیں گے۔

قادری صاحب "سیرت غوث" کے صفحہ ۵ پر رقمطراز ہیں کہ:

"غوث اعظم کے علم و عرفان کی شہرت جب دور دراز تک پھیل گئی، تو بغداد کے اجل فقہائیں سے ایک شوالہ فقہاء آپ کا امتحان لینے کی غرض سے حاضر ہوئے۔ ان میں سے ہر فقہیہ بہت سے پیچیدہ مسائل لے کر حاضر ہوا، جب وہ فقہیہ بیٹھ گئے، تو آپ نے اپنی گردن جھکالی، آپ کے سینہ مبارک سے نور کی ایک کرن ظاہر ہوئی، جو ان سب کے سینوں پر پڑی۔ جس سے وہ سب سوال، جو ان کے دلوں میں تھے، سلب ہو گئے۔ وہ سخت پریشان اور مضرب ہوئے۔ سب نے مل کر زور سے بیخ ماری اور اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ اپنی پگڑیاں پھینک دیں۔ اس کے بعد آپ کرسی پر جلوہ افروز ہوئے اور ان کے سوالات، جو وہ اپنے دلوں میں لے کر آئے تھے، کے جوابات ارشاد فرمائے جس پر سب فقہائے آپ کے علم و فضل کا اعتراف کیا۔" (جامع کرامات، ج ۲، ۱۔ قلائد البجاء، ص ۳۳۔ طبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۱۲۸۔ نزہۃ الخاطر، ص ۶۸۔ تفریح الخاطر، ص ۵۱۔ تحفہ قلوبیہ، ص ۴۲)

اب دیکھئے بغداد میں ہی دس علمائے حدیث نے امام بخاری کا امتحان لیا تھا۔ وہ یوں کہ ان دس آدمیوں میں سے ہر ایک نے امام بخاری کے سامنے دس دس حدیثیں پڑھیں (یعنی کل ستو حدیثیں پڑھی گئیں) اور انہوں نے کیا یہ تھا کہ ان احادیث کی اسانید اور متون کو گڈ ٹڈ کر دیا تھا۔ ہر حدیث سننے کے بعد امام بخاری کہہ دیتے کہ مجھے اس کا علم نہیں۔ جب یہ حضرات سوا حدیث پوری پڑھ چکے، تو آپ نے پہلے شخص کو بلایا اور کہا کہ آپ نے جو احادیث پڑھی ہیں۔ فلاں فلاں حدیث کے متون کی اسانید یہ اور یہ ہیں اور فلاں اسانید کے متن یہ ہیں۔ اسی طرح آپ نے پوری سوا احادیث کے اسانید اور متون کو بالکل صحیح صحیح بیان فرمادیا، تو آپ کی اس وسعت علم و حافظہ کا انہیں قائل ہونا پڑا اور نتیجتاً آپ امام المحدثین کے لقب سے نوازے گئے۔

معلوم ہوتا ہے عبد القادر جیلانی کے کسی عقیدت مند نے امام بخاری کو لے واقعہ کی ریس میں یہ افسانہ گھڑا، پھر مذکورہ بالا چھ تذکرہ نگاروں نے اسے درج فرمایا۔ اب سوال یہ ہے کہ امام بخاری کو تو اس امتحان کے بعد امام المحدثین کا لقب دیا گیا شیخ جیلانی کو بھی کسی نے امام الفقہاء سمجھا؟ اصل بات یہ ہے کہ:

۱۔ ان تذکرہ نگاروں کو بس کرامات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کا شوق ہوتا ہے جو وہ پورا کر لیتے ہیں۔

سوچنے کی بات ہے کہ جب شیخ عبدالقادر نے نور کی کرن ڈال کر اُن پر وجد طاری کر دیا اور اُن کی مَنت ماری، تو اب جو کچھ بھی پیران پیر جواب دیتے، یہ بغداد کے سوا جمل فقہاء اسے ٹھیک نہ کہتے تو کہا جتے۔
۲۔ اجل فقہاء کے لفظ سے تو یوں پتہ چلتا ہے کہ بغداد کے سب لوگ فقیہ ہی تھے ان میں سوا جمل فقہاء شیخ صاحب کا امتحان لینے گئے تھے۔

۳۔ ان سوا جمل فقیہوں میں سے ہر ایک نے بہت سے پیچیدہ فقہی سوالات سوچ رکھے تھے۔ اور اگر اب ان مسائل کا اندازہ اوسطاً پانچ مسائل فی فقیہ لگائیں، تو یہ پانچ صدی پیچیدہ فقہی مسائل بنتے ہیں جن کا ایک مجلس میں مدلل جواب دینا ناممکنات سے ہے، الا یہ کہ کوئی صاحب نور کی کرن پھینک کر ان کا ناطقہ بند کر دیں۔

۴۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ نور کی کرن ہمیشہ خطِ مستقیم میں سفر کرتی ہے۔ پیران پیر کے سینہ سے نور کی ایک کرن ایک وقت سب پر کیسے پڑ گئی؟ ہو سکتا ہے کہ سوا جمل فقہاء ایک قطار بنا کر کھڑے ہو گئے ہوں، اور یہ نور کی کرن سب کے جسموں کو چھیدتی ہوئی پار کھل کر سب پر یکدم جا پڑی ہو۔ ہر حال یہ سب باتیں مذکورہ بالا چھ تذکرہ نگار ہی خوب سمجھ سکتے ہیں۔ رموزِ مملکتِ خولش خسراں دانند

پھر جن علمائے حق نے ایسے صوفیوں کے عقائد اور کتابوں پر اعتراض کئے، ان صوفیوں نے

۶۔ الحاقی مضامین اور جعلی تصانیف

ان سے انتقام یوں لیا کہ ان کی کتابوں میں اپنی طرف سے ایسے مضامین شامل کر دیے جس سے دینِ طریقت کے نظریات کو تقویت پہنچ سکے۔ چنانچہ امام شعرانی خود اپنی کتابوں کے متعلق ایک دلچسپ اور عبرت انگیز تجربہ لکھتے ہیں۔ اَلْأَجْوِبَةُ الْمَرْضِيَّةُ میں فرماتے ہیں کہ:

”میری کتاب البحر المودود فی الموائع والعمود، میں بعض حادوں نے ایسے مضامین شامل کر دیے۔ جو مخالفِ شریعت تھے اور جامع ازہر وغیرہ میں اُن کو خوب گشت کر لیا اس سے ایک فتنہ کھڑا ہو گیا، یہاں تک کہ میں نے اپنا صحیح اور محفوظ نسخہ علماء کے پاس بھیجا جس پر بڑے بڑے علماء و مشائخ اسلام نے تقریظ و توثیق لکھی تھی۔ اس وقت ان کو ان الحاقی مضامین کی حقیقت معلوم ہوئی اور فتنہ فرو ہوا۔ اور امام غزالیؒ کے متعلق بھی بعض علماء کا خیال ہے کہ بعض صوفی قسم کے لوگوں نے مستقل کتب میں تصنیف کر کے امام غزالیؒ کے نام سے منسوب کر دی ہیں۔ پھر ان کتب کی وسیع پیمانے پر شاعت بھی کی

جا چکی ہے۔ مثلاً المضمون بہ علی غیر اہلہ، المضمون بہ علی اہلہ، معارج القدس، مشکوٰۃ الانوار، ایسی ہی بے اصل کتابیں ہیں جو امام غزالی کے دشمنوں اور بدخواہوں نے خود تصنیف کر کے ان کے نام منسوب کر دی ہیں۔ (تاریخ دعوت و عزیمت، ج ۲، ص ۱۵۴) واللہ اعلم بالصواب، اسی طرح بعض حضرات کے نزدیک قصیدہ غوثیہ بھی سید عبدالقادر جیلانی کی طرف خواہ مخواہ منسوب کیا گیا ہے۔

ہمیں فریب کا یہ پہلو اس لئے اُجاگر کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے کہ اس کتاب میں آپ کے جابجا ایسے صحیح العقیدہ اور مشہور قبیح سنت اولیائے کرام کے ایسے اقتباس بھی ملیں گے جن کا ان بزرگ حضرات کی طرف نسبت کرنا گراں بار گزرتا ہے، مگر چونکہ ان کے معتقدین اور کرم فرماؤں کی مہربانی سے یہ کُتنب چھپ کر متداول ہیں۔ لہذا ہم یہ اقتباسات درج کرنے میں حق بجانب ہیں۔

حضرت شیخ عبدالقادرؒ کی اپنی تصنیف غنیۃ الطالبین میں اتباع سنت پر زور دیا گیا ہے، مگر جب ہم اخبار الانبیاء مصنفہ علیہم السلام دہلوی جیسے تذکرے دیکھتے ہیں، تو بہت سی باتیں جو ان کی طرف منسوب ہیں، بدعت اور صریح شرک تک جا پہنچتی ہیں۔ چند ایک اقتباسات آپ خود بھی ملاحظہ فرمالیں گے۔

اسی طرح حضرت مجدد الف ثانیؒ شریعتِ مطہرہ کی تائید اور صوفیاء کے نظریاتِ باطل کی تردید میں یوں رقمطراز ہیں:

”اس طرح کا مقولہ شیخ کبیر مینی کا جو یا شیخ اکبر شامی کا۔ ہمیں محمد عربیؐ کا کلام در کا ہے نہ کہ محی الدین (ابن عربی) صد الدین قونوی اور عبدالرزاق کاشی کا۔ ہم کو نص سے کام ہے نہ کہ فص لے سے، فتوحاتِ مدینہ نے ہم کو فتوحاتِ مکہ سے بے نیاز کر دیا ہے۔“ (مکتوبات اہم ربانی، مکتوبت، ج ۱، بحوالہ: تاریخ دعوت و عزیمت، ج ۲، ص ۱۵۳، از ابوالحسن علی ندوی)

مگر جب انہی حضرت مجدد الف ثانیؒ کو محفوظات اور تذکروں کے آئینہ میں دیکھتے ہیں تو یہ بزرگ بھی کچھ اور ہی شخصیت نظر آنے لگتے ہیں۔



لے ابن عربی کی مشہور کتاب ”فصوص الحکم“ کی طرف اشارہ ہے۔
لے فتوحاتِ مکہ بھی ابن عربی ہی کی تصنیف ہے۔ ابن عربی نے بہت سے باطل نظریات کو تصوف میں داخل کر دیا۔ جن کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

دینِ طریقت کے نظریات و عقائد

دینِ طریقت کے آفاقی مذہب ہونے کا جو دعویٰ کیا جاتا ہے، تو وہ اس لحاظ سے نہیں کہ اس میں عالمگیریت اور ہمہ گیریت پائی جاتی ہے اور جملہ بنی نوع انسان کو پیش آمدہ مسائل کے حل کرنے کا ضامن ہے، بلکہ یہ دعویٰ اس لحاظ سے ہے کہ یہ دین زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے اور دنیا کے تمام مذاہب میں موجود رہا ہے۔

اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ ان دینِ طریقت کے پیروکاروں کو سینٹ کہتے تھے، قرآن نے ان کے لئے رہبان کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ہندوؤں میں ایسے لوگ جوگی، گرد، سادھو، رشی، مونی کے مختلف ناموں سے موسوم کئے جاتے ہیں۔ بدھ مت ایسے لوگوں کو بھگشو کا نام دیتا ہے۔ سکھ انہیں گیانی کہتے ہیں اور مسلمانوں میں ایسے لوگوں کے بے شمار نام مشہور ہیں۔ مثلاً پیر، فقیر، مُرشد، درویش، صوفی، خداسیدہ، بزرگ، عارف، مجذوب، واصل باللہ، واصل بخفی، قطب، ابدال، غوث وغیرہ وغیرہ۔ جن میں سے کچھ نام ان کے مراتب کے لحاظ سے رکھے گئے ہیں۔

اس مذہب کی اصل بنیاد ذاتی مکاشفات و مشاہدات پر ہوتی ہے، لیکن ان مشاہدات و مکاشفات میں فروعی اختلاف کے باوجود چند باتیں ایسی ہیں جن پر ان سب مذاہب کا اتفاق ہو جاتا ہے۔ ایسی ہی متفق ملیہ باتوں کو دینِ طریقت میں نظریات و عقائد کی حیثیت حاصل ہے جو مراتب کے لحاظ سے درج ذیل ہیں :

یعنی انسان چلہ کشی اور ریاضتوں کے ذریعہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اسے کائنات کی ہر چیز میں خدا نظر آنے لگتا ہے، بلکہ وہ ہر چیز

۱۔ وحدت الوجود

کو خدا کی ذات کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس قدر مشترک کے لحاظ سے ایک بدکار انسان اور ایک بزرگ، ایک درخت اور ایک پھو، پہلے اتنے باغ اور ایک غلامت کا ڈھیر سب برابر ہوتے ہیں؛ کیونکہ ان سب میں خدا موجود ہے۔

جب انسان اس مقام سے ترقی کر جاتا ہے تو اس کی ہستی خدا کی ہستی میں مدغم ہو جاتی ہے اور وہ دونوں ایک ہی ہو جاتے ہیں۔ گویا یہ نظریہ خدا کی ہستی کو کائنات سے الگ تسلیم تو کرتا ہے اور اس کائنات کو خدا کا پرتو یا سایہ تصور کرتا ہے، لیکن مزید روحانی ترقی کے بعد خود کو خدا کی ذات میں گم کر دیتا ہے۔

۲۔ وحدت الشہود

اس سے اگلا مقام یہ ہے کہ انسان اپنے آئینہ دل کو اتنا لطیف اور صاف بنا لیتا ہے کہ خدا کی ذات خود اس کے جسم میں داخل ہو جاتی ہے یا حلول کر جاتی ہے۔ گویا وحدت الشہود میں تو انسان روحانی ترقی کرتا کرتا خدا کی ذات میں جا مدغم ہوتا ہے لیکن حلول میں خدا خود اپنے مرتبہ سے نیچے اتر کر انسان کے جسم میں داخل ہو کر مدغم ہو جاتا ہے۔

بالفاظ دیگر ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وحدت الشہود اور حلول، وحدت الوجود ہی کے دوسرے پہلو یا ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔ اصل الأصول وحدت الوجود ہی ہے۔

۳۔ حلول

دینِ طریقت کے پیروکاروں میں کم و بیش مندرجہ بالا تینوں عقائد پائے جاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی خاص فرد کسی ایک نظریے کو زیادہ نمایاں کرتا اور اس کا علمبردار بن جاتا ہے۔ بعد میں اس شخص کے معتقدین اسی نظریے کے پرچارک بن جاتے ہیں۔ گو دینِ طریقت کے مراتب و مقامات کی رو سے یہی ترتیب درست ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے مگر چونکہ اسلام میں سب سے پہلے حلول کا عقیدہ در آیا ہے اس لئے ہم اس ترتیب کو ملحوظ رکھ کر پہلے ”حلول“ کی تفصیل بیان کریں گے۔

حلول کا نظریہ

خدا کا کسی انسان کے جسم میں حلول کر جانے کا عقیدہ یہود و نصاریٰ میں بھی پایا جاتا تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ

اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں اور عیسائی

النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ذَلِكُمْ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ (۹)

کہتے ہیں کہ مسیح خدا کے بیٹے ہیں۔ یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں۔ پہلے کافر بھی اسی طرح کی باتیں کہا کرتے تھے۔

اس آیت سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں:-

۱۔ حلول کا عقیدہ یہود و نصاریٰ سے پہلے بھی دنیا میں پایا جاتا تھا۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے پہلے بھی موجود تھا۔

۲۔ حلول کا عقیدہ ایسا نظریہ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔ صرف منہ کی باتیں ہیں اور مزید یہ کہ یہ صریح کفر ہے۔

ایک دوسرے مقام پر اس عقیدہ کی اور زیادہ وضاحت ہوتی ہے، ارشاد باری ہے:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ (۵)

بلاشبہ وہ لوگ کافر ہیں، جو کہتے ہیں کہ مریم کے بیٹے مسیح ہی خدا ہیں۔

پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ خدا صرف کسی نبی ہی کے جسم میں حلول کرے۔ دوسرے پیروں، فقیروں کے جسم میں بھی حلول کر سکتا ہے۔ دیکھئے ایک عیسائی راہب اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کا کیسے اظہار کر رہا ہے:

”سینٹ پال کا قول ہے، ہم ذاتِ باری میں مسلسل تحلیل ہوتے رہتے ہیں۔ جب ایک شے دوسری میں غم ہو جائے، تو ان دونوں کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ میں بھی خدا میں تحلیل ہو رہا ہوں اور وہ ذاتِ برحق مجھ سے ہم آہنگ ہو رہی ہے۔ قسم ہے اس زندہ جاوید خدا کی کہ اب مجھ میں اور خالق کائنات میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہا، ہم اب دونوں ایک ہی ہیں۔“

”وہ آنکھ جس سے میں دیدارِ خداوندی سے لطف افروز ہوتا ہوں۔ اسی آنکھ سے وہ علیم و بصیر ذاتِ میرا انتظار کر رہی ہے۔ میری آنکھ اور خدا کی آنکھ دونوں ایک ہی ہیں۔“

اقتباس بالا میں ”حلول“ کے علاوہ ”وحدت الوجود“ کی صاف جھلک دکھائی دے رہی ہے۔

۳۔ ایک مشہور فلسفی اور صوفی، جسے قرون وسطیٰ میں بڑی شہرت حاصل رہی ہے (دعوت ۳۵، صفحہ ۲۱۳ بحوالہ مذہب و

تجدید مذہب، پروفیسر عبدالمجید صدیقی)۔

میسائی راہب سینٹ پال کی طرح ایک مسلمان صوفی عبدالکریم جلی (م - ۸۲۰ھ) حلول کے متعلق اپنا ذاتی تجربہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

”میں نے اپنا وجود کھو دیا، پھر وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) میری طرف سے مجھ میں قائم مقام ہوا۔ یہ عوض جلیل القدر تھا، بلکہ بعینہ میں ہی تھا۔ پس میں وہ تھا اور وہ میں تھا۔ وجود مفرد تھا۔ جس کے لئے کوئی جھگڑنے والا نہ تھا۔ میں اس کے ساتھ اس میں باقی رہا اور فرق ہمارے درمیان سے اٹھ گیا اور میرا حال ماضی و مضارع میں ایک ہی جیسا ہو گیا، لیکن میں نے اپنے نفس کو بند کیا۔ پھر حجاب اٹھ گیا اور میں اپنی نیند سے بیدار ہوا گویا کہ میں لیٹا ہی نہ تھا۔ میں نے اپنی چشم حقیقت سے اپنے آپ کو حق دیکھا۔“ (انسان کامل ص ۱۸۱)

غور فرمائیے ! ایک میسائی راہب اور ایک مسلمان صوفی کے اندازِ بیان یا اندازِ فکر میں کچھ فرق ہے؟

ہندوستان میں بھی یہ سب نظریات قدیم سے پائے جاتے ہیں۔ ہندوؤں میں ایسے انسان کو جس کے بدن میں خدا اتر آتا ہے، اوتار کہتے ہیں۔ رام چند جی اور کرشن ان کے ایسے ہی اوتار ہیں جنہیں یہ لوگ خدائی صفات کے حامل قرار دیتے ہیں۔

اور مسلمانوں میں اس عقیدہ کی صدائے بازگشت ان الفاظ میں سنائی دے رہی ہے۔
وہی جو مستویٰ عرش تھا خدا ہو کر اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفیٰ ہو کر
اسی طرح ایک دوسرا شجر ے

اپنا اللہ میاں نے ہند میں نام رکھ لیا خواجہ غریب نواز
بھی اس عقیدہ حلول کی وضاحت کر رہا ہے۔

اسلام میں عقیدہ حلول کی ابتداء
اسلام میں اس عقیدہ کی داغ بیل عبداللہ بن سبا یہودی نے ڈالی تھی۔ یہ شخص مین کے شہر صنعا کا رہنے والا اور نہایت ذہین و فطین آدمی تھا۔ قرونِ اولیٰ میں یہودیوں کو جو ذلت نصیب ہوئی اس کا انتقام لینے کے لئے منافقانہ طور پر مسلمان ہوا، کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ عملی میدان میں اب مسلمانوں سے انتقام لینے کی یہودیوں میں سکت باقی نہیں رہ گئی۔ لہذا وہ مسلمانوں کے عقائد میں تفرقہ کے بیج بو کر کشت و

انتشار پیدا کرنا چاہتا تھا۔ یہ شخص درویشی کا لبادہ اوڑھ کر زہد و تقویٰ کے رُوپ میں سامنے آیا اور اسی زہد و تقویٰ کی ریاکاری سے تو مسلمانوں کو اپنا گریہ بنالیا۔ یہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مسلمان ہوا اور حالات کے دھارے کا انتظار کرتا رہا۔ اس کی یہ سازشی تحریک انتہائی مخفیہ طور پر مکہ اور مدینہ سے دُور دُور کُوفہ، بصرہ اور مصر میں کام کر رہی تھی۔ بالآخر اسی یہودی کے حامیوں نے حضرت عثمانؓ پر مختلف الزامات عاید کئے اور موقعہ پا کر غنڈہ گردی کر کے انہیں شہید کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ اسلام کے جسم پر اس نے دو طرح کے وار کئے اور اپنی سازش کی کامیابی کے لئے حضرت علیؓ کو بطور ہیرو منتخب کیا۔

۱۔ نو مسلم عجمی، لوگوں کو یہ تاثر دیا کہ رسول اکرم ﷺ سے قرابتداری کی بنا پر خلافت کے اصل حقدار حضرت علیؓ ہیں۔ اور پہلے تین غلیفوں نے حضرت علیؓ کا حق غصب کیا ہے نئے مسلمان جو ابھی اسلامی تعلیمات سے پوری طرح آشنا نہ تھے۔ دُنیا کے عام دستور وراثت و نیابت کے مطابق اس کی چال میں آگئے۔

۲۔ چونکہ خود درویشی کے رُوپ میں آیا تھا۔ لہذا ظاہر اور باطن کی تفریق کر کے اور شریعت و طریقت کے رموز بتلا کر ان نو مسلموں میں دین طریقت کے مہمانہ اور کافرانہ نظریات داخل کر دیئے اور بتلایا کہ حضرت علیؓ خدا کی ذات کا مظہر ہیں اور خدا ان کے بدن میں حلول کر گیا ہے۔

ایک دفعہ خود اُس نے کوفہ میں حضرت علیؓ کو مخاطب کلمہ کے رمز و کنایہ کی زبان میں کہا اَنْتَ هُوَ یعنی ”تو وہی ہے“ تو حضرت علیؓ اس کے نظریہ کو بھانپ گئے اور اسے سخت سرنش کی، بعد میں اسے سزا دینے کے لئے بلا بھیجا، لیکن معلوم ہوا کہ وہ کوفہ سے راہ فرار اختیار کر چکا ہے۔

بہر حال اس نے اپنے معتقدین کی ایک جماعت تیار کر لی تھی۔ ایک دفعہ یہ لوگ علی الاعلان بازار میں کھڑے ہو کر اپنے نظریہ کا پرچار کر رہے تھے۔ حضرت علیؓ کے غلام قنبر نے بھی یہ باتیں سنیں تو حضرت علیؓ کو جا کر اطلاع دی کہ کچھ لوگ آپ کو خدا کہہ رہے ہیں اور آپ میں خدائی صفات ملتے ہیں۔ آپ نے ان کو بلایا۔ یہ قوم زُط کے ستر (۷۰) اشخاص تھے۔ ان سے آپ نے پوچھا: تم کیا کہتے ہو؟ انہوں نے کہا: ”آپ ہمارے رب ہیں اور خالق و رازق ہیں۔“ آپ نے فرمایا: ”تم پر افسوس

ہے۔ میں تو تم جیسا ایک بندہ ہوں، تمہاری طرح کھانا اور پیتا ہوں، اگر اللہ کی اطاعت کروں گا تو مجھے اجر دے گا اور اس کی نافرمانی کروں گا، تو مجھے سزا دے گا، لہذا تم خدا سے ڈرو اور اس عقیدے کو چھوڑ دو۔“

دوسرے دن قنبر نے پھر حضرت علیؓ کو بتایا کہ وہ لوگ تو وہی کچھ کہہ رہے ہیں۔ آپ نے دوبارہ انہیں بلایا اور پھر تنبیہ اور سزنش کی، لیکن پھر بھی یہ لوگ باز نہ آئے۔ تیسرے دن آپ نے بلا کر ان کو یہ دھمکی بھی دی کہ اگر تم نے پھر یہی بات کہی تو میں تم کو بدترین طریقہ سے سزا دوں گا۔ مگر وہ اپنی بات پر اڑے رہے۔ آپ نے ایک گڑھا کھدوایا اور اس میں آگ جلوائی اور ان سے کہا: ”دیکھو! اب بھی باز آ جاؤ۔ ورنہ اس گڑھے میں پھینک دوں گا، مگر وہ اپنے عقیدہ پر قائم رہے تب حضرت علیؓ کے حکم سے آگ میں پھینک دیئے گئے۔“ (فتح الباری، ص ۲۳۸ ج ۱۲)

امام بخاری نے یہ حدیث مختصر بخاری کتاب استتابة المرتدین میں درج فرمائی ہے اور ان حوالیوں کے لئے ”زناده“ کا لفظ استعمال کیا ہے اور یہ بھی صراحت کی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کہتے تھے کہ اگر میں حاکم ہوتا، تو ان لوگوں کو جلانے کے بجائے قتل کر ڈالتا۔

حلول کا عقیدہ رکھنے والے وہ لوگ جو بیچ رہے تھے۔ وہ اپنے عقیدہ میں اور بھی سخت ہو گئے ان کی دلیل یہ تھی کہ ”آگ اور پانی کا عذاب (جلا کر مار ڈالنے یا ڈبو کر مار ڈالنے کی سزا) صرف اللہ تعالیٰ ہی کو سزاوار ہے اور حضرت علیؓ نے بھی جلایا ہے۔ لہذا وہ عین خدا ہیں۔ وہ زبان سے یہ کہتے تھے لَا يُعَذِّبُ إِلَّا رَبُّ النَّارِ یعنی آگ کا خدا ہی آگ سے عذاب دیتا ہے۔

عبد اللہ بن سبا کا یہ عقیدہ اس کے پیروکاروں حسین بن منصور حلاج (م ۳۰۹ھ) نصیریہ، کیسانیہ، قرامطیہ اور باطنیہ سے ہوتا

ہو اصفیاء کے اندر داخل ہو گیا۔ حسین بن منصور حلاج (م ۳۰۹ھ) اس عقیدہ کے علمبردار اعلیٰ تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان سے پہلے بھی ایسے صوفیاء گزرے ہیں، جو یہ عقیدہ رکھتے تھے مگر سینوں میں چھپا رکھتے تھے۔ اس عقیدہ کو شہرت دوام حلاج سے ہی ہوئی اس کا دعویٰ تھا کہ خدا اس کے اپنے اندر حلول کر گیا ہے۔

اسی وجہ سے وہ اَنَا الْحَقَّ کا نعرہ لگاتا تھا۔ اسے یہ بھی خوب معلوم تھا کہ اس کا یہ عقیدہ

مسلمانوں کے متفقہ عقیدہ کے سراسر خلاف ہے۔ اس سلسلہ میں اس کے اپنے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

عَقَدَ الْخَلَائِقُ فِي الْإِلَهِ عَقَائِدُ وَأَنَا اعْتَقَدْتُ جَمِيعَ مَا اعْتَقَدُوا
إِلَهِ کے بارے میں لوگوں کے بہت سے عقیدے ہیں اور میں ان سب عقیدوں پر عقیدہ رکھتا ہوں۔

كَفَرْتُ بِدِينِ اللَّهِ وَالْكَفْرُ وَاجِبٌ لَدَيْ وَعِنْدَ الْمُسْلِمِينَ قَبِيحٌ
میں اللہ کے دین سے کفر کرتا ہوں اور یہ کفر میرے لئے واجب ہے جب کہ تمام مسلمانوں کے نزدیک یہ بُرا ہے۔

حلاج کے درج ذیل اشعار بہت مشہور ہیں:
سُبْحَانَ مَنْ أَظْهَرَ نَاسُوتَهُ سِرَّ سَنَا لَاهُوتِهِ الْمَثَاقِبُ
پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے ناسوت (یعنی حین بن منصور حلاج) کو اپنے لاهوتِ ثاقب کی چمک کا راز بنا کر ظاہر کیا۔

تَرَبَّدَا فِي خَلْقِهِ ظَاهِرًا فِي صُورَةِ الْأَكْلِ وَالشَّارِبِ
پھر وہ اپنی مخلوق میں ایک کھانے اور پینے والے کی صورت میں ظاہر ہوا۔
حَتَّى لَقَدْ عَايَنَهُ خَلْقَهُ كَلَحْظَةِ الْحَاجِبِ بِالْحَاجِبِ
یہاں تک کہ اس کی مخلوق نے اس کو اس طرح دیکھا، جس طرح ایک دیکھنے والا دوسرے کو دیکھتا ہے۔ (تاریخ بغداد للخطیب بغدادی، ج ۸، صفحہ ۱۲۹)

حسین بن منصور نے اپنے متعلق دین سے ارتداد اور کفر کا فتویٰ تو خود ہی لگا دیا۔ سمجھانے کے باوجود بھی جب وہ اپنے اس عقیدہ پر مصر رہا تو بالآخر اسے خلیفہ بغداد المقتدر باللہ نے ۲۴ ذی قعدہ ۳۰۹ھ (۹۱۴ء) کو بغداد میں قتل کر دیا۔ اور اس خدا کی لاش کو جلا کر دریا میں پھینک دیا گیا۔ اتنے شدید جرم کے باوجود صوفیاء کی اکثریت نے اُن کے حق پر ہونے اور اُن کے سزا دینے والوں کو باطل پر ہونے کا فیصلہ کیا اور کہا۔

روا باشد انا کجی از دستِ چپانہ بود روا از نیک بستِ

یعنی اگر ایک درخت سے اناج کی آواز درست ہو سکتی ہے تو ایک ”نیک بخت“ کی طرف سے یہ آواز کیوں درست نہیں ہو سکتی۔ گویا صوفیاء کے نزدیک دین سے ارتداد اور کفر کوئی جرم نہ تھا بلکہ عین توحید تھی۔ ان کے نزدیک اگر کچھ جرم تھا تو فقط یہ کہ حسین بن منصور نے اس اصل راز توحید کو فاش کیوں کر دیا۔ کسی شاعر نے اس بات کو یوں بیان کیا ہے

مَنْ بَاخَ بِالنِّسَرِ كَانَ الْقَتْلُ شَيْئَةً بَيْنَ الرِّجَالِ وَلَمْ يُؤْخَذْ لَهُ ثَارُ

ترجمہ: جو شخص راز فاش کر دے اس کا انجام قتل کے سوا کیا ہو اور ایسے مقتول کا بدلہ بھی نہیں لیا جاسکتا۔

مشہور متصوف عبد الکریم جلی (م ۸۲۰ھ) مصنف ”الانسان الکامل“ کا کمال یہ ہے کہ اس نے علول کے اس صریح کفریہ عقیدہ کو قرآن سے ہی ثابت کر دکھایا ہے۔ چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کی ”صفت سمع کی تجلی“ کے ذیلی عنوان کے تحت قلمراز ہے کہ:

”اور اس حقیقت سمع کی، تجلی سے خدا تعالیٰ اپنے بندوں سے بدوں حجاب اسماء کلام کرتا ہے، قبل تجلی اسماء کے۔ پھر بعض کلام کرنے والے ایسے ہیں جس سے حقیقت ذاتیہ (یعنی خدا تعالیٰ - مؤلف) اس کے نفس سے اس کے ساتھ سرگوشی کرتا ہے۔ پھر وہ (بندہ) بغیر جہت اور بغیر جارحہ (یعنی کان) کے کلام کو سنتا ہے اور کلام کا سننا اپنی کینت کے ساتھ ہوتا ہے۔ نہ کان سے پھر اس کو کہا جاتا ہے، تو میرا حبیب ہے، تو میرا محبوب ہے، تو مراد ہے، عباد میں میرا منہ ہے، تو مقصدِ انشیٰ اور مقصدِ اعلیٰ ہے، اسرار میں تو میرا ستر ہے، انوار میں تو میرا نور ہے، تو میرا عین، تو میری زینت، تو میرا جمال، تو میرا کمال، تو میرا اسم، تو میری ذات، تو میری نعمت، تو میری صفات، میں تیرا اسم، میں تیری رسم، میں تیری ملامت، میں تیری نشانی ہوں، تو موجودات کا خلاصہ اور حدوث و مقصود ہے، تو میرے شہود کی طرف قریب ہوتا ہے، میں اپنے وجود سے تیرے قریب ہوتا ہوں، تو دور نہ ہو۔ پھر میں ہی

لے واضح رہے کہ وہ درخت خود نہیں بول رہا تھا۔ نہ اس کے اندر سے یہ آواز آئی تھی بلکہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق (۱۱) اس پُر اس دادی کے دائیں کان سے پر ایک درخت تھا جس میں سے ہو کر یہ آواز آرہی تھی جبکہ حسین بن منصور خود خدا کی دعوت پر تھے

بعض صوفیاء اس درخت لیل آواز کو اسی عقیدہ علول کے تحت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آواز قرار دیتے ہیں۔

وہ ہوں، جو میں نے کہا خُتُّ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ہم اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ اسمِ عبد سے مقتید نہ ہو (یعنی اب تمہیں میرا عبد بننے کی ضرورت نہیں، مؤلف) پھر اگر گدب نہ ہوتا، تو بندہ بھی نہ ہوتا، تو نے مجھے ظاہر کیا، جیسا کہ میں نے تجھے ظاہر کیا اگر تیری عبودیت نہ ہوتی، تو میری ربوبیت ظاہر نہ ہوتی۔ تو نے مجھے موجود کیا جیسا کہ میں نے تجھے موجود کیا۔ پھر اگر تیرا وجود نہ ہوتا، تو میرا بھی وجود نہ ہوتا۔“ (انسان کامل، ص ۱۱۳)

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ کی اسرار و رموز کی زبان میں یہ لاجواب تشریح پڑھنے کے بعد کسی شاعر کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے۔
من تو شدم تو من شدی من جان شدم تو تن شدی تاکس نہ گوید بعد ازاں من دیگر م تو دیگر می

حسین بن منصور حلاج کا مقام اولیا کے کرام کی نظر میں

حضرت علی ہجویری (م ۴۶۵ھ) ان کی مدح میں یوں رقمطراز ہیں کہ:

”انہیں میں سے مستغرق منیٰ ابوالغیث حضرت حسین بن منصور حلاج رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ سرستان بادۂ وحدت اور مشاقِ جمالِ احادیث گزے ہیں اور ہایت قویِ احوالِ مشائخ نئے رکشہ الجوب صنفِ حضرت علی ہجویری، ص ۳۰

پھر فرماتے ہیں کہ: ”دیکھتے نہیں کہ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ حضرت حسین بن منصور کی شان میں کیا فرما رہے ہیں۔ آپ کا اعلان ہے: اَنَا وَالْحَلَّاجُ فِي شَيْءٍ وَاحِدٍ فَخَلَفْنِي جَنُوفٍ وَاَهْلَكَ عَقْلَهُ یعنی میں اور حسین بن منصور حلاج ایک ہی طریق پر ہیں مگر مجھے میرے دیوانہ پن نے آزاد کرادیا (اصل ترجمہ ”چھپے رکھا“ ہونا چاہیے۔ مؤلف) اور حسین بن منصور کو اس کی عقلندی نے ہلاک کرادیا۔“

اگر معاذ اللہ وہ بے دین ہوتے، تو شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے فرماتے کہ میں اور حلاج ایک ہی چیز ہیں۔ حضرت محمد بن خنیف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: هُوَ الْعَرَبَانِي حَسِينُ بْنُ مَنْصُورٍ حَلَّاجٌ عَالِمٌ رَبَّانِي

تھے اور اے آوروں نے بھی بہت کچھ تعریف کی اور انہیں بزرگ بتایا “ (کشف المحجوب، ص ۳۰۲)
 (محوالہ تفسیر خاص ص ۳۸)
 حضرت علی ہجویری کے بیان سے مندرجہ ذیل نتائج نکلتے ہیں:

۱۔ یہ بزرگ صحابی نہ ہونے کے باوجود ”رضی اللہ عنہ“ ہیں۔

۲۔ ان کی بزرگی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انہیں شبلیؒ نے اپنا ہم مسلک قرار دیا ہے۔ یہ ایسی دلیل ہے جو تقلیدِ آباء پر ختم ہو جاتی ہے۔

۳۔ آپ کے سوا دوسرے بزرگوں نے بھی انہیں بزرگ (بڑی شان والے صوفی) تسلیم کیا ہے
 اپنی شنوئی میں فرماتے ہیں۔

مولانا رومؒ

گفت فرعون نے انا الحق گشت پست گفت منصوے انا الحق گشت مست
 لعنة الله ایں انا راد قہف رحمۃ الله ایں انا راد قہف
 ترجمہ: فرعون نے انا الحق کہا تو ذلیل ہو گیا اور منصوے نے انا الحق کہا تو (عشق و محبت میں) مست
 قرار پایا۔ فرعون کی خودی کے لئے تو بعد میں اللہ کی لعنت ہی رہ گئی اور منصوے کی خودی کے لئے بعد میں
 اللہ کی رحمت رہی ہے۔

پیران پیر، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی (م ۵۶۱ھ) کا مندرجہ ذیل
 اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

”حضرت شیخ نے فرمایا کہ حین بن منصوے حلاج کے زمانہ میں کوئی اُن کی دستگیری کرنے والا اور جس
 لغزش میں وہ مبتلا ہوئے، کوئی بچانے والا نہیں تھا۔ اگر میں ان کے زمانے میں ہوتا، تو ان کی دستگیری
 کرتا اور نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔“ (اخبار الاخبار، مصنفہ عبدالحق محدث دہلوی، ترجمہ اردو، مولانا سہمان محمود، ص ۳۹)
 شیخ عبدالقادر، حلاج کی کس قسم کی دستگیری فرمانا چاہتے تھے، یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے
 وہ اسے اس عقیدہ سے باز رکھنا چاہتے تھے یا اس عقیدہ کو سینہ میں چھپانے کی تلقین کرنا چاہتے تھے۔ یا
 علمائے وقت کے فتویٰ سے اختلاف کر کے انہیں بچالینا چاہتے تھے۔ بہر حال یہ بات واضح ہے کہ
 آپ کو حلاج سے ہمہ دی ضرور تھی۔

خواجہ نظام الدین اولیاء دہلی
 خواجہ نظام الدین اولیاء (م ۷۵۰ھ) ان کی بزرگی کے

اس قدر قائل تھے کہ آپ نے فرمایا :

”ذکر مشائخ کا ہو ہوا تھا۔ بندہ نے عرض کیا کہ سیدی احمد کیسے تھے؟ آپ نے فرمایا : وہ بزرگ شخص تھے۔ عرب کا قاعدہ ہے کہ جب کسی کو بزرگی سے یاد کرتے ہیں، تو اسے سیدی کہتے ہیں۔ وہ شیخ حسین بن منصور حلاج کے زمانے میں تھے۔ جب کہ ان کو جلایا گیا اور ان کی خاکِ مجلہ میں ڈالی گئی۔ سیدی احمد صاحب نے ذرا سی خاک اس میں سے تبرکاً اٹھا کر کھائی تھی۔ یہ ساری برکتیں اسی سبب سے انہیں حاصل تھیں۔“ (فوائد الفوائد، ملفوظات نظام الدین اولیاء صاحب۔ مرتبہ : خواجہ حسن دہلوی، ص ۴۱، ترجمہ : پروفیسر محمد سرور صاحب شائع کردہ : محکمہ اوقاف، پنجاب)

ملاحظہ فرمائیے کہ جب ان کی خاک تبرکاً کھانے سے اتنی برکتیں حاصل ہو جائیں، تو ان بزرگ کی بزرگی کا کیا عالم ہوگا؟

اب تذکرہ نگاروں کا اختلاف بھی ملاحظہ فرمائے۔ فوائد الفوائد میں تو مندرجہ بالا عبارت مذکور ہے لیکن اخبار الاخبار میں حضرت نظام الدین اولیاء کا حلاج کے متعلق فتویٰ یوں ہے۔

”اخبار الاخبار میں نویسد کہ از نظام الدین اولیاء سوال کردند کہ حکم شیخ ابن منصور حلاج چیست ؟ فرمود کہ ”مردود است جنید اور ارد کردہ بود۔ جنید مقتدلے وقت بود۔ رد اور تو ہمہ باشد۔“

ترجمہ : صاحب اخبار الاخبار لکھتا ہے کہ نظام الدین اولیاء سے پوچھا گیا کہ شیخ ابن منصور حلاج کے متعلق کیا ارشاد ہے؟ فرمایا : ”وہ مردود ہے۔ جنید نے اس کو رد کیا تھا۔ جنید مقتدلے وقت تھے۔“

ان کا رد کرنا سب کا رد کرنا ہے۔“ (المبلغ المبین فارسی از شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ص ۸، مطبوعہ مکتبہ سلفیہ لاہور) واضح رہے کہ حضرت جنیدؒ تو ۲۹۸ھ میں وفات پا گئے اور حلاج کے قتل کا واقعہ ۳۰۹ھ کے آخر

کا ہے۔ البتہ حضرت جنیدؒ کے مرید خاص شبلیؒ زندہ تھے اور وہ منصورؒ کے ہم خیال اور ہمزاتھے اور یہ بھی واضح رہے کہ فوائد الفوائد کے مطابق تو نظام الدین اولیاء حلاج کو بہت بڑا بزرگ قرار دیتے ہیں مگر اخبار الاخبار

لے احمد سے دفائی سلسلہ کا آغاز ہوتا ہے جس طرح ہمارے ملکہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جیسے شریکِ ولایت باوجود مصر میں مسیحاؒ کا ظہور کیا بعداً ہے۔ اب نظام الدین اولیاء صاحب کی تاریخ دانی کا یہ کام ہے کہ سیدی احمد کو ملحق کا ہر ذرا ہے یہ ہیں، ملاحظہ یہ بزرگ پلن پر کہ مصر تھے اولاً اس وفات

۴۱۲ھ ہے۔ (خزینۃ الاحیاء، ص ۱۱۱)۔ لے تذکرہ نگاروں کی تاریخ دانی بھی ملاحظہ فرمائیے اور ولایات کا اختلاف بھی۔ البتہ ممکن ہے کہ حلاج کے نظریات اس کی وفات سے بہت عرصہ پہلے پھیل چکے ہوں اور حضرت جنیدؒ نے ان کو مردود قرار دیا ہو لیکن وہ اس کے قتل کے وقت زندہ نہ تھے۔

میں مردود قرار دے رہے ہیں۔

حلول کا عقیدہ آج تک مسلمانوں میں متواتر چلا آرہا ہے۔ چنانچہ امام اہل سنت، احمد رضا خان بریلوی فرماتے

امام اہلسنت رضا خان بریلوی

ہیں :

سوال : ”حضرت منصوٰ و تبریز دوسرے نے ایسے الفاظ کہے جن سے خدائی ثابت ہے، لیکن وہ ولی اللہ گنے جاتے ہیں اور فرعون، شداد، ہامان و عمرو نے دعویٰ کیا تھا تو مغلہ فی النار ہوئے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟“

جواب : ”ان کافروں نے خود کہا اور ملعون ہوئے اور انہوں نے خود نہ کہا۔ اس نے کہا جسے کہنا شایاں ہے اور آواز بھی انہی سے سموع ہوئی۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درخت سے سنا اِنِّیْ اَنَا اللّٰهُ میں ہوں رب اللہ سا ہے جہاں کا، کیا درخت نے کہا تھا۔ حاشا بلکہ اللہ نے۔ یونہی یہ حضرات اس وقت شجر موسیٰ ہوتے ہیں۔“ (احکام شریعت، ص ۹۳)

دیکھئے عقیدہ حلول کی کس قسم کے اسرار و رموز سے وکالت فرما رہے ہیں، فرعون، عمرو وغیرہ کو اللہ نے جہنمی قرار دیا اور اس کی اطلاع قرآن میں دی ہے۔ حلاج دوسرے وغیرہ کو ولی تو آپ لوگ کہتے ہیں۔ عاصم المسلمین نے تو منصوٰ کو زینبی اور کافر قرار دیا اور باقی دونوں کا انہم اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر یہی ”امام اہل سنت“ فرماتے ہیں :

”حضور پر نور ستیدنا غوث اعظم علیہ السلام حضور اقدس و انور سید عالم کے وارثِ کامل و نائبِ تام وائینہ ذات ہیں کہ حضور پر نور ﷺ مع اپنی جمیع صفات جمال و جلال و کمال و افضال کے ان میں متجلی ہیں جس طرح ذاتِ عزتِ احدیت مع جملہ صفات و نعوت و جلالتِ آیینہ محمدی ﷺ میں تجلی فرما ہے۔“ (فتاویٰ افریقہ، ص ۱۰۱)

ہم نے بغرض اختصار صرف چار پانچ مشہور صوفیہ کے اقباسات پر اکتفا کیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ صوفیاء کی اکثریت آج تک منصور کو اس صریح کفر کے باوجود بہت بڑا متعبد اور راست باز ثابت کرنے کی کوشش کرتی اور اس کی مدافعت میں طرح طرح کی تاویلات پیش کرتی چلی آئی ہے۔ منجملہ ایک غدر ”حالتِ مکر“ کا ہے۔

سُکرا اور صُحُو کا امتیاز

صوفیاء کی طرف سے یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ حالت سُکر
کیفِ مستی میں اگر کسی بزرگ کے منہ سے ایسے خدائی صفات

کے حامل الفاظ یا خدائی کا دعویٰ زبان سے نکل جائے، تو وہ شرعی لحاظ سے قابلِ مواخذہ نہیں۔ سوال
یہ ہے کہ آخر یہ سُکر کب شرعی چیز ہے۔ حضور اکرم ﷺ یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر کبھی یہ کیفیت طاری ہوتی؟
تو کیا یہ بزرگ ان سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہیں؟ یہ سُکر تو بذاتِ خود ایک بدعت اور مصنوعی
چیز ہے اور اس کی وکالت اس سے بھی بدتر۔ اسی طرح کے چند اقوال بایزید بسطامی کی طرف منسوب ہیں
مثلاً آپ نے فرمایا:

سُبْعَانِیْ مَا اَعْظَمُ شَانِیْ
میں پاک ہوں، میری شان کتنی بڑی ہے۔
یا یہ بھی فرمایا:

مُلْکِیْ اَعْظَمُ مِنْ مُلْکِ اللّٰهِ
میرے بادشاہی، خدا کی بادشاہی سے زیادہ ہے۔
اور یوں بھی فرمایا کہ:

خُضُّنَا بَحْرًا وَوَقَفَ
الْاَنْبِیَاءُ بِسَاحِلِهِ
ہم تو صحرے کے، سمندر میں کود گئے جب کہ انبیاء
اس کے ساحل پر ہی کھڑے رہے۔ (فضائح صوفیہ،
ص ۱۰، از عبد الرحمن عبد الحامق، مطبوعہ کویت)

یہ تو خیر سُکر اور صُحُو کی بحث تھی حسین بن منصور حلاج کے متعلق تو بالاصراحت مذکور ہے کہ وہ اناحق
کا لغو صرف حالتِ سُکر میں ہی نہیں بلکہ صُحُو میں یعنی بقیاتی ہوش و حواس اپنے آپ کو اناحق کہتا تھا، تو پھر
اس سے بھی حمدِ دی کس بناء پر کی جاتی ہے؟

پھر صوفیاء کا یہ عذر بھی محض عذرِ لنگ ہے کیونکہ
بعض صوفیاء سُکر کو صُحُو (ہوشمندی) سے بہتر سمجھتے

سُکر اور صُحُو کی آڑ میں انبیاء پر تہمات

ہیں۔ جیسا کہ علی جویری اپنی کتاب کشف المحجوب میں ”الکلام فی الشکر والصُّحُو“
لے مولانا اشرف علی تھانوی سُکر پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

”اللہ کا ذکر ہوشِ برحمانہ کے لئے کیا جاتا ہے نہ کہ کھونٹے کے لئے خواجہ معید اللہ احرار کہتے ہیں کہ سُکر و تنفراق میں قرب نہیں

بڑھتا، کیونکہ اس میں عقل نہیں ہوتا، جو مدارِ قرب ہے۔“ (تہذیبِ تصوف، ص ۳۵)

کے تحت فرماتے ہیں :

”جان تو کہ اللہ عزوجل تجھے عزت عطا فرمائے سکر اور غلبہ ارباب معافی کے نزدیک حق تعالیٰ کی محبت کے غلبہ سے ہے اور صحو یعنی حصول مراد سے مراد ہے اور صاحبان معافی کو ان معنوں میں بہت ہی کلام ہے۔ ایک گروہ صحو کو سکرِ فضیلت دیتا ہے اور ایک گروہ سُکر کو صحوِ فضیلت دیتا ہے۔ اور وہ لوگ جو سُکر کو صحوِ فضیلت دیتے ہیں وہ بایزید (بسطامی) اور ان کے قبتعین ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ صحو اعتدالِ اوتیمکین پر آدمیت کی صفت سے صورت پذیر ہوتا ہے اور وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے حجابِ اعظم ہے۔ اور سکر کا آفت کے زوال اور بشریت کی صفات کے نقص پر اور اس کے اختیار اور تدبیر کی جانے اور اس کے تصرف کے حق میں فنا ہونے پر اطلاق کرتے ہیں۔ جب خدا کا فعل بندہ کی طرف منسوب ہوگا تب بندہ اپنے آپ کے ساتھ قائم ہوگا اور جب بندہ کا فعل خدا کی طرف منسوب ہوگا تب حق پر قائم ہوگا۔ جب بندہ اپنے آپ میں قائم ہوتا ہے (حالتِ صحو) تو وہ ایسا ہوتا ہے جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کی نظر اور یاہ کی عورت پر پڑی اور جو دیکھا، سو دیکھا اور جب بندہ خدا کے ساتھ قائم ہوتا ہے (حالتِ سکر) جیسے کہ ہمارے نبی اکرم ﷺ ہیں، تو اس کی نظر کا یہ عالم ہو جاتا ہے کہ جب اس کی نظر جنسِ عورت پر پڑتی ہے، تو حضرت زید رضی اللہ عنہ کی بیوی (زینب بنت جحش) خود حضرت زید رضی اللہ عنہ پر حرام ہو جاتی ہے اسکی وجہ یہی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت زید رضی اللہ عنہ محلِ صحو میں تھے اور ہمارے حضور ﷺ محلِ سُکر میں۔“ (کشف المحجوب، اردو ترجمہ از مولوی محمد حسین، ص ۲۶۶، مطبوعہ، ملک دین محمد اینڈ سنز لاہور)

جو بری صاحب کے اس اقتباس سے عروج ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں :

- ۱۔ صوفیاء کا ایک گروہ بالخصوص بایزید بسطامی اور اس کے قبتعین سُکر کو صحو سے بہتر سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک صحو (ہوشمندی) اللہ تعالیٰ کی محبت کے راستہ میں حجابِ اعظم ہے۔
- ۲۔ جو بری صاحب نے صحو و سکر کا فلسفہ بیان کر کے اور ان اصطلاحات کو نبیاء کی ذات سے منسوب کیے صحو و سکر دونوں کا جواز بھی پیش کر دیا ہے۔

۳۔ صحو کی حالت میں حضرت داؤد علیہ السلام کی نظر اور یاہ کی عورت پر پڑی، پھر دیکھا جو دیکھا۔ جیسے غلط الزام کی آپ نے تائید و توثیق فرمادی ہے۔ جس کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ (جنہیں تمام صوفیاء اپنا جدِ امجد سمجھتے ہیں) نے فرمایا تھا کہ جو شخص یہ بات بیان کرے گا میں اس کو حدِ قذف کا دو گنا یعنی ۸۰ دتے

لگاؤں گا کیونکہ اس نے ایک بنی پر تہمت لگائی جس کی سزا گنی چاہیے۔

۴۔ سکر کی آڑ میں اپنے حضور اکرم ﷺ کی عصمت کو داغدار فرمایا اور ایک ایسے الزام کی تائید و توثیق کر دی جسے سلام دشمن مصنفین اکثر اُچھالتے رہے ہیں۔ اگرچہ رطب و یابس اکٹھا کرنے والے بعض مفسرین نے بھی ایسی باتیں لکھ دی ہیں تاہم علمائے حق نے اس کی پر زور تردید بھی کر دی ہے نیز قرآن کے سیاق و سباق سے بھی ایسے الزام کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔

۵۔ ان سب باتوں کے باوجود بھوئی صاحب سکر و صحو دونوں حالتوں کو جائز اور درست کہتے ہیں اور ان واقعات اور حالات کو بھی جن پر آپ نے صحو اور سکر کا حکم لگا کر عصمتِ انبیاء کو داغدار فرمایا ہے۔

منصور حلاج کی تدبیر کی ترقی

خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ دیوبند میں ایک شخص پکڑا گیا جس کے ساتھ ایک تو برا تھا جسے وہ

کسی وقت بھی جدا نہیں کرتا تھا جب اس تو برے کی تلاشی لی گئی، تو اس میں سے ایک خطبر آمد ہوا جس میں ”من الرحيم الى فلان ابن فلان“ کے الفاظ لکھے تھے۔ یہ خط فوراً بغداد روانہ کیا گیا۔ قاضی کے سامنے حلاج کو پیش کیا گیا انہوں نے اعتراف کیا کہ یہ خط انہی کا لکھا ہوا ہے۔ قاضی نے پوچھا، ”تنے دن تک تو تم نبوت کا دعویٰ کرتے تھے اب ربوبیت کا بھی دعویٰ کرنے لگے ہو؟“ حلاج نے جواب دیا، ”میں ربوبیت کا دعویٰ نہیں کرتا، لیکن یہ ہمارے نزدیک عین الجمع ہے کیا کاتب اللہ کے سوا کوئی اور ہو سکتا ہے۔ میں اور میرا ہاتھ تو صرف ایک آکھ ہے۔“ (تاریخ بغداد، جلد ۸، ص ۳۸) اسی طرح شیخ ابن عربی نے حلاج کا ایک خط نقل کیا ہے جس کو انہوں نے اپنے ایک شاگرد کے نام لکھا ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے:

”اے میرے لڑکے! تجھ پر سلامتی ہو، خدا تجھ سے ظاہری شریعت کو چھپائے اور تجھ پر کفر کی حقیقت

۱۰ حضرت سعید بن مسیبؓ اور عمارت اعمور نے حضرت علیؓ سے روایت کیا ہے کہ:

مَنْ حَدَّثَكُمْ بِحَدِيثِ دَاوُدَ
عَلَى مَا يَرَوِيهِ الْقِصَاصُ جَلَدَتْهُ يَأْتُهُ
وَسِتَيْنِ جَلْدَةٍ وَهُوَ حَدُّ الْفَرِيَةِ

تم میں سے جو کوئی حضرت داؤدؑ کے متعلق وہ باتیں بیان کرے گا جو قصہ گو اسرائیلیات سے بیان کرتے ہیں تو اس کی سزا ایک سو ساٹھ دترے ہے اور یہ انبیاء پر تہمت

کھولے کیونکہ شریعت کا ظاہر شرکِ خفی ہے اور کفر کی حقیقت معرفتِ جلیہ ہے۔ ابابعد.....“ (رسائل ابن عربی، مطبوعہ حیدرآباد، جز اول، رسالہ اہم رازی، ص ۱۳)

حلاج کے متعلق ابن عربی نے اپنی فتوحاتِ مکیہ میں ایک اور واقعہ نقل کیا ہے کہ مشہور بزرگ شیخ ابو عمرو بن عثمان کی حلاج کے سامنے سے گزری اور پوچھا کیا لکھ ہے ہو، حلاج نے جواب دیا ”قُلْ اَنْ کا جواب لکھ رہا ہوں۔“ یہ سن کر ابو عمرو بن عثمان کی نے بددعا کی اور انہی کی بددعا کا نتیجہ تھا کہ حلاج قتل کر دیا گیا۔

کیا یہ سب واقعات حالتِ سُکر کے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ حلاج پر باطنیت کے اثرات نمایاں تھے اور یوں بھی تصوفِ شیمیت (عبداللہ بن سبا کا پیدا کردہ فرقہ) سے متاثر ہے۔ حلاج کے متعلق اہم ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیمؒ دونوں نے صاف لکھا ہے کہ وہ کافر تھا اور اس کے متعلق علماء کا فیصلہ بالکل ٹھیک تھا۔ اہم ابن تیمیہؒ ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

”کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حلاج فنا میں ڈوب گیا اور باطنی حقیقت سے معذور تھا، مگر ظاہری طور پر اس کا قتل واجب تھا اور کچھ دوسرے اسے شہید، فنا فی اللہ، موحّد اور محقق کہتے ہیں۔ یہ لوگ شریعت کی پرواہ نہیں کرتے۔“ پھر واضح الفاظ میں لکھتے ہیں:

”حلاج اپنے کفر کی وجہ سے قتل کیا گیا، وہ قرآن کا معارضہ کرتا تھا اس کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر کسی کا حج فوت ہو جائے، تو اپنے ہاں کعبہ بنا کر اس کا طواف کر سکتا ہے اور حج کے سوا تمام رسوم ادا کر سکتا ہے اور حج پر مبنی رقم خرچ ہو سکتی ہو اس کو صدقہ دے سکتا ہے۔“ آگے چل کر لکھتے ہیں:

”جنیدؒ، عمرو بن عثمان کی اور ابو یعقوبؒ جیسے حلیل القدر مشائخ نے حلاج کی مذمت کی ہے۔ اگر کوئی شخص حلاج کے متعلق حسن ظن رکھتا ہے تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ وہ اصل حالات سے آگاہ نہیں۔“

(مجموعہ الرسائل الحنبلی، جلد ۲، ص ۹۹ تا ۱۰۰)

رسالہ معارف، جلد ۲، شمارہ ۴، میں
”حسین بن منصور حلاج کی تاریخی شخصیت“

سید سلیمان ندویؒ اور حسین بن منصور حلاج

کے عنوان سے سید سلیمان ندویؒ کا ایک بصیرت افروز مضمون چھپا تھا جس کے چیدہ چیدہ اقتباسات درج ذیل ہیں:

”حسین بن منصور حلاج ایران میں پیدا ہوئے۔ ان کا دادا پارسی تھا۔ باپ مسلمان ہوا۔ آبائی وطن ٹہر بیضا ہے۔ حسین نے واسط میں جو بصرہ اور کوفہ کے درمیان واقع ہے، نشوونما پائی۔ اس کی آمد و رفت بغداد میں بھی ثابت ہے۔ سن ولادت معلوم نہیں۔ ۳۱۰ھ میں بغداد میں قتل ہوا۔“

”تاریخ کی کتب اس امر پر متفق ہیں کہ حلاج نیزنگ، شعبہ بازی اور ہاتھوں کے کھیل میں بہت چالاک اور مشاق تھا۔ روپے برساتا تھا، طرح طرح کے میوے منگواتا، ہوا میں اڑتا اور اس کے علاوہ بھی کئی عجائبات دکھاتا تھا۔ اس کے ایک ہم سفر کا بیان ہے کہ حسین اس کے ساتھ صرف اس غرض سے ہندوستان آیا تھا کہ یہاں کی مشہور شعبہ بازیوں کی تعلیم حاصل کرے۔ چنانچہ اس نے میرے سامنے ایک عورت سے رستی پر چڑھ کر غائب ہو جانے کا فن دیکھا۔ راہ میں گڑھے کھود کر کہیں پانی، کہیں میوہ، کہیں کھانا پہلے سے چھپا دیتا۔ پھر اپنے ہمراہیوں کو لے کر اسی سمت میں سفر کرتا اور بوقت ضرورت کرامتوں کے تماشے دکھاتا۔“

سید سلیمان ندویؒ نے ابن سعد قرطبی، بغداد کے مشہور سیاح ابن موقل، مؤرخ ابن ندیم، ابوعلی بن مسکویہ، مسعودی، علامہ ابن جوزی، ابن اثیر اور امام اکھمین کی تواریخ سے ثابت کیا ہے کہ وہ ایک شعبہ باز اور گمراہ شخص تھا۔ چنانچہ ابن ندیم کے حوالہ سے، جو صرف ایک واسطے سے روایت کرتا ہے، لکھتے ہیں کہ :

(ترجمہ) ”حسین بن منصور حلاج ایک جیلہ گر اور شعبہ باز آدمی تھا اس نے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے صوفیوں کے طریقے اختیار کئے تھے۔ صوفیوں کی طرح باتیں کرتا اور علم کے جانے کا دعویدار تھا، حالانکہ وہ اس سے خالی تھا۔ البتہ علمِ کیمیا میں اسے کچھ مہارت ضرور تھی۔ جب اپنے مریدوں کے پاس ہوتا، تو خدائی کا دعویٰ کرتا اور کہتا کہ خدا مجھ میں حلول کر گیا ہے اور جب سلاطین کے پاس جاتا، تو کہتا میں شیعہ مذہب کا آدمی ہوں اور عوام سے کہتا کہ میں ایک صوفی ہوں۔ البتہ یہ بات سب سے کہتا کہ خدا نے مجھ میں حلول کیا ہے اور میں بالکل خدا ہی ہوں۔“

اور ابن اثیر کی عبارت درج کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

(ترجمہ) ”حسین بن منصور کے قتل کا سبب یہ ہے کہ حلاج جب واپس بغداد آیا، تو کسی نے وزیر حامد بن عباس کو اطلاع دی کہ حلاج کہتا ہے کہ میں نے بہت لوگوں کو زندہ کیا ہے اور میں مردوں کو زندہ کر سکتا

ہوں اور بھت سے جنات میرے تابع ہیں اور میں جو چاہوں میرے پاس لاکھ حاضر کر دیتے ہیں۔ نیز یہ کہ بھت سے اہل کار میرے گردیدہ ہو گئے ہیں۔ نصر حاجب سرکاری دفاتر کا نگران بھی میری طرف مائل ہو گیا ہے اور اس کے علاوہ کئی بڑے بڑے لوگ حلقہ گوش ہو گئے ہیں۔ یہ سُن کر وزیر حامد بن عباس نے خلیفہ سے درخواست کی کہ علاج کا معاملہ اس کے سپرد کر دیا جائے لیکن نصر حاجب اڑے آیا جب وزیر نے اصرار کیا تو خلیفہ مقتدر باللہ نے منصور اور اس کے چیلوں کا معاملہ حامد بن عباس کے سپرد کر دیا۔“

حامد بن عباس نے علماء سے اس کے قتل کا فتویٰ طلب کیا، نو علماء اور فقہائے نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ثبوت کافی نہیں۔ پھر حامد نے علماء کے سامنے اس کی ایک کتاب پیش کی جس میں لکھا تھا کہ ”اگر کوئی شخص حج نہ کر سکے تو ایک صاف ستھری کوٹھری کو لپیپ پوت کر حج کے ارکان اس کے سامنے ادا کرے۔ پھر تین یتیموں کو بلوا کر انہیں عمدہ کھانا کھلائے، عمدہ کپڑے پہنائے اور سات سات درہم ان کے حوالے کر دے، تو اس کو حج کا ثواب مل جائے گا۔“ حامد بن عباس نے جب یہ فقرے قاضی القضاۃ کو سنائے، تو اس نے علاج سے پوچھا کہ اس کا ماخذ کیا ہے؟ علاج نے حسن بصری کی کتاب ”الاخلاص، کتاب السنۃ“ کا حوالہ دیا۔ علاج کی یہ کذب بیانی سُن کر قاضی القضاۃ غضب ناک ہو گیا کیونکہ کتاب مذکورہ وہ پڑھ چکا تھا اور اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی۔ بالآخر قاضی القضاۃ نے لکھ دیا کہ ایسے شخص کا خون حلال ہے۔ اس تحریر پر اور بھی کئی علماء نے دستخط کر دیئے۔ چنانچہ علاج ازداد اور زندہ کی سزا میں پہلے قتل کیا گیا، پھر جلایا گیا اور راکھ کو دریا برد کر دیا گیا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے پیروؤں نے وہی بات مشہور کر دی جو ہر نام مدعی کے پیرو کار کرتے ہیں۔ یعنی وہ مرا نہیں بلکہ زندہ ہے اور پھر لوٹ کر آئے گا۔ گنگافوس کہ وہ آج ہمک واپس نہ آسکا۔

حلول معین اور حلول مطلق

حسین بن منصور علاج سے عقیدت رکھنے والے جن بزرگوں کے اقتباسات پیش کئے گئے ہیں وہ ولایت کی دنیا میں آفتاب و ماہتاب کی مانند درخشندہ ہیں اور جن کی اسلامی خدمات اور ان کے تتبع سنت ہونے کو شک سے بالاتر سمجھا جاتا ہے جب ایسے اساطین کا یہ حال ہو تو عام ولیوں اور پیروں فقیروں کی اس عقیدہ سے جو وابستگی ہوگی اس کا اندازہ خود لگایا جاسکتا ہے۔

بعد کے ادوار میں حلول کا یہ شرکیہ عقیدہ اور بھی ترقی کر گیا اور یہ تسلیم کر لیا گیا کہ حلول کے لئے کسی معین ہستی

کی قید ضروری نہیں حلول ہر شخص میں ہو سکتا ہے اور اس کو حلولِ مطلق کا نام دیا گیا۔

حلولِ مطلق کے علمبرداروں میں سے ایک عبد الکریم جیلیؒ ہے جو کہتا ہے کہ ”قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ“ میں ”هُوَ“ کا مرجع قُلْ میں مستتر ضمیر اَنْتَ ہے اور اس سے مراد انسانِ کامل ہے یعنی حضور اکرم ﷺ اس بے نیابت کا ماخذ دراصل محی الدین کا یہ قول ہے ”سُبْحَنَ مَنْ أَظْهَرَ الْأَشْيَاءَ وَهُوَ عَيْنُهَا“ یعنی پاک ہے وہ ذات جس نے اشیاء کو ظہور کا لباس پہنایا۔ جب کہ اشیاء اور اس کی ذات ایک ہی ہے۔ جیلی نے یہ بھی کہا ”عیسائی حلول کی بنا پر کافر قرار نہیں دیئے گئے۔ بلکہ اُن کے کفر کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے عام اشیاء کو چھوڑ کر صرف حضرت مسیح ﷺ میں ہی حلول کو خاص کیا۔ اگر وہ خدا کے حلول کو ہر چیز میں تسلیم کر لیتے، تو کافر نہ ہوتے۔“

نئے نئے خدا

انہی عقائد اتحاد و حلول اور ان کی بڑا حمایت کا یہ اثر ہوا کہ بعد کے ادوار میں کئی ”خدا“ پیدا ہوتے رہے اور ان کی خدائی کو بھی بنظرِ استحسان ہی دیکھا جاتا رہا ہے یہاں ہم گیارہویں صدی ہجری کے ایک خدا اور اس کے انجام کا ذکر کرتے ہیں مدنیۃ الاولیاء کے مصنف مفتی غلام سرگندہؒ کے صفحہ ۱۹ چچم سرمد دہلوی مقتول کے حالات قلب بند کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”یہ بزرگ صاحبِ جذب و سکروستی و استغراق و عشق و محبت تھا۔ پہلے یہودی مشرب تھا۔ کتابِ لغات کمال شوق سے پڑھا کرتا۔ من بعد مشرف بہ اسلام ہوا اور علومِ ظاہری میں تحصیل کی۔ اچانک حضرت عشق اس کے حال پر متوجہ ہوئے اور یہ ایک ہندو بچہ پر عاشق ہوا۔ مدت تک اس کے عشق کے دام میں مبتلا رہا من بعد بحکم الحب زلفطرة الحقیقت معشوقِ حقیقی کے عشق میں ایسا محو ہوا کہ دوئی کی گنجائش عاشق و معشوق میں نہ رہی اور یہ بے خود، بے ہوش، سرور پارہنہ کشوف الصوت کبھی بازاروں میں پھرا کرتا اور کبھی ویرانہ جنگل کو نکل جاتا۔ ہوتے ہوتے یہ حالت طاری ہوئی کہ ۷

من خدام من خدام من خدا

کہنے لگا جب یہ بات علمائے وقت کو معلوم ہوئی۔ سب نے باتفاق اس کے قتل کا فتوے لکھا اور رنگ زیب عالمگیر کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کے قتل کی اجازت چاہی۔ چنانچہ یہ بادشاہ کے حکم سے ”خدا“ میں قتل ہوا۔“

۷ عبد الکریم جیلی کا ایک اقتباس اس ضمن میں ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔ اس نے انسانِ کامل کھ کر ابن عربی کی کتابِ معصوم حکم کی ہی ایک طرح سے شرح پیش کی ہے۔

۲۔ وحدت الوجود

وحدت الوجود یہ ہے کہ کائنات کی ہر ایک چیز کائنات کے پھیلے ہوئے حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔ کسی ایک چیز کی دوسرے سے غیر تیت نہیں۔ سب موجودات میں محمل وحدت پائی جاتی ہے۔ گویا خدا کا کائنات سے اس طرح کا تعلق ہے جسے ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ بالفاظِ دیگر مادہ کی محدود دنیا خدا سے الگ اپنا کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی۔ ”ہمہ اوست“ اسی نظریہ کا دوسرا نام ہے۔ جس کے مطابق خدا ہی سب کچھ ہے اور سب کچھ ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ یہ کائنات خدا سے الگ کوئی مخلوق نہیں۔ بلکہ یہ کائنات ہی خدا اور خدا ہی کائنات ہے۔ وحدت الوجود کے قائلین اس کائنات کی مثال ایک بھر بیکراں سے دیتے ہیں جس میں ہر وقت موجیں اور جباب اٹھتے ہیں اور پھر اسی میں گم ہو جاتے ہیں۔ یہی صورت اس کائنات میں حوادث کی ہے۔ ہر آن نئی نئی اشیاء وجود میں آتی ہیں اور پھر اس میں ہی گم ہوتی رہتی ہیں۔

دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں ”ہمہ اوست“ کا یہ عقیدہ کسی نہ کسی شکل میں اختیار نہ کیا گیا ہو۔ ہندوؤں کے ہاں اس عقیدہ کا علمبردار شکر اچار یہ بتلایا جاتا ہے۔ ہندومت میں اس عقیدہ کی ہمہ گیری کا اندازہ اُنپنڈ کے مندرجہ ذیل شلوکوں سے لگایا جاسکتا ہے:

(اے ذاتِ برحق) تم تو اگ ہو،

تم تو سوج ہو،

تم ہوا ہو،

تم چاند ہو،

تم ستاروں سے روشن فلک ہو،

تم برہمنِ اعظم ہو،

تم جل ہو،

تم فی الحقیقت ان ساری چیزوں کے خالق ہو۔“ (اُپنشد ترجمہ از سوامی دیانند)

ہندوؤں ہی کا ایک فرقہ برہمن مت کائنات کی ہر چیز کو خدا ہی تصور کرتا ہے۔ اسی وجہ سے

ہندو مظاہر قدرت یعنی سورج، چاند، شجر و حجر، غرض ہر چیز کو خدا ہی سمجھ کر اُس کو اور اپنے افتادوں کے جمعوں کو پوجتے ہیں۔ وہ ”ہمہ دوست“ کی بجائے ”ہر میں ہر“ کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔
عیسائیوں میں اس نظریہ کی موجودگی کا اندازہ ایک اہلب کے درج ذیل بیان سے لگایا جاسکتا ہے
وہ جن الفاظ میں اپنے قلبی واردات کا اظہار کر رہا ہے۔ اس میں حلول اور وحدت الوجود دونوں پڑوشنی پڑتی ہے :

”مجھے آج تک وہ رات، بلکہ پہاڑی پر وہ جگہ اچھی طرح یاد ہے جب کہ میری رُوح لامحدود میں گم ہو گئی تھی اور دونوں عالم یعنی عالم خارجی اور عالم باطنی دونوں ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔ جیسے کہ ایک گہرا سمندر دوسرے گہرے سمندر کو لپکار رہا ہو۔ میری رُوح ذات مطلق میں پوری طرح گم تھی۔ مجھے خارجی دنیا کا کوئی احساس تک باقی نہ رہا تھا۔ مجھ پر ایک ناقابل بیان کیف وستی کا عالم طاری تھا اور مجھے چند لمحوں کے لئے یہ محسوس ہوا کہ میں کائنات اور خالق کائنات ایک دوسرے سے اس طرح ہم آہنگ ہیں جس طرح کہ کسی راگ کی مختلف دھنیں ایک نغمہ میں شامل ہو کر اپنی انفرادیت کھو دیتی ہیں۔ (RELIGIOUS

EXPERIENCE P 144 BY WILLIAM JAMES)

اسلامی تاریخ میں اس کے علمبردار
توشیح محی الدین ابن عربی، المعروف

اسلام میں نظریہ وحدت الوجود کی درآمد

شیخ اکبر (م ۶۳۸ ھ مطابق ۱۲۴۰ء) تسلیم کئے جاتے ہیں لیکن تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظریہ ان سے پہلے بھی مسلمان صوفیاء میں موجود تھا۔ اسلام میں تصوف کا آغاز دوسری ہجری کے آخر میں شروع ہوا اور تیسری صدی میں پُران چڑھا۔ اس دور کے سب صوفیہ میں کم و بیش یہ نظریہ موجود تھا۔ ایسے شواہد تو ہم بعد میں پیش کریں گے۔ سرمدت ہم ابن عربی کی تعلیمات سے آپ کو متعارف کرائیں گے جنہوں نے فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم جیسی کتابیں لکھ کر اس نظریہ کو صوفیہ کے عقائد میں داخل کر دیا اور پھر اپنی ساری زندگی اسی عقیدہ کی آبیاری میں کھپا دی، وہ اپنا نظریہ توحید ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

”ایک توحید عقل والے کی ہے اور ایک توحید عارف صاحب تجلیات کی۔ ان دونوں میں بڑا

ابن عربی کی توحید اور فتوحات مکیہ

فرق ہے۔ صاحب عقل، توحید کا شعروں پڑھے گا

وَفِي كُلِّ شَيْءٍ لَّهُ آيَةٌ تَدُلُّ عَلَى أَنَّهُ وَاحِدٌ
ترجمہ : اور ہر ایک چیز میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے ایک نشانی ہے، جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ ایک ہے۔

اور صاحبِ تجلی کا شعر یوں ہوگا۔
وَفِي كُلِّ شَيْءٍ لَّهُ آيَةٌ تَدُلُّ عَلَى أَنَّهُ عَيْنُهُ
ترجمہ : اور ہر ایک چیز میں اس کے لئے ایک نشانی ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ اسی کا عین ہے۔

ابن عربی نے خدا اور بندے کے تعلق کو کبوتر ختم کیا، وہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ فتوحاتِ مکبہ کے پہلے ہی صفحہ پر فرماتے ہیں :

۱ اَلرَّبُّ حَقٌّ وَالْعَبْدُ حَقٌّ يَأْتِيَتْ شِعْرِي مَنِ الْمَكْلَفُ
۲ اِنْ قُلْتَ عَبْدًا فَذَلِكَ مَيِّتٌ اَوْ قُلْتَ رَبًّا اَنْفٌ مُّكْلَفٌ
ترجمہ : پروردگار بھی حق ہے اور بندہ بھی حق۔ کاش ! میں معلوم کر سکتا کہ ان میں سے مکلف (مطیع) کون ہے۔

۲ اگر تم کہو کہ مکلف بندہ ہے، تو بندہ تو مردہ اور میت ہے اور اگر کہو رب ہے تو وہ بھلا مکلف کیسے ہو سکتا ہے۔

لیجئے تمام احکامِ شرعیہ کی پابندی اور تعمیل سے چھٹی ہوئی۔ یہ ہیں بندہ اور خدا سب کو عین ذات سمجھنے کے مزے۔ آپ اسی مضمون کو اپنے رسالہ "رسائل ابن عربی، کتاب الجلالۃ، ص ۱۲ پر یوں ادا فرماتے ہیں :
فَيَا لَيْتَ شِعْرِي مَنْ يَكُونُ مُكْلَفًا وَمَا تَمَّ إِلَّا اللَّهُ لَيْسَ سِوَاهُ
ترجمہ : کاش ! مجھے معلوم ہوتا کہ مکلف کون ہے؛ درآنحالیکہ یہاں اللہ کے سوا کسی کا وجود ہی نہیں ہے۔

ابن عربی کی فتوحاتِ مکبہ صرف باطنی علوم پر ہی متوی نہیں ہے بلکہ اس میں علمِ جفر اور علمِ نجوم (جولش) کے مباحث بھی شامل ہیں جن کی نفسِ انسانی پر تاثراتِ تسلیم کی گئی ہیں۔ (دائرة المعارف الاسلامیہ، ص ۱۳۰، زیر عنوان "علم تصوف")

فصوص الحکم کی تعلیمات

اب فصوص الحکم کی داستان بھی سن لیجئے فصوص، نص بمعنی نگیسنہ کی جمع ہے اور فصوص الحکم بمعنی دانائی کے نگیسنے۔ یہ کل ۲۰ فص یا نگیسنے

ہیں۔ ہر ایک فص کو قرآن کریم میں مذکور ۲۰ انبیاء سے منسوب کیا گیا ہے

اب عربی کا دعویٰ ہے کہ ان فصوص کا علم مجھے مشاہدہ سے حاصل ہوا ہے۔ میں نے اسے لوح محفوظ سے نقل کیا۔ بعد میں ۳۲۷ کے محرم میں حضرت محمد ﷺ کو دمشق کے شہر محروسہ میں دیکھا۔ آپ کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ آپ نے مجھ سے فرمایا: ”یہ کتاب فصوص الحکم ہے اس کو محفوظ کر دو اور لوگوں کے سامنے پیش کرو تا کہ انہیں فائدہ حاصل ہو۔ چنانچہ میں نے آپ کے حکم کے مطابق اسے لوگوں میں پھیلانے کا پختہ ارادہ کر لیا اور اس میں کمی بیشی کرنا میرے لئے ممکن نہ رہا۔ (فصوص، ص ۵۸۶، ۵۸۷)

آپ بھی یقیناً ایسی معرکہ الاراء کتاب کے مندرجات سے مستفید ہونا پسند فرمائیں گے۔ اس کتاب میں ابن عربی نے قرآن کی تفسیرات کی تحریف کر کے اس کا حلیہ بگاڑنے لکھ دیا ہے اور وحدت الوجود کی عینک چڑھا کر ہر واقعہ پر تبصرہ فرماتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ قوم ہود بھی صراطِ مستقیم پر تھی۔ فرعون کامل الایمان تھا اور قوم نوح بھی۔ اللہ پاک نے قوم نوح اور فرعون کو ان کے نیک اعمال کا بدلہ دیتے ہوئے وحدت الوجود کے سنہ میں غرق کیا۔ اور قوم ہود کو عشقِ الہی کی آگ میں داخل کیا تا کہ اسے عیش و آرام حاصل ہو۔ حضرت ہارون علیہ السلام سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ انہوں نے بنی اسرائیل کو بچھڑے کی عبادت سے منع کیا۔ حالانکہ بچھڑا بھی خدا تعالیٰ کا عکس اور حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے بھی نہایت اچھا کردار ادا کیا جو بت پرستی سے باز نہ آئے، کیونکہ یہ تمام بت خدا ہی کے مظاہر تھے۔ جہنم عذاب کی جگہ نہیں، بلکہ اس میں حلاوت اور شیرینی موجود ہے۔ (وہ عذاب کو عذوبت سے مشتق قرار دیتا ہے) وغیرہ ذلک من اکثرافات۔ (امام ابن تیمیہ، از کوکب مرئی)

زیر عنوان صوفیہ پر تنقید

دوزخ کی حقیقت

عبد الکرم حبلی (م ۸۲۰ھ) مصنف ”انسان کامل“ جو ایک طرح فصوص الحکم کا شارح ہے۔ دوزخ کی حقیقت کو ان الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

”پھر اس کے بعد جاننا چاہئے کہ آگ چونکہ وجود میں عارضی چیز تھی، لہذا اس کا زوال جائز ہوا اور اس کا زوال یہ تھا کہ جلانے کی صفت اس سے دور کر دی اور اتراق کی صفت کے دور ہونے سے اس کے فرشتے بھی چلے جائیں گے اور نعمتوں کے فرشتے ان کی جگہ پر آجائیں گے ان کے آنے میں اس (دوزخ)

میں تڑپتیزک (زقوم) کا درخت پیدا ہو جائے گا اور وہ سبز ہے اور جنت میں سب رنگوں سے اچھا رنگ سبز ہے پس معاملہ منکس ہو گیا کہ جو جہنم تھا، وہ نعیم بن گیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آگ کو گھڑا بنا دیا اور اس کا محل اب تک ویسے ہی باقی ہے، لیکن نارتیت چلی گئی، اگر تو چاہے تو کہہ سکتے ہو کہ آگ اُٹل نہیں ہوئی، لیکن عذاب کی تکلیف راحت کے ساتھ تبدیل ہو گئی۔ ایسا ہی قیامت کے دن جہنم کا حال ہوگا۔ چاہے تو کہہ دے کہ قدم رکھنے کے بعد بالکل آگ زائل ہو جائے گی اور چاہے تو یہ کہہ دے کہ وہ اپنے حال پر باقی ہے، لیکن تکلیف راحت سے بدل جائے گی۔ یہ دونوں احتمال صحیح ہو سکتے ہیں۔
(النیل کامل، ص ۳۰۱)

ابن عربی نے یہ مسئلہ تو حل کر دیا کہ تمام بُرت پرست اقوام حتیٰ پر تھیں اور یہ بھی حل فرما دیا کہ انہیں جو اس بُرت پرستی کے بدلہ میں عذاب ہوگا وہ دراصل عذاب نہیں بلکہ شیرینی اور حلاوت، ان کے اعمال کا اچھا بدلہ ہے۔ اب صرف یہ ابھن باقی رہ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو پھر کس غرض کے لئے مبعوث فرمایا؟ کاش! وہ اس بات کا بھی تسلی بخش جواب دے کر دینِ طریقت کی حقانیت ثابت کر دیتے۔
ابن عربی ایک نہایت بڑے عالم، ادیب، شاعر اور صوفی تھے۔ اپنی کتابوں میں اپنی بے شمار کرامات بھی ارشاد فرمائی ہیں جن کا انداز بالکل وہی ہے جو عام پیروں فقیروں کا ہوتا ہے۔ نمونہ ایک کرامت ملاحظہ فرمائیے۔ آپ کعبۃ اللہ اور اس کے طواف کے متعلق اپنا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں۔

ابن عربی اور کعبۃ اللہ

”ایک مرتبہ کعبۃ اللہ کو مجھ پر بڑا ہی طیش آگیا وہ اپنی بنیادوں سے بندھ کر ابن عربی پر گر جانا چاہتا تھا۔ ابن عربی نے حجرِ اسود کو ڈھال بنایا۔ کعبۃ اللہ کو یہ کہتے ہوئے صاف طور پر سنا کہ ذرا نزدیک تو آؤ۔ دیکھو میں تمہیں کیا کرتا ہوں۔ کب تک میری قدر لگھٹاتے رہو گے اور عارفین کو مجھ پر فضیلت دیتے رہو گے۔ قسم ہے اُس ذات کی جس کے لئے عزت اور بڑائی ہے۔ میں ہرگز ہرگز تمہیں اپنا طواف نہیں کرنے دوں گا۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ اس وقت میں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو ادب سکھانا چاہتا ہے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور کعبہ کی تعریف شروع کر دی۔ جوں جوں میں اس کی تعریف کرتا جاتا تھا اس کا غصہ بھی ٹھنڈا ہوتا جاتا تھا اور وہ اپنی بنیادوں پر جمتا جاتا تھا۔ اس نے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ میں طواف شروع کروں۔ جب میں حجرِ اسود کے پاس پہنچا تو میری زبان سے کلمہ شہادت نکلا، جو حجرِ اسود میں منکمن ہو گیا۔ میں نے کعبہ کی تعریف میں کئی رسائل لکھے

ہیں۔ جن کو تاج الرسائل کے نام سے مرتب کر دیا ہے۔ (فتوحات مکتبہ، ج ۱، ص ۱۰، ۱۱)

اس عقیدہ وحدت الوجود کا جو اثر آپ کی ذات والاصفات پر مرتب ہوا اس کی بھی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے یعنی ایک دوسری کرامت بھی،

”آپ نے اپنی دو سال سے بھی کم عمر بچی زینب سے جماع کے متعلق ایک مسئلہ پوچھا، تو وہ فوراً بول پڑی۔ یہ دیکھ کر بچہ کی ماں اور نانی فوراً جمع پڑی اور بچہ کی نانی تو بے ہوش ہو گئی۔“ (فتوحات مکتبہ، ج ۳، ص ۱۱)

ہم یہ تو بتلا چکے ہیں کہ یہ عقائد وحدت و حلول، دین طریقت یا تصوف کی جان ہیں، تو جب سے تصوف اسلام میں داخل ہوا یہ عقائد بھی شامل ہوتے گئے۔ پھر جس طرح حسین بن منصور حلاج نے کھل کر عقیدہ حلول کو پیش کرنے اور اپنے خدا ہونے کا دعویٰ کیا اور مقتول ہوا۔ بعینہ ہی صورت شیخ اکبر کی تھی۔ چونکہ عقیدہ وحدت الوجود قرآن کی تعلیم سے براہ راست متصادم تھا اس لئے علمائے دین مخالف ہو گئے۔ چنانچہ جب یہ مصر پہنچے، تو علمائے کرام نے اُن کے کفر کا فتویٰ دیا اور سلطان مصر نے اُن کے قتل کا حکم دے دیا۔ یہ بات ابن عربی کو بھی معلوم ہو گئی، تو چپکے سے مصر سے راہ فرار اختیار کر کے دمشق پہنچ گئے۔ باقی عمر درس و تدریس میں گزار کر ۷۳۸ھ کو راہی ملک عدم ہوئے۔ (حقیقت وحدت الوجود، ص ۹)

تو جس طرح صوفیاء کی نظر میں حلاج کا قصو یہ نہیں تھا کہ اُس نے خدائی کا دعویٰ کیوں کیا ہے۔ بلکہ قصو یہ تھا کہ اس نے اس راز کو فاش کیوں کیا؛ بعینہ ہی معاملہ شیخ اکبر کا بھی ہے۔ صوفیاء میں سے کسی نے بھی کھل کر شیخ اکبر کی تردید نہیں کی۔ ان میں سے جو بزرگ وحدت الوجود کو اسلامی تعلیم کے خلاف سمجھتے ہیں۔ وہ بمبائیل و تعبیر کے ہر ممکن پہلو سے اپنے شیخ اکبر کی حمایت و دفاع میں کوشاں رہتے ہیں۔ چنانچہ دو مباحثہ میں سے اشرف علی تھانویؒ نے ایک کتاب التنبیہ للطریقی فی تنزیہ ابن عربی لکھ کر یہی خدمت سرانجام دی ہے۔ آپ اس کتاب سے پہلے فصوص الحکم کی شرح بنام خصوص الحکم لکھنا چاہتے تھے جس کو اہل الاقوم کی صورت میں بعض مقامات کی شرح کر کے چھوڑ دیا گیا۔ اس کی وجہ آپ یہ لکھتے ہیں کہ:

”اس (شرح کے لکھنے) کے زمانہ میں مجھ کو جو نوحش و انقباض ان مضامین سے

فصوص سے نوحش اور اس کی شرح کا تراکٹ

ہونا تھا۔ عمر بھر یاد ہے گا۔ بعض مقامات پر قلب کو بے حد تکلیف ہوتی تھی۔ چنانچہ کہیں کہیں اس کا ذکر بھی کیا ہے اور یہ وجہ تھی اس شرح کے چھوڑ دینے کی۔“

یہ تو خوش و انقباض ایسا شدید تھا کہ پھر حضرت (اشرف علی) اس کام کی طرف سال ہا سال طبیعت کو رجوع نہ فرما سکے۔ بالآخر سات سال بعد التنبیہ الطرب فی تنزیہہ ابن عربی کے نام سے ایک کتاب متقدماً شیخ کی تنزیہ و حمایت میں سپرد قلم فرمائی۔“ (تجدید تصوف و سلوک، ص ۴۰۸)

عفیف الدین تلمسانی

پھر کچھ دوسرے بزرگ ایسے بھی گزرے ہیں جن فصوص الحکم کو سبقتاڑ چھایا کرتے تھے۔ انہیں میں سے ایک عفیف الدین تلمسانی ہیں فصوص الحکم کی شرح کیا کرتے تھے۔ جب اس کے خلاف شریعت مسائل پر نکتہ چینی ہوتی تو مترضین پر حکم عقلی کا الزام لگاتے۔ کبھی کبھی کفریہ اقوال بھی بک دیا کرتے تھے۔ چنانچہ امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ ”شیخ کمال الدین ابن المرامی کو ابتدا میں تلمسانی سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ ان سے فصوص الحکم پڑھنے لگے۔ انشاء درس میں کمال الدین نے فصوص الحکم کی بعض قابل اعتراض باتوں پر گرفت کی اور کہا کہ یہ قرآن و حدیث کے صریح ارشادات کے خلاف ہیں، تو ایک مرتبہ تلمسانی کو سخت غصہ آگیا اور کہا: ”بار بار قرآن و حدیث کا کیا حوالہ دیتے ہو۔ انہیں اٹھا کر دروازے سے باہر پھینکو اور یہاں صاف دل ہو کر آؤ تاکہ تمہیں خالص توحید ملے۔“

تلمسانی کی ان باتوں سے کمال الدین کے دل کو سخت ٹھیس پہنچی وہ فوراً ان کی مجلس سے چلے آئے تلمسانی کو خطرہ لاحق ہوا کہیں یہ بات عام لوگوں میں نہ پھیل جائے اور ان کے خلاف کوئی زبردست ہنگامہ کھڑا نہ ہو جائے، تو روتے ہوئے کمال الدین کے پاس آئے اور انہیں ماضی کیا۔

شیخ کمال الدین ہی کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ شیخ تلمسانی نے کہا: ”قرآن میں توحید ہے کہاں؟ وہ تو پوئے کا پورا شرک سے بھرا ہوا ہے، جو شخص اس کی اتباع کرے گا وہ کبھی توحید کے بلند مرتبے پر نہیں پہنچ سکتا۔“ (ام ابن تیمیہؒ، از کوکن عمری، زیر عنوان صوفیاء پر تنقید، ص ۳۲۱)

شیخ کمال الدین نے ایک مرتبہ اعتراض کیا کہ ”اگر عالم کی تمام چیزیں ایک ہیں جیسا کہ تمہارا عقیدہ ہے تو پھر تمہارے نزدیک جو دو، بیٹی اور ایک اجنبی عورت میں کیا فرق ہے؟“ تلمسانی نے جواب دیا: ”ہمارے ہاں تو کوئی فرق نہیں۔ چونکہ ان مجہولوں (اہل شریعت) نے ان کو حرام قرار دیا ہے تو ہم بھی کہہ دیتے ہیں کہ یہ چیزیں تم پر حرام ہیں، ورنہ ہم پر کوئی چیز حرام نہیں۔“ (ام ابن تیمیہؒ، مصنفہ کوکن عمری ایم اے، ص ۳۲۱)

لاحظہ فرمایا آپ نے اس نظریہ وحدت کی زد کہاں کہاں ہمک جا کر پڑتی ہے۔

ابن عربی کے فلسفہ کو صوفیاء کے طبع میں بہت پذیرائی ہوئی۔ اس کے شارحین میں مند سجہ ذیل حضرات بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ النابلسی، الکاشانی، الصیبری، بالی آفندی، جلال الدین رومی، عبدالرحمن جامی، رومی کی ثنوی کو تو ”فتوحات در فارسی“ کہا جاتا ہے۔ عبدالکریم جلی کی کتاب ”انسان کامل“، فصوص الحکم کی ایک طرح سے شرح ہے۔ بے ضابطہ تشریح اور استفادہ کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ (دائرة المعارف الاسلامیہ زیر عنوان طریقت، ص ۱۳۱، ج ۱۲)

مند سجہ بالا شارحین کے علاوہ ان میں کئی دیگر معروف ہستیوں کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ ابن سبعین، عبدالوہاب شعرانی، شیخ فرید الدین عطار وغیرہ یہ سب حضرات اسی نظریہ کی آبیاری کرتے نظر آتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ وعدۃ الوجود کے نظریہ کے مطابق کائنات کی ہر چیز چونکہ خدا کا حصہ ہے لہذا اس پہلو سے ایک شریف اور بدعاش، آدمی اور گدھا، کتے اور پرند سب برابر ہیں۔ اب دیکھتے یہی عقیدہ ابن عربی سے پہلے صوفیائیں پایا جاتا تھا:-

ابن عربی کے پیشرو

ابوالنصر سراج طوسی (م ۳۷۸ھ) کی کتاب الملح فی التصوف اس موضوع پر ایک مستند کتاب سمجھی جاتی ہے اس کے صفحہ ۴۹ پر مذکور ہے۔

”الوحمرہ صوفی کو حارث محاسبی کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ حارث کی بکری نے میں میں کیا تو ابو حمزہ صوفی ہچکیاں لینے لگا اور اس بکری سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”لَبِثْتُ يَا سَيِّدِي!“ (میرے آقا! میں حاضر ہوں)

اس پر حارث محاسبی نے ٹوکا، تو ابو حمزہ نے جواب دیا: ”معلوم ہوتا ہے، تم ابھی تصوف کے میدان میں مبتدی ہو۔“

اب دیکھئے حارث محاسبی کا سن وفات ۲۴۳ھ ہے اور یہی وہ شخص ہے جس کو سب سے پہلے صوفی کے لقب سے پکارا گیا۔ اور ابو حمزہ انہیں مبتدی قرار دے رہے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ تیسری صدی ہجری کے آغاز میں وحدت الوجود کا عقیدہ مسلمان صوفیوں میں اگیا تھا۔ اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ کتاب مذکورہ

کے صفحہ ۴۹۲ پر درج ہے :

”ابو الحسن نورى نے ایک کتے کو بھونکتے دیکھا تو کہنے لگا۔ ”لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ“
(یعنی میں حاضر ہوں اور تجھ سے سعادت چاہتا ہوں)۔ یہ بزرگ جو کتے کے بھونکنے کو خدا کی پکار قرار دے
کر جواب دے رہے ہیں۔ یہ سری سقطیؒ کے مرید اور جنسید کے ہم صحبت تھے۔ (مقران حق، ص ۱۶۴) اور
سری سقطی کا سن وفات ۲۵۹ھ ہے جن کے یہ مرید تھے۔

پھر شیخ جنید بغدادی بھی اس عقیدہ سے سخت متاثر تھے۔ شیخ عبدالغنی نابلسیؒ (م ۱۱۴۳ھ) اپنی
کتاب فتح الربانی میں ایک واقعہ درج کیا ہے کہ :

”جنید بغدادی کہتے ہیں کہ مجھے کسی چیز سے اتنا فائدہ نہیں پہنچا جتنا مجھے ایک شعر سننے سے ہوا۔
میں سڑک پر جا رہا تھا تو ایک شاعریوں کہہ رہا تھا۔

وَإِذَا قُلْتُ مَا ذَنْبِي إِلَيْكَ ! أَجَبْتَنِي وَجُودُكَ ذَنْبٌ لَا يُقَاسُ بِهِ ذَنْبٌ
جب میں پوچھتا ہوں کہ میرا گناہ کیا ہے تو مجھے جواب دیتا ہے کہ تیرا اپنے وجود کو الگ سمجھنا ہی ایسا گناہ
ہے جس کے برابر کوئی گناہ نہیں۔

پھر جنیدؒ بغدادی کے مرید شبلیؒ اور منصورؒ علاج (م ۳۰۹ھ) اس وحدت و حلول کے معاملہ میں ایک
دوسرے کے ہمراز و ہم خیال تھے۔ جب منصورؒ کو تختہ دار پر کھینچا گیا، تو پہلے اس پر پتھر برسائے گئے۔ علماء و
بزرگان دین جمع ہو کر آئے مگر شبلیؒ نہیں گئے۔ بالآخر لوگوں کے مجبور کرنے پر انہیں جانا پڑا۔ اس مقام پر صاحب
”مقران حق“ صفحہ ۴۵ پر تحریر فرماتے ہیں :

”نقل ہے کہ جب آپ (علاج) کو سنگسار کیا جا رہا تھا، تو حضرت شبلیؒ نے ذرا سا پتھر اٹھا کر آپ کو
مارا۔ آپ نے آہ کی۔ لوگوں نے کہا : ”کسی بڑے پتھر پر تو آپ نے آہ نہیں کی، لیکن اس کے ذرا سے ڈھیلے
پر درد محسوس کیا ؟“ فرمایا : ”لوگ نہیں جانتے کہ مجھے نہیں مارنا چاہئے مگر شبلی جانتا ہے۔ پس دوست کا ناروا
فعل باعث درد ہوا۔“

غرض اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں جن میں تصوف کے ان پیشروؤں میں وحدت الوجود کے نظریات
پلتے ہیں۔ تاہم دازلمائے درون کو سب سے پہلے جس شخص نے تحریری صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کیا وہ
ہمائے ام غزالیؒ (م ۵۰۵ھ) ہیں۔ آپ اخلاقیات اور فلسفہ و منطق کے بڑے متبحر عالم تھے۔ فلسفہ کی رو

سے تو یہ پہلے ہی وحدت الوجود کو ایک حقیقت سمجھتے تھے لیکن مشاہدہ نہیں تھا۔ لہذا ایک مدت بے قرار اور پریشان رہنے کے بعد خود راہ سلوک پر چل کھڑے ہوئے۔ اور گیارہ سال کی ریاضت و مجاہدہ کے دوران اس نظریہ وحدت کو جی پالیا۔ یہ ساری داستان انہوں نے خود ایک سالہ التَّقْدَمِ الْعَتَلِ لکھ کر بیان کی ہے جس کا مہصل یہ ہے:

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ ”توحید کی دو قسمیں ہیں، ایک توحید عوام کی، دوسرے خواص کی۔ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ عوام کی توحید ہے اور لَا هُوَ إِلَّا هُوَ خواص کی۔“

(نہیں، مگر وہی) خواص کی توحید ہے، کیونکہ وہ عام ہے اور یہ خاص۔ اور یہ زیادہ شامل، زیادہ لائق اور زیادہ انحصار ہے۔ اور اس کو ماننے والے کو فردانیت میں زیادہ داخل کرنے والا مخلوقات کے معراج کی انتہا فردانیت ہے۔“ (ترجمہ، مشکوٰۃ الانوار، مصنف، امام غزالی، ص، ۳۱)

اس اقتباس سے مندرجہ ذیل باتوں پر روشنی پڑتی ہے:

(۱) حضور اکرم ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین وغیرہ سب عوام کا کلمہ توحید پڑھتے رہے لہذا وہ خواص کے زمرہ سے باہر ہیں۔

(۲) خواص کا کلمہ توحید نظریہ وحدت الوجود ہے اور یہ کلمہ ”نہیں مگر وہی“ زیادہ شامل، زیادہ لائق، اور زیادہ انحصار ہے۔

(ج) آپ سمجھ کر فردانیت، جو مخلوقات کے معراج کی انتہا ہے۔ وہ کیا شے ہے۔ یعنی خالق و مخلوق اور عبد و معبود میں کوئی دوئی باقی نہ ہے اور یہ نظریہ اس آفاقی مذہب کے تینوں نظریات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

امام غزالیؒ کے بعد وحدت الوجود کا مسئلہ صوفیاء میں متفق علیہ قرار پایا۔ تاہم اس نظریہ کو بقائے دوام شیخ اکبرؒ کی کوششوں سے حاصل ہوا، چنانچہ آج تک صوفیاء میں یہ مسئلہ مسلم حلالاً و آہانتھا۔ تاآنکہ مجدد الف ثانیؒ نے اس سے اختلاف بھی کیا اور اس کی تردید بھی کی۔ جس کی وضاحت ہم آگے وحدت الشہود کے بیان میں کریں گے۔ سر درست یہ کہنا مقصود ہے کہ آج بھی اکثر صوفیاء اس پر ایسے ہی ایمان رکھتے ہیں جیسے کہ ابن عربیؒ اور ان کے خوشہ چینیوں کا تھا۔ چنانچہ دور متاخرین کے صوفی حکیم الامتہ اشرف علی تھانویؒ اپنی تصنیف ”امداد المشتاق لمفوضات امداد اللہ مہاجر کئی“ (جوان کے پیر ہیں) کے صفحہ ۱۱۰ پر ایک ایسے

لہ وحدت الوجود کا مسئلہ خاص کلام اور فلسفہ کا مسئلہ ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

بزرگ کا واقعہ درج فرماتے ہیں۔ جس نے وحدت الوجود کی اس تعبیر کو کہ کائنات کی ہر چیز خدا کا حصہ ہے۔ اور بلحاظ درجہ برابر ہے۔ پاخانہ (نجاست) کھا کر عملاً صحیح ثابت کر دکھایا۔ فرماتے ہیں :

” ۲۲۴ ، فرمایا کہ ایک موحّد (یہاں موحّد سے مراد وحدت الوجود کا قائل ہے) سے لوگوں نے کہا کہ اگر علو اور غلیظ ایک ہیں ، تو دونوں کھاؤ۔ انہوں نے شکل خنزیر ہو کر گوہ کھالیا۔ پھر بصورت آدمی ہو کر علو کھایا اس کو حفظ مراتب کہتے ہیں ، جو واجب ہے۔“

(حاشیہ) قَوْلُهُ : انہوں نے شکل خنزیر ہو کر گوہ کھالیا۔ اَقُولُ : اس معترض کی عبادت کے سبب اس کے تکلف و تصرف کی ضرورت پڑی۔ ورنہ جواب ظاہر ہے کہ یہ اتحاد مرتبہ حقیقت میں ہے نہ کہ احکام و آثار میں۔“

لاحظہ فرمائیے پیر مرشد دونوں کا اس نظریہ پر کیسا پختہ ایمان ہے اور ان کی نظروں میں موحّد شخص ہے جو (۱) جو وحدت الوجود کا قائل ہو۔ (۲) ہذا حلال و حرام کی عقیدہ تائید کرنے کی کوئی ضرورت نہیں (۳) و جو حضرات اپنی شکل تبدیل کرنے پر بھی قادر ہوتے ہیں۔

نظریہ وحدت الوجود کی تاریخ

ہم پہلے یہ بتلا چکے ہیں کہ یہ نظریہ خود اسلام کے وجود میں آنے سے ہزار ہا سال پہلے ہندوؤں کے اُنشڈوں میں موجود تھا اور ایک اقباس بھی پیش کر چکے ہیں۔ آج سے تقریباً پانچ ہزار سال پہلے کرشن نے ، جو ہندوؤں کے سب سے بڑے اقدار مانے جاتے ہیں۔ (جیسے ہمارے ہاں منصور علاج تھے ، یا جیسے حضرت علی ؓ کے متعلق خیال کیا گیا) مہا بھارت یعنی کور و اور پانڈوؤں کو اس کا اُپدیش دیا تھا ، جو آج بھی گیتا کے صفحات میں موجود ہے۔ اس طرح یہ نظریہ دوسرے مذاہب میں بھی پایا جاتا تھا ، تو جب عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے زمانہ میں (یعنی دوسری صدی ہجری کے آخر میں) یونانی ، لاطینی اور سنسکرت کی بے شمار کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں ہونے لگا تو ان کتابوں میں فلسفہ وحدت الوجود اور تصوف کے بیشمار مسائل پر بحث موجود تھی۔ انہی نظریات و مسائل سے ہمارے صوفیاء نے بھی متاثر ہونا شروع کیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے پہلے ایسے زاہد قسم کے لوگوں کو زباد ، عباد یا صاحبین کہا جاتا تھا۔ صوفی یا تصوف کے نام سے کوئی واقف نہ تھا اور فن تصوف کی اصطلاحات اور سرار و رموز تو بہت بعد کی پیداواریں۔

چنانچہ ہارون الرشید (۱۴۷ - ۱۷۰) کے دور کے بعد فلسفہ و منطق کے دوسرے مسائل و نظریات کی طرح گہانہ دھیان اور رہبانیت کے مسائل و نظریات بھی ہمارے صوفیاء میں داخل ہوئے۔

فلسفہ اور وحدت الوجود

ہم پہلے باب میں واضح کر چکے ہیں کہ وحی الہی سے بے نیاز ہو کر جب کبھی انسان نے محض اپنی عقل یا وجدان کے بل بوتے پر کائنات کا مسمہ حل کرنے کی کوشش کی ہے تو اس میں ہمیشہ ٹھوکریں ہی کھائی ہیں۔ اب اتفاق کی بات ہے کہ وحدت الوجود کا مسئلہ عقل یا فلسفہ کا مسئلہ بھی ہے اور وجدان یا تصوف کا بھی۔ بالفاظ دیگر یہ خالص مادہ پرستانہ فلسفہ بھی ہے اور صوفیاء کا روحانی مسئلہ بھی۔ اور ان دونوں کا اس مسئلہ پر اتحاد و اتفاق بھی ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود وحی الہی سے متصادم ہے۔

اب دیکھئے کہ ! مادہ پرست کہتے ہیں کہ وجود ایک ہے جو ازلی ابدی ہے اور وہ مادہ ہے، جس کو فنا نہیں۔

اور وجودی کہتے ہیں : وجود ایک ہے، جو ازلی ابدی ہے اور وہ اللہ ہے جس کو فنا نہیں۔ اسی طرح مادہ پرست کہتے ہیں کہ مادہ میں جو حرکت، تغیر و تبدل اور صورت و اشکال پائی جاتی ہیں وہ مادہ کا طبعی خاصہ ہے اور وجودی کہتے ہیں کہ وجود میں جو حرکت، تغیر و تبدل اور صورت و اشکال پائی جاتی ہیں، وہ اللہ کی تخلیقات ہیں۔

اب اگر ہم اللہ کی جگہ مادہ اور تخلیقات کی جگہ طبعی خاصہ کے الفاظ رکھ دیں، تو دونوں کے جواب بالکل ایک ہیں۔ پھر وجودی چونکہ کائنات کو اللہ کا عین یعنی اللہ ہی مانتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ کائنات ہی ازلی و ابدی ہے یعنی قدیم ہے حادث نہیں۔ اور یہی مادہ پرست بھی کہتے ہیں۔

اور اس وحدت الوجود کے عین فلسفہ کا مسئلہ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ کاجوں میں فلسفہ کے مضمون میں یہ مسئلہ بھی شامل نصاب ہے۔ چنانچہ حقیقت وحدت الوجود کے مصنف عبدالحکیم انصاری اس کتاب کے صفحہ ۱ پر ایک لطیفہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

”میرے ایک دوست، جو فلسفہ کے ایم اے تھے، ایک دن مجھ سے وحدت الوجود پر گفتگو کر رہے تھے۔ جب میں نے ان کو ہر طرف سے لا جواب کر دیا، تو کہنے لگے کہ : ”جو کچھ بھی ہو، مجھ کو تو اگر ایک سیکنڈ کے لئے بھی یقین آجائے کہ میں خدا نہیں ہوں، تو میں فوراً مر جاؤں۔“ میں نے جواباً کہا : ”سبحان اللہ ! آپ بڑے

اپنے خدا ہیں کہ آپ کو موت بھی آسکتی ہے۔“

تصوف اور وحدت الوجود

بعینہ اسی طرح کا ایک دوسرا لطیفہ ایک صوفی کے متعلق ایسی کتاب کے صفحہ ۶۰، ۶۱، پر تحریر کرتے ہیں:

”ہمارے ایک شہتیه خاندان کے پیر بھائی تھے، جو صوفی جی کے نام سے مشہور تھے۔ وہ صاحب اجازت تھے اور ان کے بہت سے مرید بھی تھے۔ ایک دن میرے پاس آئے، تو ہم مل کر چائے پینے لگے۔ چائے پیتے پیتے صوفی جی کے چہرے پر کیفیت کے آثار نمایاں ہوئے۔ چہرہ سُرخ ہو گیا۔ آنکھوں میں لال لال ڈورے اُبھر آئے۔ پھر کچھ نشہ کی سی حالت طاری ہوئی۔ یکایک صوفی جی نے سر اٹھایا اور کہنے لگے ”بھائی جان! میں خدا ہوں۔“ اس پر میں نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور اس کے دو ٹکڑے کر کے صوفی جی سے کہا: ”آپ خدا ہیں، تو اسے جوڑ دیجئے۔“ صوفی جی نے دونوں ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو ملا کر ان پر توجہ فرمائی، لیکن کیا بنتا تھا۔ ساتھ ہی ان کی وہ کیفیت بھی غائب ہو گئی جس کی وجہ سے وہ خدائی کا دعویٰ کر رہے تھے۔“

”اس پر صوفی جی کہنے لگے، ”پھر یہ آخر سب کچھ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا: ”کیا؟“ بولے کہ ”یہی وحدت الوجود! میرے خیال میں تو یہ سب ایک کیفیت ہے، حقیقت نہیں ہے۔“ میں نے کہا: ”واقعی آپ نے پتہ کی بات کہی، وحدت الوجود ایک بہت بڑی کیفیت ہے، حقیقت نہیں ہے۔“ صوفی جی نے کہا: ”تو کیا حضرت ابن عربی جیسے عظیم الشان بزرگ نے بھی غلطی کی ہے۔“ میں نے کہا: ”ابن عربی نبی تو نہیں تھے، دلی ہی تھے اور اولیاء سے غلطی ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔“ لیکن میرے خیال میں حتیٰ یہ ہے کہ انہوں نے غلطی نہیں کی بلکہ اُن کو غلط فہمی ہوئی جیسی کہ ابھی آپ کو اپنے باسے میں ہو گئی تھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آپ کی کیفیت صرف چند لمحوں کے لئے تھی اس لئے غلط فہمی بھی چند لمحے رہی، لیکن ابن عربی چونکہ اپنے سلوک کے اختتام پر آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کے بعد اس غلط فہمی میں مبتلا ہوئے۔ اس لئے ان کی غلط فہمی دُور نہ ہوئی۔“

یہ ہیں ذاتی تجربات و خیالات خواجہ عبدالکیم انصاری، نقشبندی، مجددی، توحیدی صاحب کے، جو بانی سلسلہ عالیہ توحید یہ ہیں اور جنہیں یہ بھی دعوے ہے کہ وہ سلوک کی تمام منازل طے کر چکے ہیں۔ اسی طرح ایک دوسرے عبدالباری صاحب، سابق استاذ فلسفہ و دینیات عثمانیہ یونیورسٹی، جو مجدد تصوف و سلوک کے مصنف بھی ہیں اور مرتب بھی۔ وہ اس کتاب کے صفحہ ۱۶۳ پر لکھتے ہیں:

”راقمِ حق پر کچھ تو ہمیشہ سے طبعاً عقلیت و فلسفہ کا غلبہ رہا۔ پھر کڑوا کر بلاغیم چڑھا کہ ساری عمر فلسفہ کے مطالعہ اور تعلیم و تعلم کا مشغلہ رہا۔ اور فلسفہ دراصل نام ہے وحدت الوجود ہی کی تاریخ کا۔ یعنی عالمِ کثرت کے بعد وحدت کو معلوم کرنے کی فکری و عقلی سعی و طلب کا، لیکن متعارف اور اصطلاحی وحدت الوجود کا نام زیادہ تر تصوف کے سلسلہ میں پڑھنے اور سننے میں آتا رہا۔“ حضرت مجددِ تھانوی کی اس مجددانہ تحقیق و توثیق سے بڑا اطمینان ہوا کہ یہ سلسلہ دراصل ایک علمی و کلامی سلسلہ ہے اور اسلامی تصوف کا یہ کوئی خاص جز نہیں اور نہ اس اعتبار سے اس بحث کی کوئی اہمیت و حاجت رہ جاتی ہے کہ اسلامی تصوف میں یہ سلسلہ باہر سے داخل ہوا یا نہیں۔ بلکہ اس کی غالباً نہ تعبیرات یقیناً بیرونی اثرات کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔“

پھر اسی کتاب کے صفحہ ۱۶۳ پر اپنے مُرشد تھانویؒ کے حوالہ سے لکھتے ہیں :

”مسئلہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود مسائلِ کشفیہ ہیں۔ ایسے ظنی و احتمالی مسئلہ کی کسی خاص تعبیر کو یکھنچ تان کر قرآن و حدیث کی نصوص سے ثابت کرنے کی کوشش کرنا بڑی جسارت اور خطرہ کی بات ہے جس میں تحریف تک کا غلو لوگوں نے کیا۔“ (حوالہ مذکورہ)

اشرف علی تھانویؒ اور ابنِ عربیؒ کی تنزیہیہ

اب دیکھئے کہ یہی مجددِ علیہ الرحمۃ تھانویؒ جو تصوف و سلوک کی تجدید کرنا چاہتے

ہیں اور علمائے کرام اور صوفیائے عظام کی راہوں میں افراط و تفریط کی نشاندہی کر کے کچھ علماء کو سمجھانا چاہتے ہیں کچھ تصوف کے داغ و دھونا چاہتے ہیں۔ وحدت الوجود اور شہود کے کشف کو ظنی اور غیر منصوص قرار دے رہے ہیں۔ پھر آخر اس بات کی کیا مجبوری تھی کہ آپ فصوصِ الحکم کی شرح خصوصاً الحکم محض اس خیال سے لکھنے بیٹھ گئے کہ جہاں جہاں قرآن و سنت کے خلاف واضح باتیں موجود ہیں ان کی تاویل کر کے ابنِ عربیؒ کے دامن کو پاک کیا جاسکے۔ اس سلسلہ میں آپ نے سات سال تک محنت کی طبیعت میں سخت انقباض پیدا ہوا اور بالآخر وہ کام نہ ہو سکا، تو ابنِ عربیؒ کی تنزیہیہ ہی چھاپ دی، کہ اسی کے خلافِ شریعت اقوال کے مقابلہ میں اسی کے اقوال مطابقتِ شریعت درج کر کے ابنِ عربیؒ کی صفائی پیش کی جاسکے۔ اس نظریہ کے اثرات جو دنیاۓ اسلام پر مرتب ہوئے وہ تو سب کو معلوم ہیں، پھر بھلا ایسا شخص اس کرمِ فرمائی کا مستحق تھا، کیا یہ بات مجددِ علیہ الرحمۃ کی جادہٗ سلوک پر گامزن بخونے کی وجہ سے ابنِ عربیؒ کی صریح جانبداری پر دلالت نہیں کرتی۔؟

اب اس کشفی، ظنی اور غیر منصوص مسئلہ کو قرآن و حدیث سے ثابت کرنے والوں کے دلائل بھی دیکھ لیجئے،

جنہیں مجدد صاحب خطرناک غلطی اور بڑی جسارت قرار دے رہے ہیں۔

وَحَدَّثَ الْوَجُودِ بِشَرْعِي دَلَالِ

قرآنی دلائل

قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات سے یہ مسئلہ ثابت کیا جاتا ہے۔ ذرا غور سے ان کا مفہوم اور تاویلات ملاحظہ فرماتے جائیے :

۱۔ سب سے پہلے تو کلمہ توحید لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ پر ہی ہاتھ صاف کیا جاتا ہے اور اس کے معنی یہ کہتے جاتے ہیں کہ ”نہیں کوئی معبود مگر وہ اللہ ہی تو ہے۔“ یعنی ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ کے بجائے ”لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ اللَّهُ“ کا مفہوم بیان کیا جاتا ہے۔ بس اب معاملہ ہی صاف ہے۔ کسی بُت کو سجدہ کر دیا یا درخت یا کسی پتھر یا سورج کو، جسے بھی سجدہ کر دے وہ اللہ ہی ہے کیونکہ اللہ ہی کا حصہ ہے۔

۲۔ اسی طرح آیت ”وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا آيَاهُ“ (۱۶۶) کا واضح مفہوم تو یہ ہے کہ تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی پرستش نہ کرنا، کا مفہوم یہ لیا گیا کہ تم جس کی بھی عبادت کرو، وہ وہی تو ہے۔

۳۔ اَيْنَمَا تُولُوْا فَتَجِدْ وَجْهَ اللَّهِ (۱۶۷) ، تم جس طرف بھی منہ کرو گے اسی طرف اللہ ہے۔ اس آیت کے معنی خواجہ حسن بکھری اپنی زبان میں یوں فرما رہے ہیں :

کافراں سجدہ کہہ کر بُتوں کی گردند ہمہ اُوسوئے تو بود و ہمہ سُوروئے تو بود
یعنی کافر جو بتوں کو سجدہ کرتے ہیں، تو ان کا منہ تیری طرف ہوتا ہے، کیونکہ ہر طرف تیرا ہی چہرہ ہوتا ہے
اب دیکھئے ! جب نہیں اس قدر ٹھیک صاف اور دور از کار تاویلات پر آمادہ ہو جائے، تو پھر سارے قرآن سے ہی سب کچھ ثابت کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کی چند آیتیں ادبھی پیش کی جاتی ہیں مثلاً۔

۴۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (۱۶۸)
وہی اول ہے، وہی آخر ہے، وہی ظاہر ہے، وہی باطن ہے۔

اس کے معنی بھی وجودی حضرات یہی لیتے ہیں کہ وجود صرف ایک ہے اور وہ اللہ ہے، جو باطن میں تو اللہ ہے اور ظاہر میں موجودات و مخلوقات۔

۵۔ اَللّٰهُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
اللہ ہی آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔

یعنی اللہ ہی کی وجہ سے تمام کائنات منور ہے۔ یہی معنی خستہ ترین نے کئے ہیں۔ وجودی اس کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ آسمان و زمین اللہ ہی کا نور یا اس کی تجلیات ہیں اور ان تجلیات ہی سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے۔

۶۔ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ
میں نے آدم میں اپنی روح سے پھونکا

وجودی اس سے یہ مراد لیتے ہیں کہ خدا نے اپنی روح آدم میں پھونک کر فرشتوں کو سجدہ کر دیا، تو وہ انسان گویا خدا ہی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر تمام جانداروں میں اللہ تعالیٰ اپنی روح کے حصے پھونکتے جائیں تو ایسے خدا کا تصور اسلام میں کہیں موجود ہے؟ اس کا صحیح مفہوم ہم انشاء اللہ روح کی بحث میں بیان کریں گے۔

اور عبد الکریم چلی صاحب اس وحدت و حلول کا فلسفہ اپنی زبان میں یوں فرما رہے ہیں :

”حلّ اشکال کی صورت یہ ہے کہ جب حق سبحانہ و تعالیٰ اپنے کسی اسم یا صفت سے بندہ پر متحلی ہونا چاہتا ہے، تو اس بندہ کو فنا کر دیتا ہے۔ ایسی فنا کہ اس کو اپنے نفس سے معدوم کر ڈالتا ہے اور وجود سے اُس کو سلب کر لیتا ہے۔ پھر جب نورِ عبادی مٹ جاتا ہے اور روح خلقی فنا ہو جاتا ہے تو حق تعالیٰ بندہ کی شکل میں بدوں حلول (لفظ حلول سے غالباً مصنف حساب کو چڑ ہے جو بدوں حلول فرمایا، ورنہ بحث تو حلول ہی کی چل رہی ہے جو حل اشکال سے شروع ہوئی ہے، مؤلف) اپنی ذات کا ایک لطیفہ اس چیز کے بدلے قائم کر دیتا ہے جو اس سے اُس نے چھپینی ہے اور وہ لطیفہ اس بندہ سے نہ جدا ہوتا ہے نہ اس سے متصل۔ اس لئے کہ اپنے بندوں پر اُس کا تجلی کرنا بطور اُس کے فضل و جود کے ہے اگر وہ اس کو فنا کر کے اس کا عوض اُن کو نہ دے تو یہ ایک قسم کا عذاب ہے جو شبانِ شان باری نہیں۔“ (انسان کامل، ص ۱۰۹)

اب احادیث کی طرف آئیے !

حدیث سے دلائل

اتحاد و حلول جیسے مشرکانہ عقائد کے حق میں جو حدیث بڑے زور و شور

سے پیش کی جاتی ہے وہ بخاری کی درج ذیل قدسی حدیث کتاب التّٰقَات میں مذکور ہے۔ جسے ہم علامہ ویدلزمان صاحب نیسار لباری کے ترجمہ اور حاشیہ کے ساتھ بلا کم و کاست پیش کرتے ہیں :

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
أَخْبَرْتَنِي ﷺ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ

إِنَّ اللَّهَ قَالَ : مَنْ عَادَى لِي وَلِيًّا فَقَدْ

أُذِنَتْهُ بِالْحَرْبِ وَمَا يَقْرَبُ إِلَيَّ عَبْدِيْ

فرماتا ہے جو شخص میرے کسی ولی سے دشمنی رکھے۔ میں

اس کو یہ خبر کھے دیتا ہوں کہ میں اس سے لڑوں گا اور

بَشَىٰ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ وَمَا يَزَالُ
عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّىٰ
أُحِبَّهُ فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ
الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ وَبَصَرَهُ
الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ وَيَدَهُ الَّتِي
يَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِي
يَمْشِي بِهَا وَإِنْ سَأَلَنِي
لَا أُعْطِيَنَّهُ وَلَئِنْ اسْتَعَاذَنِي
لَا أَعِيذَنَّهُ وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَيْءٍ أَنَا
فَاعِلُهُ تَرَدُّدِي عَنْ نَفْسِي
الْمُؤْمِنِ يَكْفُرُهُ الْمَوْتُ وَأَنَا
أَكْفُرُهُ مَسَاعَتَهُ

(بخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع)

میرا بندہ جن عبادتوں سے میرا قُرب حاصل کرتا ہے ان
میں سے کوئی عبادت مجھ کو اس سے زیادہ پسند نہیں ہے
جو میں نے اس پر فرض کی ہے اور میرا بندہ (فرض ادا کرنے
کے بعد) نفل عبادتیں کر کے مجھ سے اتنا قریب ہو جاتا ہے
کہ میں اسے محبت کرنے لگتا ہوں، پھر تو یہ حال ہوتا ہے کہ
میں ہی اس کا کان ہوتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی
آنکھ ہوتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہوتا ہوں
جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں ہوتا ہوں جس سے وہ
چلتا ہے اگر مجھے کچھ مانگتا ہے، تو میں اس کو دیتا ہوں وہ
اگر کسی (دشمن یا شیطان) سے میری پناہ چاہتا ہے، تو اس
کو محفوظ رکھتا ہوں اور مجھ کو کسی کام میں، جس کو میں کرنا چاہتا
ہوں، اتنا تردد نہیں ہوتا۔ جتنا اپنے مسلمان بندے کی جان
نکالنے میں ہوتا ہے وہ تو موت کو (بوجہ جہانی تکلیف) برا سمجھتا

ہے اور مجھ کو بھی اس کو تکلیف دینا برا لگتا ہے

گویا جو حدیث اپنے دعوے کے اثبات میں پیش کی جاتی ہے اسی میں اس کا رد ہے اور جس حدیث
رد ہے وہ عموماً پڑھی بھی نہیں جاتی۔

۲۔ دوسری حدیث جس سے وحدت الوجود کا استدلال کیا جاتا ہے۔ وہ حدیث کا ایک ٹکڑا ہے۔ اَنَا عِنْدَ ظَنِّ
عَبْدِي بَنِي لَيْعَنِي مِثْلِي (اللہ) اپنے بندے کے ساتھ اس کے گمان کے مطابق سلوک کرتا ہوں۔ وَجُودِي

لے اس حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ بندہ عین خدا ہو جاتا ہے جیسے معاذ اللہ ملولیدہ اور اتحادیہ کا دعوے ہے۔ کہاں خدا اور کہاں
بندہ، بلکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب بندہ میری عبادت میں غرق ہو جاتا ہے اور مرتبہ محبوبیت پر پہنچتا ہے، تو اس کے
حواس ظاہری اور باطنی سب شریعت کے تابع ہو جاتے ہیں۔ وہ ہاتھ، پاؤں، کان، آنکھ سے وہی کام لیتا ہے جس میں میری
مرضی ہے خلاف شریعت اس سے کوئی کام سرزد نہیں ہوتا۔ لے اس فقرے سے ملولیدہ اور اتحادیہ کا رد ہو گیا۔ اگر بندہ عین خدا ہو
جاتا تو پھر وہ مبالغہ کرنے اور پناہ دینے کے معنی نہیں بنتے۔ (وحیدالان)

کہتے ہیں کہ اگر ہم کسی بُت کو بھی یہ گمان کر کے پُوچیں کہ فی الحقیقت ہم اللہ کو پُوچ رہے ہیں، تو وہ اس حدیث کی رُو سے اللہ ہی کو سجدہ ہوگا۔ یہ ایسا استدلال ہے، جو ساری اسلامی تعلیم کے خلاف ہے اور اس کے لئے کوئی قرینہ بھی نہیں۔

حدیث کا مطلب صاف ہے کہ خوف اور اُمید میں سے جس پہلو کا انسان اللہ سے زیادہ ظن رکھے گا۔ خدا اس سے ویسا ہی برتاؤ کرے گا، لیکن یہ نہیں ہونا چاہیے کہ کسی ایک پہلو سے انسان کیسے غافل رہے۔ بموجب ارشاد باری تعالیٰ **يَذُوعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا** (۳۶۸) پھر خوف اور طمع یا ایم ورجا میں سے جو نسا پہلو انسان کی طبیعت پر غالب ہے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے ایسا ہی معاملہ کریں گے۔

۳۔ تیسری حدیث جس سے اولیاء کا علم غیب ثابت کیا جاتا ہے وہ ہے **اَتَّقُوا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَإِنَّهُ يَنْظُرُ يَنْوَرُ اللَّهُ** یعنی مومن کی فراست سے بچو، کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ اس حدیث میں کئی باتیں قابلِ توجہ ہیں۔ مثلاً:

۱۔ یہ حدیث جملہ مومنین سے متعلق ہے، لیکن اگر وہ صوفیہ اس حدیث کا مصداق وہ اولیاء اللہ دیکھتے ہیں جن کی تعداد بھی ان کے ہاں مقرر ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے 'وین طریقت کا باطنی نظام')

۲۔ فراست کے معنی غیب دانی یا اشرف والہ خفا نہیں، جیسا کہ یہ اتحادی اور وجودی سمجھتے ہیں بلکہ اس کے معنی کسی کے ظاہری احوال و آثار کو دیکھ کر اس کے باطن کا حال سمجھنا ہے۔ علم قیافہ و فراست مشہور لفظ ہے۔

۳۔ نور سے مراد، نورِ ایمان ہے۔ جیسا کہ حدیث میں لفظ 'مومن' آیا ہے۔ اس سے مراد صفاتی قلب کے وہ طریقے نہیں، جن کا ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔

اس کے علاوہ کئی وضعی احادیث اور صوفیاء کے احادیث سے ملتے جلتے مقولے مثلاً **مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ** بھی اس ضمن میں پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ علمی اعتبار سے ایسی چیزوں کا کوئی مقام نہیں۔ لہذا بغرض اختصار یہاں ہم انہیں نظر انداز کر رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ مناسب مقامات پر انشاء اللہ پیش کیئے جائیں گے۔

۳۔ وحدت الشہود

ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ اسلام میں دینِ طریقت کے نظریات و راستوں سے داخل ہوئے تھے پہلا رستہ تو عبد اللہ بن سبا یہودی کی باطنی تحریک کا تھا، جو کہ درویشی کے رنگ میں ہی سامنے آیا تھا اور یہودیوں میں بہانیت کے جو طریق و عقائد تھے وہ سب اس نے مسلمان مُریدوں میں داخل کر دیئے چنانچہ پُر فیسہ سلیم حشتی اپنی کتاب ”اسلامی تصوف“ میں اسی ماخذ پر زیادہ سے زیادہ زور صرف کرتے ہیں، لیکن اس بات سے بھی مجالِ انکار نہیں کہ اسلامی تصوف اس سے زیادہ متاثر ان تراجم سے ہوا، جو ہارون الرشید اور مامون الرشید کے زمانہ میں یونانی، لاطینی اور سنسکرت کی کتابوں کے کئے گئے۔ جن میں گیان دھیان اور مادی فلسفہ سب کے اُصول مندرج تھے۔

وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا فرق

وحدت الشہود کی اسلام میں درآمد کی تاریخ پر بحث کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں نظریات اور عقائد کا فرق واضح کر دیا جائے۔ مختصر الفاظ میں اس فرق کو یوں واضح کیا جاسکتا ہے کہ وحدت الوجود سے مراد ”ہمہ اوست“ ہے اور وحدت الشہود سے ”ہمہ از اوست“ اور تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ وجودی صرف ایک وجود کے قائل ہیں کہ خدا ہی کائنات اور اس کی ہر چیز ہے اور کائنات اور اس کی ہر چیز ہی خدا ہے۔ لیکن شہودی خدا کی ہستی کو ایک مستقل بالذات ہستی اور کائنات سے علیحدہ قرار دیتے ہیں اور کائنات کو خدا کا ظل، سایہ یا پرتو قرار دیتے ہیں۔

اب اس سے اگلا مرحلہ یہ ہے کہ جس طرح سایہ مناسب وقت پر دھوپ یا نور میں گم ہو جاتا ہے اسی طرح انسان بھی روحانی ترقی کے مدارج طے کرتا ہوا مناسب وقت پر اللہ کی ذات میں گم ہو جاتا ہے اور ایسے عیسائی راہبوں کے اقتباس ہم پہلے پیش کر چکے ہیں جو اپنے آپ کو خدا کی ذات میں گم کر رہے تھے۔ اب دیکھئے کہ گوبلٹا ہر شہود کا نظریہ وجودی نظریہ سے کچھ اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن نتائج کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ وحدت الوجود کا نظریہ خود اللہ تعالیٰ کو انسان کے جسم میں اتارتا ہے اور شہود کا نظریہ انسان کو بلند کر کے اللہ کی ذات میں داخل یا مدغم کرتا ہے حالانکہ وہ انسان اسی دنیا میں موجود ہوتا ہے کہیں ساتوں آسمانوں سے ماوراء ہستی سے نہیں جاملتا۔ وجودی نظریہ حلول کے ذریعہ انسان کو خدا بناتا ہے، لیکن شہودی نظریہ اپنے

مخصوص نظریہ سے انسان کو خدا بناتا ہے۔ گویا نتیجہ کے لحاظ سے دونوں انسان کو خدا بنانے کے لحاظ سے ایک ہی ہیں۔ خدا تعالیٰ نے عیسائیوں کے اس عقیدہ کو صریح کفر قرار دیا اور فرمایا:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ (۳/۵)

خدا تین میں کا تیسرا ہے۔

عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت عیسیٰ ﷺ اور حضرت مریم علیہا السلام خدا کی ذات میں یوں مدغم ہوتے ہیں کہ تینوں الگ الگ بھی خدا ہیں اور تینوں مل کر بھی ایک ہی خدا بنتا ہے اور یہ عقیدہ کا ایسا گورکھ دھندا ہے جسے سمجھانے سے خود عیسائی پادری بھی لاچار اور اس لاچاری کے معترف ہیں و جبر یہ ہے کہ وحدت الشہود خالصتا دینِ طریقت کا جزو ہے اور بموجب آیاتِ بالا صریح کفر ہے تو آخر کفر اور شریعتِ الہی کا اتحاد کیسے ممکن ہو؟

ہندومت وحدت الشہود کے تصور کو آتما، مہاتما اور پرما تما کی اصطلاحوں سے پیش کرتا ہے۔ آتما بمعنی رُوح ہے اور مہاتما، بزرگ مُفع جو بہت زیادہ روحانی مدارج طے کر چکی ہو، جیسے مہاتما گاندھی اور مہاتما بھگت وغیرہ۔ بھر و روحانی ترقی کا اگلا درجہ یہ ہے کہ مہا آتما، مزید روحانی ترقی کر کے پرما تما و سب سے بڑی اور بزرگ رُوح یعنی خدا سے مل جائے پس اسی صورت میں انسان کی نجات ممکن ہے ورنہ رُوح تا ابد "اواگون" یا تانسخ (جس کی تفصیل آگے آئے گی) کے چکر میں پھنکتی رہتی ہے۔

اور مسلمان صوفیاء نے اپنے سلوک کی مندرجہ ذیل سات منازل مقرر کر رکھی ہیں:

۱۔ طلب ۲۔ عشق ۳۔ معرفت ۴۔ استغناء ۵۔ توحید ۶۔ حیرت

۷۔ فقر و فانیافتہ اتم۔ (مرشدِ کامل ترجمہ: حقائق الاخیار، مصنف: صادق فرغانی، ص ۱۲۷ تا ۱۳۲)

گویا ساتویں منزل یا سیر الی اللہ کی آخری منزل پر جا کر انسان یا سالک فنا فی اللہ یا واصل باللہ یا واصل بحق ہو جاتا ہے، تاہم یہ ساتویں منزل سلوک کی آخری منزل نہیں۔ اس کے بعد سیر فی اللہ شروع ہو جاتی ہے جس کی کوئی انتہا نہیں اور یہی فلسفہ ہندومت یا عیسائیت بھی پیش کرتی ہے۔

وحدت الوجود کی طرح گویہ نظریہ بھی دوسری صدی ہجری کے اخیر میں اسلام میں درآمد ہو گیا تھا، تاہم منصو حلاج نے وجودی فطریہ کو جو تکامل

وحدت الشہود کی تاریخ

لے ابنِ اکبر کی طرح صادق فرغانی کا بھی یہ دعویٰ ہے کہ اس نے ۱۲ کتاب کے مندرجات کشف میں۔ رسول اللہ ﷺ پر پیش کئے اور ان کی تصحیح کے بعد شامل کتاب کئے ہیں۔

منشا، اس کو جسے یہ نظریہ، دبارہ۔ اسلامی تاریخ میں پہلے شخص ہمیں ابو اسماعیل ہرودی (م ۴۸۱ھ) نظر آتے ہیں جنہوں نے یہ فلسفہ تحریری طور پر پیش کیا۔ پھر اس کے بعد علاؤ الدین سمنانی (م ۳۷۰ھ) نے اس نظریہ کو آگے بڑھایا، لیکن امام غزالی اور ابن الجبر جیسے فلاسفوں اور متصوفین کی تبلیغ کے مقابلے میں شہودی نظریہ ناقابل انتہات ہی سمجھا جاتا رہا۔ تا آنکہ گیارہویں صدی ہجری مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ نے اس نظریہ کی آبیاری کی اور اُسے پُران چڑھایا۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

”پہلے میں بھی وحدت الوجود کو مانتا تھا، لیکن جب میں نے آگے ترقی کی، تو وحدت الوجود کی کیفیت مجھے بہت ادنیٰ نظر آئی اور مجھے یہ یقین حاصل ہوا کہ مخلوق خالق کا ظل ہے۔ مجھ پر اصل حقیقت کھلی اور مجھے معلوم ہو گیا کہ خدا، خدا ہے اور مخلوق، مخلوق۔ دونوں الگ الگ وجود ہیں۔“ (حقیقت وحدت الوجود ص ۱۸، مصنفہ عبدالمکرم انصاری)

اب ایک دوسرا اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیے، جو ذرا مفصل ہے شیخ مجدد اپنے باطنی ارتقاء کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”میں پہلے وحدت الوجود کا معتقد تھا۔ کیونکہ بچپن ہی سے اسے بر بنائے استدلال عقلی جانتا تھا اور اس کی صداقت کا کامل یقین تھا، لیکن جب اہ سوک اختیار کی، تو پہلی مرتبہ وحدت الوجود ایک ادراک روحانی کی حیثیت سے متحقق ہوئی اور میں نے برائی العین اس کا شاہدہ کر لیا۔ میں عرصہ تک اس مقام میں رہا اور تمام معارف، جو اس مقام سے متعلق ہیں وہ مجھے حاصل ہو گئے۔“ (مکتوبات امام ربانی، دفتر اول، مکتوب نمبر ۳۱، بحوالہ حضرت مجدد کا نظریہ توحید، ص ۷۰)

بعد ازاں ایک بالکل نیا روحانی ادراک میری روح پر غالب آگیا اور میں نے پایا کہ میں آئندہ وحدت الوجود کو نہیں مان سکتا۔ تاہم مجھے اپنے کشف کے اظہار میں تاثر تھا کیونکہ میں عرصہ دراز تک وحدت الوجود کا معتقد رہا تھا۔ آخر کار مجھے اس کا انکار بصراحت تمام لازم پڑا اور مجھ پر کشف ہو گیا کہ وحدت الوجود ایک ادنیٰ مقام ہے اور میں ایک بالاتر مقام پر پہنچ گیا ہوں، یعنی خلقت پر۔ اگرچہ میں ابھی تک دراصل وحدت الوجود کے انکار پر راضی نہ تھا کیونکہ تمام بڑے بڑے متصوفین نے اسے مانا تھا، لیکن اب اس کا انکار ایک ناگزیر واقعہ ہو گیا تھا۔ بہر کیف میری آرزو تھی کہ میں خلقت پر ہی رہوں کیونکہ خلقت کو وحدت الوجود سے ایک انبیت تھی۔ میں اس میں اپنے

تئیں اور اس عالم کے تئیں خدا کا ظل محسوس کرتا تھا، لیکن فضل خداوندی دستگیر ہوا اور میں اعلیٰ ترین مقام یعنی مقام عبودیت پر فائز ہو گیا۔ تب میں نے پایا کہ عبودیت تمام دوسرے مقامات سے بالاتر ہے اور مجھے مقام وحدت الوجود یا خلقت میں رہنے کی آرزو پر ندامت ہوئی۔“ (مکتوبات دفتر اول مکتوب نمبر ۱۶۔ بحوالہ حضرت مجدد کا نظریہ توحید، ص ۱۷)

پھر مجدد صاحب کشف کی حقیقت اور اس کے غیر یقینی ہونے کو ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

”کشف سے جو ظاہر ہوتا ہے وہ شہود ہی شہود ہے اور حقیقت نہیں بلکہ غایت فی الباب یہ ہے کہ خدا کا شہود ہو ہی نہیں سکتا۔ پس ایمان بالغیب کے سوا چارہ نہیں اور ایمان بالغیب اس وقت پستراتا ہے جب ہم دخیال اپنی سعی سے عاجز آجائیں اور متحیلہ کچھ باقی نہ ہے یعنی متحقق ہو جائے کہ وہ ذات ہماری دسترس سے بالاتر ہے اور ہمارے حیطہ ادراک و عقل سے ماوراء ہے۔“ (مکتوبات دفتر ۲، مکتوب نمبر ۹، بحوالہ حضرت مجدد کا نظریہ توحید، صفحہ نمبر ۹۵)

مندرجہ بالا اقتباسات سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں۔

۱۔ مجدد صاحب کے نزدیک سلوک کی تین منازل ہیں جو انہوں نے طے کیں۔

(i) وحدة الوجود، جہاں سالک خدا، انسان اور کائنات سب کو ایک ہی ذات سمجھتا ہے۔

(ii) اس سے اگلا درجہ وحدة اشہود کا ہے۔ جہاں سالک خدا اور انسان ثنویت محسوس کرنے لگتا ہے مگر

صرف اس حد تک کہ خدا قائم بالذات ہے اور باقی چیزیں اس کا سایہ یا ظن ہیں اور

(iii) اس سے اگلا مقام یہ ہے کہ خدا اور کائنات میں ثنویت پوری طرح آشکار ہو جاتی ہے۔ سالک یہ سمجھنے

لگتا ہے خدا الگ ہے، کائنات الگ۔ صرف سایہ کے لحاظ سے نہیں، بلکہ مستقل وجود کے لحاظ سے اور یہی مقام عبودیت ہے۔

۲۔ آپ کے زمانہ تک نظریہ وحدت الوجود کی متصوفین پر اس قدر گہری چھاپ تھی کہ کوئی اس کے خلاف کہنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ اس کی وجہ دو تھیں۔ ایک اپنے پرانے عقیدہ سے محبت، دوسرے اپنے بزرگوں کا احترام۔

۳۔ کشف، بہر حال کشف ہی ہے، حقیقت نہیں، چاروناچار ہمیں وحی الہی یا ایمان بالغیب کے سایہ عاطفت ہی پناہ لینا پڑتی ہے۔

اب دیکھئے کہ مجدد صاحب نے اتنی محنت شاقہ کے بعد جو سرستہ راز تلاش کیا ہے کیا یہ خدا نے ہمیں
 بغیر کسی محنت اور داغ سوزی کے بذلیعہ انبیاء ابتداء سے ہی نہیں بتلادیا تھا۔ قرآن میں جو یہ آیت ہے کہ :
 لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (۶۱۰۴) لگائیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک
 کر سکتا ہے۔

اس میں عین کی بجائے بصر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے یسین ظاہری آنکھ کے لئے آتا ہے اور 'بصر'
 ظاہری اور باطنی یا قلبی ہر دو آنکھوں کے لئے آتا ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ نرم عقل و فلسفہ کی رو سے
 خدا کی کُنہ کو پا سکتے ہو اور نہ وہ دمان و مشاہدہ و کشف کے ذیل ہے۔ پھر یہ بھی بتلادیا کہ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ
 کوئی چیز اس کے مثل نہیں۔

اس آیت میں انسان کے تخیل و واہمہ کو چیلنج کیا گیا ہے کہ وہ بھی خدا کا تصوّر پیش نہیں کر سکتا۔
 یہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ اِنَّ لَوُكُلٍ نَفْسًا غَافِلًا (۶۹۱)
 ان لوگوں نے (انبیاء کی ہدایت کو قابل اعتناء نہ سمجھا کر) خدا
 کی قدر جیسے چاہئے جانی چاہئے تھی، نہ جانی۔

پھر یہ بھی عجیب بات ہے کہ مجدد صاحب نے اتنی ریاضتوں اور محنت شاقہ کے بعد جس عبدیت کے مقام
 کا اظہار کیا ہے، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اس قدر محنت شاقہ اور تزکیہ نفس کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔
 وہ تو مجھے اور مجھ جیسے گنہگاروں سب کو حاصل ہے۔ حسب ارشاد باری تعالیٰ :

قُلْ يُعَادِيَ الَّذِينَ اَسْرَفُوا
 عَلَىٰ اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا
 مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ
 اے (پیغمبر) میری طرف سے لوگوں کو کہہ دو کہ اے میرے
 بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، خدا کی
 رحمت سے ناامید نہ ہونا۔

یہ الگ بات ہے کہ مجھ گنہگار کا عبدیت کے لحاظ سے مقام الگ ہے، مجدد صاحب کا بہت اونچا،
 اور حضور اکرم ﷺ کا سب سے اونچا، مگر عجب ہونے میں تو مجال انکار نہیں ہو سکتا۔

اب اسی طرح ایک اور صاحب ہیں
 خواجہ عبدالحکیم انصاری، نقشبندی

وجود اور شہود کی ایک دوسرے انداز سے تحقیق

مجددی، توحیدی، بانی سلسلہ عالیہ، توحیدیہ اور مصنف کتاب "حقیقت وحدۃ الوجود" جن کے کچھ اقتباس

ہم پیش کر چکے ہیں۔ گویا تہی معروف شخصیت تو نہیں تاہم اُن کا دعوئے ہے کہ وہ بھی ذاتِ بحت تک یا حرمِ کبریا تک مشاہدہ کرائے ہیں۔ یہ بزرگ سلوک کی منازل، روح اور خدا کی ذات و صفات بیان کرنے میں منفر د نظر آتے ہیں۔ ان کے خیالات کے مطابق سالک کی روحانی پرواز کی پہلی منزل دونخ ہے، جو ہماری زمین سے متصل ہے اور اس کی دلیل یہ جیتے ہیں :

وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَىٰ
رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا (۱۹، ۲۱) اودھ تہا سے کوئی ایسا نہیں مگر اسے رجتہم پر سے گزنا ہوگا۔

لہذا کوئی بھی روح (زندگی میں یا مرنے کے بعد) جب اوپر کو پرواز کئے گی تو یہاں سے گزنا ہوگا۔ اگر روح گنہگار ہوگی تو بس اُس میں رہ جائے گی تا آنکہ جل کر اور لطیف ہو کر پرواز کے قابل نہ ہو جائے۔ وہ اس دونخ کو زمین ہی کی مثل قرار دیتے ہیں جس میں کہیں لُح و دق صہا ہیں، کہیں ریگستان، کہیں کڑوے اور گرم چٹنے اور کہیں آتش فشاں پہاڑ۔

پھر اس کے بعد اعراف ہے۔ پھر جنتوں کے طبقات شروع ہو جاتے ہیں، جو بہ ترتیب اس طرح ہیں عالمِ ملکوت، دوسرے جبروت، تیسرا لاہوت، چوتھا ماہوت اور پانچواں ہو۔ دونخ کے طبقات سے عالم ہو کے آخر تک عالمِ مثال کہلاتا ہے۔ اس کے بعد عالمِ اُمر ہے جس میں بے شمار لطائف ہیں۔ پہلے لطیفہ عدم ہے، پھر لطیفہ نفس، پھر لطیفہ عقل اور پھر لطیفہ روح۔ ان لطائف سے آگے حوالی عرش کا علاقہ ہے، پھر عرشِ مجید ہے جس کے عین مرکز میں سالک کو ذاتِ بحت کا مشاہدہ اور عرفان ہوتا ہے اسی جگہ سالک روح کا سفر ختم ہو جاتا ہے اور وہ عارفِ کامل اور دلی مکمل بن جاتا ہے۔ (ص ۹۰)

خدا کے متعلق ان کا تصویریہ ہے کہ :

”روح کا سفر مادی عالم یعنی کرتہ زمین سے شروع ہو کر عرشِ کبریا پر اس جگہ ختم ہوتا ہے جہاں سالک کو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بحت کا عرفان ہوتا ہے۔ جن میں نہ کوئی رنگ ہے، نہ بو ہے، نہ ————— نہ کوئی صفت ہے اور جس کی بابت وہ خود قرآن میں ارشاد فرماتا ہے :

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ پاک ہے، وہ ذات تمام صفات سے
عَبَمَا يَصِفُونَ (۱۸/۲۴) (ترجمہ از موصوف)

لاحظہ فرمائیے! اپنے مسک کی تائید میں آیت کے ترجمہ کا کیا استیاناس کیا گیا ہے۔ یہ آیت یا اس

جیسی اور تین چار جگہ پر آیات میں، سب میں کافروں اور مشرکوں کی ایسی بات کا رد فرمایا گیا ہے، جو صفات الہی کے منکر تھے لیکن یہاں اس کو خدا ہی کی ذات صفات کے رد میں پیش کیا جا رہا ہے مزید طرفہ یہ کہ اس مسلک کی تائید میں ایک اور ”آیت“ پیش کی گئی ہے، جو سرے سے قرآن میں موجود ہی نہیں۔ اَلَا نَ كَمَا كَانَ اور اس کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے: ”وہ جیسا تھا، ویسا ہی ہے اور ویسا ہی ہے گا۔“ (ص ۶۹) لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ اپنے مسلک کی تائید میں قرآن کے ساتھ اس قدر زیادتی۔

اور رُوح کے متعلق ان کا نظریہ ہے کہ وہ ایک روحانی شاع ہے جس کا ایک سر تو عالمِ اُم میں ہے اور دوسرا انسان کے دماغ میں پیوست ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ:

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ اِلَّا هُوَ اخِذٌ

گو یا کوئی جاندار یا سانپ، جس کو اللہ نے اس کی چوٹی

بِنَا صَيَّبَهَا

اب یہ روحانی سیر یا سلوک اسی شاع کی راہ پر ہوتا ہے، گویا یہی صراطِ مستقیم ہے اور ہر شخص کا یہ صراطِ مستقیم الگ الگ ہے۔ (اقتباس، ص ۵۹)

وحدت الوجود اور شہود کے بانی میں ان کا نظریہ ہے کہ ابن عربی جب علمِ ہا ہوت کے بعد عالمِ ہویں داخل ہوئے تو ان کو ایسی فرحت اور سکون ہوا کہ بس یہیں کے ہو کر رہ گئے اور سمجھ گئے کہ یہ (ہو) ذاتِ احدیت ہے اور یہیں سے تمام شائیں نکل کر عالمِ مادی تک پہنچ کر قفل ہوئی اور جامد شکل اختیار کر رہی ہیں تو انہوں نے دعویٰ کر دیا کہ وجود ایک ہے اور وہی خدا ہے اور بالکل یہی نظریہ مادہ پرستوں کا بھی ہے۔ لیکن مجدد الف ثانیؒ ”کچھ عرصہ یہاں رہ کر“ ”ہو“ کے اوپر والے کنا سے پر پہنچے، تو وحدت الوجود کے منکر ہو گئے اور سمجھ گئے کہ مخلوقات خدا کا خلق (سایہ) ہے۔“ (اقتباس، ص ۱۰۶، ۱۰۷)

ہم حیران ہیں کہ صوفیاء کا طبقہ کشف کو غیر یقینی قرار بھی دیتا چلا جاتا ہے۔ پھر بھی انہی عقائد و نظریات کو صحیح ثابت کرنے اور حُر زبانی بنائے رکھنے پر مُصر بھی ہے۔ یہ بزرگ بھی نظریہ وحدت الوجود کا بطلان یا تردید نہیں کرتے، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ابن عربی کو غلط فہمی ہوئی اور مجدد صاحب تو اس ”ہو“ کے مقام سے آگے نکل گئے تھے۔ اس غلط فہمی کا آپ نے ذکر نہیں فرمایا۔ جسے مجدد صاحب نے خود ایک کیفیت سے تعبیر کیا ہے۔ حقیقت ہے نہیں۔

متاخرین میں ایک صوفی توکل شاہ انبالوی (م ۱۳۱۸ھ) نظر آتے ہیں جنہوں نے علی وجہ البصیرت

نظریہ وحدت الوجود کو غلط قرار دے کر وحدت الشہود کو اپنایا، وہ فرمایا کرتے تھے کہ :

”جب وحدت الوجود کے حالات و واقعات کا انکشاف ہوا، تو وحدت کا ایک بھر پور کمال نظر آیا۔ اپنا وجود اس بھر پور کمال کا قطرہ معلوم ہوتا تھا اور ہر طرف وحدت ہی وحدت کا عالم نظر آتا تھا۔ جب یہ حالت ہوتی تو ہم اپنے جسم میں سوتیاں چھبوتے اور جب اس طرح کرنے سے تکلیف ہوتی، تو خیال آتا کہ اللہ تعالیٰ تو تمام تکلیفوں سے منزہ ہے۔ اگر تو کوکل شاہ (خدا ہے تو تجھے تکلیف کیوں ہوتی؟ اور اگر کوئی جھمنے سے بھی تکلیف نہ ہوتی تو آگ کا دکھنا ہوا انگارہ بدن پر رکھتے تھے۔ جب جلنے سے تکلیف ہوتی، تو پھر وہی خیال آتا تھا کہ اس آگ نے تجھے کیوں جلایا؟ اللہ تعالیٰ کی ذات تو ان تمام کیفیات سے مبرا ہے۔ پھر عاجزی اور انکاری سے بارگاہ ایزدی میں دعا کرتے کہ میری مدد فرما اور میرے حال پر رحم فرما کہ میں تیری نماز ادا سکوں۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ملک الملک نے اس بھر پور کنارے سے پار نکال کر شاہراہ شہود پر ڈال دیا۔ پہلے ہم اسی حالت کو بڑا مقام سمجھتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وجود سے آگے شہود کی منزل ہے۔“ (صوفیائے نقشبند، ص ۱۲۳)

شاہ ولی اللہ اور وجود و شہود

ایک اور بزرگ ہستی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہیں۔ ہم مجدد الف ثانی کی طرح ان کی دینی خدمات کے بدل و جان معترف

ہیں اور ان بزرگوں کے حق میں تہہ دل سے دعا نکلتی ہے لیکن شاہ صاحب مذکور جہاں عالم محدث اور فقیہ ہیں وہاں متصوف بھی ہیں۔ انہوں نے ایک رسالہ بنام ”فیصلہ وحدۃ الوجود والشہود“ لکھا۔ جس میں صرف ابن عربی اور مجدد صاحب کے نظریات کو تطبیق دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ وحدت الوجود یا شہود کی تردید یا بطلان کی جرات نہیں ہوئی بلکہ حقیقتاً دیکھا جائے تو مجدد الف ثانی کے نظریہ توحید کی مقبولیت کے باوجود شاہ صاحب کا ذہن نظریہ وحدت الوجود کی حقانیت کی طرف مائل رہا اور تطبیق یوں دی گئی کہ وحدت الوجود کے نظریہ میں وحدت الشہود کا نظریہ پہلے ہی شامل ہے اور نزاع صرف لفظی ہے حقیقت ایک ہی ہے چنانچہ اسی رسالہ کے صفحہ پر فرماتے ہیں :

فالْمَذْهَبُ الْأَوَّلُ تَسْمَى بِوَحْدَةِ الْوُجُودِ وَ
الثَّانِي بِوَحْدَةِ الشَّهَادَةِ وَوَقَعَ عِنْدَنَا أَنَّ
الْمُكْشُوفِينَ صَحِيحَانِ جَمِيعًا لَكِنَّ الْقَوْلَ
بِأَنَّ وَحْدَةَ الشَّهَادَةِ عَلَى هَذَا الْمَعْنَى لَمْ يَقُلْ
تو پہلے مذہب کا نام وحدت الوجود ہے اور دوسرے کا
وحدت الشہود ہے اور ہمارے نزدیک دونوں مکاشفے صحیح
ہیں۔ لیکن یہ کہنا کہ شیخ عربی نے وحدت الشہود اس
معنی سے نہیں کہے، یہ سہو ہے، بلکہ شیخ اور اتباع

به الشيخ العربي سهو بل الشيخ واتباعه شيخ، بلکہ حکماء نے بھی کی ہے۔

(فیصلہ وحدۃ الوجود والشہود، ص ۷)

بل الحكماء ایضاً یقولون ہا

آپ کو یہ نظریات چونکہ ورثہ میں ملے تھے۔ لہذا ان کا انکار اور بطلان مشکل تھا، چنانچہ انھیں العارفین،

صفحہ ۹۶ پر فرماتے ہیں:

”والد گرامی (شاہ عبدالرحیم صاحب) فرماتے تھے کہ اوقات عزیز میں سے ایک وقت فنا کے کلی اور غیبتِ تامہ میں سر ہوئی تو دیکھا کہ حق سبحانہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ: میرے فلاں بندے کو ڈھونڈ لاؤ، زمین میں تلاش کیا، آسمان چھان ماسے، نہ ملا۔ بہشت میں تلاش کیا نہ پایا۔ اس پر حق سبحانہ تعالیٰ نے فرشتوں سے خطاب کیا کہ جو مجھ میں فنا ہوا، وہ نہ آسمانوں میں ملے گا نہ زمینوں میں اور نہ ہی بہشت میں۔“

لیکن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی اس تطبیق کو شیخ مجدد کے متبعین نے قبول نہیں کیا۔ چنانچہ خواجہ میر نامہ عندیوب نے اپنی کتاب نالہ عندیوب صفحہ ۱۱۵۳ میں وحدت الوجود کی تنقید کی۔ پھر خواجہ میر درد نے اس وجودی نظریہ کو سرسبز زندہ قرار دیا۔ پھر مولوی غلام محیی (دم ۱۱۹۵ھ) نے مرزا مظہر جان جاناں کے ایماء پر شاہ ولی اللہ صاحب کی تردید پر قلم اٹھایا اور ۱۱۸۴ھ میں رسالہ دفع باطل شائع کیا۔ جس میں اپنے والد کی پُر زور حمایت کی۔ پھر سید احمد بریلوی نے صراطِ مستقیم لکھ کر وحدت الوجود کو حقانیت کے خلاف قرار دیا، چاہے تو یہ تھا کہ جس طرح مجدد الف ثانی نے بر بنائے کشف وحدت الوجود کو صرف ایک کیفیت قرار دیا ہے اور اس کی تردید کی ہے اسی طرح کوئی بزرگ بر بنائے کشف ان کے نظریات کی توثیق یا تردید کرتے مگر ایسا کسی نے بھی نہیں کیا۔ صرف عقلی اور استدلالی قسم کی بحث چل رہی ہے، جو آج تک جاری ہے۔

دینِ طریقت کے عقائد پر تحقیقی نظر

اِس باب میں جن تین نظریات و عقائد وحدت الوجود، وحدت الشہود اور حلول کی وضاحت پیش کی ہے ان کو عرف عام میں اتحادِ ثلاثہ یا اتحادِ حلول کے نظریات کہا جاتا ہے۔ اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ شرعی نقطہ نظر سے اسلام میں ایسے نظریات کی گنجائش ہے یا نہیں۔ وحدت الوجود کا نظریہ کائنات میں تمام اشیاء کو ایک ہی صف میں لاکھڑا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تمام موجودات خدا ہی کا حصہ ہیں اور انہیں اس کی ذات سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن کریم اس باطل نظریہ کی پُر زور تردید کرتا ہے۔ قرآن نے کائنات کو دو الگ الگ درجوں میں تقسیم

کیا ہے۔

۱۔ عبد اور مہبود : اس لحاظ سے اس کائنات کا خالق ، مالک اور مہبوس فقط اللہ تعالیٰ ہے۔ باقی تمام مخلوق اُس کی بندگی پر مہبوس ہے۔ تمام موجودات میں سے صرف انسان اور جن کو کسی حد تک اطاعت اور عصیان کا اختیار بھی دیا گیا ہے اور اس سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ دوسری موجودات کی طرح اللہ کو خالق اور مہبود سمجھے اور گویں اُمور کی طرح اختیاری اُمور میں بھی اپنے آپ کو اللہ کی مرضی کے تابع بنا دے یہی اس کی روحانی ترقی ہے اور یہی مقام ولایت ہے۔

۲۔ انسان اور دیگر موجودات : قرآن ہمیں یہ بھی بتلاتا ہے کہ کائنات کی باقی تمام موجودات صرف انسان کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی اور وہ اس کی خدام ہیں۔ اس کے ہمسایہ بالائیں نہیں کہ انسان ان کی پرستش شروع کر دے۔ انسان باقی تمام اشیاء کو حسب ضرورت و مرضی اپنے مصرف میں لاسکتا ہے ان سے کام لے سکتا ہے۔ ان کو نفع بھی کر سکتا ہے، مار بھی سکتا ہے اور نافع اشیاء سے فائدہ اٹھانے کا اسے پورا پورا حق دیا گیا ہے، کیونکہ سب چیزیں اس کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔

اب وحدت الشہود اور مخلوق کی طرف آئیے۔ اگر انسان اور خدا کا جوہر ایک ہی ہو، تو کیا اس کا امکان ہے؟ اور اگر ان میں غیرت پائی جاتی ہو تو بھی یہ ناممکن ہے اور اس بحث میں مرکزی بحث روح کے متعلق ہے کہ آیا انسان اور خدا میں ایک ہی روح کار فرما ہے، جو ازلی اور ابدی ہے یا ان میں کچھ فرق ہے۔ قرآن کریم ان دونوں میں فرق کرتا ہے اور ان دونوں قسم کے جوہروں کو یکسر مختلف قرار دیتا ہے۔

حضرت اکرم ﷺ سے روح کے بارے میں استفسار کیا گیا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب ان الفاظ میں دیا۔

روح کی حقیقت

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنْ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (۱۶۸۵)

آپ سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ وہ میرے پروردگار کے حکم سے ہے اور تم لوگوں کو بہت سے علم الا قلیل (۱۶۸۵) ہی کم علم دیا گیا ہے۔

اس آیت میں ”قل الروح من ربي“ کے بجائے ”من امر ربي“ کہہ کر وحدت روح کے نظریہ کا ابطال کر دیا گیا ہے۔ ”امر ربی“ کی حقیقت کو علماء نے دو طرح سے بیان کیا ہے۔ پہلی مثال اس طرح ہے کہ فرض کیجئے کہ کوئی کارخانہ بجلی کے ذریعہ چلتا ہے۔ اس کارخانہ کی بھاری بھر کم مشین موجود اور نصب ہونے

کے باوجود صرف اس وقت حرکت کرتی ہے جب بجلی کی کرنٹ آتی ہے اور جب کرنٹ چلی جائے، تو یہ از خود بند ہوجاتی ہے۔ اب اس کرنٹ پر بھی کسی دوسری ہستی کا کنٹرول ہے۔ وہ ہستی اور کرنٹ ایک چیز نہیں۔ بعینہ یہی مثال خدا، رُوح اور ذوقی الارواح کی ہے۔

دوسری یہ کہ مثلاً ایک بادشاہ کسی شخص کو محض اپنے حکم سے، خواہ وہ زبانی ہو تحریری، گورنر بنا دیتا ہے، تو وہ شخص گورنری کا حکم ملتے ہی از خود ان اختیارات کا مالک ہو جاتا ہے اور جب بادشاہ کسی کو معزول کرنا چاہتا ہے کہ اس کے ایک حکم سے اس کے سب اختیارات از خود چھن جاتے ہیں اور وہ اسی وقت پہلے جیسا ایک بلے بس انسان رہ جاتا ہے، گویا قوت تمام ترکم میں ہے۔ پھر بادشاہ اور حکم الگ الگ چیزیں ہیں اور وہ لازم و ملزوم بھی نہیں، بعینہ یہی مثال خدا، رُوح اور انسان کی ہے اور رُوح کی حیثیت محض ایک حکم ہے۔

ہندومت میں رُوح کو لازوال اور ازلی ابدی تسلیم کیا گیا ہے۔ پھر وہ رُوح کی وحدت پر بھی زور دیتا ہے۔ آتما، مہاتما اور پر ماتا

ہندومت اور نظریہ رُوح

کی تقسیم میں یہی نظریہ کار فرما ہے، اس نظریہ نے دو مسائل کو جنم دیا۔
۱۔ اہنسا کا اصول۔ یعنی انسان کو کسی جاندار شے کو دکھ دینا یا مارنا نہیں چاہیے۔ کیونکہ انسان کی رُوح اور اس جاندار کی رُوح ایک ہی وحدت کے حصے ہیں۔ لہذا ہندوؤں میں کسی جانور کو، خواہ کتنا ہی مؤذی کیوں نہ ہو، دکھ دینا بہت بڑا پاپ دگناہ کیوں سمجھا گیا ہے۔ نہ ہی کسی انسان کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ جانور کو ذبح کر کے اس کا گوشت کھائے یا اسے کسی اور طریقہ سے استعمال میں لائے۔

۲۔ آدواگون یا تنازع کا اصول بھی اسی نظریہ وحدت کا مرہونِ عزت ہے۔ آدواگون کا چکر یہ ہے کہ ایک انسان اگر اپنی تمام زندگی میں بُرے کام کرتا ہے، تو مرنے کے بعد اس کی رُوح کسی کمتر مخلوق مثلاً کسی گدھے کے قالب میں منتقل ہو جائے گی، بواجبی پیدا ہونے والا ہے اور اگر بہت زیادہ پاپ کئے، تو اس سے بھی کمتر مخلوق مثلاً کسی کتے یا چیونٹی میں منتقل ہو جائے گی اور اس دوران اپنے گناہوں کی سزا بھگتے گی۔ جب تک سزا بھگت نہ چکے کسی انسان کے قالب میں منتقل نہیں ہو سکتی اور اگر کسی انسان نے اپنی زندگی میں اچھے کام کئے ہیں تو کسی ایسے انسان کے قالب میں منتقل ہوگی، جو نیک بخت ہوگا اور یہ پتھر یونہی چلتا رہتا ہے۔ تاہم آتما (روح) مہاتما نہ بن جائے اور مہاتما سے آگے روحانی مدارج طے کر کے پر ماتما (خدا) میں مدغم نہ ہو جائے تبھی جا کر اس کی نجات ہوتی ہے۔

ہندومت کا نظریہ روح وحدت الشہود اور حلول دونوں نظریوں کا جواز ثابت کرتا ہے، لیکن اسلام کا نظریہ روح ان دونوں نظریات کی مخالفت کرتا ہے جیسا کہ پہلے واضح کیا گیا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ ہندومت جس طرح پرمانتا کو ازلی ابدی تسلیم کرتا ہے۔ اس طرح کائنات یعنی روح اور مادہ دونوں کو ازلی ابدی تسلیم کرتا ہے۔ مسلمانوں میں کچھ ایسے ”بزرگ“ بھی پیدا ہوئے ہیں جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ قرآن کے ایک ایک صفحے سے تنازع کو ثابت کر سکتے ہیں۔ آپ تصوف کی کوئی مغنبر کتاب لے کر اس میں ”مبدأ اور معاد“ کی بحث پڑھ لیجئے۔ اس کے اور ہندوؤں کے نظریات بالکل ملتے جلتے نظر آئیں گے۔

مندرجہ بالا نظریات کی سب سے پہلی
زرد اسلام کے بنیادی عقیدہ توحید پر پڑتی

دین طریقت کے نظریات کا اسلامی تعلیمات پر اثر

ہے۔ ان نظریات نے عبد اور مہبود کا قصہ ہی پاک کر ڈالا ہے۔ لہذا جو لوگ ان کے قائل ہیں نہ وہ مسلمان رہ سکتے ہیں اور نہ ہی ان کے دلوں میں قرآن وحدیث کا احترام باقی رہ جاتا ہے۔ اگرچہ یہ لوگ مہبود کو مہبود اور خود کو عبد کہتے ہیں، تو یہ محض لوگوں کے ڈر سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ عقیف الدین تلمسانی کا مکالمہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ یا بعض دوسرے اہل قلم صوفیاء طریقت کو شریعت کے تابع ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

۱۔ ان لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ ان دیکھے خدا کی پرستش، ایمان کی پہلی منزل ہے جس کو یہ لوگ اپنی زبان میں طلب کہتے ہیں جس پر عاشقان ربانی کبھی قناعت نہیں کر سکتے۔ وہ اس کی مثال آبِ شوق سے دیتے ہیں، جو پیاس کو بجھاتا نہیں، بلکہ مزید بھجھاتا ہے۔ اس کے مقابل اہل تصوف کی توحید (نظریہ وحدت الوجود) آبِ شرب ہے جو پیاس بھی بجھاتا ہے اور تسکین بھی بخشتا ہے۔

۲۔ نظریہ وحدت الوجود کا دوسرا اثر مظاہر پرستی کی شکل میں رونما ہوا۔ سوچ، چاند، ستاروں کی پرستش اور ان کے انسان پر اثرات، آگ، ہوا، پانی، سمند، دریا، شجر و جھرتی کہ جانوروں، درندوں اور پرندوں کی پرستش صرف اس لئے شروع ہوئی کہ وہ ہر چیز کو خدا کا ہی حصہ سمجھتے ہیں جس نے جس میں کوئی خوشگوار اثر دیکھا اس کی پوجا شروع کر دی۔ وحدتِ روح اور اس کو لازوال سمجھنے کے نظریہ نے بت پرستی اور قبر پرستی کی صوت اختیار کر لی اور اس طرح دنیا طرح طرح کے شرک میں مبتلا ہو گئی۔ عالم حادث کے بجائے قدیم بن گیا اور اللہ تعالیٰ کو معطل کر دیا گیا۔

۳۔ اس نظریہ کی سب سے بڑی ردِ صفات باری پر پڑتی ہے، مثلاً:

الف۔ انسان ظالم، جاہل اور بدکردار بھی ہوتے ہیں۔ اگر یہ سب عین ہیں، تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ خدا میں بھی معاذ اللہ یہ نقائص موجود ہیں۔

ب۔ انسانوں پر اور اسی طرح کائنات کی دوسری اشیاء پر تغیر و تبدل کا عمل جاری رہتا ہے۔ انسان پیدا بھی ہوتے ہیں۔ بیمار بھی ہوتے ہیں، دکھ بھی اٹھاتے ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ اگر انسان خدا کا عین ہے، تو کیا معاذ اللہ خدا، جو حقی اور قیوم ہے، وہ بھی ان تغیرات کی زد میں ہے۔

ج۔ خدا نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کی خدائی کی تردید ان الفاظ سے کی تھی کہ ”وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔“ اور جو کھانا کھائے اس کو بہت سے عوارض لاحق ہوتے ہیں۔ اب ساری دنیا بنی نوع انسان اور حیوان کھانا کھاتے ہیں مگر یہ خدا کا عین بھی ہیں، تو کیا معاذ اللہ خدا بھی انہی عوارض سے دوچار ہے۔

۴۔ ان نظریات کو تسلیم کرنے والے خود بخود جبریہ عقائد کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایک پانی کا قطرہ، جو اپنے جوہری اوصاف کے لحاظ سے سمندر کا ہم جنس ہے۔ جب لڑھکتا لڑھکتا پہاڑیوں، نشیبوں اور ندی نالوں سے ہوتا ہوا سمند میں جا گرتا ہے، تو اس سائے عمل میں اس قطرہ کا کچھ بھی اختیار نہیں ہوتا بعینہ یہ صورت حال انسان کی ہے جس کی اصل منزل مقصود سمندر یا خدا تعالیٰ کی ذات میں ادغام ہے اور دنیا میں جو اعمال و افعال اس سے سرزد ہوتے ہیں ان میں وہ مجبور محض ہے۔

۵۔ ان نظریات نے اسلامی اخلاق پر گہرا اثر ڈالا۔ نہ تو خیر و شر کی تمیز باقی رہی اور نہ حلال و حرام کی۔ اسی طرح شرعی احکام کی پابندی کی ضرورت بھی ختم ہو گئی۔ جیسا کہ ضعیف الدین تلمسانی سے پوچھا گیا کہ اگر دنیا کی سب چیزیں خدا ہی کا حصہ ہیں، تو تم جو رو اور بیٹی میں تمیز کیوں روا رکھتے ہو؟ تو اس نے جواب دیا کہ یہ تمیز تو تم مجھوں (اہل شریعت) کی پیدا کردہ ہے، ہم تو اس میں تمیز روا نہیں رکھتے۔

۶۔ مندرجہ بالا تبدیلی اقدار کی وجہ سے جزا و سزا اور جنت و دوزخ بے معنی چیزیں بن کر رہ گئیں بھلا وہ کون خدا ہو گا جو اپنے ہی ایک حصے کو جہنم کی آگ میں جھونک دے۔ ابن عربی لکھتا تھا کہ جہنم کی آگ ٹھنڈی ہو کر لطف و لذت کا سامان مہیا کرے گی۔ کبھی یہ لوگ اپنے مکاشفات میں جہنم کو بھونکوں سے بھگادیتے ہیں تو کبھی جنت کو آگ لگا دیتے ہیں۔ ابن عربی کے اس نظریہ نے اس قدر زور پکڑا کہ ساری دنیا میں اس کے حامی اور

علمبردار پیدا ہو گئے۔

، — اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی محبت اور ان کی غیر مشروط اطاعت ایمان کا جزو قرار دیا ہے اور جس کے دل میں رسول اللہ ﷺ کا یہ مقام نہ ہو، وہ دائرہ سلام سے خارج ہو جاتا ہے اقبال کا شعر ہے ۔

در دل مسلم مقام مصطفیٰ ست آبروئے مازنام مصطفیٰ ست

لیکن یہ نظریہ رسول اللہ ﷺ کی محبت اور اطاعت کو خارج از بحث قرار دیتا ہے۔ جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مجھ میں بھی خدا ہے اور ایسا ہی خدا ہی پاک ﷺ میں ہے، تو آخر رسول اللہ ﷺ کی کیا فضیلت باقی رہ گئی۔ چنانچہ اس نظریہ کے ایک علمبردار ملا بدخشانی، قادری، مرشد داراشکوہ کا ایک مشہور شعر ہے ۔

پنجہ در پنجم خدا دایم من چہ پروائے مصطفیٰ دایم

(غزنیۃ الاصفیاء، ص ۷۸)

اب اس سے بھی آگے بڑھئے، اس نظریہ کے ماننے والے بوساطت ”عشق“ کرشن جی، ہیر سیال، کے عاشق رانجھا اور رسول کریم ﷺ اور اللہ تعالیٰ سب کو ایک مقام پر لے آتے ہیں۔ یہ حضرات بڑے مزے سے ایسے اشار پڑھتے ہیں۔

بند را بن وچ بین وجائے متھراے وچ گنواں چرائے

چو چوک دے گھر چاکر سدائے عرشاں تے رحمن کھائے

گھر عبد اللہ جانی دا

نعوذ باللہ من ذلک المخافات۔

۸۔ یہ عقیدہ عزت و ذلت، عروج و زوال، آزادی و محکومی کے فرق کو ختم کر کے سب کو ایک سطح پر لا کھڑا کرتا ہے۔ ہمارے ان عارفین کے ہاں ذلت، غلامی و محکومی بھی شان خداوندی کا ایک نشان ہے۔ بھلا جہاں تربیت سے نفس کشی کی جاتی ہو، وہاں عزت نفس ایک بے معنی چیز بن جاتی ہے۔ لہذا جہاد قتال اوستی و مل ان کے ہاں بیکار چیزیں ہیں اور یہی بات قوی زندگی کے لئے زہرِ ہلاک ہے۔

۹۔ اس نظریہ نے شاعرِ اشد کی تعظیم کا تصور بھی ختم کر دیا اور پیروں، فقیروں کے مزارات خانقاہوں

اور معابد کو مسجد حرام یا مسجد نبوی کا درجہ دے دیا۔ جیسا کہ کسی نے کہا ہے :

مدینہ بھی مطہر ہے مقدس ہے علی پور بھی ادھر جائیں تو اچھا ہے، ادھر جائیں تو اچھا ہے مندرجہ بالا نتائج سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دینِ طریقت اور دینِ اسلام بالکل متضاد اور ایک دوسرے کے مخالف ہیں جس طرح اسلام میں عضو و انفاق کی تاکید کی بنا پر سوشلزم کو قبول نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح زہد اور دنیا سے بے رغبتی اور تقویٰ وغیرہ کے خود ایجاد کردہ مضامیم کی بنا پر یہ دینِ طریقت بھی قطعاً گوارا نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اسلام میں زہد کا تصور اس زہد سے یکسر مختلف ہے، جو میں دینِ طریقت بتلاتا ہے۔

دینِ طریقت کے کچھ علمبراروں کو جرأت ہوئی اور اعلانیہ اپنے کفر کا اعلان کر دیا۔ کچھ ان نظریات کو دل میں چھپائے رکھتے اور اپنے خاص رازداروں اور شاگردوں سے ایسے نکات بیان کرتے رہتے۔ لیکن ان میں زیادہ طبقہ ایسے بزرگوں پر مشتمل رہا، جو زبان سے یہی کہتے رہتے کہ خدا کے عاجز بندے اور رسول کے ادنیٰ خادم ہیں اور تعلیماتِ اسلامیہ کی مخصوص تفسیر جو باطنی علوم کا جزو و لا ینفک ہے، کا جو حق انہیں حاصل ہے وہ بھی خدا کا احسان اور نبی کی برکت سے ہے لیکن ان کی عملی زندگی میں اس کی قطعاً شہادت نہیں ملتی مبنی کار و ایاموں کی دلیل ان کے نزدیک صرف یہ ہے کہ انہیں زندہ جاوید خدا ہر بات سے آگاہ کر دیتا ہے۔

WWW.DEENEKHALIS.COM

WWW.RAHEHAQ.COM

WWW.ESNIPS.COM/USER/TRUEMASLAK

برائے ہر بانی یہ کتاب خود بھی خریدے اور بھٹے
ہوئے بھائیوں کو بھی تحفہ دیجئے۔

صوفیاء کے نظریات و عقائد

ہم چند ایسے نظریات کا ذکر کریں گے جن کا تعلق صرف اسلام سے ہے۔ دوسرے مذاہب اس میں شامل نہیں۔ ان نظریات کی تفصیل پیش کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ صوفیاء کا مختصر تعارف پیش کر دیا جائے۔

پہلی اور دوسری صدی ہجری میں ان بزرگوں کو زُہاد، مُعباد اور صلحاء کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ عبد اللہ بن سبا کے حوالی پر دیگر کافروں کو تو علی الاعلان خارج از اسلام قرار دیا جا چکا تھا۔ عام مسلمانوں میں یہ شرکاذنہ عقائد ابھی تک ڈر نہیں آتے تھے۔ تاریخ اسلام میں ہیں سب سے پہلے زاہد و عابد اویس قرنیؓ ملتے ہیں جنہوں نے پوری کی پوری زندگی زہد و عبادت میں صرف کی۔ ان کے بعد میں مندرجہ ذیل مشہور زاہدین کے نام ملتے ہیں۔

- ۱۔ حسن بصریؒ (م ۱۱۰ھ) ۲۔ حبیب عجمیؒ (م ۱۳۷ھ)
- ۳۔ ابراہیم بن ادھمؒ (م ۱۶۲ھ) ۴۔ فضیل بن عیاضؒ (م ۱۸۷ھ)
- ۵۔ معروف کرخیؒ (م ۲۰۶ھ) ۶۔ بشر حافی الزاہدؒ (م ۲۱۷ھ)

لیکن فریق تصوف پر بعد میں کتابیں لکھنے والوں میں سے ایک صوفی مصنف حافظ ابوالنعمان اصبہانی (م ۴۳۰ھ) نے اپنی تصنیف حلیۃ الاولیاء میں متصوفین کی برتری جتلانے کی خاطر اس فہرست میں خلفائے اربعہ اور بہت سے دوسرے بزرگ صحابہ اور تابعین کو بھی شامل کر لیا۔

پہلا شخص جس نے فقر و فاقہ اور نفلی عبادات میں غلو سے کام لیا اور تصوف کو ایک عملی شکل عطا کی وہ حارث بن اسد

غیر اسلامی نظریات کی درآمد

محاجبی تھے۔ مالداروں سے سخت نفرت کرتے اور حصول مال میں حد سے زیادہ احتیاط کرتے تھے۔ انہوں نے والد کی میراث لینے سے محض اس وجہ سے انکار کر دیا تھا کہ وہ رافضی تھے اور تقدیر کے قائل نہ تھے۔ ان کی اس احتیاط ہی کی وجہ سے اُن کا نام محاسبی پڑ گیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ یونانی فلسفہ کا اسلامی نظریات پر اثر پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ حادث بن اسد کے علم کلام کے بعض مسائل پر گفتگو کرنے کی وجہ سے امام احمد بن حنبلؒ نے ان سے ملاقات ترک کر دی تھی۔

تیسری صدی میں ہمیں ایسے بزرگ بھی ملتے ہیں جنہوں نے معرفتِ نفس، فقر و فاقہ، توکل، صبر و رضا، بہت زیادہ زور دیا۔ انہوں نے منہ سجالا مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور بعض نے چھوٹے چھوٹے رسائل بھی لکھے ان کے یہی محفوظات آگے چل کر تصوف کی بنیاد قرار پائے۔ گویا زندگی کے جس ایک پہلو دنیا سے بے رغبتی یا زہد پر انہوں نے زور دیا تھا۔ وہی دینِ تصوف میں اصل بنیاد قرار پائی۔ ان بزرگوں کے نام یہ ہیں :

- ۱۔ ذوالنون مصریؒ (م ۲۴۵ھ) — ۲۔ بازید بسطامیؒ (م ۲۶۱ھ)
- ۳۔ سری سقطیؒ (م ۲۵۹ھ) — ۴۔ سہل بن عبد اللہ نیشاپوریؒ (م ۲۸۳ھ)
- ۵۔ حکیم ترندیؒ (م ۲۸۵ھ) — ۶۔ عبد اللہ دقاقؒ (م ۲۹۰ھ)
- ۷۔ جنید بغدادیؒ (م ۲۹۸ھ) — ۸۔ ابوالحسن نوریؒ (م ۲۹۵ھ)
- ۹۔ عمرو بن عثمان مکیؒ (م ۲۹۷ھ) — ۱۰۔ حسین بن منصور صلیحؒ (م ۳۰۹ھ)
- ۱۱۔ ابوعلی ثقفیؒ (م ۳۲۸ھ) — ۱۲۔ ابوبکر شبلیؒ (م ۳۲۲ھ)

ان بزرگوں میں بعض حضرات کے محفوظات یا تذکرے ہمیں آج بھی ملتے ہیں۔ ان میں رطب و یابس بہت کچھ شامل ہے اور ان کے حالات میں عجیب و غریب باتیں پائی جاتی ہیں۔ جن کی وجہ ہم پہلے ہی بیان کر آئے ہیں مگر حقیقتاً ان میں اکثر لوگ صالح، کتاب و سنت کے پابند، حقوق اللہ اور حقوق العباد کا خیال رکھنے والے، وجد و سماع کی محضوں سے پرہیز کرنے والے تھے۔ ان کی اصلاحِ نفس اور تربیت کا ایک خاص طریقہ تھا جس سے علمائے شریعت کو بھی کچھ اختلاف نہ تھا۔ پھر ان میں سے بعض حضرات ایسے بھی نکلے، جو لوفاں میں غلو سے کام لے محاسبی (م ۲۴۳ھ) انہوں نے سب سے پہلے تصوف پر ایک سالہ الزامیہ لکھا تھا۔ جس میں محاسبہ نفس زیادہ زور دیا گیا تھا۔ ان کو محاسبی کہنے کی دوسری وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ یہی زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ لہذا میں ہمیشہ پر یہ تھے۔

لینے کے علاوہ یونانی فلسفہ اور مشرکانہ نظریات کے قائل، ترغیب و ترہیب کے لئے لوگوں میں احادیث وضع کر کے پھیلانے والے اور جھوٹ سے کام چلانے والے تھے۔ جن کی فہرست ہم پہلے دے چکے ہیں۔ (امام ابن تیمیہ، از کوکن عمری، ص ۲۶۸)

پہلا صوفی صوفی کی اصطلاح بھی دوسری صدی کی ایجاد ہے۔ سب سے پہلا شخص جو صوفی کے نام سے مشہور ہوا ابو ہاشم محمد بن احمد الصوفی تھا۔ صوفی کے لفظ کی توجیہات تو کافی بیان کی جاتی ہیں۔ تاہم زیادہ راجح یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ لوگ چونکہ اُن کا مونث کثیرا کہتے تھے اور خرقہ یا گدڑی ان کا شعار یا علامت بن چکی تھی، لہذا یہ صوفی کہلائے۔ صوفیاء کے مخصوص نظریات و عقائد بھی اسی دور کی پیداوار ہیں۔

ان تصریحات کے بعد اب ہم صوفیہ کے مخصوص مقام کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ ولایت نبویہ افضل ہے۔

ولایت کا مقام اور ابن عربی تیسری صدی کے اواخر کے مصنفین میں سے ایک ابو عبد اللہ الحکیم ترمذی دم ۲۸۵ھ میں جنہوں نے ختم الولائیہ کے نام سے ایک کتاب لکھی اور انبیاء و اولیاء کے سلسلے میں ہر ایک کا ایک خاتم قرار دیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس کتاب میں تصوف کے بعض مسائل پر اپنا خاص نقطہ نظر پیش کیا۔ علمائے وقت نے ان کے خلاف بڑی شورش کی اور ان پر کفر کا فتویٰ صادر کیا۔ آخر انہیں ترمذ سے جلا وطن ہو کر بلخ میں پناہ لینے پڑی (ملاح اور ترمذی دونوں ہم عصر تھے) تاہم ترمذی صاحب کے خیالات لوگوں میں پھیلتے رہے تاںکہ ابن عربی کا زمانہ آگیا، تو ابن عربی نے اس پر مزید ماحیے چڑھائے۔ ابن عربی نے ولایت کی دو قسمیں بتلائی۔

ایک ولایت عامہ مطلقہ جو حضرت عیسیٰ ﷺ کے لئے مخصوص ہے اور دوسری ولایت خاصہ محمدیہ جو حضور کے متبعین کو حاصل ہوتی ہے۔

ابن عربی نے ہر دور کا ایک خاتم الاولیاء مقرر کیا۔ ۵۹۵ھ میں اس نے بزم خود اپنے زمانہ کے ختم الاولیاء کو دیکھا۔ اس نے اس میں ختم ولایت کی وہ نشانی دیکھی جو دوسروں کو نظر نہیں آتی تھی۔ پھر بعد میں خود اپنے ختم الاولیاء ہونے کا دعویٰ پیش کر دیا اور کہا۔

أَنَّا خَتَمُ الْوَلَايَةِ دُونَ شَكِّ لَوِثَ الْهَاشِمِيِّ مَعَ الْمَسِيحِ
 میں بلاشبہ ختم الاولیاء ہوں، مجھے حضرت مسیح کی ولایت (عام مطلقہ) سے ساتھ ہی ساتھ رسول اکرم
 کی ولایت (خاصہ) بھی میراث میں ملی ہے۔

پھر اس کے آگے بڑھ کر اس نے یہ نظریہ بھی پیش کر دیا کہ ولایت کا درجہ نبوت سے اونچا ہے۔ اور
 ارشاد فرمایا:

مَقَامُ النَّبُوءَةِ فَوْقَ بَرَزَخِ قَوْنِي الرِّسُولِ دُونَ الْوَلِيِّ
 نبوت کا مقام درمیانی درجہ ہے۔ اس کا مرتبہ رسول سے اوپر اور ولی سے نیچے ہے۔

یعنی آپ فرمایا رہے ہیں کہ مقام رسالت سے مقام نبوت افضل ہے اور مقام نبوت سے مقام ولایت
 افضل ہے۔ نبوت کا مقام درمیان میں ہے۔ جو رسالت سے اوپر ہے اور ولایت سے نیچے۔ بالفاظ دیگر
 مقام ولایت سب سے اوپر ہے اس کے نیچے نبوت، پھر اس کے نیچے رسالت۔

اور اس سے دوسرا نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ خاتم الاولیاء
 خاتم الانبیاء سے افضل ہوتا ہے۔ جب اس نظریہ پر
 علماء کی طرف سے گرفت اور لے ڈے شروع ہوئی تو یہ کہہ دیا جاتا کہ نبی، نبوت اور ولایت دونوں مقامات
 پر فائز ہوتا ہے اور اس کا درجہ ولایت اس کے درجہ نبوت سے افضل ہوتا ہے۔ یہ ان لوگوں کی حیلہ سازی
 ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اس طبقہ کے اکثر لوگ ولی کو نبی سے بڑے مقام پر فائز سمجھتے ہیں۔

نبوت کا مرتبہ گھٹانے کے لئے ابن عربی نے ایک
 تیسرا نظریہ بھی پیش کیا۔ وہ یہ ہے کہ نبوت بھی وہی
 اکتسابی نبوت اور مزائے قابلان

چیز نہیں بلکہ کبھی اور اکتسابی ہے۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ آخر زمانہ میں مسیحؑ آئیں گے جو شریعت محمدیہ کا
 نظام جاری کریں گے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایسا نبی آسکتا ہے جو نئی شریعت کا جاری کرنے والا نہ ہو۔ اور ایسی
 نبوت دوعانی ریاضتوں کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔

۱۔ چنانچہ صادق خاں اپنی کتاب ”حوائج الانبیاء“ (ترجمہ: مرشد کامل، ص ۱۹) پر لکھتا ہے: ”نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل
 ہے مگر اس کی ولایت سے نبی کی ولایت مراد ہے۔ یعنی نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہے کہ نہ ولی کی ولایت، کچھ اسی قسم کے
 ارشادات بعد از محمدؐ نے بھی اپنی کتاب ”انسان کامل“ میں بیان فرمائے ہیں۔

چنانچہ مزائے قادیان کو ایسے ہی موافق سے نبوت کا دعوے کرنے کا جواز مل گیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ مرزا قادیانی اور شیخ اکبر کے الہامات و معنات میں بہت مشابہت پائی جاتی ہے۔ وہ تدریجاً نبی بنا تھا۔ یہ تدریجاً خاتم الاولیاء بن گئے جو ان کے نزدیک خاتم الانبیاء سے بھی بہت بلند مقام ہے۔

گویا میدانِ ولایت میں ابن عربی شیخ اکبر نے درج ذیل کارنامے سرانجام دیئے:

۱۔ نظریہ وحدت الوجود کو اپنی تقریر و تحریر کے ذیلے دوام بخشا۔

۲۔ ولایت کو دو حصوں میں تقسیم کیا، ولایت عامہ اور ولایت خاصہ، ولایت عامہ کو حضرت علیؑ سے مختص قرار دیا اور ولایت خاصہ کو حضور اکرم ﷺ سے مختص کیا اور خود کو ان دونوں اقام کا خاتم قرار دیا۔ بعد میں آنے والوں نے ولایت عامہ کو عام مسلمانوں کے لئے پہنچے دیا اور ولایت خاصہ کو اولیاء اللہ کے لئے مختص کیا۔ اس طرح لفظِ ولی کا اطلاق مؤمنین کی ایک صفت ہونے کے بجائے ایک مخصوص منصب قرار پایا۔

۳۔ نبوت اور رسالت کا الگ الگ تصور پیش کیا۔ خدا سے خبریں حاصل کرنے کا تعلق نبوت ہے اور ان خبروں کو لوگوں تک پہنچانے کا رسالت ہے۔ اور نبوت کو رسالت سے بہتر قرار دیا۔ اور یہی اس شعر کا مطلب ہے۔

مَقَامُ النَّبُوَّةِ فَوْقَ بَرَزَخِ الرُّسُولِ وَدُونِ الْوَلِيِّ
گویا سب ادنیٰ مقام تو ولی کا ہوتا ہے پھر اس کے نیچے نبی کا اور اس کے نیچے رسول کا۔ گویا نبوت کا مقام درمیانی مقام ہے۔ رسول اس سے نیچے اور ولی اس سے اوپر ہوتا ہے۔

۴۔ چونکہ ولایت اکتسابی چیز ہے لہذا نبوت جو اس سے فروتر مقام ہے، کو بھی اکتسابی ہی قرار دیا۔ انہی نظریات اور اس کے پیش کردہ دلائل سے مزائے قادیان نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور نبوت کا دعوے کر دیا۔

اب ولایت کو نبوت سے افضل ثابت کرنے کی عقلی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ نبی تو فرشتہ کے واسطے سے خدا سے علم حاصل کرتا ہے لیکن ایک ولی اپنے مکاشفات و مشاہدات کے ذریعہ براہ راست خدا سے یہ علم حاصل کرتا ہے۔ گویا ولی بزرگم خود یا تو خدائی کے مقام پر ہوتے ہیں یا اس سے ذرا تھوڑا نیچے۔ کبھی وہ خدا بن گئے لوگوں سے اپنی بندگی کرواتے ہیں اور کبھی بندہ بن کر رسول سے بھی کسی اوپر کے مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ چنانچہ بائبل بے بسطامی کے متعلق ایسے بہت سے اقوال مشہور ہیں۔ مثلاً انہوں نے فرمایا:

شطحیات بازید بسطامی

(۱) سُبْحَانَ مَا أَعْظَمُ شَأْنِي

میں پاک ہوں، میری شان کے کیا کہنے۔

اور علی ہجویریؒ یہ لکھنے کے بعد فرماتے ہیں کہ: ”یہ کہنا ان کی گفتار کا نشانہ ہے اور درحقیقت یہ کہنے والا حق تعالیٰ ہی پردہٴ عبید میں ہے۔“ (کلام المرغوب، ترجمہ کشف المحجوب، ص ۴۴۳)

اگر کلام المرغوب کی یہ روایت صحیح ہے تو مانا پڑے گا کہ علی ہجویریؒ بھی حلول کا عقیدہ رکھتے تھے اور ان میں گویا خدا ہی بول رہا تھا۔

بازید بسطامی سے یہ روایات بھی منسوب ہیں:

(۲) مَا فِي جُبَّتِي إِلَّا اللَّهُ

میرے جُبے میں اللہ کے سوا کچھ نہیں۔

یہ قول بھی اسی عقیدہٴ حلول کا ظہر ہے۔

۳ مُلْكِي أَعْظَمُ مِنْ مُلْكِ اللَّهِ

میری بادشاہی خدا کی بادشاہی سے عظیم ہے

اب حالتِ سکر میں خدا سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں، تو بھلا انبیاء کو کیا سمجھیں۔ فرمایا:

۴ خُصَّتْ بَحْرًا وَ وَقَفَ الْأَنْبِيَاءُ

میں نے تو سمندر میں غوطہ لگا دیا۔ جب کہ انبیاء

بِسَاحِلِهِ

اس کے ساحل پر ہی کھڑے رہے۔

اور افضل الانبیاء (المسلمین)، افضل البشر حضور اکرم ﷺ کے متعلق فرمایا:

ه لَوْ كَرِهْتُ أَرْفَعُ مِنْ لَوَاءِ

میرا جھنڈا محمد ﷺ کے جھنڈے سے

مُحَمَّدٍ

بند ہوگا۔

اور شریعتِ اسلامیہ تو ان کے مرتبہ سے بہت ہی فروتر تھی تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائے۔ باطنی

علوم کی شرعی عدمِ نفیست۔

بازید بسطامی کے علاوہ دوسرے بھی بہت سے اولیاء کرام کے ایسے بلند بانگ دعوے اُن کی کتابوں میں درج ہیں، جنہیں ہم مناسب مقام پر درج کریں گے۔

اولیاء اللہ کی انبیاء پر فوقیت اور فضیلت ثابت کرنے کے

ولایت کی نبوت پر برتری کا قرآن کریم سے ثبوت

لئے فقہ حضرت خضر علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے استدلال پیش کیا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام

جیسے اولوالعزم پیغمبر کو حضرت خضر علیہ السلام کے پاس بھیجا گیا جنہوں نے حضرت خضر علیہ السلام سے التجا کی اس ہدایت سے کچھ باتیں مجھے سکھلائیں، جو آپ کو اللہ نے عطا کی ہیں اور میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ حضرت خضر علیہ السلام کو خدا نے ”لَدُنِّيْ عَلَمٌ“ عطا کیا تھا جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا علم فرشتہ کے واسطے سے تھا۔ (سورہ کہف، آیات ۶۵-۶۶)

قصہ موسیٰ و خضر

اس دلیل میں بہت سے مغالطے ہیں جن کی تفصیل اس طرح ہے :

۱۔ حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق اکثر علما کا خیال ہے کہ وہ ولی نہ تھے، بلکہ نبی تھے۔ علامہ شبیر عثمانی اس آیت کے حاشیہ میں لکھتے ہیں :

”اس میں اختلاف ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کو رسول مانا جائے، یا نبی یا ولی کے درجہ میں رکھا جائے۔ ایسے مباحث کا فیصلہ یہاں نہیں ہو سکتا، تاہم احقر کا رجحان ہے کہ اُن کو نبی تسلیم کیا جائے، جیسا کہ بعض محققین کا خیال ہے۔“

۲۔ لفظ ”لَدُن“ سے یہ مراد لینا کہ اس میں فرشتے کا واسطہ درکار نہیں، یہ مفہوم ہی سرے سے غلط ہے، کیونکہ انبیاء کا علم جو فرشتے کے واسطے سے انبیاء پر نازل ہوتا ہے، کے لئے بھی یہی لفظ قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے۔ ارشاد باری ہے :

وَ اِنَّكَ لَتَلْقٰی الْقُرْآنَ مِنْ لَدُنِّ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ
(۱۲۱) جاتا ہے۔

۳۔ اگر حضرت خضر کو ولی تسلیم کر لیا جائے، تو از روئے شریعت ولی پر نہ ایمان لانا فرض ہوتا ہے۔ نہ ہی اس کی اطاعت واجب ہوتی ہے جبکہ نبی یا رسول پر ایمان لانا فرض ہوتا ہے اور اس کی اطاعت کو بھی عین اللہ کی اطاعت اور فرض قرار دیا گیا ہے، لہذا نبی کا درجہ بہر حال ولی سے بہت بلند رہتا ہے۔ جیسا کہ انہی بایزید بسطامی نے دوسرے مقام پر (شاید حالت صحو میں) ان الفاظ میں اعتراف کیا :

مراتبِ ولایت

فرمایا : ”عام مؤمنین کے مقام کی نہایت، اولیاء کے مقام کی ابتداء ہے اور اس کی اطاعت اور صدقہوں کے مقام کی نہایت، اولیاء کے مقام کی نہایت، نبیوں کے مقام کی ابتداء ہے اور نبیوں کے مقام کی نہایت رسولوں کے مقام کی ابتداء ہے اور رسولوں کے مقام کی نہایت اولوالعزم کے

مقام کی ابتداء ہے اور اولوالعزم کے مقام کی نہایت حضرت محمد ﷺ کی ابتداء ہے اور آپ کے مقام کی نہایت کسی کو معلوم نہیں۔ سوائے حق تعالیٰ کے کوئی آپ کے مقام کی نہایت کو نہیں جانتا۔ روزِ ازل اور میثاق کے دن بھی رُوحوں کا مقام انہی مراتب پر تھا اور قیامت کو بھی ان ہی مراتب پر ہوگا اور ان کے اسرار حق تعالیٰ کی محبت میں انہی درجات پر مرتب ہوں گے۔ (صوفیائے نقشبند، ص ۹۶)

گویا مختصر درجات کی ترتیب یوں ہوئی۔ ۱۔ عام مؤمنین ۲۔ ولی ۳۔ شہید ۴۔ صدیق ۵۔ نبی ۶۔ رسول ۷۔ اولوالعزم رسول ۸۔ حضرت محمد ﷺ

اب سوال یہ ہے کہ اگر حضرت خضر علیہ السلام ولی تھے یا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے (جو اولوالعزم رسول ہیں) کم درجہ کے نبی تھے، تو اللہ نے حضرت موسیٰ کو ہدایت کی باتیں؛ کیکنے کے لئے ان کے پاس کیوں بھیجا۔ اس سوال کے جواب میں صحیح بخاری کی روایت یوں ہے :

عَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ أَنَّ مُوسَى قَامَ خَطِيبًا فِي بَنِي إِسْرَائِيلَ فُسِّدَ آتُ النَّاسِ أَعْلَمُ؛ فَقَالَ "أَنَا" فَعَتَبَ اللَّهُ عَلَيْهِ إِذْ لَمَّ يَرِدُ الْعِلْمَ إِلَيْهِ فَأَوْحَى اللَّهُ عَلَيْهِ أَنْ لِي عَبْدًا بِمَجْمَعِ الْبَحْرَيْنِ هُوَ أَعْلَمُ مِنْكَ.... قَالَ إِنَّكَ لَنْ تَسْطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا يَا مُوسَى إِنِّي عَلَى عِلْمٍ مِنْ عِلْمِ اللَّهِ عَلَمِيهِ لَا تَعْلَمُ وَأَنْتَ عَلَى عِلْمٍ مِنْ عِلْمِ اللَّهِ عَلَمِكَ اللَّهُ لَا أَعْلَمُ

ابن کعب بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ کو یوں کہتے سنا: آپ فرماتے تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو کھڑے ہو کر خطبہ سنایا کسی نے ان سے پوچھا، لوگوں میں سب سے زیادہ عالم کون ہے؟ انہوں نے کہا "میں؟" اللہ نے ان پر عتاب فرمایا۔ ان کو چاہتے تھے کہ اللہ پر سوچ دیتے دیوں کہتے کہ اللہ جانتا ہے اتب اللہ نے ان پر وحی بھیجی کہ "جہاں دو دریا ملتے ہیں، وہاں میرا ایک بندہ ہے جو تجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے...." حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: "تم سے بھلا وہ باتیں دیکھ کر کیسے صبر ہو گا، سنو موسیٰ! بات یہ ہے کہ اللہ نے مجھ کو ایک خاص قسم کا علم دیا ہے جو تم نہیں جانتے اور تمہیں ایک خاص قسم کا علم دیا ہے جسے میں نہیں جانتا۔ (بخاری، کتاب التفسیر)

اس حدیث کا ترجمہ علامہ حمید الزمان کا ہے۔ اب اس کے تشریحی نوٹ بھی انہی کی زبانی سنئے :
لے یعنی میرا طریق اور، تہا را طریق اور، میں خاص باتوں پر اللہ کی طرف سے مامور ہوں، تم ہدایت عام کے لئے

بھیجے گئے ہو۔ ہر بات پر اعتراض کر دے۔ جس کو تم بظاہر خلاف شرع پاؤ گے۔ میں کہاں تک تم کو سمجھاتا ہوں گا
 اے بعض صوفیوں نے اس کی شرح میں یوں کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صرف شریعت کا علم تھا۔ اور حضرت
 خضر علیہ السلام کو حقیقت کا اور ہمارے پیغمبر کو دونوں علم ملے تھے۔ میں کہتا ہوں یقیناً صحیح نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ
 علیہ السلام انبیاء اولوالعزم میں سے تھے۔ ان کو تو حقیقت کا علم نہ ہوا اور ادنیٰ ادنیٰ اولیا کو نہ جانے۔ یہ کیونکر ہو سکتا
 ہے۔ اس طرح حضرت خضر علیہ السلام کو شریعت کا علم تو بالکل نہ ہو، تو حقیقت کا علم کیونکر ہوگا۔ حقیقت بغیر
 شریعت کے زندہ و اکاد ہے۔

مندرجہ بالا اقتباسات میں علامہ عثمانی اپنے رجحان کے مطابق حضرت خضر علیہ السلام کو نبی قرار دیتے ہیں۔ اور
 علامہ وحید الزمان کے ”علیہ السلام“ کھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نبی تھے۔ کیونکہ ”علیہ السلام“
 کا لفظ عموماً انبیاء کے لئے ہی استعمال کیا جاتا ہے، لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کا علم جس میں کائنات
 میں جاری و ساری مشیت الہی سے چند اوقات سے پرے اٹھائے گئے تھے۔ تاکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام
 مشیت الہی کے مصلحتوں سے واقف ہو سکیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علم (شریعت) سے متصادم ہے تو
 حضرت خضر علیہ السلام کو ادنیٰ ولی بھی تسلیم کرنے کو تیار نظر نہیں آتے اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ حقیقت کے
 علم کا انحصار ہی شریعت پر ہے ورنہ وہ علم زندہ و اکاد ہے۔

مندرجہ بالا تصریحات سے البتہ مندرجہ ذیل باتیں ضرور متنبط ہوتی ہیں:

۱۔ حضرت خضر خواہ نبی تھے یا ولی تھے، یا
 کچھ اور، انہوں نے جو کچھ کیا، اللہ کے حکم سے

حضرت خضر علیہ السلام کون اور کیا تھے؟

کیا۔ انہیں یہ علم اللہ ہی نے عطا کیا، گویا وہ بھی مامور من اللہ تھے۔

۲۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام یقیناً اولوالعزم رسول تھے۔ وہ بھی مامور من اللہ تھے۔ انہیں بھی خدا تعالیٰ نے
 ہی علم عطا کیا تھا، لیکن ان کا علم حضرت خضر کے علم سے متصادم تھا۔

۳۔ قرآنی آیات کی رو سے یہ ثابت شدہ امر ہے کہ انبیاء کا علم ابتداء سے ایک ہی رہا ہے، لہذا
 حضرت خضر علیہ السلام یقیناً نبی نہیں ہو سکتے۔ اب اگر انہیں ولی تسلیم کر لیا جائے، تو یہ تو باور کیا جا سکتا ہے کہ
 اللہ تعالیٰ نے انہیں (بقول صوفیاء) کشف الہام سے ان غیب کے حالات سے مطلع کر دیا ہو، لیکن ولی کو یہ کتب
 اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے علم غیب سے اطلاع کی بنا پر کسی دوسرے کی ملوکہ چیز کو تباہ کر دے، یا کسی شخص کو قتل بھی

کر دے۔ ولی بھی آخر انسان ہے اور احکام شرعیہ کا مکلف اور اصول شریعت میں یہ گنجائش کہیں نہیں پائی جاتی کہ کسی انسان کے لئے محض اس بناء پر احکام شرعیہ میں سے کسی حکم کی خلاف ورزی جائز ہو کہ اسے بذریعہ الہام اس خلاف ورزی کا حکم ملا ہے اور بذریعہ علم غیب اس خلاف ورزی کی مصلحت بتائی گئی ہے۔

یہ ایک ایسی بات ہے جس پر نہ صرف تمام علمائے شریعت متفق ہیں، بلکہ اکابر صوفیاء بھی بالاتفاق یہی بات کہتے ہیں۔ چنانچہ علامہ آلوسی نے چند نامور اکابر صوفیاء مثلاً شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، جنید بغدادیؒ، برہنہ سقنیؒ، مجدد الف ثانیؒ اور امام غزالیؒ وغیرہم کے اقوال نقل کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اہل تصوف کے نزدیک بھی کسی ایسے الہام پر عمل کرنا خود صاحب الہام تک کے لئے بھی جائز نہیں ہے جو نص شرعی کے خلاف ہو۔ (روح المعانی، ۱۶ ج، ص ۵۱۶)

حضرت خضرؑ کی شخصیت!
حضرت خضرؑ کے متعلق مولانا مودودیؒ نے تفہیم القرآن میں جو تحقیق پیش کی ہے، وہ ایسے تمام اشکالات کو دور کر دیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت خضرؑ نہ نبی تھے نہ ولی، بلکہ وہ انسان بھی نہ تھے۔ وہ اللہ کے اُن بندوں میں سے تھے جو مشیتِ الہی (نہ کہ شریعتِ الہی) کے تحت کام کرتے ہیں۔ ان کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ حضرت خضرؑ کے لئے قرآن میں انسان کا لفظ نہیں آیا بلکہ ”عبد“ کا لفظ آیا ہے، جو فرشتوں کے لئے بھی استعمال ہوا ہے، مثلاً:

وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبْدُ الرَّحْمَنِ اِنَاثًا (۲۳) کی بیٹیاں مقرر کیا۔
۲۔ احادیث میں حضرت خضرؑ کے لئے ”رَجُلٌ“ کا لفظ آیا ہے، لیکن ”رَجُل“ کا لفظ بھی انسان کے علاوہ جن کے لئے بھی قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے، مثلاً:

وَ اِنَّهٗ كَانَ رِجَالًا مِّنَ الْاِنْسِ اور یہ کہ بعض بنی آدم بعض جنات کی بنا پہلا کرتے
يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ (۴) تھے۔

اور یہ تو ظاہر ہے کہ جب کوئی فرشتہ، جن یا کوئی غیر مرنی مخلوق انسان کے سامنے آئے گی، تو انسان کی شکل میں ہی آئے گی۔ جیسا کہ فرشتہ، حضرت مریمؑ کے سامنے انسان ہی کی شکل میں نمودار ہوا تھا۔ (۱۹)
لہذا رسولی اللہ ﷺ کا یہ فرمان کہ حضرت موسیٰؑ نے وہاں ایک ”مرد“ کو پایا۔ حضرت خضرؑ کے انسان

یا بنی آدم ہونے پر صریح دلالت نہیں کرتا۔

۳۔ لہذا حضرت خضر فرشتہ یا اللہ کی کوئی ایسی مخلوق تھی جو شرائع کی مکلف نہیں، بلکہ کارگاہِ مشیت کی کارکن ہے اور متقدمین میں سے بعض لوگوں نے یہی رائے ظاہر کی ہے۔ جسے ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ماوردی کے حوالہ نقل کیا ہے۔ (تہمید القرآن ج ۳ ص ۴۴) وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

ہمارے خیال میں مولانا مودودیؒ نے ابن کثیر اور علامہ ماوردیؒ کے حوالہ سے جو تحقیق پیش کی ہے یہی اقرب الی الحق ہے۔ کیونکہ اس سے تمام اشکالات از خود رفع ہو جاتے ہیں۔ اندر میں صورت حال حضرت محمدؐ و حضرت خضرؑ کے تقابل کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی اور یہ بات بھی ہم اکابرِ صوفیاء کے اقوال کے حوالوں سے پیش کر چکے ہیں کہ ملی خواہ کس مقام پر ہو۔ اگر اس کے الہامِ نفسِ شرعیہ سے متضادم ہوں، تو وہ مردود ہیں۔

دوسرا واقعہ، جو قرآن سے اولیاء اللہ کی جنوں پر فضیلت کے سلسلے میں پیش کیا جاتا ہے، جو سورۃ نمل میں اس طرح مذکور ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے درباریوں سے پوچھا کہ مکہ سابقین کا تخت کون جلد از جلد میرے پاس لا سکتا ہے؟ تو:

قَالَ عَفَرْتُ مِنَ الْجِنَّ اَنَا اَتِيكَ بِهِ
قَبْلَ اَنْ تَقُومَ مِنْ مَقَامِكَ وَاِنِّي
عَلَيْهِ لَقَوِيٍّ اَمِيْنٌ قَالَ الَّذِي
عِنْدَهُ عَلِمَ مِنَ الْكِتَابِ اَنَا اَتِيكَ بِهِ
قَبْلَ اَنْ يَرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ فَلَمَّا رَاَهُ
مُسْتَقِرًّا عِنْدَهُ قَالَ هَذَا مِنْ فَضْلِ

جنوں میں سے ایک قوی، ایک جن نے کہا: میں اسے دربارِ بقا
کرنے سے پیشتر لائے دیتا ہوں۔ اور وہ جس کے پاس
کتاب کا علم تھا، کہنے لگا: میں اسے تمہاری پک چھیننے
سے پہلے لائے دیتا ہوں۔ جو نبی حضرت سلیمانؑ
نے اس تخت کو اپنے پاس رکھا، دیکھا، تو پکارا ٹھے: یہ
میرے رب کا فضل ہے۔

(۲۴-۳۹)

بَيِّن

اس آیت میں اس شخص سے جس کے پاس کتاب کا علم تھا سے بعض حضرات حضرت خضرؑ مراد لیتے ہیں۔ یہ ایک ایسا قیاس ہے جس کے لئے قرآن و حدیث میں کوئی اشارہ تک نہیں ملتا۔ حالانکہ بات یہی سی ہے اور اس پر واضح دلائل بھی موجود ہیں کہ اس سے مراد فرشتے ہیں جو تدبیرِ کائنات پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہیں۔ اور اللہ کے ارادے کن فیکون کے مطابق پک چھیننے سے پیشتر انہی مدبراتِ امر کے ذریعہ سرانجام پا

جاتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب (حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق باقی مباحث "خضر کی شخصیت" کے تحت آگے آئے ہیں)

۲۔ عابد کی عالم پر فضیلت

ایک نبی کی ذمہ داریاں، جو قرآن کریم نے بیان کی ہیں، وہ یہ ہیں :

انبیاء کی ذمہ داریاں

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا لِّمَنْ هُمْ بِغَيْرِ ۖ
مَنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ ۖ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ
وَيُزَكِّيهِمْ ۚ (۱۲۹) پاک صاف کرے۔

گویا ایک نبی یا رسول کے ذمہ مندرجہ ذیل چار ذمہ داریاں ہیں :

- ۱۔ تبلیغ یا وحی الہی کو دوسرے تک پہنچانا۔
- ۲۔ تعلیم کتاب، یعنی اللہ کی کتاب کے معانی و مفہوم کو واضح اور متعین کرنا اور ان کی تعلیم دینا۔
- ۳۔ حکمت سکھانا۔ حکمت سے مراد احکام الہی کو عملی شکل دینے کا طریق ہے اور بعض کے نزدیک تفقہ فی الدین، یعنی نصوص شرعیہ سے حالات زمانہ کے مطابق نئے مسائل کا استنباط ہے۔
- ۴۔ تزکیہ نفس : جس سے مراد، دل کو شرک کی نجاستوں سے پاک کرنا اور گنہ گاروں اور اخلاقِ ذلیلہ سے نفرت پیدا کرنا ہے۔

اب صوفیاء کا دعویٰ یہ ہے کہ چوتھی شق اہل باطن یا صوفیاء سے تعلق رکھتی ہے۔ نیز یہ کہ دین کا یہی پہلو اصل دین ہے اور باقی باتوں کا درجہ ان سے کم تر ہے۔ اسی وجہ سے نبی کی نبوت کو دوحصوں میں تقسیم کیا گیا، ایک نبوت، دوسرے ولایت۔ پہلے مین کام تو نبوت کے درجہ کے لئے مخصوص کئے گئے ہیں اور چوتھے کو ولایت سے منسوب کیا گیا۔

جب صوفیاء میں یہ بات طے پاگئی کہ نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ بھی نکلتا تھا کہ ایک عابد (جو بعد کے ادوار میں صوفی اور عارف کہلائے) کو ایک عالم سے افضل ہونا چاہئے

یہ ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ تصوف کا لفظ تیسری صدی کی پیداوار ہے۔ قرول ثلثہ میں اس لفظ کا کوئی وجود نہ تھا پہلی، دوسری صدی ہجری میں لوگوں کو عابد، زاہد یا صالح ہی کہا جاتا تھا۔ فن تصوف ایک باقاعدہ فن کی شکل میں چوتھی صدی میں سامنے آتا ہے۔ تصوف کیا ہے؟ اس کی کوئی ایسی جامع تعریف آج تک پیش نہیں کی جاسکی، جس پر سب اعیان صوفیہ کا اجماع ہو۔ البتہ صوفی کے لفظ کی بے شمار توجیہات میں سے معقول تر توجیہ یہی ہے کہ اُن کا مونا جبہ، گدڑی یا مرقع پہننے اور اس کو اپنا شمار بنانے کی وجہ سے یہ لوگ صوفی کے نام سے موسوم ہوئے۔ صوفی اور تصوف دونوں الفاظ میں قدر مشترک اس کا مادہ "صوف" ہے، جس کے معنی اُن کے ہیں۔

صوفی کون ہیں؟

جب اہل تصوف پر یہ اعتراض ہوا کہ صوفیہ کا یہ ایک الگ فرقہ پیدا ہو گیا، تو انہوں نے اپنا وجود ثابت کرنے کے لئے کئی توجیہات پیش کیں، مثلاً:

۱۔ حدیث جبریل میں، جب حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا، کہ "احسان کیا ہے؟" تو آپ نے جواب دیا کہ "تو اُنہ کی ایسے عبادت کرے جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو کم از کم یہ سمجھے کہ خدا مجھے دیکھ رہا ہے۔" تو اس حدیث میں احسان سے مراد تصوف اور معنی ہم ہی لوگ ہیں۔ اس توجیہ پر یہ اعتراض داروہوتا ہے کہ پھر قرول ثلاثہ کے مسلمانوں کو اس "مراد" کی کیوں سمجھ نہ آتی۔

۲۔ یہ لوگ کہتے ہیں، صدیقیوں سے مراد ہم لوگ ہیں۔ امام ابن تیمیہؒ اس توجیہ پر تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ صدیق کا درجہ اختصاص کے حامل لوگوں (SPECIALISTS) کے لئے بولا جاتا ہے۔ ان لوگوں کو صدیقیوں فی الزہد تو کہا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ یہ زہد اسلامی نظریات کا حامل ہو، مگر علی الاطلاق لفظ صدیق اسلام کے جملہ پہلوؤں پر حاوی ہے۔ (الفقر والتصوف لابن تیمیہ)

۳۔ ان لوگوں کا یہ بھی دعو ہے کہ قرآن میں معنی، ابرار، مشاہدین، مؤمنین، قانتین، مطمئنین، صادقین ان سب الفاظ سے ہم اہل تصوف ہی مراد ہیں۔ دغلا صد تصوف اسلام، ص، گویا جو صفات بھی مومنوں کی ہو سکتی ہیں۔ وہ سب انہوں نے اپنی طرف منسوب کر لی ہیں۔

بہر حال یہ سب ایسے دعوے ہیں جس پر کوئی واضح دلیل موجود نہیں اور حقیقت یہی ہے کہ یہ فرقہ اپنے مخصوص عقائد و نظریات اور اعمال و کردار کے لحاظ سے بالحد کی پیداوار ہے۔ پھر ان صوفیہ نے مراتب مدارج کے لحاظ سے بھی کئی اصطلاحیں بنالی ہیں۔ مثلاً طالب، عاشق، سالک، عارف، مجدد، بقیہ

فنا فی اللہ، واصل باللہ یا بختی عجیب، ابدال، غوث اور قطب وغیرہ وغیرہ۔ جن کا دور صحابہ کرام میں کہیں اشارہ ممکن نہیں ملتا۔

کیا تصوف ایک بدعت ہے؟

جب سے یہ فنی تصوف و سلوک معرض وجود میں آیا ہے۔ اس پر حملے حق کی طرف سے مسلسل اور متواتر یہ اعتراض ہوتا رہا ہے۔ پھر بعض ایسے صوفیاء کرام جن کے دلوں میں شریعت کی بھی کچھ قدر قیمت ہوتی ہے، وہ اس اعتراض کا جواب دینے کی کوشش اور اس طریقت کو شریعت کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش فرماتے رہے ہیں۔ موجودہ دور میں مولانا اللہ یا رخاں صاحب نے، جو اسی بحر طریقت کے شناسا در ہیں اور شریعت کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔ اس اعتراض کا جواب اپنی تصنیف ”دلائل السلوک“ میں ذرا تفصیل سے دیا ہے۔ یہاں ہم آپ کے اس جواب کا جائزہ لینا مناسب سمجھتے ہیں۔ آپ نے اس کتاب میں ”مدرسہ محمدیہ“ کے عنوان کے تحت اس اعتراض کے جواب میں کئی اصولی باتیں بیان فرمائیں۔ جن کا مختصر یہ ہے:

۱۔ حضور اکرم ﷺ جامع کمالات تھے صحابہ میں سے ہر شخص کو اس کی فطری صلاحیتوں کے مطابق حصہ ملا، کوئی مبلغ بنا، کوئی مدرس، کوئی محدث، کوئی فقیہ، کوئی قاضی اور صاحب الہام و کشف و صوفی و عارف اب حیرت یہ ہے کہ لوگ یہ تو نہیں کہتے کہ تمام صحابہ مفسر و محدث و فقیہ کیوں نہیں تھے، مگر یہ بات بڑی بے تکلفی سے کہہ دیتے ہیں کہ سائے صحابہ صاحب کشف و الہام اور صوفی کیوں نہیں تھے۔ (دلائل السلوک ص ۱۹۶)

دوسری اصولی بات آپ نے یہ بتلائی کہ ”آپ کی تعلیم بنیادی اور اصولی قسم کی ہوتی تھی۔ ان اصول و کلیات سے جزئیات کا استخراج ان لوگوں کے ذمے تھا، جو اس کی صلاحیت رکھتے ہوں۔“ اور تیسری اصولی بات آپ نے یہ بتلائی کہ ”دور نبوی اور دور صحابہ میں تمام علوم و فنون اصولی اور اجمالی شکل میں تھے۔ کسی فن کی تدوین نہ ہوتی تھی۔ فن تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، صرف و نحو، معانی وغیرہ جس طرح حالات کے مطابق اپنی تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ مدون ہوتے رہے۔ اسی طرح تصوف سلوک کی تدوین بھی رفتہ رفتہ عمل میں لائی گئی تو جب دوسرے علوم کو کوئی بدعت نہیں کہتا، تو آخر اس علم یا فن تصوف و سلوک کو کیوں بدعت کہا جاتا ہے۔ (دلائل السلوک ص ۶۹)

اب دیکھئے کہ مولانا اللہ یا رخاں نے جو تین اصولی باتیں بتلائی ہیں دراصل یہ ایک ہی اصولی بات ہے اور وہ یہ کہ فن حدیث، فقہ، تفسیر، صرف و معانی وغیرہ بعد میں مدون ہونے کی وجہ سے بدعت نہیں، تو

تصوف کیسے بدعت ہوا؟ آپ کو تو یہ حیرت ہے کہ آخر تصوف ہی کیوں بدعت کہلائے۔ اور حیرت ہمیں بھی ہے اور وہ یہ کہ آخر علما کو ان تمام علوم و فنون میں سے صرف تصوف کے ساتھ وہ کون سی دشمنی تھی کہ اور کسی علم و فن کو بدعت نہیں کہا گیا، مگر اسے بدعت کہتے ہیں۔ آخر دال میں کچھ تو کالا ہے۔ علما کچھ ایسے سر بھرے تو نہیں کہ بلا وجہ ہی تصوف کے پیچھے پڑ گئے۔

دورِ نبویٰ اور دورِ صحابہ میں مدرس، مبلغ، مفسر، محدث، قاری، قاضی اور فقیہہ صحابہ موجود تھے۔

حدیث، تفسیر، فقہ وغیرہ بدعت نہیں

جو اسی اعزازِی لقب سے مشہور تھے اور ان کے نام تک گنوائے جاسکتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ مدرس، مبلغ اور قاری : وہ صحابہ کرامؓ تھے، جو درس گاہِ صفہ میں زیرِ تعلیم رہا کرتے تھے ان میں کچھ صحابہؓ تو یہاں مستقلاً رہائش پذیر تھے کچھ ایسے بیرونی صحابہ تھے، جو چنڈوں کے لئے یہاں رہ کر تربیت و تعلیم حاصل کرتے تھے اور کچھ صبح سے شام تک رہ کر چلے جاتے تھے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے ایک انصاری سے باری مقرر کر رکھی تھی۔ ایسے صحابہؓ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ قیدِ رعل اور ذکوان کے وسا نے جب آنحضرت ﷺ سے اپنے قبیلوں کے لئے مبتغوں کا مطالبہ کیا تو آپؐ نے ستر صحابہؓ برائے تدریس و تبلیغ ان کے ہمراہ بھیج دئے تھے جنہیں بعد میں انہوں نے دھوکہ سے شہید کر دیا تھا، لہذا ایسے مبتغین، مدرّسین، اور قاری صحابہؓ کے ہم گنونا بھی دشوار ہے۔

۲۔ محدثین : ایسے تمام صحابہ کرامؓ جو کثیر الروایۃ ہیں، محدثین تھے۔ کثیر الروایۃ سے مراد وہ اصحاب میں جنہوں نے ایک ہزار سے زیادہ احادیث روایت کی ہیں اور وہ یہ ہیں۔ ۱۔ حضرت ابوہریرہؓ (۱۶۳۰) تعدادِ مرویات (۵۳، ۴۴) ۲۔ حضرت عائشہؓ (۲۲۱۰) ۳۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ (۱۶۳۰) ۴۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ (۱۶۶۰) ۵۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ (۱۵۴۰) ۶۔ حضرت انس بن مالکؓ (۱۲۸۶) ۷۔ حضرت ابوسعید خدریؓ (۱۱۷۰) وغیرہم۔

اور حضرت ابوہریرہؓ کو تو خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ”میں جانتا ہوں کہ تم میری حدیثیں کے سب سے زیادہ شائق ہو۔“ (بخاری، کتابِ العلم)

۳۔ فقیہہ — صحابہ وہ تھے جن کے متفق خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ان چار حضرات سے قرآن کھو اور وہ چار حضرات یہ ہیں : ۱۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ۲۔ حضرت سالم مولیٰ

ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ ۳۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور ۴۔ حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ (بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب مع القرآن)

۵۔ ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فقیہ تھے۔ جن کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا تھی کہ ”اے الہی! انہیں قرآن کی حکمت سکھلا دے۔“

۶۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا شمار بھی اکابر فقہاء صحابہ میں ہوتا ہے۔ نزدیکی کی روایت کے مطابق جب کبھی صحابہ کسی مسئلہ کو حل نہ کر سکتے، تو آپ کے پاس آتے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس مسئلہ کا حل مل جاتا۔ علاوہ ازیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بھی فقہاء میں شمار ہوتے ہوتے ہیں۔

۴۔ مفتی : حضرت صفوان بن سلیم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ دور نبوی میں درج ذیل صحابہ کرام فتوے دیا کرتے تھے۔

وَلَمْ يَكُنْ يُفْتَى فِي زَمَنِ النَّبِيِّ صَلَّى
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَيْرَ عُمَرَ وَعَلِيٍّ
وَمَعَاذٍ وَابْنِ مُوسَى (تابع الفقہاء)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چار آدمیوں کے سوا کوئی
فتوے نہ دیتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ
حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ

قاضی مظلوم الحسن، عبد الممد صارو

۵۔ قاضی : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مملکت اسلامیہ کے مختلف صوبوں میں جو عمال مقرر کئے وہ سب کے سب قاضی بھی تھے اور وہ یہ ہیں :

- ۱۔ مکہ مکرمہ میں غناب بن اسید انصاری رضی اللہ عنہ ۲۔ طائف میں مالک بن عوف اور عثمان بن ابی الہثم
- ۳۔ بحرین، ابو العلاء الکھضرمی رضی اللہ عنہ ۴۔ صنعا (دین) بازان ابکھی، مہاجر بن امیہ اور ابان بن
- سعد بن العاص رضی اللہ عنہ ۵۔ عمان، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ۶۔ نجران البوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ، ۷۔ السوئل
- ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ۸۔ یمن، معاذ بن جبل اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ۹۔ وادی القری، عمرو بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ
- ۱۱۔ تیماء، یزید بن ابی سفیان (صحیح بخاری، کتاب اخبار الاحاد، باب ما کان یثبت بہ الامم، بحوالہ اسلامی ریاست، ص ۴۴، مطبوعہ

علما اکیڈمی، لاہور۔)

۶۔ صرف ونحو : صرف ونحو کے قواعد کی اہل عرب کو قطعاً ضرورت نہ تھی۔ جب اسلام

حدودِ عرب سے باہر پھیل گیا اور غیر عرب قرآن پڑھنے میں اعراب کی غلطیاں کرنے لگے، تو اس علم کی ضرورت پیش آئی، تاہم حضرت علیؓ کے دور میں اس علم کی تدوین شروع ہو گئی۔ چند ابتدائی قواعد حضرت علیؓ نے وضع کئے باقی کام حضرت اسود دہلی کے سپرد کر دیا جنہوں نے اس علم کی ابتدائی تدوین کی۔

یہ پوری تصریحات پڑھنے کے بعد اب بتلائے کہ دو نبوی یاد و صحابہؓ میں صوفی کون تھا؟ جو اس لقب سے پکارا گیا ہو؟ نیز عظیم و فن تصوف و سلوک کی تدوین کس صحابی نے کی ہے؟ اگر ان باتوں کا جواب نفی میں ہو تو بتلایئے کہ بدعت اور کسے کہتے ہیں؟ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ آج جس ”صحیح اسلامی تصوف“ کا تصور پیش کیا جانے لگا ہے اس کے کچھ اصول کتاب و سنت سے ماخوذ ہیں اور یہ اصول صحابہ کرامؓ کو بھی معلوم تھے۔ پھر بعض صحابہ اور تابعین نے انہی اصولوں پر زیادہ توجہ مبذول فرمائی۔ تزکیہ نفس کے لئے ان کا اپنا ایک مخصوص طریق عمل تھا جس پر عمل کو بھی چنداں اعتراض نہ تھا اور ایسے حضرت عابد، زاہد یا صالح کہلاتے تھے۔ سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ آخر بعد کے لوگوں کو صوفی کا لقب اختیار کر کے اپنا الگ تشخص قائم کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ وہ کون سی مبادلاتیاز باتیں ہیں، جو ان زہاد، عباد اور صالحین میں نہ تھیں مگر بعد میں ان کے جانشین ”صوفیہ“ میں آگئیں۔ بس ہی باتیں ہماری اس کتاب کا موضوع ہیں اور یہی باتیں بعض صوفیوں میں صرف بدعت ہی نہیں، بلکہ کفر و شرک تک پہنچ جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں اس فن کی بے شمار ایسی اصطلاحات ہیں۔ جن کا کتاب سنت میں سراغ تک نہیں ملتا۔

یہ تین اصولی باتیں بیان کرنے کے بعد مولانا اللہ یار خان صاحب فتح الباری کے حوالہ سے ایک دایت پیش کرتے ہیں کہ

کیا تصوف دین کا اہم شعبہ ہے؟

حضرت حذیفہؓ کو منافقین کے نام معلوم تھے اور دیگر کئی آئندہ امور کا علم تھا۔ حضرت حذیفہؓ کو کشف الہام اور علم الاسرار سے وہ وافر حصہ ملا، جو دوسروں کو نہیں ملا، لہذا چوتھی اصولی بات یہ فرمائی کہ تصوف و احسان دین کا اہم شعبہ ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ جب ایک شے ثابت ہو جائے، تو وہ اپنے تمام لوازمات کے ساتھ ثابت ہو جاتی ہے اور الہام و کشف کا ثابت ہونا تصوف کے لوازمات سے ہے۔ اس لئے دین کو تسلیم کرنے کے ساتھ تصوف و احسان کو تسلیم کرنا پڑے گا، اسے تسلیم کیا، تو کشف الہام کو ماننا پڑے گا۔ کیونکہ یہ لازم و ملزوم ہیں۔ (ایضاً، ص ۱۹۰)

مولانا موصوف کا یہ بیان کئی لحاظ سے محل نظر ہے۔ مثلاً:

۱۔ مولانا موصوف کو خود بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ کشف الہام کا صحیح ہونا ضروری نہیں (دلائل السلوک ص ۱) لیکن حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا علم چونکہ یقینی طور پر صحیح تھا، لہذا وہ ان کا ذاتی کشف الہام نہ تھا، بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل شدہ علم تھا، جو آپ کو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی عطا کیا تھا۔

۲۔ آپ فرماتے ہیں کہ چونکہ الہام و کشف تصوف کے لوازمات سے ہے اور یہ الہام و کشف، جو گویا ہندوؤں، سکھوں، کافروں اور شیطانوں تک کو بھی ہوتا ہے۔ لہذا ایسے لوگ بھی اہل تصوف اور صوفی کہلا سکتے ہیں اور یہی مفہوم ہے اس مقولہ کا، جو صوفیہ میں بکثرت مشہور ہے کہ ”الصُّوفِ لَا مَذْهَبَ لَهُ“ لیکن اس صغریٰ سے یہ نتیجہ پیش کرنا، لہذا دین کے ساتھ تصوف و احسان کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا، کیونکہ درست ہو سکتا ہے؟

۳۔ تصوف اور احسان کو ہم معنی قرار دینا بھی غلط ہے۔ اب اگر صوفیا کے اکابرین یا متاخرین میں سے عبدالحق محدث دہلوی وغیرہم احسان سے مراد تصوف ہی لیں، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس مفہوم کو صحابہ کرامؓ کیوں نہ سمجھ سکے صحابہ کرام کی کثیر تعداد مسین ضرورتی۔ ارشاد باری ہے:

وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ
وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ
مہاجرین و انصار میں سے جن لوگوں نے پہلے ایمان لایا
میں بوقت کی پیروی لوگ جنہوں نے احسان کے ساتھ

لہ عبدالحق محدث دہلوی نے حدیث جبریل کی شرح میں اہم مالک کا یہ قول نقل فرمایا ہے:

قَالَ الْإِمَامُ مَالِكٌ : مَنْ تَصَوَّفَ وَلَمْ
يَتَفَقَّهْ فَقَدْ تَزَنَّدَقَ وَمَنْ تَفَقَّهَ وَلَمْ
يَتَصَوَّفَ فَقَدْ تَفَسَّقَ وَمَنْ جَمَعَ بَيْنَهُمَا
فَقَدْ تَحَقَّقَ
حضرت اہم مالک نے فرمایا: ”جس نے فقہ کے بغیر تصوف
حاصل کیا، وہ زندیق ہوا۔ اور جس نے تصوف کیے
بغیر فقہ کا علم حاصل کیا، وہ فاسق ہوا اور جس نے دونوں کو
جمع کیا، وہ محقق ہوا۔ (دلائل السلوک، ص ۳۰)

اہم مالک کے اس قول سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے:

۱۔ تصوف کا علم یا فن حاصل کرنا دین کی تکمیل کے لئے نہایت ضروری ہے۔

۲۔ عبدالحق محدث دہلوی چونکہ دونوں چیزوں کے ماہر ہیں لہذا آپ فی الواقع محقق ہوئے۔ لیکن شکل یہ ہے کہ یہ قول اہم مالک کا ہونی نہیں سکتا اور خواہ مخواہ ان کے سرخوش ہو گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اہم مالک تو کائنات میں فوت ہو جاتے ہیں جبکہ ابھی صوفی کا لفظ بھی علم و دین آیا تھا۔ فن تصوف تو بہت بعد کی پیداوار ہے۔ یہ محدث اور محقق صاحب کا اپنا خیال تھا۔ جو انہوں نے اہم مالک کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ اسی لئے اس کا حوالہ بھی درج نہیں۔

يَا حَسَانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ وَ ان کی پیروی کی، اللہ ان سب سے راضی اور وہ اللہ سے رَضُوا عَنْهُ (۹) راضی ہوئے۔

لیکن تمام صحابہ میں سے صوفی ایک بھی نہ تھا، لہذا احسان سے تصوف مراد لینا درست نہیں۔

صحابہ کرامؓ میں سے کسی صحابی کے صوفی کے لقب سے لقب نہ ہونے کا جواب سب سے پہلے ابو انصر

سراج طوسی (م ۴۸، ۴۹ھ) نے اپنی کتاب الملح میں دیا۔ اور اسی جواب کو بعد میں آنے والے مصنفین دہراتے چلے آئے ہیں اور وہ جواب یہ ہے: ”صحابہ رسول کریم ﷺ کے لئے دوسرا کوئی تعطیلی لفظ ہوئی نہیں سکتا۔ ان کے لئے سب سے بہتر فضیلت آپ کا اصحاب ہونا تھا۔ اس لئے جس شخص کو صحابی کے لقب سے لقب کر دیا۔ اس کے فضائل کی انتہا ہو گئی۔ اس کے لئے کسی اور لفظ کی ضرورت ہو ہی نہیں سکتی۔“ (خلاصہ تصوف اسلام، ص ۷۷)

اب اس جواب میں جتنا وزن ہے وہ آپ خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ صحابیت کی فضیلت میں تو سب صحابہ کرام برابر ہیں۔ پھر کسی صحابی کا مختصر، محدث یا فقیہ ہونا صحابیت سے زائد فضائل ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ صوفی ہونا بھی کوئی زائد فضیلت ہے، جو کسی صحابی کو میسر آئی ہو؟ ابو انصر سراج کے اس جواب سے یہ بات ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ صحابہ کرام میں سے کوئی صحابی بھی اس لقب سے لقب نہیں ہوا اور یہ دور صحابہؓ تک پھیلا ہوا ہے۔

۵ اب اگر احسان کے لفظ سے تصوف کو الگ کر دیا جائے اور اس کے ساتھ اس کا مترادف لفظ سلوک ملا دیا جائے، تو تصوف و سلوک جب بذاتِ خود ہی دین کا کوئی شعبہ قرار نہیں پاتا، تو اس کے لوازمات یعنی منازل سلوک، مقامات احوال اور ان کی لاتعداد اصطلاحات مثلاً جمع تفرقہ، فنا، بقا، سیر، کشف، مشاہدہ، توحید و تجرید، صحو و سکر وغیرہ کا بھی مولانا موصوف کے بیان کردہ اصول کے مطابق دین سے کچھ تعلق نہ رہا۔

اب اگر اس تصوف کو اس طبقہ سے تعلق رکھنے والے بعض بزرگوں کی کتابوں سے مثلاً شاہ ولی اللہ (م ۱۱۷۶ھ) کی تفہیمات سے یا قاضی ثناء اللہ پانی پتی (م ۱۲۲۵ھ) کی تفسیر مظہری سے یا امام غسائی (م ۵۰۵ھ) کی عبارت یا حافظ علی الدین محمود (م ۶۸۶ھ) کی تفسیر جمل سے، اصول دین اور بمنزلہ روح فی

اجد اور اس کا حصول فرضِ عین قرار دیا جائے اور اس کا توازن ثابت کر دکھایا جائے تو ہم ایسی مابعد کی پیدا کردہ شریعت اور توازن کے ہرگز قائل نہیں ہیں۔

اب ان لوگوں کا دعوے یہ ہے کہ راہِ سلوک پر چلنے والا کوئی شخص بھی عالم اور فقیہ سے افضل ہوتا ہے

عالم پر عابد کی فضیلت کی کشفی دلیل

اس کی پوری وضاحت کے لئے شیخ موفیؒ کا کشف و مشاہدہ ”ملاحظہ فرماتے۔

”نقل ہے کہ حضرت شیخ موفیؒ نے فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص بہشت میں کھڑا ہے جو نیک بخت لوگوں کو بہشت کی طرف بلاتا ہے اور بد بختوں کو اس کے قریب نہیں آنے دیتا۔ اس کے بعد ایک شخص کو دیکھا، جو تخت پر بیٹھا ہے اور اس کے دونوں طرف دو فرشتے ہیں۔ ایک اس کے منہ میں بہشت کا کھانا ڈالتا ہے اور کہتا ہے اے وہ شخص جس نے بہشت کے کھانوں کی خاطر دنیا کے کھانے نہیں کھاتے، اب بہشت کا کھانا کھا۔ دوسرا اس کے منہ میں بہشت کی شراب پکاتا ہے اور کہتا ہے کہ تو نے بہشت کی شراب کی خاطر دنیا کی شراب نہیں پی، اب بہشت کی شراب سے لطف اٹھا۔ اس کے بعد ایک اور شخص کو دیکھا جو عرش پر آنکھیں لگائے کھڑا ہے اور بہشت کے کھانے اور شراب کی اسے بالکل خواہش نہیں ہے۔ میں نے پوچھا یہ کون ہیں؟ ہاتھ نے کہا ”جو بہشت کے دروازے پر کھڑا ہے اور نیک بختوں کو بہشت کی طرف بلاتا ہے اور بد بختوں کو اس کے قریب نہیں آنے دیتا، وہ اہم احمد بن حنبلؒ ہیں اور جو تخت پر بیٹھا ہے اور فرشتے اس کے منہ میں کھانا اور شراب ڈالتے ہیں وہ بشر حافی ہیں، جو بہشت کے کھانے اور شراب کی امید پر تمام عمر روزہ دار ہے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے ان کی خواہش پوری کر دی ہے اور جو عرش پر آنکھیں لگائے کھڑے ہیں وہ معروف کرخیؒ ہیں، جو بہشت کی امید اور دوزخ کے خوف سے بے نیاز، محض اللہ تعالیٰ کے دیدار کی امید پر روزہ دار ہے۔ پس خدا نے حجاب اٹھا دیا ہے اور آپ ہمیشہ اس کے دیدار میں محو رہتے ہیں۔“ (مرشد کامل، ص ۳۶، ۳۷)

دیکھتے یہ روایت علماء و صوفیاء کے مراتب کے متعلق صوفیاء کے نظریات کی کیسی صحیح ترجمانی کر رہی ہے۔ اب بشر حافی، جن کا اہم احمد بن حنبلؒ کو مرید بتایا جاتا ہے، وہ بزرگ ہیں، جن سے کسی نے کہا تھا کہ میرے پاس دس ہزار درہم ہیں اور میں حج کو جانا چاہتا ہوں، تو آپ نے فرمایا۔ ”تو حج کو نہیں جاتا سیر و تفریح کو جاتا ہے۔ یہ رقم حاجت مندوں میں بانٹ دے، تو تیرے اس ایک حج سے ہزار گنا بڑھ کر اس کا درجہ ہوگا۔“ (مقرآن حق، ص ۸۰)

بھلا اہم احمد بن حنبلؒ جیسے محدث اور فقیہ ایک ایسے بزرگ کی بیت کر سکتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے فریضہ کو محض ایک مستحسن فعل کے عوض ساقط کر رہا ہے، بلکہ اس کا درجہ ہزار گنا زیادہ بتلاتا ہے۔ پھر بشرحانیؒ کے اور بھی کئی واقعات تذکرہ میں موجود ہیں، جو سنت کے صریح خلاف ہیں۔ مثلاً عمر بھر روزہ دار رہنا۔

رہا معاملہ معروف کرخیؒ کا، تو یہ وہ خود کہتے ہیں کہ ”بہشت کی آرزو کرنا بغیر عمل کے اور شفاعت کی امید رکھنا بغیر نگہداشت کے آدمی کے نفس کا فریب اور غور ہے۔“ (مقربان حق، ص ۱۸۴) لیکن درج بالا اقتباس انہیں شریعت سے بے نیاز ثابت کر رہا ہے۔ یہ ہیں مندرجہ بالا روایت کے تضادات۔

اب دیکھئے رسول اللہ ﷺ نے یوں فرمایا کہ:

عابد پر علم کی فضیلت کے دلائل

اِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْانْبِيَاءِ عالم لوگ ہی انبیاء کے وارث ہیں۔ (ابوداؤد، کتاب العلم، باب فضل العلم)

یہاں علماء کا ذکر فرمایا ہے۔ مجاہد یا زہاد و صالحین (جیسا کہ اس دور میں لوگ موسوم تھے) کا ذکر نہیں فرمایا پھر آپؐ نے علم اور عابد یا زہاد کے مراتب کا فرق ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

وَاِنَّ فَضْلَ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ علم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے، جیسے چودھویں درجہ کا چاند تمام ستاروں پر فضیلت رکھتا ہے۔ (جامع ترمذی)

سَائِرُ الْكَوَاكِبِ (ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی، بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب العلم، فصل الثانی)

تیسری روایت یوں ہے:

ذَكَرَ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلَانِ أَحَدُهُمَا عَابِدٌ وَالْآخَرُ عَالِمٌ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ عَلَى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ

رسول اللہ ﷺ سے دو آدمیوں کا ذکر کیا گیا۔ جن میں سے ایک عابد تھا، دوسرا عالم۔ آپؐ نے فرمایا کہ ”علم عابد پر ایسی فضیلت رکھتا ہے جیسا کہ مہتاب سے ادنیٰ آدمی پر فضیلت رکھتا ہوں۔“ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: ”تھقین اللہ اور اس کے فرشتے اور آسمانوں اور زمین کی ساری مخلوقات، یہاں تک کہ چوٹیاں اپنے سونچنے میں اور پھیلیاں اس کے لئے دعائے خیر کرتی ہیں، جو

ذَكَرَ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلَانِ أَحَدُهُمَا عَابِدٌ وَالْآخَرُ عَالِمٌ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ عَلَى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ

ذَكَرَ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلَانِ أَحَدُهُمَا عَابِدٌ وَالْآخَرُ عَالِمٌ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ عَلَى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ

وَحَقِّ الْحَقِّ لِيَصْلُوْنَ عَلَى مَعْلَمٍ
لوگوں کو بھلائی سکھاتا ہے۔

النَّاسِ الْخَيْرِ
(ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب العلم، الفصل الثانی)

اب عالم اور عابد کے متعلق ایک فیصلہ صوفیاء کا ہے۔ دوسرا حضور اکرم ﷺ کا۔ تقابل آپ خود کر لیجئے اور فیصلہ کر لیجئے کہ قابلِ حجت کس کا فیصلہ ہو سکتا ہے؟

۳۔ عابد کی مجاہد پر فضیلت

اس ضمن میں تفصیلی بحث باب نمبر ۴ صوفیاء کے مخصوص مسائل کے تحت بعنوان ”جہادِ اصغر اور جہادِ اکبر“ میں دیکھتے۔ صوفیاء کا یہ نظریہ ہے کہ ریاضتِ نفس جہادِ اکبر ہے اور جہادِ بوالسیف جہادِ اصغر، یعنی ریاضتِ نفس و مجاہدہ، جہاد فی سبیل اللہ سے افضل اور بہتر ہے۔ بعنوان مندرجہ میں اس نظریہ کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

۴۔ باطنی علوم کی شرعی علوم پر فضیلت

چونکہ صوفیاء کے اکثر اعمال و عقائد شریعتِ مطہرہ کے صریح برخلاف ہوتے ہیں، بلکہ بسا اوقات دائرہ اسلام سے ہی خارج کر دیتے ہیں۔ لہذا انہوں نے مسلمانوں میں مقبول ہونے کی خاطر اسلام سے علی الاعلان بیراری کا اعلان تو نہیں کیا۔ البتہ ایسی تدبیریں ضرور اختیار فرمائیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لٹھی بھی بچ رہے۔ اسی سلسلہ میں ہم ان کا قرآن کریم کی تفسیر و تاویل کا انداز اور موضوع احادیث کا ذکر آئندہ چل کر پیش کریں گے منجملہ ان تدابیر کے ایک تدبیر ظاہری علم اور باطنی علم کی اصطلاح بھی ہے اور یہ کہ باطنی علم ظاہری علم سے افضل ہوتا ہے۔

باطنی علوم کے حصول کے ذرائع

ظاہری علم کا مفہوم تو بالکل واضح ہے، یعنی وہ علم جو قرآن و حدیث سے حاصل ہوتا ہے۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ باطن کے علم کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں اور وہ درج ذیل ہیں :

ایسا علم جو درس و تدریس اور کتابوں سے حاصل نہ ہوتا ہو۔ بہہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا ہو، جیسے ایک پیر سے اس کے کسی مرید یا غلیفہ کو حاصل ہوتا ہے۔

ابندِ یعر توجہ

مثلاً: نقل ہے کہ ایک شخص نے حضرت احمد جامؒ کے پاس آکر عرض کیا: ”میں طالب علم ہوں، چونکہ کندہن ہوں اس لئے دقیق اور مشکل مسئلے میری سمجھ میں نہیں آتے“ آپ نے فرمایا: ”تمہارا نام کیا ہے؟“ عرض کیا ”عمر!“ فرمایا ”عمر! اپنے استاد کو میری طرف سے کہنا کہ کل میرے ہاں آکر طالب علموں کو سبق پڑھانا۔“ عمر نے پیغام پہنچا دیا۔ دوسرے دن عمر اور مولوی صاحب دونوں حضرت احمد جامؒ کے تکبیر میں تشریف لائے۔ طالب علم سبق پڑھنے لگے۔ آپ نے عمر کو کہا: ”آج تم عبارت پڑھو“ جب آپ کی زبان سے یہ کلمہ نکلا، تو عمر کے سینے میں علم کا دریا جوش مارنے لگا۔ عمر نے عبارت پڑھی اور عبارت کا مطلب ایسا بیان کیا کہ استاد اور طلبہ اسے سمجھ نہ سکے۔ تمام اہل مجلس حیران رہ گئے۔ آپ نے فرمایا: ”عمر! یہ مطالب جو تم نے بیان کئے ہیں حاضرین مجلس ان کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ کسی قدر آسان اور سہل مطالب بیان کرو۔“ عمر نے پہلے کی نسبت آسان مطالب بیان کئے مگر اس کا استاد اور طلبہ ان کو بھی نہ سمجھ سکے۔ آپ نے فرمایا: ”اس سے بھی زیادہ آسان مطالب بیان کر۔“ کیونکہ حاضرین مجلس اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔“ عمر نے اس سے بھی زیادہ آسان اور سہل مطالب بیان کئے، تو اس کے استاد اور حاضرین مجلس نے ان کو کسی قدر سمجھ لیا۔“ (درشد کمال ص ۱۲۳)

تویہ ہے باطنی علم جو ایک سینہ سے دوسرے سینہ میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اب دیکھتے کہ خود شیخ احمد جامؒ کا علم کتنا وسیع ہوگا؟ اس طریقہ کے بعد کسی دینی درس گاہ یا یونیورسٹی کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ اگر حضور اکرم ﷺ کو اس باطنی علم کا علم ہوتا تو صفہ کی درس گاہ کبھی جاری نہ فرماتے۔

حضور اکرم ﷺ نے بھی حضرت ابن عباسؓ کے لئے تفقہ فی الدین کی دعا فرمائی تھی۔ لیکن ان کے بیان کردہ مطالب عوام سمجھتے تو نہ تھے۔ پھر یہ دیکھتے کہ حضور اکرم ﷺ نے تو دعا فرمائی تھی اور وہ بارگاہ الہی میں قبول ہوئی اور حضرت ابن عباسؓ کا سینہ کھل گیا، لیکن یہاں صرف توجہ سے ہی شیخ مذکور نے سینہ میں ایسے علوم بھر دیئے، جو کہ عوام کے فہم سے بہت بالاتر تھے۔ جو بار بار کی تاکید کے بعد انسانی فہم کی سطح پر آئے اور اغلب خیال تو یہ ہے کہ شیخ موصوفان علوم سے خود بھی واقف نہ تھے۔ دوسرے کے سینہ میں وہ کیا بھر سکتے تھے۔ لہذا اس کرامت کی حقیقت افسانہ سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہوتی۔

۲۔ حصول علم بذریعہ عام

اب باطنی علم کا اس سے بھی عجیب تر واقعہ ملاحظہ فرمائیے، مختصر یہ ہے کہ ایک شخص حضرت (محمد اسماعیل لاہوری،

المشہور میاں کلاں اکامرید تھا، شادی ہوئی تو اس عورت کو قرآن حفظ تھا۔ رات کو ہمبستری کے وقت عورت نے کہا کہ جب تک تو قرآن حفظ نہ کر لے میری صحبت کے لائق نہیں۔ یہ بات سن کر مدغمبایا اور حضرت کی خدمت میں آکر عرض حال کیا۔ فرمایا ”کل فجر کی نماز کے وقت، جب ہم امام ہوں، تو ہمارے داہنے ہاتھ کی طرف کھڑے ہونا اُس نے ایسا ہی کیا۔ بعد ازلے نماز جب حضرت نے سلام کیا اور نظر فیض اُتر دہنی طرف کے نمازیوں پر پڑی، تو سب کے سب قرآن کے حافظ ہو گئے اور بائیں طرف کے ناظر۔ حافظوں میں وہ مرید بھی حافظ ہو گیا اور اپنے گھر میں آباد ہو کر تمام عمر حضرت کے عنایات کا شکریہ ادا کرتا رہا۔“ (مدیقۃ الاولیاء ص ۱۷۶، تصنیف مفتی غلام سرور لاہوری)

اب بتائیے کہ ایسے باطنی فیض کا حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی میں بھی کوئی سراغ ملتا ہے اگر اس نظر فیض اثر کا نسخہ حضور اکرم ﷺ کے پاس ہوتا، تو ستر قاریوں کی شہادت پر اتنا افسوس کبھی نہ کرتے اور نہ ہی مہینہ بھر صبح کی نماز میں قبیلہ رعل اور ذکوان کے خلاف جنہوں نے دھوکہ سے ان قاریوں کو شہید کیا تھا، قوت نازلہ پڑھتے۔

۳۔ بذریعہ کشف و مشاہدہ یا لدُنّی علم کشف و مشاہدہ سے حاصل شدہ لدُنّی علم کی افضلیت میں توکل شاہ انبالوی کی زبان سے سینے :

”فرمایا، علم دو قسم کا ہے۔ ایک کسی دوسرے لدُنّی۔ کسی کی مثال ایک جوہر کی سی ہے۔ جس میں جتنا پانی بھر دیا جائے اُسی قدر اس میں بے گاہ۔ لوگ علم پڑھتے ہیں، جتنا پڑھتے ہیں اُسی قدر رہتا ہے اور یہ مسائل بتاتے ہیں تو اسی میں سے دیکھ کر بتاتے ہیں۔ اور علم لدُنّی کی مثال ایک چشمہ کی سی ہے جس میں سے ہر کاٹ لی جائے، تو اب اس میں سے خود پیو، جانو، دل کو پلاؤ، خواہ کسی جگہ صرف کرو، پانی اس میں سے کم نہیں ہوتا۔ یعنی جب دل کی طاقی کھُل جاتی ہے، تو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ایک نور کا منبع دل میں آتا ہے اور خود بخود ساری باتیں دل کے اندر سے اس کی سمجھ میں آتی رہتی ہیں کسی سے پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ پھر فقیر، مولویوں سے نہیں بلکہ اپنے دل سے فتویٰ لیتا ہے۔“ (صوفیائے متبذل، ص ۲۵۶)

مولانا اللہ یار خان اپنی کتاب دلائل السلوک کے صفحہ ۴۱ پر لکھتے ہیں :

کشفی علوم کی اجتہاد پر فضیلت

”صوفیائے کرام میں فقہاء مجتہدین کے مقابلہ میں ایک قوت زائد ہوتی ہے کہ وہ صاحب

کشف والہام ہوتے ہیں۔ فقہار محض ذاتی رائے سے مسائل کا استخراج کرتے ہیں اور یہ لوگ کشف والہام کی روشنی میں اور کشف والہام، اعلام و اطلاع من اللہ ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اعلام من اللہ محض ذاتی رائے سے افضل ہے۔ جس طرح قیاس و رائے کی صحت کا معیار یہ ہے کہ کتاب و سنت کے مخالف نہ ہو۔ اسی طرح کشف والہام کی صحت کا معیار بھی کتاب و سنت کی موافقت ہے۔ بہر حال اس کی فوقیت مسلم ہے۔“..... ”میں ذاتی طور پر فقہائے مجتہدین کے اجتہاد کو صوفیاء کے کشف والہام پر مقدم سمجھتا ہوں۔ اس کی دلیل صوفیاء کا تعامل ہے۔ تمام صوفیاء محققین، مجتہدین کے مقلد رہے ہیں پس فقیہ کے اجتہاد کا مقدم ہونا ثابت ہو گیا۔“ (دلائل السلوک، ص ۴۱)

اب دیکھئے کہ :

۱۔ مولانا موصوف کے اس اقتباس کے پہلے حصہ میں آپ فرما رہے ہیں کہ ”کشف والہام کی فوقیت بہر حال مسلم ہے۔“ اور دوسرے حصہ میں اپنا ہی ذاتی خیال یہ پیش فرماتے ہیں کہ یں ائمہ مجتہدین کے اجتہاد کو کشف والہام پر مقدم سمجھتا ہوں، تو پھر کشف والہام کی فوقیت مسلم کیسے ہو گئی۔ جب آپ خود ہی اسے مسلم تسلیم نہیں فرما رہے، تو دوسرے اسے کیسے مسلم سمجھیں گے؟

۲۔ آپ نے کشف والہام کی برتری کی عقلی دلیل بھی پیش کر دی اور صوفیائے محققین کے تعامل سے اس عقلی دلیل کی خود ہی تردید بھی فرمادی۔ جس سے معلوم ہوا کہ صوفیاء محققین کے نزدیک آپ کی عقلی دلیل لے چنانچہ ایک دوسرے مقام پر صاف لکھ دیا کہ : ”جس طرح شریعت ظاہری میں اخبار مصوم کے متعلق صحیح تیز رکھنے والے علماء موجود ہیں۔ اسی طرح کشف والہام میں بھی مہارت رکھنے والے صوفیاء عارفین موجود ہیں۔ البتہ یہ درست ہے کہ علوم ظاہریہ کو پرکھنے والے ماہرین بہت ہیں۔ مگر کشف والہام کے ماہرین کی بابت اس میں شک نہیں کہ علوم کشفیہ والہامیہ بھی خزانہ غیب کے علوم ہیں۔ دونوں میں فرق قطعی اور ظنی کا ہے۔“ (دلائل السلوک، ص ۱۱۳)

مولانا موصوف کے دونوں اقتباسات سامنے رکھنے سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں :

- ۱۔ صوفیاء کے نزدیک علوم کشفیہ والہامیہ کی اجتہاد پر فوقیت مسلم ہے کیونکہ صوفیاء میں کشف والہام کی ایک قوت زائد ہوتی ہے۔
- ۲۔ لیکن آپ ذاتی طور پر فقہاء کے اجتہاد کو صوفیاء کے کشف والہام پر مقدم سمجھتے ہیں کیونکہ اگر صوفیاء کا تعامل ائمہ مجتہدین کی عقیدہ کا ہے۔
- ۳۔ اجتہاد کو مقدم سمجھنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ علوم شرعیہ کو پرکھنے والے ماہرین علوم کشفیہ کی نسبت بہت زیادہ ہیں۔
- ۴۔ اگرچہ حقیقی وجہ یہ ہے کہ علوم شرعیہ اور کشفیہ دونوں خزانہ غیب سے ہیں مگر علوم شرعیہ قطعی ہیں جبکہ علوم کشفیہ ظنی ہیں۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

درست نہیں اور عقلی دلیل کی کمزوری یہ ہے کہ کشف و الہام سب کے سب اعلام من اللہ ہی نہیں ہوتے من الشیطان بھی ہو سکتے ہیں۔ اب اگر کسی غلط فہمی یا حسن عقیدت کی بنا پر سب کچھ ہی من اللہ سمجھ لیا جائے، تو یہ ایک فاش غلطی ہے۔ اسی لئے صوفیاء محققین اپنے کشف و الہام پر فقہاء کے اجتہاد کو ترجیح دیتے ہیں اور معتد رہے ہیں۔ البتہ وہ صوفیاء، جو محقق نہیں اور کثیر تعداد میں یہی لوگ ہیں، یہی سمجھتے ہیں کہ کشف و الہام کی فوقیت آئمہ مجتہدین کے اجتہاد پر بہر حال مقدم ہے۔ چنانچہ پائیں تو کل شاہ انبالوی نے صاف فرمادیا کہ ایسا صاحب کشف و الہام ”مولوی سے نہیں اپنے دل سے فتویٰ پوچھتا ہے۔“ اور صاحب مرشد کامل فرماتے ہیں کہ :

۴۔ کشفی یا لدنی علم بذلیعہ عشق

”غلبہ محبت کے سبب جب اُس کے دل کا شیشہ علائق و عوائق کی کدورت سے پاک ہو جاتا ہے تو اس کے اور خدا کے درمیان باطن سے ایک راستہ کھل جاتا ہے اور موانع کے زائل ہونے کے سبب اسے اپنے معشوق (خدا) سے ایک اور اتصال ہو جاتا ہے اور اسے تجلیات ہونے لگتی ہیں۔ اس مقام میں سالک کو حضرت عشق وہ عجیب و غریب علوم سکھاتا ہے جن سے زبان آشنا نہیں اور وہ زبان کے بغیر انہیں بیان کرتا ہے۔“ (مرشد کامل، ص ۱۳۰)

اقتباس بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ باطنی علوم کا استاد خدا نہیں، کیونکہ وہ تو (نعوذ باللہ) مشوق ہے، بلکہ حضرت عشق ہے۔ پھر ان علوم کو بغیر زبان کے بیان کرنے کی صورت بھی ہم جیسوں کی سمجھ سے بالاتر ہے۔

صاحب صوفیائے نقشبند
عبدالحق عجمی دہلوی کے حالات

۵۔ علم لدنی کا حصول بذلیعہ حضرت خضر

مرشد صغیر کا بقیہ
تقصا و بیانی
لیکن اس دعوے کے باوجود جب صوفیاء کے عقائد پر بحث کی باری آتی ہے، تو مولانا موصوف آئمہ مجتہدین کے اجتہاد سے ماہ فرار اختیار کرنے لگتے ہیں۔ بحث یہ ہے کہ کیا رجال النیب۔ جن، شیطان اور اولیاء و انبیاء کی اراخ وغیرہ کو دیکھا جاسکتا ہے جیسا کہ صوفیاء ایسا ہی اعتقاد رکھتے ہیں۔ اب اہم شافعی کا فتوے یہ ہے کہ ”معلیٰ رویت جن کی شہادت بھی مردود ہے۔“ (دلائل السلوک، ص ۱۳۳) تو آپ اس پر طویل بحث کرنے کے بعد نتیجہ پیش کرتے ہیں کہ یہ رویت بطور عرق عادت ہوتی ہے نہ کہ بطور عادت اور فتویٰ عادت پر ہوتا ہے۔

اب اس دلیل میں متنازعہ وزن ہے۔ خود ملاحظہ فرمائیے۔ اہم شافعی کو بھی خوب معلوم تھا کہ جنوں کو دیکھنا بطور عادت نہیں۔ بطور عرق عادت ہی ہو سکتا ہے اور یہ کچھ جگتے ہوئے انہوں نے اس فتوے کو دیا تھا۔

قلم بند کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

”اس کے بعد آپ (عبدالغنی بن محمد) م ۵۵، ۵۶ھ اہل اللہ اور اولیاء اللہ کی جستجو میں مصروف ہو گئے جتنی کہ ایک دن حضرت علیہ السلام سے آپ کی ملاقات ہوئی اور حضرت علیہ السلام نے فرمایا : ”میں غم کو اپنی فرزندگی میں لینا ہوں اور غم کو ایک سبق پڑھاتا ہوں اگر تم اس کی پابندی اور مواظبت کرو گے ، تو نہم اسرار باطنی تم پر کھل جائیں گے۔“ پھر حضرت علیہ السلام نے آپ کو وقوفِ عدی کی تعلیم دی اور فرمایا : سخن میں غوطہ لگاؤ اور دل سے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ کہو۔“ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور اس کا ورد کرتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ اسرار و رموز منکشف ہونے لگے : ”میں بے نقصد ہوں“ یہ وقوفِ عدی کیا ہوتا ہے ؟ یہ تو کوئی علم لدنی کا ماہر ہی بتلا سکتا ہے۔ ہمارے ناقص خیال میں اس سے مراد عملیات کا وہ حصہ ہے جس میں خانے بنا کر اس کو اعداد سے پُر کیا جاتا ہے۔

۶۔ باطنی علم کا حصول بذریعہ باطنی معانی

ان لوگوں نے قرآن و حدیث کے لفظوں کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک

ظاہری معانی ، دوسرے اس کے باطنی یا اصلی معانی یا اس کی روح ، باطنی معانی کو باطنی علم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ مولانا جلال الدین رومی اپنی ثنوی میں فرما رہے ہیں :

من زقرآن مغز را برداشتم استخوان بیش سگال انداختم

ترجمہ : میں نے قرآن سے مغز (اصل مطالب) اخذ کر لئے ہیں اور ہڈیاں جو بچ گئیں وہ میں نے کتوں (اہل ظاہر) کے آگے پھینک دی ہیں۔ اور مولانا روم نے اس ”مغز“ سے جو ثنوی تصنیف فرمائی اس کے متعلق عبد الرحمن جامی نے یہ دعویٰ کیا کہ :

ثنوی معنوی مولوی ہست قرآن در زبان پہلوی

مولوی (جلال الدین رومی) کی یہ ثنوی ہی حقیقت میں فارسی زبان میں قرآن ہے۔ حالانکہ لوگ اس ثنوی کو ”فتوحاتِ محیتہ در فارسی“ کہتے ہیں۔

پھر ان حضرات نے ان باطنی معانی کے لئے ایک حدیث بھی وضع کر ڈالی ، جو یہ ہے :

إِنَّ الْقُرْآنَ لَهُ ظَهْرًا وَ بَاطِنًا وَ لَيْسَ بِهِ بَاطِنٌ إِلَّا سَبْعَةٌ اس کے باطن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ پھر

اَبْطُرُ وَفِي رِوَايَةٍ اِلَى سَبْعِينَ
بَطْنًا (ریاض السالکین، ص ۳۷۲) تک ہے۔

دیکھا آپ نے ان صوفیاء نے اس وضعی حدیث کے ذریعہ باطنی معانی کے لئے کس قدر گنجائش پیدا کر لی ہے۔

کسی عمل کے ظاہر اور باطن کے ہم بھی قائل ہیں۔ مثلاً نماز کی ظاہری صورت وہ ہے، جو رسول اللہ نے سکھائی اور نماز کا باطن یہ ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَشْمِى عَيْنَ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (۱۶)، نماز بے حیائی اور بُرے کاموں سے روکتی ہے۔ بالفاظ دیگر تقویٰ پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح روزہ کی ظاہری شکل سحری سے افطاری تک کچھ نہ کھانا پینا ہے جبکہ اس کا باطنی معنی ضبطِ نفس ہے۔ جو حدیث میں بالوضاحت مذکور ہے۔ گویا ہر عمل کا ظاہر بھی اور اسی طرح باطن بھی شریعت نے خود ہی بتا دیا ہے۔ باطنی معنی باہر سے تلاش کرنے کی ایک مسلمان کو قطعاً ضرورت نہیں۔ لیکن ان حضرات نے باطنی معنی کے لئے تصوف کی نئی اصطلاحات اور اسرار و رموز کا ایک ڈھیر سامنے لا کر دکھایا ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھتے اسرار و رموز اور پسیلیوں کی زبان۔

باطنی علم کو قلبی علم بھی کہتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں ظاہری علم کو قلمی علم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ علم ظاہر کو اہلِ قال اور صوفیوں کو اہلِ حال سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان صوفیوں کے ہاں مشہور مقولہ ہے: علم درسی نہ بود در سینہ بود یعنی علم پڑھانے کی چیز نہیں (اصلی علم تو سینہ میں ہوتا ہے) پھر مولانا روم نے یوں بھی فرمایا کہ :

علم حق در علم صوفی گم نشود ایں سخن کے باورِ مردم شود

ترجمہ : لوگوں کو اس بات کا کیونکر یقین ہو کہ حقیقی علم تو صوفی کے علم میں گم ہوتا ہے۔

یعنی حقیقی علم انہی صوفیوں کے پاس ہوتا ہے۔ جس کا شریعت یا کسی نبی اور رسول کی تعلیم سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ اس بات کو دوسرے لوگ کیسے باور کر سکتے ہیں؟

اب مولانا روم کے اس فکر کے علی الرغم رسول اللہ کا ارشاد

حصولِ علم کا ذریعہ صرف تعلیم و تعلم ہے

ملاحظہ ہو آپ نے فرمایا :

إِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ (بخاری تعلیقاً، ص ۱، ج ۱) یعنی علم پڑھنے پڑھانے سے حاصل ہوتا ہے۔

اُس کے اس ارشاد سے واضح ہوتا ہے کہ علم کے حصول کا ذریعہ تعلیم و تعلم ہے۔ جسے صوفیاء درخور اعتنا سمجھتے ہی نہیں۔ چنانچہ ایک بزرگ صوفی نے علوم شریعت پر جو تعلیم و تعلم سے حاصل ہوتے ہیں۔ یوں تبصرہ فرمایا کہ :

إِذَا رَأَيْتَ الصُّوفِيَّ يَشْتَغِلُ
بِحَدِّثِنَا فَأَغْسِلْ يَدَكَ مِنْهُ
جب تم کسی صوفی کو دیکھو کہ وہ حَدِّثُنَا اور أَخْبَرْنَا کے
چکر میں پڑ گیا ہے تو بس اس سے ہاتھ دھو لو۔

(مدارج السالکین، ص ۲۱۹، ج ۴، بحوالہ زکریا بن ۵۴)

اب فرمائیے ایسا اعتقاد رکھنے والے حضرات کو شرعی علوم بھلا کیسے مضہم ہو سکتے ہیں؟ اسی لئے صوفیوں میں یہ مقولہ بھی بہت مشہور ہے۔

الْعِلْمُ حِجَابُ الْأَكْبَرِ
یعنی علم (شریعت) ہی دین طریقت یا شاہدہ حق میں اسب
سے بڑا حجاب ہے۔

اور کسی صوفی نے یہ بھی کہہ دیا کہ :

لِجَهْدٍ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنَ الْعِلْمِ

یعنی جہالت مجھے علم سے زیادہ عزیز ہے۔

یہ تفصیل تو علم ظاہر یا شریعت کی نفی تھی۔ اب باطنی علم کا
اثبات ملاحظہ فرمائیے۔ عبد العزیز قادری فرماتے ہیں :

کشفی علوم اور لطائف

”علم تصوف نے اس دولت کا آئینہ لگا لیا کہ جسم انسانی میں اندرونی اعضا، معدہ، جگر، تلی وغیرہ
کے علاوہ سات غیر مادی لطیف اعضا بھی پائے جاتے ہیں، جو یہ ہیں، نفس، روح، قلب، ستر خفی،
اخفی، آئنا۔

اگر اللہ اللہ کی ضربوں سے ایک بطیفہ بھی روشن کر لیا جائے، تو کشف حاصل ہو۔ کائنات کی چیزیں
فرمانبرداری کریں، سانوں (؟) روشن ہو جائیں تو کیا کہنا۔“

”تصوف کی کتابیں غیر مادی بھی ہوتی ہیں
جو ان مادی کاغذوں پر چھاپہ خالوں میں

باطنی علوم کی کتب اور ان کے مصنفین

لہ۔ اکابر صوفیاء لطائف خمسہ کا ذکر کرتے ہیں، جو یہ ہیں : (۱) قلب اس کا فعل ذکر ہے (۲) روح کا فعل حضور ہے (۳) سری کا سر شافہ (۴) اخفی کا شہود

مشاہدہ اور فنا اور (۵) اخفی کا معائنہ اور فنا الفنا۔ (دلائل السوکی ص ۴۱) لیکن قادری صاحب کے لطائف زیادہ بھی ہیں اور مختلف بھی۔

نہیں چھپتیں۔ ان کتابوں کو نطاب کہتے ہیں۔ نطاب وہی شخص حاصل کر سکتا اور پڑھ سکتا ہے جو اپنے لطائف کو روشن کرے۔ چند ایک نطابوں کے نام ملاحظہ ہوں:

شباب المعرفة، مصنفہ صدیق اکبر رحمۃ اللہ علیہ، مجاہدۃ الوحدة، مصنفہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، کلیات حیات مصنفہ عثمان غنی رضی اللہ عنہ، قوی القدرۃ، مصنفہ مولائے علی رضی اللہ عنہ، کربۃ الوحده، مصنفہ غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ (سرچرچہ جیت، عبدالعزیز قادری، ص ۶۸، مطبوعہ تبلیغ سوسائٹی، قصور پورہ، لاہور)

دیکھا آپ نے کس طرح ان لوگوں نے خلفائے راشدین کو بھی اس میدان میں لاگھیر ڈال دیا اور یہ کتابیں بھی وہی شخص پڑھ سکتا ہے، جو دین طریقت پر ایمان لا چکا ہو اور اسی راہ پر گامزن ہو۔ ان صوفیاء کے تمام اسرار و رموز، خواہ کسی بھی لطیفہ سے مشتق ہوں، انہی مادی کاغذوں اور کتابوں میں ثبت ہو چکے ہیں۔ کسی بڑے سے بڑے عارف نے بھی ان نطابات کا ذکر تک نہیں کیا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان نطابات اور ان کے مصنفین کا ماخذ و مرجع کیا ہے۔

باطنی علوم کیوں افضل ہیں؟

صوفیوں کے ”سلف صالحین“ کی زبان سے ملاحظہ فرمایا لیجئے۔ بایزید بسطامی شریعت اسلام پر تنقید

علم حدیث مردوں کا علم ہے

کہتے ہوئے فرماتے ہیں:

تم نے اپنا علم فوت شدہ لوگوں سے حاصل کیا ہے اور ہم نے اپنا علم اس ذات سے حاصل کیا ہے، جو ہمیشہ سے زندہ ہے اور اس پر کبھی موت نہیں آئے گی۔ ہم لوگ کہتے ہیں کہ میرے دل نے اپنے رب سے بیان کیا اور تم کہتے ہو کہ فلاں نے مجھ سے حدیث بیان کی، وہ کہاں ہے؟ جواب ملتا ہے: مر گیا، پھر اس فلاں نے فلاں سے بیان کیا، تو وہ کہاں ہے؟ جواب یہی کہ مر گیا ہے۔

اَخَذْتُوْ عَلِمَکُمْ مِیْتًا عَنْ مِیْتٍ
وَ اَخَذْنَا عَلِمَنَا عَنِ الْحَیِّ الَّذِیْ هُوَ
لَا یَمُوْتُ؛ یَقُوْلُ امْثَلُنَا؛ حَدَّثَنِیْ
قَلْبِیْ عَنْ رَبِّیْ وَ اَنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ
حَدَّثَنِیْ فُلَانٌ وَ اَیْنَ هُوَ؟ قَالُوْا
مَاتَ، عَنْ فُلَانٍ وَ اَیْنَ هُوَ؟
قَالُوْا مَاتَ (فتوحات مکیہ، ص ۶۵، ج ۱)

اور جنید بغدادی فرماتے ہیں:

ہندی کے لئے مستحب ہے کہ اس کا دل تین چیزوں میں

لَحَبُّ لِمُبْتَدِیْ اَنْ لَا یَشْتَغَلَ قَلْبُهٗ

بِهَذِهِ الثَّلَاثِ وَالْاِتِّفَاعِ حَالُهُ؛ مشغول نہ ہو (۱) کمائی کرنا (۲) علم حدیث طلب کرنا
الْكَسْبُ وَطَلَبُ الْحَدِيثِ وَالزَّوْجِ (۳) نکاح کرنا۔ اور صوفی کے لئے یہ بھی مستحب ہے کہ
وَاحَبٌ لِلصَّوْفِيِّ اَنْ لَا يَقْرَأَ وَلَا يَكْتُبَ۔ وہ کھنا پڑھنا ترک کر دے۔ (قوت القلوب، ص ۱۳۵ ج ۴)

واضح ہے کہ قوت القلوب للشیخ ابوطالب مکی (م ۳۸۴ھ) تصوف کی اہمات کتب سے ہے
تصوف کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنے کے لئے خورشید احمد گیلانی صاحب نے جو وہ کتب کا انتخاب کیا
ان میں سے ایک یہ قوت القلوب ہے۔

اب دیکھتے تین باتوں سے منید بغدادیؒ مبتدی کو منع فرما ہے میں اور چوتھی بات کو مستحب قرار دے
رہے ہیں کیا یہ چاروں باتیں شریعت اسلامیہ کی صریح خلاف ورزی ہیں۔ پھر جو لوگ طریقت کو شریعت کے
تابع ثابت کرنے بیٹھ جاتے ہیں ان کی اس نیک آرزو کی خوشی ضرور ہے مگر بمصدق ۷
بہ بین تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا

یہ کیسے خلیج کیونکر پائی جاسکتی ہے۔

اور شاہ ولی اللہ صاحب نے ان قلبی واردات کو بنیاد قرار دے کر ایک چہل حدیث کا مجموعہ مسی
الدائمین بھی تیار کیا ہے، جو آپ کے والد ماجد شیخ عبدالرحیم، حضور اکرم ﷺ سے علم حاصل کرتے
تھے۔ اس مجموعہ میں سے بطور نمونہ ایک حدیث درج ذیل ہے۔ سلسلہ اسناد بھی بنور ملاحظہ فرمائیے:

المحدث الخامس عشر: اخبرني پندرہویں حدیث: مجھے میرے والد نے
والدی، انہ کان مریضا فرأى خبر دی۔ وہ بیمار ہوئے تو حضور اکرم
النبي صلى الله عليه وسلم في النوم کو خواب میں دیکھا۔ حضور اکرم
فقال: كيف حالک يا بنی! ثم بشره ﷺ نے پوچھا: بیٹا! کیا حال ہے! پھر
بالشفاء واعطاه شعرتين من شعور بے شفا کی خوشخبری دی اور اپنی داڑھی کے دو بال
لحيته فتعافى عن المرض في بھی عنایت فرمائے۔ جب بیدار ہوئے
الحال وبقيت الشعرتان عنده في تو وہ موجود تھے۔ ان میں سے ایک مجھے یا
اليقظة فاعطاني احدهما فمى عندی جو میرے پاس موجود ہے۔

اب بتلائے جب باطنی علم میں اتنی خوبیاں ہوں تو روایت و روایت کے طول طویل چکروں میں

پڑنے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے؟ مسلمانوں کے جن کارناموں پر غیر مسلم بھی داد دینے پر مجبور تھے۔ ان صوفیوں نے اُن سب پر پانی پھیر دیا۔ اب اس علم کے پڑھنے کی ضرورت ہے، نہ اس پر عمل کرنے کی۔ پھر باطنی علم افضل بھی ہے کیونکہ وہ مردوں سے نہیں، بلکہ خدا یا نبی جیسی ہستیوں سے بلا واسطہ حاصل ہوتا ہے۔ اور ان کے خواب میں دیئے ہوئے تبرکات بیداری میں بھی ان کے پاس موجود ہوتے ہیں۔

اور اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ احادیث کی صحت کو پرکھنے کا معیار صوفیاء کے نزدیک ان کا کشف

احادیث کو پرکھنے کا معیار

ہے۔ وہ اپنے کشف کی رو سے ایک صحیح الاسناد حدیث کو ضعیف اور ایک ضعیف یا موضوع حدیث کو صحیح قرار دے دیتے ہیں اور اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ اور ان کی اپنی موضوعات بھی محض اسی لئے مقبول ہیں کہ ان پر ان کے اکابر نے مہر تصدیق ثبت کی ہے۔ یہ موضوع ہم تفصیل سے کسی دوسری جگہ زیر بحث لائے ہیں۔

برخی احادیث اور عقیدہ حیات النبی

تمام تصوفیاء میں یہ عقیدہ قائم ہے کہ پیر، فقیر اور عارف حضرات مرتے نہیں، بلکہ اس مادی عالم آب و گل سے پردہ فرماتے ہیں۔ اُن کی روح اصلاح الہی دنیا کے کاموں میں پہلے سے زیادہ مستعد ہو جاتی ہے۔ جب امام اولیاء اللہ کی زندگی کا یہ حال ہے، تو انبیاء اور باخصوص آنحضرت ﷺ تو اس طرح کی زندگی کے بہت زیادہ حقدار ہیں۔ مولانا اللہ یار خان صاحب نے اس سلسلہ میں اس حدیث سے استدلال فرمایا ہے کہ ”جب آنحضرت ﷺ کی وفات ہو گئی، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے، آپ کے چہرہ سے کپڑا اٹھایا، بوسہ دیا اور فرمایا: موت واقع ہو گئی اب دوبارہ اللہ تعالیٰ آپ کو موت نہیں دے گا۔“ اس کا مطلب صحابہ نے تو یہ سمجھا کہ اب یوم البعث کو آپ اٹھائے جائیں گے۔ موت یہی تھی، جو واقع ہو چکی۔ پھر اس کے بعد دوسری موت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور یہ قاعدہ صرف حضو اکرم ﷺ کے ساتھ ہی مختص نہیں بلکہ قانون یا سنت الہی ہی یہ ہے کہ مرنے کے بعد دوسری بار موت کسی عام مسلمان تو درکنار، کسی کافر کو بھی نہیں آئے گی۔ لیکن مولانا موصوف نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد سے یہ نتیجہ نکالا کہ موت ایک لمحہ کے لئے واقع ہو چکی ہے۔ اب آپ کو دوبارہ زندگی مل چکی ہے اور دوبارہ

موت کبھی نہ آئے گی۔ اگر آپ کے اس استدلال کو درست فرض کر لیا جائے، تو بھی حضور اکرم ﷺ یا پیروں فقیروں کی کوئی مابہ الاتیاز نشانی واضح نہیں ہوتی کیونکہ کافر بھی مرنے کے ساتھ برزخی زندگی میں زندہ ہوتے ہیں، جنہیں عذاب دیا جاتا ہے۔

اس سے آگے صوفیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ بجز غصریٰ اپنی قبر میں زندہ ہیں۔ پھر اس دنیا میں آتے جاتے ہیں۔ کسی مقام پر دوبار بھی منعقد کرتے ہیں۔ جہاں اولیاء اللہ، جن کی دل کی آنکھیں ماہوتی ہیں، وہاں جاتے اور آپ سے شرف ملاقات حاصل کرتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ بجز غصریٰ ان اولیاء اللہ کے پاس آتے ہیں اور ان اولیاء اللہ کو زیارت اور کلام سے مشرف فرماتے ہیں۔ اولیاء اللہ جیسے ملائکہ یا جنات کو دیکھتے اور ہم کلام ہوتے ہیں۔ اسی طرح حضور اکرم ﷺ کو بھی دیکھتے اور ان سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ اور روحانی نبوت بھی کرتے ہیں۔

اس عقیدہ پر یہ اعتراض ہوا کہ ”اگر صوفیاء رسول کریم ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوتے ہیں، تو صحابی ہوئے اور جو کلام ان سے سنتے ہیں وہ حدیث ہوتی۔ پھر صوفیاء میں اور صحابہ میں فرق کیا رہ گیا؟ اس اعتراض کے جواب میں مولانا اللہ یار خان فرماتے ہیں کہ صحابیت کے لئے دو شرائط ہیں: (۱) احکام شرع کی پابندی اور (۲) اسی علم آگے میں رسول اللہ کا شرف حاصل ہونا۔ لہذا صوفیاء صحابی کی تعریف میں نہیں آتے۔ رہا حدیث کا معاملہ، تو اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ اسی طرح کی ”برزخی حدیث“ سے کوئی نیا حکم ثابت نہیں ہو سکتا۔ سابقہ احکام کی تائید و تصدیق ہو سکتی ہے اور یہی کچھ صوفیاء کرتے ہیں کہ بیداری کے واقعہ کی تصدیق کر لیتے ہیں۔“ (دلائل السلوک، ص ۱۹۳)

چلئے یہ بھی طے ہوا کہ آپ کی مادی زندگی میں بیان کی ہوئی احادیث برزخی ملاقات میں تصدیق کرائی جا سکتی ہیں۔ کوئی نیا حکم ثابت نہیں ہو سکتا۔ اب مشکل یہ ہے کہ مولانا اللہ یار خان خود ہی اپنے بیان کو وہ اصول کی خلاف ورزی کر جاتے ہیں۔ مثلاً اپنی اسی کتاب دلائل السلوک کے صفحہ ۱۵۶ پر فرماتے ہیں:

”سید محمد شاذلی کثرت سے حضور اکرم ﷺ کی زیارت کیا کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ حضور ﷺ! لوگ میری اس روایت کا انکار کرتے ہیں، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس نے میری تکذیب کی وہ نصرانی، یہودی یا مجوسی ہو کر مرے گا۔“ (دلائل السلوک، ص ۱۵۶، بحوالہ طباطبائی، ص ۴۶)

واضح رہے کہ یہ برزخی حدیث مولانا اللہ یار خان اپنے عقیدہ کی تائید میں پیش فرما رہے ہیں اور آپ کی زیارت

فی الدنیا کے منکین کا انجام بھی ایسا عبرت ناک بتلایا ہے جو شریعت میں فریضہ حج کی استطاعت رکھنے کے باوجود حج نہ کرنے والوں کا بتلایا گیا ہے۔

دوسری برزخی حدیث بھی طبقات شمرانی سے (۲: ۵۵) اپنی شاذلی صاحب کی ہے اور اسی عقیدہ حیات النبی کی مؤید ہے اور وہ یہ ہے:

”میں نے حضور اکرم ﷺ کی زیارت کی، مجھے حضور نے فرمایا: ”میں مُردہ نہیں ہوں۔ میری موت عبادت ہے۔ اس شخص سے پوشیدہ ہونا جس کو اللہ کی طرف سے بصیرت حاصل نہیں ہے اور جسے اللہ تم بصیرت دے، تو میں اسے دیکھتا ہوں اور وہ مجھے دیکھتا ہے۔“ (دلائل السوگ، ص ۱۲۷)

اب دیکھئے ان برزخی احادیث کے ذریعے احکام کا اثبات تو درکنار، عقائد کی بنیاد استوار ہو رہی ہے۔ اب یہاں سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ تعالیٰ نے ایسی بصیرت دی تھی یا نہیں؟ اگر ان سے ایسی برزخی احادیث دجوان کے کم از کم اپنے اقوال تو ہو سکتے ہیں انہیں منقول نہیں؟

۵۔ شریعت پر طریقت کی بالادستی

دین طریقت کا شریعت

پر بول بالا کرنے کے لئے

۱۔ پہلے علم شریعت کو محو کرنا پھر علم طریقت حاصل کرنا

پہلا طریق یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ یہ صوفی لوگ اس میدان میں ہر نو وارد کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ پہلے وہ علم شریعت کو دل سے محو کر لے۔ ورنہ وہ اس حلقہ میں شل نہیں ہو سکتا۔ یہاں ہم خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا ارشاد پیش کریں گے، جو اس حقیقت کی پوری وضاحت کر رہا ہے۔

”الغرض خواجہ ذکرہ اللہ باخیر نے یہ حکایت بیان

فرمائی اور آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور فرمایا کہ

خواجہ نظام الدین اولیاء کا ارشاد

پیران راہ میں سے ایک پیر تھا اور اس کا بیٹا محمد نامی صاحب علم اور مرد اہل تھا۔ جب اُس نے چاہا کہ میں علم طریقت میں آؤں، تو اس نے اپنے باپ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ درویش بنوں۔ اس کے باپ نے کہا کہ پہلے تو ایک چتہ کر۔ اس نے کہا بُہت اچھا۔ باپ کے فرماتے ہی چتہ میں بیٹھ گیا۔ جب وہ نام ہوا تو باپ کی خدمت میں آیا۔ باپ نے اس سے چند مسائل پوچھے۔ اُس نے سب کا جواب دیا۔ باپ نے

کہا ایک اور چٹہ کرو۔ یہ چٹہ تہاے لئے سود مند نہیں ہوا۔ اس نے ایک چٹہ اور کیا۔ پھر باپ کی خدمت میں آیا۔ باپ نے اس سے پھر چٹہ منگے پوچھے۔ اُس نے کچھ کچھ جواب دیا۔ باپ نے کہا: سیٹا! ایک چٹہ اور کرو۔ پھر اس نے بیس چٹہ پور کیا اور باپ کی خدمت میں آیا اور اس نے کچھ مسائل پوچھے۔ وہ لڑکا حق میں کچھ ایسا مشغول ہو گیا تھا کہ کسی کا بھی کچھ جواب نہ دے سکا۔ (ذوالفقار، حصہ دوم۔ نظام الدین اولیا، مرتبہ خواجہ حسن دہلوی۔ ترجمہ غلام احمد بریل، مطبع مجتہبی دہلی ۱۳۱۲ھ، ص ۱۹۵)

اقتباس بالا سے مندرجہ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے۔

- ۱۔ باپ کو اس بات کا خوب علم تھا کہ قرآن و حدیث سے جب تک پیچھا نہ چھڑایا جائے۔ طریقت کی طرف پیش رفت محال ہے۔
 - ۲۔ کم از کم تین چٹوں میں شرعی علوم از خود محو ہو جاتے ہیں اور شرعی علوم کو محو کرنے کے لئے چٹہ کشی ہی اس کا واحد علاج ہے۔
 - ۳۔ پہلا چٹہ تو بے کاری گیا کیونکہ لڑکے نے سب مسائل کے جواب دے دیئے اور ابھی اسے شرعی مسائل یاد تھے۔ دوسرے چٹے کے بعد آدھا علم بھول چکا تھا اور تیسرے چٹے کے بعد جب شرعی علوم کو بخیر بھول چکا، تو یہی وقت حق میں مشغول ہونے کا مناسب وقت تھا۔ بالفاظ دیگر شرعی علوم کے مقابلہ میں حق صرف علم طریقت ہے جو علوم شرعیہ کو بھلائے بغیر ہاتھ نہیں آتا۔
 - ۴۔ علم طریقت کے حصول کے لئے جاہل لوگ زیادہ موزوں ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ دین طریقت جہلا کے طبقوں میں خوب بنتا ہے۔ کیونکہ یہی اُس کا صحیح میدان ہے۔
- اب چند مزید واقعات ملاحظہ فرمائے۔

شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے متعلق مشہور ہے کہ شیخ شہاب الدین سہروردی کو ان کے چچا ابوالخیر سہروردی شیخ موصوف کے پاس لائے اور عرض کیا میرا یہ بھتیجا علم کلام میں مشغول رہا کرتا ہے۔ ہر چند روکنا ہوں۔ اثر نہیں ہوتا۔ حضرت نے اُن سے مخاطب ہو کر پوچھا: ”عمر! کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں انہوں نے نام بناتے۔ حضرت نے اُن کو اپنا دست مہدک ان کے سینہ پر پھیرا، روایت کے راویوں نے آگے خود شیخ کا پیغام نقل کیا ہے کہ:

میراجواں ہمت بیٹا ایک روز تیری مجلس میں آیا اور دیوانہ ہو کر گیا۔ اب میں نہیں جانتی کہ وہ کہاں ہے۔ اور کس حال میں ہے؟ اس عورت کی حالتِ نار پر شیخ کا دل لیجا۔ کہا: ”غم نہ کھا، تیرا بیٹا ملا، تو مجھے ضرور اطلاع دوں گا۔ ایک رات شیخ احمد، خدمتِ شیخ میں حاضر ہوا۔ آپ نے اپنے خادم سے کہا۔ جاؤ اس کی ماں کو بلالو۔ جب اس کی ماں اس کے اہل و عیال کے ساتھ آئی، تو سب نے شیخ احمد کو دیکھ کر نالہ و فریاد شروع کر دیا۔ ہر چند کہا کہ شیخ احمد ان کے ساتھ گھر چلے، مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوا۔ بلکہ شیخ سے کہا: ”آپ نے ان لوگوں کو بلا کر میرا وقت خراب کیا۔ یہ تو میرے لئے وبالِ جان بن گئے ہیں۔“ اس پر اس کی بیوی بولی۔ ”تو نے اپنا بنانا یا کام خراب کر دیا ہے۔ مجھ پر جو بیٹے لگی، اس کو خوش و ناخوش پتے نہ ہوں گی۔ اس اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لیتا جا۔“ احمد نے کہا: ”بہت خوب! اسی وقت لوگے کا لباس اتروا کر گدڑی پہنا دی اور ہاتھ میں زمبیل دے دی۔ لوگے کی ماں نے جو یہ صورت دیکھی، تو اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئی اور شیخ احمد نے اپنی راہ دشت لی۔“ (غزنیۃ الامنیاء ص ۱۳۳)

یہ سری سقلی (م ۲۵۰) تیسری صدی کے صوفی ہیں۔ جب کہ ابھی تصوف کی کتب تصنیف بھی نہ ہوئیں تھیں۔ گویا اسی دور سے ان صوفیاء کا طور طریقِ شریعتِ اسلامیہ سے الگ ہو گیا تھا۔
بوعلی فارمدی (م ۴۷۷) اور امام قشیری
 (بوعلی فارمدی کو) فرمایا: ”آپ نے امام قشیری (نے) مجھے

نوجوان جاؤ۔ تحصیلِ علم کرو۔ میں مزید تین سال تک تحصیلِ علم میں مصروف رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ میں نے جب دوات سے قلم نکالا، تو وہ سیاہ کے بجائے سفید نکلا۔ میں نے حضرت امام ابو قاسم قشیری کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ سنایا، تو آپ نے فرمایا: ”اس بات کا مطلب یہ ہے کہ علم تجھ سے دستبردار ہو گیا تو تو بھی اب علم سے دست بردار ہو جا اور طریقت کا راستہ اختیار کر لے اور اس میں مشغول ہو جا۔“ (صوفیائے نقشبند ص ۱۷۳)

امام قشیری کی اس تعبیر واقعہ سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ طریقت کا علم شریعت کے علم سے افضل ہوتا ہے۔ کیونکہ شریعت کا علم سیاہی سے لکھا جاتا ہے اور سیاہ ہوتا ہے۔ جب کہ طریقت کا علم سفید ہوتا ہے۔ البتہ یہ سمجھ نہیں آتی کہ دوات سے قلم سفید کیسے نکلا؟ یہ تو ہو سکتا ہے کہ قلم کو سیاہی نہ لگے اور خشک ہی باہر نکل آئے۔ لیکن وہ سفید کیسے ہو گیا تھا؟ یہ راز صوفیاء ہی سمجھ سکتے ہیں۔

مُربد کو شریعتِ اسلام سے
سے برگشتہ کرنے کا دوسرا

۲۔ شیخ کی غیر مشروط اطاعت کی پابندی

طریق یہ ہے کہ صوفی لوگ (یادیں طریقت کے دوسرے مذہبوں کے گرو) اپنے نئے مُربد سے سب سے پہلے غیر مشروط اطاعت کا عہد لیتے ہیں اور اگر کہیں کوئی درمیان میں اللہ و رسول ﷺ کے احکام کا ذکر کرے تو وہ راندہ درگاہ قرار دیا جاتا ہے۔ حافظ شیرازی اس مفہوم کو مندرجہ ذیل شعر میں ادا فرما رہے ہیں۔

بے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغال گوید کہ سالک بے خبر بود ز راہ و رسم منزل ما !
ترجمہ: اگر تجھے بزرگ پیر اپنے مصلیٰ کو شراب میں رنگین کرنے کا حکم دے، تو ضرور ایسا کر کہ سالک (سلوک کی) منزلوں کے آداب و مراسم سے غوا قف نہیں ہوتا۔

اطاعتِ شیخ کے متعلق مولانا اللہ یار خان فرماتے ہیں کہ:

تصوف ہلوک اور اطاعتِ شیخ

”تصوف اور تزکیہ باطن میں سالک اور شیخ کا تعلق بڑا نازک ہے۔ ظاہری علوم میں معاملہ اور قسم کا ہے۔ استاد سے نفرت اور اس کی مخالفت کے باوجود آدمی ظاہری علم حاصل کر لیتا ہے۔ مگر اس راہ میں شیخ کامل میسر آجائے، تو اس کی مخالفت مانع فیض ہی نہیں، بلکہ حرام ہے۔ شیخ کامل کی مخالفت دراصل تزکیہ باطن اور رضا نے الہی کے حصول سے نا فرور میدہ ہونے کی دلیل ہے۔“ (دلائل السلوک ص ۵۱)

اب دیکھتے اقتباس بالا میں کتنی باتیں محلِ نظر ہیں :

- ۱۔ معصوم اور متبراعن الخطاء صرف انبیاء کرام کی ذات ہوتی ہے۔ شیخ خواہ کامل سے کامل تر کیوں نہ ہو۔ اسلامی عقیدہ کے مطابق وہ معصوم اور متبراعن الخطاء نہیں ہو سکتا۔ لہذا ایسی غیر مشروط اطاعت قرآن کریم کی رو سے صرف اللہ اور اس کے رسول کی ہی ہو سکتی ہے۔ باقی سب کے اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے اور مخالفت بھی۔ جیسا کہ حضرت امم مالکؓ نے آپ کی قبر کی طرف اشارہ کر کے واضح طور پر کہا: ”کہ اس صاحبِ قبر کے سوا ہر کسی کی بات کو قبول بھی کیا جاسکتا ہے اور رد بھی۔ مگر آپ کی کسی بات کو رد نہیں کیا جاسکتا۔“
- ۲۔ یہ شیخ کامل حضرت جس طرح سے سائیکن کی تربیت فرماتے ہیں اس کی مثالیں ہم کسی دوسرے مقام پر پیش کر رہے ہیں۔ ان میں سے بے شمار باتیں صریحاً خلافِ شریعت ہوتی ہیں۔ اب اگر ان کی مخالفت کو کو حرام قرار دیا جائے، تو بتلا یہ شخصیت پرستی اور کسے کہتے ہیں؟ یہی بات تصورِ شیخ کا پہلا زینہ

ہے جسے آپ خود بھی حرام فرماتے ہیں۔

۳۔ آپ نے حصولِ علم و فیض کی منطق بیان فرماتے ہوئے افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ استاد سے اگر نفرت اور مخالفت ہو تو ظاہری علوم میں بھی کسبِ علم و فیض مشکل ہی سے ہوتا ہے۔ بھلا جو شاگرد اپنے استاد سے متنفر ہے اور مخالفت بھی ہے وہ اس کے پاس کیا لینے جائے گا اور جائے گا بھی، تو استاد نے جس شفقت سے کچھ بتلائے گا، وہ سب کو معلوم ہے۔

۴۔ چونکہ آپ نے شیخِ کامل کی مخالفت کو حرام قرار دیا ہے۔ یہی اس بات کی قوی دلیل ہے کہ ایسے علم و فن کا کاتب، جس میں اللہ اور رسول کے علاوہ کسی دوسرے کی غیر مشروط اطاعت کو لازمی قرار دیا جائے، از روئے شریعت حرام ہے۔

حدائقِ الانبیاء کے مترجم اس غیر مشروط اطاعت کے علاوہ کچھ نہرونیاز کی بھی ہدایت فرماتے ہوئے

صادقِ فرغانی کی زائد شرط

لکھتے ہیں :

”جب سالک مُرشد کے ہاتھ میں ہاتھ دے چکے، تو اسے چاہیئے کہ اس کے آگے بے اختیار ہو جائے، جیسے مُردہ غسل کے سامنے بے اختیار ہو جاتا ہے۔ یعنی اسے کسی بات کا اختیار نہ رہے اور جب کبھی اپنے پیر کی خدمت میں جائے خالی ہاتھ نہ جائے اگرچہ ٹھوڑی چیز دے مگر دے ضرور، کیونکہ یہ اس کی محبت اور اخلاص کی علامت ہے۔“ (تعلیقِ مرشدِ کامل، ترجمہ حدائقِ الانبیاء، ص ۱۴۰، مطبوعہ شیخ محمد بشیر)

(اردو بازار، لاہور)

اس غیر مشروط اطاعت کا اثر سالک یا مرید پر جو ہو سکتا ہے، وہ تو فرغانی صاحب نے بتلادیا ہے۔ کہ مرید، پیر کے ہاتھوں میں یوں بے بس و بے اختیار ہونا چاہئے، جیسے غسل کے ہاتھوں میں مُردہ۔ اور مُرشد ان کا دل پر یہ اثر ہو کہ وہ پیسے ہی اپنے آپ کو نبی یا رسول سے کم نہ سمجھتے تھے۔ اب اپنا کلمہ بھی پڑھوانے لگے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

خواجہ فرید الدین گنج شکر فرماتے ہیں :

”کیونکہ پیر کے کام میں مستعد ہونا عین دین کے کاموں میں

اللہ کے نئے نئے رسول

مُسند ہونا ہے۔ پھر فرمانے لگے، ایک مرتبہ میں شیخ معین الدین (اپنے دادا پیر مولف) کی خدمت میں حاضر تھا اور اہل صفہ بھی موجود تھے۔ اولیاء اللہ کا ذکر ہو رہا تھا کہ اتنے میں ایک شخص آیا اور بیعت کے لئے پاؤسی کی۔ آپ نے اس کو بٹھالیا۔ اُس نے عرض کی میں مُرید ہونے آیا ہوں۔ فرمایا، جو کچھ ہم کہیں گے کرے گا۔ اگر یہ شرط منظور ہے، تو بیشک میں مرید کر لوں گا۔ اس نے کہا جو کچھ آپ کہیں گے وہی کروں گا۔ آپ نے فرمایا کہ تو اس طرح کلمہ پڑھتا ہے "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ" ایک بار اس طرح پڑھ "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ حَسْبِيَ رَسُولُ اللَّهِ"۔ چونکہ راسخ العقیدہ تھا، اس نے فوراً پڑھ لیا۔ خواجہ نے بیعت لی اور بہت کچھ غلعت و نعمت عطا کی اور فرمایا میں نے فقط تیرا امتحان لیا تھا کہ تجھ کو مجھ سے کس قدر عقیدت ہے۔ ورنہ میرا مقصود نہ تھا کہ تجھ سے اس طرح کلمہ پڑھواؤں۔" (فوائد السالکین مفوضات قطب الدین

بختیار کاکی۔ مرتبہ فرید الدین گنج شکر، ترجمہ غلام احمد بریلوی۔ ص ۱۲۶، ۱۲۷)

لاحظہ فرمایا آپ نے پیر کا مقام۔ منصب رسالت تو یہ تھا کہ جب رسول ﷺ بلائیں مومنوں کو فوراً آنا چاہیے اور رسول کی اطاعت بھی اتنی غیر مشروط نہیں کہ دنیوی کاموں میں بھی آپ کی اطاعت لازم ہو جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کئی بار آپ سے پوچھ لیا کہ یہ آپ کی رائے ہے یا حکم۔ اور اگر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ میری رائے ہے، تو صحابہ نے اختلاف کیا۔ لیکن یہاں غیر مشروط اطاعت اور پیر کے کاموں میں مشغول رہنے کو عین عبادت قرار دیا جاتا ہے۔

پھر اگر پیر صاحب نے اس نئے مرید کی اطاعت و عقیدت کا ٹیسٹ لینا ہی تھا تو یہ تو کسی اور طریقے سے بھی ہو سکتا تھا۔ کیا اس ٹیسٹ کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ اسلام کے بنیادی کلمہ شہادت پر ہی یہ وا چلایا جائے اور مرید کے راسخ العقیدہ ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ ایسا کلمہ کفر کہہ دے۔ یہ تو وہی بات ہوتی، جو بابل میں ہاروت، ماروت جادو سکھلانے سے پیشتر کہہ لیا کرتے تھے کہ یہ کفر اختیار نہ کر۔ پھر بھی اگر کوئی راسخ العقیدہ ہوتا اور کلمہ کفر پڑھ لیتا، تو اسے جادو سکھا دیتے اور یہ سب اللہ کی طرف سے آزمائش اور تنبیہ تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان پیروں میں ایسا کلمہ پڑھانا اور آزمائش لینا ایک پرانا دستور ہے۔ کیونکہ شیخ شبلی نے بھی ایک شخص سے ایسا ہی ٹیسٹ لیا تھا۔ فوائد الغواد، مفوضات خواجہ نظام الدین اولیاء۔ مرتبہ خواجہ حسن دہلوی۔ ترجمہ پروفیسر محمد

ان واقعات کی تصدیق حکیم الامت اشرف علی تھانوی صاحب نے بھی فرمادی ہے۔ وہ اپنی کتاب
الکشف میں لکھتے ہیں کہ تھانہ بھون کے پیر صادق صاحب کلمہ لا الہ الا اللہ صادق رسول اللہ کو آزمائش
کے طور پر استعمال کرتے تھے اور چہرہ چستی رسول اللہ اور شبلی رسول اللہ کی طرح اس کے بعد معذرت بھی
نہیں کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک یہ کلمہ بالکل صحیح تھا کیونکہ ان کے خیال میں صادق رسول اللہ یا رسول اللہ
صادقؐ ایک ہی بات تھی۔

علامہ ازیں مولانا موصوف اس کلمہ کے معاملہ میں اپنی ذات کے لئے خاصی پچک رکھتے تھے مولانا
محمد سعید اکبر آبادی، جو دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے اپنے رسالہ 'برہان' فروری ۱۹۵۲ء کے
صفحہ ۱۰۷ پر رقمطراز ہیں کہ :

”اپنے معاملات میں تاویل و توجہ اور اغماض و مسامحت کی مولانا میں جو خوبی اُس کا اندازہ اس واقعہ سے
بھی ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی مرید نے ان کو لکھا کہ رات خواب میں میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ ہر چند کلمہ
شہادت صحیح صحیح ادا کرنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن ہر بار یہ ہوتا ہے کہ لا الہ الا اللہ کے بعد اشرف علی
رسول اللہ منہ سے نکل جاتا ہے۔“

”ظاہر ہے کہ اس کا صاف اور سیدھا جواب یہ تھا کہ یہ کلمہ کفر ہے۔ شیطان کا فریب اور نفس کا دھوکہ
ہے۔ تم فوراً توبہ استغفار کرو، لیکن مولانا تھانوی صاحب صرف یہ کہہ کر بات آئی گئی کر دیتے ہیں کہ تم
کو مجھ سے غایت محبت ہے۔ یہ سب کچھ اسی کا ثمرہ ہے۔“ (برہان، فروری ۱۹۵۲ء، ص ۱۰۷)

اسلام جس چیز کو توحید قرار دیتا ہے وہ صوفیاء کی
نظروں میں شرک ہے اور جس چیز کو شرک قرار

۳۔ غیشی احکام کی تلقین

دیتا ہے۔ وہی دین طریقت کی بنیاد ہے۔ عموماً صوفیاء کی طرف سے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ باطنی علم تقویٰ
شریعت اسلامیہ کی پابندی، تسبیح و تحمید اور اصلاح نفس سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ یہ محض ایک فریب ہے
حقیقت یہ ہے کہ باطنی علم بھی جادو ہی کی طرح کھل ہوئی مگر اسی ہے۔ جس طرح ہاروت اور ماروت لوگوں کو
کہتے تھے کہ اگر کفر و شرک کی باتیں منظور ہیں، تو تم جادو کا علم سیکھ سکتے ہو ورنہ اس کام کے نزدیک نہ جاؤ۔

بیینہ یہی صورت اس دین تصوف میں ہے۔ چنانچہ امام غزالی احیاء العلوم (ج ۴، ص ۳۵۸) پر ایک حکایت
نقل کرتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے :

بایزید بسطامی (م ۲۶۱ھ) کا طریق تربیت

ایک شخص تیس سال البزید
بسطامی کی خدمت کرتا رہا

ایک روز اس نے شکایت کی یا حضرت! میں تیس سال آپ کی خدمت میں رہا۔ رات کبھی نہیں سویا اور ہمیشہ روزے بھی رکھتا ہوں، مگر میرے دل میں باطنی علم کے آثار نظر نہیں آتے۔ حالانکہ میں اس کا قائل بھی ہوں البزید نے کہا تم تین سو سال بھی لگے رہو، تو یہ علم حاصل نہ کر سکو گے۔ مرید نے پوچھا، اس کا کوئی علاج؛ بایزید نے فرمایا، تم وہ علاج کر نہ سکو گے۔ مرید نے جب اصرار کیا، تو فرمایا: ”اپنی داڑھی اور سر منڈا دو، گدڑی پہن لو۔ باداموں کا ایک کنگول اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے گرد پتوں کو جمع کرو اور کہو جو بچہ مجھے ایک گھونسا مارے گا، اُسے ایک بادام دوں گا۔ اسی طرح گلی گلی پھرو۔“ مرید نے کہا: ”سبحان اللہ! یہ کیا علاج ہے؟“ بایزید نے کہا، ”تیسرا سچا اللہ کیا بھی شرک۔ کیونکہ یہ کلمہ تو اپنی پاکیزگی بیان کرنے کے لئے کہہ رہا ہے۔“ مرید نے کہا: ”مجھ سے یہ علاج تو نہیں ہو سکتا کوئی اور بات بتلائیے۔“ بایزید نے کہا: ”اگر یہ علاج نہیں کر سکتا، تو دوسرا کوئی علاج نہیں۔ (احیاء العلوم، ج ۲، ص ۳۵۰)

یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد امام غزالیؒ لکھتے ہیں: ”جس شخص کا دل بیمار ہے اور وہ اپنے نفس کے تابع ہے اس کا علاج وہی ہے جو بایزید نے تجویز کیا۔“

ان واقعات سے آپ اس باطنی علم کے سراور و موز سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں کہ کس انداز میں مرید کو لاعلمانیہ خلاف شریعت کاموں اور اپنی غیر مشروط اطاعت اور شریعتی عقائد کے لئے مجبور کیا جا رہا ہے جب انسان اس مقام پر پہنچ جاتا ہے، تو بس شیطانی تجلیات، قلبی واردات، ہاتھی غیبی کی آوازوں اور مشاہدات و مکالمات حق تعالیٰ کے لئے دروازے کھلتے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اس مرید بیچارے نے تین خلاف شریعت کام، تو پہلے ہی سرانجام دے لئے تھے۔ (۱) رات کو بالکل نہ سونا۔ (۲) ہمیشہ روزہ رکھنا۔ (۳) دین طریقت پر ایمان۔ اب چوتھی بات پیر کی غیر مشروط اطاعت میں فیل ہونے کے باعث نامرادی رہا۔

اور اس کے کئی طریقے ہیں مثلاً:

۱۔ رات کو قرآن پڑھنے سے منع کرنا۔

۴۔ قرآن و سنت سے دور کرنا

عبدالوہاب شمرانی اپنی کتاب کبریٰ احمد بر حاشیہ البیواقیۃ والجلالہ کے صفحہ ۲۱ پر لکھتا ہے کہ: ”اللہ تعالیٰ نے ندائے غیب کے ذریعہ فرمایا: ”اے بندو! رات میرے لئے ہے نہ اس لئے کہ اس میں

قرآن پڑھا جائے۔ تیرے لئے دن میں بہت کام ہوتے ہیں۔ میں یہ اس لئے کہتا ہوں کہ جب تو رات کو قرآن پڑھے گا، تو اس کے معافی تھے مشاہدہ سے تفرقہ کی طرف لے جائیں گے۔ پھر کوئی آیت تھے میری جنت، اور جو کچھ میں نے اس میں پیدا کیا ہے، کی طرف لے جائے گی۔ تو پھر جب تو اپنی جنت میں حوروں کے ساتھ استبرق کے بچپونوں سے تکیہ لگائے ہوگا، تو میرا خیال کہاں ہوگا؟ پھر کوئی آیت جہنم کی طرف تھے لے جائے گی اور اس میں طرح طرح کے عذاب کا معائنہ کرے گا۔ تو جب تو ان باتوں میں مشغول ہوگا، تو میرا خیال کب ہوگا؟ پھر کوئی آیت تھے قصہ آدم ﷺ اور نوح ﷺ، ہود ﷺ، صالح ﷺ، موسیٰ ﷺ، یاموسیٰ ﷺ کی طرف لے جائے گی۔ علیٰ ہذا القیاس۔ میں نے تجھے تدبر کا حکم نہیں دیا، بلکہ یہ کہ تو اپنے دل کے خیالات کو مجھ پر مجتمع کرے۔ رہیں استنباط احکام والی آیات تو ان کے لئے دوسرا وقت ہے۔“ (فضائح صوفیاء، ص ۸)

اب دیکھئے شعرانی صاحب کس خطرناک انداز سے مسلمانوں کی توجہ قرآن کی تلاوت سے ہٹا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ توبہ فرمائیں کہ :

۱۔ اَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالًا (۴۴)

۲۔ فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعَبِدَ (۵۰/۴۵)

۳۔ يٰۤاَيُّهَا الْمَزْمَلُ قُمِ اللَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا نِّصْفَهٗ اَوْ اَنْقِصْ مِنْهُ قَلِيْلًا اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيْلًا (۱-۷۶)

لیکن یہ حضرت توجہ الی اللہ کی اڑ میں رات کو قرآن پڑھنے اور اس میں غور و تدبر کرنے سے منع فرما رہے ہیں۔

ب۔ اپنے بنائے ہوئے اوراد و وظائف اور اعمال کو قرآن سے بہتر قرار دینا۔

اور ہم مشاہدہ ہے کہ اس گروہ سے تعلق رکھنے والے حضرات اوراد و وظائف، درود لکھتی، درود تاج، قصیدہ غوثیہ، شش قفل، ہفت ہیکل وغیرہ وغیرہ کی تلاوت ضرور کرتے ہیں۔ قرآن خواہ پڑھیں یا نہ

پڑھیں۔ اسی طرح انہوں نے کئی طرح کی نمازیں بھی ایجاد کر رکھی ہیں۔ مثلاً صلوٰۃ فاتح، صلوٰۃ غوثیہ، خضر کی نماز وغیرہ وغیرہ۔ اور احمدی جانی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ”صلوٰۃ الفاتح کا ثواب، جو کچھ زمین بھر میں ذکر اذکار پڑھے جاتے ہیں ان کو چھ ہزار سے ضرب دی جائے، تو اس کے برابر ہے۔“ (فضائح صوفیہ، ص ۱۰)۔

ج قرآن سے دُور رکھنے کا تیسرا طریق یہ ہے کہ انہوں نے قرآن اور اسی طرح حدیث کو بھی اسرار و رموز کا مجموعہ قرار دے دیا ہے۔ پہلے الفاظ کے ظاہری اور باطنی معانی کی تفریق پیدا کی۔ پھر باطنی معانی کو ظاہری پر ترجیح دے کر یوں گویا ہوئے۔ ۱۔

خُضَّتْ بَحْرًا وَقَفَ الْأَنْبِيَاءُ بِسَاحِلِهِ هَمُّ تَوَسُّدٍ بَيْنَ كُودِ كَتَمَ وَأَوْبَسِيَاءَ مَلَّ بِرَبِّهِ كُحْلُ رَجَعِ۔

یعنی انبیاء ظاہری معانی پر ہی لگے رہ گئے۔ جب کہ ہم لوگ ان کے باطنی معانی تک پہنچ گئے۔ اور ابن سبعین نے تو کتاب وسنت کی مخالفت میں یہاں تک کہہ دیا:

لَقَدْ جَدَّ ابْنُ أَمَنَةَ وَإِسْعَازُ ابْنِ أَمَنَةَ رَفِئِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نَعَى اللَّهُكَ وَبِشْرٍ رَحِمَتِ

قَالَ لَا نَسِيحَ بَعْدِي (فضائح صوفیہ، ص ۱۰) کو یہ کہہ کر متینہ کر دیا کہ میں سے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

ابن سبعین کو یہ غرافات کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ یہ حضرات نہ تو اپنے آپ کو انبیاء سے کمتر سمجھتے ہیں اور نہ اپنے مشکوفات و مشاہدات کو شریعت سے کمتر سمجھتے ہیں اور اس کی تفصیل آپ کو مناسب مقامات پر اس کتاب میں مل جائے گی۔

امام ابن قیم نے مدارج السالکین (جو اسماعیل ہرودی دم ۴۸۱ھ) کی کتاب منازل السائرین کی شرح اور اس پر تبصرہ ہے) میں سلوک کے مقامات پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اگر فلال چیز کی حقیقت یہ ہے، جو ارباب تصوف پٹن کرتے ہیں، تو پھر اس کے معنی یہ ہوتے کہ اس مقام کو صحابہ، بلکہ انبیاء بھی حاصل نہ کر سکے۔“ (ذکر فی نفس، ص ۲۰)۔

ابو اسماعیل ہرودی دم ۴۸۱ھ) نے توبہ، توکل، صبر، رضا وغیرہ وغیرہ کی شرح میں تین درجے مقرر کئے ہیں۔ پہلا درجہ عوام کا دوسرا خواص کا، تیسرا انھل انھواص کا۔ پہلے درجہ کا معیار یہی وہ اتنا اونچا بیان کرتا ہے۔ جتنا کہ قرآن کسی کو لے جانا چاہتا ہے۔ اور اگر کوئی کسر رہ جائے، تو وہ دوسرے میں بہر حال پوری ہو جاتی ہے۔ رہا تیسرا درجہ تو وہ صاف مافوق البشریت درجہ معلوم ہوتا ہے اور شیخ کے نزدیک یہی درجہ کاملین کا ہے اب اگر کوئی شخص کتاب وسنت کو معیار بنا کر اس کا تجزیہ کرے، تو وہ یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ

اس مقام کا اگر کوئی وجود ہے، تو وہ شیخ کے ذہن میں ہے۔ کتاب و سنت سے ثبوت تو کیا اس کا سراغ تک نہیں ملتا۔“ (حوالہ ایضاً)

۶۔ صوفیاء کا باطنی سیاسی نظام

باطنی نظام کے قیام کی ضرورت

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم زمین کی حکومت اپنے صانع بندوں کو عنایت فرماتے ہیں۔ جب صوفیاء نے، جو خود کو صالحین کا جانشین تصور کرتے ہیں، دیکھا کہ ان کے پاس تو صرف عزت اور گوشہ نشینی یا غیب دانی اور تصرفات ہی رہ گئے ہیں۔ رہی زمین کی حکومت یا سلطنت، تو اس سے ان کا کسی دور میں کوئی واسطہ نہیں رہا، تو اس مشکل کا حل انہوں نے یہ سوچا کہ ایک تو دنیوی سلطنت کی بھرپور تنقیص کی جائے۔ دوسرے اپنا الگ باطنی نظام قائم کر کے اس کو ظاہری حکومت سے برتر ثابت کیا جائے۔ تو جس طرح شیعہ حضرات نے اپنا الگ باطنی نظام قائم کر کے اس نظام کا پیشوا اہم منصوبہ کو قرار دیا۔ اسی طرح صوفیاء نے اپنا الگ باطنی نظام قائم کیا جس کا پیشوا ’غوث‘ کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔

باطنی مناصب، ان کی تعداد اور طریق کار کے سلسلہ میں

باطنی نظام کا صد دفتر اور عہدیداروں کے مساکن

عبدالرحمن عبدالسمانی مصنف ”فضائح الصوفیاء“ کی تحقیق یہ ہے کہ ”تمام عالم میں ’غوث‘ ایک ہوتا ہے۔ جس کے ماتحت چار قطب ہوتے ہیں اور عالم کے چاروں کونوں پر ’غوث‘ کے حکم سے مامور ہوتے ہیں پھر سات ابدال ہیں، جو ’غوث‘ کے حکم سے سات پہاڑیوں پر رہتے ہیں۔ پھر ان کے بعد پنجب کا کادر جہ ہے اور یہ ہر شہر میں ایک ایک ہوتا ہے۔ اس طرح ان لوگوں نے ساری دنیا پر اپنا جال بچھا رکھا ہے اور ان کا دفتر ’غارِ حرا‘ میں ہے۔ جہاں یہ سب حضرات ہر رات کو اکٹھے ہوتے اور اللہ تعالیٰ کی قدر و قضا پر نظر رکھتے ہیں۔“ (فضائح الصوفیاء عبدالرحمن عبدالسمانی، ص ۴۵، مطبوعہ کویت)

اور دائرۃ المعارف الاسلامیہ (مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور) میں اولیاء کے ان باطنی مناصب اور فیوض

کی تفصیل ایک ذیلی عنوان ”طبقات رجال الغیب“ کے تحت کچھ اس طرح دی گئی ہے۔

طبقات رجال الغیب

صوفیاء کے نزدیک دنیا اس لئے قائم ہے کہ اولیاء اللہ کے ایک مستور مگر منظم سلسلے کی شفاعت سے اس کی

باتیں ملتی رہتی ہیں۔ دنیا میں ان اولیاء اللہ کی تعداد مقرر ہے۔ جب ایک ولی کا انتقال ہو جاتا ہے، تو دوسرا فوراً اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ اس کی تعداد میں سونقبا، چالیس ابدال، سات امناء، چار عمود اور ان کا قطب شامل ہیں۔ (قطب یعنی وہ محور جس کے گرد بخیاں صوفیاء سارا نظام گردش کرتا ہے بخوث)

(دائمہ مرج ۶، ص ۲۶۶، زیر عنوان تصوف)

مناصب اولیاء اللہ کی شرعی بنیادیں

مندرجہ بالا سرسری معلومات کے بعد اب ہم آپ کو اللہ یار خان صاحب کی تفصیلی معلومات سے متعارف کرائیں گے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اپنی کتاب ’دلائل السلوک‘ میں ایک منقل باب قائم کیا ہے فرماتے ہیں کہ یہ سب اصطلاحات احادیث سے ماخوذ ہیں۔ پھر اس سلسلہ میں آپ نے چودہ احادیث ابولیمع اصغہانی (دم ۲۳۰ھ) کی کتاب حلیۃ الاولیاء سے درج فرمائی ہیں۔ اس کتاب کے متعلق بھی ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ اس دس جلدوں پر مشتمل مبسوط کتاب میں رطب ویابس سب کچھ شامل ہے۔ موضوع احادیث کی بھر مار ہے اور بہ تکلف خلفائے اربعہ اور بعض دوسرے صحابہ کو بھی اس زمرہ صوفیاء میں شامل کر لیا گیا ہے اب مولانا موصوف اس کتاب سے چودہ احادیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

”مذکورہ بالا احادیث کے رواۃ پر جرح کی گئی ہے۔“ (د۔س، ص ۶۸) پھر اس سلسلے میں جلال الدین سیوطی (دم ۹۱۱ھ) جو خود اسی طبقہ صوفیاء سے تعلق رکھتے ہیں، کی تحقیق ملاحظہ ہو۔ اور وہ تحقیق یہ ہے کہ:

”علامہ سیوطی نے قریناً بیس کتب و رواۃ سے ابدال کی احادیث نقل کی ہیں اور تمام کو صحیح اور حسن فرمایا ہے۔ تمام طرق احادیث کو جمع کرنے پر قد مشترک یعنی ابدال کا وجود یقیناً تسلیم کرنا پڑے گا جس مستقل کتاب کا حوالہ علامہ موصوف نے دیا ہے اس کا نام الخبر الدال علی وجود القطب والنجباء والابدال“ ہے۔“ (دلائل السلوک، ص ۶۹)

اب دیکھئے کہ اس اقتباس میں :

۱۔ مولانا اشدر یار خان نے تسلیم کر لیا ہے کہ ان تمام احادیث کے رواۃ مجروح ہیں۔

۲۔ علامہ جلال الدین سیوطی بیس احادیث نقل کر کے فرما رہے کہ احادیث صحیح بھی ہیں اور حسن بھی۔ لیکن اس دعوے کے باوجود ان میں سے کوئی ایک حدیث بھی صحاح ستہ میں مذکور نہیں۔ لہذا یہ حسن اور صحیح کا دعوے محل نظر ٹھہرا۔

۳۔ جس مستقل کتاب ”انجبال لدال علی وجود القطب والنجباء والابدال“ سے علامہ سیوطی نے یہ بیس (۲۰) احادیث نقل فرمائیں، وہ خبر سے اُن کی اپنی تصنیف ہے۔ (دلائل السلوک، ص ۲۱۵)

۴۔ ان تمام احادیث میں چونکہ قدر مشترک ”ابدال“ کا لفظ ہے، لہذا سفارش کی گئی ہے کہ کم از کم اس ابدال کو تو ضرور تسلیم کر لیا جائے۔

گویا ایسی معتبر احادیث سے مناصب اولیاء اللہ ثابت ہو گئے۔ اب جن ائمہ پر ان احادیث سے مزید روشنی پڑتی ہے، وہ درج ذیل ہیں :

احادیث متعلقہ قطب ابدال وغیرہ | حدیث ۱۱ کے مطابق ۱۵۰۰ اخبار اور ۴۰ ابدال ہوتے ہیں۔ اگر کوئی ابدال مَر جائے، تو ان ۵۰۰ میں سے کوئی ایک ترقی کر کے دُجھنی پُر کر دیتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا ”خبر“ آجاتا ہے۔

حدیث ۲ — احمد کی حدیث ہے، اس میں ابدال کی تعداد ۳۰ ہے۔ ان کے قلوب ابراہیم علیہ السلام کے قلب پر ہیں۔

حدیث ۳ — طبرانی کی حدیث ہے۔ اس میں ابدال ۳۰ ہیں اور ان کی برکات یہ ہیں کہ (۱) ان کے دم قدم سے زمین قائم اور (۲) بارش ہوتی ہے۔

حدیث ۴ — ابن عساکر کی حدیث ہے۔ اس میں ابدال ۴۰ ہیں مگر ہیں سب علاقہ شام کے۔ اُن کی برکت سے (۱) بارش ہوتی ہے۔ (۲) دشمن پر فتح ہوتی ہے۔ (۳) اہل زمین سے نکالیف اور مصائب دُور کئے جاتے ہیں۔

حدیث ۵ — (طبرانی) اس حدیث میں ابدال کی تعداد مذکور نہیں، البتہ علاقہ شام مذکور ہے ان کی برکت سے (۱) تہیں مدد دی جاتی ہے۔ (۲) رزق ملتا ہے۔

حدیث ۶۔ (احمد) یہ ابدال علاقہ شام کے ۴۰ مرد ہیں۔ ان کی تعداد پوری کر دی جاتی ہے۔ ان کی برکت سے (۱) بارش ہوتی ہے۔ (۲) دشمنوں کے مقابلہ میں مدد دی جاتی ہے اور (۳) صرف شام کے علاقہ کو عذاب سے دور کیا جاتا ہے۔

(معلوم ہوتا ہے کہ آجکل یا تو شام میں ابدال نہیں رہے یا پھر ان کی برکات ختم ہو چکی ہیں کہ مسلمان وہاں محکوم و مقہور ہیں اور یہودیوں کے ہاتھوں عذاب شدید بھی اٹھا رہے ہیں)

حدیث ۷۔ خلال کی حدیث میں ابدال تو ۴۰ ہیں مگر ان میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ مجموعی تعداد ۴۰ ہے۔ الگ الگ تعداد مذکور نہیں۔

حدیث ۸۔ (حاکم) ابدال موالی میں سے ہیں (یعنی یہ ابدال عربی نسل نہیں ہوتے)۔ یا تو ان کے غلام ہوتے ہیں یا ان کے ہاتھ پر لٹکا لانے پر ان کے قبیلہ سے غلام ہو جاتے ہیں)۔

حدیث ۹۔ (ابن ابی الدنیا) ابدالوں کی علامت یہ ہے کہ وہ کسی پر لعن طعن نہیں کرتے (اب بتلائے کہ اس ایک نشانی سے آپ کسی ابدال کی شناخت کر سکتے ہیں)؛

حدیث ۱۰۔ (ابن حبان) ابراہیم خلیل جیسے نسیں اور استی سے زمین خالی نہ رہے گی۔ ان کی برکات یہ ہیں۔ (۱) فریاد رسی ہوگی (۲) رزق دیا جائے گا۔ (۳) بارش ہوگی۔ (اس نسیں اور استی کی تعداد کی ہمیں تو سمجھ نہیں آتی۔ ممکن ہے آپ کچھ سمجھ کر اس حدیث صحیح اور حسن سے کچھ نتیجہ اخذ کر سکیں)

حدیث ۱۱۔ (بیہقی) اس حدیث میں نہ تعداد ہے نہ علاقہ کا تعین ہے نہ برکات کا۔ مذکور یہ ہے کہ میری اُمت کے ابدال اپنے علوں کی وجہ سے نہیں، بلکہ اللہ کی رحمت، نضوں کی سخاوت اور سینوں کی سلامتی کی وجہ سے جنت میں داخل ہوں گے۔

حدیث ۱۲۔ (ابن عدی) ابدال چالیس ہیں۔ ۲۲ شام میں اور ۱۸ عراق میں اور ان کی علاقہ و تعداد پوری رکھی جاتی ہے۔

حدیث ۱۳۔ (طبرانی) طبرانی کی حدیث ۱۲ میں ابدال ۳۰ تھے۔ اس حدیث ۱۳ میں ۴۰ ہیں اور ان کی برکات مذکورۃ الصدہ ہی ہیں۔

حدیث ۱۴۔ (حدیث ابوالنعمان سب مندرجہ بالا احادیث کے بلا متکمل حوالہ راوی ہیں) ابدال ۴۰ مرد ہیں اور برکات یہ ہیں کہ اہل زمین کی تکالیف دور ہوتی ہیں۔ سو یہ ہے وہ سرایہ احادیث جن کے

ٹائپ مقرر کر دیئے، تو کیا یہ سردار ایسے ہی نقیب تھے، جو صوفیاء کو درکار ہیں؛

اس کے بعد سیوطی صاحب نے صوفیاء کے ان مناصب کے ثبوت میں جو دو احادیث بیان فرمائیں وہ

درج ذیل ہیں :

۱۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خدا کے ۳۰۰ بندے محسوس ہیں جن کے قلوب حضرت آدم ﷺ کے قلب کی مانند ہیں۔ ۴۰ کے قلوب حضرت موسیٰ ﷺ کے قلب کی مانند ہیں۔ ۵۰ کے قلوب حضرت جبرائیل ﷺ کے قلب کی مانند ہیں۔ ۶۰ کے قلوب حضرت ابراہیم ﷺ کے قلب کی مانند ہیں۔ ۷۰ کے قلوب حضرت میکائیل ﷺ کے قلب کی مانند ہیں۔ اور ایک ایسا بندہ ہے جس کا قلب حضرت اسرافیل ﷺ کے قلب کی مانند ہے۔“

۲۔ خطیب نے بذریعہ ابو بکر ابن ابی شیبہ حدیث کا اخراج کیا کہ میں نے کافی سے سنا کہ نقباء ۳۰۰ ہیں۔ نجباء ۷۰ ہیں، ابدال ۴۰ ہیں، اختیار ۷۰، قطب ۴، اور غوث ایک ہے۔“ (دلائل السوگ، ص ۱۱)

ان دونوں احادیث کے مقابل سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں :

۱۔ اولیاء اللہ کے مناصب کی تعداد ۶۰ ہے۔ سب کے اعلیٰ منصب غوث کا ہے، جس کا دل حضرت اسرافیل ﷺ کے قلب کی مانند ہے۔

۲۔ سب سے نیچا منصب نقیب کا ہے۔ یہ کُل ۳۰۰ سیٹیں ہیں اور ان کا دل حضرت آدم ﷺ کے قلب کی مانند ہوتا ہے۔

۳۔ باقی چار مناصب کی نشستوں میں اختلاف ہے اور اسی طرح اس بات میں بھی کہ ان کے قلوب کس علیہ السلام کے قلب کی مانند ہیں۔

۴۔ انبیاء کے قلوب ملائکہ کے قلوب بہت افضل ہوتے ہیں۔ سب کم تر درجہ کا قلب نقیب یا حضرت آدم ﷺ (نفعو بذالہ من ذلک الہفوات) کا دل ہے۔ پھر اس کے اوپر حضرت موسیٰ ﷺ پھر اس سے اوپر حضرت ابراہیم ﷺ کا دل ہے۔ اس کے بعد فرشتوں کی باری آتی ہے۔ حضرت ابراہیم ﷺ سے اوپر حضرت جبرائیل ﷺ کا دل ہے۔ پھر اس کے اوپر حضرت میکائیل ﷺ کا، پھر اس سے اوپر حضرت اسرافیل ﷺ کا دل ہے، جو غوث کے قلب کی مانند ہے۔

یہ تو ایسے مناصب تھے، جن کا ثبوت ”سراپہ احادیث“ سے مہیا کر دیا گیا ہے۔ یہ احادیث خواہ کیسی

ہی مجروح اور موضوع ہوں۔ سب کچھ ان کے لئے قابل قبول اور قابل محبت ہیں۔ یہ سب کچھ کر لینے کے بعد ان کے ہاں کئی ایسے مناصب بچ جاتے ہیں جن کے لئے آپ کو کوئی موضوع حدیث بھی نہیں مل سکی اور ان کا ثبوت ان کے بزرگان کرام کے اقوال میں مثلاً :

(۱) قطب کی اقسام اور ان کے فیوض حسب ذیل ہیں :

(۲) قطب ابدال عالم کے وجود اور اس کی بقا سے

اولیاء اللہ کے اعلیٰ مناصب

تعلق رکھنے والے امور میں فیض کا واسطہ ہے۔ پیدائش، رزق، مصائب کے دور ہونے اور صحت و آرام کے حاصل ہونے کا تعلق قطب ابدال کے فیض کے ساتھ مخصوص ہے۔

اب قطب ارشاد۔ ”ہدایت و ارشاد سے تعلق امور میں وصول فیض کا ایک واسطہ ہے۔ یہاں ہدایت، نیک کاموں کی توفیق اور توبہ و غیرہ کا تعلق قطب ارشاد کے فیض کا نتیجہ ہے۔“ (معارف لدنیہ، اہم ربانی، ص ۴۳، بحوالہ دلائل السلوک، ص ۶۲)

(ج) حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہم کو قطب مدار کا معاون بنایا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے دنیا کے بقا کا سبب بنایا ہے۔ اس کی برکت کی وجہ سے بقائے عالم ہے اور فرمایا کہ اس وقت قطب مدار میں ہیں اور وہ شافعی فقہ کا نفع ہے اور ہم اس کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔ (تفسیر مظہری، ۱۵: ۶۲، بحوالہ دلائل السلوک، ص ۶۲)

ان اقتباسات سے معلوم ہوا کہ :

۱۔ اہم ربانی کا قطب ابدال اور قاضی شفاء اللہ پانی پتی کا قطب مدار ایک ہی چیز ہیں، کیونکہ ان دونوں کا فیض ایک ہی قسم کا ہے یعنی وہ عالم کے بقا کا سبب ہیں اور یہ فیوض اسی قسم کے ہیں، جیسے نجوم پرست کسی مخصوص ستارہ کے اثرات بتلایا کرتے ہیں کہ رزق، پیدائش، مصائب وغیرہ فلاں فلاں ستارہ کی تاثیر ہے۔

۲۔ قطب سے متعلق زیادہ روایات تو یہ ہیں کہ وہ چار ہوتے ہیں، لہذا ان کی اقسام بھی چار ہو جائیں تو انچھا تھا، خواہ ان کے فیوض ایک ہی جیسے ہوتے۔

علامہ سیوطی نے کافی سے جو روایت کی کہ ”نقباء ۳۰۰، نجباء ۴۰، ابدال

منصب داروں کے مساکن اور فیوض

۴۰. اخیراً ، قطب ۴ ، اور غوث ایک ہے۔ " تو اس کے آگے یہ روایت یوں چلتی ہے۔ " نقباء کا مسکن مغرب (۹) سنباء کا مصر، ابدال کا شام ہے۔ قطب زمین کے گوشوں میں ہوتے ہیں اور غوث کا مسکن مکہ ہے۔ جب مخلوق کو عوامی مصیبت آجائے، تو دعا کے لئے نقباء ہاتھ پھیلاتے ہیں، اگر قبول نہ ہو تو پھر سنباء ، پھر اخیر ، پھر قطب اگر پھر بھی دعا قبول نہ ہو، تو پھر غوث دعا کے لئے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی دعا قبول ہو جاتی ہے۔ " (اسخیر الدال سیوطی ص ۲۳ ، بحوالہ دلائل السلوک، ص ۴۳)

علامہ سیوطی کی اس روایت میں کئی باتیں قابلِ غور ہیں مثلاً :

- ۱۔ نقباء کا مسکن مغرب ہے۔ مغرب اسمائے قبلیہ سے ہے، یہ تو وضاحت ہونی چاہئے حتیٰ کہ سیوطی صاحب کے مسکن سے مغرب مراد ہے یا کوئی اور مقام؟
- ۲۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان صوفیاء نے زمین کو چھٹا، مستطیل یا مربع شکل کا تصور کر رکھا ہے۔ جس کے چار گوشے ہیں اور ہر گوشے پر ایک ایک قطب اس زمین کی بقا کے لئے ضروری ہے۔
- ۳۔ پیرانِ پیر کو غوث الاعظم کہا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ مکہ میں نہیں ہے۔ ان کا مؤلد، مسکن ، مدفن سب کچھ بغداد ہے، پھر وہ غوث اعظم کیسے بن گئے؟

۴۔ اللہ تعالیٰ ان منصب داروں کی دعا بھی براستہ معروف یا (THROUGH PROPER CHANNEL)

- ہی سنتا ہے۔ پھر وہ عام آدمیوں کی دعا کیونکر سن سکتا ہے؟ اور یہ بات قرآن کریم کے صریح خلاف ہے۔
- ۵۔ یہ تمام مراحل طے کرنے کے بعد اگر غوث کی دعا بھی قبول نہ ہو تو کیا یہ دنیا تباہ ہو جائے گی؟ غوث کی دعا کی مقبولیت کی کیا ضمانت ہے؟ افضل الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے دعا کی کہ اُمت تفرقہ کا شکار نہ ہو، تو اللہ تعالیٰ نے قبول نہیں فرمائی۔ آپ نے قبیلہ رطل اور ذکوان کے حق میں ہلاکت کی بددعا فرمائی، تو اللہ تعالیٰ نے فرما دیا لَیْسَ لَکَ مِنَ الْأَمْرِ شَیْءٌ۔ حضرت نوح علیہ السلام نے سڑے نو سو سال تبلیغ کے بعد ایک نافرمان بیٹے کے حق میں دعا کی، تو اللہ تعالیٰ نے اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ کہہ کر رد کر دی، تو یہ غوث بیچائے آخر کس باغ کی مولیٰ ہیں؟

- ۶۔ دعا بعض دفعہ قبول ہو جاتی ہے، لیکن اس کا اثر بہت مدت بعد ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ کی دعا قبول ہو گئی مگر اڑ چالیس سال بعد ہوا، اور چالیس سال بعد نبی اسرائیل کو حکومت ملی۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا قبول ہو گئی مگر تیرہ سال بعد بیٹا پیدا ہوا۔ اب نقیبوں کو یہ کیسے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہماری

دُعا قبول نہیں ہوئی اب فوراً انجیبوں کو دُعا کرنا چاہئے۔ بہر حال ان اولیاء کے پاس دُعا قبول ہونے یا نہ ہونے کو معلوم کرنے کے لئے انتظار کی مدت کیا ہے؟

عام اہل تصوف تو قطب کو سب سے بڑا اور آخری منصب قرار دیتے ہیں۔ اور چونکہ غوث ایک ہی ہوتا ہے۔ لہذا یہ مناصب ختم ہو بھی جانے چاہئیں، مگر بلند پایہ عارفین کے ہاں اس کے آگے بھی کئی مناصب ہیں اور وہ ہیں، قیوم، فرد، قطب وحدت اور صدیق۔

قیوم کے متعلق اہم ربانی مجدد الف ثانی فرماتے ہیں:

”وہ عارف، جو قیوم کے منصب پر فائز ہو، وزیر کا حکم رکھتا ہے کہ مخلوق کے اہم امور کا تعلق اسی سے ہے، گو انعام تو بادشاہ کی طرف سے ہوتے ہیں، مگر وزیر کی وساطت سے ملتے ہیں... معلوم ہوا کہ قیوم انسان کامل ہوتا ہے اور کل احکام ظاہری اور باطنی قیوم کی ذات سے وابستہ ہیں۔ میں مہم حدیث سے بھی تبادر ہوتا ہے ”قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللَّهُ مُعْطٍ“ یعنی میں تو تقسیم کنندہ ہوں۔ دینے والا اللہ ہے۔“ (مکتوبات، ۲: ۲، بحوالہ دلائل السلوک، ص ۴۴۲) امام ربانی کے اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ افضل الانبیاء ان کے نزدیک ان کے مقرر کردہ منصب قیومیت پر فائز تھے۔ دیکھا آپنے حضور ﷺ کو کس گھٹیا مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ پھر مولانا اشعار خان فرماتے ہیں:

”قیوم لا ولی الا رسول کا نائب ہوتا ہے وہ کل انعامات کا سبب ہوتا ہے۔ جب کہ قطب ابدال اور قطب ارشاد خاص ایک ایک انعام کا ذریعہ ہیں۔“

”فرد اور قطب وحدت کا تعلق براہ راست ذاتِ باری سے ہوتا ہے (یعنی اس میں رسول ﷺ کا واسطہ نہیں

فرد اور قطب وحدت

ہوتا۔ مؤلف) اس لئے ان کا مرتبہ غوث اور قیوم سے بہت بلند ہوتا ہے۔“ (دلائل السلوک، ص ۴۴)

فرد اور قطب وحدت کے ثبوت میں مولانا اشعار خان نے ایک صحیح حدیث سے جس طرح استدلال فرمایا ہے اب وہ ملاحظہ فرماتے، لکھتے ہیں:

”فرد اور قطب وحدت کا مفہوم بعینہ وہ حدیث ہے، جو رسول اللہ ﷺ سے بطور دُعا غزوہ بدر

میں زبان پرائی :

اللَّهُمَّ إِنَّ تَهْلِكَ هَذِهِ الْعَصَابَةُ الہی ! اگر آپ نے اس جماعت اصحاب کرام کو بھوک کر دیا
لَا تَعْبُدُ فِي الْأَرْضِ أَبَدًا تو پھر زمین پر کبھی بھی آپ کی عبادت دکی جائے گی۔
معرفتِ توحید، فیضانِ کلام ہونا اور جلد ہونا قطبِ وحدت اور افراد کی خصوصیات میں سے
ہے اور معرفتِ ذاتِ باری تعالیٰ اس سے وابستہ ہوتی ہے۔ “ (دلائل السلوک، ص ۸۳)

دیکھا آپ نے دعوے اور دلیل میں کتنا زبردست تعلق ہے۔ اب اگر ایسی نصِ قطعی کے باوجود بھی
اولیاء اللہ کے ان مناصب یعنی فرد اور قطبِ وحدت پر ایمان نہ لائیں، تو اس میں مولانا موصوف کا کیا قصور
ہے؟ پھر مولانا نے تشریح میں توحید کے ساتھ معرفت اور فیضانِ کلام اور جلد ہونا اور ان منصبوں
کا ذاتِ باری تعالیٰ سے وابستہ ہونا کے الفاظ شامل کر کے سب کچھ اس حدیث سے ثابت کر دکھایا
ہے۔

غوثِ قطب، ابدال کا ثبوت پیرانِ پیر کی زبان سے

”اس کے بعد آپ
نے فرمایا کہ میں شیر

برہنہ اور چڑھی ہوئی گمان ہوں، میرا تیر نشانہ پر لگنے والا، میرا نیزہ بے خطا اور میرا گھوڑا بے زین ہے
میں عشقِ خداوندی کی آگ، حال و احوال کا سلب کرنے والا، دریائے بیکران، رہنمائے وقت اور فیروز
سے باتیں کرنے والا ہوں۔ ایک دفعہ آپ نے کیفیتِ حال میں فرمایا کہ میں ہوں محفوظ، میں ہوں ملحوظ، اے
روزہ دارو، اے شبِ بیدارو، اے پہاڑوں پر بیٹھنے والو، خدا کرے تمہارے پہاڑ بیٹھ جائیں، اور
اے خانقاہ نشینو! خدا کرے تمہاری خانقاہیں زمین دوز ہو جائیں، حکمِ خدا کے سامنے آؤ۔ میرا حکم خدا کی طرف
سے ہے۔ اے رہبرانِ منزل، اے ابدال، اے اقطاب و اوتاد، اے پیو انو، اور اے نوجوانو! آؤ
اور دریائے بیکراں سے فیض حاصل کر لو۔ عزت پروردگار کی قسم! تمام نیک بخت اور بد بخت میرے سامنے
پیش کئے گئے اور میری نظر لوحِ محفوظ میں جمی ہوئی ہے۔ میں دریائے علم و مشاہدہ الہی کا غوطہ خور ہوں میں
تم سب پر اللہ کی رحمت، رسول کا نائب اور اس کا دنیا میں وارث ہوں۔ پھر فرمایا کہ انسانوں کے بھی پیر ہوتے
ہیں۔ جنات اور فرشتوں کے بھی، لیکن میں تمام پیروں کا پیر ہوں۔“ (اخبار الاخیار، مصنفہ عبدالحی محمد دہلوی

یہ ہیں پرانے پیر عبد القادر جیلانی، اس قد جلاہ جلال کے مالک، جو جنوں انسانوں اور حتیٰ کہ فرشتوں اور جنوں کے بھی پیر ہیں۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ آپ کی وفات کے چند ہی سال بعد عبد اللہ بن یونس بن احمد وزیر جلال الدین ابوالمظفر نے آپ کے مکان کو مسد کر کے آپ کی اولاد کو در بدر کر دیا۔ حتیٰ کہ آپ کی قبر کھو ڈالی اور آپ کی ہڈیاں دریا (دجلہ) کی لہروں میں پھینک دیں اور کہا کہ یہ وقف کی زمین ہے۔ اس میں کسی کا دفن کیا جانا حلال نہیں ہے، تو آپ اس کا کچھ بگاڑ بھی نہ سکے۔ (بحوالہ انجم الظاہر، ص ۱۳۲، ۱۳۳)

اس تاریخی حقیقت کا اعتراف ضیاء اللہ صاحب قادری نے اپنی کتاب سیرۃ غوث الثقلین میں ص ۲۳۱ ان الفاظ میں کیا ہے :

”ابن یونس نے سیدنا غوث اعظم کی اولاد کو طرح طرح کی اذیت اور تکلیف پہنچائی، یہاں تک کہ اُس نے بغداد شہر سے بھی جلا وطن کر دیا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کے خاندان کو تباہ و برباد کر دیا۔ وَأَقْبَلَ مَوْتَهُ اور اس کی بُری طرح موت ہوئی (قلائد البواہر، ص ۵۶) حضور غوث پاک کا ارشاد ہے :

وَنَحْنُ لِمَنْ قَدْ سَاعَنَا سَمَقَاتِلًا فَمَنْ لَمْ يُصَدِّقْ فَلْيَجِرِبْ وَيَعْتَدِبْ
یعنی جو کوئی ہمیں اذیت پہنچائے ہم اس کے لئے ستم قاتل ہیں۔ جس کو یقین نہ ہو، وہ اذیت پہنچا کر تجربہ کر لے۔“ (سیرۃ غوث الثقلین، ص ۱۳۲)

اس اقتباس سے درج ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں :

۱۔ ابن یونس کا آپ کی اولاد کو جلا وطن کرنے کا واقعہ درست ہے اور اس کی وجہ صاحب انجم الظاہر نے بیان کر دی ہے۔

۲۔ جلا وطنی کی پاداش میں ابن یونس کے خاندان کی تباہی صاحب غوث الثقلین کا اپنا خیال ہے جس کا کوئی تاریخی ثبوت انہوں نے پیش نہیں کیا نہ ہی جلا وطنی کی وجہ بیان فرمائی ہے۔

۳۔ عبد القادر جیلانیؒ نے اذیت دینے والے کے لئے انتقام کا جو خطرناک نقشہ اپنے شعر میں بیان فرمایا ہے ہمیں افسوس ہے کہ یہ بات رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے بالکل مخالف اور متضاد ہے۔

جس طرح سیاسی نظام
میں بڑے افسر کی طرف

ولایت اور اس کے مناصب کا عزل و نصب

کے کسی چھوٹے افسر کی تقرری ہوتی ہے اور نااہل ہونے پر اسے معزول کر دیا جاتا ہے۔ ولایت کے

سیاسی نظام میں بھی بالکل یہی صورت حال ہے۔ درج ذیل واقعہ سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے۔
 ”ایک واقعہ ہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ سے آپ کا ایک مُردہ کچھ بد اعتقاد ہوا اور اس غلط فہمی میں
 پڑا کہ اب میں بھی کسی مقام پر فائز ہو چکا ہوں۔ حضرت جنیدؒ سے کچھ اعراض کر لیا۔ چند روز بعد اس غرض
 سے آیا کہ تجربہ کرے اور دیکھے کہ میرا خیال جنیدؒ پر منکشف ہوا یا نہیں؟ اور حضرت جنیدؒ اپنے نورِ فرست سے
 اس کی حالت ملاحظہ فرما رہے تھے، جب وہ مرید آیا آپ سے کچھ سوال کرنے لگا۔ آپ نے فرمایا کیا جواب
 چاہتا ہے۔ الفاظ و عبارات میں یا حقیقت معنی میں؟ مرید نے عرض کی دونوں طرح۔ آپ نے فرمایا:
 عبارتی جواب تو یہ ہے کہ اگر میرا تجربہ کرنے کی بجائے اپنا تجربہ کر لیتا، تو میرے تجربہ کا محتاج نہ ہوتا اور
 اس جگہ تجربہ کی غرض سے نہ آتا۔ اور معنوی جواب یہ ہے کہ میں نے تجھے منصبِ ولایت سے معزول کیا۔ یہ
 فرمانا تھا کہ مرید کا چہرہ سیاہ ہو گیا، پیچھے لگا اور لپکارا کہ حضورِ راحت یقین میرے دل سے جاتی رہی۔
 توبہ کرنے لگا اور پہلی بوجھ اس سے ہاتھ اٹھایا۔ اس وقت حضرت جنیدؒ نے فرمایا، تو نہیں جانتا کہ اللہ کے
 ولی والیان اسرار ہوتے ہیں۔ تجھ میں ان کی ضرب کی برداشت نہیں۔ پھر ایک مچھونک اس پر ماری۔ وہ
 پھر اپنے درجہ پر متمکن ہوا۔ اس وقت سے خاصانِ بارگاہ کے معاملات میں دخل دینے سے بھی توبہ کی اور
 پختہ عہد کر لیا۔“ (کلام المرغوب اردو ترجمہ کشف المحجوب مصنفہ علی جویری صاحب، ص ۲۶۰، ۲۶۱)

اقتباس بالا سے درج ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

- ۱۔ آپ خاصانِ بارگاہ میں سے تھے (گو صحیح منصب متعین نہیں ہو سکتا کہ کون سے منصب پر پہنچ کر
 ولی خاصانِ بارگاہ بنتے ہیں تاہم) وہ اپنے سے چھوٹے ولی کو معزول کر سکتے تھے۔
- ۲۔ اپنے سے بڑے مرتبہ والے کے متعلق دل میں شک لانے سے بھی اتنی سزا مل سکتی ہے۔
- ۳۔ ولی اللہ واقعہ اسرار نہیں بلکہ والیان اسرار ہوتے ہیں، جبکہ صحابہؓ کو اور بعض دفعہ خود حضور اکرم
 ﷺ کو بھی ایسے باطنی امور کا پتہ نہ چلتا تھا۔
- ۴۔ ان کا تصرف و اختیار اور ان کی مارتنی شدید ہوتی ہے کہ ان سے کمتر درجہ کے ولی بھی وہ ضرب
 برداشت نہیں کر سکتے۔

علامہ عبدالقادر الاربلی مصنف تفریح النظار ص ۳۹-۴۰،
 مطبوعہ مصر بحوالہ سیرۃ غوث الثقلین ص ۲۲۲ زیر عنوان قائم قلا

قائم ولایت کون؟

فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی بندے کو ولی بنانا چاہتا ہے، تو حکم فرماتا ہے کہ اے حضرت محمد ﷺ کی بارگاہ میں پیش کرو۔ (کے حکم فرماتا ہے؛ علامہ اربلی غالباً یہ بات بتلانا مجھول گئے مؤلف، جب آپ کی بارگاہ میں پیش کیا جاتا ہے، تو آپ فرماتے ہیں کہ اے میرے بیٹے عبدالقادر جیلانی کے پاس لے جاؤ، تاکہ وہ اس کی اہلیت دیکھیں اور یہ بھی دیکھیں کہ منصب ولایت کا مستحق ہے یا نہیں؟ چنانچہ وہ دربارِ غوثِ اعظم میں پیش کیا جاتا ہے۔ آپ اس کو اگر منصب ولایت کے قابل دیکھتے ہیں، تو اس کا نام دفترِ محمدیہ ﷺ میں لکھ کر مہر لگاتے ہیں۔ پھر اے حضور اکرم ﷺ کی بارگاہ میں پیش کیا جاتا ہے اور غوثِ اعظم کی تحریر کے مطابق نبی پاک ﷺ کا فرمان لکھا جاتا ہے۔ پس اس کو ولایت کی خلعت سے سرفراز کیا جاتا ہے، جو غوثِ پاک کے دستِ مبارک سے دی جاتی ہے۔ جب وہ اے پہن لیتا ہے، تو علمِ غیب و شہادت (یعنی آدمیوں اور رجالِ الغیب) میں مقبول و تسلیم ہو جاتا ہے۔ پس اس عہدہ پر حضرت غوثِ پاک قیامت تک فائز رہیں گے اور اس مقام میں کوئی ولی آپ کے مائل اور شریک نہیں ہے ہر زمان اور آن میں قطب، غوث اور تمام اولیاء اللہ آپ کی ذاتِ منبعِ برکات سے مستفیض ہونے لیتے ہیں۔“ (تفزیح الغلط، ص ۳۸، ۳۹)

اب دیکھئے جنسید بغدادی (د ۱۲۹۸) بھی اسی مرتبہ عزل و نصب پر فائز تھے اور یہ سلسلہ ہر دور کے جدِ اعلیٰ ہیں، لہذا علامہ اربلی صاحب غالباً انہیں معاف کر ہی دیں گے کیونکہ یہ غوثِ اعظم سے بہت پہلے کے ہیں۔ اسی طرح ایک اور صاحب ابوسعید حشتی بھی نظر آتے ہیں۔ جو اسی عزل و نصب کے منصب پر فائز ہیں (تفصیل آگے آئے گی) یہ ایک تو حشتی ہیں، دوسرے پیرانِ پیر کے تقریباً ہم عصر ہیں۔ اصل معاملہ تو بابا فرید الدین گنج شکر کا ہے، جو اسی سلسلہ قادریہ میں فنمک اور تیسری پشت میں آپ کے مرید بھی ہیں۔ انہوں نے آخریہ عزل و نصب کے اختیارات (جو ناقیامت عبدالقادر جیلانی کے لئے مخصوص تھے) کیوں غوثِ پاک سے چھین کر ان پر خود قبضہ کر لیا۔؟ (واقعہ کی تفصیل آگے آئے گی۔ ملاحظہ حریب زانی)

اب عبدالقادر جیلانیؒ نے ان اختیاراتِ عزل و نصب کو جس طرح استعمال کیا وہ بھی مروج ذیل

پیرانِ پیر کا ایک چور کو ابدال بنا دینا

واقعات سے ملاحظہ فرمایا جائے،

”شاہ ابوالعالیؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ شیخ علاؤدفرماتے تھے کہ ہمارے پیر چہاگیر (عبدالقادر جیلانی)

کے در دولت پتر تمام اہل دولت و ثروت بھی آتے تھے۔ ایک چور نے بجا بڑے مالدار ہوں گے اور ارادہ کیا کہ گھر میں گھس جاؤں اور دلی مُراد پاؤں۔ وہ گھر میں داخل ہوا کچھ بھی نہ پایا اور اندھا ہو گیا۔ آنجناب پر اس سیاہ بے نور کا حال روشن تھا۔ خیال فرمایا کہ یہ بات مزوت سے بعید ہے کہ ہمارے گھر میں کامیابی کی خواہش سے آکر ناگام چلا جائے۔ آپ ابھی اسی خیال میں تھے کہ حضرت خضر ؑ آئے اور عرض کی کہ اے مالی ملک کے والی ! ایک ابدال اس وقت قضائے الہی سے فوت ہو گیا ہے۔ جس کے لئے آپ حکم دیں اُس کی جگہ مقرر کیا جائے۔ آپ نے فرمایا ایک کستہ دل ہمارے گھر میں پڑ لے۔ جاؤ اس کو لے آؤ تاکہ اسے بلند مرتبہ پر فائز کر دیں اور حضرت خضر ؑ گئے اور اس شخص کو آپ کے حضور میں پیش کیا گیا۔ جس کو آپ نے ایک ہی نگاہ لطف سے ابدال بنا دیا “ (تذکرہ قدیریہ، ص ۱۹، ۲۰، خزینۃ الاولیاء قدوسی، ج ۱، ص ۹۷، بحوالہ سیرتِ نبوتِ اشعین، ص ۱۲۸)

اب دیکھئے اس اقتباس سے درج ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے :

- ۱۔ علامہ اربلی کے بیان کردہ دستور ولایت کو توڑنے والے خود غوثِ اعظم ہیں۔ اس چور کو نہ حضورِ اکرم ؐ کے سامنے پیش کیا گیا نہ اُدھر سے آرڈر ہوا کہ اسے عبدالقادر جیلانی کے پاس لے جاؤ کہ وہ اس کی ولایت کی اہلیت کو ٹیسٹ کریں، تو پھر غوثِ پاک نے ایک چور کو ابدال بنا کر دھاندلی نہیں کی ؟
- ۲۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خضر ؑ کی ڈیوٹی یہ ہے کہ وہ مرنے والے ابدالوں کی اطلاع غوثِ اعظم کو دیا کریں اور نئے بننے والے ابدالوں کو غوثِ پاک کی بارگاہ میں حاضر کیا کریں۔
- ۳۔ جب چور گھر میں پہلے ہی موجود تھا، غوثِ پاک بھی گھر پر ہی تھے، تو حضرت خضر نے کس مقام سے اس چور کو آپ کے پاس حاضر کیا ؟

اب دیکھئے اسی واقعہ کو باختلاف روایت صاحبِ تفریحِ المخطوط (۱۲) نے یوں بیان فرمایا ہے جو کچھ اس طرح ہے :

”غوثِ اعظم مدینہ منورہ سے حاضری دے کر ننگے پاؤں بغداد کی طرف آ رہے تھے۔ راستہ میں ایک چور کھڑا کسی مسافر کا انتظار کر رہا تھا کہ اُسے لوٹ لے، آپ جب اس کے قریب پہنچے، تو پوچھا تم کون ہو؟ اس نے جواب دیا: بدو ہوں۔ آپ نے کشف کے ذیلے اس کی بدکرداری کو نکھا ہوا دیکھا۔ اتنے میں اُس چور کے دل میں بھی خیال آیا کہ شاید یہ غوثِ اعظم ہیں۔ آپ کو چور کے دل میں یہ خیال پیدا ہونے کا علم ہو گیا۔

اور فرمایا میں عبدالقادر ہوں، چوریہ بات سنتے ہی آپ کے قدموں پر گر پڑا اور اس کی زبان پر 'سَيِّدِي عَبْدُ الْقَادِرُ شَيْئًا لَّهِ' جاری ہو گیا۔ آپ کو اس کی حالت پر رحم آگیا اور اس کی اصلاح کے لئے بارگاہ الہی میں منتوجہ ہوئے تو غیب سے ندا آئی: "اے غوثِ اعظم اس چور کو سیدھا رستہ دکھا دو اور ہدایت کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے اُسے قطبِ بنا دو۔ چنانچہ آپ کی ایک نگاہ فیضِ رساں سے وہ قطب کے درجے پر فائز ہو گیا۔" (سیرۃ غوث، ص ۴۸۰ بحوالہ تفریح السامعین ص ۲۲)

۱۔ اب دیکھئے کہ پہلی روایت کے مطابق چور آپ کے گھر کو لوٹنے آیا، لیکن اس روایت میں وہ راہ میں اسی غرض سے کھڑا تھا۔

۲۔ پہلی روایت میں آپ نے حضور اکرم ﷺ کے واسطے کو تو ختم کیا تھا مگر حضرت خضر علیہ السلام سے کچھ کام لیا تھا مگر اس روایت میں اُن کی بھی ضرورت پیش نہیں آئی۔ حالانکہ چور دونوں واقعات میں پاس موجود تھا۔

۳۔ پہلی روایت میں آپ نے چور کو ابدال بنایا تھا اس روایت کے مطابق قطب بنا دیا اور اس کی سابقہ اہمیت کو ہر دو بار ٹیسٹ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

۴۔ پہلی روایت کے مطابق آپ کو اس لئے رحم آیا تھا کہ گھر سے خالی واپس نہ جائے اور دوسری روایت کے مطابق اس کے شَيْئًا لَّهِ کے وظیفہ سے آپ کا دل بھر آیا۔ گویا آپ کی زندگی میں ہی اس وظیفہ کا رواج ہو چکا تھا جسے آپ بہت پسند فرماتے تھے۔

اب یہ واقعہ ایک ہی تھا۔ جس میں تذکرہ نگاروں نے اتنا اختلاف پیدا کر دیا یا واقعات ہی دو الگ الگ ہیں؛ فیصلہ تو تذکرہ نگار ہی کریں گے۔ بظاہر یہ واقعہ ایک ہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ چوروں کو قطب یا ابدال بنا دیا کرتے تھے۔

ضیاء اللہ قادری صاحب اپنی کتاب سیرۃ غوث الثقلین کے صفحہ ۸۵ پر رقمطراز ہیں:

پیرانِ پیر کا ایک کافر کو ابدال بنا دینا

"مک شہم میں ایک ابدال انتقال کر گئے، تو آپ سرزمینِ عراق سے فوراً وہاں تشریف فرما ہوئے بعد ازیں حضرت خضر علیہ السلام اور دیگر ابدال بھی تشریف لے آئے سب حضرات نے ان کا جنازہ پڑھا بعد از جنازہ حضرت غوث پاک نے حضرت خضر علیہ السلام سے کہا کہ قسطنطنیہ میں فلاں کافر کو یہاں لے آئیں۔ حضرت خضر نے فی الفور اس کو حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے اس کافر کو کلمہ پڑھا کر مسلمان

کیا۔ اُس کی مونچھوں کو پست کیا اور اپنی ایک ہی نظر کرم سے اُسے مقام ابدال پر فائز فرما دیا اور سب ابدالوں سے فرمایا کہ انتقال کرنے والے ابدال کے مقام پر اسے قَرَر کرتا ہوں، جس پر سب ابدالوں نے تسلیمِ خم کر دیا۔

دیبا۔ ”دستورِ مسلم الشبوت، ص ۴۶۶، سفینۃ الاولیاء، ص ۶۵“

اس اقتباس سے درج ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے :

۱۔ آپ اکثر چہرہ اور کافرِ قہم کے لوگوں کو ہی ابدال بنایا کرتے تھے۔

۲۔ علامہ اربلی کے بیان کردہ دستورِ ولایت کی خلاف ورزی کیا کرتے تھے۔

۳۔ حضرت خضرؑ اس معاملہ میں آپ کے کارندے کی حیثیت رکھتے تھے کہ نئے بننے والے ابدال کو آپ کے حضور پیش کیا کریں۔

اللہ تعالیٰ نے تو حضرت موسیٰؑ جیسے اُولو العزم پیغمبر کو اُن کی خدمت میں بھیجا تھا، لیکن ان تذکرہ نگاروں نے مزید دھائی ہزار سال تک انہیں زندہ رکھ کر اُن کو غوثِ پاک کی چاکری پر مامور کر دیا ہے۔

۴۔ کسی بزرگ کا ایک وقت کئی مقامات پر بعدِ عنصری موجود ہونا اور موجود ہو جانا کو کتاب و سنت کے صریح خلاف ہے تاہم اس طبقہ میں یہ مسئلہ ”مُجْمَعٌ عَلَیْہِ“ کی حیثیت رکھتا ہے۔

”شیخ نور اللہ لطائف القادریہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ

معین الدین چشتی جمیری کو ہندوستان کس نے بھیجا؟

معین الدین نے غوثِ اعظم سے عراق کا علاقہ مانگا، تو آپ نے ارشاد فرمایا : ”عراق میں نے شہاب الدین سہروردی کو عطا کر دیا ہے اور تم کو ہندوستان کا علاقہ عطا کرتا ہوں۔“ (تفہیم السخا، ص ۶۱۔ بحوالہ سیرۃ غوثِ اشقین، ص ۲۳) اب دوسری روایت ملاحظہ فرمائیے :

”مشہور ہے جب خواجہ معین الدین صاحب مدینہ منورہ کی زیارت کے لئے گئے، تو وہاں آپ کو ہندوستان کے کفار میں تبلیغِ اسلام کا حکم ملا۔ رسول اللہ ﷺ خواب میں تشریف لائے اور ان سے فرمایا کہ ”خدا نے ہندوستان کا ملک تیرے سپرد کر دیا ہے، وہاں جا اور جمہور میں سکونت اختیار کر۔ خدا کی مدد سے دینِ اسلام تیرے اور تیرے ارادتمندوں کے تقوے سے اس سرزمین میں پھیل جائے گا۔“ (روحِ تصوف، ص ۱۰۰۔

بحوالہ دعوتِ سلام، پروفیسر آغا، ترجمہ عنایت اللہ، ص ۲۷۸، مطبوعہ محکمہ اوقاف پنجاب، لاہور)

اس روایت کی تائید شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب اپنی تصنیف تاریخ مشائخِ مچشت میں ان الفاظ میں کرتے ہیں :

”آپ دس محرم کو اجیر رونق افروز ہوئے۔ وہاں سب سے پہلے تید میر جن بیعت ہوئے اس کے بعد ہزار با خلقت داخل سلسلہ ہوئی۔ حضور اکرم ﷺ کے حکم کی بناء پر ہندوستان تشریف لائے۔“
(تاریخ مشائخِ مچشت، ص ۱۶۸)

اب تیسری روایت ملاحظہ فرماتے۔ یہی شیخ الحدیث اسی کتاب کے صفحہ ۱۶۷ پر پہلے یوں لکھ چکے ہیں کہ :

”حضرت شیخ عثمان ہارونی، ہندوستان کی ولایت پر آپ کو مامور کر کے حج کو تشریف لے گئے۔“
اب مینوں متضاد روایات سے مندرجہ ذیل باتیں مستفاد ہوتی ہیں :

۱۔ خواجہ صاحب کو ہندوستان کس نے بھیجا؟ یہ فیصلہ آپ خود کر لیجئے۔ البتہ یہ بات ضرور مشککتی ہے کہ آپ کے پیرومرشد عثمان ہارونی ہندوستان جانے کا آرڈر دے چکے تھے، تو آپ نے غوثِ اعظم سے عراق کا علاقہ کیوں طلب کیا؟

۲۔ پہلی روایت غوثِ اعظم کو قاسم ولایت تسلیم کرتی ہے، لیکن باقی دونوں روایات اربلی صاحب کے بیان کردہ دستور ولایت پر خطِ نسخ پھیر دیتی ہیں کہ آپ قیامت تک مجھے لئے قاسم ولایت ہیں۔

پھر بعد میں آنے والوں نے بھی اس دستور ولایت کی چنداں پروا نہ کی، جس کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں کسی کو ولایت اسمِ اعظم کے طفیل ملتی رہی، کسی کو شیخ کے حکم سے اور کسی کو حکمِ الہی براہِ راست، درمیان سے پیرانِ پیر کا واسطہ بالکل ساقط کر لیا جاتا رہا۔

اب ایک تیسرے ولی اللہ
ابوسعید ہشتی صابری گنگوہی

لمحہ بھر میں ضربِ شدید کے ذریعہ ولایت کی عنایت

کامِ شہنشاہوں کو ولی بنانے اور اس منصب پر فائز کرنے کا طریقہ بھی ملاحظہ فرماتے : ان کا طریقہ واردات بالکل جداگانہ ہے۔ حسبِ حدیقتہ الاولیاء رقمطراز ہیں کہ :

”سواطع الانوار میں لکھا ہے کہ ایک شخص منحہ حال ان (ابوسعید ہشتی صابری گنگوہی، م ۱۰۴۰ ھ) کے پاؤں آیا اور عرض کی میں طالبِ خدا ہوں مگر طاقتِ محنت، عبادت و ریاضت کی مجھ میں نہیں ہے۔“

چاہتا ہوں کہ آپ کی نظریں اُسے مقصودِ دل حاصل کر لیں۔ حضرت کے ہاتھ میں اس وقت عصا تھا۔ فرمایا کہ ہاں ہم اس عصا کی تین ضربیں طالب کو خدا تک پہنچا دیتے ہیں۔ یہ کہہ کر ایک ضرب عصا کی اس کے سر پر لگائی، عالمِ ملکوت اس پر کھل گیا، دوسری ضرب میں عالمِ جبروت، تیسری ضرب میں عالمِ شہود اس پر منکشف ہو گیا۔ تین دن تک بے ہوش رہا۔ جب ہوش میں آیا، صدقِ دل سے مرید ہو گیا۔ “مدنیۃ الاولیاء، ص ۳۰

ہمارے خیال میں تو وہ کوئی بڑا ہی سخت جان مرید تھا۔ جس کو سر میں تین عصا کھانے سے صرف عالمِ ملکوت، جبروت اور شہود ہی روشن ہوئے، اس پر تو چودہ طبق روشن ہو جانے چاہئیں تھے۔ البتہ اس بات کی سمجھ نہیں آتی کہ جب اس پر تینوں عالم منکشف ہو گئے اور وہ خدا تک بھی پہنچ چکا، تو پھر بعد میں مرید کس غرض سے ہوا۔

اب پیرانِ پیر کے پوتے مرید بابا فرید الدین گنج شکر
عزل و نصب کا طریقہ ملاحظہ فرمائے :

احکامِ ولایت کو چاک کر ڈالنا

”حضرت فرید الدین گنج شکر کا دستِ نوا تھا کہ جس خلیفہ کو کسی ملک کو روانہ کرتے، فرمان اپنے دستخط سے لکھ کر فرماتے کہ خواجہ جمال الدین ہانسی سے جا کر مہر کر لو۔ اس رسم کے بعد جب علاؤ الدین علی احمد صابری ہانسی پہنچے، چونکہ یہ خواجہ فرید الدین گنج شکر کے بھانجے، داماد اور ولایت میں سب سے بڑھ کر تھے، ان کے استقبال کے لئے خواجہ جمال الدین ہانسی سے دو میل باہر آئے۔ انہوں نے ان کی تحویم کی مگر جندول سے پیچھے نہ اترے اور خواجہ جمال الدین ہانسی کی سپاہ کے ساتھ رہے اور انہیں مسجد میں لے جا کر اتار لیا۔ اس وقت تھا۔ خواجہ جمال الدین نے انہیں مسجد میں اہم بھی کیا۔ نماز کے بعد علاؤ الدین نے خواجہ جمال الدین سے فرمان پر مہر کرنے کی درخواست کی۔ انہوں نے کہا اب شام کا وقت ہے کل صبح کر دوں گا۔ یہ بات سنتے ہی علاؤ الدین نے داہنے ہاتھ کی بڑی انگلی کو پھونکا۔ اس پھونک سے انگلی شمع کی مانند روشن ہو گئی۔ فرمایا: ”اب روشنی ہو گئی ہے۔ فرمان پڑھ کر مہر کر دو۔“ یہ بات سن کر خواجہ جمال نے فرمان پھاڑ کر کہا کہ ”دلی بیچارہ تیری ایسی آتشیں دم ولایت بہانے کی قوت نہیں رکھتی۔“ اس بات پر علاؤ الدین کمال ناراض ہوئے اور فرمایا: ”تو نے میرے فرمان کو پھاڑ ڈالا، میں نے تیری ولایت کو پھاڑ ڈالا۔“ جمال الدین نے کہا ”اول سے یا آخر سے؟“ کہا ”آخر سے۔“

”یہ بات کہہ کر وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ خواجہ فرید کی خدمت میں آکر مکمل حال بیان کیا۔ انہوں نے کہا ”پارہ کردہ جمال را فرید نتوان دوخت“ یعنی جمال کے پھاڑے ہوئے فرید سی نہیں سکتا۔“ (حقیقۃ الاولیاء، ص ۷۹)

اب دیکھئے اس عزل و نصب کے تنازعہ میں تین فریق ہیں۔ (۱) فرید الدین آرڈر دینے والے۔ (۲) جمال الدین بانسوی اور (۳) علاؤ الدین صاحب، مہر لگوانے والے۔ فرید الدین صاحب، علاؤ الدین صاحب کو مہر لگوانے بھیجتے ہیں، تو علاؤ الدین شام کے بعد انگلی روشن کر کے اصرار کرتے ہیں کہ ابھی مہر کر دو۔ جمال الدین صاحب اس بیجا تقاضا پر برا فروختہ ہو کر آرڈر ہی پھاڑ دیتے ہیں، تو اب مہر لگوانے والے علاؤ الدین اگرچہ غرض مند ہیں تاہم فرید الدین فرمان کنندہ کے بھانجا ہونے کی بنا پر جمال الدین مہر کنندہ کی ولایت ہی پھاڑ دیتے ہیں، لیکن اس کی ولایت کو آخر سے پھاڑنے میں، اول بچار ہوتا ہے۔ یہ کارنامہ سرانجام دے کر یہ علاؤ الدین حبس خانہ صاحب اپنے ماموں بابا فرید الدین، فرمان کنندہ کے پاس پہنچے مگر یہ فرمان کنندہ بھی معذوری کا اظہار کرتے ہیں کہ جس فرمان کو جمال الدین نے پھاڑ دیا اسے میں سی نہیں سکتا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ علاؤ الدین علی احمد صابری ولی تھے یا نہیں؟ اور انہوں نے جو جمال الدین کی ولایت کو آخر سے پھاڑ ڈالا تھا، اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ وہ ولی رہے یا نہیں؟

پھر یہ بھی غور فرمائیے کہ بابا فرید الدین یہ خیال نہیں فرماتے کہ عزل و نصب کا یہ مقام تو اب قیامت تک اُن کے دادا پیر یعنی پیران سیکو محال ہے۔ آپ خواہ مخواہ ان کا یہ منصب اور حق غضب فرما رہے ہیں اور علامہ اربلی کے بیان کردہ دستور کی بھی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔

اب اس باطنی سیاسی نظام کی تفصیل جناب عبدالعزیز قادری مصنف ”سرچشمہ حیات“ کی زبان

دور نبوی کا باطنی نظام

سے سینئے۔ ساتھ ساتھ کتابوں کے دیئے گئے حوالہ جات بھی ملاحظہ فرماتے جائیے :

”اسلام سے پہلے اس جہان کا اندونی نظام فرشتوں اور اولیائے جنات کے سپرد تھا۔ آنحضرت نے انسانوں کو بھی اس کا باقاعدہ حصہ دار بنایا اور پانچ سال قبل از ہجرت پندرہ ممالک کا انتظام حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سپرد فرمایا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور دیگر کئی صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی اس نظام میں شمول

کیا۔“ (حقیقت گلزار صابری، صفحہ درج نہیں، بحوالہ سرچشمہ حیات، ص ۶۶)

دیکھ لیا آپ نے کس قدر مستند، مدلل اور بصیرت افروز بیان ہے گلزار صابری صاحب کا۔ اس کی کس کس بات پر تبصرہ کیا جائے، نشان زدہ نکات خود دیکھ لیجئے۔

باطنی نظام کا ثبوت قرآن سے

پھر قادری صاحب اس باطنی نظام کا ثبوت قرآن مجید سے یوں پیش فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزُّبُورِ مِنْ بَعْدِ
الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرْثُهَا عِبَادِيَ
الصَّالِحُونَ . إِنَّ فِي ذَلِكَ
لَبَلَّغٍ لِقَوْمٍ عَابِدِينَ

ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا کہ بے شک
زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے، سو
میرے اس فرمان میں عبادت گزاروں کے واسطے
بشارت ہے۔

بلغی کا ترجمہ بشارت کرنے کی مصلحت قادری صاحب ہی سمجھتے ہیں۔ پھر اس آیت کی تشریح فرماتے ہیں۔ زمین کی اس وراثت سے مراد سلطنت کا ملکہ اور حکومت باطن ہے اس کے حاکم (یعنی قطب ابدال وغیرہ) چاہیں تو دنیا کے بادشاہوں کو بادشاہت سے معزول کر دیں۔ رہی حکومت ناقصہ (یعنی ظاہری حکومت) تو وہ مشرکوں، کافروں، بے دینوں، سبکے لئے عام ہے۔ (سروری کلاچوی)

پھر اس بیان مذکورہ پر قادری صاحب خود ہی ایک اشکال پیش کرتے ہیں کہ: صحابہ جیسے اہل باطن کا باہمی جگ و جدل بعید نظر آتا ہے، تو اس کا حل یہ پیش کرتے ہیں:

”شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے موقع پر اور اس کے بعد جتنے واقعات پیش آئے تھے، ان میں سے ایک ایک کی اطلاع حضور ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہم پہنچا چکے تھے۔ اس لئے ان واقعات کو خدا تعالیٰ کی اہل تقدیرات سے سمجھا جا چکا تھا اور ایسے موقع پر اہل باطن امر تقدیری کو پورا کر دینے کے لئے پُر جوش ہوتے ہیں۔“ (فتوحات مہاجر کی)

یہ حل ہے یا مزید الجھاؤ؟ کیا سب صحابہ اہل باطن اور جبر یہ عقیدہ کے قائل تھے؟ جو تقدیر کو پورا کرنے کے لئے دیدہ دلالت ایک دوسرے کی گردنیں مارنے پر تزلزل گئے تھے۔

پھر قادری صاحب فرماتے ہیں: ”یہی وجہ تھی کہ آنحضرت ﷺ جب اکھڑ میں تشریف لے گئے حالانکہ آپ کی ذاتی رائے میدان اکھڑ میں جانے کے خلاف تھی اور اس لئے لڑائی کے لئے کوئی دُعا نہ

مانگی۔ حالانکہ بد کے لئے آپؐ نے خضوع و خشوع سے دُعا مانگی تھی۔“ (ثنوی شریف)

پھر قادری صاحب دوسرا اشکال پیش فرماتے ہیں۔ ”اولیاء اللہ کافروں کی فوجیں مخدوم طاقوں سے تباہ کر دیا کریں، تو لو لائی کی نوبت ہی نہ آئے۔“ اس کا حل یہ بتاتے ہیں کہ ”باطن بغیر ظاہر کے مکمل نہیں۔“

(سرچشمہ حیات، از عبدالعزیز قادری، ص ۶۹ تا ۷۱، مطبوعہ تبلیغ سوسائٹی، قصور پورہ، لاہور)

اب سوال یہ ہے کہ اگر باطن، ظاہر کے بغیر مکمل نہیں اور ظاہر باطن کے بغیر سب کچھ کر رہا ہے، تو اس باطن کا فائدہ کیا ہے؟ حقیقت یہی ہے کہ ان اہل باطن کے ریت پر تعمیر کئے ہوئے محل محض روپیگیڈا اور جہلاء کی اندھی عقیدت کے سہارے قائم ہیں۔ جن کے پیچھے کوئی ٹھوس بنیاد نہیں۔ شرعی دلائل کے ایک ہی جھوٹے سے یہ محل زمین بوس ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ان کے بلند بانگ دعوے یہ ہیں کہ قبول مولانا دہلوی

اولیاء را هست قدرت از الہ تیر جنتہ باز گرداند زراہ

ترجمہ : اولیاء اللہ کو اللہ کی طرف ایسی قدرت (نصرت) حاصل ہوتی ہے کہ وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کو واپس لا سکتے ہیں۔

اولیاء اللہ کی بے بسی

اور جو لوگوں کی موت و حیات پر نصرت کا دعویٰ رکھتے

ہیں۔ جب خود ان پر کوئی حادثہ پیش آتا ہے، تو فوراً

راہ فرار اختیار کر جاتے ہیں۔ اس وقت نہ ان کی دعا کام آتی ہے اور نہ کرامت۔ مثلاً حدیقۃ الاولیاء کے مصنف مفتی غلام سرور صفحہ ۸، اپریشیح کرم شاہ قریشی حارثی ہکامی کے متعلق لکھتے ہیں کہ :

”پہلے ان کی سکونت لاہور میں تھی۔ جب غارت گیل قوم سکھ نے پنجاب میں ہنگامہ غارتگری گرم کیا، تو یہ بزرگ لکھنؤ چلا گیا اور چند سال اپنے نانا شیخ نور الحسن قریشی کے ساتھ بسر کئے۔ مراجعت کے وقت متصل شاہ جہان پور ۱۲۸۰ھ میں قراقرظ کے ہاتھوں شہید ہوا۔ رضی اللہ عنہ ۱۲۰۱ھ، اس کا سال وفات ہے۔“

اور معروف کرخیؒ (م ۲۰۶ھ) کی وفات یوں ہوئی کہ آپ وفات سے چند روز پہلے اپنے سپر طریقت اہم مولے رضا دشیعوں کے آٹھویں اہم کی ملاقات کے لئے گئے۔ دربالوں نے اند نہ جانے دیا۔ جب اصرار

پر نوبت پہنچی، تو باسبانوں نے شیخ معروف کو زود کو بکھا، جس سے ان کی ہلی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ یہی صدمہ آپ کی موت کا باعث ہوا۔ ذخیرۃ الاصفیاء، ص ۱۳۱، اس وقت نہ اہم صاحب کا ”نور باطن“ کام آیا نہ معروف کرخی کا نہ ہی اہم موصوف کی دعا اور دم بھاڑ اپنے خلف الرشید کے کسی کام آ سکے۔

آپ مادر زاد ولی تھے آپ | بابا نور محمد تیزی المعروف بابا جیوم ۱۲۸۲ھ کا فرایا ہجرت؟

پر لازم لگایا گیا کہ آپ کا طریقہ جو گیارہ ہے اور آپ اپنے مریدوں کو ایک ہزار مرتبہ یومئہ یا ایلئس پڑھنے کو بتاتے ہیں، افغانی یہ باتیں سن کر آپ کے خلاف ہو گئے اور آپ کے مریدوں کو لوٹنے لگے، کچھ عرصہ تو آپ برداشت کرتے رہے بالآخر تیزی شریف سے موضع اڑاوڑ چلے گئے۔ (صوفیائے نقشبند، ص ۱۶۹)

ادریہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ان اولیاء کے شیخ اکبر ریجی مصر میں کفر کا فتوے لگا اور ان کے قتل کا حکم حاصل کر لیا گیا، تو انہوں نے بھی چپکے سے راہ فرار اختیار کی اور دمشق میں آکر پناہ لی تھی۔ غرض اس طرح کے واقعات بھی بے شمار ہیں جن سے ان کی خدائی کی اصل حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے اور جن میں سے چند واقعات آپ کے اس کتاب میں دیگر مقامات پر مل جائیں گے۔

اہل باطن پر علمائے حق کی گرفت

اب سوال یہ ہے کہ اگر ان صوفیائے کرام کا مذہب ایسے ہی مشرکانہ عقائد و اعمال کا مرقع ہے، تو اہل ظاہر نے ان پر کوئی گرفت بھی کی یا نہیں؟ اس سوال کا جواب مختصراً حسب ذیل ہے:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں عبداللہ بن سبا یہودیوں کے چیلوں یعنی حلوئیوں نے اپنے عقائد کا اظہار

حکومتوں سے سزا دلوانا

کیا، تو انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زندہ جلا دیا تھا۔ اس سخت سزا کی وجہ سے یہ فتنہ کافی عرصہ دبارہا۔ اس کے بعد جب منصور حلاج نے یہی بات کہی، تو علمائے حق نے اس پر بھی بروقت گرفت کی غلیضہ مقتدر باللہ نے ۲۰۹ھ میں اور بقول بعض ۳۱۰ھ میں اسے قتل کر دیا۔ پھر اسے دفن نہیں کیا گیا بلکہ اسے جلا کر اس کی راگھ دریا میں پھینک دی گئی۔

ابو عبد اللہ الحکیم ترمذی نے تیسری صدی کے آخر میں جب نظریۂ ختم الولائیہ پیش کیا اور تصوف کے بعض دوسرے مسائل پر روشنی ڈالی تو علمائے وقت نے بڑی شورش کی اور اس پر کفر کا فتویٰ بھی لگایا آخر اُس نے اپنی جان بچانے کی خاطر ترمذ سے راہ فرار اختیار کی اور خلا وطن ہو کر بلخ میں جا کر پناہ لی۔

پھر ہمیں تاریخ میں ایک اور صوفی بزرگ شہاب الدین سہروردی المقتول کا ذکر ملتا ہے۔ یہ بزرگ ایک صوفی اور فلسفی کی حیثیت سے پہلے اصفہان میں رہے پھر بغداد بعد ازاں وہاں سے حلب چلے گئے۔

جب ان کے صوفیانہ عقائد نے مسلمانوں کے دل میں اُن کی طرف سے شبہات پیدا کر دیے اور راسخ الاعتقاد علماء نے ان پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ کیا، تو ابوالمکث الظاہر نے ۵۸۰ھ میں ان کو بھروسہ ۳۸ سال قتل کر دیا۔ (دائرة المعارف، ج ۱۱، ص ۴۴۰، زین العابدین شہاب الدین سہروردی المقتول)

ابن عربی پر بھی وحدت الوجود کی اشاعت و تشہیر کی پاداش میں کفر کا فتوے لگایا گیا اور اسے زندیق، ملحد اور کذاب جیسے بدترین القاب سے نوازا گیا اور مصر میں ان کے قتل کا حکم بھی حاصل کر لیا گیا۔ ان کو اس کا پتہ لگ گیا تو بچکے سے راہ فرار اختیار کی اور دمشق میں آکر دم لیا۔

عصیف الدین تمسانی قرآن و حدیث کے خلاف خرافات بکتا تھا مگر نہایت ازداری سے اور جب اُسے یہ منظرہ پیدا ہوا کہ کہیں کمال الدین اس کا راز فاش نہ کر دے، تو اپنے اس شاگرد کے پاس آیا اور منت معذرت سے اسے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اس کے یہ خرافات پردہ راز میں رہنے دے۔

اس کے بعد امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا دور آتا ہے انہوں نے اپنے وقت کے موجودہ رفاعی، بدعتی اور مشرک فرقے سے حکومتی سطح پر مناظرہ و مباحلہ کیا، جس میں یہ رفاعی بزرگ ہار گئے (حالانکہ حکومت کے اکثر اہل کاروں پر ان رفاعی شعبہ بازوں کا اچھا خاصا اثر تھا) اور معذرت طلب کی اور وعدہ کیا کہ آئندہ ایسی بدعات و خرافات سے باز آئیں گے اور خلاف شریعت کام نہیں کریں گے۔

ہند میں اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں حکیم سرمد نے عدائی کا دعویٰ کیا، تو اسے سنہ ۱۰۸۰ھ میں قتل کیا گیا۔ یہ تو تعزیری اقدامات تھے، اب تحریری بھی سن لیجئے:

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ پہلی اور دوسری صدی میں ایسے بزرگوں کو زائد، عابد یا صاحب کہا جاتا تھا، صوفیاء کی اصطلاح بعد میں وضع ہوئی۔ یہ لوگ چونکہ فقر و فاقہ، دنیا سے بے رغبتی اور نقلی عبادت مثلاً نماز، روزہ میں سنت سے آگے بڑھ گئے اور غلو سے کام لیتے تھے۔ لہذا ان لوگوں یا ان کے معتقدین میں اپنے نظریات کو صحیح ثابت کرنے کی خاطر موضوعات اور جھوٹ کا بھی رواج ہو گیا تھا۔ چنانچہ امام مسلم اپنی کتاب 'مسلم' کے مقدمہ میں مندرجہ ذیل روایت درج فرماتے ہیں:

امام مسلم اور صالحین

محمد بن یحییٰ بن سید القطان کہتے ہیں کہ میرے باپ

قال محمد بن یحییٰ بن سید القطان عن

یحییٰ نے کہا: "ہم نے صالحین سے زیادہ کسی کو مدح

ابیہ قال: لعنوا الصالحین فی شئیء کذب

منہرفی الحدیث • قال ابن ابی عتاب
فلقیته انا محمد بن یحییٰ بن سعید القطان
فسالته عنه فقال عن ابیه : " المرتبر
اهل الخیر ف شیخ اکذب منهم
فی الحدیث " قال مسلم یقول یجوزی
الکذب علی لسانہم ولا یتعمدون
الکذب (مقدمہ ص ۱۱۲، ۱۱۳ مصری)

کے معاملہ میں جھوٹ بولنے والا نہیں دیکھا۔ " ابن ابی عتاب
کہتے ہیں کہ پھر مجھ سے محمد بن یحییٰ بن سعید القطان کی ملاقات
ہوئی۔ اور میں نے ان سے یہی بات پوچھی، تو کہنے لگے: "ہاں
میرے والد فرماتے تھے کہ تو ان اہل خیر (صوفیاء) سے زیادہ کسی
کو بھی حدیث کے معاملہ میں جھوٹا نہ دیکھے گا۔" امام مسلم کہتے
ہیں کہ جھوٹ ان کی زبانوں سے بے ساختہ جاری ہو جاتا
ہے۔ چاہے جھوٹ بولنے کا ارادہ نہ بھی رکھتے ہوں۔"

صالحین سے حدیث قبول کرنے میں متامل

چنانچہ آئمہ حدیث اس
طبقہ صالحین سے حدیث

قبول کرنے میں متامل رہتے تھے۔ ان حضرات میں زہد اور عبادات میں غلو کی وجہ سے ان کی روایات کو
درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ کیونکہ اُن کا ظن اور ضرورت سے زیادہ احتیاط "علم" کے نکات پر حاوی
رہتے تھے۔ چنانچہ مشہور حدیث "پانی پاک ہے جب تک اس کا رنگ، ذائقہ اور بو متغیر نہ ہو۔"
کے سلسلہ میں "رشیدین بن سعد" کی روایت کو محض "أَخَذَتْهُ غَفْلَةُ الصَّالِحِينَ" کی بنا پر قبول نہیں کیا
گیا۔ (متفرق کتب اسمائے الرجال) حالانکہ یہ حدیث صحیح ہے مگر سلسلہ اسناد میں ایسے صلحاء کا نام آنے
سے محدثین پر ہیز کرتے تھے اور جب تک دوسرے ثقہ راویوں سے توثیق نہ ہو اسے قبول نہ کرتے تھے۔
امام مسلم کہتے تھے کہ اس دین (طریقت) کے ذریعہ حضرت
ابوبکر رضی اللہ عنہ و حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واسطے سے جو

صوفیاء کا شجرہ طریقت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا جاتا ہے یہ بالکل جھوٹ ہے۔ آپ مقدمہ مسلم میں فرماتے ہیں:

حدثنی حسن بن علی الحلوانی قال
حدثنا یزید بن ہارون اخبرنا ہشام
قال دخل ابوداؤد الماعنی علی قتادة فلما
قام قالوا ان هذا یزعم انه لقی ثمانیۃ عشر
بدریۃ فقال قتادة هذا کان سائلاً قبل الجارح

مجھ سے حسن بن علی حلوانی نے بیان کیا ان کو یزید بن ہارون
نے، ان کو ہشام نے خبر دی کہ داؤد الماعنی (تائینا) قتادہ تابعی،
کی محفل میں داخل ہوا۔ جب جانے لگا تو اہل محفل نے کہا کہ
یہ داؤد الماعنی دعویدار ہے کہ اس نے اٹھارہ بدری صحابیوں سے
ملاقات کی ہے۔ قتادہ نے فرمایا یہ تو طاعونِ حارثی سے

لايعرض في شيء من هذا ولا يتكلم فيه و
 پہلے لکھا پھر تاقا۔ اس وقت تو اس نے کبھی کوئی ایسی بات نہ
 اللہ ماحدثنا الحسن عن بدری مشافهة کی تھی۔ خدا کی قسم! حسن (بصری) اور سعید بن المسیب (جو
 ولا حدثنا سعید بن المسیب عن بدری داؤد اعلیٰ سے عمر میں بڑے تھے) نے بھی سوائے سعد بن ملک
 مشافهة إلا عن سعد بن مالك (مقدمہ صحیح مسلم بصری) کے کسی بدری صحابی سے کوئی حدیث ہم تک نہیں پہنچائی۔

ملا علی قاری نے بھی اپنی تصنیف ”موضوعات“ میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ صوفیاء
 جو اپنی نسبت حضرت حسن بصریؒ کے ذریعہ سے حضرت علیؒ سے ملتے ہیں، تو انہی حدیث کے
 ہاں حضرت حسن بصریؒ کی حضرت علیؒ سے تو ملاقات بھی ثابت نہیں۔ تحصیل علم تو بڑی بات ہے
 (بحوالہ اسلامی تصوف، پروفیسر یوسف سلیم چشتی، ص ۱۱۰)

دائرة المعارف الاسلامیہ (مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی) میں صوفیاء کے شجرہ طریقت پر طویل بحث کی گئی ہے
 لہٰذا مولانا اللہ یاد خان اپنی تصنیف دلائل السلوک کے صفحہ ۲۴ پر اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

”صوفیاء کرام تو سب کے سب حضرت حسن بصریؒ اور حضرت علیؒ کی ملاقات پر متفق ہیں۔ اہل حدیث کے ہاں ملاقات او
 رایت بالاتفاق ثابت ہے ہاں صحبت طویلہ کی بالاتفاق نفی ہے۔ اگر فیض کے لئے صحبت طویلہ کو شرط قرار دیا جائے، تو پھر فیض باطنی
 بالواسطہ تو ممکن ہے، عمل نہیں۔ ہاں فیض بالواسطہ کی نفی ہوگی مگر بالواسطہ کی نفی کہاں لازم آئی۔۔۔ اب رہا یہ سوال کہ اگر کسب فیض بالواسطہ
 کا اصول تسلیم کر لیا جائے، تو وہ واسطہ کون سا ہے؟ جواب یہ ہے کہ حضرت علیؒ سے ملنے والے ہزاروں صحابی حضرت حسنؒ سے ملے
 تھے۔ کسی سے فیض حاصل کر لیا ہو۔ یہ کوئی ظاہری چیز تو ہے نہیں کہ ظاہری چیز کی نفی سے باطنی فیض کی نفی ہو جائے۔“

ادریسی کچھ ہم کہتے ہیں کہ یہ صوفیاء اپنا شجرہ نسب لانے کے لئے ظاہری صحبت کے محتاج نہیں۔ بھلا جن کے ہاں نسبت اولیہ جیسا
 کارگردار وجود ہو، انہیں اس ظاہری ملاقات یا صحبت کو ثابت کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ یہ جواب دینے کے بعد آپ نے سید
 احمد شاہ قشاشی، شاہ ولی اللہ دہلوی، تہذیب التہذیب اور مولانا الدین سیوطی کے چند اقتباسات اور دیکھائے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ
 حضرت علیؒ اور حضرت حسنؒ کی ملاقات، سماع اور روایت ثابت ہے۔ اب ایک طرف ان حضرات کے اقوال ماننے
 رکھنے اور دوسری طرف یہ دیکھنے کہ:

۱۔ امام غزالی قسم اٹھا کہتے ہیں کہ حسن (بصری) اور سعید بن المسیب نے مجھے کسی بدری صحابی سے کوئی حدیث ہم تک نہیں پہنچائی۔ (مقدمہ صحیح مسلم، ص ۱۰، بصری)

۲۔ ملا علی قاری مصنف ”موضوعات“ کبیر ان کی ملاقات بھی تسلیم نہیں کرتے (اسلامی تصوف، یوسف سلیم چشتی، ص ۱۱۰)

۳۔ دائرة المعارف الاسلامیہ اس سلسلہ نسبت کو اپنی پوری تحقیق کے بعد منقول قرار دیتا ہے۔
 اند میں صورت جو بات راجع ہو سکتی ہے اس کا آپ خود اندازہ فرمائیے۔

کیونکہ اس میں بہت سے اختلافات ہیں۔ بالآخر جو نتیجہ پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ سب کے آخر میں چودھویں صدی عیسوی میں استاد ابن ابی اُصْبَیْبَةُ نے جو شجرہ طریقت مرتب کیا ہے اسے اس وقت سے بہت بڑے بڑے صوفی سلسلے تسلیم کرتے چلے آئے ہیں اور وہ شجرہ طریقت یوں ہے:

- ۱۔ حضرت علی ؓ ۲۔ حسن بصری، م، ۱۱۰ھ ۳۔ حبیب اللعجبی (دم ۱۱۵۶)، ۴۔ داؤد طائی
- ۵۔ معروف کرخی (دم ۲۰۶ھ) ۶۔ سری سقطی (دم ۲۵۳ھ) ۷۔ جنید بغدادی (دم ۲۹۸ھ) ۸۔ رذیابی
- ۹۔ ابوعلی کاتب زجاجی ۱۰۔ مغربی ۱۱۔ جرجانی۔

یہ شجرہ درج کرنے کے بعد دائرۃ المعارف میں سائنسہ ہی نیبصرہ بھی درج ہے :

ابن الجوزی اور ذہبی نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس شجرہ میں قدیم ترین چار واسطے یعنی ۴ تا ۲ منقول و کمزور ہیں۔ یہ بزرگ آپس میں ملے ہی نہیں تھے۔ بعض طریقت کے سلسلے ایسی اسناد استعمال کرتے ہیں جس میں معروف کرخی سے پہلے نوشیعی امام آتے ہیں۔

اس سلسلہ اسناد کی صحت اور بھی زیادہ مشکوک ہے۔ "دائرۃ المعارف الاسلامیہ، زیر عنوان تصوف، ج ۱، ص ۴۶۶

صوفیاء پر محدثین کی گرفت کے اثرات

اہل تصوف کی اولین کتابوں میں سے ایک مستند کتاب البوصیر سراج

کی کتاب الملح ہے۔ اس کے متعلق دائرہ معارف اسلامیہ مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور (جلد ۱۴/۱، ص ۱۲۵ زیر عنوان علم تصوف) پر درج ہے کہ :

"کتاب الملح تصوف کی اولین کتابوں میں سے ہے۔ اس پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے زمانہ میں تصوف کے خلاف اعتراض میں خاصی شدت آگئی تھی جن کے ازالے کی اس نے خاص ضرورت محسوس کی۔ ان شکوک کی خاصی طویل فہرست کتاب کی ابتدائی فصل میں موجود ہے۔

"البوصیر سراج (دم ۳۷۸ھ) سب سے زیادہ اصحاب الحدیث کے اعتراضوں سے خوفزدہ معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ انہیں کو سب سے زیادہ مطمئن کرنا چاہا ہے۔ یہاں تک کہ نسبت طبقات اہل الحدیث کے لئے ایک

لے یعنی ۱۔ حضرت علی ؓ (دم ۴۰ھ) ۲۔ حضرت حسن ؓ ۳۔ حضرت حسین ؓ (دم ۴۱ھ) ۴۔ زین العابدین (دم ۹۵ھ) ۵۔ امام باقر (دم ۱۱۴ھ) ۶۔ جعفر صادق (دم ۱۴۹ھ) ۷۔ موسیٰ کاظم (دم ۱۸۳ھ) ۸۔ موسیٰ رضا (دم ۲۰۳ھ) ۹۔ محمد بن علی تقی (دم ۲۲۱ھ) قادری اور سہروردی اپنا سلسلہ اٹھویں

امام موسیٰ رضا سے ملاتے ہیں جبکہ چشتی حضرت علی، حسن بصری سے آگے عبدالواحد بن زید کی طرف منتقل کرتے ہیں

پورا باب وقف کیا گیا ہے۔“

پھر اسی عنوان کے تحت ایک دوسرے مقام پر درج ہے کہ :

”الونصر سراج کے ہاں اس امر کی کوشش نظر آتی ہے کہ تصوف کے اصولوں اور عقیدوں کو محدثین اور فقہاء کے طریقے پر بیان کیا جائے تاکہ طریقت کو شریعت کا ہم خیال بلکہ اس کے تابع ثابت کیا جاسکے۔“ کوشش یہ کی گئی ہے کہ تصوف کو علوم شریعت میں مقام مل جائے اسی لئے تطبیق و موافقت کی سعی ہر جگہ نمایاں ہے۔ کتاب کے آخر میں اکابر صوفیاء کے بعض الفاظ سے جو غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں ان کو صاف کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ دینی حلقوں کے لئے قابل قبول بنایا جائے۔“

صوفیاء پر فقہاء کی گرفت

دائرة المعارف الاسلامیہ مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی

(جلد ۱۲، زیر عنوان طریقت، ص ۴۶) پر درج ہے کہ :

”راسخ العقیدہ فقہاء نے ان بدعتوں کے خلاف، جن کی تبلیغ بعض صوفی طریقے کرتے رہے۔ ہمیشہ جنگ جاری رکھی، یعنی ان کی نقلی عبادتوں، ان کے مخصوص لباس (دخرقہ وغیرہ) ان کی مستثنیات، منشی اشیاء (قہوہ، حبشیش، افیون) ان کی شعبہ بازی اور ان کے عقیدے کے خلاف لھڑا سنا دبیعت پر مؤرخانہ تنقید پر خاص توجہ کی ہے اور ان کے سلسلوں کے رخنوں اور نقائص کو ظاہر کر کے ان کی صحت کو غیر اغلب قرار دیا ہے۔“

اس کے بعد سلف اور خلف میں بے شمار ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ اہل حیت اور محافظین شریعت نے جب کسی کا کوئی ایسا قول دیکھا جو اس کو شریعت کے نصوص اور اس کے متواتر قطعی عقائد کے خلاف نظر آیا، تو انہوں نے اس قول کی تردید کی اور صاحب قول کی عظمت و شہرت اور اس کی ولایت و مقبولیت کے آثار بھی اس کو اس تردید سے باز نہ رکھ سکے۔ ایسے محافظین شریعت میں سے بعض لوگوں نے اس موضوع پر مستقل رسائل بھی تصنیف کئے ہیں۔ صاحب جلاء العینین نے صفحہ ۴۳، ۴۴ پر ایسے اصحاب کے کارنامے درج کئے ہیں۔ اس فہرست میں ہم کو علامہ سخاوی، علامہ سید الدین تفتازانی، ملا علی قاری، حافظ ابن حجر عسقلانی، ابوجیان مفسر شیخ الاسلام عز الدین بن عبد السلام، حافظ البوذری، شیخ الاسلام سراج الدین البلقینی جیسے نامور علماء و آئمہ فن نظر آتے ہیں۔ (تاریخ دعوت و عزیمت، ج ۲، ص ۱۵۲، از ابوالحسن علی ندوی)

امام ابن تیمیہ اور مجدد الف ثانی کے کارنامے

اور ان سب میں ہمیں امام ابن تیمیہؒ
سرفہرست نظر آتے ہیں مندرجہ بالا

سب جہزات ان کے ہوا تھے۔ امام ابن تیمیہؒ نے جس طرح تقریر و تحریر اور حکومتی سطح پر مناظرہ و مباحلہ کر کے ان صوفیوں کے مشرکانہ عقائد کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، اسے ہم پہلے مناسبت مقام پر درج کر آتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ امام ابن تیمیہؒ خود بھی زاہد تھے، ان سے کرامات کے صدور کے واقعات بھی ملتے ہیں اور ان کی بعض تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی ان منازل سلوک کو ذاتی تجربہ کی بنا پر خوب سمجھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے صوفیوں کے ان سب مشرکانہ عقائد و بدعات کا نہایت سختی سے رد کیا جن کی شریعت اسلامیہ میں کوئی گنجائش نہ تھی۔ خود اتباع سنت اور عقائد سلفیہ میں نہایت تشدد دتھے۔

امام ابن تیمیہؒ نے کئی محافوں پر ان وجودیوں کا مقابلہ کیا انہیں نجی طور پر خطوط بھی لکھے کہ وہ ایسے عقائد اور خلاف سنت اعمال سے باز آئیں۔ پھر ایک سالہ "فی البطل وحدت الوجود" بھی لکھا اور ایسے مشرکانہ عقائد رکھنے والوں کے حق میں دو ٹوک فتوے دیا۔ جس کا مختصر یہ ہے :

۱۔ ایک اسلامی مملکت میں صرف تین فرقے ہی ہو سکتے ہیں (۱) مسلمان (۲) ذمی جیسے یہود و نصاریٰ یا دوسرے کافر۔ یہ لوگ اپنے مذہب کی عبادت کی ادائیگی کی حد تک تو آزاد ہوتے ہیں۔ لیکن اپنے دین کی کھلم کھلا تبلیغ نہیں کر سکتے۔ پھر وہ چونکہ جزیہ ادا کرتے ہیں لہذا وہ بھی مسلمانوں ہی طرح محفوظ و مامون ہوتے ہیں۔ (۳) مشرک و مرتد اور زندقہ وغیرہ۔ یہ لوگ چونکہ مسلمانوں میں شامل ہوتے ہیں، لیکن اپنے مشرکانہ عقائد اور بدعات پھر ان نظریات کی علی الاعلان تبلیغ کی وجہ سے وہ واجب القتل ہوتے ہیں اس کے علاوہ ان کا کوئی علاج نہیں۔ ان سے پہلے توبہ کر دائی جائے اگر باز نہ آئیں تو انہیں قتل کر دیا جائے۔ جیسا کہ حضرت علیؓ نے کیا تھا۔ اور نہ ہی ایک اسلامی مملکت میں کسی چوتھے فرقہ کی گنجائش ہے۔

(امام ابن تیمیہؒ، کوکن عمری، ص ۱۶۶)

امام ابن تیمیہؒ کے شاگرد و رشید امام ابن قیمؒ بھی اپنے استاد کی طرح جہاں ایک متبحر عالم، محدث اور فقیہ تھے، ساتھ ہی ساتھ صوفی بھی تھے۔ انہوں نے بھی جہاں سلوک پر متدکب و رساں لکھے۔ وہاں ابوالسبیل عبد اللہ ہرودیؒ (م ۴۸۱) کی کتاب منازل السائرین کی شرح مدارج السالکین بھی لکھی ہے۔ اس کتاب میں صوفیاء کے غلط عقائد اور غلو کی جا بجا نشان دہی کر کے شدید گرفت کی ہے۔

صاحب جلالین نے جن علماء کے نام گنوائے ہیں۔ ان کے علاوہ مندرجہ ذیل علماء بھی بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے ان مشرکۃ عقائد کے خلاف بھرپور جدوجہد کی ہے۔ علامہ ابن خلدون، علامہ ذہبی، ابن المقرئ، ابراہیم البقاعی اور مجدد الف ثانیؒ۔

مجدد الف ثانیؒ کا کمال یہ ہے کہ جہاں وہ تتبع سنت اور عالم دین تھے وہاں طریقت میں بھی بلند مقام پر فائز تھے۔ انہوں نے ربنائے کشف نظریہ وحدت الوجود اور شہود کو بیچ قرار دیا اور اس کا ابطال کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوفیاء میں سے بھی کسی کو کھلی کراپ کے نظریات کے خلاف لکھنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ آپ نے اپنے کارہائے نمایاں سے اس بے دینی اور بد مذہبی کا رخ بدل دیا، جو اکبر کے زمانہ سے چلی آرہی تھی مجدد صاحب نے ابن عربی شیخ اکبر کے اس نظریے کا بھی رد کیا کہ نبوت وہی نہیں بلکہ کسی ہوتی ہے۔ حضرت مجدد کا نظریہ توحید، ص ۳۶)

مجدد الف ثانیؒ کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب کا نام اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ صوفیاء میں جو سیرپستی اور گورپستی کے رجحانات پائے جاتے ہیں اس کے خلاف انہوں نے بھرپور جدوجہد کی ہے۔ لیکن ان کا یہ پہلو کمزور ہے کہ وہ خود ان نظریات کے قائل ہے ہیں اور مجدد الف ثانی کے نظریات سے تطبیق کی کوشش کی ہے۔

اسی طرح ایک بزرگ اشرف علی تھانوی قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے تصوف میں غیر اسلامی عقائد و اعمال کو دور کرنے کی کوشش کی ہے مگر ان کا دوسرا پہلو شاہ ولی اللہ صاحب سے بھی زیادہ کمزور نظر آتا ہے وہ صرف ان نظریات کے قائل ہی نہیں اکابر اور بدنام صوفیائے خلاف شریعتہ احوال و افعال کی ہر ممکن تائید و تفسیر سے تنزیہ کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

الباقی عبد اللہ غزنوی جن کے متعلق نواب صلیبی حسن خان لکھتے ہیں کہ وہ جمع حدیث نبوی اور علم سلوک تھے۔ انتہا درجہ کے تتبع سنت بزرگ تھے۔ انہوں نے بھی کھلی کراپ کے وجود کے نظریے کی مخالفت کی ہے۔

الغرض علمائے شریعت نے ہر دور میں ان مشرکۃ عقائد کی بیخ کنی کی حتیٰ المقدور کوشش کی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آج بھی ان کے خلاف بھرپور جدوجہد کی ضرورت ہے۔

صوفیاء کے مخصوص مسائل (۱)

۱۔ اولیاء اللہ اور ان کی گرفت

اولیاء اللہ کی فضیلت میں عموماً یہ آیت پیش کی جاتی ہے :

اولیاء اللہ کون ہیں ؟

إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲۶۳)

لیکن سوال یہ ہے کہ ان اولیاء اللہ سے یہی لوگ مراد ہیں، جو چہ کشتی اور قبروں پر مراقبہ کرتے ، خوارق عادات امور کا اظہار کرتے اور صاحب تصرف و اختیار بنے ہوئے ہیں۔ قرآن اولیاء اللہ کی اس تعریف کا انکار کرتا ہے۔ وہ اولیاء اللہ کی تعریف اس سے اگلی آیت میں یوں بیان کرتا ہے :

الَّذِينَ آمَنُوا وَكَافُوا يَتَّقُونَ (۲۶۴)

یعنی وہ جو ایمان لائے اور پرہیزگار رہے۔
اولیاء اللہ کی بعینہ یہی تعریف درج ذیل آیت میں بھی بیان ہوئی ہے۔ اب دیکھئے کہ اس آیت کے مخاطب کون لوگ ہیں :

فَأَمَّا يَا تَبِيتُكُمْ مَتَىٰ هُدًى فَن
تَبِعَ هُدًى فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲۶۵)

جب تہائے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے گی۔ پھر جس نے میری ہدایت کی پیروی کی، تو ان پر نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔
مندرجہ بالا دونوں آیتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اولیاء اللہ وہ لوگ ہیں، جو اللہ کی ہدایت پر ایمان لائے اور اس کی پیروی کرتے ہیں، نہ کہ وہ لوگ جو خود خدائی کے دعویدار بن بیٹھے ہیں اللہ تعالیٰ نے ولی کو مومنین کی صفت قرار دیا تھا۔ ان صوفیاء نے ولی کو ایک منصب میں تبدیل کر دیا۔

اولیاء اللہ و الیاء اسرار ہوتے ہیں

سید الطائفہ جنید بغدادیؒ ولی کی
یہ تعریف بیان کرتے ہیں کہ ”ولی والیاء اسرار“

ہوتے ہیں۔ یعنی وہ خدا کے سرستہ رازوں کے مالک ہوتے ہیں۔ پھر یہ تعریف عوام میں اتنی مقبول ہوئی کہ وہ سمجھنے لگے کہ جس طرح لڑکی کا ولی یا سرپرست اس کے نکاح کا مختار ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ خدا کے ولی اور سرپرست ہوتے ہیں۔ اور اس سے حسبِ منشا کام کروا سکتے ہیں۔

بلاشبہ اولیاء کا لفظ قرآن میں سرپرست یا صاحب اختیار کے لئے بھی استعمال ہوا ہے، جو کسی کی بگڑی بنا سکتا ہو یا کسی کی حاجت پوری کر سکتا ہو۔ لیکن اس صورت میں یہ ہمیشہ منفی پہلو لئے ہوتے ہوتا ہے۔ یعنی لوگوں کا یہ گمان باطل ہوتا ہے کہ وہ لوگ صاحب تصرف و اختیار ہیں۔ مثلاً :

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ اور جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اس کے سوا دوسرے
اللَّهُ حَفِيفٌ عَلَيْهِمْ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ سرپرست بنا رکھے ہیں۔ اللہ ہی ان پر نگران ہے اور آپ
بِوَكِيلٍ کسی کے وکیل نہیں۔ (۳۲/۶)

یعنی پیر اور مرید کے ان احوال کا محاسبہ اور موازنہ اللہ ہی کا کام ہے۔ اے پیغمبر تہا سے ذمہ ری بات نہیں کہ جو بات نہ مانے اس کو تہاں نہیں کر سکو۔

اس آیت کے حاشیہ میں مولانا مودودیؒ تفہیم القرآن کے حاشیہ میں لکھتے ہیں :

”اگرچہ اس آیت کے مخاطب بظاہر حضور ہی ہیں، لیکن اصل مدعا کفار کو یہ بتلانا ہے کہ اللہ کا نبی اس طرح کا کوئی دعوائے نہیں رکھتا، جیسا کہ جاہلیت کے معاشروں میں بالعموم یہ خیال پایا جاتا ہے کہ یہ حضرت“ قسم کے لوگ ہر اس شخص کی قسمت بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں، جو ان کی شان میں گستاخی کرے۔ بلکہ مرنے کے بعد ان کی قبر کی بھی اگر کوئی توہین کر گزے یا اور کچھ نہیں، تو ان کے متعلق کوئی بُرا خیال ہی دل میں لے آئے تو اس کا تختہ الٹ دیتے ہیں۔ یہ خیال زیادہ تر ان ”حضرتوں“ کا اپنا پھیلا ہوا ہوتا ہے اور نیک لوگ جو خود ایسی باتیں نہیں کرتے ان کے نام اور ان کی ہڈیوں کو اپنے کا بار کا سرمایہ بنانے کے لئے کچھ دوسرے ہوشیار لوگ ان کے متعلق اس خیال کو پھیلاتے ہیں۔ بہر حال عوام میں اسے روحانیت اور خدا رسیدگی کا لازمہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی فریب کا طلسم توڑنے کے لئے اللہ تعالیٰ حضور ﷺ سے فرما رہے ہیں کہ آپ

کا کام صرف لوگوں کو راہ دکھانا ہے ان کی قیمتیں تنہا اے حوالہ نہیں کی گئیں۔ ان کے اعمال کو دیکھنا اور ان کو عذاب دینا ہمارا اپنا کام ہے۔

اسی طرح درج ذیل آیت میں بھی اولیاء سے مراد یہی ”حضرت“ قسم کے لوگ ہیں، فرمایا :
 اَتَّبِعُوا مَا اَنْزَلْ اِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ
 اَوْلِيَاءَ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ
 جو تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے اس کی پیروی کرو (یہی اصل ولایت ہے) اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے پرستوں کی پیروی نہ کرو۔ مگر تم کم ہی نصیحت مانتے ہو۔ (۴/۳)

ولی کے مفہوم میں تبدیلی کب ہوتی ؟
 قرآن کی رو سے تمام بنی نوع انسان دو فرقوں میں منقسم ہے۔ ایک اولیاء اللہ یا اولیاء الرحمن، دوسرے اولیاء الشیطان۔ ہر وہ شخص جو اللہ کے دین کو قبول کرتا ہے اور اس کی سر بندی کے لئے کام کرتا ہے، وہ اللہ کا ولی ہے۔ خواہ یہ کوشش کم ہو یا زیادہ۔ اور جو اللہ کی اطاعت نہیں کرتا اور بناوٹ کرتا ہے وہ شیطان کا ولی ہے۔ تمام کے تمام انسان ولی ضرور ہیں۔ کوئی اللہ کا ولی ہے اور کوئی شیطان کا۔ اور اس کی دلیل یہ آیت ہے :

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ۚ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَوْلِیَآءُهُمُ الطَّاغُوْتُ یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ
 جو لوگ ایمان لائے، اللہ ان کا ولی ہے کہ اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا ہے اور جو کافر ہیں ان کے ولی شیطان ہیں، جو ان کو روشنی سے نکال کر اندھیرے میں لے جاتے ہیں۔ (۲/۲۵۰)

گویا مومنوں کا اللہ اور وہ اللہ کے ولی اور کافروں کے شیطان ولی اور یہ شیطان کافروں کے ولی ہوتے ہیں لیکن اس طبقہ نے اولیاء سے مراد صرف وہ فرقہ سمجھ رکھا ہے، جس سے کشف و کرامات یا شنبہ بازیوں کا ظہور ہو۔ پھر اسی طبقہ میں سے کسی کو اللہ کا ولی کہہ دیتے ہیں اور کسی کو شیطان کا۔

ولی کا مفہوم کب سے بدلا ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مفہوم کی تبدیلی تیسری صدی ہجری میں پیدا ہوئی۔ دوسری صدی تک ایسے لوگوں کو زہاد، عبا و یا صابکین تو کہا جاتا تھا مگر اولیاء اللہ کسی نے نہ کہا تھا جب چوتھی صدی ہجری میں صوفیاء کے طبقہ کے مختلف سائل ضبطِ تحریر میں آئے، تو ان حضرات نے ولی

کہ لفظ کو اس مفہوم کے لئے مختص کر لیا۔ پھر اس کے بعد ان اولیاء اللہ کے مناصب اور اسمائیں مقرر کی گئیں، جن کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

طریقۂ نظریات کے مطابق (خواہ حلول کے نظریہ سے ہو یا وحدۃ الشہود کے نظریہ سے) سب عارف باللہ

ذاتی اور عطائی کا فلسفہ

اور فانی اللہ لوگ انسانی رُوپ میں چلتے پھرتے خدا ہوتے ہیں۔ جن کا علم اور تصرف خدا ہی کے برابر ہوتا ہے فرق صرف یہ سمجھا جاتا ہے کہ خدا کا علم غیب یا تصرف تو اس کا ذاتی ہے اور ان اولیائے کرام کا علم غیب یا تصرف خدا کا عطایا ہوا یا عطائی ہوتا ہے۔ اب اس ذاتی اور عطائی کے متعلق بھی شریعت کا فیصلہ سن لیجئے۔ مشرکین مکہ بھی جو فرشتوں، بزرگوں اور بتوں میں علم غیب یا تصرف کا عقیدہ رکھتے تھے، وہ حج کے دوران تبلیہ ان الفاظ میں کہا کرتے تھے :

لَبَّيْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ إِلَّا شَرِيكًا میں حاضر ہوں، نیز کوئی شریک نہیں مگر وہ شریکِ ج
هُوَ لَكَ تَهْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ نیزی مٹ ہے اور تو اس کا مالک ہے اور وہ شریک

(مسلم، کتاب الحج، باب التلبیہ) نیز، مالک نہیں۔

گویا ایسے ذاتی اور عطائی کا نظریہ رکھنے والوں کو بھی مُشرک ہی قرار دیا گیا۔ اب مولانا روم کا یہ شعر بھی ملاحظہ فرمائیے، جو ان صوفیہ کے مسئلہ عقیدہ کی ترجمانی کرتا ہے :

اولیاء را بہت قدرت از الہ تیر جُستہ باز گردانند راہ

ترجمہ : اولیاء اللہ کو اللہ سے یہ قدرت حاصل ہوتی ہے کہ کمان سے ٹکھے ہوئے تیر کو واپس موڑ لائیں۔

اب اس کا دوسرا پہلو سامنے لائے، کیا بیک وقت اتنے صاحب تصرف حضرات کی موجودگی کا امکان بھی ہے یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

خداؤں کی تعداد

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ اگر آسمان اور زمین خدا کے سوا اور معبود ہوتے، تو نظام

لَفَسَدَتَا کائنات درہم برہم ہو جاتا (۲۱/۲۲)

یہاں اللہ کا لفظ صاحب تصرف و اختیار کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، تو اللہ تعالیٰ اپنے سوا کسی میں تصرف کی نفی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر ایک کے بجائے دو بھی ایسی صاحب تصرف و

اختیار ہستیاں ہوں تو زمین و آسمان اور کائنات کا نظام درست نہ بنا ممکن ہے۔ چہ جائیکہ سینکڑوں ایک وقت موجود ہوں۔

دوسرے مقام پر ان صاحب تصرف و اختیار ہستیوں کے تصرف کی نفی ان الفاظ میں بیان فرمائی:

إِنَّ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ
لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوْ اجْتَمَعُوا لَهُ
وَأَنْ يَسْلُبَهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَا
يَسْتَنْفِذُوهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ
وَالْمَطْلُوبُ (۲۷، ۳)

جن لوگوں کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو وہ تو ایک مکھی
بھی نہیں بنا سکتے، خواہ سب لکٹے ہو جائیں اور اگر ان
سے مکھی کچھ چھین لے جائے، تو اس سے واپس بھی
نہیں لا سکتے۔ طالب اور مطلوب (مُريد اور پيسه)
دونوں کمزور ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کسی دوسرے کے تصرف و اختیار کا مسئلہ ایک اور مثال سے بھی سمجھایا ہے۔

فرمایا:

ضَرَبَ لَكُمْ مَثَلًا مِنْ أَنْفُسِكُمْ
هَلْ لَكُمْ مِنْ مَمْلُوكٍ أَيْمَانَكُمْ
مَنْ شُكِّكَ فِي مَا رَزَقَكُمْ
فَأَنْتُمْ فِيهِ سَوَاءٌ تَخَافُونَهُمْ
كَخِيفَتِكُمْ أَنْفُسَكُمْ (۳۷، ۳۸)

اللہ تعالیٰ تمہارے حسب حال ایک مثال مثال فرماتا ہے، کہ
بھلا جن (لوگوں وغیرہ) کے تم آقا ہو، تم انہیں اس
حال میں شریک بناتے ہو، جو ہم نے تم کو دیا ہے تاکہ
نور اور آقا برابر حیثیت کے بن جائیں، تم اس سلسلے میں
ان سے یوں ڈرتے ہو جیسے انہوں سے۔

تو بھلا جب تم آقا کی حیثیت سے غلام کی شرکات گوارا نہیں کر سکتے، تو جس خدا کے سب غلام ہیں۔
وہ ان کی شرکات کب گوارا کر سکتا ہے۔

مندرجہ بالا آیت سے واضح ہو جاتا ہے کہ اولیاء اللہ کا صاحب تصرف ہونا ایک یہودہ سی
بات اور صریح شرک ہے۔

اب چونکہ قرآن ہر مسلمان اور مومن کو
اللہ کا ولی قرار دیتا ہے۔ لہذا ولایت

ولایت عامہ اور ولایت خاصہ کا عقیدہ

عامہ اور ولایت خاصہ کا عقیدہ تراشا گیا۔ ولایت عامہ تو عام مسلمانوں کے لئے رہنے دی گئی اور ولایت
خاصہ ان صاحب تصرف "اولیاء اللہ" کے لئے۔ اب دیکھتے کہ ایمان بھی مسلمانوں میں کم و بیش ہوتا ہے۔

کوئی کمزور ایمان والا ہوتا ہے کسی کا اس سے پختہ ہوتا ہے کسی کا اس سے بھی زیادہ پختہ اور اکمل، لیکن ایمان کو دو یا زیادہ حصوں تقسیم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی، تو پھر آخر اس ولایت کی یہ تقسیم کیوں کی گئی پھر اس تقسیم کے لیے کوئی خط امتیاز بھی ہونا چاہئے کہ ولایتِ خاصہ کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ ظاہر ہے یہ خط امتیاز منصوص تو ہے نہیں اور ان کا اپنا معیار یہ ہے کہ جن لوگوں سے کشف و کرامات سرزد ہوں تو وہ ولایتِ خاصہ کے مالک ہوتے ہیں اور عام مومن یا مسلمان ولایتِ عامہ کے مستحق۔ اگرچہ عرف عام میں انہیں ولی نہیں کہا جاتا۔

پھر جب کشف و کرامات ہی ولایتِ خاصہ کا معیار ٹھہرا، تو اس کشف و کرامات کی حقیقت کا حال بھی راہِ طریقت کے ایک جادہ پیم اور عارفِ بائند خواجہ حکیم انصاری کی زبان سے سن لیجئے:

”دورانِ سلوک میں ہر قسم کے صوفیوں اور فقیروں کی صحبت میں بیٹھا کرتا تھا۔ مجھے بڑی عجیب معلومات حاصل ہوتیں۔ میں نے ہر طرح اور ہر رنگ کے فقیر دیکھے۔ مثلاً قلندر، مانگ، رندولی، رقص و سرود کے سیا مے ناب کے متوالے اور خصوصاً رسولِ شہی، جو نماز روزے بے منع کرتے، شراب اور چرس وغیرہ کو جائز بلکہ ضروری سمجھتے ہیں اور خلاف شرع اعمال کرتے ہیں۔ کشف و کرامات ان سے بھی سرزد ہوتی ہیں۔ مزید تحقیق پر پتہ چلا کہ یہ سب محدث الوجود کو ماننے والے ہیں، جن کو اسلامی تصوف اور فقر محمدی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ہندوؤں کے لوگ اور دوسری مشقوں کے ذریعے روحانی طاقت پیدا کر لیتے ہیں۔“ (حقیقتِ محدث الوجود، ص ۲۱)

تو یہ ہے کشف و کرامات کی حقیقت جسے ولایتِ خاصہ کا معیار قرار دیا گیا ہے اور ہم بلا خوفِ تردد کہہ سکتے ہیں کہ تذکروں میں مذکور اکثر اولیائے کرام اسی نوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ متبع سنت اور مشرکانہ عقائد سے متبرک اولیائے کرام کی اگرچہ جان بین کی جائے تو شاید وہ پانچ فیصد بھی نہ نکلے۔

اولیاء اللہ کی گستاخی کا انجام

ایک اور راوی نے بیان کیا ”میں امام جعفر کے ساتھ جا رہا تھا۔ برسرِ راہ ایک

۱۔ امام جعفر صادق کی بے ادبی کا انجام

خشک کھجور کا درخت نظر پڑا آپ نے فرمایا: ”اے کھجور! ہمارے لئے کھانے کا بندوبست کرو۔ کھجور اُسی وقت سرسبز ہوگئی۔ اُس پر خوشے لگ گئے اور ام کی طرف جھک گئے۔ ہم دونوں نے کھجوریں کھائیں جو اتنی میٹھی تھیں کہ میں نے زندگی بھر ایسی کھجوریں نہ کھائی تھیں۔ ایک اور شخص وہاں کھڑا تھا۔ کہنے لگا ”کیا زود اثر جادو ہے۔“ آپ نے فرمایا ”یہ جادو نہیں دُعا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا۔ تم چاہو تو بھی دُعا کرو اور تم گنا نظر آنے لگو۔“ اعرابی اپنی سگ طبعی کے باعث کہنے لگا ”اچھا کرو“ حضرت نے دُعا کی، تو وہ کتابن کر اپنے گھر جانے لگا۔ حضرت ام نے مجھے حکم دیا کہ ”اس کتے کے پیچھے پیچھے جاؤ۔“ جب وہ اعرابی اپنی اہلیہ کے پاس گیا، تو دُعا ہلائی شروع کر دی۔ اس نے ڈنڈا اٹھایا اور گھر سے نکال دیا۔ وہاں سے نکل کر پھر ام کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کے قدموں میں بیٹھنے لگا اور آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ حضرت کو اُس کی حالت پر رحم آگیا اور دُعا کی تو وہ اپنی اصلی حالت میں آگیا۔“ (خزینۃ الاصفیاء، ص ۸۸)

اب یہ بھی غنیمت سمجھئے کہ اس ”ایک اور راوی“ کو اس اعرابی پر رحم آگیا۔ ورنہ اگر وہ یوں لکھ دیتا کہ جب کتا اگر آپ کے قدموں میں بیٹھنے لگا، تو آپ کہہ دیتے کہ ”اب تیرا کمان سے نکل چکا ہے۔“ جیسا کہ کئی اولیاءِ ایسا بھی کہہ دیتے ہیں اور ہمیشہ گناہی رہتا۔ تو وہ ایک اور راوی اس بات کے بھی پورے حقوق رکھتا تھا۔ غور فرمائیے ان راویوں نے اولیاء اللہ کی عوام پر بہت بھٹلانے میں کیسا متوثر کر دار ادا کیا ہے اور کیسے کیسے افسانے تراشے ہیں۔

امام موسیٰ رضا کو مامون الرشید نے ولیعہد مقرر کیا تھا۔ ایک دن آپ خلیفہ مامون کے پاس

۲۔ امام موسیٰ رضا اور قالین کے شیر

اپنی مسندِ آرام پر بیٹھے تھے کہ ایک حاسد اور بدخواہ بھی آگیا اور امام صاحب کو کہنے لگا کہ ”اگر تم اتنے ہی صاحبِ کرامت ہو، تو خلیفہ کے دربار میں کبھی ہوتی قالین پر شیروں کی تصویر کو زندہ کر کے دکھاؤ اور انہیں مہر پر منت کر دو۔ اگر ایسا کر دو تو یہ کرامت اور معجزہ ہوگا۔“ اس بدگھڑا کی یہ گفتگو سننے ہی حضرت امام نے غضبناک ہو کر شیروں کو لٹکا را اور کہا کہ اس کذاب اور دشمنِ اہل بیت کو پکڑ کر اپنا تر لواءہ کر لو۔ حکم ملتے ہی دونوں تصویریں شیریں کر چھپیں اور شہنشاہِ ولایت کے اس بدگو کو اپنے خونیں پنجوں میں دبا کر اس کا ہڈی گوشت سب چبا گئے۔ پھر فرمیں پر گرے ہوئے خون کے قطروں کو چاٹنے لگے۔ خلیفہ مامون یہ منظر دیکھ کر زمین پر گر گیا دونوں شیر اب ام کی پابوسی کے لئے آئے اور زبانِ حال سے کہنے لگے۔ ”اگر آپ حکم فرمائیں تو اس عذار

خلیفہ کو جو ظاہر میں آپ کی دوستی کا دم بھرتا ہے مگر دلی طور پر دشمن اہل بیت ہے، کیفرِ کڈارِ نکت پہنچا دیں۔ آپ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کو ابھی اس کی زندگی مطلوب ہے۔ تم جس طرح تھے اسی طرح ہو جاؤ“ چنانچہ دونوں بہادر شیر اپنی اصلی حالت پر چلے گئے اور شیرِ قالین بن گئے۔ (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۰۳)

دیکھا آپ نے کیا ہولناک انجام ہوتا ہے اولیاء اللہ کی بے ادبی کرنے والوں کا۔ یہ سب کچھ درست مگر دو باتیں کھٹکتی ہی رہ گئیں:

۱۔ دربار میں فرش پر قالین بچھے ہوتے تھے جب شیر نے اس بد گفتار کو تر نوالہ بنایا، تو اس کے خون کے قطرے تو قالینوں میں جذب ہو گئے ہوں گے۔ بعد میں شیر کون سے فرش سے خون کے قطرے چاٹنے لگے تھے۔

۲۔ ام موسیٰ کے والد موسیٰ کاظم نے ہارون الرشید کی جیل میں وفات پائی۔ انہیں زہر دیا گیا۔ پھر آپ کو بھی زہر دیا گیا۔ پھر آپ کے بیٹے ام تقی کو بھی زہر دیا گیا، تو اگر ام موصوف کو اللہ نے کرامت کی اتنی قوت بخشی تھی، تو آپ کے خاندان کا یہ حال کیوں ہوا؟

ایک بار شیخ جنید کے ایک مرید سے کوئی بے ادبی سرزد ہو گئی۔ وہ ندامت کے مائے باہر چلا گیا اتفاقاً

۳۔ جنید بندا دی اور جلوہ گری

راہ میں شیخ سے دوچار ہو گیا۔ شیخ کی نظر پڑی، تو ہیبت سے ایسا گرا کہ سر بھٹ گیا۔ چند قطرے خون کے زمین پر گرے جن سے لفظ ”اللہ“ لکھا گیا۔ شیخ نے جب یہ دیکھا تو فرمایا: ”اچھا! میرے سامنے جلوہ گری کرتا ہے۔“ خدا کی قسم! یہ بچے جو میرے سامنے کھیل رہے ہیں، اس مقام میں تیرے برابر ہیں۔ شیخ کی یہ بات اتنی گراں گزری کہ جاں بحق ہو گیا۔ (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۱۴)

شاید جنید بندا دی صاحب کو اس اپنے گناہ پر نادم مرید کے مرنے کے بعد کچھ رحم آگیا ہو اور اس کے حق میں دعائے مغفرت کر دی ہو؛ تذکرہ نگار نے اس کا ذکر نہیں فرمایا۔ وہ اس لئے کہ اس طرح جو دھاک وہ اولیاء اللہ کی عوام پر بٹھانا چاہتے ہیں، اس میں کمی واقع ہونے کا امکان تھا۔

حدیثہ الاولیاء کے مصنف مفتی غلام سرور اس کتاب کے صفحہ ۱۲۹ پر ایک بزرگ مشیخ عبد الواحد کا ذکر

۴۔ عبد الواحد کی گستاخی کا انجام

فرما ہے ہیں :

”ایک بے ادب عورت نے جس کا بیٹا حضرت کی بیعت میں آکر تارک الدنیا و مجذوب ہو گیا تھا، حضرت کے روبرو بے ادبی کے کلمات کہنے شروع کئے۔ حضرت نے صبر کیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ آخر جب دیکھا کہ غیرت الہی درپے انتقام ہے، تو اپنے خادم کی طرف اشارہ کیا کہ اس عورت کو ایک طمانچہ مار۔ خادم نے زبانی عورت کو منع کیا اور طمانچہ لگانے میں متاثر رہا۔ عورت اسی وقت گری اور مگر تھی۔ حضرت اپنے خادم پر کمال غضب ناک ہوئے اور فرمایا کہ اگر تو طمانچہ لگانے میں دیر نہ کرتا، تو اس عورت کی جان برباد نہ ہوتی، کیونکہ اس حالت میں اس بدگوئی شدید کا انتقام میری طرف سے ہو جاتا اور اب منتقم حقیقی نے یہ انتقام لیا اور جان اس کی جاتی رہی۔ خون اس عورت کا تیری گردن پر ہے۔“

غور فرمایا آپ نے عوام کو اولیاء اللہ کے باطنی تصرف سے بھی اور ان کی بے ادبی کرنے سے مرعوب کرنے کے لئے کیسا افسانہ تراشا گیا ہے کہ آئندہ سب لوگ عبرت حاصل کر لیں۔

بخاری و مسلم دونوں میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ”کسی شخص نے حضور اکرم ﷺ سے کچھ قرض لینا تھا اس نے اگر شدید تقاضا کیا اور سخت سُست الفاظ کہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سخت ناگوار گزرا، تو انہوں نے جوابی کارروائی کا ارادہ کیا، تو آپ نے فرمایا ”اے چھوڑ دو، کیونکہ صاحبِ حق کو باتیں کرنے کا حق ہوتا ہے۔“ دیگر بہت سے انبیاء کی لوگ بے ادبی، گستاخی، توہین، مار پیٹ سخی کہ انہیں قتل بھی کرتے رہے لیکن بسا اوقات غیرت الہی یوں جوش میں نہ آئی، صرف اس بزرگ پر کیوں اتنی جوش میں آگئی کہ پل بھر میں اس عورت کو جان سے ختم کر ڈالا؟

اب ایک دوسرے بزرگ ”خواجہ علاؤ الدین صابری“ کے غضب کا واقعہ سنئے :

۵۔ انتقام سے بچئے

آپ کو خواجہ فرید الدین گنج شکر نے کلیر بھیجا۔ چند ماہ گزر گئے لوگ کچھ متوجہ نہ ہوئے۔ ایک دن آپ جمعہ کی نماز پڑھنے گئے، تو امام کے مصلیٰ پر بیٹھ گئے۔ لوگوں نے کہا: ”یہ قاضی کی جانناز ہے۔ کسی دوسری جگہ بیٹھ جاؤ۔“ آپ نے فرمایا: ”قاضی سے بڑھ کر تہ قطب کا ہے اور ہم اس سرزمین کے قطب ہیں۔“ لوگوں نے یہ بات سننی میں اڑادی اور زبردستی وہاں سے اٹھا دیا۔ آپ پیچھے آکھڑے ہوئے۔ حضرت کو کوئی جگہ نماز پڑھنے کو نہ ملی، تو مسجد کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: ”لوگ سجدہ کرتے ہیں تو بھی سجدہ کر۔“ یہ بات سنتے ہی مسجد چھت اور دیوار کے ان پر گر پڑی اور سب لوگ پینچے آکر ہلاک ہو گئے۔ (مدینۃ الاولیاء، ص ۷۰)

اب گستاخی کا قصور تو تین چار آدمیوں کا ہوگا، لیکن آپ نے غضب میں آکر سب لوگوں کو ہلاک کر دیا، اور ساتھ ہی ساتھ مسجد کو بھی۔ اور ان کا قصور فقط یہ تھا کہ وہ اس بزرگ صاحب کی طرف متوجہ نہ ہوئے تھے۔
۵۔ ستوں شہیم بددور میں آپ دیں کے نمونہ میں خلقِ رسولیٰ امیں کے

۶۔ جانوروں سے بھی انتقام

اور پیرانِ پیر شیخ عبدالقادر کے کسی کا بیڑہ غرق کرنے کا قصہ تو زبانِ زد خاص و عام ہے۔ پورے بارہ سال بعد آپ نے پھر اپنی نظرِ کرم سے اس غرق شدہ بیڑے کو تار دیا۔ آپ کی یہ نظرِ کرم جانوروں کو بھی معاف نہیں کیا کرتی تھی۔ مثلاً چند درج ذیل واقعات ملاحظہ فرمائیے :

۱۔ ایک دفعہ ایک چیل آپ کی مجلسِ وعظ کے اوپر منڈلانے لگی اور چلانے لگی، آپ نے ہوا کو حکم دیا کہ اس کا سر کپڑے۔ آپ کا یہ فرمان تھا کہ اس بیچاری چیل کا سر جدا ہو کر زمین پر گر پڑا۔ پھر آپ منبرِ شریف سے اترے اور سر اور دھڑ دونوں ہلا کر لمبے اندر پڑھا اور اپنا ہاتھ مبارک پھیرا تو وہ اللہ کے اذن سے زندہ ہو کر اڑنے لگی اور لوگوں نے اس کا مشاہدہ کیا۔ “دیجۃ الاسرار، ص ۶۵ کے ملاحظہ فرمائیے۔ منہجۃ السیرت بحوالہ سیرتِ نوٹ، ص ۱۹۲

۲۔ اسی طرح ایک روز ایک چوہے کی سختی آگئی، جو چھت سے مٹی گرا رہا تھا۔ زمین دفعہ آپ پر مٹی گر گئی، چوتھی دفعہ جو گر گئی، تو آپ نے جلالت سے اس کی طرف دیکھ کر فرمایا طَارَ رَأْسُكَ آپ کا یہ فرمان ہی تھا کہ چوہے کا سر ایک طرف اور دھڑ ایک طرف جاگرا۔ دشتِ قادریہ، ص ۲۲، قلائدِ انوار، ص ۳۵ بحوالہ سیرتِ نوٹ، ص ۲۱۱

۳۔ ایک دفعہ وضو کے دوران ایک چڑیا نے آپ پر بیٹ کر دی، تو آپ نے جلالت سے دیکھ، تو سَقَطَ مِیْنًا یعنی وہ اسی وقت گر کر مر گئی۔ (حوالہ ایضاً)

گویا جو چیر بھی آپ کی طبعِ نازک پر گراں گزرتی۔ آپ فوراً اپنی نظرِ کرم سے اس کو جان ہی ختم کر ڈالتے تھے۔ غور فرمائیے اس انتقامی کاروائی کی رحمتِ للعالمین کے اسوۂ حسنہ سے کچھ مشابہت ہے؛

۷۔ مُردہ ولی کے انتقام سے بھی بچئے

یہ تو خیر زندہ ولیوں کی گستاخی کی بات تھی۔ اب دیکھئے۔ ان کے مزارات سے

گستاخی کا بھی یہی انجام ہوتا ہے۔ ذکرِ حضرت ایشاں کا ہور ہا ہے :

”خان دوران صوبہ دار لاہور جو خشک ملا تھا اموشاخ عظام کے ساتھ اس کو کمال عداوت تھی۔ برسرِ پناش ہوا اور مجاور کو بلا کر کہا کہ اس روخصے کو گرا دیا جائے۔ مجاور نے جواب دیا مجھ کو گرانے کا اختیار نہیں، آپ کو اختیار ہے تو گرا دو۔ دوسرے دن صوبہ دار وہاں آیا اور اسے گرانے کا حکم دیا مگر جب وہاں سے لوٹ کر شالامار باغ کو چلا۔ تو راستہ میں گھوڑے نے ناخن لیا، گھوڑے سے گرا، گردن ٹوٹ گئی، تین دن زندہ رہ کر مر گیا۔ نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ غَضَبِ الْاَوْلِيَاءِ“ (صدقۃ الاولیاء، ص ۱۲۲)

اب دیکھئے کہ فتح مکہ کے بعد ۱۱ھ میں خود حضور اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس مہم پر روانہ کیا، جو روخصے، قتبے، مزار اور ایک بالشت سے اونچی قبریں ہیں، سب کو گرا کر ہموار کر دیا جائے اور ان خداؤں کی خدائی کا خاتمہ کیا جائے۔ آج پھر کیسے حیلوں بہانوں سے یہ خدائی پھر عوام پر مستط کی جا رہی ہے۔

۲۔ عشق و مستی

دینِ طریقت کا پہلا زینہ عشق الہی قرار دیا گیا ہے، بلکہ صوفیاء ایمان کی تشریح ہی عشق و محبت سے کرتے ہیں (حقائق الاخیار، صادق فرغانی، ترجمہ بنام تلعین مرشد کامل، ص ۳۴۸) عشق عربی زبان کا لفظ ہے۔ لیکن یہ لفظ عموماً بڑے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم یا احادیث صحیحہ میں کہیں بھی یہ لفظ مذکور نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے یا اس کے رسول اکرم ﷺ سے محبت خواہ کتنی ہی زیادہ ہو اس کے لئے حُب کا لفظ ہی استعمال ہوا ہے۔ حتیٰ کہ قرآن کریم نے اسے سورۃ یوسف میں، جبکہ زلیخا کو واقعی حضرت یوسف علیہ السلام سے منسوب عشق تھا اس لفظ کے استعمال سے پرہیز کیا اور اس کی جگہ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا یعنی محبت زلیخا کے دل کے پردے تک پہنچ گئی تھی یا گھر گئی تھی کے الفاظ استعمال کئے، اس لئے کہ عشق کے لفظ سے غیر شعوری طور پر طبیعت فحاشی اور ہیمنیت کی طرف مائل ہو جاتی ہے، لیکن دینِ طریقت کا مدار ہی ’عشق‘ پر ہے اور اس لفظ کو بڑے فخریہ انداز میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

قَدْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ
یُحِبِّکُمْ اللّٰهُ

(۲/۲۱)

(اے پیغمبر! لوگوں سے کہہ دو اگر تم خدا سے محبت چاہتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا تم سے محبت رکھے گا۔

بتلاتے بھلا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ بھی کوئی اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والا کون ہو سکتا ہے، لیکن یہاں بھی لفظ محبت ہی استعمال ہوا ہے مگر متصوفین اور شاعروں نے اس لفظ کا پُر پیچہ اس رنگ میں کیا کہ یہ لفظ ایمان کا مترادف اور ایک بہت اچھی صفت قرار دیا گیا۔ مولانا روم، حافظ شیرازی اور علامہ اقبال نے اس لفظ کو دوام بخشا۔ مثلاً علامہ اقبال کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر وہی قرآن، وہی فراق وہی حسین، وہی طہ
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوت ایمانی کی تعریف بھی اس لفظ سے کی جا رہی ہے اور اس کے مقابل عقل کو لاکھڑا کیا گیا ہے۔

بے خطر کوڈ پڑا آتشِ نرود میں عشق عقل ہے محو تماشائے لبِ بامِ ابھی
اسی طرح عام مسلمانوں کی قوت ایمانی کو بھی اس لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے :-
ہرگز نہ میرد آنکہ دشمن زندہ شد بشوقِ ثبوت است بر جسریدہ عالمِ دوامِ ہا (مظہیر الی)
ترجمہ: وہ شخص کبھی نہیں مرتا جس کا دل عشق سے زندہ ہے۔ صحیفہ کائنات پر ہمارا دوام اسی عشق کی برکت سے ثبوت ہو چکا ہے۔

اب ہم دیکھیں گے کہ دینِ طریقت میں عشق کی مداخلت کیوں ضروری قرار دی گئی۔ ابن عربی جو ہمارے صوفیاء کے شیخ اکبر ہیں۔ اس کا فلسفہ یوں بیان کرتے ہیں :

”اللہ نے انسان کے وجود سے ایک دوسرے وجود کو جو اسی کی شکل پر تھا، نکالا۔ اور اس کا نام عورت رکھا۔ یوں سمجھئے کہ عورت آدمی کا ظہور ہے۔ جب انسان عورت کی طرف جھکتا ہے، تو گویا اپنے نفس کی طرف شوق کرتا ہے اور عورت، جو آدمی کی طرف مائل ہوتی ہے، تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک مسافر اپنے اصلی وطن کی طرف کشش رکھتا ہے۔ اسی لحاظ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عورتیں زیادہ محبوب تھیں۔ پھر اللہ کی محبت جس مخلوق کے ساتھ زیادہ تھی۔ اللہ نے اس مخلوق کو اپنی شکل پر پیدا فرمایا اور فرشتوں سے سجدہ کروایا۔ اس میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ انسان کو معلوم ہو کہ اللہ اور انسانوں میں کس قدر مناسبت ہے اور شکل و صورت کے لحاظ سے کس قدر ہم آہنگی ہے۔“ (خصوص الحکم، ص ۲۱۶)

”پھر جس طرح عورت ہم شکل اور وطن ہونے کی وجہ سے مرد سے محبت کرتی ہے۔ اسی طرح انسان خدا سے محبت کرتا ہے اور جس طرح مرد اس کا جزو اور ہم شکل ہونے کی بناء پر عورت کی طرف مائل ہوتا اور محبت کرتا ہے۔ اسی طرح خدا ہی انسان کی طرف مائل ہوتا اور محبت کرتا ہے پس تین چیزیں سامنے آئیں۔ خدا مرد اور عورت۔ گویا جس طرح عورت کو مرد کی کشش ہوتی ہے۔ اسی طرح مرد کو اپنے رب کی کشش ہوتی ہے“ گویا کسی عورت کے ساتھ محبت بھرے الفاظ و اخلاق کو تخلقوا باخلاق اللہ کی منزل قرار دیا جا رہا ہے۔

آپ نے یہ بات تو صوفی لوگوں سے اکثر سنی ہو گی کہ عشق حقیقی کی ابتدا عشق مجازی یعنی عورت کے عشق سے ہوتی ہے۔ اس کے تحت میں بھی یہی فلسفہ کام کر رہا ہے۔ ابن عربی کا کہنا ہے کہ ”جب مرد عورت سے محبت اور جماعت کرتا ہے، تو یہ مشاہدہ حقیقی کی اکل ترین صورت ہوتی ہے اور وہ عورت میں خدا کا مشاہدہ کرتا ہے، یعنی عورت جو منفصل ہے، اس میں اس کو خدا نظر آ رہا ہے اور ظاہر ہے کہ مادیات سے ہٹ کر خدا کا مشاہدہ تجربہ ہی صورت میں نہیں ہو سکتا۔“ (فصوص الحکم، ص ۲۱۴)

عشق مجازی اور حقیقی کی تقسیم

ابن عربی نے تو مشاہدہ حق کے لئے عورت کا وجود ضروری سمجھا، خواہ کوئی خلوت ہو، مگر دوسرے صوفی

عشق مجازی اور امرِ پرستی

اکثر امرِ دِیابے ریش لڑکے کو پسند فرماتے ہیں۔ اس بارہ میں اُن کا ایک مقولہ بھی ہے، یعنی :

النَّظَرُ إِلَى وَجْهِ الْأَمْرِ عِبَادَةٌ

یعنی بے ریش لڑکے کے چہرے کی طرف دیکھنا عبادت ہے۔

چنانچہ شبلی خود بیان کرتے ہیں کہ ”مجھے اس وقت تک سکون حاصل نہیں ہوتا، جب تک کسی بے ریش لڑکے کو نہ دیکھ لوں۔“ (الطبقات الشرائف، ص ۱۰۴)

اور یہی تیسری صدی کے صوفی ابو بکر شبلی روایت کرتے ہیں کہ ”میں نے ایک بار ابلیس کو دیکھ کر آواز دی، تو اس نے کہا، مجھے تجھ سے کچھ کام نہیں، میں تمہاری لگ رہی سے فارغ ہو چکا ہوں۔ میں نے پوچھا، وہ کیسے؟ ابلیس کہنے لگا، تم نوخیز لڑکوں کے ساتھ محبت کرتے ہو؟“ شبلی نے بیان کیا کہ اِقْتَنَاءِ یہ ایسی چیز ہے جس سے کوئی صوفی محفوظ رہا ہو؟ (الطبقات الشرائف، ص ۱۰۴)

اب صوفی عبد الغنی نابلسی کے عشقِ مجازی کے متعلق ارشاد است

اللہ تعالیٰ پر الزام

ملاحظہ فرماتے :

إِلَهٌ لِّسَ لِلْعُشَاقِ ذَنْبٌ لَا نَكَ أَنْتَ تَبْلَى الْعَاشِقِينَ
 اے میرے خدا! عاشقوں کا کیا گناہ ہے، جبکہ تو خود ہی عشاق کو عشق میں مبتلا کرتا ہے۔
 وَ تَخْلُقُ كُلَّ ذِي وَجْهِ جَمِيلٍ تَكَادُ لَهُ تُصَلِّبُ الْعَايِدِينَ
 اور تو ہی خوبصورت چہروں کا خالق ہے جن کی خوبصورتی کی وجہ سے عبادت گزاران کے سامنے
 سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔

وَتَأْمُرُنَا بِبَعْضِ الْبَصِيرِ مِنْهُمْ كَيْ نَنَكَ مَا خَلَقْتَ لَنَا عِيُونًا
 پھر ہمیں حکم دیتا ہے کہ ان سے نگاہیں نیچی رکھیں کیا تو نے ان کو دیکھنے کے لئے ہمیں آنکھیں عطا نہیں
 کیں۔ (فتح الربانی للفیض الرحمٰنی، ص ۲۷)

یہ اشعار محض شاعرانہ تصورات نہیں، بلکہ عشق مجازی، حقیقی اور معرفت کی جان ہیں، جو ایک صاحب
 حال متصوف نے کہے ہیں۔

بعد میں عشق مجازی کا یہ نظریہ آہستہ آہستہ دینِ طریقت
 کی بنیاد قرار پا گیا۔ عارف جامی فرماتے ہیں:

عشق مجازی کے فضائل

متاب از عشق اور کچھ مجازی ست کہ آن بہر حقیقت کار سازی ست
 ترجمہ: عشق سے روگردانی نہ کر اگرچہ مجازی ہو۔ کہ یہ حقیقت (عشق حقیقی) کے لئے ایک جیل ہے۔
 اور اس سلسلہ میں ایک موضوع حدیث بھی پیش کی جاتی ہے:

مَنْ عَشَقَ فَعَفَفَ وَكَتَمَ فَمَاتَ
 جو شخص کسی پر عاشق ہو جائے، پھر عیفت ہے اور پوشیدہ
 رکھے، پھر مر جائے، تو وہ شہید مرے گا۔ (تہذیب عشق و کرم)

مولانا اشرف علی تھانوی صاحب یہ حدیث درج کرنے کے بعد اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ ”یہ
 عشق غیر اختیاری ہوا (خود پیدا کردہ نہ ہو) پھر اس کی بات کسی سے نہ کرے، نہ کسی سے اس کی بات نہ
 نہ ہی دل میں اس کا خیال لائے۔ سوال یہ ہے کہ وہ عشق ہی کیا ہو جس کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔ آگے
 چل کر تھانوی صاحب لکھتے ہیں:

”اور بعض مشائخ نے جو بعض طالبین کو عشق مجازی پیدا کرنے کا مشورہ دیا ہے اس سے عشق حلال مثلاً
 بی بی سے) مراد ہے نہ کہ حرام (ایضاً ص ۱۳۷)

غور فرمائیے! اپنی بی بی سے پیار و محبت کرنے کو کوئی ان اصطلاحی معنوں میں عشق کہتا ہے؛ بی بی سے پیار و محبت تو ایک فطری داعیہ اور مخصوص طریقہ ہے، جس کی خود اللہ تعالیٰ نے تلقین کی ہے۔ اس کا عشق مجازی سے کیا تعلق؛ غرض مجدد صاحب موصوف اپنے اکابر کے اس مسئلہ پر بڑے اُلجھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پھر اس عشق مجازی کا فائدہ یہ بتلاتے ہیں کہ جب قلب کا انجن گرم ہو جائے، تو پھر اس کا رُخ عشق الہی کی طرف بآسانی موڑا جاسکتا ہے۔ یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ عشق ہی کیا جس کا رُخ موڑنا اپنے بس میں ہو۔ پھر فرماتے ہیں کہ صوفیاء کے دل کی گرمی اور سوز وہ گوہر نایاب ہے، جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا ہے۔ تصوف کے سینہ بہ سینہ ہونے کے یہی معنی ہیں (ص ۱۴۱) گویا اپنے پوری طرح اعتراف کر لیا کہ تصوف کا اصل جوہر دل کی گرمی ہے، جو عشق مجازی سے پیدا ہوتی ہے۔

عشق کے منجملہ فضائل میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عاشق الہی کا جنازہ یا عرش الہی؛

ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ:

”ابو مولے کہتے ہیں کہ رات میں نے خواب دیکھا کہ عرش الہی سر پر اٹھائے اڑ رہا ہوں۔ اس خواب سے سخت متعجب ہوا اور اس کی تعبیر پوچھنے کے لئے بایزید بسطامی کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ آپ کا وصال ہو گیا ہے اور بے شمار مخلوق ہر طرف سے جمع ہو رہی ہے۔ جنازہ اٹھایا گیا، تو میں نے چاہا کہ اسے کندھا دوں، مگر کثرتِ ہجوم کی وجہ سے میری باری نہ آتی تھی۔ بالآخر جنازہ کے پیچھے گھس کر اُسے اپنے سر پر اٹھالیا، تو ناگہاں اس وقت کیا سنتا ہوں کہ کوئی کہہ رہا ہے۔ ”اے ابو مولے! یہی تیرے خواب کی تعبیر ہے۔ وہ عرش الہی تو یہی عاشق الہی کا جنازہ ہے۔“ (صوفیائے نقشبند، ص ۹۵)

اس لحاظ سے جتنے عاشقان الہی اس طبقہ میں پائے جاتے ہیں۔ انہیں بھی اور ان کے سینوں کو بھی عرش الہی ہی سمجھا جاتا ہے۔

اس عشق کی گرمی سے متعلق بھی صوفیاء میں درج ذیل مقولہ زبانِ زدِ خاص و عام ہے:

الْعَشْقُ نَارٌ يَهْرَقُ مَا سَوْفَ اللَّهُ عشق ایک ایسی آگ ہے جو اللہ کے سوا ہر چیز کو جلا دیجیے

پھر اس مقولہ کی عملی تفسیر و تعبیر جو پیرانِ پیر نے واقعاتی دنیا میں پیش فرمائی، وہ بھی ملاحظہ فرمائیے:

العشق ناز کی عملی تعبیر

صاحب ”مناقب غوثیہ“ حضرت شیخ محمد صادق شیبانی فرماتے ہیں: ”ایک روز میں غوث الاعظم کی خدمت میں حاضر

تھا۔ آپ نے اپنے ایک خادم سے کہا: ”سید احمد فاعی (م ۵۲، ۵۳) کے پاس جا اور پوچھ کہ عشق کیا ہے؟ اور اس کا جواب مجھے لاکر دے۔“ خادم ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور حضرت کا پیغام دیا۔ یہ سُنتے ہی انہوں نے ایک آہ جاں کاہ اپنے سینہ پر سوز سے کھینچی اور کہا کہ عشق ایسی آگ ہے جو ماسوا اللہ کو جلا ڈالتی ہے۔ ان کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ جس درخت کے پتے آپ بیٹھے ہوئے تھے وہ جل اٹھا اور سید احمد فاعی بھی اُس کے ساتھ جل کر خاکستر ہو گئے۔ پھر وہی راکھ پانی ہو کر برف کی مانند جم گئی۔ خادم خوفزدہ ہو کر خدمت غوث الاعظم میں حاضر ہوا اور تمام ماجرایاں کیا۔ فرمایا: پھر اُسی جگہ جا اور اس کو بخور اور عطر سے معطر کر۔ جسم سید احمد اس عام عنصری کی طرف عود کرے گا۔ چنانچہ خادم اسی جگہ واپس آیا۔ اس جگہ کو معطر کیا تو جو پانی سید احمد کی جگہ جما ہوا تھا۔ اس نے جسم کی صورت اختیار کر لی اور سید احمد دوبارہ زندہ ہو گئے۔“

(غزنیۃ الاصفیاء، ص ۱۷۱)

یہ قصہ تو بہت اچھا ہے مگر یہ سمجھ نہیں آئی کہ:

۱۔ عشق کی اس آگ سے سید فاعی بھی جل کر خاکستر ہوئے اور درخت بھی۔ مگر پاس کھڑا خادم صحیح و سلامت بچ گیا، کیا وہ ماسوا اللہ نہیں تھا؟

۲۔ عشق کا کام تو ماسوا اللہ کو جلا ڈالنا ہے۔ پھر اسے پانی اور پھر برف میں تبدیل کرنا نہیں۔ پھر یہ عمل اکیلے سید فاعی پر ہوا۔ درخت پر نہیں ہوا۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ایسے عشق کے جلے ہوتے لوگوں کا علاج بخور اور عطر ہوتا ہے۔

بہر حال صادق شیبانی صاحب کی داد دیجئے کہ انہوں نے العشق نازِ یحرق ماسوا اللہ کی عملی تعبیر پیش کر دی۔

ان اولیاء اللہ نے ہم خرماد ہم ثواب کے مصداق عشقِ مجازی کے اس کارِ خیر میں حصہ لیا۔ ان میں چند ایک کا ذکر ہم یہاں کریں گے۔ اس سے پہلے ہم حکیم سرمد دہلوی کا ذکر پہلے باب میں کر چکے ہیں کہ وہ کس طرح ایک ہندو لونڈے پر عاشق ہوئے۔ اس کے عشق میں دیوانہ ہو گئے، تو انہیں ”مجدوب“ کا مقدس لقب مل گیا تھا۔

شیخ حسین لاہوی (م ۱۰۵۲ھ) کا عشق

بہلول دریائی (م ۹۸۳ھ)
کے خلیفہ تھے۔ ۳۶ سال

ویرانے میں ریاضت و مجاہد کیا۔ رات کو داتا گنج بخش کے مزار پر اع تکاف میں بیٹھتے۔ آپ نے طریقہ لامتیہ اختیار کر لیا۔ دارالکھوہ نے انہیں ملاقیوں کے گروہ کا سر ڈال رکھا ہے۔ چار اردو کا صفایا۔ ہاتھ میں شراب کا پیالہ، سر دو نغمہ، چنگ و رباب، تمام قیود شرعی سے آزاد، جس طرف چاہتے، نکل جاتے۔

(خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۱۸)

روایت ہے کہ ایک شخص حاجی یعقوب نامی مدینہ منورہ کا رہنے والا تھا۔ وہ ہمیشہ شیخ حسین کو روضہ نبویؐ میں متکلف دیکھتا۔ وہ ایک مرتبہ لاہو آیا، تو ایک جگہ بازار میں دیکھا کہ ڈھول بج رہا ہے اور شیخ شراب کے نشہ میں چورقص کر رہا ہے۔ دیکھ کر شیخ حسین کو پہچان لیا، مگر سخت حیران ہوا کہ یہ کیا بات ہے؟ شیخ نے کہا ”انکھیں بند کرو۔“ اس نے آنکھیں بند کرتے ہی اپنے آپ کو مدینہ منورہ میں اور حسین کو روضہ نبویؐ میں متکلف پایا۔“ (ایضاً، ص ۲۲۱)

”نقل ہے کہ حسین کے دشمنوں نے اکبر بادشاہ سے شکایت کی کہ ”لاہو میں ایک شیخ حسین نامی ہے دائمی مونچھیں منڈواتا ہے۔ سُرخ لباس پہنتا ہے اور کھلے بندوں خلاف شریعت امور کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایک حسین لڑکے مادھو کو اپنے پاس رکھتا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ڈھول کی آواز پر رقص کرتا ہے۔ اس کے باوجود باطنی ولایت کا دعویدار بھی ہے۔ بادشاہ نے اسے بلایا، تو حسین اسی طرح مست و غمور جام و صراحی لئے دربار میں حاضر ہوئے۔ اکبر نے کہا ”تو سلسلہ قادریہ کا پیرو ہو کر یہ نئے نوشی اور امر ذہ پرستی کیوں کرتا ہے؟“ اس کے جواب میں حسین نے اپنی صراحی سے ایک پیالہ اکبر کے سامنے پیش کیا۔ اکبر نے دیکھا وہ سر و پانی تھا۔ دوسرا پیالہ پیش کیا، تو وہ شربت سے پُر تھا۔ اسی طرح تیسرا پیالہ دودھ سے۔ اکبر سخت حیران ہوا اور غرض امتحان جیل بھجوا دیا کہ اگر صاحب کرامت ہے، تو زنداں میں نہیں رہ سکتا۔ اکبر جب اسے جیل بھجوا کر زنان خانہ میں گیا، تو شیخ حسین کو بادشاہ یگم کے پاس کھڑا دیکھا۔ پھر قید خانہ میں گیا، تو حسین کو وہاں بھی موجود پایا۔ یہ دیکھ کر اکبر نے اسے رہا کر دیا۔“ (ایضاً، ص ۲۲۲)

”صاحب حقیقت الفقراء لکھتے ہیں کہ شیخ حسین کے مرید نو ہزار کے قریب تھے، جو ان کے فریے کامل و اکمل ہوتے۔ بعض نے شیخ کے مریدوں کی تعداد ایک لاکھ پچیس ہزار لکھی ہے۔ ان میں سے سولہ خفا

زیادہ مشہور ہوئے۔ ان میں سے چار کا خطاب غریب ہے، چار کا دیوان، چار کا خاکی اور چار کا بلاول۔
دیوان یہ ہیں :

”پہلا دیوان مادھو۔ رامادھو لال ہندو لڑکا، جو آپ کا معشوق تھا، ولی کامل ہوا۔ اور آپ کے ساتھ لاہور میں مدفون ہے) دوسرا دیوان گورکھ، تیسرا دیوان بخش، چوتھا اللہ دیوان، لاہور میں مدفون ہے۔“
(ایضاً ۲۲۳)

”جب تک کوئی شخص دارہی مونچھ کا صفایا نہ کر دیتا، اس وقت مرید نہ سمجھا جاتا۔ وہ اپنے ہاتھ سے مرید کو شراب کا پیالہ دیتے، اگر وہ پی لیتا، تو مریدوں میں سمجھا جاتا (گو باہی اس کی بیعت تھی) ورنہ مجلس سے باہر نکال دیا جاتا۔ ان ظاہری بدعتوں اور خلافِ شریعت باتوں کے باوجود ولی سمجھے جاتے تھے..... داراشکوہ نے ”حسنات العارفین“ میں اُن کی بڑی تعریف کی اور ایک دو کرامتوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ اپنی تصنیف ”شطحیات“ میں لکھتا ہے کہ ”شہزادہ سلیم اور اکبر کی اکثر بیگمات اس کی حقیقت مند تھیں، سلیم نے خاص کر ایک درباری بہار خان نامی کو مقرر کر رکھا تھا، جو اُن کا روزنامہ لکھتا ہے۔ اور یہ روزنامہ رسالہ بہاریہ کے نام سے مشہور ہے۔“ (ایضاً، ص ۲۱۸ کا ماحشیہ)

شیخ مادھو حسین لاہوری کے خلفاً ارجمند اور
محبوبانِ دل پسند میں شمار ہوتے ہیں۔ شاہدہ

ذکر معشوق شیخ مادھو لاہوری

کے ایک برہمن کے لڑکے تھے۔ بڑے صاحبِ جمال اور خوش شکل تھے۔ ایک دن گھوڑے پر سوار جا رہے تھے کہ شیخ حسین کا دل موہ لیا۔ بس پھر کیا تھا، شیخ حسین لاہور چھوڑ کر شاہدہ میں آگئے۔ ساری رات مادھو کے مکان کا طواف کرتے اور ان کے متعلق جہاں سے خبر ملتی کہ مادھو لال فلاں جگہ ہے، وہاں چلے جاتے۔ ان حالات نے شاہ حسین کے عشق کو زمانہ میں مشہور کر دیا۔ آخر اس عشق کے اثرات مادھو لال کے دل پر وارد ہونے لگے اور وہ بھی شیخ حسین کے پاس آنے لگا۔ والدین آڑے آئے مگر بے سود۔ آخر مادھو سے کہنے لگے۔ ہم گنگا نشان کرنے جا رہے ہیں، تم بھی ہمارے پاس چلو۔ مادھو لال، شیخ حسین کے پاس اجازت کے لئے گیا، تو شیخ حسین نے کہا۔ والدین سے کہہ دو۔ ”تم جاؤ، بوقتِ غسل میں موجود ہوں گا۔“ مادھو لال اس کرامت کے مظاہرہ کے لئے لاہور رہ گئے۔ جب غسل کا وقت تھا، تو شیخ حسین نے مادھو لال سے کہا ”آنکھیں بند کر کے میسرے قدم پر قدم رکھتے آؤ۔ تھوڑی دیر بعد شیخ حسین نے کہا اب آنکھیں کھول لو۔“

مادھو نے دیکھا کہ وہ دریائے گنگا میں اپنے والدین کے ساتھ غسل کر رہے ہیں اور شاہ حسین بھی کنارے پر موجود ہیں۔ مادھو والدین سے ملاقات کے بعد اسی طرح شیخ حسین کے قدم پر قدم رکھ کر واپس لاہور پہنچ گئے اور مسلمان ہو گئے۔ دو ماہ بعد ہولی اور بسنت کے تہوار آئے، تو شیخ حسین نے مادھو لال کی دیکھائی کے لئے مجلس سماع و سرود منعقد کی اور علم مستی میں ایک دوسرے پر بسنتی رنگ پھینکا، چنانچہ تاحال یہ رسم جاری ہے اور شیخ حسین کے معتقدین آپ کے مزار پر گلابی رنگ پھینکتے ہیں۔ اس مجلس میں مادھو لال شیخ حسین کی بیعت ہوا اور شیخ کی نگاہ کیسیا اثر نے مادھو لال کو کمالات فقر پر پہنچا دیا۔

(ذخیرۃ الاصفیاء، ص ۲۵۰، ۲۵۱)

مادھو لال حسین کے عشق کی داستان ہم نے ذرا تفصیل سے اس لئے لکھی ہے کہ اس سے مروجہ ولایت کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً:

- ۱۔ ایسا بے دین، امر ذرپرست اور کبارتر کا مرتکب بھی ولی ہو سکتا ہے اور ایک نگاہ کیسیا اثر سے کمالات فقر تک پہنچا سکتا ہے۔ یعنی کمالات کا معنی شعبہ بازیوں اور ولی بمعنی شعبہ باز۔
 - ۲۔ ایسے اولیاء اللہ بھی تذکروں کی زینت اور قابل احترام قدس سہ سچھے جاتے ہیں۔
 - ۳۔ ولایت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ ورنہ مادھو لال کا کم از کم نام ہی تبدیل کر دیا جاتا۔
 - ۴۔ جو لوگ ان اولیاء کے ہاتھ پر مسلمان ہوتے ہیں۔ وہ دراصل شعبہ بازیوں سے متاثر ہوتے ہیں۔
- ایسا ہی اسلام انہیں بھی پسند ہے۔

تاج محمود قادری نوشاہی

صاحب تذکرہ نوشاہی آپ کے صاحبزادے شیخ آفتاب کی زبانی نقل کرتے ہیں کہ ایک روز شیخ محمود بجات سکرو استغراق کنوئیں پر بیٹھے تھے کہ ایک نئی ذہن کی ڈولی ادھر سے گزری، آپ چونکہ حسن پرست اور عشق پرست تھے۔ اس ڈولی کے پاس جا کر اس سے کہا کہ ”اس ڈولی کا پردہ اٹھا، تاکہ میں صانع حقیقی کا جلوہ اس آئینہ قدرت میں دیکھوں۔“ ڈلہا یسٹن کر بڑے غصہ میں آیا اور بدکلامی سے مخاطب ہوا اور آگے بڑھ گیا۔ ابھی تھوڑی ہی راہ طے کی تھی کہ ذہن خود بخود دیوانہ وار نکل آئی اور زمین پر پڑنے لگوٹنے لگی اور کپڑے پھاڑ ڈالے۔ اس کا شوہر بے حد پریشان ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی آستخی کی معافی چاہی۔ آپ نے فرمایا۔ ”جاؤ! تنہا ہی ذہن اب اصلی حالت پر آگئی ہے۔“ (ذخیرۃ الاصفیاء، ص ۲۸۵)

دیکھا آپنے کس طرح ان اولیاء اللہ کے ہاتھوں قرآن کے احکام پردہ کی مٹی پلید ہوتی ہے۔ حیرت یہ ہے کہ ایسے شعبہ بازوں کو بھی تذکرہ نگار قدس سرہ کے القاب سے نوازتے اور ان کی داتا نول کو اپنے تذکروں کی زینت بناتے ہیں اور یہ اولیاء اللہ خود ہی مجرم نہیں ہوتے، بلکہ شعبہ بازیاں دکھلا کر دوسروں کو اپنا معتقد بناتے اور اپنی بے ہوشیوں کے لئے راہ ہموار کرتے پھرتے ہیں۔

”مشہور یہ ہے کہ حضرت نوشاہ قوم گلو (کہار) سے تعلق رکھتے ہیں، مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ آپ قوم کھڑ (کھوہ)

حاجی محمد قادری نوشاہی

سے تھے۔ اس قوم (گلو، کہار) سے مشہور ہو جانے کی وجہ یہ تھی کہ آپ کے بزرگوں میں سے کوئی بزرگ اس قوم (گلو، کہار) کی ایک حسین و جمیل لڑکی پر عاشق ہو گئے تھے اور اس کے عشق میں ایسے خود رفته ہوئے تھے کہ اسی قوم کے طور طریقے اختیار کر لئے۔ آخر یہ عشق مجازی عشق حقیقی میں تبدیل ہو گیا اور آپ مرۃ اولیاء میں آ گئے۔“ (خزینۃ الاولیاء، ص ۲۶۶)

ہمارے خیال میں زمرۃ اولیاء میں شامل ہونے کا یہ نسخہ بڑا دل گھتا بھی ہے، آسان بھی اور بہترین بھی۔

آپ قطبُ العالم، غوث ربانی، بشر
یزدانی اور مادر زاد ولی تھے۔ خزینہ

میاں شیر محمد شر قپوری (م ۱۳۳۱ھ)

معرفت کا مصنف بیان کرتا ہے کہ ”ایک مرتبہ آپ کو ایک نو عمر لڑکے غلام محمد کٹاریہ سے محبت ہو گئی۔ اس کے عشق میں اس درجہ محویت ہوئی کہ آپ ہر وقت اسے یاد کرتے رہتے۔ جب اسے نہ پاتے، تو بے چین ہو کر اُسے ڈھونڈنے نکل جاتے اور تلاش کر کے لاتے اور جب کبھی وہ چلا جاتا، تو اکثر فرماتے۔ ادھر عشق ستار ہا ہے ادھر غلام محمد یاد آرہا ہے۔ بہت عرصہ دراز تک میاں صاحب اس نوجوان کے عشق میں مبتلا رہے اور آہ و فغاں کرتے رہے۔ پھر کافی مدت بعد آہستہ آہستہ اس سے کسی قسم کا تعلق نہ رہا۔“ (صوفیۃ

نقشبند، ص ۳۶۵)

ان واقعات سے آپ کو یہ تو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اگرچہ یہ اولیاء اللہ غیر محرم عورتوں سے بھی عشق فرماتے ہیں، تاہم لونڈوں کو زیادہ پسند فرماتے ہیں اور اگر کوئی لڑکا ہندو بھی ہو، تو پھر عشق مجازی اپنی پوری بہار دکھاتا ہے اور یہ سب کام متبرک اس لئے ہے کہ یہ عقیدہ بنا کر پیش کیا گیا ہے کہ عشق مجازی ہی عشق حقیقی یا معرفت کا پہلا زینہ ہے۔ پھر ان لوگوں نے عشق مجازی کی آڑ میں حیوانات کو بھی نہ چھوڑا۔

عشق مجازی اور حیوانات

ان صوفیوں میں ایک صوفی "بید علی ویش" ہیں وہ کسی کو گدھی پر سوار دیکھتے، تو اترنے کا حکم دیتے اور کہتے کہ اس کا ستر تھم رکھ تاکہ میں اس سے بدلی کروں۔ اگر وہ انگار کرتا تو زمین سے چمٹ جاتا اور وہ ایک قدم نہ چل سکتا سوا بیچارہ مجبوراً تو ایک طرف نظر کر لیتا یا پھر یہ نظر اقرار برداشت کرتا۔ جبکہ دوسرے لوگ پاس سے گزر رہے ہوتے۔ (فضائح صوفیہ، ص ۱۳۶ عربی مطبوعہ کوہت)

اب دیکھئے۔ یہ بزرگ ویش تو اس لئے کہلاتے کہ وحشی جانوروں سے صحبت فرمایا کرتے تھے۔ تاہم صوفیاء کے طبقہ میں ان حضرت کی بزرگی بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ پھر ان لوگوں کی مکاری ملاحظہ ہو۔ ان لوگوں نے اپنے آپ کو ملائکہ کہلانا شروع کر دیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی ملامت سے بھی ان کے معرفت کے دروازے کھلتے ہیں۔ وَذَیْنِ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمٰیاً لَّهُمُ الرَّحْمٰہُ (۲۶/۴۲)

اسی طرح کا ایک واقعہ تذکرہ غوثیہ میں بھی مذکور ہے، جو بلا تبصرہ حاضر خدمت ہے:

"فقیر صاحب نے فرمایا کہ بعد نماز عشاء ہماری روٹی مسجد میں لے آنا۔ جب ہم روٹی لے کر مسجد میں پہنچے تو دیکھا کہ میاں صاحب ایک گدھی سے مصروف ہیں۔ میں نے منہ پھیر لیا، پھر جو دیکھا تو نماز پڑھتے ہیں۔ بعد فراغت کھانا کھایا، باتیں کرنے لگے۔" (تذکرہ غوثیہ بحوالہ الانسان فی القرآن طبع اول، ص ۲۵۲ تا ۲۵۵)

واضح رہے کہ محکمہ کتاب کے دوسرے ایڈیشن سے یہ عبارت حذف کر دی گئی ہے۔

۳۔ جہاد اصغر اور جہاد اکبر

صوفیاء کا طبقہ ریاضت و مجاہدہ کی فضیلت ثابت کرنے کے لئے درج ذیل حدیث کا سہارا لیتا ہے:

وَالْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ فِي طَاعَةِ اللّٰهِ

مجاہد وہ ہے، جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس سے جہاد کرے۔

اس حدیث میں فی طاعت اللہ کے الفاظ صوفیاء کے اس گمان باطل کو رد کرنے کے لئے کافی ہیں کیونکہ ان کے ریاضت و مجاہدہ میں بے شمار ایسی چیزیں ہیں جو صریحاً کتاب و سنت کے خلاف ہیں۔ ان کا مجاہدہ

نفس نہیں بلکہ نفس کشی ہوتی ہے اور فی محبۃ اللہ ہوتی ہے اور اللہ کی اطاعت اور اس کا اسلامی نقطہ نگاہ سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔

پھر یہ حدیث یہتی نے ثوبُ الایمان میں فضائل سے روایت کی ہے۔ جس کے پورے الفاظ یہ ہیں: ”اور مجاہد وہ ہے جس نے اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس سے جہاد کیا اور مہاجر وہ ہے جس نے چھوٹے اور بڑے گناہوں کو ترک کر دیا۔“

ظاہر ہے کہ اس حدیث میں جہاد اور ہجرت کے اس پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس طرف ذہن مائل متقل نہیں ہوتا۔ بتلایا یہ گیا ہے کہ جہاد اور ہجرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے وہ جس طرح ہجرت وہی ہے۔ جو مسلمانوں نے فتح مکہ سے پہلے کی ہے یا ایسے حالات میں مسلمان اعلیٰ کلمہ الحق کے لیے کریں۔ اسی طرح جہاد حقیقتاً وہی ہے جسے جہاد بالسیف کہا جاتا ہے اور ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

جہاد بالسیف کی فضیلت

ارشادِ باری ہے:

لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرَ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ، فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً (۲/۹۵)

جو مسلمان بغیر مذکورہ گھروں میں بیٹھ رہتے ہیں اور جو اللہ کی راہ میں جان اور مال سے جہاد کرتے ہیں، یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ نے جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر فضیلت بخشی ہے۔

اور امام بخاری نے کتاب الجہاد والسیر میں ایک متقل باب قائم کیا ہے، جس کا عنوان ہے:

أَفْضَلُ النَّاسِ مُؤْمِنٌ يُجَاهِدُ بِنَفْسِهِ وَمَالِهِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ

سب لوگوں میں افضل وہ ہے، جو اللہ کی راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد کرے۔

مولانا اللہ یار خاں صاحب نے کتاب الاذکار (محی الدین ابو زکریا نورانی، م ۱۶۷۶) میں سے دو احادیث ایسی نقل فرمائی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر الہی ہر طرح کی جانی اور مالی عبادتوں حتیٰ کہ جہاد بالسیف سے بھی افضل ہے۔ پھر جو روایت ذکر الہی کو جہاد سے افضل قرار دیتی ہے۔ اتفاق سے اس پر ترمذی کا حوالہ بھی دیا گیا ہے اور وہ روایت اس طرح ہے:

”حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ قیامت کے دن اللہ کے

ہاں کوئی عبادت سب سے افضل ہوگی؛ فرمایا ”اللہ کو یاد کرنے والوں کا درجہ سب سے بلند ہوگا۔“ میں نے عرض کیا؛ ”کیا مجاہد فی سبیل اللہ سے بھی؟“ فرمایا ”اگر مجاہد فی سبیل اللہ کفار اور مشرکین پر تلوار چلائے، سچی کہ وہ تلوار ٹوٹ جاتے اور خون سے لٹھر جاتے، تو بھی اللہ کا ذکر کرنے والے افضل ہیں۔“ (دلائل السلوک، ص ۱۰۷) اب دیکھئے ذکر الہی کی انتہائی فضیلت سے ہمیں بھی انکار نہیں، لیکن اس وقت سوال یہ ہے کہ اس حدیث کا درجہ کیا ہے۔ یہ حدیث فی الواقع ترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء فی فضل الذکر میں موجود ہے۔ مگر امام ترمذی یہ حدیث درج کرنے کے بعد اس پر یوں تبصرہ کرتے ہیں ”هَذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ اِنَّمَا نَعْرِفُهُ مِنْ حَدِيثِ دَرَّاجٍ“ اب یہ تو واضح ہے کہ یہ تبصرہ چونکہ ان صوفیاء کے عقیدہ کے خلاف پڑتا تھا، لہذا اسے عمدہ درج نہیں کیا گیا۔

دوسری حدیث جس میں ذکر الہی کو تمام جانی اور مالی عبادتوں سے افضل قرار دیا گیا ہے۔ اس کا صاحب کتابُ الاذکار نے حوالہ درج ہی نہیں فرمایا۔ یا پھر شاید مولانا اللہ یار خان چھوڑ گئے ہوں۔ پھر صوفیاء نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ جہاد بالنفس کو مجاہد بالسیف کے مثل قرار دیں، بلکہ ریاضت مجاہدہ کی افضلیت ثابت کرنے کے لئے ایک وضعی حدیث بھی پیش کر دی اور نعرہ لگایا کہ:

صوفیاء کی موضوع حدیث

”رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْأَصْغَرِ إِلَى الْجِهَادِ الْأَكْبَرِ“ ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ حسین احمد مدنی کہتے ہیں، صوفیاء اس کو صحیح حدیث کہتے ہیں، لیکن امام عسقلانی کا قول ہے کہ امام نسائی نے اسے ابراہیم بن عبیدہ کا کلام بتایا ہے۔ الفاظ کی رکاکت زبردست قرینہ ہے کہ یہ آل حضرت ﷺ کا قول نہیں ہو سکتا اور نہ حدیث کی کتابوں میں شاہ عبدالعزیز جیسے متبحر محدث نے دیکھا ہے۔ پس احادیث کا فیصلہ محدثین کے اصول و قواعد کی رُو سے کیا جائے گا۔ بیچارے صوفیاء جن پر جن ظن کا غلبہ ہوتا ہے، ان حضرات کو تنقید و تفتیش کی فرصت کہاں؛ ان کے جن ظن سے کسی قول کا حدیث رسول ہونا ثابت نہیں ہو جائے گا۔“ (مکتوبات شیخ الاسلام، ص ۳۰۸، ۳۰۹، ج ۱، بحوالہ اسلامی تصوف، یوسف سلیم چشتی، ص ۱۱۳)

عبدالکریم جیلی اس مجاہدہ نفس کے ”جہاد اکبر“ کرنے کی توجیہ پیش فرماتے ہوئے لکھتا ہے:

عبدالکریم جیلی کا فلسفہ جہاد

”نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ بخار ہر مومن کا آگ سے حصہ ہے۔ جب بخار آگ کا قائم مقام ہو مکتا ہے، تو کیا مجاہدات، ریاضات، مخالفات، جن سے تزکیہ نفس حاصل ہوتا ہے اور جن میں ہر تکلیف سے بڑھ کر تکلیف اٹھانی پڑتی ہے، دوزخ کی آگ کا قائم مقام نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مجاہدات کا نام جہاد اکبر رکھا ہے اور تلوار کے جہاد کا نام جہاد اصغر ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بخار بمقابلہ دشمن سے لڑنے مارنے اور نیزہ لگانے وغیرہ سے زیادہ آسان ہے اور یہ تمام جہاد اصغر ہے۔ ان مجاہدات و مخالفات کی سختیوں کے مقابلہ میں جن کو اہل اللہ اٹھاتے ہیں۔“

(انسان کامل، ص ۳۰۲)

عبد الکرم جیلی کے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ان صوفیاء کے مجاہدہ و ریاضت اور مخالفتِ نفس یہ بدعیہ طریقے، جہاد بالسیف کے مثل یا اس سے افضل تو درکنار، اللہ کی معصیت اور گمراہی کا سبب ضرور بن سکتے ہیں، کیونکہ یہ سنتِ رسول کے خلاف ہیں۔

پھر ایک دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ :

”شہادت کی دو قسمیں ہیں، شہادتِ کبریٰ اور شہادتِ صغریٰ۔ شہادتِ صغریٰ کی چند قسمیں ہیں۔ اور حدیث اس کے متعلق وارد ہو چکی ہے کہ جو شخص مسافرت میں یا ڈوب کر یا دستوں وغیرہ کی بیماری سے مر گیا، وہ شہید ہے اور شہادتِ صغریٰ کا اعلیٰ درجہ جہاد فی سبیل اللہ میں قتل ہو جانا ہے اور شہادتِ کبریٰ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اعلیٰ اور ایک ادنیٰ۔ اعلیٰ یہ ہے کہ عین یقین سے تمام مخلوقات میں حق کا شہود ہو۔ مثلاً مخلوقات میں سے جب کوئی چیز دیکھے، تو اس شے میں بدوں حلول و انفصال و اتصال حق کو مشاہدہ کرے، بلکہ حق کا شہود ایسا ہو جیسا کہ حق سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے قول میں خبر دی ہے فَاَیْنَمَا تَوَلَّوْا فَشَرَّ وَجْہُ اللّٰہِ۔ اس کی شرطوں میں سے ایک شرط بدوں مستی و کیف کے دوام مراقبہ ہے۔ جب یہ شہود بندہ کے لئے صحیح ہو گیا، تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کو مشاہدہ کرنے والا ہے۔ یہ شہادت کا اعلیٰ منظر ہے۔ اور ادنیٰ قسم بدوں کسی علت (یعنی دوزخ کا خوف یا جنت کی حرص) کے محبتِ الہی کا انعقاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اس کی صفات کے لئے ہو اور اس وجہ سے ہو کہ وہی محبت کرنے کے لائق ہے۔“

(انسان کامل، ص ۳۳۸)

دیکھا اس اقتباس کی رو سے صوفیاء کا یہ اعتقاد کیسے کھل کر سامنے آگیا۔ جہاد بالسیف کو وہ شہادت

ادنیٰ کی اچھی قسم قرار دے رہے ہیں۔ رہی شہادتِ اعلیٰ، تو ان کے خود ساختہ طور طریقے، ریاضیات و فلسفہ اور اس کی اصطلاحات ہیں جن کا شریعتِ نبویہ میں کوئی سراغ ہی نہیں ملتا۔

صوفیہ کے اس گوشہ نشینی کے نظریہ نے مسلمانوں کو جتنا نقصان پہنچایا شاید ہی کسی اور وجہ سے پہنچا ہو۔ اس نظریہ نے مسلمانوں سے جہاد کی رُوح کو ختم کر کے دنیا میں ذلیل اور سُواقوم بنادیا اور ایسے افعال سے مجاہدہ نفس شروع کیا جس سے انسانیت کو بھی شرم آنے لگے اور ان کی یہ تعلیم پوری قوم کے لئے ماریفہ کے انجمن کی حیثیت رکھتی ہے

دسویں صدی ہجری کے آخر میں اس نظریہ نے مسلمانوں کو اس قدر مفلوج، کابل اور بے فہم بنادیا تھا کہ وہ فرانسیسی فاتحین کے حملوں کا دفاع جامعہ ازہر میں بیٹھ کر اوراد و وظائف سے کر رہے تھے۔ نابلیون کا انتخاب کر کے اسے صوفیاء کی گوڈری پہنائی گئی اور اس کی رہنمائی میں ذکر و فکر کی مجالس قائم کی گئیں۔ بخاری شریف کا ختم بھی کرایا گیا، لیکن ان سب باتوں کا کچھ بھی فائدہ نہ ہوا اور مسلمان مار کھاتے رہے۔ بالآخر جب مسلمان مجاہدین نے یورپ کی سرزمین میں لوگوں سے جگس لیں۔ تب جا کہ حالات نے پٹا کھایا۔ مقدمہ ”الکفر الضوفی“، ص ۶۔ از عبد الرحمن عبدالغنی، مطبوعہ کربت

اس گوشہ نشینی کا جو اثر ان صوفیاء کی ذات پر مرتب ہوتا ہے، وہ ابو بکر شبلی کی زبانی ملاحظہ فرماتے:

”روایت ہے کہ کچھ عرصہ شبلی اپنے مقام سے غائب رہے۔ ہر چند تلاش کیا پتہ نہ چلا۔ ایک روز مختلفوں کے گروہ میں دیکھے گئے۔ لوگوں نے پوچھا: ”اے شیخ! یہ کیا بات ہے؟“ فرمایا: ”یہ گروہ دنیا میں نہ مرد ہے نہ عورت۔ میں بھی اسی حالت میں گرفتار ہوں، نہ مرد ہوں نہ عورت۔ پس ناچار میری جگہ انہی میں ہے۔“

(غزینۃ الاصفیاء، ص ۱۲۴)

ابو بکر شبلی کے پیرو مرشد جنید بغدادی کے مریدوں کو ایک دفعہ جہاد بایسلف

جنید بغدادی کے مرید اور جہاد بایسلف

کا شوق چرایا۔ یہ داستان اس طرح ہے کہ :

”شیخ جنید کے آٹھ مرید تھے جو سب کے سب کامل و اکمل تھے۔ ایک روز انہوں نے خدمتِ شیخ میں عرض کی کہ اے شیخ شہادت ایک عجیب نعمتِ جانفرا ہے، اسے حاصل کرنا چاہتے۔ شیخ نے ان کی تائید کی اور ان کے ساتھ مکہ و دم کی طرف جہاد کے لئے چل پڑے۔ ایک جگہ کفار سے مقابلہ ہو گیا ایک

دانش پرست) کے ہاتھوں شیخ کے آٹھوں مرید ایک ایک کر کے شہید ہو گئے۔ شیخ فرماتے ہیں: ”میں نے اس وقت ہوا میں نوکھاوے متعلق دیکھے۔ میرے ساتھیوں میں سے جو شہید ہوتا تھا، اس کی رُوح ایک کجاوے میں رکھتے اور آسمان کی طرف لے جاتے۔ آخر ایک کجاوہ باقی رہ گیا۔ میں سمجھا یہ سب کھلتے ہے۔ اور جنگ میں مشغول ہو گیا۔ دورانِ جنگ وہی گبر جس نے میرے ساتھیوں کو شہید کیا تھا۔ میرے پاس آیا اور کہا، ”الوالقاسم! یہ آخری کجاوہ میرے لئے ہے۔ تو واپس بلند چلا جا۔ اپنی قوم کی قیادت و سیادت کر اور اپنا مذہب میرے سامنے پیش کر۔ میں نے اسے تعین اسلام کی وہ مسلمان ہوا اور کفار سے لڑتا ہوا شہید ہوا۔ میں نے دیکھا کہ اس آخری کجاوے میں اس کی رُوح کو آسمان کی طرف لے گئے ہیں۔“ (ذریعہ تصنیف)

اس روایت سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے ابتداءِ ایمان کا یہ معیار بتلایا تھا کہ ایک مومن دس کافروں پر غالب ہونا چاہئے۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے اس میں تخفیف فرما کر یہ معیار مقرر کیا تھا کہ ایک مومن کم از کم دو کافروں پر ضرور بھاری ہونا چاہئے، مگر یہاں یہ صورت حال ہے کہ شیخ جنید کے آٹھ کامل اکمل مرید ایک کافر کے ہاتھوں شہید ہوئے ہیں۔ چنانچہ تو یہ تھا کہ اگر شہادت کا اتنا ہی شوق زیادہ تھا، تو بیچ تیس کافروں کو مار کر خود شہید ہوتے، مگر یہ سب ایک کافر کے ہاتھوں یوں ماسے جارہے ہیں جیسے قصاب بکروں کو ذبح کرتا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ معیار کے مطابق ان میں ایمان کا جتنا حصہ تھا وہ آپ خود اندازہ لگا لیجئے۔ یہی وہ قباحت ہے جس کی بنا پر اسلام نے رہبانیت یا طریقت کو مذموم قرار دیا۔

۲۔ شیخ جنید کو خود اپنی شہادت کا خطرہ بھی لاحق ہو چلا تھا، وہ تو خیرت گزری کہ اس گبر کا نور فرست شیخ جنید کے نور فرست سے زیادہ تھا اور اس گبر کو شیخ جنید سے پہلے معلوم ہو گیا کہ نواں کجاوہ جنید کے لئے نہیں بلکہ میرے لئے ہے۔

۳۔ اسلام لانے کا یہ بھی کیسا انوکھا طریقہ ہے کہ کافر خود کسی مسلمان کو کہے کہ ”میرے سامنے اسلام پیش کر تاکہ میں اسلام لاؤں۔“ بہر حال ولایت کی دنیا الگ ہے اور مبداق ۷

رموزِ مملکتِ خولیشِ خسرواں دانند

یہ بات بھی تسلیم کر ہی لینا چاہئے۔

۴۔ البتہ یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ روم تو سارا عہد فاروقی اور عثمانی میں فتح ہو چکا تھا اور شیخ جنید کے زمانہ

میں بغداد سے لے کر روم تک کا سارا علاقہ اسلامی مملکت میں شامل تھا۔ روم کے راستے میں ان کو کئی
کا لشکر ملا کہاں تھا؟

بہر حال اس راوی کی داد ضرور دینا چاہئے جس نے اس قصہ میں اولیاء اللہ کی کرامات سمو کر یہ
لاجواب شاہکار تراشا ہے۔

گوشہ نشینی کا رد

اسلام نے ہمیں مل جل کر رہنے پہنچنے، معاشرتی زندگی گزارنے،
خانہ داری اور کسبِ حلال کے آداب و احکام سکھلائے ہیں لیکن صوفیاء
اپنا سارا زور ترک و دنیا، خود کسب کرنے اور عالمی زندگی سے فرار پر صرف کرتے ہیں۔ کیونکہ یہی چیزیں ان
کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھی جاتی ہیں۔ تاہم صوفیاء میں سے ہی کچھ ایسے بزرگ بھی ہیں جنہوں نے
اس بنیادی ضرورت کو محسوس کیا اور ایسے واقعات انہی تذکروں میں کہیں نہ کہیں نظر آ جاتے ہیں مثلاً:
ابراہیم ادہم پہلے بلخ کے بادشاہ تھے۔ ان کے بادشاہی چھوڑ کر فقر اختیار کرنے کے بہت سے
قصے مشہور ہیں۔ انہوں نے خود تو ترک دنیا کر کے گوشہ نشینی اختیار کی تھی مگر ایک شخص کے سوال کرنے پر
وہ جواب یوں ارشاد فرماتے ہیں:

”نقل ہے کہ ایک شخص نے چاہا کہ وہ بھی اہل و عیال چھوڑ کر ابراہیمؒ کی طرح عبادت گزار بن جائے
آپ نے سنا تو فرمایا: ”واللہ اگر اے معلوم ہوتا کہ وہ پریشانی اور فکر جو اہل و عیال کی خبر گیری میں ہے میری
عبادت سے بڑھ کر فضیلت رکھتی ہے، تو وہ یہ خواہش ہرگز نہ کرتا۔“ اتنے میں ایک اور عیالدار شخص جسے
ایک دن کوئی مزدوری نہ ملی تھی، فکر و غم میں جا رہا تھا کہ بچوں کو کیا کھلاتے گا۔ راستہ میں حضرت ابراہیمؒ
کو بے فکر بیٹھے ہوئے دیکھا اور کہنے لگا ”مجھے آپ پر رشک آتا ہے، آپ غم عیال سے فارغ بیٹھے
ہیں۔“ آپ نے فرمایا ”بھئی! مجھے تو آج کے غم کا ثواب دے دے۔ بخدا میں اپنی ساری عمر کا ثواب
نتیجہ دیتا ہوں۔ کیونکہ اللہ کے نزدیک تیرا غم عیال میری عبادت سے زیادہ وقعت رکھتا ہے۔“ یہ
سن کر اُس کا دل خوش ہوا اور وہ چلا گیا۔“ (مقربان حق، ص ۱۱۱)

اسی طرح عبد اللہ منازلؒ کہتے ہیں کہ: ”جو شخص کسب و ہنر کرتا ہے اور خدا پر بھروسہ رکھتا ہے۔ وہ
اس شخص سے ہزار گنا بہتر ہے، جو کسب و ہنر نہیں کرتا اور خلوت نشین ہو کر اپنا بوجھ دوسروں پر ڈالتا
ہے۔“ (ایضاً، ص ۲۰۹)

۴۔ سماع اور وجہ

محل سماع کے انعقاد اور صحت کی اس سے زیادہ کیا دلیل ہے کہ علمائے شریعت تو ایک طرف صوفیوں ہی بعض سلسلے اسے ناجائز بلکہ حرام قرار دیتے ہیں۔ قرآن کریم میں شرکین مکہ کی یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ وہ خانہ کعبہ کے پاس غنا و موسیقی کی محفلیں برپا کرتے تھے۔ ارشاد باری ہے :

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ
إِلَّا مُمَآءً وَتَصْدِيَةً (۸/۳۵) بجانے کے سوا کچھ نہ تھی۔

موسیقی کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ساز اور آواز۔ خدا تعالیٰ نے مُبَآءً وَتَصْدِيَةً کے الفاظ میں پوری موسیقی ساز اور آواز دونوں کی مذمت کر دی ہے۔ موسیقی کی سُریں اور نغمے مکاء کی اور ساز و مزامیر تصدیہ کی ذیل آتے ہیں۔ اور حضو اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ موسیقی سے دل میں نفاق یوں ابھرتا ہے۔ جیسے بارش سے گھاس اُگ آتی ہے۔ نیز حضو اکرم ﷺ نے گانا بجانے والیوں کی خرید و فروخت اور انہیں موسیقی کی تعلیم دلانے سے منع فرمادیا ہے۔ (احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

اب ان صوفیوں کی خود تراشیدہ احادیث بھی سن لیجئے
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

سرود و قرص کے دلائل

۱۔ السَّمْعُ مُبَاحٌ لِمَنْ كَانَ قَلْبُهُ حَيًّا عَنِ
الدُّنْيَا مَيِّتًا

۲۔ السَّمْعُ مُبَاحٌ لِّأَهْلِهِ

(مرشد کامل ترجمہ صدائق الاخیار، ص ۱۵۱، از صادق فرغانی)

واضح رہے کہ سماع کا لفظ دور نبوی میں صرف سنے کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا جیسے سماع موتی، سرود کی محفلوں کے لئے سماع کا لفظ بہت بعد کی پیداوار اور صرف صوفیوں کی قوالیوں کے لیے وضع کی گئی۔ پھر وجد اور قرص کے جواز میں ہی فرغانی صاحب فرماتے ہیں :

”وجد کئی قسم کے ہیں۔ عوام کو بھی وجد ہوتا ہے۔ مگر جو لوگ خدا کی ذات میں فنا ہو جاتے ہیں ان کو وجد سے بہت سے اسرار منکشف ہوتے ہیں۔ دیکھو جب مصر کی عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو بے ہوش ہو کر اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے مگر ان کو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ فنا فی اللہ تھیں۔ جب

کسی پر وجد اس قدر طاری ہو جاتے کہ وہ بے اختیار ہو کر قص کرنے لگے، تو وہ معذور ہے۔ چنانچہ روایت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا "أَنْتَ مِنْهُ وَأَنَا مِنْهُ" تو آپ بے اختیار ہو کر قص کرنے لگے۔ پھر جب آپ نے حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ "أَنْتَ مَعِيَ فِي الْجَنَّةِ" تو آپ نے بھی ایسا ہی کیا۔ پھر جب حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا "أَنْتَ أَمِي" (تو میرا بھائی ہے) تو آپ نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ قص کے اہل ہیں، ان کے لئے قص مباح ہے۔" (ایضاً، ص ۱۵۳)

اب دیکھتے کہ رسول اللہ ﷺ تو سالہ محرم میں فوت ہو گئے اور امام جعفر صادق ۱۳ رجب شہ محرم کو پیدا ہوئے

دلائل کا جائزہ

لیکن فرغانی صاحب فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جعفر کو فرمایا "أَنْتَ مَعِيَ فِي الْجَنَّةِ" تو آپ نے ایسا ہی کیا (یعنی قص کیا)۔ اب یہ تو رہی آپ کی تاریخ دانی۔ رہے دوسرے اکاذیب تو یہ ان حضرات کو ورثہ میں ملے ہیں۔ جیسا کہ امام مسلم نے بوقت مطمع فرمادیا تھا۔ پھر لطف یہ ہے کہ فرغانی صاحب نے بھی ابن عربی کی طرح یہ دعوے کیا ہے کہ اس کتاب کے مندرجات رسول اللہ ﷺ پر سبالت کشف پیش کئے گئے اور ان کی توثیق کے بعد شامل کتاب کئے گئے ہیں۔

پھر فرغانی صاحب فرماتے ہیں:

"اگر سردستہ وقت بے اختیار ہو کر ہاتھ پاؤں مارنے سے اس کا عامہ گر پڑے تو کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ جب حضور اکرم ﷺ معراج سے واپس آئے تھے، تو دوسرے روز اصحاب صفہ کے پاس گئے وہ نہایت بلند آواز سے باتیں کر رہے تھے جس سے آپ پر وجد طاری ہونا شروع ہوا اور بڑھتا بڑھتا یہاں تک پہنچا کہ آپ ہاتھ پاؤں مارنے لگے اور آپ کا عامہ مبارک سر سے گر گیا۔ جب آپ اصلی حالت میں آئے، تو اصحاب نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! جو یہ حالت آپ پر طاری ہوئی ہے۔ اس میں سے ہم کو بھی کچھ عنایت کیجئے۔ آپ نے اپنی دستار پھاڑ کر ان میں تقسیم کر دی۔" (ایضاً، ص ۱۵۴)

اس گل دیگر گفت

فرغانی صاحب کی افسانہ نگاری قابلِ داد ہے۔ البتہ اگر یہ خیال کر لینے کہ معراج مکہ میں ہوا تھا اور اصحاب صفہ مدینہ میں مسجد نبوی کے چبوترہ پر بیٹھنے والے صحابہ تھے، تو ان کی دروغ گوئی پر شاید

کچھ پردہ رہ جاتا۔

پھر فرماتے ہیں: ”جو لوگ اولیاء اللہ کے منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ صوفی نے اس شعر کا مطلب کیا سمجھا جو اسے وجد ہو گیا، ایسے لوگوں کو چاہئے کہ اونٹ پر بھی اعتراض کریں کہ رجز سے اسے وجد تو ہو جاتا ہے، حالانکہ وہ زبان جانتا ہے نہ اُن کا مفہوم سمجھتا ہے۔“

آخر اعتراض کا جواب دیتے ہوئے سچی بات فرغانی صاحب کے منہ سے نکل ہی گئی۔ اچھی آواز سفلی جذبات کو ابھارتی اور ہر ایک کو، حتیٰ کہ جالوروں کو بھی اچھی لگتی ہے۔ ریڈیو کی دُصنوں پر نیچے بھی جھوٹے نکتے ہیں۔ ”ہم پوچھتے ہیں پھر اس سے معرفت الہی کا کیا تعلق ہے؟ کیا اونٹ پر بھی اسرار منکشف ہوتے ہیں جو صوفی پر ہوتے ہیں؟ یا ان بچوں پر جو بغیر مطلب بگے ریڈیو کی آواز پر جھوٹے نکتے ہیں۔“
بید سے اور صاف لفظوں میں اعتراف کر لینا چاہئے کہ صوفیوں میں ایک طبقہ عیاش طبقہ ہے جو عشق بازی، کانوں کی عیاشی اور ہوس رانی کے لئے تقدس کے پردوں میں یہ مخلیں رچاتا ہے۔ اب ہم اپنے اس دعوے کے ثبوت میں انہی صوفیوں کے سلف صامکین کے اقوال پیش کرتے ہیں:

الملح فی التصوف کے مصنف ابو النصر سراج طوسی اس کتاب کے صفحہ ۵۳ پر لکھتے ہیں:
”کچھ لوگ اس وہم میں مبتلا ہیں کہ تصوف سے مقصود صرف یہ ہے کہ قرالی کی مجلسوں میں شریک ہو جائے اور تبرکات وجد طاری کیا جائے اور پُر تکلف کھانوں کے ساتھ رفتار کو جمع کیا جائے اور دردِ انجیر عشق آفرین قصائدِ ترمِ آمیز لہجہ میں پڑے جائیں خصوصاً ایسے اشعار، جو صوفیاء کی عشق بازی اور ہوس رانی کی عکاسی کرتے ہوں۔ حالانکہ تصوف سے مقصود نہیں نہ یہی ہے کہ تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کھلے بند دل عشق بازی کا بازار گرم کیا جائے اور موسیقی کے نعمات پر مال کھینچا جائے اور ہاؤس ٹیلفڈ بند کیا جائے۔“
اس کے برعکس جنید بغدادی فرماتے ہیں:

”صوفی پر تین حالتوں میں رحمتِ خداوندی کا نزول ہوتا ہے (۱) جب وہ گانا سنتا ہے اور اس پر کیف و مستی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ (۲) جب منہ میں لقمہ ڈالتا ہے اور (۳) جب زبان سے کچھ کہتا ہے۔ اس لئے کہ وہ نہ تو بلا ضرورت کچھ کھاتا ہے اور نہ بات کرتا ہے اور نہ سنتا ہے۔“

(الفکر الصوفی، ص ۱۰۸)

گویا جنیدی صاحب کے نزدیک وجد و سماع و رقص صرف جائز ہی نہیں بلکہ رحمتِ خداوندی

کے نزول کا وقت ہوتا ہے۔

سمع کے لئے کسی شرعی دلیل کی ضرورت نہیں

حضرت علیؓ جویریؓ کا ذکر ہو رہا ہے:

”آپ خود سمع سنتے تھے اور اسوۂ رسول ﷺ اور آثارِ صحابہ کرامؓ کی سند اپنے عمل کی تائید میں لاتے تھے۔ فرماتے ہیں مشائخِ صوفیاء اباحتِ سمع کے متلاشی نہیں ہے اس لئے کسی عمل کو اس کی اباحت کی بناء پر نہیں فوائد کی بنا پر اختیار کرنا چاہئے۔ تلاشِ اباحت میں عوام رہے ہیں۔ سندِ جواز چار پایوں کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔“ (خلاصہ تصوف اسلام از آقا بیدار بخت، ص ۱۱۵)

ملاحظہ فرمائیے، اباحت کے لئے سندِ جواز تلاش کرنے کی علیؓ جویریؓ کے نزدیک کیا وقعت ہے ان کے خیال میں سمع کے لئے سندِ جواز تلاش کرنا عوام کا لانعم کا کام ہے۔ ان جیسے اولیاء اللہ کو اس کی کیا ضرورت ہے؟

بعض صوفیہ وجد و حال کو ایک اضطراری کیفیت بتلاتے ہیں۔ لیکن مندرجہ بالا تصریحات سے واضح ہے کہ یہ بھی ان لوگوں کی عیاری ہے۔ وہ صرف تقدس کے جامہ میں ہر طرح کی عیاشی سے محفوظ ہونا چاہتے ہیں۔ جب رفاہی فرقہ کے فقیروں کا امیر افرم کے سامنے ام ابن تیمیہؒ سے مناظرہ ہوا تو ان فقیروں نے بھی یہی بات کہی تھی کہ:

”یہ اقوال و افعال ہم سے اضطرارِ اسرہد ہوتے ہیں۔ ہم پر حال اور وجد طاری ہو جاتا ہے۔ ان کا روکنا ہمارے بس سے باہر ہے۔ اسی طرح جس طرح چھینک کا روکنا ہمارے اختیار میں نہیں ہوتا اور یہ حال اور وجد بھی اللہ ہی طرف سے ہے، تو امام موصوف نے جواب دیا کہ چھینک تو خدا ہی کی طرف سے ہے مگر یہ اقوال و افعال خبیثہ شیطان کی طرف سے ہیں۔ خدا اور اس کا رسول ان کاموں سے منع کرتا ہے اور وہ جن باتوں سے ہم کو منع کر دیں وہ کبھی محبوب نہیں ہو سکتی۔ امام موصوفؒ نے کہا کہ اس کی مثال یہ ہے کہ کفر اور فسق کا صدور بھی خدا کی مشیت ہی سے ہوتا ہے، لیکن کوئی شخص اسے جاز نہیں سمجھتا۔

رفاعی شیخ نے پوچھا کہ پھر اس اضطراری وجد و حال کو کیونکر روکا جاسکتا ہے۔ امام موصوف نے فوراً جواب دیا:

وجد اور حال کا علاج

”دیا شرعی کوڑوں سے“ اس پر امیر افرم ہنس پڑا۔ امام موصوف نے کہا: ”ہاں! پھر اگر شرعی کوڑوں سے کام نہ چلے، تو توار محمدی ﷺ سے۔“ یہ کہہ کر امیر افرم کے ہاتھ سے توار لے لی اور اسے ہوا میں

بلند کر کے کہا یہ شخص (امیر افرم) رسول اللہ ﷺ کا نائب اور ادنیٰ غلام ہے اور یہ رسول اللہ ﷺ کی تلوار ہے۔ اب جو شخص کتاب و سنت سے روگردانی کرے گا، اس کو موت کے گھاٹ اتارا جائے گا۔“ (امام ابن تیمیہ، از کوکب مری، ص ۱۶۵)

رفاعی شیخ نے یہ بھی کہا کہ ہمارے کچھ باطنی امور و احوال ہیں، جن کو اہل نظر نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے ان سے انکار کی کوئی وجہ نہیں۔ امام ابن تیمیہؒ نے کہا کہ ”ظاہر و باطن، شریعت و طریقت، حقیقت و مجاز سب کچھ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف لوٹایا جائے گا۔ ہم اس سے کہ وہ مشائخ ہوں یا فقیر، بادشاہ ہوں یا امراء، علم ہوں یا قاضی۔ اس لئے کہ ساری مخلوق پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت واجب ہے۔ یہ اہل باطن بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے۔“ (ایضاً، ص ۱۶۳)

سماع کے متعلق صوفیائے حق کا فتویٰ

ایک اور بزرگ شیخ احمد بن ابراہیم واسطی ہیں، جن کو شیخ عبدالحق دہلوی

علم عامل اور عارف کامل کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ”یہ جو کہا جاتا ہے کہ شعر کو، نہ کہ قرآن کو طبیعت بشری سے خاص مناسبت ہے۔ اس لئے اشعار سن کر دل میں قدرتاں خریک پیدا ہوتی ہے۔ سو یہ قول لغو و بے حقیقت ہے۔ اس لئے کہ شعر کے وزن اور سُر تال پر حرکت کرنا جلت حیوانی کا تقاضا ہے۔ چنانچہ حیوانات اور بچے سب اچھی موسیقی سے اثر قبول کرتے ہیں۔ یہ فطرت حیوانی ہے ان کی اعلیٰ فطرت کا درجہ اس سے کہیں بلند ہے۔ جن کے دلوں میں محبت الہی حلاوت کر چکی ہے جیسا کہ حضرات صحابہؓ اور ان کے بعد آنے والوں کا حال تھا۔ سو ان کے قلوب کو حرکت میں لانے والی اور ان کے شوق و وجد، رقت اور خشوع کو بڑھانے والی شے قرآن پاک کی سماعت ہی ہو سکتی ہے۔“ (تصوف اسلام، ص ۱۵۶)

بعض صوفیاء کہتے ہیں کہ سماع میں اصل وجد میں لانے والی چیز موسیقی کی بجائے شعر کی شریعت اور حقیقت ہوتی ہے، تو ہم عرض کریں گے کہ دور جاہلیت میں لبید ہی ایک ایسا شاعر تھا جس کے کلام کو حضور اکرم ﷺ پسند فرماتے تھے مثلاً اس کا یہ شعر آپ کو بہت پسند آیا: (بجلی بتا پناقت پناقت پناقت)

اَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ وَ كُلُّ نَعِيْمٍ لَا مَحَالَةَ زَائِلٌ
سن لو کہ اللہ کے سوا جو چیز بھی ہے وہ باطل ہے اور ہر ایک نعمت لامحالہ زائل ہونے والی
انہیں لبید کو ایک دن حضرت عمرؓ نے کہا کہ اپنا کوئی کلام سناؤ، تو کہنے لگے جب کہ قرآن دل

میں سچ بس گیا ہے میں نے شعرو شاعری کو دل سے نکال دیا ہے۔

سماع کے شرعاً حرام ہونے کی اس سے زیادہ کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ بعض اکابر صوفیاء نے بھی اس کی حرمت کا فتوے دیا ہے مثلاً :

۱۔ خواجہ نظام الدین اولیاء دہلوی اسے شرعاً ناجائز قرار دیتے ہیں۔ (تصوف اسلام، ص ۱۱۱)

۲۔ خود حضرت علی جویری سماع سنتے تھے، لیکن شرعاً اسے ناجائز سمجھتے تھے (ایضاً، ص ۵۸)

۳۔ عبداللہ غزنویؒ نے سماع کو ناجائز قرار دیکر قرآن سننا ہی اپنا شعار بنالیا تھا۔ (سوانح، مرتبہ علیہما غزنویؒ)

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بعض اکابر صوفیاء اسے بھی ملتے ہیں جو سماع کے اتنے رسیاتھے کہ مرتے دم بھی قرآن سننے کی بجائے

سماع کی دلدادگی

کسی قوال کو بلانے کی تاکید کرتے یا سماع سن کر جان دیتے رہے ہیں۔ مثلاً :

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے متعلق منقول ہے کہ ان کے یہاں مجلس سماع گرم تھی۔ قوال، احمد جام کی غزل گارہا تھا۔ جب یہ غزل گاتے گاتے نوبت اس شعر پر پہنچی :

کشتگانِ خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است

تو حضرت کا حال برگشتہ ہو گیا اور اسی حالت میں جان دے دی۔ (مدیقۃ الاولیاء، ص ۴۲) اور

بعض روایات میں ہے کہ نین و ن اسی حالت میں رہ کر وفات پائی۔

ایک اور بزرگ فیض بخش صابری چشتی ہیں جب ان کی موت کا وقت قریب آیا۔ قوالوں کو بلایا،

ایک قوال قادر بخش کو نعمت پڑھنے کو کہا۔ اس نے یہ غزل شروع کی :

منم خاکِ در کوئے محمدؐ اسیرِ حلقہٗ معنے محمدؐ قتلِ نوکِ شیرِ نگاہشؐ شہیدِ تیغِ ابروئے محمدؐ

تو آپ پر وجد طاری ہوا اور اسی حالت وفات پائی۔

کہا رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ اپنے مرنے والوں کو کلمہ شہادت کی تلقین کرو اور ان کے پاس

سورۃ یٰسین پڑھو اور کہا ان اولیاء اللہ کی قوالیوں سے یہ دلدادگی۔

بہیں تعاونت راہ از کماست تا بہ کجا

اب فرقہ نوشا بہیہ کے سماع و وجد کا حال بھی ذرا سن لیجئے :

پوشیدہ رہے کہ فرقہ عالیہ نوشا بہیہ میں سب لوگ صاحب وجد و سماع و شوق و ذوق و مستی

ہیں مگر فقرائے سلسلہ پاک رحمٰن سماع کے وقت سب سے زیادہ مست ہو جاتے ہیں جب تک ان کے پاؤں میں رسہ ڈال لیا نہ لٹکائیں اور ساعت دو ساعت اسی حالت میں رقص نہ کر لیں سر نہ ہنیں ہوتے اور اگر اس عمل سے ہوش میں نہ آئیں، تو اسی حالت میں ان کو زمین پر کھینچے ہیں جب تک وہ ہوش میں نہ آجائیں۔ رتن ان کے پاؤں سے نہیں کھولا جاتا۔“ (حدیث الاولیاء، ص ۶۹)

ان نوشاہی ”اولیاء اللہ“ پر سماع کی مغل کے بغیر بھی وجد طاری ہو جاتا ہے۔ ایسا بھی ایک واقعہ سن لیجئے:

”مذکورہ نوشاہی میں ہے کہ ایک روز حافظ صاحب اپنے خسر کے ہاں

حافظ برخوردار قادری نوشاہی کا سماع

حالت جذب واستغراق میں بیٹھے تھے۔ گھر کے سامنے ایک زمیندار کی لڑکی چرخہ کات رہی اور تھکا سا تھک کچھ گا بھی رہی تھی۔ اس کے سرور نے حافظ صاحب پر حالت وجد طاری کر دی۔ لڑکی کے خاموش ہونے پر فرمایا۔ ”اے لڑکی! ایک بار پھر اسی طرح نغمہ سرائی کر۔“ لڑکی شرم کے مائے اٹھ کر اندر چلی گئی۔ کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اس کے پیٹ میں سخت درد اٹھا اور حالت نزع تک جا پہنچی۔ علاج معالجہ سے فائدہ نہ ہوا۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر اس کے والدین آپ کے پاس آئے اور محذرت چاہی۔ آپ نے فرمایا۔ ”اے میرے دو بر ملاؤ۔“ جب لڑکی آپ کے سامنے حاضر ہوئی، تو فرمایا: ”اے لڑکی! پھر اسی طرح نغمہ گا۔ انشاء اللہ اچھی ہو جائے گی۔“ چنانچہ اس لڑکی نے وہی نغمہ اسی انداز میں گایا۔ آپ کی توجہ سے اسی وقت صحت یاب ہو گئی۔“ (غزنیۃ الاصفیاء، ص ۲۸۸)

دیکھ لیجئے دوسرے لوگوں کو اپنے شعبہ کے دام میں پھنسا کر ان اولیاء اللہ کو اپنی حیوانی خواہشات کو پورا کرنے کا کیسا فن آتا ہے۔ ایک بات البتہ کھٹکتی ہی رہی کہ جب لڑکی ابھی تک ٹھیک بھی نہ ہوئی تھی، تو انس نے اسی انداز اور سر میں گایسے لیا:

”روایت ہے کہ شیخ ابوالحسن خرقانی سماع نہیں سنا کرتے تھے۔ ایک روز ابوسعید آپ

ابوسعید اور ابوالحسن خرقانی کا سماع

کی زیارت کے لئے خرقان آئے اور کھانے سے فارغ ہو کر سماع کی اجازت طلب کی۔ آپ (ابوالحسن خرقانی) نے فرمایا: ”ہم سماع نہیں سنا کرتے، آپ کی وجہ سے سُن لیتے ہیں۔“ قوالوں نے ایک شعر پڑھا،

تو ابوسعید نے کہا ”اے شیخ ! اب وقت ہے آپ اٹھیں۔“ ابوالحسن اٹھ کھڑے ہوئے اور تین بار اپنی آستین کو وجدانہ حرکت دی اور سات بار حالت وجد میں زمین پر پلنے پیرائے۔ آپ کا وجد میں آنا تھا کہ خانقاہ کی دیواریں آپ کے ساتھ ہلنے لگیں۔ ابوسعید نے کہا: ”حضرت ! بس کیجئے کیونکہ ساری عمارت گر جائے گی۔ اور قسم ہے اس ذات وحدہ لا شریک کی کہ آسمان وزمین بھی آپ کے ساتھ رقص کرنے لگیں گے۔“ اس پر ابوالحسن خرقانی نے اپنے مریدوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ: ”سماع اس شخص کے لئے جائز ہے، جو اوپر عرش تک اور نیچے تحت الثریٰ تک دیکھتا ہو۔“ آپ نے مزید فرمایا: ”اگر تم سے کوئی دریافت کرے کہ رقص کیوں کرتے ہو، تو کہنا گزے ہوئے لوگوں کی موافقت میں اور جن لوگوں کے لئے سماع جائز ہے، وہ ایسا کرتے ہیں۔“ (صوفیائے نقشبند، ص ۱۱۱)

خوف فرمائیے ابوالحسن خرقانی جو سماع و وجد سنا ہی نہ کرتے تھے، ابوسعید کی درخواست پر پہلی ہی دفعہ سماع سنا اور وجد میں آئے، تو کیسا زلزلہ بپا کر دیا۔ پھر آپ نے سماع کے جواز کی شرائط اور دلائل بھی کتنے شاندار فراہم کر دیئے ہیں۔

واقعی ایسے لوگوں کا علاج وہی ہے، جو امام ابن تیمیہؒ نے تجویز کیا۔ اور ان لوگوں کا خواجہ علی حکیم انصاری مصنف حقیقت وحدت الوجود نے صحیح تعارف کرا دیا ہے، کہ ”ایسے لوگ شرابی، کبابی ہوتے ہیں سلام سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ہندو جو گیوں سے یوگ وغیرہ سیکھ اور ریاضتیں کر کے لوگوں کو شعبد سے دکھاتے پھرتے ہیں۔“

۵۔ جامِ مے کی شاعری

برسطی، شبلی اور ابو یزید کے زمانہ سے عصرِ حاضر تک بعض صوفیاء اور مجذوبوں نے تکالیف شرعیہ کو بغیر ضروری قرار دینے کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ اس کا مذاق بھی اڑایا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جمالیاتی وسائل کی مدد سے وجدانی ہیجان پیدا کر کے سامعین میں جذب و مستی کی ایک مصنوعی کیفیت پیدا کی جائے۔ اس مقصد کے لئے بالخصوص شاعری کا سہارا لیا گیا۔ یہ شاعری تصوف کی زبان (اسرار و رموز) میں شراب کی مدح سرائی کرتی ہے۔ حالانکہ شریعت نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ اس میں مجتہد کچھ پیالے کو ساقی اشماس الدیر گردش میں لاتا اور پیش کرتا ہے۔ مثلاً حافظ شیرازی کے ”ج ذیل شاعرانہ نظم فرمائیے۔“

اَلَا يَا اَيُّهَا السَّاقِي اُوْدِ كَاسًا وَاَنَا لَهَا
كَعَشَقِ اَسَانَ نَمُو دَاوِلْ مَلْ اَفَادْ مُشْكَلْ بَا

بے ستادہ رنگین کن گرت پیرمغال گوید کہ سالک بے خبر نہ بود ز راہ رسم منزل ہا ترجمہ : اے ساقی ! جام کو گھما اور پیش کر کہ عشق پہلے پہل تو آسان معلوم ہوتا ہے۔ پھر بہت سی مشکلات آپڑتی ہیں۔ اگر تجھے پیرمغال (شراب خانہ کا شیخ) کہتا ہے کہ اپنا مصلیٰ شراب سے رنگین کر تو ایسا ضرور کر۔ کیونکہ سالک منازل سلوک کی راہ و رسم سے بے خبر نہیں ہوتا۔ دیکھتے ان اشار میں تصوف اور شراب کو لازم و ملزوم کر کے پیش کیا گیا ہے۔

فارسی زبان میں اس قسم کی شاعری کو رواج دینے والے مندرجہ ذیل شعراء ہیں۔ (۱) جلال الدین رومی (ثنوی)، (۲) شیخ فرید الدین عطار (ثنوی)، (۳) ابوسعید (رباعیات)، (۴) حافظ شیرازی (غزلیں) اور (۵) عبدالرحمن جامی (نظمیں)

عربی زبان میں ابن العارض اور تسری کی نظمیں، یہی موضوع پیش کرتی ہیں۔ عربی کے درج ذیل شاعر ملاحظہ فرمائیے :

تَعَالَوْا نُخَبِّبُ الْجَمَاعَ وَنَجْعَلُ فِيهِ خَمَارَهُ
آؤ ہم لوگ مسجد کو ویران کریں اور اس میں شراب خانہ بنائیں۔

وَنَحْنُ نَكْسِرُ الْمُنْبَرَ وَنَجْعَلُ مِنْهُ طَبَارَهُ
اور منبر کو توڑ کر اس سے ساز و مزامیر بنائیں۔

وَنَحْنُ نَخْرِقُ الْمُصْحَفَ وَنَجْعَلُ مِنْهُ ذِمَارَهُ
اور قرآن کو پھاڑ کر اس کی بانسری بنائیں

وَنَنْتِفِ لِحْيَةَ الْقَاضِي وَنَجْعَلُ مِنْهُ أَوْتَارَهُ
اور قاضی کی داڑھی کو اکھاڑ کر اس سے تانت بنائیں

(تاریخ دعوت و عزیمت، ص ۱۹۳، ج ۲)

دیکھا آپ نے شراب اور قص و سرود کی محفلیں سجانے کے لئے کس طرح کتاب اللہ اور شمار اللہ کا تمسخر اڑا بیگیا ہے۔

پھر اسی قسم کی صوفیانہ شاعری ہندوستان میں بھی پہنچی اور اردو کے شعرا نے بھی اس موضوع پر جی بھر کر طبع آزمائی کی۔ کسی شاعر نے تو یوں کہا :

زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر یا وہ جگہ بت دے جس جا خدا نہیں
اور کسی نے یوں کہا۔

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں فقط یہ بات کہ پیر مغاں ہے مردِ خلیق
پھر کوئی صاحب ساقی کے بدین الفاظ مشکوٰۃ ہوتے ہیں :

مثا دیا مرے ساقی نے عالم من و تو پلا کے مجھ کو متے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ
نہے نہ شعر، نہ ساقی نہ شور چنگے دُباب سکوت کو لب جوئے ولالہ خود رو !
مرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں کہ خانقاہ میں غالی ہیں صوفیوں کے کدو !
پھر کسی نے یوں آرزو کی ۔

لاک بار پھر وہی بادہ و جام اے ساقی ہاتھ آجاتے مجھے میرا مقام اے ساقی !
پنجابی زبان میں جن متصوف شعراء نے اس میدان میں طبع آزمائی کی ان میں بلھے شاہ اور خواجہ فرید کے نام قابل ذکر
ہیں مثلاً بلھے شاہ فرماتے ہیں :-

۱۔ چھوک مصلیٰ جسٹ لونا نہ پھر تبسبع ، ماما ، سوٹا مد عاشق کہندے دے دے ہوکا ترک ملا لوں کما مردار
۲۔ بلھیا اپی شرابے کما کباب بیٹھ بال ہڈاں دی آگ ، چوری کرتے بھن گھر رب دا ، اوس ٹھگاں دے ٹھگ نوں ٹھگ
غرض تصوف کی اس شاعری کا جس میں شراب معرفت کا ذکر ہوا اور ساقی ، جام و سُبُو وغیرہ الفاظ کو
تمبیحات اور تلویحات کے طور پر استعمال کیا گیا ہو۔ ہر طرف چرچا ہو گیا اور وہ شراب جس کی تیاری اور فرو
تک کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ نے دس متعلقہ آدمیوں پر لعنت فرمائی تھی۔ تصوف کی دنیا میں شراب
اور اس کے متعلقات تقدس کا جامہ اوڑھ کر جب سامنے آئے ، تو نفرت کے بجائے ان الفاظ اور
اشیاء سے موانست پیدا ہونے لگی ۔

وجد و سماع کی محفلوں میں قوالیوں کا رواج ہوا تو قوالوں کی ایک فوج ظفر موج پیدا ہوئی۔ جنہوں نے
عوام میں اس شاعری کو مقبول بنایا۔ ادھر وجد و سماع کی محفلوں میں ایسی قوالیاں لازم قرار پائیں ، اور یہ
بزرگانِ دین اس ذریعہ سے سوک کی منازل طے کرتے اور نوبت بایں جا رسید کہ بعض بزرگ تو مرتے
وقت بھی کلمہ شہادت یا قرآن کی تلقین کی بجائے کسی قوال کو بلانے کی تلقین کرنے لگے۔ جیسا کہ وجد و سماع
کے سلسلہ میں ایک دو اولیاء اللہ کے واقعات پہلے بیان ہو چکے ہیں ۔

پھر کچھ اولیاء ایسے بھی گزرے ہیں جنہیں سرخ شراب بہت پسند آتی تھی چنانچہ غلام محی الدین قادری جالندھری نے

شراب کی دلدادگی

اس پر پورا قصیدہ ہی لکھ ڈالا۔ جس میں سے چند اشعار حسبِ قیل ہیں: (ماخوذ از ریاض السابکین، ص ۲۶۵)

ساقی پلائے جامِ خوشگوار سرخ تا میری چشم کو کرے اس کا رخسار سرخ
ہر شش طرف جو نظر کروں آنکھ کھول کر آوے چاں نظر مجھے چوں لالہ زار سرخ
جیوان و جن، کان، نباتات سرسبز دریا و دشت، بیشہ و ہر کوہ و غار سرخ
مخل میں جا کے دیکھوں تو مطربِ جہنم پوٹیں طنبوہ سرخ، چنگ کی ہر تار تار سرخ
یاور ہو بخت گرم تو کچھ عجب نہیں اے قادری جو دیکھوں میں ایسی بہار سرخ
پھر کتنی تذکروں میں اولیاء اللہ ایسے بھی ملتے ہیں جو فی الواقعہ اور علی الاعلان شراب پیاتے تھے۔
اور شیخ حسین لاہوری تو اس وقت تک کسی کو مرید بھی نہ بتاتے تھے جب تک وہ ان کے ہاتھوں شراب
کا جام نوش نہ فرمالے۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ طریقت کو شریعت سے ماخوذ بنانے والے صوفیاء نے
بھی ایسے لوگوں کو دنیائے ولایت سے خارج نہیں کیا۔ ان کے نام بدستور تذکروں میں عزت و محرم سے
لئے جاتے انہیں قدس سرہ لکھا جاتا ہے اور پوری عقیدت سے ان کا ذکر خیر کیا جاتا ہے۔

۶۔ تصویرِ شیخ

صوفیاء نے سلوک کی منازل

طے کرانے کے لئے تین

تصویرِ خدا سے دُور رکھنے کا ذریعہ ہے

دبے مقرر کر رکھے ہیں۔ (۱) فنا فی الشیخ (۲) فنا فی الرسول (۳) فنا فی اللہ۔ فنا فی الشیخ کے درجہ کی ابتدا
”تصویرِ شیخ“ سے کرائی جاتی ہے۔ تصویرِ شیخ سے مراد صرف پیر کی ”غیر مشروط اطاعت“ ہی نہیں ہوتی، بلکہ
اسے یہ ذہن نشین کرایا جاتا ہے کہ اس کا پیر ہر وقت اس کے حالات سے باخبر رہتا ہے اور ہر وقت
ضرورت اس کی مدد کو پہنچتا ہے۔ اس عقیدہ کو مرید کے ذہن میں راسخ کرنے کے لئے اسے تسلیم دی
جاتی ہے کہ وہ ہر وقت پیر کی شکل کو اپنے ذہن میں رکھے۔ یہی واہمہ اور شوقِ بسا اوقات ایک حقیقت
بن کر سامنے آنے لگتا ہے۔

مسلمانوں کو صرف حضور اکرم ﷺ کی ”غیر مشروط اطاعت“ کا پابند کیا گیا ہے، کیونکہ وہ جو

کچھ کہتا ہے اللہ کے حکم سے کہتا ہے، لیکن صوفیاء کی تعلیم مرید اور پیر کو 'عبد اور معبود' کے مقام پر لاکھڑا کرتی ہے جس کا حضور اکرم ﷺ یا کسی دوسرے نبی کو بھی حق نہ تھا۔ صوفیاء نے پیری کے فن کو ایک خاص تکنیک دے کر عوام پر اس طرح مسلط کر دیا ہے کہ کوئی آدمی اس وقت تک خدا کے ہاں رسائی نہیں پاسکتا جب تک باقاعدہ کسی سلسلہ طریقت میں داخل نہ ہو۔ پہلے تصویرِ شیخ کی مشق کرے، حتیٰ کہ فانی ایشیخ ہو جائے، یعنی اسے اپنی ذات کے لئے حاضر ناظر، افعال و کردار اور گفتار کو دیکھنے اور سننے والا سمجھنے لگے۔ تب جا کر یہ منزل ختم ہوتی ہے اور عملاً ہوتا یہ ہے کہ مرید بیچارے تمام عمر فانی ایشیخ کی منزل میں ہی غوطے کھاتے کھاتے ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ گویا اللہ اور اس کے رسول سے بیگانہ کر کے اپنا غلام بنانے کا کارگر اور کامیاب حربہ ہے۔ یہ کوئی مبالغہ آرائی کی بات نہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی کا درج ذیل اقتباس اس حقیقت پر پوری طرح روشنی ڈالتا ہے:

”ان (صوفیاء) کے طریق میں بعض ایسی چیزیں، جو مخصوص میں وارد نہیں، بشرط طریق ہیں اور شرط بھی اعظم و اہم، چنانچہ تصویرِ شیخ باوجودیکہ صریحاً کسی نص میں وارد نہیں اور پھر خطرناک بھی ہے اور بعض کو اس میں غلو بھی ہو گیا ہے اور اسی خطرہ و غلو کے سبب مع لانا شہیدؒ اس کو منع فرماتے ہیں مگر باوجود اس کے اکابر نقشبندیہ اس کو مقصود فرماتے ہیں۔ چنانچہ انوار العارفين ذکر تصویرِ شیخ میں کنز الہدایہؒ مکتوبات مجدد و صاحب کا ارشاد نقل ہے کہ:

”ذکر تنہا بے رابطہ و بے فانی ایشیخ موصول نیست ذکر ہر چند از اسباب وصول است

لیکن غالباً مشروط بر رابطہ محبت و فانی ایشیخ است۔“ (تجدید تصوف سلوک، ص ۴۲۲)

(ترجمہ) فانی ایشیخ ہونے کے بغیر تنہا ذکر سے خدا تک رسائی نہیں ہو سکتی، اگرچہ ذکر بھی رسائی کا ایک سبب ہے، لیکن اس کی غالب شرط (پیر سے) محبت کا تعلق اور اس میں فنا ہونا ہے۔
اقتباس بالا سے صاف واضح ہے کہ (۱) تصویرِ شیخ کے عقیدہ کا قرآن و سنت میں کہیں سراغ نہیں ملتا۔ (۲) یہ عقیدہ انتہائی خطرناک اور گمراہ کن ہے۔ (۳) صوفیاء اور خصوصاً نقشبندیوں سے اسے اللہ کی رسائی کا سب سے بڑی اور اہم شرط قرار دیا گیا ہے۔

اب دیکھتے مولانا روم فلسفہ انصاف ثلاثہ کی اہمیت کے لئے بیان فرماتے ہیں:

تصویرِ شیخ اور بزرگوں کے اقوال

پیرِ کامل صورتِ ظِلِّ اللہ یعنی دیدِ پیر دیدِ کبریا !

ہر کہ پیر و ذاتِ ادرائیکہ دید نے مرید و نے مرید و نے مرید

یعنی پیرِ کامل فنا فی الوجود سے فنا فی الشیخ کا مقام عطا کرتا ہے اور فنا فی الشیخ سے نکال کر فنا فی الرسول کا مرتبہ عطا کرتا ہے۔ بعد ازاں فنا فی اللہ کے مقام میں منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ سب مقام پیرِ مُرشد

کے طفیل ہی حاصل ہوتے ہیں، جو مُرید الیسا نہیں سمجھتا وہ قطعاً مرید نہیں ہے؛ (ریاض السالکین، ص ۲۲۵)

اور معین الدین اجمیریؒ نے فرمایا کہ: ”اگر روزِ قیامت خدا تعالیٰ کا جمال میسر ہوگا تو میری صورت میں ہوگا،

تو دیکھوں گا، ورنہ اس کی طرف منہ بھی نہ کروں گا۔“ (ریاض السالکین، ص ۲۳۱)

اور بابا فرید الدین گنج شکرؒ نے فرمایا کہ: ”اگر قیامت کے دن خدا تعالیٰ میرے پیر کی صورت کے سوا

کسی دوسری صورت میں اپنا جمال یا کمال دکھائے گا، تو میں اس طرف آنکھ بھی نہ کھولوں گا۔“ (اقتباس از انوار

ص ۲۹۰، مطبوعہ منبائی دہلی بحوالہ ایضاً)

اور شیخ محمد صادق نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کا دیدار بھی اگر پیرِ دُشگیر کی صورت میں ہوا، تو دیکھوں گا۔ ورنہ

اسے بالکل نہ چاہوں گا۔“ (ریاض السالکین، ص ۲۳۱)

دیکھا آپ نے تصویرِ شیخ کا یہ فارمولا کیسے شاندار نتائج پیدا کر کے مرید کو لبِ شیخ ہی محبُولِ میں ڈال

دیتا ہے۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ یہ عقیدہ کس طرح ایک طرف تو پیر کو

خدائی تقدس عطا کرتا ہے اور دوسری طرف مرید کو اندھی

اندھی عقیدت

عقیدت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ حکیم فیض عالم صدیقی مصنف کتاب ”اختلافِ اُمت کا المیہ“ کے صفحہ ۹۲

پر لکھتے ہیں:

”میں آپ کے سامنے اپنا ایک واقعہ حلیفہ پیش کرتا ہوں۔ چند روز ہوئے میرے پاس ایک عزیز

رشتہ دار آئے، جو شدتِ کشتہ پیری ہیں، میں نے باتوں باتوں میں کہا کہ ”فلاں پیر صاحب کے متعلق اگر

چار عاقل بالغ گواہ پیش کر دوں، جنہوں نے انہیں زنا کا ارتکاب کرتے دیکھا ہو، تو پھر اُن کے متعلق کیا ہو

گے؟“ کہنے لگے: ”یہ بھی کوئی فقیری کا زنا ہوگا، جو ہماری سمجھ میں نہ آتا ہوگا۔“ پھر ایک پیر صاحب کی

شراب خوری اور جھنگ نوشی کا ذکر کیا، تو کہنے لگے: ”بھائی جان! یہ باتیں ہماری سمجھ سے باہر ہیں وہ

بہت بُرے ولی ہیں۔“

راہِ سلوک کی منازل
طے کرنے کے لئے

جنید بغدادی کے مُریک دریا میں غوطے لگانے کی وجہ

تصویر شیخ کے عقیدہ کی اہمیت کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جس کے راوی امام اہلسنت احمد رضا خاں مجدد مائتہ حاضر ہیں اور غالباً ”حدیقہ ندیہ“ کے حوالہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت جنید بغدادی یا اللہ یا اللہ کہہ کر دریا عبور کر گئے، لیکن مریہ کو یہ کہا کہ یا جنید یا جنید کہہ کر چلا آ۔ پھر شیطان لعین نے اس کے دل میں وسوسہ ڈالا کہ کیوں نہ میں بھی یا اللہ کہوں، جیسا کہ پیرِ صاحب کہتے ہیں۔ یا اللہ کہنے کی دیر تھی کہ ڈوبنے لگا۔ پھر جنید کو پکارا، جنید نے فرمایا: ”وہی کہہ یا جنید یا جنید۔“ جب پار لگا، تو پوچھا: ”حضرت! یہ کیا بات ہے؟“ فرمایا: ”اے نادان! ابھی تو جنید تک تو پہنچا نہیں اور اللہ تک سائی کی ہوس ہے۔“ (مخطوطات احمد رضا خان بریلوی، ص ۱۱۴)

یہ ہیں اس تصویر شیخ جیسی بدعت اور لعنت کے کرشمے۔ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا کہ ”جب بھی مجھے کوئی پکائے میں اس کے قریب ہوں، پکائے والے کی دعا اور جواب دیتا ہوں۔“ پھر یہ بھی کہا ہے کہ: ”میں تمہاری رگِ جان سے بھی قریب ہوں۔“ اور یہ لوگ ایسے افسانے تراش کر لوگوں کو شرک میں مبتلا کرتے اور اللہ سے دُور رکھتے ہیں اور اپنی پستش کرواتے ہیں۔ طرفہ تماشایہ کر اگر اس بیچارے کے ضمیر سے حق کی آواز اٹھی بھی، تو اُسے شیطانِ لعین کی آواز قرار دے کر آگے ایسا افسانہ جوڑا کہ وہ واقعی شیطانِ لعین کی ہی آواز معلوم ہونے لگے۔

۱۔ حضرت خضرؑ کی شخصیت

حضرت خضرؑ کے متعلق ہم پہلے تفصیلی بحث کر آئے ہیں کہ ان کی شخصیت آج تک مختلف فیہ

حضرت خضرؑ کون ہیں؟

رہی ہے، کہ وہ نبی تھے یا ولی، کوئی جن یا کوئی فرشتہ تھے جو تدا بیرِ مثبتِ الہی پر مامور تھے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ پر اُن کی لغزش کی وجہ سے عتاب فرماتے ہوئے بغرض تادیب حضرت خضرؑ کے پاس بھیجا تھا، لیکن ہمارے صوفیائے اُن کو ولی قرار دے کر حضرت موسیٰؑ سے افضل ثابت کرنے کی کوشش کی اور یہ کوشش اُس وقت شروع ہوئی جب اُن میں

یہ عقیدہ رائج ہوا کہ ”ولایت نبوت سے افضل ہے۔“ پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ یہ لوگ حضرت خضر علیہ السلام کو ایک زندہ و جاوید ہستی تسلیم کر کے اس سے ہر وقت رہبری کے خواہاں رہتے ہیں جب تک حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات اور رہبری حاصل نہ ہو، ولایت مکمل نہیں ہوتی۔ پھر حضرت خضر کی فرضی شخصیت کے متعلق کئی طرح کے افسانے تراشے گئے، جو اتنے عام ہوتے کہ شعر و ادب میں بھی داخل ہو گئے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

تہیدستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل کہ خضر از آبِ حیوان نشنہ می آرد سکندر را
ترجمہ: بے نصیب لوگوں کو کامل پیر سے کیا فائدہ؟ خضر بھی تو سکندر بادشاہ کو زندگانی کے چشمہ سے پیاسہ پی واپس لے آیا تھا۔

اس فرضی قصہ کے متعلق مشہور متصوف اور مصنف انسان کامل عبد الحکیم جلی کی تحقیق یہ ہے کہ آب حیوان فی الواقعہ ایک ایسا چشمہ ہے جس کے متعلق افلاطون نے یہ بات دریافت کی تھی کہ جو اس چشمہ کا پانی پی لے وہ مرتا نہیں۔ افلاطون خود اس مقام پر پہنچا اور اس نے اس سے پانی پی لیا، لہذا وہ ایک پہاڑ میں جس کا نام دراوند ہے، اب تک زندہ ہے۔ افلاطون کا شاگرد ارسطو تھا، جو سکندر کا استاد تھا، جو شکر سکندر نے ترتیب دیا اس میں حضرت خضر علیہ السلام بھی موجود تھے مگر حضرت خضر علیہ السلام باوجود سکندر کی آرزو کے اے جُل دے گئے اور اس چشمہ کا حال پوشیدہ رکھا۔ حالانکہ اس چشمہ کا حال حضرت خضر علیہ السلام کو معلوم تھا۔ وغیرہ
ذکر من کثرافات۔ (انسان کامل، ص ۴۰۰)

غالب اسی خیال کی تائید میں کہتا ہے:

کیا کیا خضر نے سکندر سے اب کے رہنما کرے کوئی؟

یہ حضرت خضر علیہ السلام کے فیض سے متعلق شعر تھا اور اب دوسرا شعر ان کی رہبری و راہنمائی اور ہدایت سے تعلق رکھتا ہے۔ اقبال کہتا ہے۔

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

اور جن صاحبِ نصیب لوگوں کو حضرت خضر علیہ السلام کی راہنمائی یا ملاقات حاصل ہو جائے، تو اس کی اولیائی میں کیا شک ہو سکتا ہے اب جن خوش قسمت بزرگوں کو یہ سعادت ملی، ان کے حالات سنیں

حضرت خضر سے ملاقات

(۱) حضرت محمد علی ترمذی کا ذکر چل رہا ہے،
”ایک دن آپ قبرستان میں ایک درخت

کے نیچے بیٹھے ہوئے اپنی بدمستی پر آنسو بہا رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ میرے ساتھی تھوڑی مدت کے بعد علم حاصل کر کے آئیں گے اور عزت پائیں گے، میں یونہی گنوار رہوں گا۔ ناگاہ ایک طرف سے ایک پیر مرد نورانی شکل ظاہر ہوئے اور کہنے لگے، ”میاں تم علم حاصل کرنا چاہتے ہو؟“ آپ نے کہا: ”ہاں! یہی آرزو رکھتا ہوں۔“ انہوں نے کہا: ”تو میں ہر روز یہیں آکر علم پڑھایا کروں گا۔“ یس کر آپ خوش ہوئے اور تین برس تک ان سے علم پڑھتے رہے۔ جب فارغ ہوئے، تو انہوں نے پوچھا: ”اے عزیز! کیا تم نے سمجھا کہ یہ دولت علم تمہیں کس وجہ سے حاصل ہوئی؟“ آپ نے نفی میں جواب دیا، تو بولے: ”میں اللہ کا بندہ خضر ہوں۔ تم نے اپنی والدہ کو آزدہ نہ کیا تھا، یہ صرف اس کا صلہ ہے کہ میں تمہاری تعلیم پر مقدر ہوا۔“ (مقرآن حق، ص ۱۶۸)

اب دیکھئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو اللہ نے حضرت خضر علیہ السلام کے پاس خود جانے کو کہا تھا لیکن ان بزرگ کے پاس حضرت خضر علیہ السلام خود پہنچ کر اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ پھر جو حضرت خضر علیہ السلام کے پاس علم ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو تین ملاقات دیکھ کر ہی فیصلہ کر لیا کہ یہ علم میرے بس کا روگ نہیں، لیکن یہ بزرگ متواتر تین سال ان سے علم حاصل کرتے رہے اور انہیں حضرت خضر علیہ السلام کا اس قسم کا علم ہضم ہوتا رہا۔

۲۔ ابوبکر و راق کا ذکر چل رہا ہے۔ ”نقل ہے کہ آپ کو مدت سے آرزو تھی کہ حضرت خضر علیہ السلام کی زیارت ہو۔ ہر روز قبرستان جاتے اور راتے میں ایک جزو قرآن کریم کا پڑھتے۔ ایک دن گھر سے نکلے ہی تھے کہ ایک نورانی شکل بزرگ سے ملاقات ہو گئی، جو کہنے لگے کہ اگر آپ پسند کریں تو میں بھی تھوڑا سا وقت آپ کے ساتھ گزار لوں۔“ آپ نے اجازت دے دی۔ دونوں قبرستان گئے۔ راہ میں آپ اس بزرگ سے عمدہ عمدہ باتیں کرتے رہے۔ جب وہ جانے لگے، تو انہوں نے کہا: ”آپ نے مجھے پہچانا کہ میں کون ہوں؟ اے اوراق! میں خضر ہوں، تو مدت سے چاہتا تھا کہ مجھ سے ملے۔ آج میں یہ احباب ہوا، لیکن قرآن کریم کا جو جزو تو راتے میں پڑھا کرتا تھا۔ میری باتوں کے سبب اس کی سعادت سے محروم رہا۔ اب سمجھ لے کہ جب صحبت خضر سے یہ نقصان ہوا، تو دوسرے لوگوں کی صحبت سے کتنا نقصان ہو

۱۔ حضرت خضر علیہ السلام کی تسبیح کی تھی۔ یہ * اولیاء اللہ کی اقام کے تحت ملاحظہ فرمائیے،

گا پس تنہائی سب اچھی چیز ہے۔“ (مقرآن حق، ص ۲۰۷)

معلوم ہوتا ہے کہ (۱) حضرت خضر علیہ السلام اکثر قبرستان میں ہی ملتے ہیں، نورانی شکل میں (۲) وہ اپنا نامارف خود کرواتے ہیں تاکہ شبہ نہ رہے۔ (۳) ان کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فلاں شخص میری ملاقات کا مشتاق ہے۔

سلسلہ چشت میں غالباً خواجہ حلیف
المرعشی (م ۲۰۲ھ) وہ پہلے بزرگ

صوفیاء اور حضرت خضر علیہ السلام کی تاریخ

بیں جنہوں نے ۱۶ سال کی عمر میں علوم ظاہریہ کی تکمیل فرمائی۔ اس کے بعد حضرت خضر علیہ السلام کی وہابی سے سلطان ابراہیم بن ادھم (م ۱۶۲ھ) ہمک مسائی کی (تاریخ چشتیت، مولانا زکریا، ص ۱۴۵)

پھر ان کے بعد دوسرے بزرگ علوم شاد و دینوری (م ۲۹۰ھ) ہیں، جو بیعت سے قبل حضرت خضر علیہ السلام کی صحبت میں تھے اور ان ہی کے اشارہ سے بیعت ہوئی تھی۔“ (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۴۹)

”غوث الاعظم قدس سرہ سے منقول ہے
کہ ابتدائے حال میں میں نے خدا تعالیٰ سے

پیران پیر سے پہلی ملاقات

عہد کیا تھا کہ ”میں اس وقت تک نہ کھاؤں گا جب تک وہ خود نہ کھلائیں پلائیں گے اور میرے منہ میں لقمہ نہ رکھیں گے۔“ چالیس دن بعد میرے پاس ایک شیخ آیا اور میرے پاس کھانا رکھ کر چلا گیا۔ بھوک کی شدت کے باوجود میں نے اپنے عہد کو یاد رکھتے ہوئے اس کھانے کی طرف توجہ نہ دی۔ اچانک میں نے آواز سنی، کوئی زور زور سے الجوع الجوع (بھوک، بھوک) پکار رہا ہے۔ اتنے میں شیخ ابوسعید اُدھر سے گزبے اور پوچھا: ”عبدالقادر ایہ آواز کیسی ہے؟“ میں نے کہا: ”یہ میرے نفس کا اضطراب ہے مگر روح اپنی جگہ پر قائم اور مشاہدہ النوار خداوندی میں محو ہے۔“ فرمایا میرے گھر چلو، عرض کی اس جگہ سے باہر قدم نہ رکھوں گا۔ وہ چلے گئے، تو ابو العباس خضر تشریف لائے۔ فرمایا: ”اٹھو ابوسعید کی خدمت میں جاؤ۔ میں ان کی طرف چل پڑا، انہوں نے مجھے دیکھ کر فرمایا: ”اے عبدالقادر! جو کچھ میں نے کہا تھا وہ کافی نہ تھا۔ تو نے خضر کو خواہ مخواہ تکلیف دی۔ پھر آپ مجھے مکان کے اندر لے گئے، کھانا تیار تھا، وہ لقمہ لقمہ میرے منہ میں ڈالتے جاتے تھے، یہاں تک کہ میں اچھی طرح سیر ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے غرقہ پہنایا اور میں ان کی صحبت

میں رہنے لگا۔“ (خزینۃ الاصفید، ص ۱۵۰)

اس اقتباس سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں :

۱۔ حضرت خضر علیہ السلام کی کفایت ابو العباس ہے اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کا کوئی لڑکا عباس ہو، جس کے نام پر آپ نے یہ کنیت پسند فرمائی ہو۔

۲۔ اولیاء اللہ کے ہاں خضر کی بات کی اس قدر وقعت ہے کہ وہ اپنے خدا سے کئے ہوئے عہد کا بھی پکا نہیں کرتے اور اُن کا حکم مانتے ہیں۔

۳۔ دہی باتیں ممکن ہیں، یا تو یہ تسلیم کیا جائے کہ ابوسعید کا ہاتھ جس سے وہ لقمہ ڈالتے تھے، دراصل اللہ ہی کا ہاتھ تھا یا یہ کہ پیرانِ پیر نے اپنے عہد کی خلاف ورزی کی۔

حضرت خضر علیہ السلام کی اضافی ڈیوٹی | قادری صاحب اپنی کتاب "سیرۃ غوث الثقلین" کے صفحہ ۹ پر فرماتے ہیں کہ :

”ایک دن حضرت غوث اعظم منبر پر علوم و معارف بیان فرما رہے تھے۔ اثنائے وعظ میں اُٹھ کر چند قدم ہوا میں چلے اور زبان مبارک سے فرمایا **يَا اِسْرَآئِيْلُ قِفْ فَاَسْمِعْ كَلَامَ اَلْحَمْدِ** یعنی اے اسرائیلی ٹھہر جاؤ اور محمدی کا کلام سنو۔ آپ سے دریافت کیا گیا کہ کیا واقعہ تھا، تو آپ نے ارشاد فرمایا : کہ حضرت خضر علیہ السلام یہاں سے گزر رہے تھے، تو میں اُن کو اپنا کلام سننے کے لئے ٹھہرانے گیا تھا، تو آپ ٹھہر گئے۔“ (مکتوبات الف ثانی نمبر ۵۵، ج ۲۔ ہجرت الاسرار، ص ۴۷۔ انجباء الاخيار فارسی، ص ۱۹)

اب دیکھئے کہ یہ حضرت خضر علیہ السلام بھی کیسی پراسرار شخصیت ہیں۔ یہ ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مجمع البحرین پر انسانی صورت میں ملے تھے۔ چوتھی صدی قبل مسیح سکندر رومی کے لشکر میں بصورت انسانی شامل ہوئے، جو کہ کافر تھا۔ اور اسے آپ حیات کے چشمہ سے پانی پینے سے بے نیل و مرام ہی واپس لے آئے۔ محمد علی صاحب ترمذی اور ابو بکر وراق کو قبرستان میں بصورت انسانی ملتے ہیں کسی کو وقوفِ مدی کی تعلیم دیتے ہیں اور کسی کو مکتب چھوڑ بھی جاتے ہیں۔ پچھوٹی صدی ہجری میں عبدالقادر جیلانی کو بصورت رجال الغیب ہوا میں اڑتے ہوئے ملتے ہیں اور وہ بھی زمین سے صرف چند قدم کے فاصلے پر۔ عبدالقادر جیلانی چند قدم ہوا میں چل کر اور انہیں ٹھہرا کر اپنا کلام سنا کے چھوڑتے ہیں

پھر تو حضرت خضر ؑ آپ کے ایسے مرید ہوئے کہ انہیں کے ہوئے۔

اب اُن کی ڈیوٹی یہ تھی کہ ایک تو خود اکثر اوقات آپ کی مجلس شریف میں شامل ہوتے اور مشائخِ زمانہ میں سے جس سے بھی حضرت خضر ؑ کی ملاقات ہوتی، تو اس کو آپ کی مجلس میں حاضر ہونے کی تاکید فرماتے۔ (سیۃ غوث الثقلین، ص ۷۴)، اور دوسری یہ کہ جب کوئی ولی یا ابدال فوت ہو جاتا، تو آپ اس کی خبر عبدالقادر جیلانی کو دیتے۔ پھر خواہ کسی چوریا کا فرکو عبدالقادر جیلانی ابدال بنانے کا ارادہ کرتے، حضرت خضر ؑ اس متعلقہ شخص کو اس کے علاقہ سے اٹھا کر آپ کے پیش کر دیا کرتے تھے۔ جیسا کہ ہم اس کتاب میں مناسب مقام پر دو واقعات تذکرہ نگاروں کے حوالوں سے پیش کر چکے ہیں۔

۱۲ سال کی عمر میں آپ **قطب الدین بختیار کاکی (م ۶۳۲ھ) کو معلم کے پاس لے جانا**

کے والد فوت ہو گئے۔ جب پانچ سال کے ہوئے، تو والدہ نے اپنے کسی ہمسایہ کو کہا کہ آپ کو کسی معلم کے پاس چھوڑ آئیں۔ راستہ میں ایک بزرگ ملے، انہوں نے دریافت کیا کہ اس لڑکے کو کہاں لے جاتے ہو؟ اور یہ جواب سن کر کہ تعلیم کے لئے مکتب لے جا رہا ہوں، فرمایا کہ میرے حوالہ کر دو، میں ایک معلم کے پاس بٹھا دوں گا۔ ہمسایہ نے ان کے حوالہ کر دیا، وہ بزرگ خواجہ ابوحض اوشی کے پاس لے گئے اور فرمایا: ”احکم الحاکمین کا حکم ہے اس لڑکے کو تو تجھ سے پڑھاؤ۔“ اور یہ فرما کر چلے گئے۔ استاد نے دستِ شفقت پھیر کر شاگرد سے فرمایا: ”بڑے صاحبِ نصیب ہو کہ حضرت خضر ؑ نہیں میرے حوالہ فرما گئے ہیں۔“ تاریخِ مشائخِ چشتیت، مولانا زکریا، ص ۱۷۱)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ قطب الدین کی تعلیم کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو ابوحض اوشی کو منتخب کیا اور حضرت خضر ؑ کو استاد تک پہنچانے کا حکم دیا تھا اور نیز یہ بھی کہ ابوحض اوشی پہلے سے ہی حضرت خضر کو جانتے تھے۔ اب یہ اللہ احکم الحاکمین کا حکم کس طرح پورا ہوا؟ یہ بھی شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کی زبانی سنئے:

”آپ (قطب الدین) حضرت شیخ (ابوحض اوشی) کی خدمت میں علمِ ظاہری کی تحصیل کے لئے حاضر ہوئے۔ حضرت نے سختی لے کر کچھ تحریر فرمانے کا ارادہ کیا ہی تھا، کہ ندائے غیبی سے معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب کی تحصیلِ ظاہری قاضی حمید الدین ناگوری کے حوالہ ہے۔“

گویا اس نملے غیبی نے اللہ احکم الحاکمین کے ارشاد اور حضرت خضرؑ کی تکلیف فرائی سب پر پانی پھیر کر قطب الدین کا استاد ہی بدل دیا۔ یہ ہے ہاتھ غیبی اور حضرت خضرؑ کی حقیقت جن سے ان اولیاء اللہ کو اکثر سابقہ پڑتا رہتا ہے۔

حضرت خضرؑ سے ایک روایت

امام اہل سنت احمد رضا خاں فرماتے ہیں:-
”حضرت خضرؑ“ سے مروی ہے کہ جو شخص اشحات

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے انگوٹھوں کو چومے گا۔ اور پھر اپنی آنکھوں پر لگائے گا۔ اس کی آنکھیں کبھی نہ کھلیں گی۔
(فتاویٰ رضویہ ۲۸۲ بحوالہ بریلویت ۲۳۹)

امام اہل سنت نے اس روایت کو امام سناوی سے نقل کیا ہے جبکہ امام سناوی خود یہ روایت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ”اس روایت کو کسی صوفی نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے اس کے راوی محدثین کے کسی ایک مجہول اور غیر معروف ہیں، نیز حضرت خضرؑ سے کس نے سنا اس کا کوئی ذکر نہیں۔“

گویا اس روایت کو امام سناوی درج کر کے اسے مردود قرار دے رہے ہیں۔ امام اہل سنت اس بدعت کو روانہ دینے کے لیے اسی مردود روایت سے استدلال فرما رہے ہیں۔

حضرت خضرؑ کی نماز

ہم اسے اکثر صوفیاء اور اولیاء قبرستانوں اور جنگلوں میں انہیں تلاش کرتے اور ان سے فیضیاب ہونے

کو بہت بڑی سعادت سمجھتے ہیں اور ان سے ملاقات کے لئے بے قرار رہتے ہیں اور اس مقصد کے حصول کے لئے اور ادو ظائف کے علاوہ ایک مخصوص قسم کی نماز بھی وضع کی گئی ہے۔ اب اس نماز خضر کا طریقہ صادق فرغانی صاحب سینے، تلقین مرشد کامل کے صفحہ ۲۴۰ پر رقمطراز ہیں:

”اس کے بعد اگر ہو سکے تو حضرت خضرؑ کی نماز کی بارہ رکعتیں پانچ سلاموں کے ساتھ پڑھے۔ پہلی رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد ایک مرتبہ سورۃ فیل، دوسری میں لایلاف، تیسری میں ماعون، چوتھی میں کوثر، پانچویں میں کافرون، چھٹی میں نصر، ساتویں میں تبت، آٹھویں میں اخلاص، نویں میں فلق، دسویں میں سورۃ ناس پڑھے۔ (گیارھویں بارھویں کے متعلق کچھ ارشاد نہیں ہوا) جو شخص اس نماز کو ہمیشہ پڑھے، اس کو حضرت خضرؑ کی ملاقات حاصل ہو جاتی ہے۔“

غور فرمایا آپ نے، نماز جیسی عبادت بھی غیث اللہ کے لئے پڑھنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔ اس سے

زیادہ صریح شرک بھی کوئی ہو سکتا ہے۔ پہلے اپنے ایمان کی خیر منائیے، پھر حضرت خضر ؑ سے ملاقات فرمائیے۔ اور ہم یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں، کہ اس طرح جو صورت آپ سے ملاقات فرمائے گی وہ شیطان ہی ہوگا، جو اپنے آپ کو خضر ظاہر کرے گا۔ کچھ بھی ہو، ملاقات تو ہو ہی جائے گی۔ اور اس پراسرار ہستی کے حالات سے آپ مطلع ہو جائیں گے اور اس سے ”فیض“ بھی حاصل کر سکیں گے۔ لیکن یاد رکھئے! حضرت خضر ؑ ہرگز زندہ نہیں ہیں۔ وہ فوت ہو چکے ہیں اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر وہ دور نبوی ؐ میں زندہ ہوتے، تو حضور اکرم ؐ کو ضرور ملتے، جہاد میں شرکت فرماتے اور صحابہ ؓ سے ملاقات کرتے مگر کسی کمزوری روایت سے بھی اس قسم کا کوئی ملنا نہیں ملتا۔

دائرة المعارف الاسلامیہ
مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی

حضرت خضر ؑ کی ابدی زندگی کا عقیدہ

زیر عنوان طریقت، ج ۱۲، ص ۲۶۰ پر درج ہے کہ :

”راخ العقیدہ فقہار نے اہل تصوف کے استاد الہامی (روحانی) کے خلاف بھی آواز بلند کی ہے۔ جس کی بنا پر سلسلہ تصوف کو ایک ایسی مقدس ہستی کے مظاہرے فیضان حاصل ہوتا ہے، جو پراسرار اور غیر فانی ہے یعنی الخضر، جن کی ہادی طریقہ کی حیثیت سے سب سلسلے توقیر و تعظیم کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ حضرت موسیٰ ؑ کے رہنما اور صوفی کی روح کو حقیقتِ علیا سے آشنا کرنے کے اہل ہیں۔ یہ عقیدہ غالباً تصوف کی کسی مستند کتاب میں نہیں پایا جاتا۔“ (دائرة المعارف، بحوالہ بالا)

پھر اسی دائرة المعارف میں خواجہ خضر کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ :

”ہندوستان میں انہیں کنوؤں اور چشموں کی روح کا روپ سمجھا جاتا ہے۔ دریائے سندھ کے آس پاس انہیں دریا کا اوتار سمجھا جاتا ہے۔ ایک شاعر نے حضرت خضر ؑ کا نام میکائیل کے نام کی جگہ بطور ایک بڑے فرشتہ کے لیا ہے۔ حضرت خضر ؑ کی خانقاہ سندھ کے ایک جزیرے میں بھکر کے پاس ہے جہاں ہر ہفتہ سب کے عقیدت مند زیارت کو جاتے ہیں۔“ (دائرة المعارف، ج ۹، ص ۲۲)

۸۔ رجال الغیب سے استفادہ

ہم پہلے باب میں بیان کر آئے ہیں کہ ریاضت و مجاہدہ اور چاند کشیوں کے ذریعہ انسان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ عالم

رجال الغیب کی تسخیر

ارواح میں بے شمار قسم کی رُوحیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً فرشتے، جن، فوت شدہ انسانوں کی نیک اور بد رُوحیں شیطانی اور خبیث رُوحیں سب اس عالم میں پائی جاتی ہیں۔ انسان نے اپنی ضرورت اور پسند کے مطابق کئی قسم کے جنتِ منتر اور اد و ظائف ان رُوحوں کو قابو کرنے کے لئے ایجاد کر لئے اور ان کو مسخر کر کے کئی قسم کی شبیدہ بازیاں دکھانا شروع کیں۔ ایسی رُوحوں کو عام طور پر رجال الغیب کے نام سے پکارا جاتا ہے اور دورِ نبوی ﷺ میں ان رُوحوں سے کام لینے والے تین گروہ تھے۔ (۱) رہبان (۲) کاہن اور (۳) جادوگر۔ اور شریعت نے ایسے سب علوم و فنون کو کفر قرار دیا ہے۔

پھر آپ نے کئی ایسے فقیروں اور درویشوں کو بھی دیکھا ہوگا جو کسی دیرانے یا لبِ دریا ڈیرہ ڈال کر عموماً رات کو چلہ کشی کرتے، اپنے گرد حصار کھینچتے اور کوئی جنتِ منتر یا قرآن کی آیت یاد دہکے اور اد و ظائف پڑھتے ہیں اور مقررہ چلہ پورا کرتے ہیں۔ رات کو اس وظیفہ کی مقررہ تعداد کے پڑھنے کے دوران کئی قسم کی بد رُوحیں یا جن وغیرہ انہیں ڈرتے دھمکتے ہیں۔ اگر چلہ کاٹنے والا ان سے نہ ڈرے اور چلہ پورا کرے، تو وہ کامیاب ہو جاتا ہے اور ان خبیث رُوحوں کا حاکم بن جاتا ہے۔ ورنہ دورانِ چلہ یہ رُوحیں اسے سخت اذیتیں پہنچاتی ہیں اور بعض دفعہ اسے ہلاک بھی کر دیتی ہیں۔ اب جو شخص اس چلہ میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ دوسروں کو پڑے ہوئے جن نکال بھی سکتا ہے۔ کسی چنگے بھلے انسان میں جن ڈال بھی سکتا ہے۔ لوگوں کو تعویذوں اور جنتروں کے ذریعے تکلیفیں بھی پہنچا سکتا ہے اور ان رُوحوں کی وساطت سے غیب کی خبریں بھی دیتا ہے۔ حضرت سلیمان ؑ کے زمانہ میں بنی اسرائیل اس کا دوبارہ کے پیچھے پڑ گئے تھے جسے اللہ نے کفر قرار دیا۔ اور یہی حال دورِ نبوی ﷺ کے رہبانوں، کاہنوں اور ساحروں کا تھا۔

آپ حیران ہوں گے کہ اس طبقہ صوفیاء میں سے اکثر حضرات کا دوبارہ بھی اسی قسم کا ہوتا ہے۔ ان کے کشفِ قبور کے سلسلے، ریاضات، مجاہدات، چلہ کشیاں وغیرہ بھی اسی قسم کی ہوتی ہیں اور ان کے ثمرات (عوام کی زبان میں کرامات) بھی اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ اب یہ مسئلہ چونکہ بہت نازک ہے۔ اس لئے ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہیں گے۔ صرف ان اولیاء اللہ کے تذکرہ نگاروں کی عبادت پیش کر دیں گے۔ نتیجہ آپ خود نکال لیجئے گا۔

اس سلسلہ میں ہم طبقہ صوفیاء کی آفتاب و ماہتاب ہستی شیخ عبدالقادر کے واقعات پیش کریں گے۔

پیرانِ پیر کی ریاضت

اور ان کے سیرۃ نگار، محقق ضیاء اللہ قادری کی کتاب سیرۃ غوث الثقلین سے اقتباس پیش کریں گے، یہ بھی خیال رہے کہ اس کتاب کے ابتدائیں نو ایسے مشہور مشائخ عظام و علمائے کرام کی تعاریف بھی درج کی گئی ہیں جنہوں نے اس کتاب کو ایک تحقیقی کتاب قرار دے کر بہ نظر امتحان عامہ فرسائی فرمائی ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ عبدالقادر جیلانیؒ کو غوث الثقلین کہا جاتا ہے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ثقلین سے مراد انسان اور جن ہیں نہ کہ انسان اور فرشتے یا فوت شدہ انسانوں کی رُوحیں۔ چنانچہ قادری صاحب نے اپنی کتاب کے صفحہ ۸ پر ایک عنوان ”جنوں پر حکومت“ قائم کر کے اس اشتباہ کو دور کر دیا ہے۔ آپ کو یہ جنات پر حکومت کیسے ملی۔ اس کے متعلق قادری صاحب ”سیرت غوث الثقلین“ کے صفحہ ۱۲۰ پر لکھتے ہیں :

”حضرت کو نفسانی خواہشات کے علاوہ شیطاں اور جنات کے ساتھ بھی سخت مقابلہ سے سیدہ پُسر ہونا پڑا۔“ چند ایک واقعات ملاحظہ فرمائیں :

۱۔ شیخ عثمان العسیرینی فرماتے ہیں کہ میں نے غوثِ اعظم کی زبان سے سنا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ: ”میں شب و روز بیاباں اور ویران جنگلوں میں رہا کرتا تھا، تو میرے پاس شیطاںیں مسلح ہو کر ہمتناک صوتوں میں صف بصف آتے اور مجھ سے مقابلہ کرتے مجھ پر آگ پھینکتے مگر میں اپنے دل میں بہت زیادہ ہمت اور طاقت محسوس کرتا اور غیب سے کوئی مجھے پکار کر کہتا۔ اے عبدالقادر! اٹھو، اُن کی طرف بڑھو۔ مقابلہ میں ہم نہیں ثابت قدم رکھیں گے۔ پھر جب میں ان کی طرف بڑھتا، تو وہ دائیں بائیں یا جدھر سے آئے اسی طرف بھاگ جاتے۔ ان میں سے کبھی میرے پاس صرف ایک شخص ہی آتا اور ڈرانا اور مجھے کہتا کہ یہاں سے چلے جاؤ، تو میں اسے ایک طمانچہ مارتا، تو وہ بھاگتا نظر آتا۔ پھر میں لاسول پڑھتا، تو وہ جل کر راکھ ہو جاتا۔“ (ہجرت الاسرار، ص ۸۵، ۸۶۔ قلائد الجواہر، ص ۱۱)

پیران پیر کی مجلس میں جالِ الغیب کی حاضری قادری صاحب ”سیرۃ غوث الثقلین“ کے صفحہ ۹۶ پر قلمباز ہیں :

۱۔ ”حافظ ابو نعیم طبرانی فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں غوثِ پاک کی مجلس میں حاضر تھا، تو آپ نے ارشاد فرمایا :
 ۱۔ ابوالسعد حریری بیان کرتے ہیں کہ غوثِ پاک نے فرمایا ہے کہ: ”میں نے ریاضت و مجاہدہ کا کوئی ایسا طریقہ نہیں چھوڑا جس کو اپنے نفس کے لئے نہ اپنایا ہو اور اس پر قائم نہ رہا ہوں۔ مدتِ عرصہ تک میں شہر کے ویران اور بے آباد مقامات پر زندگی بسر کرتا رہا۔ نفس کو طرح طرح کی ریاضت و مشقت میں ڈالا، پچیس برس ہم عراق کے بیاباں جنگلوں میں تنہا پھرتا رہا۔“ (سیرۃ غوث الثقلین، ص ۸۳)

”کہ میرا کلام رجال الغیب سے ہوتا ہے، جو کہ قاف سے میری مجلس میں شرکت کے لئے حاضر ہوتے ہیں شیخ عبدالقادر کے اس دعوے کی تصدیق اُن کے فرزند ارجنہ شیخ عبدالزاق ان الفاظ میں فرماتے ہیں: ”حضور کے فرمان کے وقت جب میں اُپر نظر اٹھا کر دیکھا، تو ہوا میں رجال الغیب کی صفوں کی صفیں نظر آئیں اور ان سے تمام اُفتی بھر پور تھا اور یہ لوگ سروں کو جھکاتے ہوئے غوث پاک کا کلام سُن رہے تھے“ (قلائد الجواہر، ص ۵۸)

۲ ”ابوالفخام حسینی سے مروی ہے کہ میں ایک دن مغرب اور عشاء کے درمیان مدرسہ کی چھت پر شیخ عبدالقادر کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص کو ہوا میں اڑتا ہوا دیکھا، اس کا لباس سفید اور نہایت ہی عمدہ عمامہ باندھ ہوئے تھا وہ آپ کی خدمت میں مؤذنب بیٹھا اور سلام عرض کر کے چلا گیا، تو میں نے حضرت کے مبارک ہاتھ کو بوسہ دے کر پوچھا: ”یہ کون شخص ہے؟“ آپ نے فرمایا: ”یہ رجال الغیب تھا، جو کہ ہمیشہ پھرتے رہتے ہیں۔“ (قلائد الجواہر، ص ۶۸)

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ ان جنوں یا رجال الغیب کو مسخر کرنے کا کیا طریقہ ہے اور وہ ان سے کیا کام لیتے تھے اور کیسے؟ چنانچہ قادری صاحب دکی کتاب سیرۃ غوث الثقلین، صفحہ ۹۵ تا ۱۰۵ کی مہند جوئیل دومریات ملاحظہ فرمائیے، لکھتے ہیں:

ابوسعید عبداللہ رحمہ اللہ کا اپنا ذاتی واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میری فاطمہ نامی غیر شادی شدہ سولہ سالہ لڑکی کو چھت

جنات سے لڑکی واپس لانا

سے کوئی جن اٹھا کر لے گیا۔ میں نے پریٹنی کے عالم میں یہ واقعہ غوث الثقلین کو بتایا، تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ: ”تم بعد اذ کے محلہ کرنخ کی ویران جگہ میں پانچویں میلہ کے قریب جا کر بیٹھ جاؤ اور اپنے ارد گرد زمین پر دائرہ کھینچ لینا اور دائرہ کھینچتے وقت بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ عَلٰی نَبِیِّہِ عَبْدِ الْقَادِرِ پڑھنا جب آدھی رات گزرے گی، تو تمہارے پاس سے مختلف صورتوں میں جنات گزریں گے، تم ان سے بالکل

لے صوفیاء کی تاریخ میں اور بھی بہت سے ولی اللہ ہیں جنہوں نے جنات کو تسخیر کر رکھا تھا اور ان سے مختلف کام لیتے تھے۔ مثلاً عبدالقدوس گنگوہی، غوث محمد گوالید، عبداللہ شاہ بلوچ وغیرہ۔ ان کا ذکر آگے چل کر مختلف عنوانات کے تحت آئے گا۔ پیران پیر کی زندگی ہی میں خواجہ محمد چشتی کی وفات پر اُن کی نماز جنازہ سب سے پہلے رجال الغیب نے ہی پڑھی تھی، پھر آدمیوں نے اور ان کا جنازہ اُنہی ہی لگا تھا۔ (تاریخ مشائخ چشت مولانا زکریا، ص ۱۶۰)

نہ ڈرنا۔ پھر صبح کو جنوں کے بادشاہ کا ایک عظیم لشکر کے ساتھ تہاے پاس سے گزر ہوگا۔ وہ تم سے تہاری ضرورت دریافت کرے گا، تو اسے صرف یہ کہنا کہ مجھے عبدالقادر نے بھیجا ہے۔ بعد ازیں اپنی بیٹی کا واقعہ بیان کرنا۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ جنوں کے بادشاہ نے جب آپ کا نام سنا، تو گھوڑے سے نیچے اتر کر بیٹھ گیا اور پوچھا: حضرت نے تمہیں کس لئے بھیجا ہے۔ میں نے مقصد بیان کیا، تو اس نے اپنے لشکر سے پوچھا کہ اس لڑکی کو کون اٹھا لایا ہے؟ سب نے لامعی کا اظہار کیا۔ بعد ازاں ایک سرکش جن حاضر کیا گیا، جس کے پاس لڑکی تھی۔ جنات نے بتلایا کہ یہ جن چین کے جنات میں سے ہے۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا: ”تجھے کیا ہوا کہ قطبِ وقت کے شہر سے لڑکی اٹھالی؟“ جن نے جواب دیا: ”کہ یہ مجھے اچھی لگی تھی۔“ بادشاہ نے حکم دیا کہ اسی وقت اس کا سر قلم کر دیا جائے، چنانچہ اس کی گردن اڑادی گئی اور لڑکی میرے حوالے کر دی گئی۔ میں (یعنی ابوسعید عبداللہ راوی) نے کہا کہ مجھے آج سے پہلے جنات کا غوثِ اعظم کی تابعداری کرنے کا علم نہ تھا۔“ (ہجرت الاسرار، ص ۷۱، ۷۲۔ قلائد الجواہر، ص ۲۲۱، ۲۲۲۔ نزہۃ القادر، ص ۶۲۔ تحفہ قادریہ، ص ۶۸۔ سنینہ اولیاء، ص ۷۴، ۷۵۔ خزینۃ الاصفیاء، ج ۱، ص ۹۵)

اور صاحبِ خزینۃ الاصفیاء نے یہ اضافہ بھی فرمادیا:

”کہ اس جنوں کے بادشاہ نے کہا: ”ہم ان (پیران پیر) کے فرمانبردار کیوں نہ ہوں۔ جب وہ گھر میں تمام جنات پر نظر ڈالتے ہیں، تو ان کی ہیبت سے جنات تھرا اٹھتے ہیں۔“ (خزینۃ الاصفیاء، رد و ترجمہ، ص ۱۵۶)

اب دیکھئے اس واقعہ کو چھتہ تذکرہ نگاروں نے بیان فرمایا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت بڑی معتبر ہے مگر میں تو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ جب ابوسعید عبداللہ راوی کی لڑکی چھت سے غائب ہوئی، تو ابوسعید کو کیسے معلوم ہو گیا کہ اُسے ضرور کوئی جن ہی اٹھا کر لے گیا؟ جن تو غیر مرئی مخلوق ہوتے ہیں۔ پھر اگر اسے یہ ظن غالب ہو ہی گیا تھا، تو بھی اُس کو اس وقت تک یہ تو معلوم نہ تھا کہ جن بھی شیخ عبدالقادر کی تابعداری کرتے ہیں۔ پھر وہ آپ کے پاس جن کے لڑکی اٹھانے کی شکایت لے کر کیسے چلا گیا؟ تاہم اس واقعہ سے چند اور امور پر روشنی ضرور پڑتی ہے، مثلاً:

۱۔ پیران پیر نے بھی جنوں کو مستخر کرنے اور ان سے کام لینے کے وہی طریقے پیش کئے جو آج کل کے جنوں کے عامل کیا کرتے ہیں۔

۲۔ جن خواہ چین کے ہوں یا بغداد کے سب کا بادشاہ ایک ہی ہوتا ہے۔

۳۔ پیران پیر کے زمانہ میں جنوں میں کافرانہ حکومتیں جنگل کا قانون رائج تھا۔ ورنہ جن بھی شریعت کے مکلف ہیں اور مجرم اور اس کی سزا کے شرعی تقاضوں کے پابند ہیں۔

آسیب کے دوے

”ایک دفعہ ایک اصفہانی نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: ”میری بیوی کو آسیب ہے اور کثرت سے

اس کو دورے پڑتے ہیں۔ تمام عامل عاجز آگئے ہیں، تو حضرت نے ارشاد فرمایا: ”کہ یہ سرانڈیپ کے بیابان کا خالص نامی جن ہے۔ اب جب تمہاری بیوی کو دورے کی شکایت ہو، تو اس کے کان میں کہنا ”اے خالص! عبدالقادر، جو کہ بعد اود شرعیف میں مقیم ہیں۔ اُن کا فرمان ہے کہ سرکشی نہ کر۔ آج کے بعد اگر آئندہ آیا، تو ہلاک کر دیا جائے گا۔“ اس کے بعد وہ شخص اصفہان چلا گیا پھر دس برس بعد آیا، اور عرض کیا کہ آپ کے فرمان کے بعد بھی میری بیوی کو دورے کی شکایت نہیں ہوتی۔“ (دیجہ الاسرار ص ۷۲، قلائد الجواہر ص ۳۲، سفینۃ الاولیاء ص ۷۲، تحفہ قادریہ ص ۶۸)

یہ واقعہ بھی چار تذکرہ نگاروں نے بیان فرما کر اُس کے نہایت مقبرہ ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے موجود طبعی تحقیق تو یہ ہے کہ ایسے دورے شادی شدہ عورت کو نہیں پڑتے بلکہ جوان اور کنواری عورت کو پڑتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اصفہانی خود نامرد ہو، تاہم یہ مان لیتے ہیں کہ یہ واقعہ چار شہادتوں کی وجہ سے بالکل درست ہے۔ اب اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ جب جنوں کے دوسرے عامل عاجز نہ آجاتے، تو عبدالقادر جیلانی کے پاس آتے تھے، کیونکہ آپ سب سے اونچے درجہ کے جنات کے عامل تھے مزید تفصیل باب ہفتم، زیر عنوان ”اولیاء اللہ کا مقابلہ“ میں دیکھئے۔

WWW.DEENEKHALIS.COM

WWW.RAHEHAQ.COM

WWW.ESNIPS.COM/USER/TRUEMASLAK

یہ کتاب خرید کر اسلام کی سچی تعلیمات کے فروغ میں
مکتبہ السلام کا ساتھ دیجئے۔

صوفیاء کے مخصوص مسائل (۲)

۹ شیعیت سے لگاؤ

یہ تو شاید آپ کو معلوم ہو گا کہ ہمارے ہاں دینِ طریقت کے مروجہ چاروں سلسلے قادری، نقشبندی، چشتی، سہروردی۔ اور اسی طرح کئی غیر ملکی سلسلے بدوی، رفاعی اور یونسی وغیرہ بھی۔ اپنے شجرہ طریقت کو حضرت علی ؑ سے جا ملاتے ہیں اور بڑے خود انہیں علومِ باطنی کا علمبردار سمجھتے ہیں۔ عبداللہ بن سبا یہودی نے ظاہر اور باطن کا یہ گمراہ کن عقیدہ جس چابکدستی سے اسلام میں داخل کیا، وہ بھی ہم پہلے بیان کر آئے ہیں اور یہ بھی کہی عبدا اللہ بن سبا کے پیروکار شیعیانِ علی کے نام سے موسوم ہوئے اور انہی لوگوں نے حضرت علی ؑ میں حلول کا عقیدہ اپنایا۔ یہ باطنیت کے اثرات اور اسی وجہ سے دینِ طریقت میں حضرت علی ؑ کی فضیلت اور شیعیت سے لگاؤ کا عقیدہ آج تک پایا جاتا ہے اور اس کی وجہ وہ روایات ہیں جو مذکوروں اور محفوظات میں آج بھی پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے چند روایتوں کا ہم یہاں ذکر کریں گے:

۱۔ بارہ اماموں کا فیض

ضیاء اللہ قادری صاحب اپنی کتاب "سیرۂ غوث الثقلین" کے صفحہ ۱۰۹ اور صفحہ ۲۲۱ پر رقمطراز ہیں کہ:

"حضرت مجدد الف ثانی فرماتے ہیں کہ میں خیال کرتا ہوں کہ حضرت علی ؑ وصال سے قبل اس مقامِ ولایت کے لجاوادی تھے اور جس کسی کو اس طریقہ سے فیض پہنچتا تھا، ان کی سچی توسط اور توسل سے پہنچتا تھا۔ جب حضرت علی ؑ کا انتقال ہو گیا، تو یہ بلند درجہ کا منصب حضراتِ جنین ؑ کو بالترتیب حاصل ہوا۔ ان کے بعد بالترتیب بارہ اماموں کو پہنچتا رہا اور اس طرح ان بزرگوں کے وصال کے بعد جس کسی

لے فی الحقیقت ان سلسلوں کی تعداد سو سے متجاوز ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے "حارۃ المعارف" اسلام آباد زیر عنوان طریقت۔

کو فیض پہنچتا ہے۔ ان ہی کے توسل سے پہنچتا ہے اور بعد ازاں جتنے بھی اقطاب اور بجائے وقت ہوئے ہیں۔ ان کے مجاور وادی بھی وہی ہوئے ہیں، کیونکہ اطراف کو لا محالہ مرکز سے ملنا ہی پڑتا ہے۔ تاکہ ان کو نوبت سیدہ عبدالقادر جیلانی تک پہنچی اور یہ مرتبہ آپ کو مل گیا۔ بارہ اماموں اور حضرت شیخ کے درمیان کوئی شخص اس مرتبہ پر نہیں ہے۔ اب اس راستے سے فیوض و برکات جتنے اقطاب، بجائے اور ولیوں کو پہنچتی ہیں، ان کے ذریعے پہنچتی ہیں، کیونکہ فیض کا یہ مرکز ان کے بغیر کسی کو نہیں ملا۔ اسی جگہ غوث پاک نے فرمایا کہ :

اَفَلْتَ شَمْسُ الْأَوَّلِينَ وَ شَمْسُنَا اَبَدًا عَلٰی اَفْقِ الْعٰلٰی لَا تَغْرُبُ

یعنی پہلے ولیوں کے سورج ڈوب گئے اور ہمارا سورج ہمیشہ افق بلند پر رہے گا، جو کبھی نہ ڈوبے گا۔

(مکتوبات ج ۳، نمبر ۱۲۳)

محمد الف ثانی کے درج بالا اقتباس میں مندرجہ ذیل امور قابل غور ہیں :

۱۔ عبدالقادر جیلانی کا شجرہ طریقت اٹھویں امام علی موسیٰ (م ۲۰۳ھ) کے بعد معروف کرخ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ باقی چار اماموں کا کہیں ذکر نہیں۔ (حوالے کے لئے دیکھئے اسی کتاب سیرت غوث اشعلین کے صفحہ ۱۲۸، ۱۲۹ پر غوث پاک کا شجرہ طریقت و خلافت)

۲۔ خود محمد الف ثانی نقشبندی بھی ہیں اور ان کا شجرہ طریقت چھٹے امام جعفر صادق (م ۱۴۹ھ) سے بازید بسطامی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ باقی چھ اماموں کا ذکر نہیں ملتا تاہم آپ نے پورے بارہ اماموں کا ذکر کر کے شیعہ حضرات کے فرقہ اشاعہ عشریہ سے لگاؤ کا پورا ثبوت دیتا فرمایا ہے۔

۳۔ اگر مرکز فی الواقعہ یہ بارہ امام ہی ہیں تو طریقت کے سائے کے سائے سلسلے اس مرکز کو چھوڑ گئے ہیں اور حقیقی حضرات تو اپنا شجرہ طریقت حضرت علی (ؑ) سے ایک لخت حسن بصری (م ۱۱۰ھ) کی طرف موڑ لیتے ہیں۔ حالانکہ حضرت حسن بصری کی حضرت علی (ؑ) سے ملاقات کو بھی محدثین تسلیم نہیں کرتے۔

۴۔ اس دُنیا نے طریقت میں عبدالقادر جیلانی سے پہلے کے کئی حضرات کے سورج طریقت کے آسمان پر آج تک چمک رہے ہیں۔ مثلاً معروف کرخ، سری سقطی، جنید بغدادی، ابوبکر شبلی، منصور حلّاج، حسن بصری، ابراہیم ادھم، بازید بسطامی وغیرہ وغیرہ، کیا ان سب کے سورج ڈوب چکے ہیں؟

خواجہ فرید الدین گنج شکر دفعہ معراج پر دُشٹی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

۲۔ حضرت علی (ؑ) پہلے روش تھے

”پھر کچھ خرقة کا ذکر ہونے لگا۔ آپ (خواجہ فرید الدین گنج شکر) نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی شبِ معراج میں خرقة ملا تھا اور آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بلا کر فرمایا کہ میں نے اپنے پروردگار سے خرقة پایا ہے۔ مجھ کو حکم ہے کہ میں تم سے اسے کسی کو دوں۔ اب میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ جو شخص تم میں سے جواب با صواب دے گا۔ میں یہ خرقة اسے دوں گا۔ اول آپ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ: اے ابو بکر رضی اللہ عنہ یہ خرقة تجھ کو دوں، تو تو کیا کرے؟ کہا: یا رسول اللہ ﷺ! میں صدق اختیار کروں اور خدا کی بندگی کروں اور جو کچھ میرے پاس مال و منال ہو، وہ سب اللہ کی راہ میں دوں۔ پھر آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کہا، میں عدل کروں اور بندگانِ خدا کے ساتھ انصاف کروں اور مظلوموں کی داد دوں۔ پھر آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کہا، میں ایک دوسرے میں اتفاق کی کوشش کروں۔ پھر آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا۔ انہوں نے کہا، کہ میں پردہ پوشی کروں اور خدا کے بندوں کے عیب چھپاؤں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ”اے علی رضی اللہ عنہ! یہ خرقة میں نے تجھ کو دیا۔ مجھ کو حضرت رب العزت کا فرمان بھی یہی تھا کہ جو تیرے یاروں سے یہ جواب دے، اسی کو یہ خرقة دیجئے۔“

”یہ حکایت فرما کر شیخ الاسلام آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور ہائے ہائے کر کے رونے لگے اور بیہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے، تو یہ لفظ مبارک زبان پر لائے کہ ”معلوم شد درویشی پردہ پوشی است“ یعنی یہ بات معلوم ہوئی کہ درویشی کے معنی یہی ہیں کہ بندگانِ خدا کی پردہ پوشی کرے۔“ (راحة القلوب، ملفوظات خواجہ فرید الدین گنج شکر، مرتبہ خواجہ نظام الدین اولیاء مترجم غلام احمد بریلوی، مطبع مجتبیٰ دہلی، ۱۹۱۶ء، ص ۱۳۸)

اس حکایت سے مندرجہ ذیل باتیں مستفاد ہوتی ہیں۔

۱۔ معراجِ مبیا مشہور واقعہ تقریباً سب محدثین نے ذکر کیا، لیکن اس عظیم الشان خرقة کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ یہ شاید اہل باطن پر ہی القا ہوا ہو۔

۲۔ اس امت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سب سے پہلے درویش، پردہ پوش اور خرقة پوش تھے۔

۳۔ یہ کہ صدق اور صدقہ، عدل و انصاف اور اصلاح بین المسلمین یہ سب اعمال پردہ پوشی کے مقابلہ میں بیچ ہیں۔ پختہ نین غفراء کے جواب کا خرقة سے کچھ تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ حضرت علی شاید لوگوں کے عیوب پر یہ خرقة ڈال کر پردہ پوشی فرما لیتے ہوں۔

۳۔ جُمَہِ نبویؐ کی تاریخ

ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ عبدالعزیز قادری مصنف سرچشمہ حیات کے بیان کے مطابق (بحوالہ حقیقت نگار صابری)

حضرت اکرم ﷺ نے پانچ سال قبل از ہجرت پندرہ ممالک کا باطنی انتظام حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا تھا اور ارشد اولیٰ صاحب مصنف الاولیں کے بیان کے مطابق حضرت اکرم ﷺ نے بوقتِ حلت اپنا جُمَہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالہ کر کے فرمایا: کہ وہ اسے خواجہ اویس قرنی کو پہنچائیں اور ان سے اُمت کی بخشش کے لئے دُعا کرائیں۔ چنانچہ ان دونوں صحابہ کرام نے بڑی جستجو کے بعد دس سال بعد آخرِ عمر اویس کو آخر تلاش کر ہی لیا اور جُمَہ مبارک ہدیہ کیا اور اُمت کی بخشش کے لئے درخواست کی۔ پھر یہی جُمَہ مبارک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس واپس آ گیا۔ یہ کیسے واپس آیا؟ یہ ہمیں معلوم نہیں۔ ہمیں تو یہی معلوم ہے کہ جب فرات میں طغیانی آئی تھی اور کوفہ لے لوگوں نے آپ سے اس بات کی شکایت کی تھی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہی جُمَہ بہن کر دیا۔ فرات کے کنارے پہنچ دو رکعت نماز ادا فرمائی تھی (غزنیۃ الاصفیاء ص ۶۱) پھر جُتے ہوئے یہی جُمَہ قلعہ لاہور پہنچ گیا تھا چنانچہ آج کل اسی مقام پر ہے۔ (صدقۃ الاولیاء ص ۲۴۶)

۴۔ ماتم اور تعزیر داری کی اہمیت

خواجہ فرید الدین سے متعلق دوسرا واقعہ بھی درِ نبوی کا ایک تاریخی واقعہ ہے جو ماتم اور تعزیر پر روشنی ڈالتا

ہے۔ پھر آپ (خواجہ فرید الدین گنج شکر) نے اس موقع پر فرمایا کہ ایک دفعہ رسول خدا ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یزید پلید کو کندھے پر بٹھائے ہوئے لے جاتے تھے۔ رسول خدا ﷺ نے تبسم کیا اور فرمایا: سبحان اللہ! دوزخی ہشتی کے کندھے پر سوار ہوئے جارہے۔ جب یہ کلمہ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سنا، تو حال پوچھا کہ یا رسول اللہ! یہ تو معاویہ کا لڑکا ہے۔ دوزخی کہاں سے ہے؟ کہا اے علی رضی اللہ عنہ! یہ یزید وہ بد نصیب لڑکا ہے۔ جو میکہ حسن و حسین رضی اللہ عنہما اور میری ساری آل کو شہید کرے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور تلوار نیام سے نکال لی کہ میں اسے مارے ڈالتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: اے علی رضی اللہ عنہ! ایسا نہ کہ خدا کا حکم ایسا ہی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ رونے لگے اور کہنے لگے کہ یا رسول اللہ! اس وقت آپ سر پر ہوں گے؟ فرمایا: نہیں! کہا یاروں میں سے کوئی ہوگا؟ کہا نہیں! کہا کیا میں ہوں گا؟ کہا نہیں! کہا، فاطمہ ہوں گی؟ کہا وہ بھی نہیں۔ کہا یا رسول اللہ ﷺ! میرے بچوں کی کون ماتم داری کرے گا؟ میری امت

”پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ ﷺ دونوں گریہ کرنے لگے اور دونوں شاہزادوں سے بخلگیر ہوئے اور نعرہ مارا کہ میں نہیں جانتا کہ اس دشت (کربلا) میں تمہارا کیا حال ہوگا۔“

اس کے بعد شیخ الاسلام زبان مبارک سے فرمانے لگے کہ جس روز امیر المؤمنین حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے شہادت پائی اس رات ایک بزرگ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خواب میں دیکھا کہ آپ کل انبیاء کی بیویوں کو ساتھ لائی ہیں۔ دامن کرم مبارک سے بندھا ہوا ہے۔ دشت کربلا میں جہانکے امیر المؤمنین حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہادت پا دیں گے، جھاڑو دے رہی ہیں اور اپنی آستین مبارک سے صاف کرتی جاتی ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ: ”لے خاتون قیامت اور لے بنتِ شیعہ روزِ محشر! یہ کیا مقام ہے جسے آپ اپنی آستین سے صاف کر رہی ہیں؟“ فرمایا: ”یہ وہ مقام ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ میرا بیٹا یہاں سر دے گا اور شہادت پائے گا۔“

”اس کے بعد اسی موقع پر آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبریل علیہ السلام سے یہ حکایت پوچھی کہ جب ان میں سے کوئی بھی نہ ہوگا، تو کون ان کی تعزیت کرے گا؟ کہا یا رسول اللہ ﷺ! آپ کی امت آپ کے فرزندوں کی تعزیت کرے گی اور ایسی ماتم داری کرے گی کہ اس کی صفت بیان نہیں ہو سکتی۔“ (در احاطۃ القلوب، ص ۲۰۶، ۲۰۷، ملفوظات عجاہ فرید الدین گنج شکر، مرتبہ خواجہ نظام الدین اولیاء، ترجمہ غلام احمد بریاء، مطبوعہ مجتہباتی دہلی ۱۹۱۲ء)

اس بیان سے مندرجہ ذیل باتیں مستفاد ہوتی ہیں :

۱۔ مندرجہ بالا بیان شیخ الاسلام کی تاریخ و جغرافیہ دانی کا ایسا نادر شاہکار ہے کہ خواہ مخواہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ مثلاً :

۱۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، یزید کو کندھے پر اٹھائے حضور اکرم ﷺ کے سامنے بکھلے حالانکہ یزید تو اس وقت پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔ وہ حضور اکرم ﷺ کے وصال کے پندرہ سال بعد ۲۶ھ میں خلافت عثمان کے دور میں پیدا ہوئے تھے، تو پھر ہشتی کے کندھے پر دوڑی کا کیا سوال؟

ب۔ حضور اکرم ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں شہزادوں سے بغل گیر ہوئے اور فرمایا میں نہیں جانتا دشت میں تمہارا کیا حال ہوگا۔“ حالانکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ واقعہ کربلا ۱۰ھ سے گیارہ

سال پہلے ۲۰ صفر ۵۰ کو وفات پا چکے تھے۔

ج۔ جب آپ کی ساری آل کو یزید نے دشتِ کربلا میں شہید کر دیا تھا، تو یہ اتنے کثیر تعداد میں سر جید کہاں سے تشریف لائے۔

د۔ دشتِ کربلا تو ریت کا میدان تھا، وہاں حضرت فاطمہ ؑ نے کیا جھاڑو دے کر ریت کے تودے ہٹائے تھے۔

ر۔ امیر المؤمنین کوئی اعزازی لقب نہیں، حضرت حسین ؑ امیر المؤمنین کیسے ہو گئے جبکہ ان کی خلافت ایک لمحہ کے لئے بھی منعقد نہیں ہوئی۔

۲۔ اسی طرح یہ بیان شیعہ نوازی کا بھی شاہکار ہے۔ یزیدؓ کو دوزخی قرار دینا۔ وقوعہ شہادت سے پہلے ہی حضور اکرم ﷺ اور حضرت علی ؑ کا گریہ و داری کرنا۔ پھر زبانِ نبوت سے امت کی طرف سے تعزیر اور ماتم داری کا اعلان۔ پھر حضرت جبرئیل ؑ کے ذریعے خود خدا کا اعلان کر یہ تم داری صرف جائز ہی نہیں، بلکہ ایک اچھی صفت ہے۔ یہ سب باتیں شیعیت کی پوری پوری تائید کر رہی ہیں۔

مفتی غلام سرور صاحب لاہوری، مصنف خزینۃ الاصفیاء، اس کتاب کے صفحہ ۵۸ پر رقمطراز ہیں کہ :

۵۔ جنوں کا ماتم

”جب حضرت عثمان ؓ کو شہید کیا گیا، تو جنات نے تین دن تک مسجدِ نبوی ﷺ کی چھت پر ماتم کیا اور آپ کے مرثیہ میں آیات پڑھتے رہے۔ حضرت عثمان ؓ کی شہادت کے بعد آپ کو تین روز تک دفن نہ کیا گیا۔ ناگاہ ہاتف نے آواز دی : اِدْفَنُوْهُ وَلَا اَصْلُوْهُ فَاِنْ اَللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ قَدْ صَلَتْ اَللّٰهُ عَلَیْہِ“ یعنی انہیں دفنایا جائے اور نماز جنازہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس محبوب کا جنازہ ادا کر دیا ہے۔“ (خزینۃ الاصفیاء، ص ۵۸)

اب دیکھئے کہ :

۱۔ جنات کے کرنے کا کام تو یہ تھا، کہ ان غنڈوں کا جنہوں نے حضرت عثمان ؓ کو شہید کیا تھا۔ گلا گھونٹ دیتے یا کم از کم شہید کمرنے کے بعد ہی ان کی خبر لیتے، لیکن انہوں نے بھی کیا کم ہمتی دکھائی کہ بس ماتم پر ہی مطمئن ہو گئے اور یہ بدرسم امتِ محمدیہ میں چھوڑ دی۔ جس کو عملاً شیعہ حضرات نے اور عقیدہ تا صوفیاء نے تسلیم کر لیا۔

۲۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دفن کا انحصار ہاتھ کی ندا پر تھا۔ اگر یہ ندا دو دن پہلے آجاتی تو آپ دو دن پہلے دفن ہو جاتے اور غنیمت سمجھتے کہ تین دن بعد یہ ہاتھ کی ندا آگئی۔ اگر ایک ماہ بعد ندا آتی، تو میت کا جو حال ہوتا وہ معلوم ہے۔ لہذا ہمیں اس ہاتھ کی آواز کا مشکور ہونا چاہیے۔

۳۔ معلوم ہوتا ہے کہ کرامت نگار تاریخ کے پیش نظر سے بالکل بیگانہ ہو کر ہر طرح کے واقعہ کو رجال الغیب، ندائے غیبی کے ذریعے اپنے مخصوص رنگ میں رنگ دینے کے عادی ہوتے ہیں۔ یہی عربی زبان کی فصاحت تو وہ بھی قابلِ داد ہے۔

۶۔ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما اور حوض کوثر

”مولانا جامی (م ۸۹۸ھ) اپنی کتاب شواہد النبوت میں فرماتے ہیں:

”ایک نیک آدمی نے خواب میں دیکھا کہ قیامت برپا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حوض کوثر کے پاس کھڑے ہیں اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہما دایں بائیں کھڑے مخلوقِ خدا کو پانی پلا رہے ہیں۔ میں نے بھی پانی کی درخواست کی، تو فرمایا: ”حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر پانی نہیں مل سکتا۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو آپ نے فرمایا: ”تمہیں پانی نہیں مل سکتا، کیونکہ تمہارے ہمسایہ میں ایک شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہتا ہے اور تم منع نہیں کرتے۔“ میں نے عرض کی کہ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں منع کروں، تو مجھے قتل نہ کر دے۔“ آپ نے مجھے ایک تیز چھری دی کہ اس سے دشمنِ علیؑ کا کام تمام کر دو۔“ میں نے چھری لی اور اگر اس دشمنِ مولا علیؑ کو قتل کر کے آپ کو جا کر اطلاع دی، تو آپ نے حضرات حسنین رضی اللہ عنہما سے فرمایا: ”اسے آب کوثر دے دو اس نے حقِ محبتِ علیؑ ادا کر دیا ہے۔“ میں نے یہ سنا کہ وہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے میری آنکھ کھل گئی۔ صبح ہوئی، تو باہر شوہر پاتا تھا کہ فلاں شخص کو کسی نے بستر میں ہی قتل کر دیا ہے۔ صبح پولیس آئی اور بے گناہ ہمسایوں کو گرفتار کر لیا۔ میں نے کہا: ”سبحان اللہ! کیا خواب ہے۔ بے گناہ ہمسائے گرفتارِ مصیبت ہو گئے۔ انہیں بے گناہ قید و بند میں رکھنا دین کے خلاف ہے۔ میں نے قاضی شہر کے پاس جا کر اپنے قتل کا اعتراف کر لیا اور رات کا واقعہ سنا کر کہا کہ یہ لوگ بے قصوب ہیں، انہیں رہا کر دیا جائے۔“ اس نے کہا: ”تم بھی اس مقدمہ میں بے گناہ ہو، مقتول اپنی سزا کو پہنچ گیا ہے۔“ (غرینۃ الاسنیۃ، ص ۶۷)

مولانا جلال الرحمن جامی صاحب کی شواہدِ النبوت کی یہ روایت کئی لحاظ سے محلِ نظر ہے۔ مثلاً:

حوض کوثر سے پانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود پلائیں گے۔ اس میں حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کا کوئی واسطہ نہیں۔

۲۔ خود آپ کو غیب کا حال معلوم نہ ہوگا۔ حوض کوثر کی طرف آنے والے بعض مسلمانوں کو فرشتے دھکیل رہے ہوں گے۔ آپ ﷺ فرشتوں سے اس کی وجہ پوچھیں گے، تو فرشتے کہیں گے کہ ”آپ کو خبر نہیں کہ آپ ﷺ کے بعد ان لوگوں نے کیا بدعات جاری کیں۔“ دسملہ تو آپ کو یہ کیسے معلوم ہوگا کہ فلاں شخص دشمن علی ہے۔ اور یہ پانی کا سا تل اپنے اس دشمن علی ہمسایہ کو برا بھلا سمجھنے سے منع نہیں کرتا۔“

۳۔ خواب حضو اکرم ﷺ کو بھی آیا تھا کہ وہ اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم سمیت عمرہ کر رہے ہیں، لیکن یہ خواب کا عمرہ دو سال بعد واقعاتی دنیا میں وقوع پذیر ہوا، تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ”اللہ تبارک نے اپنے رسول کے خواب کو سچ کر دکھایا۔“ لیکن اس ”نیک شخص“ کا خواب اُسی وقت اس واقعاتی دنیا میں اس کے جاگنے سے پہلے رونما ہو گیا۔ شاید شخص رسول اکرم ﷺ سے بھی زیادہ پہنچا ہوا ہو۔

۴۔ پولیس بھی محبت بدھو قسم کی تھی۔ دشمن علی کے قتل کا شبہ تو کسی محب علی نیک آدمی پر ہی ہو سکتا تھا اس نے دو سکر ہمایوں کو خواہ مخواہ قید و بند میں ڈال دیا۔ البتہ اس لحاظ سے باشعور بھی تھی کہ اس خواب کے حوادث کو عدالت کی بنیاد قرار نہ دے کر اس ”نیک شخص“ کو بھی چھوڑ دیا۔

۵۔ یہ سارا قصہ آپ کوثر کے پیالہ پینے کے گرد گھومتا ہے اور یہی بات اس ”نیک آدمی“ کو یاد نہ رہی کہ پیالہ پیایا محروم ہی رہا، پھر اس قصہ کا فائدہ ہی کیا تھا؟ بہر حال ہم جامی صاحب کی داد دیتے بغیر نہیں رہ سکتے جنہوں نے حب علی ﷺ کی تائید کے سلسلے میں ایسا جواب افانہ تراشا ہے۔

”حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ام المؤمنین
بیان فرماتی ہیں کہ ایک اہل آپ

۷ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور خون کر بلا

کافی دیر سے گھر آئے۔ پریشان حال، غبار آلود اور تنکے تنکے دکھائی دیتے تھے اور ہاتھ میں کوئی چیز تھی۔ میں نے پوچھا: ”یا رسول اللہ! یہ کیا ہے؟ اور آپ اس حال میں کیوں ہیں؟“ فرمایا: ”آج مجھے کر بلا لے جایا گیا جو حضرت جین رضی اللہ عنہ کا قتل ہو گا۔ مجھے اپنی اولاد کے دوسرے افراد بھی دکھائے گئے جو ابھی پیدا بھی نہ ہوئے تھے، میں اس زمین پر پڑا ہوا خون اکٹھا کر کے لے آیا ہوں۔ آپ ﷺ نے ہاتھ مکھول کر مجھے فرمایا: ”اس سُرخ نمٹی کو اپنے پاس محفوظ کر لو۔“ میں نے یہ سُرخ مٹی ایک شیشی میں ڈال کر

منہ کو خوب بند کر دیا۔ جب حضرت حسین ؑ سفر عراق کروانہ ہوئے، میں ہر روز اس شیشی کو دیکھا کرتی اور رویا کرتی۔ محرم کی دسویں تاریخ، شام کو میں نے دیکھا کہ وہ مٹی خون بن گئی ہے، مجھے معلوم ہو گیا کہ آج حضرت حسین ؑ شہید کر دیئے گئے ہیں۔“ (غزینۃ الاصفیاء، ص ۴۲)۔

یہ ”حدیث“ چونکہ بلا حوالہ اور بے سند ہے، لہذا موضوع اور مردود ہے۔ پھر کئی لحاظ سے محل نظر بھی ہے۔ مثلاً یہ کہ آپ ؑ کو یہ میدان کافی رات گئے کیوں دکھایا گیا؟ ہم اس بات کے قائل نہیں کہ آپ اس طرح کے نور تھے کہ آپ کے جسم سے روشنی پھوٹی تھی۔ بلکہ ہم اس بات کے قائل ہیں کہ رات کو آپ کے ہاں بھی چراغ جلتا اور بجھتا تھا۔ جیسا کہ بخاری میں حضرت عائشہ ؓ کی روایت سے ثابت ہے۔ پھر آپ کو اشخاص بھی ایسے دکھائے گئے، جو ابھی پیدا بھی نہ ہوئے تھے اور آپ انہیں جانتے بھی نہ تھے۔ اس رات کے اندھیرے میں آپ نے انہیں کیا دیکھا ہوگا؟

پھر آپ نے کربلا کے میدان سے اکٹھا تو خون کیا تھا، مگر گھر آنے تک وہ سُرخ مٹی میں تبدیل ہو گیا۔ یہ تبدیلی اس لئے کی گئی کہ اگر کرامت تراش اس خون کو پہلے سُرخ مٹی نہ بناتے، تو اگلی کرامت کی بنیاد نہیں بن سکتی تھی۔

”حضرت امام حسین ؑ کی شہادت کے بعد محمد بن

۸۔ حضرت زین العابدین کو امامت کیسے ملی؟

حنفیہ (جو حضرت علی ؑ کی بیوی حنفیہ کے بطن سے تھے) اور زین العابدین (ابن حسین ؑ) میں امامت کے متعلق جھگڑا ہوا۔ محمد بن حنفیہ کہتے تھے، میں بڑا ہوں، لہذا امامت میرا حق ہے اور زین العابدین کہتے تھے کہ میں اہل بیت سے ہوں، لہذا امامت میرا حق ہے۔ آخر زین العابدین نے کہا کہ چلو حجرِ اسود سے فیصلہ کر دیتے ہیں۔ دونوں حجرِ اسود کے سامنے پیش ہوئے۔ پہلے محمد بن حنفیہ نے اپنا دعویٰ پیش کیا، لیکن حجرِ اسود خاموش رہا۔ پھر جب زین العابدین نے دعویٰ پیش کیا، تو حجرِ اسود زور بولا، یوں معلوم ہوتا تھا کہ اپنی جگہ سے نکل آئے گا۔ پھر فصیح زبان میں کہا: ”اللہ تعالیٰ نے امامت اور ولایت باطنی کا حق تو زین العابدین کو دیا ہے دوسرا کوئی بھی اس کا شریک نہیں ہو سکتا۔“ یہ فیصلہ سنتے ہی محمد بن حنفیہ اپنے حق سے دستبردار ہو گئے۔

(غزینۃ الاصفیاء، ص ۴۹)

حجرِ اسود کو حضرت عمر ؓ نے مخاطب کر کے کہا تھا کہ میں خوب جانتا ہوں کہ تو بے جان پتھر ہے جو کہ کسی کو چومنا نہ سکتا

ہے نہ بگاڑ سکتا ہے۔ اگر رسول اللہ ﷺ نے نہیں نہ چڑھا ہوتا، تو میں بھی نہ چومتا۔“ اس وقت حجر اسود کچھ نہ بولا۔ لیکن حکم بن کر بلند آواز سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پوتے کو ہی اہل بیت اور امامت کا مستحق قرار دے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے کو امامت اور ولایت باطنی سے محروم کر دیا اور اس طرح اہل بیت کی طرف قاری کا ثبوت مکیان

۹۔ اشرف علی تھانوی کی پیدائش

اشرف علی صاحب تھانوی اپنی پیدائش کا واقعہ بیان فرما رہے ہیں:

”میں ایک مجذوب کی دُعا سے پیدا ہوا ہوں، جن کا نام غلام مرتضیٰ ہے۔ ان سے کہا گیا تھا کہ اس لڑکی، یعنی میری والدہ کی اولاد زندہ نہیں رہتی، تو فرمایا کہ ”عمر اور علی کی کھینچا تانی میں ٹوٹ جاتی ہے۔ اب جو اولاد ہو علی کے سپرد کر دینا۔“ اس درمیان کو کوئی نہیں سمجھا۔ میری والدہ، جن کی نسبت سنا ہے کہ صاحبِ فوق تھیں، سمجھ گئی اور کہنے لگیں کہ باپ فاروقی ہیں اور ماں علوی اور نام بچوں کے والد کے نام پر رکھے جاتے ہیں۔ اب جو اولاد ہو ماں کے خاندان کے نام پر رکھو۔ یعنی اس میں لفظ علی ہو، وہ مجذوب خوش ہوئے اور فرمایا: ”یہ لڑکی بڑی ذہین ہے، یہی مطلب ہے۔“ نانی صاحبہ نے عرض کیا پھر آپ ہی نام رکھ دیجئے۔“ فرمایا: ”دو لڑکے ہوں گے، ایک کا نام اشرف علی خان رکھنا اور ایک کا نام اکبر علی خان۔“ عرض کیا گیا کہ کیا پٹھان ہیں؟ فرمایا ”ہاں ہاں! ایک کا اشرف علی اور ایک کا اکبر علی رکھنا۔ ایک ہمارا ہوگا، وہ حافظ اور مولوی ہوگا اور ایک دنیا دار ہوگا۔ پھر ہم دونوں بھائی پیدا ہوئے۔“ (رافضاتِ یوسیف، ص ۲۰۱، ج ۵، بحوالہ سیرت غوث الثقلین، ص ۲۰۰)

اس اقتباس سے درج ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:

- ۱۔ مولانا اشرف تھانوی کی والدہ اور نانی دونوں کو اندر پر توکل نہ تھا اور آج کل کی کمزور عقیدہ والی عورتوں کی طرح ہی تھیں، جو اولاد کے حصول یا زندگی کے لئے بیرونِ فقیروں کی طرف رجوع فرماتی ہیں۔
- ۲۔ مجذوب غلام مرتضیٰ صاحب اسرار و رموز میں بات کیا کرتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے طرفدار تھے۔
- ۳۔ ان مجذوب صاحب کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کھینچا تانی کا تو علم ہو گیا، لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ خاندان پٹھان نہیں، چنانچہ بعد میں ناموں کی تصحیح بھی فرمائی۔

اب حضرت علی
اور اہل بیت سے متعلق

تصوف پر باطنیت کی چھاپ اور موضوعات

ایک حدیث بھی سن لیجئے، جو صوفیاء اور شیعوں میں یکساں مقبول ہے :

مَثَلُ أَهْلِ بَيْتِي كَسَفِينَةِ نُوحٍ میرے اہل بیت کی مثال حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی
مَنْ رَكِبَهَا نَجَّى وَمَنْ خَلَّفَ کی طرح ہے، جو اس میں سوار ہوا نجات پا گیا۔ اور جو
پیچھے رہ گیا، غرق ہوا اور گر گیا۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اپنی کتاب "اسلامی تصوف" میں بدلائل یہ بات ثابت کی ہے کہ موجودہ تصوف باطنیت یعنی عبد اللہ بن سبا یہودی کی تحریک سے سخت متاثر ہے۔ انہوں نے اس بات پر خاصا زور دیا ہے کہ بے شمار وضعی احادیث شیعوں اور باطنیوں نے وضع کیں، جن کو صوفیاء نے قبول کر لیا ہے۔ علاوہ ازیں بہت سے الحاقی مضامین بھی اہل تصوف کی تصنیفات میں شامل کر دیئے ہیں۔ وہ اس کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں کہ : "آخر میں تلاعلی قاری کی مشہور کتاب موضوعات سے چند اقتباسات درج کر کے اس موضوع کو ختم کرتا ہوں۔"

۱۔ سیرۃ النبی ﷺ کا اولین مصنف ابن اسحاق چونکہ شیعہ تھا اس لئے اس نے اکثر ایسی باتیں بھی درج کر دی ہیں جن سے اس کے مذہب کی تائید ہو۔ مثلاً اخیر کے دروازہ اکھیرٹے کی روایت۔
۲۔ كُنْتُ كَنُزًا مَحْفِيًّا حدیث نہیں۔ اکثر صوفیاء اسے حدیث سمجھتے ہیں۔
۳۔ تاریخوں میں غلیفہ منتخب ہو جانے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلیفہ زدے سکنے کی روایت بھی غلط ہے۔

۴۔ آئمہ حدیث کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حسن بصری دم۔ ۱۱۰ھ کی ملاقات اور تحصیل علم ثابت نہیں۔

۵۔ خرقة والی حدیث (جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے) غلط ہے اور معاندین صحابہ کی وضع کردہ ہے۔

۶۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نماز عصر قضا ہونے پر حضرت رسول اللہ ﷺ کے سورج کو واپس ہونے کی روایت بھی غلط ہے۔

۷۔ حجة الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کا مجمع عام میں فرمانا کہ "حضرت علی رضی اللہ عنہ میرا وصی ہے۔ قطعاً بے بنیاد اور غلط ہے۔

۸۔ یہ روایت کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ: "حضرت علی رضی اللہ عنہ

کے خلاف خروج مت کرنا۔“ بے بنیاد ہے۔

۹۔ پھر آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا خروج کریں، تو تم نرمی کا برتاؤ کرنا۔“ سرسبز کذب اور افتراء ہے۔

۱۰۔ یہ روایت کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کچھ باطنی اسرار و علوم سکھائے تھے، جو دوسرے صحابہ کو نہیں سکھائے۔ قطعاً غلط ہے۔

طاعلی قاری کے اس قول پر کہ ”روافض نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل میں ۳ لاکھ روایات وضع کی تھیں۔“ اس اقتباس کو ختم کرتا ہوں۔ ”اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش، یوسٹ سلیم چشتی، ص ۱۰۸“ یہی سلیم چشتی آگے چل کر ایک شیعہ مصنف پر دینر سید حسین نصر کی ایک انگریزی کتاب ”اسلام کے مطامع نظر اور حقائق“ سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں، مثلاً:

۱۔ منگولوں کے حملے کے دور میں ایران میں تصوف اور اسماعیلیت میں اتحاد کی ایک مستقل صورت پیدا ہو گئی تھی، جس کا تحقیقی مطالعہ ابھی تک نہیں کیا گیا۔ (ص ۱۴۰)

۲۔ اثنا عشری شیعیت میں مذہب کے ظاہری اور باطنی پیلوؤں کو بالخصوص اہمیت دی گئی ہے اور اس اعتبار سے وہ تصوف کی منو ہے۔ (ص ۱۶۰)

۳۔ تصوف اور شیعہ دونوں کی تعلیم یہ ہے کہ ”نور محمدی“ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر ہر نبی کی ذات میں موجود رہا ہے۔ (ص ۱۶۰) (بحوالہ اسلامی تصوف، ایضاً، ص ۱۱۲)

ان اقتباسات سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کا موجودہ تصوف باطنیت اور شیعیت کے زیر اثر پرورش پاتا رہا ہے۔ اور ہمارے بڑے بڑے بزرگ بھی تحقیق و تعصب کے بجائے محض اکابر کی پیروی کرتے چلے آتے ہیں۔

۱۰۔ آخرتہ کی فضیلت

حقیقہ، گدہ ری یا مرقع ہمارے صوفیاء کے خاص شعار میں سے ایک ہے اور جو چیز صوفیاء سے تعلق

لے صوفیاء میں رائج شدہ موضوع احادیث اور موضوع واقعات کی مزید تفصیل آگے باب نہم میں آئے گی۔

لے ان لوگوں کا آخرتہ اون کا کوئی ٹوٹا سا چادر نما کپڑا ہے۔ کسی تو اس کی بہت ضرورت ہے کی باقی ہے۔ یہ ٹیک ہے کہ آپ

رکھتی ہو، وہ بہر حال افضل ہی ہونی چاہئے۔ پھر کسی کامل پیر کا کسی کو اپنا خلیفہ بناتے وقت بھی اسے خرقہ عطا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اب اس خرقہ کی فضیلت کا مقام یہ ہے کہ بابا فرید الدین گنج شکر کے کشف کے مطابق شب معراج میں اللہ تعالیٰ نے خود حضور اکرم ﷺ کو عطا فرمائی تھی۔ یہ خرقہ آپ نے بھی کسی جانشین کو دینا ہی تھا۔ کیونکہ اللہ کا حکم تھا، تو تمام کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کا استئمان لینے کے بعد بالآخر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر نظر انتخاب پڑی کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ میں یہ خرقہ لے کر لوگوں کی پردہ پوشی کروں گا۔ اور خدا کا حکم بھی یہی تھا کہ جو اس طرح کا جواب دے خرقہ اُسے ہی دیا جائے۔ چنانچہ تاریخ اسلام میں سب سے پہلا خرقہ ہی تھا، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلا واسطہ کی تفصیلی روایت کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور شیعیت سے لگاؤ کا عنوان دیکھ لیجئے) اب خرقہ کے دیگر فضائل و برکات بھی ملاحظہ ہوں۔

شیر خرقہ کا اثر

حضرت ابراہیم بن داؤد رضی اللہ عنہ کے تذکرہ نگار فرماتے ہیں :

”نقل ہے کہ ایک درویش نے آپ کے پیر بن کا ایک ٹکڑا

اپنی گڈری میں سیاہوا تھا، وہ جنگل میں جا رہا تھا کہ ایک شیر اس پر حملہ آور ہوا۔ جب اس کی نظر گڈری پر پڑی تو پلٹ گیا۔ درویش نے سمجھ لیا کہ یہ آپ کے پیر بن کے ٹکڑے کی حرمت تھی، جو شیر نے جان چھوڑ دی اور چلا گیا“

(مقربان حق، ص ۱۹۱)

سلطان محمود غزنوی کی فتح سومنات کا سبب

”نقل ہے کہ جب

سلطان محمود نے سومنات پر

حملہ کیا، تو چاروں طرف کے ہندو راجے مہاراجے بھاری فوجیں لے کر جمع ہو گئے۔ گھمان کارن پڑا۔ کفار کا لشکر بے شمار تھا اور کسی طرح مغلوب نہ ہوتا تھا۔ اس عالم میں محمود گھوٹے سے اُترا اور وہ پیر بن، جو حضرت ابوالحسن خرقانی رضی اللہ عنہ سے تبرکاً ساتھ لایا تھا آگے رکھا اور سجدہ ہو کر یہ دعا کی : ”الہی ! ہم ناتواں ہیں۔ اس خرقہ درویش کے صدقہ میں فتح دے“ دعا مستجاب ہوئی۔ کفار کا لشکر بھاگ نکلا اور محسوس فوجیاب ہوا۔ انس نے رات کو خواب میں حضرت ابوالحسن کو دیکھا، جو فرما رہے تھے : ”محمود ! اتنے ذرا سے کام کے لئے بارہ گاہ الہی

مواظف رہنا پسند فرماتے تھے مگر آپ رضی اللہ عنہم کوئی کاموا کپڑا پہنتے تھے نہ کہ اون کا۔ اور کبھی یہ لوگ اس خرقہ کی فضیلت کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ

اے حضرت عیسیٰ رضی اللہ عنہم پہنتے تھے اور کبھی اس کی نسبت حضرت موسیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف لٹائی جاتی ہے۔

حاشیہ صفحہ ۲۵۴

لے مرثیہ کامل یا صائق الاخبار کے مصنف صادق فرغانی محمود غزنوی کی اس فتح کے سبب شیخ لقمان غریبی کی ایک اور ہی کرامت قرار دیتی ہے، صفحہ ۲۵۴

میں میرا پرہیز پیش کر دیا۔ اے نادان اگر تو یہ کہتا کہ الہی ! اس خرقہ کی برکت سے یہ سب کافر مسلمان کر دے۔
تو اللہ تعالیٰ انہیں دین سے تیسرے بھائی بنا دیتا۔“ (مقربان حق، ص ۱۳۷)

اس واقعہ سے صرف خرقہ کی برکت و فضیلت ہی ثابت نہیں ہوتی اور بھی کئی باتیں مستنبط ہوتی ہیں، مثلاً:
۱۔ پیر بن تو رسول اکرم ﷺ کا بھی تھا، لیکن انہیں خود یا خلفائے راشدین کو کفار پر فتح حاصل کرنے کے لئے یہ نسخہ ہاتھ نہ آیا۔

۲۔ جہاد بالسیف یا اعلانے کلمۃ الحق بس ذرا سی بات ہوتی ہے۔ رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس ذرا سی بات کے لئے اتنے عزوات کئے۔ وہ بھی بس خرقہ اور دُعا سے ہی کام چلا لیتے، تو حکیم چھا ہوتا۔

اب دیکھئے اسی خرقہ کے متعلق بائزید بسطامی کیا کہہ رہے ہیں:
”نقل ہے کہ ایک شخص نے آپؑ عرض کیا: ”مجھے برکت کے لئے پوستین کا ٹھوٹا یا ٹھوٹا اعانت فرمائیے۔“
نہیے فرمایا: ”بھئی! پوستین کا ٹھوٹا کیا ہے اگر بائزید کی کھال بھی پاس رکھتے گا، تو کچھ نفع نہ ہوگا، جب تک بائزید جیسے کام نہیں کرے گا۔“ (مقربان حق، ص ۱۱۷)

۱۱- اولیاء اللہ کے جو قوموں کے کرشمے

یہ مشہور واقعہ تو آپؐ نے سنا ہی ہوگا کہ معین الدین چشتی (م ۶۳۱ھ) ہندوستان میں اسلام پھیلانے کے لئے اجمیر تشریف لائے، تو آپؐ کا ایک ہندو جوگی سے مقابلہ ہوا۔ ہندو جوگی نے یہ کرشمہ دکھایا کہ اس نے پنا جوٹا اوپر بھینکا۔ پھر وہ جوتا ہوا میں اڑنا ہوا اوپر چلا گیا۔ لوگ حیران و ششدر رہ گئے۔ پھر ہمارے دلی کی باری آئی تو آپؐ نے بھی اپنا جوتا ہوا میں بھینکا، جو اس جوگی کے جوتے کو ماتے ماتے نیچے اتار لایا۔ حاضرین نے جب یہ دیکھا، تو سمجھ گئے کہ اسلام ہی سچا مذہب ہے، چنانچہ وہ جوگی، اس کے چیلے آپؐ کے مرید ہو گئے اور حاضرین

بقبہ صفحہ گذشتہ
دے رہے ہیں۔ (صفحہ ۶۰) پر لکھتے ہیں: ”مگر قلعہ کے فتح ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اتنے میں آسمان سے ایک پتھر دیوار پر گرا۔ دیوار ٹوٹ گئی۔ مسلمان اندر گس گئے اور قلعہ فتح ہو گیا۔ وہ پتھر سلطان عمر کے پاس لایا گیا۔ اس پر یہ الفاظ لکھے تھے: صاحبہ

میں سے اکثر اسلام لے آئے۔

اس قصہ کا حوالہ مختصر نہیں اور میں دو وجوہ کی بنا پر اس کے خوالہ کی تلاش کی ضرورت بھی نہیں سمجھتا۔ ایک تو ایسے واقعات زبان عام و خاص ہیں کہ ہندوستان میں اسلام اولیاء اللہ کے ذیلے پھیلا اور دوسرے اس لئے بھی کہ بچے درج شدہ واقعات بھی چونکہ کچھ اسی قسم کے ہیں، تو پھر اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟ ثبوت تو صرف اس بات کا درکار ہے کہ کیا اولیاء اللہ کے جوئے یا کھڑاویں بھی بڑے عظیم کارنامے سرانجام دے سکتی ہیں یا نہیں؟ چنانچہ ضیاء اللہ قادری 'سیرت غوث الثقلین' صفحہ ۱۶، پر فرماتے ہیں کہ:

دشمن کی سرکوبی

شیخ ابو عمر واد ابو محمد عبدالحق سے مروی ہے کہ ہم غوث پاک کی خدمت میں حاضر تھے کہ اس وقت آپ نے اپنی کھڑائیں پہنیں اور وضو فرمایا، اور دو رکعت نفل پڑھنے کے بعد بند آواز کرتے ہوئے ایک کھڑاؤں کو ہوا میں زور سے پھینکا۔ پھر اسی طرح دوسری کو بھی پھینک دیا۔ دونوں کھڑائیں ہماری نظر سے غائب ہو گئیں مگر ہم سے کسی کو آپ سے واقعہ معلوم کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ تین دن بعد ایک قافلہ آیا اور کہنے لگا کہ ہم نے غوثِ اعظم کے حضورِ ندۂ انہ پیش کرنا ہے۔ ہم نے اجازت طلب کی، تو آپ نے اجازت دے دی اور کہا کہ جو کچھ نذرانہ دیں، لے لو۔ اس قافلہ نے یہیں اُونی، ریٹھی کیڑے، سونا وغیرہ اور آپ کی وہ دونوں کھڑائیں دیں، جن کو آپ نے ہوا میں پھینکا تھا۔ باہر اگر ہم نے ان سے کھڑاؤں کے متعلق پوچھا کہ کہاں سے ملیں؟ تو انہوں نے بیان کیا کہ میں صفر کو جا رہے تھے کہ راستہ میں عرب ڈاکوؤں نے ٹوٹ لیا اور ہمارے قافلہ کے بہت سے افراد کو قتل بھی کر ڈالا۔ اس وقت ہم نے کہا کہ شیخ عبد القادر ہماری دستگیری فرمائیں اور ہم بچ کر نکل جائیں، تو اپنے مال میں سے آپ کی نذر پیش کریں گے۔ ابھی ہم یہ کہہ ہی رہے تھے کہ دو بلند آوازیں سنائی دیں کہ سارا بیابان گونج اٹھا اور وہ ڈاکو بھی ہیبت زدہ ہو گئے۔ ہم نے سمجھا کہ کوئی شخص آ رہا ہے، جو ان ڈاکوؤں سے بھی مال چھین کر لے جائے گا۔ اتنے میں وہ ڈاکو ہمارے پاس آئے۔ اور کہنے لگے کہ آؤ تم اپنا مال اٹھا لو اور دیکھو! ہمارا کیا حال ہوا ہے۔ ہم وہاں پہنچے، تو ڈاکوؤں کے دونوں سرداروں کو مردہ پایا اور ہر ایک کے پاس پانی سے تر ایک ایک کھڑاؤں پڑی ہے اور انہوں نے ہمارا مال واپس کر دیا۔

دیکھ لیا آپ نے اولیاء اللہ کی کھڑائیں کتنی تسنی کام کی چیز ہیں۔ وقت پڑنے پر پورے ہتھیار کا کام دیتی ہیں۔ کھڑاویں دو تھیں اور ڈاکوؤں کے سردار بھی دو تھے اور ان کھڑاؤں میں یہ شور بھی تھا کہ ہم نے بس سرداروں

کو ہی ہلاک کرنا ہے، اس کے بعد ہمارا کام ختم ہے۔ البتہ افسوس کی بات یہ ہے کہ قافلہ والوں نے اپنے بہت سے آدمی مارے جانے کے بعد غوثِ اعظم کو فریاد کے لئے پکارا تھا۔ بروقت پکارتے، تو شاید ان کے مرے ہوئے لوگوں کی جانیں بھی نچ جاتیں۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ بھی سیرتِ غوث الثقلین کے صفحہ ۲، اپریلوں منقول ہے کہ:

”ایک عورت آپ کی مریدہ ہوئی۔ اُس پر ایک شخص عاشق تھا۔ ایک دن وہ عورت کسی حاجت کے لئے باہر سپاڑ کی غار کی طرف گئی، تو اس فاسق کو بھی اس کے جانے کا علم ہو گیا، وہ اس کے پیچھے پیچھے ہو گیا اور اس کو پکڑ لیا۔ وہ اس کی عصمتِ ریزی کرنا چاہتا تھا کہ اس عورت نے بارگاہِ غوثیہ میں فریاد کی اور کہا ”الغیث، یاسیدی عبدالقادر!“ اس وقت حضرت اپنے مدرسہ میں وضو فرما رہے تھے۔ آپ نے اپنی کھڑاؤں کو غار کی طرف پھینکا۔ وہ کھڑاؤں اس فاسق کے سر پر گئیں شروع ہو گئیں، جتنی کہ وہ مر گیا۔ وہ عورت آپ کی نعلین مبارک لے کر حاضر ہوئی اور مجلس میں سدا قصہ کہہ سنایا۔“ (تفہیمِ احوال، ص ۳، مطبوعہ مصر)

امام اہل سنت احمد رضا خاں بریلوی فرماتے ہیں:

”سیدی محمد شمس الدین محمد حنفی رضی اللہ عنہ اپنے حجرہ خلوت میں وضو فرما

شمس الدین محمد حنفی کی کھڑاؤں

رہے تھے۔ ناگاہ ایک کھڑاؤں ہوا پر پھینکی کہ غائب ہو گئی۔ حالانکہ حجرے میں کوئی راہ اس کے ہوا پر جانے کی نہ تھی۔ دوسری کھڑاؤں اپنے خادم کو مخاطب فرمائی کہ اے اپنے پاس رہنے دے جب تک وہ پہلے واپس نہ آئے ایک مدت کے بعد ملک شام سے ایک شخص وہ کھڑاؤں مع ہدایا لے کر حاضر ہوا اور عرض کی کہ اللہ تعالیٰ حضرت کو جزائے خیر دے۔ جب چہر میرے سینے پر مجھے ذبح کرنے بیٹھا میں نے اپنے دل میں کہا: ”یاسیدی محمد حنفی“ اسی وقت یہ کھڑاؤں غیب سے آکر اس کے سینے پر لگی کر فتنہ کیا کہ الٹا ہو گیا۔ (انوارِ لاقتباہ، ج ۱ ص ۱۱۰) (احمد رضا خاں بحوالہ بریلویت)

رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۲۳ھ) کا ذکر چل رہا ہے۔

”کوئی صاحبِ منشی تھل حسین، جو امداد اللہ مہاجر کی

کھڑاؤں سے قلبِ جاری ہوا

بیعت تھے۔ بڑی آرزو رکھتے تھے کہ کسی طرح ان کا قلب جاری ہو جائے۔ ادھر ادھر مارے پھرتے تھے۔ تھل حسین کی بیوی نے بھی حضرت صاحب سے اس بات کا ذکر کیا۔ حضرت صاحب نے تھل حسین سے وجہ پوچھی تو فرمایا، ”میاں! اس میں کیا رکھا ہے؟“ تھل حسین نے فرمایا: ”رکھا تو کچھ نہیں، مگر جی چاہتا ہے۔“ آپ نے فرمایا، ”اچھا جاؤ مسجد میں جا بیٹھو۔“ وہ جا کر مسجد میں جا بیٹھے۔ ادھر حضرت وضو کر کے کھڑاؤں کو پہن کر

سجد کی طرف چلے، کھڑاؤں کی کھٹ کھٹ سنی کہ اُدھر تھل حسین صاحب کا قلب جاری ہو گیا۔ دوڑ کر حضرت کے قدم پکڑ لئے کہ میں جو چاہتا تھا، وہ چل ہو گیا۔“ (تاریخ مشائخ چشتیت، مولانا زکریا، ص ۲۸۵)

مند جب بالا واقعات سے بھی چند مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں :

۱۔ اولیاء اللہ عموماً لکڑی کی کھڑاؤں پہنتے ہیں، کیونکہ وہ مارنے کے لئے بھی بہت کارآمد ثابت ہوتی ہیں اور قلب جاری کرنے کے لئے بھی۔

۲۔ پھر ان کھڑاؤں کا وضو سے بھی گہرا تعلق ہے۔ شاید وضو کا پانی کھڑاؤں کے کاناموں کی تاثیر میں دو آئینہ ثابت ہوتا ہو۔

۱۲۔ لوح محفوظ پر نظر

لوح محفوظ کے متعلق قرآن سے تین طرح کی معلومات ملتی ہیں۔ (۱) یہ لوح ہر طرح کی دسترس سے محفوظ ہے (۲) یہ کتاب مکھنوں بھی ہے۔ یعنی اس طرح پوشیدہ ہے کہ اسے اس پاس کے مقربین فرشتے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ (۳) وہ اُم الکتاب ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔ دوسرا کوئی اُس کے پاس پہنچ بھی نہیں سکتا۔

لیکن ہمارے اس گروہ صوفیاء کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ لوح محفوظ ہر ولی کی نظر کے سامنے ہوتی ہے۔ چنانچہ اس عقیدہ کی ترجمانی کرتے ہوئے مولانا روم (م ۶۷۳ھ) نے اپنی ثنوی میں، جسے جامی نے فارسی زبان میں قرآن ہی قرار دیا ہے، فرماتے ہیں :

لوح محفوظ است پیش اولیاء از چہ محفوظ است محفوظ از خطا

حال تو داند یکٹ یکٹ موبہ نو زانکہ پرستند از اسرارِ ہو

بلکہ پیش از دادن تو سال ما دیدہ باشندت پندیں ساہا

ترجمہ :- (۱) لوح محفوظ اولیاء کے سامنے ہوتی ہے وہ کس چیز سے محفوظ ہے؟ وہ خطا سے محفوظ ہے (یعنی اولیاء اللہ سے نہیں)

(۲) یہ اولیاء اللہ سے یکٹ یکٹ لمحہ اور بال کا حال جانتے ہیں، کیونکہ وہ اللہ کے اسرار پوچھ سکتے ہیں۔ (۳) بلکہ یہ

حالی نہوں نے تیری پیدائش سے سالہا سال پہلے لے لورج محفوظ پر دیکھ لیا ہوتا ہے۔

اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے فرمایا کہ: ”اطلاع بر لورج محفوظ بمطالعہ و دیدن نقوش نیز از بعض اولیاء بتواتر منقول است۔“ (تفسیر عزیزی، ص ۳، سورہ جن، بحوالہ سیرت غوث ثقلین، ص ۱۶۶) یعنی اولیاء اللہ کو لورج محفوظ کے نقوش کی دیکھنے اور مطالعہ سے اطلاع ہو جاتی ہے اور بعض اولیاء سے یہ بات تواتر کے ساتھ منقول ہے۔

اب دیکھئے قرآن تو یہ کہہ کر ”یہ کتاب مکنون“ (پوشیدہ) ہے۔ اب اگر یہ سب اولیاء اللہ کی نظر کے سامنے ان لی جائے، تو پوشیدہ کیسے ہوتی؛ شاہ عبدالعزیز کی عبارت سے البتہ یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ نقل کا تو ”صرف“ اولیاء اللہ سے ہے کسی عالم دین سے نہیں۔ اور ان اولیاء اللہ کچھ سلف صالحین، وہی صاحبین ہیں جن سے محدثین کسی حدیث کو قبول کرنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ کیونکہ جھوٹ فوراً بے اعتیان کے منہ سے نکل جاتا ہے، اب ہم شیخ عبدالقادر جیلانی کے چند واقعات پیش کرتے ہیں۔ ضیاء اللہ قادری ’سیرت غوث ثقلین‘ کے صفحہ ۱۹، پر قلمراز ہیں کہ:

لورج محفوظ میں تبدیلی کیسے ہوتی ہے؟

”ملفوظ الغیاشیہ میں ہے کہ غوثِ اعظم کے زمانہ میں ایک مقرب کی

ولایت سلب کر لی گئی، سب چھوٹے بڑے اس کو خدات کی نگاہ سے دیکھنے لگے، تو اس نے تین سو ساٹھ اولیاء اللہ سے دُعا کی درخواست کی۔ ان سب اولیاء نے اللہ کی بارگاہ میں سفارش کی، لیکن ان سب نے اس کا نام لورج محفوظ پر اشقیاء کی فہرست میں لکھا دیکھا اور اسے کہا کہ ”اتم کامیاب نہیں ہو گے۔“ اس کا چہرہ سیاہ ہو گیا۔ بالآخر وہ غوثِ اعظم کے پاس آیا، تو اپنے ارشاد فرمایا کہ ”اگرچہ تم مردود ہو چکے ہو، تاہم میں تمہیں مقبول بنا سکتا ہوں۔“ آپ نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی تو ندا آئی ”کیا تم کو علم نہیں کہ اس کے لئے میرے ۳۶۰ اولیاء سفارش کر چکے ہیں اور میں نے ان کی سفارش قبول نہیں فرمائی، کیونکہ یہ لورج محفوظ پر شقی اور بد بخت لکھا جا چکا ہے۔“ غوثِ پاک نے عرض کیا: ”اے رب کریم! تو مردود کو مقبول اور مقبول کو مردود بنانے پر قادر ہے۔ اگر تیری نشا یہی ہے کہ یہ مردود ہی ہے، تو تُو نے اس کو مقبول بنانے کے لئے مجھ سے دُعا کیوں کرائی؟“ تو ندا آئی: ”اے عبدالقادر! اسے میں نے تیرے سپرد کر دیا، جو چاہو بنا دو۔ اور تمہارا مقبول میرا مقبول ہے اور تمہارا مردود میرا مردود ہے۔ بیشک میں نے تم کو معزول کرنے اور مقرر کرنے کے اختیارات عطا فرمادیئے ہیں۔“ بعد ازیں آپ نے

اُس کو منہ دھونے کا ارشاد فرمایا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کا نام اشقیاء کی فہرست سے مٹا کر اصفیاء کی فہرست میں لکھ دیا۔“ (تفہیم الخاطر، ص ۲۱)

اس اقتباس میں درج ذیل امور قابل ذکر ہیں :

- ۱۔ دیکھا آپ نے سید عبدالقادر جیلانیؒ نے کتنی زبردست دلیل سے اللہ کو قائل کر لیا : اور وہ دلیل یہ تھی کہ اگر تم نے اس سلب الولائی کو مقبول نہیں بنانا تھا، تو پھر مجھ سے دُعا کیوں کرائی تھی ؟ کاش یہ دلیل دوسرے ۲۶۰ اولیاء کو بھی سوجھ جاتی، تو اس سلب الولائی کو اتنا زیادہ پریشان اور رُوسیا نہ ہونا پڑتا۔
- ۲۔ اگر عززل و نصب کے جملہ حقوق و اختیارات اللہ تعالیٰ نے پیرانِ پیر کو تفویض کر رکھے ہیں، تو مالک الملک اللہ تعالیٰ ہوا یا شیخ عبدالقادرؒ؟ اور پھر پہلے سے لوح محفوظ لکھ رکھنا بھی کچھ سؤمند معلوم نہیں ہوتا۔
- ۳۔ اس سلب الولائی ولی کی رُوسیا ہی چہرہ دھونے سے ہی اتر گئی۔ شاید میں اٹھا اُس نے نہ کوئی نماز پڑھی نہ ہی وضو کیا تھا۔ ورنہ یہ رُوسیا ہی پہلے ہی دُھل چکی ہوتی۔

ضیاء اللہ قادری سیرت غوثِ شعلین کے صفحہ ۱۹۸ پر فرماتے ہیں کہ :

آخر اللہ تعالیٰ نے ہار مان لی۔

”منتخب جواہر القلاد میں ہے کہ ایک دن ایک غوثِ غوثِ پاک کے پاس آئی اور عرض کی دُعا فرمائیں اللہ کریم مجھے اولاد عطا فرمائے۔ آپ نے لوح محفوظ کا مشاہدہ فرمایا، وہاں اس عورت کی اولاد نہیں لکھی ہوئی تھی، تاہم آپ نے اللہ سے دو بیٹوں کی التجا کی، تو ندا آئی کہ ”لوح محفوظ میں تو ایک بھی بیٹا نہیں لکھا ہوا اور آپ دو بیٹوں کا سوال کرتے ہیں؟“ آپ نے تین بیٹوں کے لئے عرض کیا، تو یہی جواب ملا۔ آپ نے چار بیٹوں کا سوال کیا، پھر وہی جواب ملا۔ پھر پانچ کا سوال کیا، تو وہی جواب ملا۔ پھر چھ کا سوال کیا، تو وہی جواب ملا۔ آپ نے سات بیٹوں کا سوال کیا، تو ندا آئی : ”اے غوث اتنا ہی کافی ہے۔“ اور یہ بشارت بھی ملی کہ ”اللہ تعالیٰ اس عورت کو سات لڑکے عطا فرمائے گا۔“ (تفہیم الخاطر، ص ۲۲، مطبوعہ مصر)

اس اقتباس سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ہی سید عبدالقادر جیلانیؒ کے سوالوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے تھے۔ تاہم یہ وضاحت نہیں کی کہ اللہ نے لوح محفوظ میں بھی ترمیم کی تھی یا وہ ویسے کی ویسے ہی رہی۔ غالباً کہ یہی ہوگی۔

اور دوسری یہ بات کہ جب وہ خواب میں قتل ہوا، تو اگر اس وقت اس کے ہزار دینار اس کے پاس ہی ہوتے، تو بھی اُن کے ضائع ہونے کا چنداں خطرہ نہ تھا۔ قصہ گھڑنے والے نے خواہ مخواہ ابوالمنظفہ سے حدب کے ایک مقام پر پیسے رکھوائے، جو وہ بیداری کے بعد لینے گیا تھا، اور مفت میں حدب کا پکڑ لوادیا۔

البتہ اس لحاظ سے ہم اس قصہ تراشش کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس نے شیخ حماد اور شیخ عبدالقادر دونوں کی لاج رکھ لی۔ رہی لوح محفوظ کی تحریر کی بات تو یہ اللہ کا کام ہے، جیسے چاہے بعد میں ترمیم کرتا ہے۔

اس عقیدہ کی مزید توثیق

شیخ عبدالقادر جیلانی کا بیان ہے کہ ”مجھے اپنے رب جلیل کی عزت و عظمت کی قسم! میرے سامنے نیک بخت

اور بد بخت لوگ پیش کئے جاتے ہیں۔ میری نظر لوح محفوظ پر ہوتی ہے۔ میں اللہ کے علوم اور مشاہدات کے سمندر میں تیرنے والا ہوں۔“ (سیرت نوٹ، ص ۱۳۶، بحوالہ حجة الاسلام، ص ۲۲۔ قلائد البھار، ص ۲۶۔ تفسیر الطبرانی اور صوفیاء کے شیخ اکبر ابن عربی نے اپنی کتاب فصوص الحکم پوری کی پوری لوح محفوظ کو دیکھ کر نقل فرمائی تھی۔ آپ فرماتے ہیں:

”میں نے اسے لوح محفوظ سے نقل کیا۔ بعد میں ۶۲۷ھ کے محرم میں رسول اللہ ﷺ کو دمشق کا شہر محروسہ میں دیکھا۔ آپ مجھے ہاتھ میں کتاب تھی۔ آپ نے فرمایا: ”یہ کتاب فصوص الحکم ہے۔ اس کو محفوظ رکھو اور لوگوں کے سامنے پیش کرو، تاکہ انہیں فائدہ حاصل ہو۔ چنانچہ میں نے آپ کے حکم کے مطابق اسے لوگوں میں پھیلانے کا پختہ ارادہ کر لیا اور اس میں کمی بیشی کرنا میرے لئے ممکن نہ رہا۔“ (فصوص، ص ۴۰، ۴۱)

اس تین سطر کے اقتباس ابن عربی کے فصوص الحکم کے متعلق دو بیان ہیں۔ ایک یہ کہ انہوں نے یہ کتاب لوح محفوظ سے نقل کی دوسرے یہ کہ کچھ ہی عرصہ بعد یہی کتاب محروسہ کے مقام پر رسول اللہ ﷺ نے خود ان کو کھچی لکھائی دی تھی۔ دونوں بیان ایک دوسرے سے بڑھ چکے ہیں۔ ان میں سے جو سنا چاہیں قبول فرمائیے۔ یا چاہیں، تو دونوں ہی قبول فرمائیے۔

پھر توبہ دستو ہی چل نکلا کہ جس شخص کے جی میں آئے، کہہ دے کہ میں نے اپنی کتاب لوح محفوظ سے نقل کی ہے۔ چنانچہ فرمائی صاحب نے بھی مرشد کامل کی تصنیف کے متعلق بھی ایسا ہی دعوے کر دیا جس کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں۔

۱۳۔ عبادات میں غلو اور بدعات

بدعت کی اقسام

بدعات دو قسم کی ہوتی ہیں۔ پہلی قسم یہ ہے کہ عبادات و نوافل جن کا ثبوت کتاب و سنت میں موجود ہے، اس پر کچھ اضافہ کر لیا جائے۔ مثلاً :

رسول اکرم ﷺ رات کو عبادت بھی کرتے تھے اور سوتے بھی تھے۔ اب اگر ایک شخص خالص نیکی کے جذبہ سے تہیہ کر لے کہ میں ساری رات قیام کر کے اللہ کی عبادت میں مشغول رہوں گا، تو یہ غلو فی العبادت اور ایک طرح سے بدعت ہے۔ اسی طرح نماز تہجد رسول اکرم ﷺ پر فرض تھی، دوسروں پر نہیں۔ اب اگر کوئی شخص اپنے آپ پر قیام اللیل کو فرض قرار دیتا ہے، تو اس کی بھی یہی صُوت ہوگی اور اگر کوئی شخص پانچ فرض نمازوں کے بجائے چھ نمازیں اپنے آپ پر فرض کر لیتا ہے، تو یہ بھی بدعت ہے۔

اسی طرح روزہ کی مثال ہے۔ حضور اکرم ﷺ بعض دفعہ خود تو متواتر روزے رکھتے چلے جاتے تھے۔ افطاری نہیں فرماتے تھے، لیکن آپ ﷺ نے دوسروں کو اس سے منع فرمادیا۔ نیز آپ ﷺ نے امت کو ہمیشہ روزہ رکھنے سے منع فرمادیا۔ اب اگر کوئی شخص روزانہ روزے رکھتا چلا جائے، تو یہ عبادت بھی مقبول نہیں بلکہ مذموم ہوگی، جیسا کہ ہم اس سے پیشتر کئی احادیث صحیحہ سے ثابت کر چکے ہیں۔

صدقہ و خیرات کی بھی مثال اسی طرح ہے۔ رسول اکرم ﷺ کے پاس جو کچھ ہوتا دے دلا کر فراغ ہوجاتا لیکن اُمت کو یہ اصول بتایا کہ **لَا تَصَدَّقُوا عَنْ ظَهْرِ غِنًى** (بھاری) یعنی صدقہ وہ ہے جس کے بعد انسان خود محتاج نہ ہو جائے، تو اگر کوئی مسلمان آپ ﷺ کے اس فرمان کا لحاظ نہیں کرتا، تو فقیروں و مسکینوں کو بھوکے پیٹے دے دے، تو یہ بھی بدعت ہوگا۔

یہی حال حج کا ہے۔ حج اس شخص پر فرض کیا گیا جس کے پاس راستہ کی سواری کا اور اپنے کھانے پینے کا خرچ بھی ہو اور گھوڑوں کے پاس بھی خرچ چھوڑ جائے۔ اب اگر کوئی شخص حج پیدل چل کر دور دراز کا سفر طے کرنے کی نیت کرتا ہے یا راستے میں لوگوں سے مانگ کر کھاتا ہے یا لوگوں سے قم فراہم کر کے حج کرنے جاتا ہے یا سواری پاس موجود ہو تو ازراہ تبرک اس پر سوار نہیں ہوتا، تو یہ سب کام نیکی کے کام نہیں، بلکہ خلاف شرع ہیں اور بدعت ہیں۔

یہ تو عبادات میں اضافہ کی بات تھی۔ اس کی دوسری صوت یہ ہے کہ انسان اضافہ تو نہیں کرتا۔ البتہ اس کے طریق کار میں تبدیلی پیدا کر لیتا ہے اور بزم خود سے بچتا ہے کہ یہ طریقہ مسنون طریق سے بہتر اور افضل ہے اس کی مثال درج ذیل واقعہ سے واضح ہوتی ہے۔

”حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو فہ کی جامع مسجد میں داخل ہوئے، تو دیکھا کہ لوگ مختلف عقول میں بٹے ہوئے ہیں۔ ہر طبقہ کے درمیان کنکریوں کا ڈھیر ہے اور ہر طبقہ میں ایک آدمی کھڑا ہے، جو ان سے کہتا ہے کہ سو بار ”سبحان اللہ“ کہو۔ لوگ سبحان اللہ کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر وہ کہتا ہے کہ سو بار ”الحمد للہ“ کہو۔ لوگ الحمد للہ کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر وہ کہتا ہے کہ سو بار ”اللہ اکبر“ کہو۔ تو لوگ اللہ اکبر کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان کو اس حالت میں دیکھ کر کہا: ”اللہ کی قسم! کیا تم ایسے دین پر ہو، جو اللہ کے رسول ﷺ سے زیادہ ہدایت والا ہے یا تم گمراہی کے سلسلے کھول رہے ہو۔ روامی مت! اب دیکھئے سبحان اللہ، الحمد للہ اور اللہ اکبر کا وظیفہ کرنا مسنون ہے، لیکن اپنے طور پر، اُس کی جو شکل ان لوگوں نے اختیار کی وہ دوسری نبوی ﷺ میں نہیں تھی۔ لہذا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے گمراہی قرار دیا۔ کیونکہ ذکر اذکار یہ طریق مسنون نہیں بدعیہ تھا۔

بدعت کی دوسری قسم یہ ہے کہ اس کا اصل بھی آثار و سنت میں موجود نہ ہو اور وہ دین کا کام اور ثواب کچھ کرائیج کی جائے۔ اور ایسی بدعات بے شمار ہیں مثلاً عید کی نماز سے پہلے اذان دینا۔ اذان سے پہلے درود کہہ کر اذان کا شروع کرنا، یہ تیجا، ساتواں کے ختم شریف وغیرہ صوفیاء میں ترک دنیا اور نفس کی ریاضتیں اور چٹکشی، حبس دم وغیرہ سب اسی ذیل آتے ہیں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بدعت جب بھی شروع کی جاتی ہے، تو نیک ارادوں، نیک نیاؤں،

ہر طرح کی بدعت گمراہی ہے

خدا کی خوشنودی اور ثواب کی نیت سے شروع کی جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود سراسر گمراہی ہے، جیسا کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: **كُلُّ بَدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ** اور جو بدعت حسنا اور بدعت سنیہ کی تقسیم کر کے بدعت حسنہ کو صحیح سمجھا جاتا ہے۔ وہ بھی اس حدیث کی رو سے سراسر گمراہی ہی ہوتی ہے۔

بدعت حسنہ کے جوازیں جو لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جماعت ثلاثہ میں شروع کرائی اور پھر

دیکھ کر فرمایا کہ: "نَعْمُ الْبِدْعَةُ هَذِهِ" تو اس سے استدلال نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مقام پر بدعت کا لفظ شرعی اصطلاح کے طور پر نہیں، بلکہ لغوی مفہوم کے طور پر استعمال فرمایا تھا۔ نصاب ترائیح کی جماعت رسول اللہ ﷺ نے خود بھی کئی بار کر لائی۔ یہاں اس سے مراد صرف نیا پن (NOVEITY) (قاہوس الجدید العصری) ہے۔ یعنی جماعت کا اتمام جو آپ نے فرمایا۔ جب لوگ پہلے سے اکیلے اکیلے مختلف ٹولوں کی معیت میں باجماعت ادا کر رہے تھے۔

بدعت کا دوسرا پہلو

کسی سنت میں کمی کرنا عصیان ہے۔ جیسے کوئی شخص صلوٰۃ موقتہ میں فرضوں کے علاوہ کبھی سنتیں نہ پڑھے، تو عصیان ہو۔ اور یہ قابل معافی ہے مگر سنت میں اضافہ کرنا نیا نئی بات شامل کرنا غلو فی العبادات اور بدعت ہے جو کفر اور شرک کی حیلوں کو چھوٹا ہے، لہذا یہ ناقابل معافی جرم ہے۔ الایہ کہ توبہ کر لی جائے۔ کیونکہ اس شخص نے رسول اللہ ﷺ کے قائم کردہ طریق کو ناکافی اور شریعت کو نامکمل سمجھ کر اس میں اضافہ کیا ہے۔ اہم شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ بندے کا شرک کے سوا تمام گناہوں میں مبتلا ہو جانا اس سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ کسی بدعت میں مبتلا ہو لیکن جب ہم ان صوفیاء کے اعمال و کردار پر نظر ڈالتے ہیں، تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عبادات و افعال میں سے بیشتر بدعات ہی کا مجموعہ ہیں۔ ابھی ہم ان کی کتابوں سے مستند اقاعات پیش کریں گے جو اس دعویٰ کا واضح ثبوت ہیں:

اویس قرنی کی عبادت

"یکمیاے سعادت، تفسیر حسینی، تذکرہ اولیاء، مجالس المؤمنین اور روضۃ الصالحین مذکور ہے کہ جناب خواجہ اویس قرنی بعض رات کو آپ فرماتے: "هَذِهِ كَيْلَةُ الرَّكُوعِ" ساری رات رکوع کی حالت میں ہنسنے صبح ہوتی، تو رکوع سے سجدہ میں جاتے۔ بعض رات کو آپ فرماتے "هَذِهِ كَيْلَةُ السُّجُودِ" (یہ شب سجدہ کی شب ہے) اور ایک ہی سجدے میں صبح ہو جاتی۔ کسی نے عرض کیا یا اویس! یہ آپ کو کس طرح اطاعت کی طاقت ہے کہ ایک رکوع یا ایک سجدے میں رات بسر کر دیتے ہیں؟ آپ نے آہ بھرتے ہوئے فرمایا: "کاش! ازل سے اب تک ایک ہی رات ہوتی کہ ایک رکوع یا ایک سجدے میں رات تمام کر دیتا۔"

"ایک اور روایت ہے کہ حضرت خواجہ فرماتے ہیں کہ میں کبھی بھی اچھی طرح ایک بار بھی سبحان ربی الاعلیٰ کہتے نہیں پاتا کہ سورج طلوع ہو جاتا ہے۔ اور میں بار تیس کہنا تو سنت ہے، میں تو سنت بھی پوری کرنے نہیں

پاتا بچہ فرمایا، "میں یہ سب کچھ اس لئے چاہتا ہوں کہ فرشتوں کی طرح عبادت کروں۔" (الاولیں، ص ۳۷)
یہ ہے اتباع سنت کا نمونہ، جو منہ جبر بالا پانچ کتابوں میں منکوح ہے۔

عبد اللہ خفیف کی عبادت

رات دن عبادت میں مصروف رہتے۔ کہتے ہیں کہ
ایک ایک رکعت میں ہزار بار قل شریف پڑھتے

تھے۔ غذا بہت کم ہوتی تھی۔ روزہ صرف سات دنہ منفقہ سے افطار فرماتے اور بس۔ اسی وجہ سے عبد اللہ خفیف
مشہور ہوئے۔" (مقربان حق۔ خلاصہ مذکور اولیاء، ص ۱۵۹)

یہ آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ ایک ہزار قل شریف پڑھنے میں کتنا وقت صرف ہو سکتا ہے اور وہ ہر
رکعت میں اتنی بار جو پڑھتے تھے، تو فرض نمازوں کا کیا حشر ہوتا ہوگا۔

امام جعفر صادق کا مقصد

"امام صاحب کا ایک دوست حج پر روانہ ہوا اور رخصت
ہوتے وقت اس نے دس ہزار درہم آپ کو بطور امانت

دیئے اور کہا کہ اس سے میرے لئے میری واپسی تک مکان خرید رکھیں۔ آپ نے اس کے جانے کے بعد وہ
سارا روپیہ اللہ کی راہ میں تقسیم کر دیا جب وہ واپس آیا، تو آپ نے فرمایا: "تہا سے لئے میں نے جنت میں
مکان خرید لیا ہے۔ جس کی ایک دیوار رسول اللہ ﷺ کے مکان کی دیوار سے ملتی ہے، دوسری دیوار حضرت
علیؑ کے مکان سے، تیسری حضرت حسنؑ اور چوتھی حضرت حسینؑ کے گھر سے ملتی ہے اور

۱۷ دوسرا پہلو: اب تصویر کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ اگر اس گزہ میں افراط اور تفريط کی انتہا پائی جاتی ہے۔ عبدالحکیم جبلی مصنف
انسان کامل لکھتے ہیں کہ بلیس اپنی ذریت کو انسانوں کو گمراہ کرنے کے لئے جب بھیجتا ہے، تو ہر گزہ کو انگ انگ کام کے لئے تاکید کرتا ہے۔ اس
ضمن میں شیطانوں کا ایک گزہ "اہل علم کو تعلیم دیتے ہیں کہ وہ مناجات و عبادت کی پستی میں قائم رہیں۔" مصنف کی یہ بات اس کے مترجم کو بھی
ہمارا محسوس ہوئی، تو اس نے ساتھ ہی یہ صراحت کر دی کہ،

"مناجات اور عبادت سادت میں داخل ہیں، لیکن عارفین موجدین، جو توحید و جدی پر فریفتہ ہیں۔ اس کو عبادات میں داخل کرتے
ہیں۔ اسی لئے شیطان نے ضلالت میں مصنف علیہ الرحمۃ نے اسے داخل کیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔" (انسان کامل، ص ۳۹۱)

ہم حیران ہیں کہ جب مترجم نے مصنف کے اس فعل کو غلط اور توحید و جدی پر فریفتگی پر محمول کیا ہے تو اس مصنف کو عارفین موجدین
کے زمرہ میں شامل کرنے کے کیا معنی ہیں اور انہیں علیہ الرحمۃ کے الفاظ سے یاد کرنے کی کیا معنی ہیں؟ کیا اس طرح وہ زمرہ عارفین موجدین کی
توہین تو نہیں کر رہے؟ کیا ایسے لوگوں کو عارف موجد کہنا درست ہے؟

میں نے اس کی دستاویز بھی تیار کر لی ہے، جو تہا سے حوالہ کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر ایک کاغذ لائے، جو اس کے حوالے کر دیا۔ اس شخص نے یہ کاغذ اپنے پاس رکھا اور دفات سے پہلے وصیت کی کہ یہ دستاویز میرے کفن میں رکھی جائے۔ اس کے لواحقین نے ایسا ہی کیا۔ دوسرے دن لوگوں نے وہ کاغذ اس کی قبر پر پڑا پایا۔ اس کی پشت پر لکھا تھا کہ ”جعفر بن محمد کی تحریر کو منظور کیا گیا ہے۔“ (خزینۃ الاصفیاء، ص ۸۹)

اس روایت کے راوی نے کئی غلط باتیں ام جعفرؓ کی طرف منسوب کر دیں، مثلاً:

۱۔ امانت کی رقم یا تو مالک کو واپس دینا ضروری ہے۔ یا اسے مالک کی مرضی کے تحت خرچ کرنا، اس کے علاوہ دوسرے کسی مصرف میں خواہ اس سے ہزار گنا بہتر ہو، میں وہ رقم خرچ نہیں کی جاسکتی۔ لیکن ام صاحب نے کسی کی رقم کو اپنی طرف سے صدقہ کر کے شریعت کی خلاف ورزی کی۔

۲۔ پھر جو جنت میں مکان لے کر دیا اس کا کوئی میراثی دروازہ ہے ہی نہیں، جو سڑک یا گلی کی طرف کھلتا ہو۔ جس سے وہ خود یا اس کے اقارب داخل ہو سکیں۔

۳۔ اس بیچائے کو اس دنیا میں رہائش کے لئے مکان کی ضرورت تھی۔ رقم جنت کے مکان پر لگ گئی، تو بیچارا مرنے تک کرایہ کے مکان میں گزارا کرتا رہا ہوگا۔

۴۔ جنت میں رسول اللہ ﷺ کا مقام وسیلہ ہے۔ جس میں کوئی دوسرا ان کا شریک نہیں اور یہی دُعا ہر مسلمان افان کے بعد رسول اللہ ﷺ کے حق میں مانگتا ہے۔ پھر آپ کے مکان کی دیوار کے ساتھ اس شخص کی یاد دوسروں کی دیواریں کیسے ہو سکتی ہیں۔

۵۔ دنیا میں تو اُسے مکان نہ مل سکا اور جو جنت کے مکان کی دستاویز کی توثیق ہوئی، تو وہ بھی مرنے کے بعد اور بغیر دستخطوں کے۔ جو اسے نہیں بلکہ دوسروں کو ملی۔ وہ بھی سوچتا تو ہوگا کہ ام موصوف پر ایسا اعتماد کیوں کیا؟

”فرمایا: ذیبا“

ابو الحسن خرقانی (م ۴۲۵) کا صدقہ اور قرض بذمہ میت

اور قیامت کے دن قرض خواہوں کا دامن گیر ہونا پسند ہے۔ مگر سائل کی حاجت کو ذکر دینا گوارا نہیں؟

(صوفیائے نقشبندیہ، ص ۱۳۰)

ایک فقہ کسی صحابی نے اگر رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ شہید کے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں، تو اُنھیں فرمایا: ”ہاں!“ وہ سائل مر کر چلا، تو آپ نے اسے واپس بلایا اور فرمایا کہ ”ابھی ابھی جبریل

ایا، تو اس نے فرمایا ہے "إِلَّا الدِّينُ" یعنی شہید کے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں مگر قرضہ معاف نہیں ہوتا۔ آپ کی عادت مبارکہ تھی کہ جس میت کے سر پر قرض ہو جب تک کوئی شخص اس قرضہ کی ادائیگی کی ضمانت نہ دے دیتا۔ آپ اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھاتے تھے اور صحابہ سے فرماتے تھے کہ جاؤ تم خود ہی اس کا جنازہ پڑھ لو۔ بایں ہمہ ابو الحسن خرقانی کو یہ سب کچھ گوارا ہے۔ مگر یہ گوارا انہیں کہ سائل خالی ہاتھ واپس جائے۔ جس کے لئے شریعت نے مکلف نہیں کیا۔

”وفات کے وقت شیخ سری سقطیؒ کا حاضر خدمت تھے کہا مجھے نصیحت و وصیت فرماتے۔ فرمایا: ”میں مڑوں، تو

میرا کرتہ صدقے میں دے دینا تاکہ دنیا سے برہنہ جاؤں، کیونکہ بطن مادر سے برہنہ ہی پیدا ہوا تھا۔“ (خزینۃ الصغیر، ص ۱۲۹)

دیکھا آپ نے، اسے کہتے ہیں اتباع سنت۔ کیا میت کو کپڑوں میں کھانا سنت نہیں؟

”امام ابو بکر اسحاق کلابازیؒ کہتے ہیں:

”شیخ ابو الحسین دراج نے سرسردانی کی تلاش

ابو الحسین کے استاد کی غیرتِ فقر

میں اپنے استاد کے برتن کو ٹھولا، تو اس میں چاندی کا ایک ٹکڑا پایا۔ فرماتے ہیں، اس پر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ جب اسناد آئے، تو میں نے عرض کیا، آپ کے برتن میں مجھے چاندی کا ایک ٹکڑا ملا ہے۔ انہوں نے فرمایا: تم نے دیکھ لیا ہے؟ اُسے وہیں رکھ دو۔ پھر کہا اُسے تم لے لو۔ اس پر میں نے کہا: آپ کو اپنے معبود کی قسم! اس ٹکڑے کا کیا قصہ ہے؟ فرمایا: اللہ نے اس کے سوا کوئی اور سونے یا چاندی کا ٹکڑا نہیں دیا۔ تو میں نے چاہا میں وصیت کروں کہ اسے میرے گھر کے ساتھ باندھ دیا جائے، تاکہ اُسے اللہ کو واپس کر دوں۔ یہ رہی ان کی غیرتِ فقر۔“ (روحِ تصوف، ص ۱۴۰، بحوالہ التعرّف ترجمہ پیر محمد حسن صاحب)

اب دیکھئے کیا عطائے توبہ کھائے تو کی اس سے زیادہ واضح کوئی اور مثال مل سکتی ہے؟ اور کیا یہ استاد صاحب اس طرح اللہ تعالیٰ کے سب انعامات کا حساب چکا سکتے ہیں؟ اگر اتنی ہی غیرتِ فقر تھی کہ گنتی تھی، تو جب اللہ نے یہ ٹکڑا دیا تھا، اس وقت لیا ہی کیوں تھا؟ کیا یہی خدا کے انعامات کے شکریہ کے انہاد ہیں۔ ۷

خداوند اتیرے یہ سادہ دل بندے کدھر جائیں کہ دردیشی بھی عیسائی و سلطانی بھی عیاری

اب اس فقر کا دوسرا پہلو بھی ملاحظہ فرمائیے :

پیران پیر (۵۶۱ھ) کا قیمتی لباس اور اس کی وجہ جواز

”بغداد کے مشہور بزاز ابو الفضل
راوی ہیں کہ غوث پاک کا خادم

میرے پاس آیا اور کہا کہ مجھے ایسا قیمتی اور عمدہ کپڑا درکار ہے جس کی قیمت فی گز ایک اشرفی ہو۔ قیمت اس سے کم ہونے زیادہ۔“ میں نے پوچھا : ”اتنا قیمتی کپڑا کس کے واسطے درکار ہے۔ خادم نے حضور کا نام لیا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ جب ایسا قیمتی لباس فقرا پسین گئے، تو خلیفہ وقت کیا پہنے گا؟ انہوں نے تو بادشاہ کے لئے تو کوئی کپڑا ہی باقی نہ چھوڑا۔ بس اس خیال کا آنا تھا کہ میرے پاؤں میں غیب سے ایک ایسی کیل چھبی کہ قریب البرگ ہو گیا۔ ہر چند نکالنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ آخر آنحضرت کے پاس لائے۔ آپ نے فرمایا : ”اے ابو الفضل ! تو نے اپنے دل میں ہم پر کیوں اعتراض کیا؟ خدا کی قسم ! میں نے اس کپڑے کو نہیں پہنا جب تک مجھے یہ نہ کہا گیا کہ ایک قمیص ایسے کپڑے کا پہن جس کی قیمت فی گز ایک اشرفی ہو۔“ (اخبار الاخیار فارسی، ص ۲۱، تفرغ الخاطر، ص ۲۳۔ قلند الجواہر، ص ۳۵۔ نزہۃ الخاطر، لغات، ص ۴۷۔ تحفہ قادریہ، ص ۵۱۔ بحوالہ سیرت غوث، ص ۱۳۶)

دیکھا قیمتی لباس کے جواز کے لئے کیا خوب صورت افسانہ تراشا گیا ہے۔ ادھر ابو الفضل کے دل میں خیال آیا، ادھر غیب سے ایک ایسی کیل چھبی کہ نکالنے سے نکلتی ہی نہ تھی اور جان لیوا ثابت ہوتی۔ پھر اس کا علاج بھی کسی حکیم، ڈاکٹر کے بجائے صرف پیران پیر کے پاس تھا شاید ابو الفضل کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ میری اہل مرض یہ کیسے چھٹنا نہیں، بلکہ پیران پیر کے متعلق دل میں یہ خیال آتا تھا تو اس جرم میں مجھے غیب سے سزا ملی ہے۔ پھر اس کا علاج مریض کو جب آپ کے پاس لایا گیا، تو آپ نے اس کے اصل مرض یا جرم ہی کا علاج فرمایا اور کھیل تو امتیہ ہے خود بخود ہی نکل گئی ہوگی اور زخم بھی اسی دم مندمل ہو گیا ہوگا۔ تاہم اس بات کا تذکرہ ان پانچ سات تذکرہ نگاروں میں سے کسی نے بھی نہیں کیا۔

اب اسی طرح کا ایک دوسرا قصہ ملاحظہ فرمائیے :

”شیخ ابوالسود (م ۵۷۹ھ) پیران پیر کے بزرگ

ترین خلفا سے تھے۔ مختلف طعام کھاتے اور لباس

شیخ ابوالسود کی قیمتی بکرمی

فاخرہ پہنتے۔ ایک دھندلے سودینار قیمت کی دستار پہن رکھتی تھی۔ ایک درویش کے دل میں خیال آیا کہ یہ تو فضول خرچی اور قرآن کے حکم کے خلاف ہے اس سے تو دوسود و دیشوں کا لباس تیار ہو سکتا ہے۔ شیخ کو

نورِ باطن سے یہ بات معلوم ہو گئی۔ آپ نے درویش کو کہا یہ گچڑی بازار میں لے جا کر بیچ ڈال اور درویشوں کے لئے طعام مہیا کر۔ اس درویش نے گچڑی بیچ کر مکلف و مسترخوان آراستہ کیا مگر شیخ کو دیکھا تو وہی گچڑی سر پر تھی۔ بڑا حیران ہوا۔ شیخ نے فرمایا: ”حیران نہ ہو اور اس شخص سے اس کی کیفیت پوچھ“ چنانچہ اس شخص نے کہا ”میں پچھلے سال کشتی میں سوار تھا کہ طوفان نے آگھیرا۔ میں نے منت مانی، اگر بچ گیا، تو ایک قیمتی چیز شیخ کی نذر گزاروں گا۔ چھ ماہ سے مجھے کوئی قیمتی دستار مل نہیں رہی تھی۔ آج ایک دکان پر دیکھی، تو خرید کر ہدیہ شیخ کیا۔ شیخ نے کہا: ”سنا! میں نے یہ گچڑی خود نہیں باندھی، بلکہ کسی اور نے بندھوائی ہے۔“ وغیرہ

(الاضیاء، ص ۱۷۹)

سچ فرمائیے کہ الف لیلہ کی داستانیں اچھی ہیں یا اولیاء اللہ کی کرامات کے یہ قصے؟ بہر حال لباس فاخرانہ کا جواز تو مل گیا کہ وہ ندائے غیب یا حکم الہی کی بنا پر پہنا کرتے ہیں۔ البتہ فقرِ بیخضرات اپنی طرف سے اختیار فرماتے ہیں۔

”بزرگوں کا قول ہے کہ سالک کی جھوک اختیار ہی ہے، کیونکہ اگر وہ سیر ہو کر کھائے گا، تو اس کا نفس زور پکڑے گا اور پھر سالک اس کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ نفس کو اتنا ضعیف اور ناتواں کرنا چاہئے کہ اگر اسے بال میں جھک دیں، تو اسے نہ توڑ سکے یہ بات جھوک کے سوا حاصل نہیں ہو سکتی۔“ (مرشد کامل، ص ۹۵)

یہی وہ ریاضت ہے جس کی وجہ سے حضور اکرم ﷺ مسلسل روزہ رکھنے سے منع فرمایا اور فرمایا ”حشر داؤد“ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے اور دشمن کے مقابلے میں جنگ سے بھاگتے نہ تھے۔ اور فرمایا ”وَلَيْفَسَيْدُكَ عَلَيْكَ حَقٌّ“

”نقل ہے کہ بائزید بسطامی کو ۲۰ دفعہ خدا کا تکرر حاصل ہوا۔ آپ نے ہر دفعہ کہا میں ابھی پورا لکھ گوارا مسلمان نہیں ہوا کئی سالوں تک آپ نے ٹوٹی ہوئی لاٹھی اور پرانا جببہ رکھا آخر چالیس رات دن ریاضت کرتے رہنے کے بعد آپ نے خدا کی بارگاہ میں عرض کی کہ الہی! اگر تو مجھے اپنے فضل و کرم سے باریابی کا شرف عطا فرمائے، تو میرا کیا نقصان ہے؟“ ہاتھ نے آواز دی۔ ”بایزید! تو اس ٹوٹی ہوئی لاٹھی اور پرانے جببے سے ہماری بارگاہ میں حاضر ہونا چاہتا ہے؟“ آپ نے اسی وقت دونوں کو زمین پر پھینک دیا اور آپ کا مقصد حاصل ہو گیا۔“ (مرشد کامل، ص ۱۰۰)

ترک دنیا کا معیار

اس واقعہ کی ابتداء میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ بائید کو ۷ دفعہ خدا کا تقرب حاصل ہوا۔ پھر اور کون سے شرف باریابی کی التجا فرما ہے تھے۔ کیا خدا کے تقرب حاصل ہونے اور خدا کا شرف باریابی میں کچھ فرق ہے؟ یہی ایک نکتہ باقی ہے کہ آپ کو کھٹکا لگا رہتا تھا کہ یہ جبہ اور لامٹھی مسلمان ہونے کی شان کے منافی ہے جس کی تائید ہاتھ غیبی نے کر دی۔ مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ چیزیں رسول خدا ﷺ بھی استعمال فرماتے تھے، تو ایسی ندائے غیبی کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔

بائید بٹطامی کا نماز دھارنا

”حضرت بائید بٹطامی نے کسی ام کے پیچھے نماز پڑھی بعد از فرغت ام نے پوچھا: ”یا حضرت! آپ مانگتے بھی کسی سے کچھ نہیں اور کرتے بھی کچھ نہیں، تو گڑبسر کیسے ہوتی ہے؟“ آپ نے فرمایا: ”ٹھہرو! میں نماز کا اعادہ کروں، کیونکہ جو اپنے رازق کو نہیں پہچانتا اس کے پیچھے نماز ناجائز ہے۔“ (درج تصوف، ص ۱۶۳، بحوالہ تاریخ مشائخ نقشبندیہ، ص ۵۲)

دیکھا آپ نے اس سوال پر بٹطامی نے کتنی گرمی کھائی اور کیا مسکت جواب دیا۔ امید ہے اس امام نے زندگی بھر کچھ بھی ایسا سوال نہ کیا ہو گا۔ رہا نماز کا مسئلہ، تو ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کی پہلی نماز جو ام کے پیچھے پڑھی تھی، ہو گئی تھی۔ اگر پھر بھی آپ نے غصہ میں اعادہ فرمایا ہو تو کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔

عبد القادر جیلانی کا وضو

”ابوالفتح ہروی بیان کرتے ہیں کہ میں غوث اعظم کی خدمت میں چالیس سال تک رہا اور اس مدت میں میں نے آپ کو ہمیشہ عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔“ (ہجۃ الاسرار، ص ۵۹۔ قلابیو، ص ۶۶۔ اخبار الاخبار، ص ۱۷۔ جامع کرامات، ج ۲، ص ۲۰۱۔ نفحات الانس، ص ۱۷۸۔ طبقات الجبرلی، ج ۱، ص ۱۲۸۔ محفل نامہ گیارہویں شریعت، ۲۳۹۔ بحوالہ سیرت غوث، ص ۸۴)

اب دیکھتے ہروی صاحب کے اس بیان کو ۸ تذکرہ نگاروں نے نقل فرمایا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت نہایت ہی معتبر ہے، مگر یہی ضیاء اللہ قادری صاحب اپنی کتاب ”سیرت غوث“ کے صفحہ ۲۴ پر فرماتے ہیں کہ ”آپ کی اولاد کثرت قعدا میں تھی۔ اس اولاد میں سے صرف دس لڑکوں کے نام لکھے ہیں۔ اور یہ ان لڑکوں کے نام ہیں جو زیادہ مشہور ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی کل اولاد بیس چالیس سے کم کیا ہوگی۔ اب سوال یہ ہے کہ ان چالیس سال میں، جن میں آپ نے عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی

کوئی اولاد نہ ہوتی تھی۔ یا کسی بیوی کے پاس نہ گئے تھے؛ کیا اتنی کثیر تعداد میں اولاد والا شخص مسلسل چالیس سال تک اس فطری عمل سے رُک سکتا ہے۔ اسی ایک بات سے ان تذکرہ نگاروں کی روایتوں کی صحت کا بھرم کھل جاتا ہے۔ پھر قادری صاحب بھی بلا سوچے سمجھے حوالہ جات کا انبار لگائے چلے جاتے ہیں، مگر یہ نہیں سوچتے کہ اس کا امکان بھی ہے یا نہیں؟

”آپ ہر روز ایک ہزار رکعت نفل ادا فرماتے تھے۔“

(تفزیح الخاطر، ص ۲۶، بحوالہ سیرت غوث، ص ۸۵)

پیرانِ پیر کے نوافل

اب دیکھتے فطری حوائج، کھانا، پینا، سونا سب آپ کے ساتھ تھے۔ اس کے علاوہ پانچ فرض نمازیں جن پر تقریباً دو گھنٹے صرف ہو جاتے ہیں۔ پھر آپ کے مجالس وعظ بھی منعقد کیا کرتے اور درس دیا کرتے تھے۔ پھر آپ کثیر الاولاد ہونے کی وجہ سے آپ کے خانگی مسائل بھی بہت تھے۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ اگر فُل سپیڈ چرنفیوں والی نماز بھی ادا کی جائے، تو بھی اوسطاً ایک منٹ فی رکعت کے حساب سے ایک ہزار رکعت پر ۱۶ گھنٹے، ۲۰ منٹ صرف ہوتے ہیں اور دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں باقی صرف ۷ گھنٹے اور ۲۰ منٹ بچتے ہیں، ان میں مندرجہ بالا حوائج پورے ہو سکتے ہیں؟

”ان کی ریاضت کا یہ حال تھا کہ رات

بھی نہ سوتے اور جس دم کی یہ حالت تھی

شیخ محمد میر کی عبادتِ ریاضت

کہ ایک دم میں تمام رات گزر جاتی اور ایک ہفتہ کے بعد روزہ افطار ہوتا تھا اور کبھی بحالتِ جذبِ استغراق ایک ایک ماہ تک طعام کھانے کی نوبت نہ پہنچتی تھی۔“ (حدیقۃ الاولیاء، ص ۳۹)

مندرجہ بالا اقتباس میں ہم نے چار باتیں نشان زد کر دی ہیں جو سُنتِ نبوی کے خلاف ہیں۔ پھر یہ شریعت کی اتباع ہوتی یا جو گیانہ طریقِ ریاضت؟

شیخ شاہ محمد مشہور بہ ملا شاہ قادری اور اتباعِ سنت اپنے گھر میں کبھی کھانا نہ پکاتے اور نہ رات کو چراغ جلاتے، سوائے ایک بوری کے

کبھی فرش کے محتاج نہ ہوتے۔ ذکر اُن کا ہمیشہ جس دم کے ساتھ ہوتا۔ تمام عمر میں کبھی آنکھیں اُن کی نیند سے آستانہ ہوتیں اور نہ نکاح کیا۔ اور ہمیشہ یہ ان کی عادت میں داخل تھا کہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھتے اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ تمام عمر میں ہم کو غسلِ جنابت اور احتلام کی حاجت نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ دونوں غسل

نکاح اور بے سند سے متعلق ہیں اور ہم نے نہ تو نکاح کیا ہے اور نہ سوتے ہیں..... ان کا دیوان فارسی ان کی عمدہ تصانیف سے ہے اور ہر ایک شعر میں مضامین ”وحدتِ وجودی“ مترشح ہیں۔ ”مدیقتہ الاولیاء“ ص ۵۰

غرض ان کے ایسے واقعات کہاں تک پیش کئے جائیں۔ کوئی بزرگ و زائدہ صرف ایک چنے پر انکفا کرتے ہیں۔ کوئی ایسے ہیں کہ روزہ کی افطاری کے لئے غور و فیضان کو دی جاتی۔ جب ایک ماہ بعد گئے، تو ان کے حجرہ میں پوری تیس روٹیاں اسی طرح پڑی ہوئی تھیں۔ وغیرہ ذلک۔ کیا ایسے افعال و عبادات کا سنت سے کوئی تعلق ہے؟

۱۴۔ اکلِ حلال میں غلو کی حد تک احتیاط

اکلِ حلال کی اہمیت

اسلام میں اکلِ حلال کو بہت اہمیت حاصل ہے

حرام کھانے والے کی نہ نماز قبول ہوتی ہے، نہ صدقہ اور نہ دُعا۔ پھر مسلمانوں کو اس بات کی بھی تنبیہ کی گئی ہے کہ مشتبہ مال سے بھی پرہیز کیا جائے، کیونکہ جو انسان مشتبہ مال کو مباح سمجھنے لگے گا، تو پھر کسی وقت حرام مال کو مباح سمجھنے کے لئے گنجائش نکالنے لگے گا۔ لیکن اس احتیاط کی بھی ایک حد مقرر ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کو بلا تحقیق و تجسس یہ معلوم ہو جائے کہ یہ مال حرام ہے یا مشتبہ؟ اور اس کی مثالیں دو صحابہ، تابعین و تبع تابعین میں بکثرت ملتی ہیں۔

کسی مال کے متعلق تحقیق و تجسس سے معلوم کرنا کہ آیا یہ حلال ہے یا نہیں؟ ہم اس کے مکلف نہیں کہ ہم اس کی تحقیق و تجسس بھی کرتے پھریں۔ صحیح بخاری، کتاب التَّوْحِيد، باب السَّوَالِ بِأَسْمَاءِ اللّٰهِ، میں درج ذیل حدیث مذکور ہے:

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ
إِنَّ هَذَا أَقْوَامًا حَدِيثًا عَدَدَهُمْ بِشْرِكٍ
يَأْتُونَنَا بِلَحْمَانِ لَا نَدْرِي

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ لوگوں نے
حضرت اکرم ﷺ سے کہا: ”یا رسول اللہ ﷺ یہاں
چند ایسے آدمی ہیں (جو تو مسلم ہیں) ابھی اُن کا شرک کا نشانہ

يَذْكُرُونَ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا آمَرٌ
لَهُ، قَالَ: "اذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ
اللَّهُ وَكُلُوا" (بخاری، کتاب التوحید)

آپ ﷺ نے فرمایا تو اللہ کا نام لے کر کھے یا کر۔
حضور اکرم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ ان سے تحقیق کر لیا کرو۔ اشتباہ کے بجائے اباحت کے پہلو کو
محوظ رکھا۔ مزید پتلی کے لئے خود اللہ کا نام لینے کا حکم دیا۔

اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے ایک دو واقعات بھی ملاحظہ فرمائیے :

۱۔ ایک دفعہ سفر میں آپ ایک تالاب کے قریب اترے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے۔
انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ: "یہاں درندے تو پانی نہیں پیتے؟" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو روک دیا
کہ: "نہ بتانا" اس سے دو اصول ثابت ہوئے۔ ایک یہ کہ اصل اشیاء اباحت ہے۔ دوسرے یہ
کہ ظاہر حالت اگر صحیح ہے، تو تفحص اور جستجو پر ہم مکلف نہیں ہیں۔ (الفارق، شبلی، ص ۳۵، مطبوعہ مکتبہ المدینہ، لاہور)

۲۔ ایک دفعہ رمضان میں بدلی کی وجہ سے آفتاب کے چھپ جانے کا دھوکہ ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ
نے روزہ کھول دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آفتاب نکل آیا۔ لوگ متردد ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:
الْخَطْبُ يَسِيرٌ وَقَدْ اجْتَهَدْنَا
یعنی معاملہ چننا اہم نہیں۔ ہم اپنی طرف سے کوشش

(مؤطا امام محمد، ص ۱۸۲، بحوالہ ایضاً) کر چکے تھے۔

گویا مشتبہ مال سے بچنے کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ کسی چیز میں کرید کر کے اس کا پورا اتا پتہ لے کر اس سے
اطمینان کر لیا جائے۔ بلکہ اس کا یہ معنی ہے کہ ایک معین حرام چیز سے ملتی جلتی چیز سے بھی پرہیز کیا جائے۔
اگرچہ اس کے احکام واضح نہ ہوں۔ مثلاً سود حرام ہے، تو اس سے ملتی جلتی چیز مثلاً کمرشل انٹرسٹ بھی حرام
سمجھا جائے گا۔ یا اگر سود اور قمار دونوں حرام ہیں، تو بیمہ بھی حرام قرار دیا جائے گا۔ کیونکہ اس میں ان دونوں
چیزوں کا عنصر موجود ہے۔ یا اگر عورتوں کو موسیقی کی تعلیم دلانا حرام ہے، تو مردوں کے لیے بھی موسیقی یا
سماع جائز نہیں قرار پاسکتا، وغیرہ۔

حلت و حرمت کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ ایک شخص کی حرام کی کمائی اگر جائز طریقے سے دوسرے کی
طرف منتقل ہو جائے، تو دوسرے آدمی کے لئے حلال ہوگی۔ فقہی زبان میں اسے یوں بیان کیا جاتا ہے
کہ "ہاتھ کی تبدیلی سے احکام بدل جاتے ہیں۔" اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک آدمی سودی کاروبار کرتا ہے،

اب کوئی دوسرا آدمی اس کے ہاتھ کوئی چیز فروخت کر کے اس کی قیمت اس سے وصول کرتا ہے تو دوسرے آدمی کو خواہ یہ بات معلوم ہو کہ یہ شخص سودی کاروبار کرتا ہے، تب بھی وہ رقم اُس دوسرے آدمی کے لئے حلال متصور ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ دین کے اصول لوگوں کو مشکلات میں ڈالنے کے لئے نہیں ہیں۔

اب ان احکامات وارشادات کی روشنی میں ہم صوفیاء کے چند واقعات درج کریں گے اور دیکھیں گے کہ اگر یہ واقعات صحیح ہیں، تو انہیں اس شکل میں پڑنے کا کوئی جواز ہے بھی یا نہیں؛ اور اگر نہیں، تو کیا وہ اس ذیل میں نہیں آتے کہ:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ . اے نبی ﷺ ! تم اپنے پر وہ چیزیں کیوں حرام کہتے
اَللّٰهُ لَعَنَ (۶۶/۱) ہو، جو اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں۔

صوفیاء کی احتیاط

حضرت سفیان ثوریؒ

حضرت سفیان ثوریؒ کے متعلق تذکرہ نگار رقمطراز ہیں کہ:

”جب کوئی آپ کی دعوت کرتا، تو رد نہ کرتے، کیونکہ حدیث میں ہے، ”جو دعوت دے، اُسے قبول کر دے، لیکن روٹی اپنے گھر سے لے جاتے اور وہی کھاتے۔ صاحب خانہ کی دریافت پر فرماتے، تجھے اپنی روٹی کا حال معلوم ہے، مگر مجھے معلوم نہیں کہ حلال مال سے ہے یا حرام سے۔ مجھے اپنی روٹی کا علم ہے کہ حلال ہے۔ تیرے بلانے سے میں آگیا، لیکن روٹی اپنی کھائے گا۔“ (مقربان حق، ص ۶۵)

غور فرمائے دعوت قبول کرنے اور عمل بالحدیث کا یہی مطلب ہے۔ پھر جب محض شبہ کی بنا پر صاحب خانہ یا میرزا بن کو یہ جواب دے، تو اس کی کس قدر دل شکنی ہوتی ہوگی۔ جب صوفیاء کا یہ مقولہ بھی بہت مشہور ہے:

دل بدست آور کہ رج اکبر است

حضور اکرم ﷺ کا تو یہ اسوہ تھا کہ ایک دفعہ کسی دعوت پر سائے کا سارا سالن ختم کر دیا کہ اس میں نمک زیادہ تھا اور آپ کو یہ خیال آیا کہ کہیں سالن کی اس بد مزگی پر میرزا بن کی دل شکنی نہ ہو۔ لیکن حضرت سفیان ثوری کا یہ عمل بشرط صحت؛ امیرزا بن کو کس قدر بد دل کر دیتا ہوگا۔

حارث محاسبی

”نقل ہے کہ ایک روز آپ حضرت جنیدؒ کے پاس آئے۔ آپ مجھ کے تھے۔ حضرت جنیدؒ نے کہا، ”ایک شادی کے گھر سے کھانا

آیا ہوا ہے، چاہیں تو لاؤں۔“ پھر کھانا لائے۔ آپ نے لقمہ منہ میں ڈالا، لیکن حلق سے نہ اُترا۔ آخر اُگل دیا۔ یہاں تک کھا ہے کہ اگر مشتبہ کھانے میں ہاتھ ڈالتے، تو انگلیاں ٹیڑھی ہو جاتیں۔“ (مقرآن حق، ص ۱۸۲)

اب دیکھئے رسول اکرم ﷺ نے یہودیہ عورت کی (زہر آلود) بکری کا گوشت کھایا اور آپ کے صحابہؓ نے بھی۔ پھر آپ کو زہر کا احساس بھی اس وقت ہوا جب لقمہ منہ میں ڈال لیا آپ ﷺ کی مرض الموت میں اس زہر کو بھی دخل تھا۔ لیکن محاسبیؒ کی مشتبہ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھانے سے انگلیاں ہی ٹیڑھی ہو جاتی ہیں۔ (۲) اس مشتبہ کھانے کا حضرت جنیدؒ جیسے بلند پایہ ولی اللہ کو تو علم نہ ہو سکا لیکن حارث محاسبیؒ کے گلے سے اُترتا ہی نہیں فلحجبا

احمد بن حربؒ

”نقل ہے کہ ایک بار آپ کی والدہ شریفہ نے ایک مرغ ذبح کیا اور کہا: ”یہ مرغ میرے گھر کا پالا ہوا ہے۔ اس میں کچھ شک و شبہ نہیں۔

اے کھاؤ۔“ آپ نے کہا: ”یہ وہی مرغ تو ہے، جو ایک روز ہمارے کے کوٹھے پر چلا گیا اور وہاں سے دانے کھائے۔ یہ میرے لئے حلال نہیں۔“ (ایضاً، ص ۱۲۱۴)

غور فرماتے! اگر حلال و حرام کا یہی معیار قائم کیا جائے، تو دنیا میں کوئی چیز حلال ثابت کی جاسکتی ہے؛ اس معیار کے مطابق تو آپ نے جو کچھ زندگی بھر کھایا تھا، اس میں بھی شبہ کے بیسیوں پہلو نکل آتے ہیں۔

بلاتبصرہ

”نقل ہے کہ آپ کا ایک بیٹا دودھ شرب تھا۔ بزرگوں نے اس کی شکایت کی، فرمایا: ”اصل یہ ہے کہ ایک روز پڑوسی کے گھر سے کھانا آیا تھا، میں نے کھالیا۔ اسی رات

خلوت کا اتفاق ہوا جس سے یہ لڑکا پیدا ہوا۔ وہ کھانا پڑوسی کو بادشہ کے گھر سے ملا تھا۔ یہ اُسی کا اثر ہے۔ آپ دُعا فرمائیے۔ اللہ میری خطا معاف فرمائے۔“ (ایضاً، ص ۳۱۴)

امام ابن قیمؒ الیہ ”معتاط“ صوفیاء پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

امام ابن قیمؒ کا فتویٰ

”یا اتنا صوفی و پرہیزگار بنا پھرے کہ عام مسلمانوں کا کھانا طعام ہی ترک کر دے کہ مبادا اس کے اندر حرام و مشتبہ مال چلا جائے اور بعض علم سے کوئے اور جاہل صوفیاء وزہاد پر تو اس بیہودہ درج و پرہیزگاری کا جنون اس قدر سوار ہوا کہ اسلامی شہروں کی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز تک کو حرام و مشتبہ سمجھ کر مال دیتے اور نہ کھاتے مگر عیسائی

شہروں سے آئی ہوئی چیزوں کو حلال و طیب جان کر ڈکار جاتے۔ تو دیکھئے ان جاہل صوفیوں کو جاہل مفرط اور غالیانہ زہد نے ہی اہل اسلام سے بدظن کر دیا اور عیسائیوں کے حق میں حسن ظنی اور خوش فہمی کا بیج بویا۔
 (ذکر الہی، ص ۳۷، ترجمہ، والی الصیّب از ابن قیم)

۱۵۔ پھیلیوں کی زبان اور اسرار و رموز

قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے عوام الناس کی ہدایت کے لئے بھیجا تھا۔ لہذا یہ ٹھیکہ اور واضح عربی میں نازل کیا گیا۔ یہ کوئی پھیلیوں، معنوں اور رموز و نکات کی کتاب نہیں اور تبلیغ کے لئے یہی سب سے بڑی خوبی ہوئی چاہئے کہ وہ آسان اور عام فہم زبان میں ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے مطالعہ کے مختلف انداز اور مثالوں سے سمجھایا، تاکہ کوئی اُبھمن نہ رہے۔ رسول اکرم ﷺ کا بھی یہی طریق تبلیغ تھا، لیکن یہ صوفیاء عام فہم انداز سے ہٹ کر رموز و نکات کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

۱۔ وقت

”نقل ہے کہ حضرت حسن بصری جب وعظ کے لئے منبر پر کھڑے ہوتے، تو دیکھتے آیا رابعہ (بصریہ) موجود ہیں یا

حسن بصری کا واعظ

نہیں؟ اگر موجود ہوتیں، تو واعظ کہتے ورنہ منبر سے اُتر آتے۔ جب تک رابعہ مجلس میں نہ آتیں آپ وعظ نہ کہتے۔ ایک بار لوگوں نے کہا: ”کیا وجہ ہے کہ جب تک ایک ضعیفہ نہ آئے آپ وعظ نہیں کہتے حالانکہ لوگ بکثرت موجود ہوتے ہیں۔“ فرمایا، ”ہاتھیوں کی غذا چیونٹیوں کے آگے نہیں رکھی جاسکتی۔“ سبحان اللہ“
 (مقربان حق، ص ۳۶)

اب سوال یہ ہے کہ آپ تبلیغ لائقہ اچھوٹیوں کے لئے فرماتے تھے یا صرف ایک ہاتھی کے لئے؟ اگر ہاتھی کے لئے آپ وعظ کی غذا مہیا کرتے تھے، تو چیونٹیوں کو تکلیف دینے کی بھی کیا ضرورت تھی۔ ہاتھی کو وہ غذا اعلیٰ درجہ ہی دینا چاہئے جو چیونٹیوں کے کام کی نہیں۔ پھر یہ سوال چیونٹی اور ہاتھی کا نہیں بلکہ چیونٹے اور مٹھنی کا ہے۔ اگر

رابعہ بصری، حسن بصری سے پردہ نہیں کرتی تھیں تو یہ ویسے خلاف شرع ہے اور اگر کرتی تھیں، تو پھر حسن بصری کو یہ کیونکر معلوم ہوتا تھا کہ وہ اب تک تشریف لائی ہیں یا نہیں؟

اور اس سے بھی بڑا سوال یہ ہے کہ آیا حسن بصری اور رابعہ بصری کی ملاقات بھی ثابت ہے یا نہیں۔
حضرت حسن بصری کا سن وفات بالاتفاق '۱۱۰ھ' ہے اور رابعہ بصری کا سن پیدائش بقول بعضے '۹۹ھ' اور بقول بعضے '۹۵ھ' ہے۔ رابعہ بصری کو بچپن ہی میں کسی نے پکڑ کر فروخت کر دیا تھا۔ ان کی پاک طینت نے خرایدار کے دل میں رحم ڈالا اور اس نے رابعہ بصریہ کو رہا کر دیا۔ (دائرة المعارف، ج ۱۰، ص ۹۲) ان حالات میں یہ واقع ہی سرے سے تراشا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں رابعہ بصریہ کے بڑا بونے کا ذکر ہے اور یہ مسئلہ محال ہے۔

”نقل ہے کہ ایک بار آپ نے کسی کو چار
سودرہم دئے تاکہ کبل لاوے۔ اس

رابعہ بصریہ اور گوئے کالے کا فلسفہ

نے پوچھا: ”کالا کبل لاؤں یا سفید؟“ آپ نے سنا اور درہم واپس لے کر دجلہ میں ڈال دیئے، فرمایا ”اسباب دنیا سرسرفاد ہے، کبل ابھی خریدا نہیں کہ کالے اور سفید کا تفرقہ شروع ہو گیا۔“ اللہ اللہ!“ (مقربان حق، ص ۴۸)
دیکھا آپ نے، جو حضور اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا کہ سفید کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں۔ ”تو یہ مسئلہ کس خوبی سے حل کیا جا رہا ہے۔ آپ نے چار سودرہم تو دیر بزد کر دیئے تاہم یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل فرمادیا۔

”نقل ہے کہ حضرت احمد خضرویہ کے پاس ایک
درویش بطور مہمان آئے۔ ان کے ساتھ ستر اور درویش

احمد خضرویہ کی مہمان نوازی

تھے۔ آپ نے ان کی خاطر ستر شمعیں روشن کیں۔ انہوں نے کہا یہ کیا اسراف ہے؟ آپ نے فرمایا: ”میں نے آپ کی عزت و ضائے الہی کے لئے کی۔ کیونکہ حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ مہمان فرستادہ خدا ہوتا ہے اس کی عزت بڑھ کر کرنی چاہئے۔ آپ اُٹھتے اور جش مع کو میں نے خدا کے لئے روشن نہ کیا ہو اُسے بٹھا دیجئے۔ انہوں نے شمعوں کو بجھانا اور اُن پر خاک ڈالنا شروع کیا مگر نہ بٹھا سکے۔ صبح ہوئی تو بہت متعجب تھے۔ آپ نے اُن سے کہا آئے! ہمیں ایک اور عجیب چیز دکھائیں۔ درویش یہ سن کر ساتھ ہو لیا۔ آپ اس کو لے کر باہر تشریف لائے۔ جب ایک کھٹکے پاس پہنچے، تو دروازہ پر ایک اہب کو بیٹھے پایا۔ اُس نے آپ کو دیکھا اور کہا: ”اند تشریف لائے۔“ پھر دسترخوان بچھا کر عمدہ کھانے رکھے اور کہا ”تناول فرمائیے۔“

آپ نے فرمایا: ”دوست، دشمن کے ساتھ نہیں کھایا کرتے۔“ اس نے کہا: ”تو مجھے بھی دوست بنالئے۔“ میں آپ سے محبت رکھتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا اور اس کے گھر کے ستر آدمی اُنسی وقت مسلمان ہو گئے۔ آپ نے اس درویش سے فرمایا: ”میں نے خدا کے لئے ستر شمعیں روشن کی تھیں۔ خدا نے مجھے یہ شرف بخشا کہ اس نے میرے ہاتھ ستر گھر ہوں کے دلوں کو نور ایمان سے روشن کر دیا۔“ (مترجمین حق)

اس واقعہ سے مندرجہ ذیل نکات مل جاتے ہیں:

- ۱۔ حضور اکرم ﷺ کے ارشاد: ”ہمان کی تکبیر“ سے مراد اس کے لئے الگ شمع جلاتا ہے۔ خدا کی عطا اور کی خوشنودی کا یہی طریقہ ہے۔
 - ۲۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ایسی شمع کسی کے بجائے مجھ نہیں سکتی، خواہ اُن پر مٹی بھی ڈالی جائے۔
 - ۳۔ ایسی شمعیں جلاتے سے مزید اسرارِ ربی کھلتے ہیں اور شمعیں کسی کا فرائضِ ظلمت کدہ کو باکِ منظور کرتی ہیں۔
 - ۴۔ ہمانوں اور شمعوں کے ساتھ پُر تکلف کھانوں کا تعلق بھی ہوتا تو ہے، لیکن وہ کسی اور جگہ ہوتا ہے۔
 - ۵۔ راہب تو تارک دنیا ہوتے ہیں۔ پھر یہ راہب بیٹھا بھی کلیسا کے دروازے پر تھا اس کے گھر کے ستر آدمی کہاں سے آگئے؟ اگر اس کے گھر ستر آدمی واقعہ تھے اور وہ ان سے معاشرتی تعلقات بھی رکھتا تھا، تو وہ یقیناً راہب نہیں تھا۔
 - ۶۔ امید ہے کہ اس راہب کے مسلمان ہونے کے بعد آپ نے اور آپ کے ساتھی درویش نے اس کا پکا ہوا کھانا تو کھا ہی لیا ہوگا۔
- اب دیکھئے باطل ایسا ہی واقعہ شبلی اور ابو حفص کے درمیان بھی پیش آیا تھا۔ وہاں بھی چالیس ہمانوں کے لئے چالیس شمعیں تو جلیں جو مجھ نہ سکیں اور پُر تکلف کھانوں کا تعلق بھی تھا مگر ان شمعوں کے کسی ظلمت کدہ کو منظور کرنے کا وہاں ذکر نہیں۔ (مترجمین حق، ص ۱۵۲) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ احمد خضر و شبلی سے بہت بلند درجہ کے ولی تھے۔

”ایک روز
آپ نے

سری سقطی (م ۲۵۰) کا خواب اور حضرت یعقوب رحمۃ اللہ علیہ

خواب میں حضرت یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا، کہا: ”اے جدِ پیغمبر! دنیا میں گرفتارِ عشقِ یوسف ہو کر کیا شو و فغاں پیدا کر دیا۔ عشقِ یوسف کے ساتھ عشقِ حق کس طرح جمع ہو سکتا ہے؟“ ”غیبِ خدا آئی۔“ سری!

خاموش رہ۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے جمال جہاں آراء کو دیکھ۔ جو نبی جلال یوسف کو دیکھا، غش کھا کر گر پڑے۔ تیسرے روز ہوش میں آئے۔ پھر ندائے غیبی آئی: ”سری! یہ اس شخص کی سرا ہے جو ملکین خدا کو لامت کرتا ہے۔“ (غزینۃ الصفاء، ص ۱۳۲)

اس روایت کو بار بار پڑھئے اور بتلاتے کہ:

۱ حضرت یعقوب علیہ السلام عاشق یوسف تھے یا عاشق حق؟ دونوں باتیں تو بہر حال جمع نہیں ہو سکتیں جو سری سقطی کا اصل اعتراض تھا۔

۲ دوبار ندائے غیبی آئی۔ پہلی ندائے غیبی کے ساتھ سری سقطی کو حضرت یوسف علیہ السلام کے جمال جہاں آرا کا دیدار بھی کرا دیا گیا۔ پھر بھی سری سقطی کو تین دن بے ہوش کر کے اور زبردستی سرا دے کر چپ کرا دیا گیا حالانکہ سری صاحب کا اعتراض پھر بھی جوں کا توں قائم رہا۔

”شبلی سے زہد کے متعلق سوال کیا گیا، تو فرمایا: ”درحقیقت زہد کہیں بھی نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ یا تو انسان اس چیز سے زہد اختیار کرے گا جو اس کی ملکیت ہی نہیں یا اس چیز سے زہد اختیار کرے گا، جو اس کے لئے ہے۔ لہذا انسان یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ اس نے زہد کیا۔ حالانکہ وہ خیر (یعنی دنیا) اس کے ساتھ اور اس کے پاس ہر وقت موجود رہتی ہے لہذا یہ نفس انسانی کی ڈیجک، سخاوت اور غمخواری کے سوا کچھ نہیں ہے۔“ (تعرف، ص ۱۳۲)

فرماتے کچھ سمجھے آپ کہ زہد کیا ہے؟ اگر زہد ہم کی کوئی چیز دنیا میں موجود نہیں، تو قرون اولیٰ کے صالحین جنہیں زہاد کہا جاتا تھا، وہ کیا تھے؟

غرض ان صوفیاء نے معاملات اور اخلاقیات میں کچھ اس طرح سے افراط و تفریط یا غلو سے کام لیا کہ۔

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

والی بات بن جاتی ہے۔

ب۔ اخلاقِ حسنہ کی تعریفیں

اب ہم صوفیاء کی مشہور اور مستند کتاب ”العرف“ سے اخلاقیات سے متعلق کچھ اقوال پیش کریں گے جن کی صورت بعینہ وہی ہے، جو ہم نے بیان کی ہے:

صبر: کسی ایک صوفی نے کہا ہے: ”اس نے صبر میں صبر کے ساتھ مقابلہ کیا یہاں تک کہ صبر کا

اٹھا۔ فریاد۔ اور صابر نے پکار کر کہا اے صبر! صبر کرو۔“ (تعرف، ص ۱۴۳)

شکر : ایک بڑے صوفی کا قول ہے : ”انعام کنندہ کو نگاہ میں رکھتے ہوئے شکر کو بھول جانا شکر ہے۔“ (تعرف، ص ۱۵۴)

تقویٰ : سہل تسری فرماتے ہیں : ”اللہ کی طرف مائل ہونے کی مقدار کے مطابق احوال کا مشاہدہ کرنا تقویٰ ہے۔“ (تعرف، ص ۱۵۱)

۲ : سہل تسری فرماتے ہیں : ”تقوے سے مراد اوروں سے بیزاری ہے اور یہی اخلاص ہے۔“ (تعرف، ص ۱۵۱)

توکل : سری سقطی فرماتے ہیں : ”توکل یہ ہے کہ تو اپنی معصیت سے نکلنے کی قدرت اور نیک کام کرنے کی طاقت سے علیحدگی اختیار کرے۔“ (تعرف، ص ۱۵۵)

۲ : بقول کسی بڑے صوفی کے اس کا مفہوم یہ ہے : ”توکل کی حقیقت ترکِ توکل ہے اور یہ اس طرح ہے کہ اللہ ان کے لئے ایسا ہو جیسا اس وقت تھا۔ جب وہ موجود نہ تھے۔“ (تعرف، ص ۱۵۶)

اخلاص : ابویقوب سوسی فرماتے ہیں : ”خالص عمل وہ ہے جس کا فرشتے تک کو پتہ نہ ہو کہ کھ سکے او نہ شیطان کو خبر ہو کہ اسے خراب کر سکے اور نہ نفس کو پتہ ہو کہ اس پر فخر کر سکے۔“ (تعرف، ص ۱۵۳)

رضا : سفیان ثوری نے رابعی کی موجودگی میں کہا : ”خدایا ! تو مجھ سے راضی ہو جا۔“ اس پر رابعی نے اسے کہا : ”کیا تجھے اُس خدا سے رضامندی طلب کرتے ہوئے شرم نہیں آتی، جس سے تو راضی نہیں ہے۔“ (تعرف، ص ۱۵۷)

یقین : نوری فرماتے ہیں : ”یقین مشاہدہ کا نام ہے۔“ اور سہل فرماتے ہیں : ”یقین پردے کے کھل جانے کا نام ہے۔“ (تعرف، ص ۱۵۹)

ذکر : جنید فرماتے ہیں : ”جس نے اللہ کے مشاہدہ کے بغیر اللہ کہا وہ مفتری ہے۔ ایک اور کہتا ہے : ”دل کا کام مشاہدہ کرنا ہے اور زبان کا کام اس مشاہدہ کو بیان کرنا ہے۔ لہذا جس نے مشاہدہ کے بغیر بیان کیا وہ جھوٹا ہے۔“ (تعرف، ص ۱۶۲)

قرب : کسی نے کہا ہے : ”قرب یہ ہے کہ تو اس کے ان افعال کا مشاہدہ کرے، جو تمہارے ساتھ پیش آرہے ہیں۔“ (تعرف، ص ۱۶۷)

تصوف اور کسبِ حلال : ”میں نے ابوالکھین محمد بن احمد فارسی کو کہتے سنا ہے کہ ”تصوف کے دس ارکان ہیں۔ پہلا رکن تجربہ توحید ہے۔ پھر سماع کا سمجھنا، حسن معاشرت، ایثار الایثار، ترک اختیار، سرعت وجد، دلوں کی باتوں کا ظاہر کرنا، روزی نہ لکنا اور نہ ذخیرہ کرنا۔ (تغزب ۱۳۵)

ج۔ ایمان اور ارکانِ اسلام کے اسرار و رموز

اب اسرار و رموز کی تیسری قسم ملاحظہ فرمائیے۔ مشہور تصوف عبدالکَریم جلی صاحب ارکانِ اسلام کے رموز اور باطنی معنی سمجھا رہے ہیں :

اسرارِ کلمہ شہادت : جاننا چاہتے کہ کلمہ شہادت بھی دو اموروں پر مبنی ہے۔ ایک ’سلب‘ اور وہ ’لا‘ ہے۔ دوسرے ’ایجاب‘ اور وہ ’لا‘ ہے۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ سوائے اللہ کے کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ اور لفظ ’اللہ‘ سے مراد یہ بت ہیں جن کی وہ عبادت کرتے ہیں۔ اور یہ بہ سبب ان کے اس سر وجود کے جو ان کی ذوات میں ہے۔ اُن کی موافقت ہے۔ پس وہ بوجہ خود سچے معبود ہیں.... اس لئے کہ اللہ تعالیٰ عین اس کا ہے اور وہ اللہ جس طرح بھی ظاہر ہوا، الوہیت کا مستحق ہے۔ پھر اس نے اپنے قول الا اللہ میں ان سب کو ایک بنا دیا ہے۔ یعنی یہ معبود سوائے ایک اللہ کے کچھ نہیں ہیں۔ یا یوں کہو کہ یہ معبود غیر اللہ نہیں ہیں۔ پس نہ عبادت کرو تم مگر بطور اطلاق ایک اللہ کی۔ نہ کسی جہت کی قید لگا کر اس لئے کہ ذاتِ حق ہی تمام جہتیں ہیں اور سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی چیز کا وجود نہیں ہے۔“ (انسان کامل،

ص ۱۳۲)

اسرارِ طہارت اور نماز : نماز سے مراد حق تعالیٰ کی واحدیت ہے اور اس کی اقامت سے تمام اسماء و صفات سے متصف ہو کر ناموس و حدیث کی اقامت کی طرف اشارہ ہے اور طہارت سے مراد نقائص کو نیسہ سے پاک ہونا ہے اور اس میں پانی کی شرط، اس بات کی طرف اشارہ کہ نقائص کو نیسہ زائل نہیں ہوتے۔ مگر آثارِ صفاتِ الہیہ کے ظہور سے کہ وجود کی زندگی میں اور پانی میں بھی زندگی کا راز رکھا گیا ہے اور ضرورتِ تہجیم کا طہارت کے قائم مقام ہونا مخالفت، مجاہدات، ریاضات کے ذریعہ نفس کو پاک کرنے کی طرف اشارہ ہے۔“ (ص ۳۳۶) پھر اسی طرح مصنف صاحب نے نماز کے تمام ارکان و افعال مثلاً تکبیر تحریمہ، سورۃ فاتحہ کی قرأت، رکوع، قومہ، سجدہ، جلسہ، التیمات وغیرہ سب کو اسرار و رموز کی زبان میں

بیان فرمایا ہے۔

اسرارِ زکوٰۃ : اور زکوٰۃ یہ ہے کہ بعد تزکیہ کے حق کو خلق پر ترجیح دے یعنی وجود میں شہودِ حق کو شہودِ خلق پر ترجیح دے باقی رہا نقدی کا اس میں چالیسواں حصہ ہونا۔ سو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وجود کے چالیس مرتبہ ہیں اور مطلوب مرتبہ الہیہ ہے اور وہ مرتبہ علیا ہے اور چالیس میں سے ایک ہے۔ “ (انسانِ کامل، ص ۴۳۷)

اسرارِ صوم : روزہ بشری خواہشات (یعنی کھانا، پینا، سونا، جنسی اور معاشرتی تعلقات) کے رواں کرنے سے نفس کو موکھنے کا نام ہے۔ تاکہ وہ خلعتِ حمدیہ الہیہ سے متصف ہو۔ علی قدرِ اقتناعِ نفس، آثارِ حقِ نفس میں ظاہر ہوتے ہیں اور روزوں کا ایک ماہ کامل تک ہونا اس بات کی ضرورت کی طرف اشارہ ہے کہ زندگی بھر تک نفس کو خواہشاتِ نفسانی سے روک رکھنا چاہئے۔ یہ خیال نہ کہے کہ میں اب اصلِ حق ہو گیا ہوں۔ مقصدِ نبی بشری کے چھوٹنے کی کیا ضرورت ہے۔ “ (انسانِ کامل، ص ۴۳۷)

رموزِ حج : حج سے اشارہ طلبِ الہی میں مدامِ کمر بستہ ہونے کی طرف ہے اور احرام سے اشارہ شہودِ مخلوق کا ترک کر دینا ہے اور سچے ہوئے کپڑے کے ترک کرنے سے اشارہ ریاستِ بشریہ کے ترک کرنے کی طرف ہے اور ناخن کٹوانے کے ترک سے اشارہ ان فلوں میں، جو اس سے صادر ہوں، خدا کے فعل کا مشاہدہ کرنا ہے۔ پھر نماز کی طرح حج کے بھی تمام ارکان و افعال مثلاً خوشبو کا ترک کرنا، نکاح کا ترک کرنا، سر سے کو ترک کرنا کے اشارے بتلاتے ہیں۔ بعد میں ملاوٹ بتلانا شرموع کر دیا ہے۔ مثلاً میقاتِ قلب سے مراد ہے مکہ مرتبہ الہیہ سے مراد ہے۔ پھر کعبہ، حجرِ اسود، طواف، طوافِ کعبہ بعد نوافل، سعی، سر منڈانا وغیرہ سب کی یا ملاوٹ بتلادی ہیں یا اشارے بیان فرماتے ہیں۔ “ (ص ۴۳۸، ۴۳۹)

رموزِ ایمانی : ایمان عالمِ غیب سے کشف کا پہلا مرتبہ ہے اور وہ سواری ہے، جو سوار کو مقاماتِ علیہ تک پہنچاتی ہے اور مشاہدہ منہ کی سیر کراتی ہے اور وہ اس چیز کے ساتھ قلب کی موافقت سے مراد ہے جس کا ادراک حاصل سے بعید ہے جو چیز عقل سے معلوم کی جاتی ہے اس کے ساتھ دل کی موافقت کا نام ایمان نہیں ہے، بلکہ وہ علمِ نظری ہے جو شہودِ دلائل سے حاصل کیا جاتا ہے پس وہ ایمان میں داخل نہیں ہے۔ “ (انسانِ کامل، ص ۴۴۰)

آستانے اور مزارات

توحید کیا ہے؟ وہی الہی ہیں یہ بتلاتی ہے کہ اس کائنات کا خالق، ملک، رازق صرف ایک اللہ ہے۔ وہی اکیلا اس نظام کو چلا رہا ہے۔ اور اسے اس نظام کائنات کو چلانے میں کسی دوسرے کی احتیاج نہیں اور نہ ہی یہ ممکن ہے اور کائنات کی ہر چیز اس کے تابع فرمان ہے۔ البتہ انسان اور جن کو کسی حد تک اختیار دیا گیا ہے، کہ وہ چاہے تو خدا کی ہدایت کو تسلیم کر کے دنیوی اور اخروی کامیابی حاصل کرے اور چاہے تو نافرمان رہے۔ اس آسمانی ہدایت کو بدل و جان تسلیم کر لینے کا نام ہی اسلام ہے جس کا آغاز ایک اقرار ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ سے ہوتا ہے۔ یعنی ”تمام کائنات میں اللہ کے سوا کوئی عباد کے لائق نہیں۔“

شرک فی العبادات عبادت، بندگی اور غلامی کو کہتے ہیں۔ تو جس طرح ایک غلام ہر حالت میں اپنے آقا کے لطف و کرم کا محتاج ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان کو چاہئے کہ ہر حال میں اسی کے لطف و کرم کا محتاج رہے۔ اس کے احکام کی برضا و رغبت تعمیل کرے۔ تکلیف ہو تو صرف اسے پکارے اور کوئی ضرورت ہو تو صرف اس کے سامنے پیش کرے، اسی سے دُعا کرے، اسی سے مدد طلب کرے، اسی سے فریاد کرے، اسی سے ڈرے اور اسی سے امید رکھے اور یہ بھروسہ بھی رکھے کہ وہ آقا و مالک ہر دُعا، التجا اور فریاد کو ہر وقت سنتا اور اس کی تکلیف کو دور کرنے یا ضرورت پوری کرنے پر قادر ہے۔ العزیز وہ اختیاری امور جن میں انسان سے اطاعت کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہیں :

انابث (رجوع)، اطاعت، محبت، خضوع، توکل، دُعا، استعانت، خوف، امید، قربانی، تذرو نیاز اور اس کے گھر (کعبۃ اللہ) کا طواف شمار اللہ کی تعظیم اور اس کے لطف و کرم پر مکمل اعتماد۔

اب اگر ان مندرجہ بالا امور میں سے کوئی کام یا ساری باتیں اللہ کے سوا کسی دوسرے شخص میں یا مقام معین میں تسلیم کرے یا اس کی طرف رجوع کرے گا تو اسی چیز کا نام شرک ہے۔ گویا اس نے خدا کی خدائی یا تصرف و

اختیار میں کسی دوسرے کو بھی شریک سمجھ لیا ہے۔ اور یہ گناہ ناقابل معافی ہے خواہ وہ کسی مسلمان سے سرزد ہو یا کافر۔
اب دینِ طریقت کے نظریات پر غور فرمائیے :

دینِ طریقت کے اثرات

جس انسان کے بدن میں خدا حلول کر گیا، وہ تو خدا ہی بن گیا۔ اور اس کو ماننے والے اس انسان کے بیماری یا عبادت گزار۔ اب جتنے انسانوں کے وجود میں خدا حلول کر چکا ہے، خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ سب خدا ہی ہیں۔

اسی طرح کسی مذہب سے تعلق رکھنے والا کوئی انسان خدا کی ذات میں غم یا فانی اللہ ہو جاتا ہے تو وہ بھی ۷ مردانِ خدا، خدا بنائند لیکن ز خدا جدا بنائند

ترجمہ : خدا کے بندے خدا تو نہیں ہوتے، لیکن خدا سے الگ بھی نہیں ہوتے،
کے مصداق ان کے فانی اللہ ہونے کے باوجود ان کے مادی جسم خداؤں کی صورت میں موجود ہوتے ہیں۔ اور ان کے متقدمین ۱۰ ان کے بیماری اور عبادت گزار۔

اور وحدت الوجود کے نظریے نے ہر چیز کو خدا کا حصہ قرار دے دیا۔ آپ بھی خدا ہیں اور میں بھی خدا، اب عبادت تم میری کرو گے یا میں تمہاری کروں؛ لیکن انسان کے اندر ایک داعیہ ہے، جو اسے صیبت کے وقت کسی نہ کسی کو پکارنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ پھر ان لوگوں نے جس سے کوئی بھلائی دیکھی۔ دوسری چیزوں کو چھوڑ کر بس اسی کو پکارا اور اس کے آگے تسلیم غم کر دیا۔ گویا وہ انسان جس کو خدا نے اشرف المخلوقات بنا کر یہ کہا تھا کہ صرف میرے سامنے جھکنا، باقی تمام کائنات کے تم سردار ہو۔ اس انسان نے خود کو اتنا ذلیل کر دیا کہ ہر چیز کو خدا سمجھ لیا اور ہر چیز کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔ یہ ہے ہمارے راہبوں اور پیروں کی تعلیم جس نے انسان کو قسم قسم کے شرک میں مبتلا کر کے اتنا ذلیل کر دیا۔

اسی وحدت الوجود کے نظریے سے مظاہر پرستی کا آغاز ہوا۔ کسی قوم نے سورج کی پرستش کی، کسی نے آگ کی، کسی نے فرشتوں کی، کسی نے درختوں، پتھروں اور حیوانوں کی اور کسی نے پیرن فیروں کی یا ان کے آتالوں کی، کسی نے ان کے محبوں کی، تو کبھی نے ان کی قبروں کی پرستش شروع کر دی۔ گویا جن باتوں سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو منع فرمایا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو ماننے کے باوجود سب شکر کیہ افعال دوسری چیزوں کے حضور سجالاتے رہے۔
قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قبر پرستی اور بُت پرستی اور قبر پرستی کی ابتداء

بُت پرستی کا وجود حضرت نوح علیہ السلام سے بھی بہت

پہلے اس دنیا میں پایا جاتا تھا۔ جب حضرت نوح نے اس قوم سے کہا کہ شرک اور بت پرستی سے باز آؤ، تو کہنے لگے:

وَقَالُوا لَا تَذَرُنَا آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَا
وَدَّاءُ وَلَا سَوَاعَا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا (۹۶)

اس کی تفسیر میں امام بخاری حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کرتے ہیں (ملا وہ ازیں یہ روایت

احمد، مسلم، نسائی میں بھی مذکور ہے)

یہ سب (وَدَّاءُ، سَوَاعَا، یَغُوثَ، یَعُوقَ، نَسْرًا) قوم نوح کے اولیاء اللہ تھے۔ جب وہ مر گئے، تو لوگ ان کی قبروں پر استکاف کرنے لگے۔ پھر ان کے مجسمے بنائے امدان کی عبادت کرنے لگے۔ پھر یہی بت عرب کے قَبَائِلِ الْعَرَبِ (صحیح بخاری و مکتب تفسیر) قَبَائِلِ میں پھیل گئے۔

اس حدیث سے دو باتیں واضح ہوئیں۔

۱۔ شرک کا تعلق "اولیاء اللہ" قوم کے لوگوں سے ہوتا ہے۔

۲۔ بت پرستی کا پہلا زینہ قبروں پر استکاف بیٹھنا ہے۔ خواہ یہ وقتی طور پر ہو یا چلہ کشی کی صورت میں۔

اور یہی دونوں چیزیں "یعنی پیر پرستی اور قبر پرستی" آج بھی مسلمانوں میں عموماً اور دین طریقت کے پیروکاروں یا جو دیلوں میں بالخصوص رائج ہیں۔ لہذا ہم ان پر ذرا تفصیل سے بحث کریں گے۔

یہ آستانے اور درگاہیں

پیر پرستی سے مراد اپنے پیر کی بلا دلیل شرعی یعنی غیر

غیر مشروط اطاعت ہی خدائی کا دعویٰ ہے

مشروط اطاعت ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ:

اتَّخِذُوا أَحِبَّارَهُمْ وَرُهَبَانَهُمْ أَوْلِيَاءَ
مِّنْ دُونِ اللَّهِ (۹۶)

ان (اہل کتاب) نے اپنے مالوں اور پیروں کو اللہ کے سوا بت بنایا۔

تو صدی بن مام نے حضور اکرم ﷺ سے استفسار کیا کہ یہ رب بنانا کیا ہے؟ ہم ان کی پرستش تو

نہیں کرتے تھے آپ نے فرمایا: ”کیا تم لوگ اُن کی باتیں بلا دلیل تسلیم نہیں کر لیتے تھے؟“ عدی بن قحط نے کہا: ”ہاں! یہ تو کرتے تھے۔“ تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ”رب بنانے سے یہی مراد ہے۔“ (تفسیر ابواب التفسیر، سورۃ توبہ)

ہم پچھلے صفحات میں کئی اقتباسات سے یہ واضح کر آئے ہیں کہ یہ لوگ کس طرح اپنے نوار دمردوں کو صوفیہ مشروط اطاعت کی شرط پر بیعت کرتے ہیں۔ بلکہ ان سے اپنا کلمہ بھی پڑھواتے ہیں اور اس طرح انہیں اپنی پستش کی تاکید کرتے ہیں۔ وہ مریدوں کو اس بات کی بھی تلقین کرتے ہیں کہ ہر مرید اپنے پیر کو ہر وقت ذہن میں رکھے۔ حتیٰ کہ مرید اس ریاضت میں اتنا پختہ ہو جائے کہ جب کبھی اور جہاں کہیں سے بھی مرید، پیر کو یاد کرے یا پکارے تو اسے پیر کی شکل سامنے نظر آنے لگے اور صورتِ حال یہ ہو کہ

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار جب درگردن جھکائی دیکھ لی

اس کیفیت کو ان لوگوں کی اصطلاح میں تصوّرِ شیخ اور اس کی پختہ حالت کو فنا فی الشیخ کہا جاتا ہے۔

مشہور اور صحیح حدیث جبریل کا آخری حصہ یہ ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے حضور اکرم ﷺ سے پوچھا کہ ”احسان کیا ہے؟“ تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ”احسان یہ ہے کہ تو خدا کی ایسے عبادت کرے جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو کم از کم اتنا تو سمجھے کہ خدا تجھے دیکھ رہا ہے۔“

اب دیکھ لیجئے یہ لوگ کس طرح خدا سے بھی زیادہ اپنی پستش کی تاکید کرتے ہیں۔ اب درج ذیل اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیے، جو تصوّرِ شیخ، نداء لغیر اللہ، توسل اور استمداد جیسے سب مسائل حل کر دیتا ہے۔ اس کے راوی جناب اعلیٰ حضرت رضا خان بریلوی ہیں:

نداء لغیر اللہ، توسل اور استمداد

”غالباً حقیقتہً ندیہ میں ہے کہ ”ایک مرتبہ حضرت سیدی عنید بغدادیؒ دجلہ پر شریف لائے اور یا اللہ کہتے ہوئے

اس پر زمین کی طرح چلنا شروع کر دیا۔ بعد میں ایک شخص آیا، اسے بھی پار جانے کی ضرورت تھی۔ کوئی کشتی اس وقت موجود نہ تھی۔ جب اس نے حضرت کو جانے دیکھا، عرض کیا میں کس طرح آؤں؟ فرمایا یا عنید! یا عنید! کہتا چلا آ۔ اس نے یہی کہا اور دریا پر زمین کی طرح چلنے لگا۔ جب بیچ دریا میں پہنچا شیطان لعین نے دل میں دوسو ڈالا کہ حضرت غم تو یا اللہ کہیں اور مجھ سے یا عنید کہلاتے ہیں۔ میں بھی یا اللہ کیوں نہ کہوں۔ اہا نے یا اللہ کہا اور ساتھ ہی غوطہ کھایا۔ پکارا حضرت! میں چلا۔ فرمایا ”وہی کہہ یا عنید یا عنید!“ جب کہا، دریا

سے پار ہوا۔ عرض کی حضرت یہ کیا بات تھی۔ آپ اللہ بھیں، تو پار ہوں اور میں کہوں تو غوطہ کھاؤں۔ فرمایا: ”اے نادان! اسی توجنید تک تو پہنچا نہیں، اللہ تک سائی کی ہو س ہے، اللہ اکبر۔“ (مفوظات مجددانہ)

حضرت اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی ص ۱۱۰

دیکھا آپ نے پیر کو وسیلہ پلانے کی کتنی زبردست دلیل ہے، جو امام اہل سنت، موجودہ صدی کے مجدد اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں ”قابلاً حقیقہ ندیہ“ کے حوالہ سے پیش فرما رہے ہیں۔ اور واقعہ بھی ایسا لا جواب گھڑا ہے کہ اس بیچارے کو تسلیم کرنا پڑا کہ میرا اللہ کو پکارنا واقعی شیطانی دوسرہ تھا۔ وہ بیچارہ تو یہ خیال کر بیٹھا ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا تھا:

وَإِذَا سَأَلَ عِبَادِي عَنِّي

فَأِنِّي قَرِيبٌ

اور جب آپ سے میرے میرے بارے میں دریافت کریں تو کہہ میں (تم سے) پاس ہوں۔ (۲۱/۸۶)

اس کی سبب تلاوت ہی کافی ہے بلکہ دنیا میں یہ باتیں کام نہیں آتیں۔

اب پیر صاحب کی خدائی میں بس ایک سجدہ کرنے کی کسر رہ جاتی ہے، تو اس سے متعلق تصحیح ذیل اقباس ملاحظہ فرمائیے:

تعمیمی اور نظام الدین اولیاء

”حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی بارگاہ میں پھر کچھ دیر اس بارے میں گفتگو رہی کہ مرید حضرت

مخدوم کی خدمت میں آتے ہیں۔ آپ کے سامنے زمین پر سر رکھتے ہیں۔ حضرت خواجہ نے، اللہ کا آپ کا

ذکر بھلائی سے کرے۔ فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ لوگوں کو اس سے منع کروں۔ لیکن چونکہ میں نے اپنے شیخ

(شیخ الاسلام فرید الدین) کے سامنے اسی طرح کیا ہے۔ اس لئے میں منع نہیں کرتا۔ اس پر بندے نے عرض

کیا کہ وہ لوگ جو حضرت مخدوم کی ذات سے وابستہ ہیں۔ وہ آپ کے ارادہ مند ہیں اور آپ انہوں نے بیعت

کی ہے، تو ان کی یہ ارادت و بیعت عبارت ہے پیر کے ساتھ عشق و محبت سے پس جہاں عشق و محبت

ہوگی زمین پر سر رکھنا ایک سہل کام ہے۔ حضرت خواجہ نے، اللہ آپ کا ذکر بھلائی سے کرے، میری اس

بات کی مداخلت میں فرمایا کہ ایک دفعہ ایک اے میں شیخ ابوسعید البواخیر ایک گھوڑے پر سوار جا رہے تھے۔

سے ایک مرید آگیا۔ وہ مرید پیدل تھا۔ اس نے شیخ ابوسعید البواخیر کے زانو کو بوسہ دیا۔ شیخ نے فرمایا کہ اس سے

نیچے بوسہ دو۔ اس نے شیخ کے پاؤں کو بوسہ دیا۔ شیخ نے کہا، اویںچے۔ مرید نے گھوڑے کے زانو کو بوسہ دیا۔

شیخ نے فرمایا اور نیچے۔ مرید نے گھوڑے کے ٹم کو بوسہ دیا۔ شیخ نے کہا، اور نیچے۔ مرید نے زمین کو بوسہ دیا

۔

اس وقت شیخ نے کہا: ”کہ میں نے جو نہیں پہنچے اور پہنچے ہوئے دینے کو کہا، تو اس سے میرا مقصد یہ نہ تھا کہ تم زمین کو بوسہ دو۔ میرا اس سے یہ مقصد تھا کہ تم بتلانیچے جاؤ گے تمہارا درجہ بلند ہوگا۔“ (فوائد الفوائد، محفوظات خواجہ نظام الدین اولیاء، مرتبہ خواجہ حسن دہلوی، ترجمہ محمد رشید صاحب، جلا آکئیدی اوقاف پنجاب لاہور مطبوعہ ۱۹۷۲ء، ص ۲۳۰)

اس اقتباس سے مندرجہ ذیل نتائج حاصل ہوتے ہیں:

- ۱۔ نظام الدین اولیاء اکیلے بھی اولیاء (بہت سے ولی) تھے۔
- ۲۔ خود کو سجدہ کروانے کے جواز کی دلیل یہ ہے کہ ان کے پیروں پر سجدہ کرواتے تھے۔
- ۳۔ اس واضح شرک کی اصل وجہ عشق و محبت ہے، جو دین طریقت کی بنیاد ہے۔
- ۴۔ یہ سجدہ تو اپنی بزرگی اور بھائی کے لیے کرواتے ہیں لیکن تاثر یہ دیتے ہیں کہ تواضع سے درجہ بلند ہوتے ہیں۔
- خداوند اتیرے یہ سادہ دل بندے کہہ جائیں کہ درویشی بھی عیاری و سلطانی بھی عیاری بھلا اگر تواضع کا سبق ہی دینا تھا، تو اس کا خود کو سجدہ کروانے کے بغیر کوئی اور طریقہ نہیں تھا۔ کیا رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح تواضع کا سبق دیا تھا؟ پھر یہ بھی خیال رہے کہ کتاب فوائد الفوائد کو روح تصوف کے مصنف نورشید احمد گیلانی نے ان چودہ امہات کتب تصوف میں شمار کیا ہے، جو صحیح روح تصوف پیش کرتی ہیں اور سنت کے مطابق ہیں۔

ایک دفعہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو سجدہ کرنا چاہا، تو آپ نے فرمایا:

سجدہ عظیمی کی حرمت

مَا هَذَا يَا مَعَاذُ؟ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ رَأَيْتُهُمْ فِي الشَّاهِرِ يَسْجُدُونَ لِأَسَاقِفِهِمْ فَقَالَ يَا مَعَاذُ! إِنَّهُ لَا يَصِلُحُ السُّجُودُ إِلَّا لِلَّهِ وَلَوْ كُنْتُ أَمِيرًا أَحَدًا لَأَمَرْتُ الْمُرَاةَ أَنْ تَسْجُدَ لِي لِزَوْجَاهَا مِنْ عَظَمَةِ حَقِّهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ

معاذ یہ کیا؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا ”یا رسول اللہ ﷺ میں نے شام میں دیکھا ہے کہ وہ اپنے پادریوں کو سجدہ کرتے ہیں۔“ آپ نے فرمایا: ”اے معاذ! سجدہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لئے درست نہیں۔ اگر میں کسی کو حکم دیتا تو دعوت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے کیونکہ خاوند کا عورت پر بڑا حق ہے۔“

کچھ لوگ سجدہ کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں۔ سجدہ تحریری اور سجدہ تنظیمی۔ اور سجدہ تنظیمی کو غیر اللہ کے لئے جائز قرار دیتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں۔ اللہ نے خود فرشتوں سے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کروایا۔ اسی طرح حضرت

یوسف ؑ کو ان کے والدین اور بھائیوں نے سجدہ کیا تھا۔

مندرجہ بالا حدیث میں ان لوگوں کی دونوں باتوں کے جواب آگئے ہیں۔ حدیث کے خط کشیدہ الفاظ "عظم حقہ علیہا" سجدہ تعظیمی پر ہی دلالت کرتے ہیں نہ کہ تحریمی پر۔ لہذا یہ تحریمی ویسی کی تقسیم ہی غلط ہے۔ نیز حضرت معاذ بن جبل ؓ نے بھی تعظیم کے طور پر آپ کو سجدہ کرنا چاہا تھا نہ کہ سجدہ تعبدی۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی آمد سے پیشتر کی شریعتیں آپ کے بعد منسوخ ہو گئیں۔ اگر پہلے یہ سجدہ جائز تھا بھی، تو آپ کے اس ارشاد کے مطابق قطعی طور پر حرام ہو چکا ہے۔

ولایت یا خدائی؟

اس بحث کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ "اولیاء اللہ" جو اپنے مریدوں سے عبدیت کے پورے حقوق وغیرہ مشروط اطاعت، استمداد و استغاثہ اور سجدہ وصول کرتے ہیں۔ تو کیا یہ خود معبود کے حقوق پورے بھی کرتے ہیں؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے حقوق کی تعین ضروری ہے اور وہ یہ ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ وہ غیب کی بھی سب باتیں جانتا ہے۔ لہذا وہ اپنے بندوں کا ہر حال میں گنجان ہے۔

۲۔ جب اسے پکارا جائے، تو وہ پکارنے والوں کی دُعا سنا، اسے قبول فرماتا، داد رسی کرتا، مشکل سے نجات دیتا، بیماری سے شفا بخشتا اور بندوں کی تمام حاجات پوری کرتا ہے۔

۳۔ اس نے اپنے بندوں سے وعدہ کر رکھا ہے کہ اگر وہ اس کے احکام مانیں گے، تو انہیں دوزخ کے عذاب سے بچائے گا اور جنت میں داخل کرے گا۔ بشرطیکہ اس نے شرک نہ کیا ہو۔

اب ان حقوق کے ثبوت ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ علم غیب خاصہ خدا ہے

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حضور اکرم کو مخاطب کر کے فرمایا:

قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا
إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ
الْغَيْبَ لَاسْتَكُنْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا
مَسْنُوفٍ السُّوءَ (۶۸، ۸۷)

اے محمد ﷺ کہہ دو کہ میں تو اپنے ہی فائدے اور نقصان کا کچھ اختیار نہیں رکھتا تو جو چاہے اور اگر میں غیب کی خبریں جانتا ہوتا، تو بہت سے فائدے جمع کر لیتا اور بھوک کو کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ :

۱۔ علم غیب جاننے کے دو فائدے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان کسی آنے والی تکلیف سے بچ جائے اور دوسرے یہ کہ آئندہ کے مفید پہلوؤں کو اپنا کر اپنے لئے بہت سی بھلائیاں اکٹھی کر لے، خواہ وہ کسی قسم کی ہوں۔ اپنی دو باتوں یعنی دفع ضرر اور جلب منفعت کا نام علم تصوف یا دین طریقت کی زبان میں "تصرف" ہے کہ اولیاء اللہ اپنے اور دوسروں کے حالات سے باخبر بھی ہوتے ہیں۔ پھر ان کی شکل کشائی بھی کر سکتے ہیں اور ان کو فیض بھی پہنچا سکتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے افضل الانبیاء کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیئے کہ میں تو اپنے نفع و نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتا۔ دوسروں کی رفع حاجات اور مشکل کشائی کیونکر کر سکتا ہوں۔

۲۔ آیت میں اَلَا مَآ شَاءَ اللّٰہ کے الفاظ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حسبِ شیت و ضرورت ایثار کو تھوڑا بہت علم غیب عطا بھی فرماتا ہے۔ چنانچہ درج ذیل آیت میں بھی اس بات کی وضاحت موجود ہے۔

عِلْمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ
اَحَدًا اِلَّا مَن ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ
فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ
خَلْفِهٖ رَصَدًا (۲۶/۴۲)

وہی غیب کا جاننے والا ہے اور کسی پر اپنے غیب کو ظاہر نہیں کرتا۔ ہاں جس پیغمبر کو پسند فرمائے، تو اس کو غیب کی خبریں بتلا دیتا ہے اور اس کے آگے اور پیچھے نگہبان مقرر کر دیتا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ :

۱۔ علم غیب جاننا اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے۔
۲۔ وہ غیب کی خبریں صرف کسی رسول کو ہی دیتا ہے۔ جسے وہ پسند کرے کیونکہ یہ دنیا کی رہنمائی کے لیے لایا ہے۔ امر ہے۔

۳۔ پھر اس بات کا بھی اہتمام فرماتا ہے کہ ان خبروں میں ادھر ادھر سے کہیں باطل کی آمیزش نہ ہو جائے۔ پھر کچھ آیات ایسی ہیں، جن سے اللہ کے علم غیب کی بحیرہ فی ثابت ہوتی ہے، مثلاً :

وَعِنْدَهُ مَفَاتِيحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا
اِلَّا هُوَ (۲۶/۵۹)

اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں۔ جن کو اس کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا۔

اور ایسی اور بھی بہت سی آیات ہیں، جنہیں ہم بخوفِ طوالت نظر انداز کرتے ہیں۔

اب احادیث کی طرف آئیے۔ احادیث سے بھی رسول اکرم ﷺ کا کئی علم غیب جاننا ثابت نہیں

ہوتا جیسا کہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کو علم غیب بتدین حاصل ہوتا رہا۔ تا آنکہ آپ کی صحت کے وقت آپ کو مَا كَانَ وَمَا يَكُونُ (یعنی ازل سے لے کر ابد تک) تمام حالات کا علم تھا اور یہ علم اللہ کے علم غیب سے کم نہ تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا علم ذاتی ہے اور رسول اکرم ﷺ کا علم عطائی، خدا کی طرف سے عطا کیا ہوا تھا۔

رسول اکرم ﷺ کا علم غیب کئی ثابت کرنے کی ضرورت | بیشتر اس کے کہ ہم اس دعوے کا جائزہ لیں

یہ بتانا ضروری خیال کرتے ہیں کہ ان لوگوں کو رسول اکرم ﷺ کا علم غیب کئی ثابت کرنے کی ضرورت صرف اس لئے پیش آئی ہے کہ اولیاء اللہ کے علم غیب کئی کے لئے راستہ صاف ہو جائے، چونکہ یہ حضرات خود کو متبع رسول ﷺ گردانتے ہیں اور زبانی بھی کچھ کہتے ہیں کہ ہماری بزرگی محض اللہ کے احسان اور رسول ﷺ کی محبت اور اتباع کے سبب ہے۔ تو جب ہم رسول اللہ ﷺ کا علم غیب کئی ثابت نہ کر لیا جائے یہ اپنے غیب کے دعوے کیسے کر سکتے ہیں؟

اب دیکھتے احادیث صحیحہ کی رؤے ہم چند واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کو آخری دور تک بھی علم غیب (کئی) نہ تھا، مثلاً:

۱۔ واقہ تحریم — آپ نے بعض امہات المؤمنین کے کہنے پر شہد کو اپنے آپ پر حرام کر لیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر باز پرس بھی ہوئی۔ اگر آپ کو اس باز پرس کا علم ہوتا، تو آپ ایسا کیوں کرنے۔ (قرآن کریم، سورہ تحریم، بخاری، کتاب اہل)

۲۔ واقہ افک — حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سلسلے میں آپ ایک ٹکڑہ بہت پریشان ہے آپ دوسرے لوگوں سے حضرت عائشہ کے کردار سے متعلق استفسار کرتے رہے۔ (قرآن کریم، سورہ نور، بخاری، دو دیگر کتابیں)۔

۳۔ زہریلی بجوی — جنگ خیبر کے بعد آپ کو یہودیوں نے زہر ملا بجوی کا گوشت بطور ہدیہ پیش کیا، جو آپ نے کھالیا۔ لقمہ اندر چلا گیا، تب آپ کو محسوس ہوا۔ (بخاری و مسلم)

۴۔ مقتاتہ فیصلہ — حضور اکرم ﷺ کا فرمان: ”تم میرے پاس جھگڑتے ہوئے آتے ہو۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی اپنی دلیل دوسرے فریق کی نسبت اچھی طرح بیان کرتا ہے اور میں جو سنتا ہوں اس پر فیصلہ کر دیتا ہوں۔ پھر اگر میں کسی کو اس کے مسلمان بھائی کا حق غلطی سے، دلاؤں، تو وہ ہرگز نہ لے۔ میں اس کو دوزخ کا ایک ٹکڑا دلا رہا ہوں۔“ (بخاری، کتاب اہل)

۵۔ حضور اکرم ﷺ کا فیات مکے روز اپنے اُقتیوں کو پانی پلانا اور فرشتوں کا کچھ اُقتیوں کو حوض کوثر سے پرے ہٹانا، تو حضور اکرم ﷺ کے استفسار پر فرشتوں کا یہ جواب دینا کہ :

لَا تَدْرِي مَا أَحْدَثْنَا بَعْدَكَ

آپ نہیں جانتے ان لوگوں نے آپ کے بعد کیا کچھ بدلتا

(بخاری و مسلم) جاری کریں۔

غرض ایسے واقعات بے شمار ہیں باب ہم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے فیصلہ پر اس موضوع کو ختم کرتے ہیں

۶۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا : ”جو کوئی تجھ سے یہ کہے کہ رسول اللہ ﷺ نے معراج میں اپنے پروردگار کو دیکھا وہ جھوٹا ہے اور جو کوئی یہ کہے کہ آپ غیب جانتے تھے وہ بھی جھوٹا ہے۔“ (بخاری، کتاب التوحید ، باب فلا یظہر علی غیب احدہا)

ماحصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنا علم غیب چاہا اتنا ہی رسول اللہ ﷺ کو عطا کیا، جو کہ خلقت کی ہدایت کے لئے ضروری تھا اور جو نہ چاہا نہ دیا۔ کئی علم غیب ایک ایسا دعویٰ ہے، جو نہ قرآن سے ثابت ہو سکتا ہے نہ احادیث سے اور نہ ہی تاریخ سے۔

۲۔ اولیاء اللہ کے علم غیب کی وسعت اور دعویٰ تصرف

لیکن کتاب سنت کے ان واضح ارشادات کے علی الرغم عبد الوہاب شمرانی کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے شیخ خواص کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ ”ہم سے نزدیک مرد کامل اس وقت تک نہیں ہوتا، جب تک کہ وہ اپنے مُربد کی حرکات کو روزِ مِثاق سے بے کر اس کے جنت یا دوزخ میں داخل ہونے تک نہ جان لے۔“ اکبریتِ امیرِ برصغیر البیوقیت و الجواہر، بحوالہ سیرتِ غوث، ص ۱۶۵

۲۔ اور حضرت عزیزاں نے فرمایا کہ : ”اولیاء اللہ کی نظر میں تمام زمین و سترِ خوان کی مانند ہے اور ہم کہتے ہیں۔ کہ ناخن کی مثل ہے۔ ان اولیاء اللہ کی نظر سے کوئی چیز غائب نہیں ہے۔“ (نہات الانس فارسی لہجی، بحوالہ سیرتِ غوث، ص ۱۶۶)

۳۔ اور عبد اکبریم جلی صاحب اس سے بھی چند قدم آگے ہیں۔ وہ انبیاء کے معجزات کو نہایت کمتر سمجھتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں کہ :

”منطق الطیر میں ان دونوں پیغمبروں حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی خصوصیت صرف یہی ہے کہ یہ باتیں بکثرت ان سے ظہور میں آئیں اور اس کا انہوں نے اذعان فرمایا۔ ورنہ جمیع افراد و اقطاب کو

ممکنست وجود یہ میں تصرف چل ہے اور ہر ایک ان میں سے وہ باتیں جانتا ہے، جو رات اور دن میں کھکتی (آواز پیدا کرتی) ہیں۔ پرندوں کی بولیاں تو درکنار ہیں۔ چنانچہ شبلی فرماتے ہیں کہ اگر ایک سیاہ چوٹی اندھیری رات میں سخت پتھر پر چل رہی ہو اور میں اس کی آواز نہیں سنتا، تو میں خیال کرتا ہوں کہ میں قریب میں آگیا اور ایک اور بزرگ نے فرمایا ہے کہ نہ میں یہ بات کہتا ہوں، جو شبلی نے کہی اور نہ اس کو سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ وہ (چوٹی) حرکت کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہے مگر میری قوت کے ساتھ۔ اور میں ہی اس کا محرک ہوں۔ پھر میں کس طرح کہوں کہ اس کو نہیں جانتا۔“ (انسان کامل، ص ۲۴)

انفاس العارفين میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اپنے والدِ محترم شاہ عبدالرحیم صاحب کے متعلق فرما رہے ہیں،

شاہ عبدالرحیم کا علم غیب

”سننے میں آیا ہے کہ آپ کا ایک خادم کسی بری عادت میں مبتلا تھا۔ آپ نے اُسے کئی بار اشاروں، کنایوں سے تنبیہ فرمائی، مگر وہ پھر بھی نہ چونکا اور نہ ہی اپنی عادت بد سے باز آیا۔ بالآخر حضرت شیخ نے اسے تنہائی میں بلا کر کہا ”تجھے کئی بار اشاروں کنایوں سے سمجھایا مگر تو نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ شاید تو سمجھتا ہے کہ ہم تیرے کرتوتوں سے بے خبر ہیں۔ قسم بخدا! اگر زمین کے نیچے طبق میں رہنے والی کسی چوٹی کے دل میں بھی سو خیالات آئیں تو ان میں ننانوے خیالات کو میں جانتا ہوں۔ اور حتیٰ سمانہ و تعالیٰ اُس کے سو کے سو خیالات سے باخبر ہے۔“

یہ سن کر خادم نے اپنی برائی سے توبہ کر لی۔“ (انفاس العارفين دارود، ص ۲۵، مصنف شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ترجمہ سید محمد فاروق قادری ایم اے، مطبوعہ العارف لاہور)

اگر شاہ ولی اللہ صاحب جیسے محدث اور فقیہ بھی اپنی روایت ”سننے میں آیا ہے“ سے متفرع کریں، تو دوسروں کو ایسی روایات بیان کرنے کا اور بھی زیادہ حق پہنچتا ہے۔ پھر آپ نے عبد اور موجود کے علم میں ننانوے اور سو کی نسبت بیان فرمائی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کس نفسی سے کام لیا ہے یا ذرا الجھک گئے ہیں۔ اب وہ واقعہ سامنے لائیے، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مجمع البحرین پر حضرت خضر علیہ السلام سے ملے تو ایک چڑیا آئی اور اس سند سے چونچ میں پانی کا ایک قطرہ لے گئی۔ تو حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ سے کہا، ”میرے اور تمہارے دونوں کے علم کی خدا تعالیٰ کے علم سے وہی نسبت ہے، جو اس پانی کے قطرہ کی، جو چڑیا لے گئی، اس سند سے ہے۔ حالانکہ ان دونوں بزرگوں کو اللہ کی طرف سے علم یقینی حاصل ہوتا تھا اور شاہ عبدالرحیم کا علم کشفی اور ظنی ہے۔“

میاں جی نور محمد (م ۱۲۵۹ھ) کے شاگرد کا علم غیب

کچھ لوگ میاں جی کے پاس آ کر
توجہ کے طالب ہوئے آپ بچوں

کو پڑھا رہے تھے۔ آپ بچوں کو یہ کہہ کر کہ ”پڑھتے رہو“ انہیں مجھ میں لے گئے اور توجہ ڈالنا شروع کی، جو بچہ
عمر میں بڑا تھا اس نے مجھ کے دروازہ کی درلٹ سے یہ منظر دیکھا، تو واپس آ کر لڑکوں میں اس کی فحاشی شروع کر دی
اور عود پیر بن بیٹھا اور بچے آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئے۔ جب میاں جی کو معلوم ہوا، تو آپ نے اس بڑے لڑکے کو بلا
کر اسے آنکھیں بند کرنے کو کہا۔ وہ بہت جلد تاب نہ لاکر چلا گیا۔ جب جوان ہوا تو اس نے بتلایا کہ جب میں چانچ
کے سامنے بیٹھا، تو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے دل پر چنگاری رکھ دی ہے۔ جو فوراً اٹھالی گئی، مگر اب تک حال
یہ ہے کہ اندھیری رات میں، سردی کے موسم میں، مکان کے اندر، لحاف میں منہ رکھنے کے باوجود باہر جو نیم کا
درخت ہے اس کے پتوں کی حرکت تک معلوم ہوتی ہے۔“ (تاریخ مشائخ پشت، ص ۲۳۹)

درج ذیل واقعہ حضرت علی ہجویریؒ سے تعلق رکھتا
ہے:

علی ہجویریؒ کا علم غیب اور اختیار و تصرف

”ایک دفعہ میں نے دمشق کے درویشوں کے ساتھ ابن المعتاد کی زیارت کے لئے جانے کا قصد کیا۔ یہ رملہ
کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ راستہ میں ہم نے آپس میں باتیں کیں کہ کچھ سوچ لو تاکہ وہ حضرت ہیں ہمارے
باطن سے مطلع کریں اور ہماری مشکل حل ہو۔ میں نے دل میں سوچا کہ مناجات ابن حنین کے اشاران سے سنوں۔
دوسرے نے سوچا مجھے طحال کا مرض ہے، یہ اچھا ہو جسے تیسرے نے کہا مجھے علوہ مابونی ان سے لینا ہے۔
جب ہم ان کی خدمت میں پہنچے، تو انہوں نے ایک جزو کاغذ جس میں اشار مناجات ابن حنین لکھے تھے
میرے آگے رکھ دیئے اور دوسرے کے طحال پر ہاتھ پھیرا دے جاتی رہی۔ تیسرے کو کہا علوہ مابونی سپاہیوں
کی غذا ہے۔ اور تو اولیاء کا لباس رکھتا ہے اور اولیاء کے لباس والے کو سپاہیوں کی غذا کا مطالبہ درست
نہیں، دونوں میں سے ایک بات اختیار کر۔“ (کلام المرفوع ترجمہ کشف المحجوب، ص ۵۴۴)

اس روایت سے ایک تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عوام کا مزاج ہی ایسا بن گیا ہے کہ ان کو صرف باطن کی اطلاع
سے ہی بزرگی کی بڑگی کا یقین آتا ہے۔ دوسرے پر صاحبان بھی اسی معیار کو پسندیدہ قرار دے کر ان کو محطالہ
کو پورا کرنے کے مادی بن گئے ہیں۔ بہر حال یہ بزرگ امتحان میں پوری طرح کامیاب ہیں اور ان کے علم غیب
اور ساتھ ہی تصرف فی الامور میں داد دینے کے بغیر چارہ نہیں۔

عثمان ہارونی کا تصرف اور طی الارض

”اس پیر مرد نے اپنا احوال دخواجہ عثمان ہارونی سے کہنا شروع کیا کہ آج تیس برس کا عرصہ ہوا کہ

میرالط کا مجھ سے جدا ہے اور کہیں چلا گیا ہے۔ اس کے مرنے جینے کی کچھ خبر تک معلوم نہیں۔ اس کی درود جاتی سے میرا بڑا حال ہے۔ اور اب میں آپ کی خدمت میں آیا ہوں اور اس کے آنے اور صحت و سلامتی کے لئے فاتحہ و اخلاص کی درخواست کرتا ہوں۔ جب خواجہ عثمان ہارونی نے یہ بات سنی، تو مراقبے میں سر جھکیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھا کر حاضرین کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ اس پیر مرد کے گم شدہ لڑکے کے آنے کے لئے فاتحہ و اخلاص پڑھو۔ جب آپ اور سب درویشوں نے فاتحہ و اخلاص ختم کی تو پیر مرد سے کہا: ”جاؤ! اور ایک لحظے کے بعد اپنے لڑکے کو ملاقات کے واسطے ہمارے پاس لے آؤ۔“

”جو نبی پیر مرد نے زبان مبارک سے یہ سنا فوراً درود خواجہ کے سر جھکا کے واپس گیا۔ ابھی راستے ہی میں تھا کہ کسی نے پیر مرد کا ہاتھ پکڑ کے کہا: ”مبارک ہو، تمہارا لڑکا آگیا۔ خوشی خوشی گھر میں آیا اور لڑکے سے ملاقات کی۔ اس پیر مرد کی آنکھیں ضعیف ہو گئی تھیں، لڑکے کو دیکھتے ہی روشن ہو گئیں، لٹے پاؤں لڑکے کو لے کر خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور لڑکے کو پاؤں کرایا۔“

”خواجہ علیہ الرحمۃ نے اس لڑکے کو آگے بلا کے پوچھا: ”میاں! تم کہاں تھے؟“ اس نے کہا: ”سند میں کشتی پر تھا۔ صاحب کشتی نے پکڑ کر زنجیر سے بکڑ رکھا تھا، آج میں اسی جگہ بیٹھا تھا کہ ایک درویش، آپ کی بیٹی، گویا آپ ہی تھے، آئے اور میرے پاؤں کی زنجیر توڑ کر گردن زور سے پکڑی اور اپنے آگے بھجھ کر کھڑا کیا۔ اور فرمایا: ”اپنا پاؤں، میرے پاؤں پر رکھ لے اور آنکھیں بند کر۔“ جیسا درویش نے حکم کیا، میں نے وہی کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کہا: ”کہ آنکھیں کھول۔“ میں نے جو آنکھیں کھولیں، تو اپنے آپ کو اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے پایا۔“ دلیل

الغرض منقولات خواجہ معین الدین چشتی، مرتبہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، ترجمہ، غلام احمد بریل، ص ۴۳-۴۴

دیکھتے ان خواجہ صاحب کے مقابلہ میں حضرت یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کیسے بے بس نظر آتے ہیں اور خواجہ صاحب ہیں کہ بیٹھے بٹھائے ایک لمحہ میں کیا کچھ کر دکھایا۔ اس واقعہ میں کئی پیغمبروں کے معجزات پنہاں ہیں اور یہ سب کچھ سورۃ فاتحہ و اخلاص کی برکت اور حضرت خواجہ کی بزرگی کے طفیل ہوا۔ جس پیغمبر پر سورۃ فاتحہ اور اخلاص اتری اور جن بزرگوں کو اس پیغمبر نے ان سوتوں کی تعلیم دی وہ تو سب ان سوتوں کے اس قسم کے فوائد سے نا آشنا ہی رہے جو ان اولیاء اللہ نے ڈھونڈ نکالے ہیں کہ ادھر مراقبہ میں پڑے اور ان کی ان میں لڑکے کو سند سے اور زنجیریں توڑ کر گھر چھوڑ آئے ہیں۔

پیران پیر کی حاجت وائی اور مشکل کشائی

ابن شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب درج ذیل آیتاس ملاحظہ فرمائیے، جس سے

آپ کی دستگیری، حاجت وائی اور مشکل کشائی بھی ثابت ہوتی ہے اور توکل و استمداد کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔

”حضرت شیخ نے فرمایا کہ منصوبہ حاجت کے زمانہ میں کوئی ان کی دستگیری کرنے والا اور جس لغزش میں وہ مبتلا ہوئے، کوئی بچانے والا نہیں تھا۔ اگر میں اُن کے زمانہ میں ہوتا تو ان کی دستگیری کرتا اور نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔ قیامت تک میں اپنے مریضوں کی دستگیری کرتا رہوں گا اگرچہ وہ سواری سے گرے اور فرمایا کہ ہر طویلہ میں ایک ناقابل مقابلہ سائنڈ اور ایک ناقابل مسابقت گھوڑا رہتا ہے اور فرمایا کہ ہر ایکٹ کر پر میرا انتظار رہتا ہے، جس میں کوئی اختلاف نہیں کرتا اور ہر منصب میں ایسا خلیفہ ہے جسے ہٹایا نہیں جاسکتا۔“

”فرمایا کہ جب بھی اللہ سے کوئی چیز مانگو، میرے وسیلہ سے مانگو۔ تاکہ مراد پوری ہو اور فرمایا کہ جو کسی میں میرے وسیلہ سے امداد چاہے، تو اس کی مصیبت دور ہو اور جو کسی سختی میں میرا نام لے کر پکارے اُسے کٹا دگی حاصل ہو، جو میرے وسیلہ سے اپنی مرادیں پیش کرے تو پوری ہوں۔“

”آپ نے فرمایا کہ جو شخص دو رکعت نماز پڑھے، ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد گیارہ مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھے اور سلام کے بعد سر کلا

دو عالم رحمۃ اللہ علیہ پر درود بھیجے اور میرا نام لے کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کی حاجت براری کرے اور ایک روایت میں ہے کہ گیارہ قدم عراق کی جانب چل کر میرا نام لے کر دعا مانگے، لیکن یہ روایت ثابت نہیں ہے۔“

(اخبار الاخیار، مصنف عبدالحق محدث (دہلوی، مترجم اردو) مولانا سہان محمود، ص ۱۴۹، ۱۵۰)

غور فرمائیے، کہ اس پورے بیان میں صرف آخری روایت ثابت نہیں، باقی سب کچھ بلا حجت و ثبوت تحقیق شدہ ہے اور یہ بات ہے بھی قرین قیاس کہ جہاں ہزاروں میل کا فاصلہ ہو وہاں صرف اقدم جانب عراق (بنداد جو شیخ جیلانی کا مولد و مدفن ہے) چلنے یا نہ چلنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ پھر عراق کی جانب تلاش کرنے کی تکلیف سے بھی اس روایت کی بے ثبوتی نے آزاد کر دیا۔

اب دیکھئے! اس نماز کو ضیاء اللہ قادری نے سیرت نوشت الثقلین میں صفحہ ۲۴۲ پر ”صلوٰۃ غوثیہ“ کے عنوان کے تحت تحریر فرمایا ہے۔ پھر اس ”صلوٰۃ غوثیہ“ کے راوی یہ اکیلے عبدالحق ”محدث“ صاحب ہی نہیں۔ مندرجہ ذیل

تذکرہ نگار بھی ہیں :

- ۱۔ بہجتہ الاسرار، ص ۱۰۲ ابوالحسن نورالدین شنطونی ۲۔ قلائد الجواہر، ص ۳۶، علامہ محمد بن محمد بن علی
- ۳۔ نزہتہ الخیطر الفاتر، ص ۹، علامہ قاضی قاری ۴۔ تفریح النظار، ص ۵۶، علامہ عبد القادر اللہوی
- ۵۔ تحفہ قادریہ، ص ۴۴، ۴۵، ابوالعالی محمد بن قادری۔

اور امام اہل سنت احمد رضا خان نے تو اس نماز کے جواز میں ایک نہایت ہی مدلل رسالہ ”اَنبَارُ الْأَنْوَارِ جُمُتِ یَمِ صَلوٰۃُ الْأَسْرَارِ“ بھی تحریر فرمایا۔ گویا آپ نے اسرار کے مسئلہ میں سے نور کی نہریں جاری کر کے نماز کے جواز کے ثبوت دلائل مبینا فرمادئے ہیں۔

اور صاحب ریاض السالکین نے اس نماز کا دوسرا نام ”صلوٰۃُ الاسرار دو گنا نہ ضرب الاقدام“ بتلایا ہے اور اس کی تفصیل یوں بیان فرمائی ہے۔

۱۔ شب یکشنبہ کو غسل کر کے خوشبو لگا کر صاف کپڑے پہن کر پاک جگہ پر بیٹھے اور نیت صلوٰۃُ الاسرار ہدیہ دربار پیران پیر کرے۔

۲۔ سلام کے بعد ابار اغثنی یا رسول اللہ پھر ابار الہی بخرمۃ غوث الثقلین اقض حاجتی پڑھے۔

۳۔ نماز سے فراغت کے بعد اقدام جانب عراق چل کر کھڑا ہو جائے اور امرتہ غوث پاک کی روح پر سلام بھیج کر اپنا دلی مطلب عرض کرے۔ (ریاض السالکین، ص ۳۱۴)

اب سوچئے نہیں بکھر دیتے کہ جہاں شرک و بدعات کا یہ عالم ہو، وہاں ایسا کعبہ و ایسا کعبہ نستعین کی کچھ حیثیت رہ جاتی ہے اور اس سے عجیب تر یہ معاملہ کہ یہ سب کچھ پیران پیر کے ہم فسوب کیا جاتا ہے۔

اب ایک علمی مجلہ ماہنامہ ”دارالعلوم“ دیوبند کے ایک مضمون سے اقتباس ملاحظہ فرمائیے :

عبد القدوس گنگوہی کی کرامات

(عنوان ہندو جوگی سے مقابلہ)

”جس وقت آپ (قطب عالم عبد القدوس گنگوہی) تکمیل علوم باطنی کے بعد گنگوہہ نشریف لائے ہیں اس وقت یہاں ایک باکمال جوگی رہتا تھا جس کی کئی نہایت وسیع اور پُر فضا خفی۔ آپ کو یہ جگہ بہت پسند

آئی اور قیام کی خواہش پیدا ہوئی۔ اندر جا کر چیلوں سے پوچھا کہ بتائیے آپ کے گرجی کہاں ہیں؟ بولے وہ تو کٹی کے اندر گئے ہیں۔ ایک سال گزر چکا ہے۔ ہوا کے لئے صرف ایک روزن ہے، کیا مجال ہے، جو کوئی اس کے قریب جائے۔ آپ اس روزن کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ مراقبہ جو کیا تو معلوم ہوا کہ وہ جس دم کئے ہوئے بیٹھا ہے اور اپنے کام میں مصروف ہے۔ آخر اپنے اس کی روح کو حرکت دی۔ ساتھ ہی وہ ہوشیار ہو گیا۔ پوچھا تو کون ہے؟ اور کس طرح اندر آ گیا۔ فرمایا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور اسی کی قدرت سے اس سوراخ کے ذریعہ اندر آ گیا ہوں، مگر تو یہ تو بتا کہ کس حد تک ترقی کر چکا ہے؟ بولا کافی ترقی کر لی ہے، جو صورت چاہوں اختیار کر سکتا ہوں، دیکھو! ابھی پانی بنتا ہوں، چنانچہ وہ اسی وقت پانی ہو گیا۔ اپنے فوراً ہی اس پانی میں دھبی ترکے رکھ لی۔ اس کے ہوش میں آتے ہی فرمایا کہ اب میں پانی ہوتا ہوں، تو اس میں ایک کپڑا تر کر کے رکھ لینا۔ اس کے بعد یہ کپڑے سو گھٹے گئے تو ایک میں بدبو بھی، تو دوسرے میں خوشبو۔ ایک کی وجہ سے دماغ پریشان ہوا جاتا تھا اور دوسرے کی خوشبو سے مطمئن ہو جاتا تھا۔ جو گی بلا کہ ”میں تو اپنے فن دہن میں کامل تھا ہی، آپ بھی کامل تھے، صرف خوشبو اور بدبو کا فرق رہا۔“ فرمایا: ”یہ کفر و حیل کا فرق ہے۔“ چنانچہ وہ اسی وقت مسلمان ہو گیا اور مرید ہو کر تکمیل کر لی۔ اس جو گی کو اپنے صاحبِ ولایت مقرر کر کے کہیں اور بھیجا دیا حضرت کار و رضہ اسی جگہ ہے۔ وصال کے بعد بھی قلب بدستور ذکر و حرکت میں مصروف تھا۔ ”ماہنامہ دارالعلوم“ دیوبند، جنوری ۱۹۶۷ء، ص ۴۔ نگرانِ اعلیٰ، قادی محمد طیب صاحب، ہیر، ابن الانور سید محمد زہر شاہ قیصر)

اقتباس بالا سے مندرجہ ذیل باتیں مستنبط ہوتی ہیں:

- ۱۔ بزرگانِ کرام کسی غائب کی روح کو جھجھوڑ سکتے ہیں، باریک سے سوراخ سے گزر سکتے ہیں اور اپنی اشکال بدل سکتے ہیں۔ یہ سب کام تو غالباً جنوں یا فرشتوں کے ہو سکتے ہیں۔ کسی نبی سے کوئی منجبر یا کسی صحابی سے ایسی کرامات ہمارے علم میں نہیں ہیں۔
- ۲۔ ایسی کرامات کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ ہندوؤں کے بزرگ بھی یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ جو اللہ کی گنگوہی اور ہندو جوگی کا باطن یا فن ایک ہی تھا۔

۳۔ البتہ یہ فرق ضرور باقی رہتا ہے کہ مسلمان کے جسم سے (یا جو شکل بھی وہ بدلے) کلمہ طیبہ کی برکت سے خوشبو آتی ہے لیکن کافر کے بدن سے کلمہ کفر کی وجہ سے بدبو آتی ہے اور یہ فرق بزرگوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ سبحان اللہ! کلمہ پاک کی پاکیزگی کو کس مقام پر جا کر فٹ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے جو کلمہ طیبہ

اور مکہ خبیثہ یا اسلام اور کفر کی تمثیل پیش کر کلمہ طیبہ کے جو فوائد بتلاتے ہیں، کیا ان کی اس فائدہ سے کوئی نسبت ہے؟

۴۔ اور یہ فائدہ اتنا عظیم تھا کہ وہ کامل جوگی (بزرگ، فوراً مسلمان ہو گیا اور اس لئے سب پیچھے بھی چھوڑنے لگا۔ اسی وقت اس کو صاحب ولایت بھی مقرر کر دیا اور علامہ مبارکی کے بیان کردہ اس دستور کی خلاف ورزی بھی کی کہ قیامت تک کے لئے قائم ولایت پیران پیر ہیں۔

۵۔ گنگوہی صاحب کا مقرر کردہ یہ نائب تو اسلامی تعلیمات خود بھی نہ جانتا تھا، دوسروں کو کیا سکھاتا تھا؟ معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ علم و فن یہ حضرات سیکھتے ہیں اسے ہی انہوں نے اسلامی تعلیمات کا نام دے رکھا ہے۔ اور یہی کچھ ان اولیاء اللہ حضرات نے ہند میں اسلام پھیلایا تھا۔

۶۔ حرکت قلب کے بند ہو جانے کا نام ہی موت یا وصال (شریف) ہے، مگر آپ کے وصال کے بعد بھی آپ کا دل حرکت بھی کرتا رہا اور ذکر بھی کرتا رہا۔ پھر یہ وصال کی بات کیسی؟ صاف کہنا چاہئے کہ مرنے کے بعد بھی بدستور زندہ رہے یا فوت ہی نہیں ہوئے۔

پھر آپ کی یہ خوشبو اس قدر پختہ ہو گئی کہ آپ اپنے ایک مرید سے محض اس لئے بگڑ بیٹھے تھے کہ تہن ہاری خوشبو کیوں نہیں آتی۔ واقعہ لوں ہوا کہ آپ کے کسی مرید نے اپنے لڑکے کی دعوت ولیمہ میں امراء اور غریبار سب کو مدعو کیا۔ آپ بھیس بدل کر مجلس غریبار میں جا بیٹھے اور دیکھا کہ امراء اور غریبار سب کی ایک جیسی تواضع ہو رہی ہے آپ کا مرید وہاں موجود تھا، لیکن اپنے شیخ کو پہچان نہ سکا۔ پھر مجلس میں آیا، تو آپ کو ناراض دیکھ کر وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا: ”ہم تہن ہاری دعوت میں گئے اور تم نے ہمیں پہچاننا نہیں۔“ اس نے کہا: ”میں بھلا اس حالت میں آپ کو کیسے پہچان سکتا تھا؟“ فرمایا: ”اگرچہ ہم نے لباس تبدیل کیا ہوا تھا، مگر تہن ہارے انداز سے خوشبو کیوں نہیں آتی؟ اور جب خوشبو نہیں آتی تو معلوم ہوا تم کو ہم سے محبت نہیں۔“ (تاریخ شائع چشت، مولانا ذکریا خان)

بلا تبصرہ :

پیران پیر اور جنس میں تبدیلی

”شاہ ابوالمعالی فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے بارگاہِ غوثیہ میں آکر لڑکے کے لیے التجا کی۔ آپ نے اس کے حق میں دعا فرمائی اور وہ روزانہ آپ کی مجلس میں آنے لگا۔ اتفاق سے اس کے ہاں لڑکی پیدا ہو گئی، تو اس نے عرض کیا کہ ”ہم نے تو لڑکے کے لئے کہا تھا اور یہ تو لڑکی ہے۔“ آپ نے فرمایا: ”اے پیٹ کر گھر لے جاؤ اور پردہ عینب سے قدرت کا کرشمہ دیکھو۔“ چنانچہ جب اس نے گھر لا کر کپڑا ہٹایا

توڑکی کے بجائے لڑکا پایا۔“ (تفزیح الخاطر، ص ۱۸۔ سفینۃ الاولیاء، ص ۱۷۔ تحفہ قادریہ، ص ۴۵۔ بحوالہ سیرت نعت، ص ۲۴)

اولیاء اللہ کا موت و حیات پر تصرف

”تمام مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ موت و حیات محض اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے اور یہ بات نصوصِ قرآنیہ سے ثابت ہے۔ کسی انسان کو یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ کب اور کہاں مرے گا، لیکن یہ ”بزرگ حضرات“ اس پابندی سے بھی آزاد ہیں۔ وہ جب چاہیں مر سکتے ہیں۔ اب منہ جہ ذیل واقعات ملاحظہ ہوں:

۱۔ عنوان ہے حضرت عبداللہ منازل :

”نقل ہے کہ ایک شخص نے ایک بزرگ کو خواب میں دیکھا کہ (یہاں سے کچھ عبارت رہ گئی ہے).... کہے کہ یہ کبھی اب اس کی عمر صرف ایک سال باقی ہے۔“ اس نے اگر آپس کہہ دیا۔ آپ نے فرمایا : ”یہ مدت تو بہت لمبی ہے۔ سال کا انتظار کو کن کرنا چھوڑ۔ نہ معلوم سال کب ختم ہو۔ یہ کہہ کر ہاتھ بجائے عجیبہ سر ہانے پر رکھا اور کہا : ”لو میں چلا“ پھر رحلت کی۔“ (مقربان حق، ص ۲۱)

۲۔ حضرت علی سہیل اصفہانی کی بات ہو رہی ہے :

”نقل ہے کہ ایک بار آپ نے اپنے دوستوں سے فرمایا : ”تم خیال کرتے ہو کہ میری موت تمہاری موت کی طرح ہوگی، یعنی بیمار پڑوں گا اور لوگ بیمار پرسی کو آئیں گے، نہیں ! میری موت اس طرح ہوگی کہ وہ پکاریں گے اور میں حاضر ہو جاؤں گا۔“ چنانچہ ایک دن آپ دوستوں کے ساتھ جارہے تھے کہ اچانک ایک صاف جگہ لیٹ گئے اور کہا : ”لیک ! لیک !“ پاس ہی حضرت ابوالحسن تھے۔ انہوں نے یہ حالت دیکھی، تو کلمہ شریف کی تعین کی۔ آپ مسکرائے اور کہا : ”مجھ کو تلقین کرتا ہے۔ اس کی عزت کی قسم ! میں اس کے درمیان صرف عزت کے پردہ کے سوا کوئی چیز حامل نہیں۔“ (مقربان حق، ص ۲۱۶)

اب وہ منظر سامنے لائیے جن حالات میں حضور اکرم ﷺ کی وفات ہوئی تھی۔ آپ نے مسلمانوں کو کلمہ شریف پڑھنے کی تلقین بھی کی ہے اور اس وقت مسلمان کلمہ شریف اور قرآن پڑھ بھی رہے تھے۔ لیکن آپ کو ایسا جلال نہیں آیا۔

۳۔ شیخ فرید الدین عطار کا ذکر ہو رہا ہے :

”آپ ایک کارِ حسناء آدمیہ کے مالک تھے۔ ایک دن کارِ بار میں مصروف تھے کہ کسی فقیر نے آکر صدا لگائی کہ خدا کے نام پر کچھ دو۔ یہ مخاطب نہ ہوئے اس نے کئی بار صدا لگائی۔ یہ اس قدر ٹھہک تھے کہ

جواب دینے کی فرصت نہ پائی۔ اس نے کہا کہ مشغولیت کا یہ عالم ہے، جان کیسے دو گے؟ انہوں نے جھجکا کر کہا ”جیسے تم دو گے۔“ اس نے کہا ”بھلا میری طرح کیا دو گے؟“ یہ کہہ کر کاسہ گدائی سر کے پیچھے رکھا۔ زبان سے لا الہ الا اللہ کہا اور روح پرواز کر گئی۔“ (خلاصہ تصوف اسلام، از آقا بیدار بخت، ص ۴۷)

موت کے وقت میں تبدیلی | قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ جب موت کا وقت آتا ہے، تو کوئی ایسے ایک لمحہ بھی آگے پیچھے نہیں کر سکتا، لیکن یہ حضرات اس وقت کو آگے پیچھے کر سکتے ہیں اور کسی ایک کی جگہ دوسرے پر بھی موت وارد کر سکتے ہیں۔ مثلاً:-

(۱)۔ حضرت ابو الحسن خیر السلاج کا ذکر چل رہا ہے :

”نقل ہے کہ جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو نماز کا وقت بھی ہو گیا۔ ملک الموت حاضر ہوئے آپ نے سر اٹھا کر خوش آمدید کہا اور فرمایا: ”اللہ آپ کو معاف کرے، ذرا ٹھہریئے! میں اور آپ دونوں خدا کے فرمانبردار بندے ہیں۔ آپ کو جو حکم ملا ہے ٹل نہیں سکتا، لیکن جو مجھے حکم ہے اس کا وقت فوت ہوا جاتا ہے۔ ذرا توقف کیجئے تاکہ نماز پڑھ لوں۔“ پہلے میری طرف سے تعمیل ہو جاتے، پھر آپ کر لیں۔“ چنانچہ آپ نے وضو کیا، نماز پڑھی اور جان جانِ آفرین کے پیر دکر دی۔“ (مقربان حق، ص ۱۵۴)

سوال یہ ہے کہ :

۱۔ آپ نے جس نماز کے لئے ملک الموت کو انتظار کرایا اس کے آپ تکلف کب تھے؟
۲۔ آپ ملک الموت کو فرما رہے ہیں ”اللہ آپ کو معاف کرے“۔ حالانکہ نہ وہ تکلف ہے۔ نہ اس سے گناہ سرزد ہوتا ہے، تو پھر معافی کیسی؟

(۲)۔ ”نقل ہے کہ محی الدین ابن عربی کو بادشاہ وقت نے کہا: ”میری لڑکی بیمار ہے آپ آکر عیادت کریں تو شاید آپ کی برکت سے شفا ہو۔“ آپ نے جا کر کہا کہ ”عزرائیل تو روح قبض کرنے آگیا ہے۔ بادشاہ آپ کے قدموں پر گر پڑا اور کہا: ”اس کا علاج آپ کے ہاتھ میں ہے۔“ ابن عربی نے عزرائیل سے کہا: ”ٹھہراہم اپنی لڑکی تمہارے ساتھ روانہ کر دیتے ہیں۔“ پھر گھر آئے اور دروازے کی طرف منہ کر کے فرمایا: ”عزرائیل یہ لڑکی حاضر ہے۔ لڑکی اسی وقت زمین پر گر پڑی اور مر گئی اور بادشاہ کی لڑکی اچھی ہو گئی۔“ (مرشد کامل، ترجمہ

مدائق الاخبار، صادق فرغانی، ص ۲۲)

دیکھ لیجئے! خدائی کس کی چل رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یا ابن عربی کی؟ پھر حضرت عزرائیل علیہ السلام کسے کسے

بھی کیسی راز و نیاز اور سمجھوتے کی باتیں ہو رہی ہیں۔

کلی تصرف کا ثبوت پیران پیر کی زبان سے

شیخ عبدالقادر جیلانی 'فتوح الغیب' میں مقام ولایت میں تحریر فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ

نے اپنی بعض کُتبِ انبیاء سابقین میں فرمایا: "اے اولادِ آدم! میں ہی وہ اللہ ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں جب میں کسی چیز کو کہہ دیتا ہوں، کن" ہو جا، تو وہ ہو جاتی ہے۔ پس جب تم میری اطاعت اور فرمانبرداری کرو گے، تو میں نہیں اسی مقام پر فائز کروں گا کہ تو مجھے جب کسی چیز کو کہے گا، کن" ہو جا تو وہ ہو جائے گی۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم میں سے بے شمار انبیاء کرام، اولیاء کرام اور خواص کو اس صفت اور مرتبہ سے نوازا، (فتوح الغیب، مقالہ نمبر ۱۶ بر حاشیہ ہجۃ الاسرار، ص ۳۸ بحوالہ سیرتِ نبویؐ، ص ۲۰۵)

اب دیکھتے اقتباس بالا میں پیران پیر نے "بعض کُتبِ انبیاء سابقین" پر انحصار فرمایا۔ کتابِ سنت کو کافی نہ سمجھا۔ شاید اس لئے کہ کتابِ سنت کی تو ایسی بات کو ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ پھر آپ نے ان بعض کُتبِ انبیاء سابقین کا حوالہ دینا بھی گوارا نہیں کیا۔ اسی سے آپ کے ارشاد کی ثقاہت کا پتہ چل جاتا ہے اور اس طرح آپ نے اپنے سمیت اللہ تعالیٰ کے کئی شریکوں کا جواز پیدا کر دیا۔ خط کشیدہ الفاظ ایک دفعہ پھر ملاحظہ فرمائیے اور بتلائیے کہ اللہ تعالیٰ نے سوائے حضرت عیسیٰؑ کے، وہ بھی چند مخصوص باتوں میں، کسی نبی کو بھی یہ قدرت عطا فرمائی تھی؟ یہ بے شمار انبیاء، اولیاء اور خواص کہاں سے آگئے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے علی الاطلاق یہ قدرت عطا فرمادی۔

پھر شیخ عبدالحی محمد ث دہلوی اسی فتوح الغیب کے اس کلام کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: "ان حضرات (انبیاء، اولیاء، خواص) میں سے ایک غوثِ پاک کی ذات بھی ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے آپ کو کائنات میں تصرف اور اقتدار حاصل ہے۔ درحقیقت ہر حال و مقام میں جو ان مقالات میں مذکور ہیں۔ وہ اپنے حال شریف کا کنایتاً اظہار ہے۔" (شرح فتوح الغیب، ص ۱۰۸، بحوالہ سیرتِ نبویؐ، ص ۲۰۶)

اب دیکھتے محدث صاحب کا پہلا جملہ اپنے الفاظ و معانی میں بالکل صاف اور واضح ہے اور ہر شخص اس کا مطلب سمجھ سکتا ہے۔ اگرچہ یہ بات کتاب و سنت کی رُو سے صریح شرک ہے، لیکن محدث صاحب کا دامن ادھر بھی اٹھا ہوا ہے۔ لہذا آپ کو "اپنے حال شریف کے کنایتاً اظہار" کہنے کی ضرورت پیش آگئی کہ اس طرح وہ شیخ جیلانی صاحب کی تفسیر یہ بھی کر سکیں اور اپنے دل کو کسی حد تک مطمئن بھی۔

علامہ آؤسی اپنی کتاب "غایۃ الامانی فی الرد علی النہانی" میں تصرف فی الکائنات کے اس مشرکane عقیدہ کی ہمہ گیری کے متعلق نہایت درد سے یہ واقعہ درج فرماتے ہیں :

اہل اسلام کے موحدین کی ایک جماعت ایک مصری کے گھر جمع ہوئی۔ اس کے قریب ہی ایک آدمی تھا، جس کو علم کا دعویٰ تھا۔ اس کو اہل خانہ نے پیچھا اور اس سے حاضرین کی موجودگی میں سوال کیا کہ تھے لوگ کائنات میں تصرف کرتے ہیں؟ اس نے جواب دیا "جناب سات آدمی!" پھر پوچھا گیا، "کون کون؟" اس نے جواب دیا، "فلاں فلاں" اور مصر کے چار مہجوزوں (بدوی، رفاعی، دسوتی اور ابو العلا) کے نام لے لئے۔ اہل خانہ نے موجود موحدین سے کہا، "میں نے آپکے سامنے اس سے اس لئے پوچھا ہے کہ آپ کو معلوم ہو کہ شرک کیاں تک اپنی جڑیں پھیلا چکا ہے؟"

۳۔ توجہ، بیعت اور شفاعت

حکیم الامت اشرف علی تھانویؒ، جنید بغدادی کی عظمت میں یوں رطب اللسان توجہ کے کرشمے ہیں۔

"۲۲۸۔ فرمایا حضرت جنید بغدادی بیٹھے تھے۔ ایک کتا سامنے سے گزرا۔ آپ کی نگاہ اس پر پڑ گئی اس قدر صاحب کمال ہو گیا کہ شہر کے کتے اس کے پیچھے دوڑے۔ وہ ایک جگہ بیٹھ گیا۔ سب کتوں نے اس کے گرد حلقہ باندھ کر مراقبہ کیا۔" (امداد المشتاق، مولفہ حکیم الامت اشرف علی تھانوی، ص ۱۰۲)

یعنی اب کتے بھی صاحب کمال و صاحب حال ہونے لگے۔ یہ مخلوق تو غیر مکلف ہے۔ اس بیچارے کو خواہ مخواہ ہی صاحب حال بنا دیا اور لطف یہ کہ یہ نگاہ اتفاقاً پڑ گئی۔ اگر باقاعدہ توجہ فرماتے، تو نہ معلوم وہ کتنا کتنے بلند مقام پر فائز ہوتا، اگر اتفاقاً نگاہ پڑ جانے کا اتنا ہی اثر ہے، تو پھر تو اس دور کے انسان، جن پر آپ کی لے ہی اشرف علی صاحب تھانوی بزرگوں کی توجہ کے متعلق ایک دوسرے مقام پر یوں قہقہہ:

"نفس و خیال کی بیک قوت ہے، جو خیال و توجہ میں کمیونی کی مشق سے مقبول کیا، مردود سے مردود شخص بھی حاصل کر سکتا ہے۔ پرانے زمانے میں سحر یا جادوگری اور آج کل کے سمریزم اور طلسمات و جادو یا سحر ہے۔ اسی نفس یا باطن کی قوت سے کسی پر اثر ڈالنے کا نام صوفیوں کی اصطلاح میں توجہ، تصرف یا ہمت ہے۔۔۔۔۔ لیکن یہ قوت کوئی دینی کمال نہیں۔ نہ مقبول و مردود ہونے کی علامت ہے۔ ہر فاسق و فاجر بھی اپنے اندر مشق سے یہ قوت پیدا کر سکتا ہے۔" (تہذیب و تمدن، ص ۹۲)

نظر پڑی سبکے سب اولیاء اللہ ہو گئے ہوں گے؟

نظرِ کرم کی فیوض و برکات

پھر یہ توجہ بھی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جو کسی کو فیض پہنچاتی ہے

یا اُسے ولی یا صاحبِ کرامت بنا دیتی ہے اور اسے نظرِ کرم کہتے

ہیں۔ جنید بغدادی کی کہتے ہیں ”نظرِ کرم“ ہی پڑی تھی۔ اب اس نظرِ کرم کے مختلف برکات و فیوض ملاحظہ فرمائیے!

۱۔ ایک بزرگ ابو ہبیرہ بصری (م ۴۸۷) ہیں۔ آپ کا جو شخص منظورِ نظر ہو جاتا۔ ایک توجہ سے فوراً اس پر علوم منکشف ہو جاتے تھے۔ “ (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۴۷)

۲۔ پیرانِ پیر (م ۵۶۱) نے جب شہاب الدین سہروردی پر ایک نگاہ ڈالی، تو علمِ کلام کی جگہ پڑھی ہوئی کتب ان کو یکسر محو ہو گئیں تھیں۔

۳۔ اس طرح عبدالقدوس گنگوہی (م ۹۴۴) نے مولانا جلال الدین (جو انہیں ناچا پیر کہا کرتے تھے) کے جملہ علوم کو ایک توجہ سے زائل کر دیا تھا۔ (حوالہ ایضاً، ص ۲۱۱)

۴۔ حضرت احمد جام نے ایک کُند ذہن طالب علم پر نظر ڈالی، تو اتنے بلند پایہ مضامین منکشف ہوئے، جو عام انسانی سطح سے بہت بلند تھے۔ (مرشدِ کامل، ص ۲۴)

۵۔ میاں اسماعیل لاہوری المعروف میاں کلاں نے صبح کی نماز کے بعد سلام پھرتے وقت جب نگاہِ کرم ڈالی تو دائیں طرف کے مقتدی سبکے سب حافظِ قرآن بن گئے تھے اور بائیں طرف کے ناظرہ پڑھنے والے۔ (مدنیۃ الاولیاء)

۶۔ ابوالحسن ابدال چشتی (م ۲۵۵) جس شخص پر نظر ڈالتے تھے، صاحبِ کرامت ہو جاتا تھا۔ (تاریخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۵۴)

۷۔ میاں جی نور محمد (۱۲۷۴) نے جب اپنے ایک شاگرد پر توجہ ڈالی، تو اس کے اثر سے وہ سرمدیوں کے موسم میں، کمرہ میں، لحاف کے اندر صحن میں نیم کے درخت کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ تک سن لیتا تھا۔ (حوالہ ایضاً، ص ۲۳۹)

پھر یہی توجہ جب کسی کو نقصان پہنچانے یا جان سے ختم کر دینے کے لئے استعمال کی جاتی ہے، تو اسے نگاہِ جلالت کہتے ہیں۔

نگاہِ جلالت کی تباہ کاریاں

کہتے ہیں۔ ان اولیاء اللہ کی دنیا میں اس قسم کی توجہ کی بھی بے شمار مثالیں ہیں۔ چند ایک درج ذیل ہیں:

۱۔ ابویوسف ہمدانی (م ۵۳۵) نے دو قہار کو یہ کہہ کر ”تم خاموش ہو، زندہ نہ رہو“ مار دیا تھا

ان کا قصور یہ تھا وہ فقہاء آپ کو بدعتی کہتے تھے۔ (صوفیائے نقشبند، ص ۱۲۹)

۲۔ جنید بغدادی (م ۲۹۷ھ) نے اپنے ایک مرید کو ایک ہی نگاہ میں مار دیا تھا اس کا قصور یہ تھا کہ اس نے آپ کی مرضی کے خلاف آپ کی تقریر میں معرہ لگایا تھا۔ (غزنیۃ الاصفیاء، ص ۱۳۷)

۳۔ علار الدین صابر کلیری (خلیفہ فرید الدین گنج شکر) نے تو مسجد کو مسجدہ کرنے کا حکم دے کر سب خاریوں کو ہلاک کر ڈالا۔ قصور اُن کا یہ تھا کہ انہوں نے آپ کو امام کے مصطفیٰ سے اٹھا دیا تھا۔ (مدلیۃ الاولیاء، ص ۷۰)

پھر آپ کی یہ جلالت اتنی ہمہ گیر تھی اور جلال اتنا غالب تھا کہ وصال کے بعد بھی مزار پر ایک شعلہ چمکتا تھا جس کی وجہ سے کسی شخص کی مجال مزار پر جانے کی نہ ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت شاہ عبدالقدوس مزار پر حاضر ہوئے، تو حضرت کی درخواست پر وہ چمک موقوف ہوئی۔ (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۸۲)

غرض اس طرح کے واقعات بھی لاتعداد ہیں جن میں سے چند ایک کی تفصیل ہم "اولیاء اللہ کی گستاخی کا انجام" کے تحت پیش کر چکے ہیں اور پیران پیر توجانوں کو بھی اس نگاہ جلالت سے معاف نہیں فرماتے تھے۔ ایک دفعہ ایک جیل کو مار دیا۔ دوسری دفعہ ایک چوہے کو، تیسری دفعہ ایک چڑیا کو واقعات کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے اب خدائی کا ایک کارنامہ باقی رہ جاتا ہے، وہ ہے اخروی نجات۔ اس بارے میں اولیاء اللہ، خدا سے بہت زیادہ فیاض ثابت ہوئے ہیں۔

بیعت ہی اخروی نجات کی ضمانت ہے "پھر شیخ الاسلام (خواجہ فرید الدین) نے فرمایا کہ (ان کے دادا پیر) شیخ معین الدین حسن بھری (جشتی اجمیری) قدس سرہ العزیز کی یہ رسم تھی کہ جو کوئی ہمایہ میں سے اس دنیا سے نقل (انتقال) کرتا اس کے جنازے کے ساتھ جاتے اور خلق کے لوٹ جانے کے بعد اس کی قبر پر بیٹھتے اور جو درود کہ ایسے وقت میں پڑھتے آئے ہیں پڑھتے۔ پھر وہاں سے آتے۔ چنانچہ اجمیر میں آپ کے ہمایوں میں سے ایک نے انتقال کیا۔ دستور کے مطابق آپ جنازہ کے ساتھ گئے، جب اسے دفن کر چکے، خلق لوٹ آئی اور خواجہ وہاں ٹھہر گئے اور تھوڑی دیر کے بعد آپ اُٹھے۔ شیخ الاسلام قطب الدین فرماتے ہیں کہ میں آپ کے ساتھ تھا۔ میں نے دیکھا کہ دمدم آپ کا رنگ متغیر ہوا، پھر اسی وقت برقرار ہو گیا۔ جب آپ وہاں سے کھڑے ہوئے، تو فرمایا الحمد للہ بیعت بڑی اچھی چیز ہے۔"

شیخ الاسلام قطب الدین اوشی نے آپ سے سوال کیا۔ تو آپ نے فرمایا کہ "جب لوگ اس کو دفن کر کے چلے گئے، تو میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ عذاب کے فرشتے آئے اور چاہا کہ اس کو عذاب کریں۔ اسی

وقت شیخ عثمان ہارونی (آپ کے پیر صاحب، م ۶۰۳۴ھ) قدس سرہ العزیز حاضر ہوئے اور کہا کہ شیخ مفید کے مریدوں میں سے ہے۔ جب خواجہ عثمان نے یہ کہا، تو فرشتوں کو فرمان ہوا کہ کہو "یہ تمہارے برخلاف تھا" خواجہ نے فرمایا "بیشک، اگرچہ برخلاف تھا مگر چونکہ اس نے اپنے آپ کو اس فقیر کے پتے باندھا تھا، تو میں نہیں چاہتا کہ اس پر عذاب کیا جائے۔" فرمان ہوا "اے فرشتو! شیخ کے مرید سے ہاتھ اٹھاؤ، میں نے اس کو بخش دیا۔ پھر شیخ الاسلام آنکھوں میں آنسو جھرا لائے اور فرمانے لگے کہ اپنے آپ کو کسی کے پتے باندھنا بہت ہی اچھی چیز ہے" (راحتہ القلوب، ملفوظات خواجہ فرید الدین گنج شمس، مرتبہ خواجہ نظام الدین اولیاء، دہلوی، مترجم غلام احمد بریلوی، مطبع مجتبائی دہلی ص ۱۴۱)۔

کسی فقیر کے پتے باندھنے کے فوائد

- ۱۔ ان بزرگوں کے کمالات کے مظاہرہ کے لئے
- ۲۔ قبر ایک ضروری چیز ہے اور کشف قبور کے لئے درود بھی مخصوص قم کے ہوتے ہیں۔
- ۳۔ ان کے تصرف کا دائرہ دنیا کے علاوہ برزخ اور قیامت تک وسیع ہوتا ہے۔
- ۴۔ ان کی غیبی فیضانی طرح ہے اور فوراً امریہ کی مصیبت کے مقام پر پہنچ جانا فرشتوں کی مانند ہوتا ہے۔
- ۵۔ خدا نے جزا و سزا کا جو اٹل قانون مقرر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ كَلَّا نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَ وہ ان بزرگوں کی خواہش پر ہی غیر مؤثر ہو کر رہ جاتا ہے اور خدا اپنا فیصلہ بدل دیتا ہے۔
- ۶۔ ان بزرگوں میں اور خدا میں فرشتوں کی وساطت سے ہر وقت سوال جواب ہو سکتے ہیں۔ شریعت میں تو انبیاء ہی اس مرتبہ کے اہل ہوتے ہیں مگر صوفیوں کے دین میں پیر بھی کسی حیثیت سے کم نہیں ہوتے۔
- ۷۔ انبیاء تو قیامت کے دن شفاعت کریں گے، لیکن یہ حضرات دنیا میں ہی شفاعت کا کام شروع کر دیتے ہیں۔
- ۸۔ ملاحظہ فرمائیے کس خوب صورت انداز میں خدا کے بجائے اپنی خدائی تسلیم کرانی جا رہی ہے۔ بیعت کی آڑ میں کیا کچھ ذہن نشین کرایا جا رہا ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ، رسول اکرم ﷺ سے یوں فرما رہے ہیں۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَانَّهُمْ ظُلُمُونَ (۳۱/۱۳۸) یسے پیغمبر! اس کام میں تمہارا کچھ اختیار نہیں۔ یا خدا ان کے حال پر مہربانی کرے یا انہیں عذاب دے کہ یہ ظلم لوگ۔

ہمارے یہ بزرگ شفاعت کے بھی بڑے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں جبکہ قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت کا حق اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے مخصوص رکھا ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر کسی کو بھی شفاعت کرنے کی مجال نہیں۔ احادیث سے البتہ یہ ثابت

شفاعت اولیاء اللہ

ہے کہ روزِ محشر حضور اکرم ﷺ شفاعت فرمائیں گے۔ اُن کے بعد دوسرے نبی اور نیکوکار لوگ بھی شفاعت کریں گے، بشرطیکہ اپنے محاسبین کا میاں پرچھے ہوں اور سوائے لوگوں کے جنہیں دنیا میں ہی جنت کی بشارت مل گئی۔ کسی کو معلوم نہیں کہ اس کا اپنا حشر کیا ہوگا۔ پھر دوسروں کی ذمہ داری اپنے سر اٹھانا کہاں تک درست ہے؟ اب سب سے ذیل واقعات ملاحظہ فرمائیے۔

ابو الحسن خرقانی قیامت کے دن نجات دہندہ فرمایا: ”جو یہاں آتا ہے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ یہ جان لے کہ قیامت کے روز میں اس وقت تک کھڑا رہوں گا جب تک کہ یہاں آنے والے کو نجات نہ دلا لوں گا۔ اگر کوئی ایسا یقین نہیں رکھتا، تو اسے کہہ دو کہ یہاں مٹ آئے اور مجھے مٹ ملے۔“ (مقرآن حق، ص ۱۴۰)

اور صوفیائے نقشبند صفحہ ۱۱۶ پر یہ روایت درج کرنے کے بعد یہ الفاظ زیادہ بھی ہیں کہ ”ایسا شخص مجھے سلام بھی نہ کہے؟“

پیران سپیر تو تسل کے فائدے ۱۔ سیرۃ غوث الثقلین کے صفحہ ۱۲۴ پر مذکور ہے کہ ”غوث پاک کا ارشاد ہے: ”جو مسلمان میرے مدرس کے کسی دروازہ سے بھی گزرے گا۔ قیامت کے اس کو مذاب میں تخفیف ہوگی۔“ (طبقات الکبریٰ، ص ۱۱۲، ج ۱۔ ہجرت الاسرار، ص ۱۰۱۔ قلائد الجواہر، ص ۱۵)

۲۔ ایک روز نفلدو کا ایک آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا ”میرے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں نے اسے خواب میں دیکھا، وہ مجھے کہتا تھا کہ میں عذابِ قبر میں مبتلا ہوں، تم شیخ عبدالقادر کو میرے لئے دعا کرنے کو کہو۔“ آپ نے فرمایا، ”تہار والد میرے مدرس کے دروازے سے کبھی گزرا تھا؟“ اس نے کہا: ”جی ہاں!“ آپ سُن کر خاموش ہو گئے۔ دوسرے دن وہ آدمی پھر آیا اور کہنے لگا ”آج میں نے پھر والد کو خواب میں دیکھا وہ بہت خوش و خرم ہے اور سبز لباس زیب تن کئے ہے۔ عذاب اس سے دُور کر دیا گیا ہے اور مجھے کہا کہ تم ان کی خدمت میں حاضری دیتے رہا کرو۔“ آپ نے یسُن کر ارشاد فرمایا کہ ”یشک میرے رب نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ جو مسلمان میرے مدرس کے دروازہ سے گزرے گا، میں اس کے عذاب میں تخفیف کروں گا۔“ (ہجرت الاسرار، ص ۱۰۱۔ قلائد الجواہر، ص ۱۵۔ سفینۃ الاولیاء، ص ۷۰۔ تحفۃ قادریہ، ص ۴۴)

اب دیکھئے! مسلمانوں کی اولین درس گاہ مسجد نبویؐ ہے جس کے معلم حضور اکرم ﷺ خود تھے لیکن اس

مسجد کی فضیلت کے متعلق ہمیں کوئی روایت ایسی نہیں ملتی کہ اس کے دروازہ سے گزرنے پر عذاب میں تخفیف کا وعدہ کیا گیا ہو۔ لیکن پیر پیر سے اللہ نے بھی وعدہ فرما دیا ہے، پھر مسجد نبویٰ افضل برائی یا شیخ عبدالقادر کا درر نظامیہ؛ ۳۔ "غوث پاک کے زمانہ میں ایک شخص بہت ہی گنہگار تھا، لیکن اسے غوث پاک سے محبت ضرور تھی۔ اس کے مرنے کے بعد جب محکمہ کبیر نے اس سے سوالات کئے، تو اس نے ہر سوال کا جواب "عبدالقادر" کہتے ہوئے دیا۔ منکر نکیر کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آیا کہ "یہ بندہ اگر چہ فاسق ہے مگر عبدالقادر سے اسے محبت ہے۔ میں نے اسے بخش دیا اور عبدالقادر سے محبت اور حسن اعتقاد کے عوض اس کی قبر کو وسیع کر دیا۔" (تفہیم الناطق، ص ۲۳، بحوالہ سیرت غوث، ص ۱۱۴)

۴۔ بُندہ اشرف کے معنہ بابُ الانج کے قبرستان میں ایک قبر سے مردہ کے چمکنے کی آواز سنائی دینے کے متعلق لوگوں نے غوث پاک کی خدمت میں عرض کیا تو آپ نے فرمایا: "کیا اس قبر والے نے مجھے خنجر پہنا ہے؟" لوگوں نے کہا: "ہیں علم نہیں۔" پھر آپ نے پوچھا: "کیا اس نے کبھی میری مجلس میں حاضری دی؟" لوگوں نے کہا: "ہیں اس کا بھی علم نہیں۔" پھر آپ نے پوچھا: "کبھی اس نے میرے پیچھے نماز پڑھی تھی؟" لوگوں نے کہا: "ہیں اس کا بھی علم نہیں۔" پھر آپ نے فرمایا: "بھولا ہوا شخص خارہ میں ہی رہتا ہے۔" پھر آپ نے مراقبہ کیا اور سر اٹھا کر فرمایا: "فرشتوں نے مجھے کہا ہے کہ "اس شخص نے آپ کی زیارت کی ہے اور آپ سے حسن ظن اور محبت رکھتا تھا۔ لہذا اس سبب اللہ تعالیٰ نے اس پر رحم کر دیا ہے۔" اس کے بعد اس قبر سے کبھی آواز سنائی نہ دی۔" (قللہ الجواہر ص ۲۵، بحوالہ سیرت غوث، ص ۱۱۴)

دیکھا آپ نے پیرانِ پیر کی شفاعت کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ حب اہل دنیا سے کوئی گواہی دستیاب نہ ہوئی تو فرشتوں نے آکر گواہی بھی دے دی اور مغفرت کی بشارت بھی سنائی۔

۵۔ شیخ عبدالحی محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ: "مشائخ منقول ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے غوث پاک سے پوچھا: کہ ایک شخص نے آپ کی بیعت تو نہیں کی مگر آپ کا ارادہ مند ہے، تو کیا وہ شخص آپ کے مریدین میں شمار ہوگا اور ان کی فضیلتوں میں شریک ہوگا یا نہیں؟" آپ نے ارشاد فرمایا کہ "جس نے اپنے آپ کو میری طرف منسوب کیا۔ وہ میرے ارادت مندوں میں شامل ہو گیا۔ اگرچہ یہ طریقہ مکروہ ہے تاہم ایسا شخص میرے اصحاب اور مریدین میں سے ہے اور میرے پروردگار نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ "وہ میرے تمام اصحاب اہل مذہب، میرے طریقہ پر چلنے والوں اور میرے محبوبوں کو بہشت میں جگہ دے گا۔" (اخبار الاخیار فارسی، ص ۲۵)

قلائد الجواہر، ص ۱۵۔ ہجرت الاسرار، ص ۱۰۱۔ تحفہ قادریہ، ص ۳۸۔ بحوالہ سیرتِ نبوت، ص ۱۳۲)

۱۶۔ غوثِ اعظم نے فرمایا: ”جو کوئی مصیبت میں مجھ سے فریاد کرے، میں اس کی مصیبت کو دور کر ڈالوں گا۔ اور جو کوئی میرے توسل سے حاجت مانگے گا اللہ اس کی حاجت پوری کر دے گا۔“ (قلائد الجواہر، اخبار الاخیار وغیرہ بحوالہ سیرتِ نبوت، ص ۱۴۷)

۱۷۔ غوث الثقلین فرماتے ہیں کہ ”قیامت تک میرے دوستوں، محبتوں اور مریدوں میں سے جو کوئی ٹھوکر کھائے گا، میں اس کا ہاتھ پکڑ لوں گا۔“ (قلائد الجواہر، ص ۱۰۷، بحوالہ ایضاً)

۱۸۔ ”فرمایا: حق تعالیٰ نے میرے ہاتھ میں ایک کاغذ دیا۔ میں نے اپنی حد نظر تک دیکھا اس میں میرے اصحاب اور مریدوں کے نام لکھے ہوئے تھے جو قیامت تک اپنی نسبتوں کو میری طرف منسوب کر کے اس سلاح چاہیں گے۔ حکم ہوا۔ ”میں نے ان سب کو تیری وجہ سے بخش دیا۔“ (غزنیۃ الاسنیار، ص ۱۶۴)

دیکھا آپ نے، ادر اللہ تعالیٰ آپ کے ہاتھ میں اتنا لمبا چوڑا کاغذ تھا تھا ہے اور ابھی اسے ملاحظہ فرما ہی رہے ہوتے ہیں ادر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی مغفرت کا اعلان عام ہو جانا ہے۔ اسے ہی کہتے ہیں جھٹ منگنی پٹیہ۔
۹۔ غوثِ اعظم نے فرمایا ”مجھے اللہ کی عزت و جلالت کی قسم! کہ میرا ہاتھ اپنے مریدوں میں اس طرح ہے جس طرح آسمان کا سایہ ہے۔ اگر میرے مرید عالی مرتبہ نہ ہوں تو کچھ مضائقہ نہیں، میں تو اللہ کی بارگاہ میں عالی مرتبہ ہوں۔“

مُرِيدِي هُمْ وَطِبَ وَاشْطَحَ وَغَنِيَّ وَافْعَلْ مَا تَشَاءُ فَلَا تُسْمِعُنِي
اے میرے مرید خوش ہو اور بیباک ہاتھ سے جو چاہے کر گزرو۔ میرا نام جو بڑا ہے تیرے پاس
مُرِيدِي لَا تَخَفُ اللَّهُ رَبِّي عَطَانِي وَفُوعَةً نِلْتُ اَلْمَنَالِي
اے میرے مرید تو مت ڈرو۔ اللہ حکیم میرا رب ہے۔ اس نے مجھے رمت و بوندی عنایت فرمائی ہے اور میں اپنی امید کو پہنچا ہوں
نَظَرْتُ اِلَى بِلَادِ اللَّهِ جَمْعًا كَخَزَائِنٍ عَلَى حُكْمِ اتِّصَالِ
خدا کے تمام شہر اور ملک میری نگاہ میں رافی کے دانہ کی طرح ہیں اور میرے حکم اتصال میں ہیں۔
وَلَا نَبْ عَلَى اَلْأَقْطَابِ جَمْعًا فَحُكْمِي نَافِذٌ فِي كُلِّ حَالٍ
اللہ تعالیٰ نے مجھے جملہ اقطاب کا مختار بنایا ہے پس میرا حکم ہر حال میں نافذ ہے۔
وَمَا مِنْهَا شُهُورٌ أَوْ دُهُورٌ تَمُوتُ وَتَنْقَضِي إِلَّا اَتَالِي

- اور کوئی مہینہ اور سال ایسا نہیں ہے جو اپنے ٹھہور سے پہلے میرے پاس نہ آئے۔ (سیرتِ نبویؐ ص ۳۴)
- ۱۰۔ نیز آپؐ نے فرمایا کہ ”ہم میں کا ایک انڈہ ہزار میں اور چوزہ کی قیمت تو لگائی نہیں جاسکتی۔ نیز فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک کھانا ہوا دے دیا۔ جس میں قیامت تک آنے والے میرے احباب اور مریدوں کے نام درج تھے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان سب کو تیری وجہ سے میں نے بخش دیا۔“ (خزینۃ المصنف ص ۱۱۶)
- ۱۱۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے دارِ وعدہ جہنم سے، جن کا نام مالک ہے، دریافت کیا کہ میرے مریدوں میں سے تمہارے پاس کوئی ہے؟ جواب دیا ”عزت پروردگار کی قسم! کوئی بھی نہیں۔“ دیکھو! میرا دستِ حمایت میرے مریدوں پر ایسا ہے، جیسے آسمان زمین کے اوپر۔ اگر میرا مرید اچھا نہیں تو کیا ہوا میں تو اچھا ہوں۔ جلال پروردگار کی قسم! جب تک میرے تمام مرید بہشت میں نہیں چلے جائیں گے، میں بارگاہِ خداوندی میں نہیں جاؤں گا۔ اگر مشرق میں میرے ایک مرید کا پردہٴ محنت گر رہا ہو اور میں مغرب میں ہوں تو یقیناً میں اس کی پردہٴ پوشی لے کر جاؤں گا۔“
- (اخبار الاخیار، مصنفہ عبدالحق محدث دہلوی، ترجمہ مولانا ساجد محمد صاحب، ص ۴۹)

ان اقتباسات سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

- ۱۔ حضور اکرم ﷺ نے تو اپنی بیٹی حضرت فاطمہؓ سے یہ فرمایا تھا کہ ”آخرت میں تمہارے کام نہ آسکوں گا۔“ لیکن آپؐ کا سب مریدوں کی بخشش کے لئے اعلانِ عام ہے، تو اس روایت کے مطابق آپؐ مالی مرتبہ ہوتے یا حضور اکرم ﷺ؟
- ۲۔ آپؐ جو کسک اپنے بدکار مریدوں کی بخشش کا بھی ذمہ لے رہے ہیں، اس لئے کہ آپؐ خود تو اچھے ہیں، تو اس طرح تو اللہ تعالیٰ کا قانون غیر مؤثر ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر خدا کی ہوتی یا اللہ کی؟ مالک یوم الدین کون تھا؟
- ۳۔ خدا کے وعدہٴ مغفرت پر آپؐ کو اطمینان نہ ہوا، تو آپؐ نے باقاعدہ جہنم کے دارِ وعدہٴ مالک سے ملاقات کر کے تصدیق و توثیق کر لی بعد ازاں مریدوں کو یہ مژدہٴ جانفزا سنایا۔
- ۴۔ آپؐ کا مریدوں پر تصرف اتنا ہمہ گیر اور محیط ہے جیسے آسمان زمین کو محیط ہے اور غیبِ الٰہی کا یہ عالم کہ
- لے ان واقعات کی صحت کی ذمہ داری تکررہ نگاہوں پر ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے تو اپنی بیٹی سیدۃ النساءؓ سے فرمایا تھا کہ
- یا فاطمۃ! اتھمنی نفسک من النار فاطمہ! اپنی جان کو آگ سے خود بچاؤ رخصتِ کتب التفسیر ص ۷۷ شعرا
- اور پھر ایک دفعہ یوں ہی فرمایا تھا کہ ”اے فاطمہ! مجھ سے جو کچھ ہے (اسی دنیا میں ملگ لے، قیامت کے دن میں تمہارے کام نہ آسکوں گا۔“ (بخاری) اور ان حضرات کے یہ دعوے ساء ما یحکون ..

مشرق میں کسی مرید کو کچھ تکلیف پہنچ رہی ہو اور آپ مغرب میں ہوں تو بھی دستگیری کرنے کے لئے جائے واردات پر فوراً پہنچ جاتے ہیں۔

اب بتلاتے کہ اگر مریدوں کو آپ کے سلسلہ میں محض غسک ہو جانے سے اتنے فوائد حاصل ہو جائیں تو شرعی تکلیفات یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے ادا کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ کیا یہ کافی نہیں کہ آپ کے نام کی نذر گیارھویں دے دی جائے اور آپ کو بوقت ضرورت پکار لیا جائے تاکہ آپ کے متقین کے زمرہ میں شامل ہو کر آخرت میں نجات حاصل کی جاسکے؟

یہ مزارات اور خانقاہیں

قبر پرستی اور بُت پرستی میں قدر مشترک

ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ قوم نوح میں بُت پرستی سے پہلے قبروں پر اعتکاف اور مراقبہ کرنے کا رواج ہوا تھا۔ بعد میں انہی اولیاء اللہ کے مجسمے بنائے گئے اور ان کی پوجا شروع ہو گئی۔ ان دونوں قسم کی پرستشوں میں قدر مشترک یہ تھی کہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جس طرح مرنے کے بعد قبر کے ساتھ صاحبِ قبر کی روح کا تعلق باقی رہتا ہے اور وہ روح پکارنے والے کی پکار سنتی اور اس کی حاجت دوائی کرتی ہے، بعینہ اسی طرح اس "ولی" کا مجسمہ بنایا جائے تو اس سے بھی وہی فوائد حاصل ہو جاتے ہیں۔ لہذا ان لوگوں کی قبروں پر جانے کے بجائے انہوں نے شارٹ کٹ یہ سوچا کہ ان کے بُت بنائے جائیں جنہیں وہ جہاں چاہتے رکھ سکتے اور ان کی پوجا کر سکتے اور ان سے اپنی مرادیں پوری کر سکتے تھے۔ اسی سہولت کی خاطر بُت تراشی کا فن ایجاد ہوا، جو ایک پیشہ کی حیثیت اختیار کر گیا۔ لوگ اپنے ان "بُتے بنائے خداؤں" کو خرید لیتے اور جہاں چاہتے لے جاتے۔ چنانچہ عرب میں پہلا شخص جو بُت لایا وہ قصی بن کلاب تھا۔

قبروں سے متعلق بعینہ یہی تصور راج مسلمانوں میں بھی پایا جاتا ہے اور یہی تصور درحقیقت "ولایت یا اولیائی" کی روحِ رواں ہے۔ چونکہ اپنے بزرگوں سے عقیدت انسان کی فطرت میں رچی ہوئی ہے لہذا یہی شرک کا سب سے بڑا چور دروازہ ثابت ہوا ہے۔ یہاں چند ایک سوالات خود بخود ذہن میں ابھرنے لگے۔ مثلاً،

۱۔ کیا واقعی قبر کے ساتھ صاحبِ قبر کی روح کا تعلق ہوتا ہے، جو اس کی پکار سن کر اس کی حاجت دوائی کرتی ہے؟
۲۔ اور اگر کرتی ہے تو کیسے؟

۳۔ کیا جو کچھ قبروں پر ہوتا ہے اس کے متعلق شریعت خاموش ہے یا کچھ واضح احکام موجود ہیں؟

ہم سدا کی اہمیت کے پیش نظر ان تینوں باتوں پر تفصیل سے بات کریں گے۔

کیا فوت شدہ لوگ سن سکتے ہیں؟

اس سوال کو شرعی اصطلاح میں "سماع موتی" کہا جاتا ہے۔ اس کے متعلق قرآن کریم کے واضح ارشادات موجود ہیں۔ مثلاً:

وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ (۲۰-۲۱/۱۶)

اور جن لوگوں کو یہ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ کوئی چیز بھی نہیں بنا سکتے، بلکہ وہ خود پیدا کئے گئے ہیں۔ وہ لاشیں ہیں بے جان، ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ إِنَّ اللَّهَ يُسْمِعُ مَنْ يَشَاءُ وَمَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَنْ فِي الْقُبُورِ (۲۱-۲۲/۳۵)

اور نہ ہی زندہ اور مرنے والے برابر ہو سکتے ہیں۔ خدا جس کو چاہتا ہے سنا دیتا ہے اور تم ان کو جو قبروں میں (مدفن) ہیں سننا نہیں سکتے۔

اور تیسرے مقام پر فرمایا:

وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّن يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَنْ لَا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَائِهِمْ غَافِلُونَ وَإِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوا لَهُمْ أَعْدَاءً وَكَانُوا بِعِبَادَتِهِمْ كُفَرِينَ (۵-۶/۴۶)

اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہو سکتا ہے، جو ایسے کو پکارتے جو قیامت تک اسے جواب نہ دے سکے اور ان کو ان کے پکارتے کی خبر بھی نہ ہو اور جب لوگ قیامت کو اٹھنے گئے جائیں گے، تو وہ ان کے دشمن ہوں گے اور ان کی پرستش سے انکار کریں گے۔

یہ اور اسی طرح قرآن کریم میں اور بھی کئی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مردے سن نہیں سکتے، لیکن سماع موتی کے قائلین ہر آیت کی کوئی نہ کوئی ایسی تاویل و توجیہ پیش کر دیتے ہیں جن سے کم از کم فوت شدہ بزرگان کرام کے سننے کا اشتنا ہو سکے۔ لہذا ان آیات کا ہم ذرا تفصیل سے جائزہ لیں گے۔

یہ تو واضح ہے کہ عبادت یا توبتوں کی ہوتی رہی ہے یا سوچ چاند، ہوا پانی، درخت وغیرہ یا فوت شدہ بزرگوں کی یا جنوں اور فرشتوں کی۔ اب دیکھتے آیت نمبر ۱ میں جنوں اور فرشتوں پر آموات غیرواحیاء کا اطلاق نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ دونوں غیر مرنے والے اور ان کے مرنے جیسے کو ہم معلوم نہیں کر سکتے اور بتوں

یاد دیگر مظاہر پر بحث بعد الموت کا اطلاق نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں وَمَا يَشْعُرُونَ اَيَّانَ يُبْعَثُونَ کے الفاظ بھی ان کو خارج از بحث قرار دے رہے ہیں۔ لہذا محالہ اس آیت سے صرف فوت شدہ بزرگ ہی مراد لئے جاسکتے ہیں۔ اس توجہ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ مشرکین مکہ تو بت پرست تھے وہ قبر پرست تو نہیں تھے۔ یہ اعتراض بھی غلط ہے کیونکہ یہود و نصاریٰ کی قبر پرستی تو احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ پھر احادیث آثار سے یہ بھی ثابت ہے کہ میں۔ تنوں کی پستش ہوتی تھی تو وہ انہی بزرگان کرام کے مجسے تھے، جن کی پہلے قبریں پوجی جاتی تھیں۔ جیسے ہم پہلے وضاحت کر چکے ہیں۔

آیت نمبر ۲ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہاں اموات سے مراد، مردہ ضمیر کا فریہ اور من فی القبور سے مراد گمراہی میں پڑے لوگ۔ گویہ مطلب بھی لیا جاسکتا ہے، لیکن کوئی قرینہ ایسا نہیں کہ اس سے مراد فوت شدہ بزرگ نہ لئے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے اصل معانی وہی ہیں جو بظاہر الفاظ سے معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہاں اموات سے مراد کفار بھی لئے جاسکتے ہیں۔ تاہم یہی وہ آیت ہے جس سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سماع موتی کے انکار پر استدلال فرمایا تھا۔

مزید فرمائیے آیت نمبر ۳ میں عَنْ دَعَائِهِمْ غُفْلُونَ کے الفاظ جنوں اور فرشتوں کو معبودان باطل کے زمرہ سے خارج کر دیتے ہیں، کیونکہ ان کی موت و زیست کا ہمیں علم نہیں اور بجات زیست وہ دُعائیں سکتے ہیں اور كَانُوا لَهُمْ اَعْدَاءُ کے الفاظ جنوں اور مظاہر کو اس زمرہ سے نکال دیتے ہیں۔ کیونکہ ان بے جان اشیاء کی نہ دنیا میں دوستی کا کچھ فائدہ نہ آخرت میں دشمنی کا کچھ نقصان بلکہ ان میں اکثر چیزوں کا تو اس وقت وجود تک بھی نہ ہوگا۔ باقی صرف فوت شدہ بزرگ رہ جاتے ہیں، جو اس آیت کا مصداق بن سکتے ہیں۔

اب احادیث کی طرف آئیے۔ سماع موتی کے حق میں سب سے بڑی دلیل بد کا واقعہ پیش کیا جاتا ہے، جو بخاری میں بالتفصیل کتاب

الغازی میں مذکور ہے۔ چوبیس کافروں کی لاشیں ایک کنوئیں میں پھینک دی گئی تھیں۔ ان سب کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مخاطب کر کے اور نام بمعہ والد (لے فلاں ابن فلاں) لے لے کر پکارا اور کہا کہ ”ہم سے تو اللہ نے وعدہ کیا تھا، وہ پورا کر دیا، کیا تم سے اللہ کا وعدہ پورا ہوا؟“ تو اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ”یا رسول اللہ! یہ تو مرنے ہیں۔“ تو آپ نے فرمایا: ”کہ تم ان سے زیادہ نہیں سن رہے۔“

اب حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ اسے ایک استثنائی صوت (یعنی اللہ کا اسماع ہے) قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

خدا نے اس خاص وقت میں ان کو زندہ کر دیا تھا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یوں فرماتی ہیں کہ وہ جس حالت میں بھی تھے، خدا نے ان کو معلوم کر دیا تھا اور پھر یہ آیت پڑھی ان الله يسمع من يشاء وما انت بمسمع من القبور۔

تاہم بعض صحابہ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور کچھ مفسرین کا اس بارے میں اختلاف تھا مگر وہ بھی مُردوں کے سننے کی حد تک۔ مَن کر جواب دینے یا جوابی کارروائی کرنے کا کوئی بھی قائل نہ تھا۔ ملاحظہ ہو تیسرے الباری، حاشیہ متعلقہ حدیث مندرجہ، سماع سے متعلق اختلاف کی اصل وجہ دراصل چند دوسری احادیث تھیں، مثلاً؛

- ۱۔ جب ہم قبرستان جاتے ہیں، تو ہمیں السلام علیکم یا اهل القبور.... الخ پڑھنے کا حکم ہے۔ پھر اگر مُردے سنتے ہی نہیں، تو اس طرح مخاطب کے کیا معنی؛
- ۲۔ احادیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ مُردے کو جب دفن کر کے واپس آتے ہیں تو وہ واپس لوٹنے والوں کی جوتیوں کی چاپ سنتا ہے۔

حدیث نمبر ۱ کی مندرجہ آیات سے تطبیق یوں ہوتی ہے کہ یہ سلام، سلام دُعا ہے۔ سلام تحیہ نہیں۔ سلام تحیہ وہ ہوتا ہے جن کا جواب دینا فرض ہوتا ہے۔

بموجب ارشاد باری تعالیٰ :

وَإِذَا جِئْتُمْ بِتَحِيَّاتٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنِ
مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا (۴۸۵) دُعا دینا اپنی لفظوں سے دُعا دو۔

اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تم ایک دوسرے سے ملو تو ایک السلام علیکم کہے اور دوسرے ملے علیکم السلام سے جواب دے۔ اور یہ جواب دینا فرض ہے۔

دوسری قسم سلام دُعا ہے۔ اس کا جواب دینا تو درکنار سنا بھی مخاطب کے لئے ضروری نہیں ہوتا۔ جیسے ہم کسی کو خط لکھتے ہیں تو ابتداءً اسے مخاطب کر کے السلام علیکم لکھتے ہیں۔ پھر کبھی اس کا جواب آجاتا ہے کبھی نہیں بھی آتا۔ اس کی دوسری مثال سلام ہے، جو ہم نماز میں حضور اکرم ﷺ پر اپنے آپ پر اور تمام نیک بندوں پر پڑھتے ہیں۔ اب ظاہر ہے حضور اکرم ﷺ یا دوسرے نیک بندوں میں سے کوئی بھی نہ یہ سلام سنا تھا نہ اس سلام کا جواب دیتا تھا۔ کیونکہ مَن لینے کے بعد اس کا جواب دینا فرض ہو جاتا ہے۔ گو یا یہاں بھی یا ایہا النبی میں یا

کالفظ "ندا" کے طور پر نہیں۔ بلکہ نماز کے اذکار جو آنحضرت ﷺ سے مانور ہیں۔ وہ اسی طرح اور اسی ترتیب سے بطور حکایت پڑھے جاتے ہیں۔ بالکل یہی صورت اسلام میکیم یا اهل القبور..... کی بھی ہے۔

حدیث نمبر ۳ میں جو مرنے کا جانے والوں کی جوتیوں کی چاپ سننے کا ذکر ہے۔ تو یہ محض اسے حسرت دلانے کے لئے اللہ تعالیٰ سنا دیتے ہیں جس طرح قلیب بدر کے کافروں کو اللہ تعالیٰ نے سنا دیا تھا۔ اس حدیث میں یہ ذکر نہیں کہ وہ ان قبر پر آنے والوں کی بھی چاپ سننا ہے یا ان کی دوسری باتیں بھی سننا ہے۔ صرف رخصت کر کے جانے والوں کی جوتیوں کی چاپ کا ذکر ہے کہ لوجن عزیزوں کے لئے تم نے اپنی زندگی کا بیشتر اور عزیز ترین حصہ صرف کر دیا اور محال و حرام تک بھی تمیز نہ رکھی وہ سب چھوڑ کر واپس جا رہے ہیں۔ منکوحہ کا سوال جواب ایک استثنائی اور اضطراری امر ہے۔ لہذا اس اضطرار سے علی الاطلاق سماع موتی کا امکان درست نہیں کہ یہ بھی استثنائی صوت ہے۔

مندرجہ آیت نمبر ۳ کے ضمن میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے تفہیم القرآن میں سماع موتی سے متعلق جو حاشیہ لکھا ہے۔ وہ اس مسئلہ سے متعلق بیشتر اشکال کو دور کر دیتا ہے۔ لہذا اس کو یہاں درج کرنا مناسب ہے گا۔ (صفحہ ۴۶، آیت نمبر ۵، حاشیہ از تفہیم القرآن، جلد ۴)

یعنی ان تک ان پکارنے والوں کی آواز سرے سے پہنچتی ہی نہیں۔ زوہ خود اپنے کانوں سے اس کو سنتے ہیں نہ کسی ذریعہ سے ان تک یہ اطلاع پہنچتی ہے کہ دنیا میں انہیں کوئی پکار رہا ہے۔ اس ارشاد الہی کو تفصیلاً یوں سمجھئے کہ دنیا بھر کے مشرکین خدا کے سوا جن ہستیوں سے دعائیں مانگتے رہے ہیں وہ تین اقسام پر منقسم ہیں ایک بے روح اور بے عقل مخلوقات، دوسرے وہ بزرگ جو گڑبچھے۔ تیسرے وہ گمراہ انسان جو خود بھی گمراہ ہوئے تھے اور دوسروں کو بھی بگاڑ کر دنیا سے رخصت ہوتے۔ پہلی قسم کے معبودوں کا تو اپنے مابذوں کی دعاؤں سے بے خبر رہنا ظاہر ہے ہی۔ رہے دوسری قسم کے معبود، جو اللہ کے مقرب انسان تھے، تو ان کے بے خبر رہنے کے دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کے ہاں اس عالم میں ہیں جہاں انسانی آوازیں براہ راست ان تک نہیں پہنچتی دوسرے یہ کہ اللہ اور اس کے فرشتے بھی ان تک یہ اطلاع نہیں پہنچاتے کہ جن لوگوں کو یہ بزرگ ساری عمر اللہ سے دُعا مانگنا سکھاتے رہے تھے وہ اب الٹی آپ (اس بزرگ) سے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ اس لئے کہ اس اطلاع سے بڑھ کر ان کو صدمہ پہنچانے والی کوئی چیز نہیں ہو سکتی اور اللہ اپنے ان نیک بندوں کی اذراہ کو اذیت دینا ہرگز پسند نہیں کرتا۔ اس کے بعد تیسری قسم کے معبودوں پر غویہ مجھے تو معلوم ہو گا کہ ان کے بے خبر رہنے کی بھی دو

ہی وجہ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مظلوموں کی حیثیت سے اللہ کے ہاں حوالا ت میں بند ہیں۔ جہاں دنیا کی کوئی آواز نہیں پہنچتی۔ دوسرے یہ کہ اللہ اور اس کے فرشتے بھی انہیں یہ اطلاع نہیں پہنچاتے کہ تمہارا مشن دنیا میں خوب کامیاب ہو رہا ہے اور لوگ تمہارے پیچھے تمہیں معبود بنائے بیٹھے ہیں۔ اس لئے کہ یہ خبریں ان کھلتے مسرت کی موجب ہوں گی اور خدا ظالموں کو ہرگز خوش کرنا نہیں چاہتا۔“

”اس سلسلے میں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو دنیا والوں کے سلام اور اُن کی دعاؤں سے رحمت دے دیتا ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں ان کے لئے فرحت کی موجب ہیں اور اسی طرح وہ مجرموں کو دنیا والوں کی لعنت اور پھٹکار اور زہر و تیو ج سے مطلع فرمادیتا ہے۔ جیسے جنگِ بدر میں مکے جانے والے کفار کو ایک حدیث کے مطابق نبی کریم ﷺ کی تیو ج سنوا دی گئی۔ کیونکہ ان کے لئے یہ اذیت کی موجب ہے۔ لیکن کوئی ایسی بات جو صاحبین کے لئے رنج کی موجب یا مجرمین کے لئے فرحت کی موجب ہو وہ ان تک نہیں پہنچاتی جاتی۔ اس تشریح سے سماعِ موتی کے مسئلے کی حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔“

مردوں کی بزرخی زندگی

دُر اصل سماعِ موتی کی بحث سے پہلے ایک اور بحث بھی پیدا ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ مُردے سُن تو تبت ہی سکتے ہیں۔ جب وہ زندہ ہوں۔ تو سوال یہ ہے کہ آیا مُردے زندہ بھی ہیں یا نہیں اور اگر زندہ ہیں تو کس طرح کی زندگی ہے؟ تو اس کے متعلق قرآن و حدیث میں واضح ارشادات موجود ہیں کہ رُوح کو چاروں مراحلِ موت و زیست میں فنا نہیں۔ وہ جب سے پیدا ہوئی ہے۔ زندہ رہنے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اب دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر وہ زندہ ہیں تو کہاں رہتی ہیں، تو اس کا واضح جواب یہ ہے کہ کافروں کی رُوحیں ”سجین“ اور مومنوں کی ”عطیں“ میں۔ یہ مقام کہاں واقع ہیں؟ یہ جاننے کے ہم تکلف ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں، کیونکہ یہ بزرخی زندگی کا معاملہ ہے۔ البتہ شہیدوں کی رُوحوں کے بارے میں تخصیص ہے۔ ارشادِ باری ہے :

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ
بَلْ أَمْوَاتٌ وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ (۲۸۵۴)

اور جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ نہ کہو۔ بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تم نہیں سمجھتے۔

اور دوسرے مقام پر فرمایا :

وَلَا تَحْزَنَ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ

اور جو اللہ کی راہ میں مارے گئے انہیں مردہ سمجھو

سہ مزید تفصیلات کے لیے میری تصنیف ”ذخا“ و ”غاب“ قبر اور سماعِ موتی ملاحظہ فرمائیے۔

بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْتَفُونَ (۳۶:۹۹) زندہ ہیں اور اپنے رب کے ہاں رزق پا رہے ہیں۔

گو یا شہداء کی زندگی عام لوگوں سے مختلف اور بہتر تو ہے لیکن سمجھ ہم وہ بھی نہیں سکتے۔ اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

”جو شخص بہشت میں جاتا ہے وہ پھر دنیا میں آنا پسند نہیں کرتا۔ گو اس کو ساری زمین کی دولت ملے البتہ شہید دنیا میں آنے کی اور دس بار اللہ کی راہ میں قتل ہونے کی آرزو کرتا ہے کیونکہ وہ شہادت کی عزت وہاں دیکھتا ہے۔“ (بخاری۔ کتاب الجہاد والسیر۔ باب تنہی الجہاد ان یرجع الی الدنیا)

ان ارشادات سے واضح ہو گیا کہ کوئی نیک آدمی جو بہشت میں جاتا ہے۔ اس کی رُوح دنیا میں واپس نہیں آسکتی کیونکہ یہ اللہ کے دستور کے خلاف ہے۔ اب ہم دیکھیں گے کہ اللہ کی سنت یا دستور کیا ہے؟ اور شہداء کی تکمیل کی وجہ کیا ہے؟

انسان کی رُوح کا سفر کچھ اس طرح ہے کہ وہ بطنِ مادر میں داخل ہونے سے مدّتوں پہلے پیدا ہو چکی تھی پھر اپنے وقتِ پختن میں داخل ہوتی ہے۔ پھر بچہ پیدا ہوتا ہے، پھر جوان ہوتا ہے۔ پھر بوڑھا ہوتا ہے پھر مر جاتا ہے۔ مرنے کے بعد رُوح عالمِ برزخ میں چلی جاتی ہے۔ قیامت تک وہاں رہے گی۔ پھر سفرِ آخرت ہے۔ نیک رُوحیں جنت میں چلی جائیں گی اور بد رُوحیں جہنم میں۔ یا اللہ تعالیٰ ان جہنمیوں میں سے بھی بعض کو بعد میں جنت میں داخل کر دیں گے جس میں یہاں پہنچ کر یہ سفر ختم ہو جاتا ہے۔

اب اس سفر کی ترتیب بدل نہیں سکتی، لیکن اس میں شارٹ کٹ ہو سکتا ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ بچہ جوان یا بوڑھا ہونے سے پیشتر ہی مر جائے، لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی بوڑھا بچہ بن جائے۔ شہداء کی تکمیل اور تحسین یہ ہے کہ انہیں مرنے کے بعد برزخ میں نہیں رکھا جاتا بلکہ براہِ راست انہیں جنت میں بھیج دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ شہیدوں کی رُوحیں سبز پرندوں کی شکل میں جنت کے باغوں میں چھپاتی پھرتی ہیں۔

اب یہ تو ظاہر ہے کہ برزخ یا بہشت میں رہنے والی رُوحیں اس دنیا کے لوگوں کی پکار یا مدعا یا بات سن نہیں سکتیں۔

کیا رُوح کا اس دنیا میں واپس آنا ممکن ہے؟

اللہ تعالیٰ پہنچا دے تو الگ بات ہے۔ بدکار لوگوں کی رُوحیں ویسے ہی مقتید ہیں۔ انہیں یہاں آنے کی اجازت یکے ہو سکتی ہے اور نیک لوگوں کی رُوحیں کسی قیمت پر اس دنیا میں آنے کا نام نہ لیں گی۔ البتہ شہیدوں

کی رُو میں آنے کی آرزو کریں گی۔ وہ بھی اس لئے نہیں کہ اپنے اہل و عیال یا متعلقین کی صورتِ حال سے مطلع کریں اور ان کی حاجت روائی یا مشکل کشائی یا بشارات سنائیں بلکہ اس لئے کہ بار بار شہید ہو کر ان کا درجہ اور زیادہ بلند ہو جو ان کو پہلی مرتبہ شہید ہونے پر ملا۔

پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ بدکاروں اور عام مسلمانوں کی رُو میں تو علمِ برّخ و بحین اور عِلّیّین ہمیں ہوئیں اور شہیدوں، نبیوں اور صدّیقوں وغیرہ کی جنت میں جو دنیا سے بہت دُور اور سفر کی آخری منزل ہے۔ پھر بھلا وہ رُو میں اس دنیا میں کیوں آئیں گی؟

ان تصریحات سے صاف واضح ہو گیا کہ قبر میں یا اُس کے آس پاس یا اس دنیا میں کسی فوت شدہ انسان کی رُوح نہیں ہوتی۔ لہٰذا سماعِ موتی کی بحث ہی سرے سے ختم ہو جاتی ہے۔ رہا درود و سلام کو مسئلہ تو اس کی وضاحت، پہلے بیان ہو چکی ہے۔ اور اسی تصریح کی تائید احادیث بھی کرتی ہیں۔

لیکن ہمارے صوفیاء بصد ہیں کہ ولی زندہ ہوتے ہیں اور انہوں نے ایک

اولیاء اللہ مرتے نہیں

حدیث یا مقولہ بھی بنایا ہوا ہے کہ اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰهِ لَا یَمُوتُوْنَ یعنی ولی مرتے نہیں۔ ان پر اس اک لمحہ کے لئے موت آتی ہے۔ پھر زندہ ہو جاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کا جدِ مبارک آپ کی وفات سے ۳۲ گھنٹے بعد دفن کیا گیا۔ تو کیا اس وقت وہ زندہ تھے؟ اور اگر زندہ تھے تو وہ صحابہ کی باتیں سنتے تھے؟ اور اگر سُن سکتے تھے، تو پھر بولتے کیوں نہ تھے۔ نیز یہ کہ اگر زندہ تھے تو انہیں دفن کیوں کیا گیا؟ اگر ان صوفیاء کے عقیدہ کو صحیح سمجھ لیا جائے، تو ایسے لاتعداد سوال اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ جن کا کوئی جواب نہیں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ پیری فقیری کے کاروبار کا سبب بڑا چور دروازہ یہی سماعِ موتی کا مسئلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے مُردوں کے سننے کی پر زور تردید کی اور اس کی تمام امکانی شکلوں کا دروازہ بند کر دیا۔ حدیث میں اگر مُردوں کے سننے کے متعلق کچھ اشارات ملتے ہیں، تو بعینہ ان کے بولنے کے متعلق بھی ملتے ہیں۔ مثلاً حدیث میں ہے کہ کسی نیک آدمی کی میت یہ کہتی ہے کہ قَدْ مُوْتِف

لے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اپنے مُرشد میاں جی نور محمد (م ۱۲۵۹ھ) کی وفات کے وقت ان کے پاس موجود تھے۔ آپ فرماتے ہیں:

”مرض الموت میں جب آپ نے یہ کلمات کہے کہ پیامِ سفر آخرت آگیا ہے، تو میں پاکی کی چٹی پٹو کر ڈالنے لگا۔ حضرت نے تسلی دی اور فرمایا کہ ”فقیر تائیں بلکہ ایک مکان سے دوسرے مکان میں انتقال کرتا ہے۔ فقیر کی قبر سے وہی فائدہ ہوگا جو ظاہری زندگی

قَدْ مُؤَنَّفٌ ” مجھے جلدی لے چلو، جلدی لے چلو (یعنی جلدی جا کر قبر میں دفن کرو) اسی طرح بدکار آدمی کی میت کہتی ہے کہ ”ہائے مجھے کہاں لے جائے ہو؟“ اب بتائے کیا آپ نے کسی میت کی یہ آواز سنی ہے؟

بات یہ ہے کہ ہم مردوں کے بولنے یا سننے کو سمجھ نہیں سکتے کیونکہ وہ بزخی زندگی کا بولنا اور سننا ہے، تو جس طرح ہم بزخی زندگی میں مردہ کی پکار اس دنیا میں سن نہیں سکتے۔ اسی طرح مردہ روحیں جو بزخی زندگی میں ہیں، ہماری پکار سن نہیں سکتیں۔ اس کی تھوڑی بہت وضاحت خواب سے ہو سکتی ہے۔ سوتا آدمی جاگنے کی آواز نہیں سن سکتا۔ حالانکہ وہ زندہ ہوتا ہے اور خواب میں سونے والا آدمی جو کچھ باتیں دوسروں سے کرتا ہے۔ پاس بیٹھا جاگتا آدمی سن نہیں سکتا۔ بعینہ یہی مثال فوت شدہ آدمیوں کے بولنے اور سننے کی ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ بزرگ حضرات اپنے کشف کے ذریعہ ان رُوحوں سے ملاقات کرتے اور ان سے سوال جواب کر سکتے ہیں، اپنی سنا سکتے ہیں، ان کی سن سکتے ہیں۔ لیکن یہ سماع موتی کا مسئلہ تو عوام سے متعلق ہے جو قبروں پر جا کر نذریں نیازیں چڑھاتے ہیں۔ پھر جس طرح صوفیاء اور علمائے شریعت میں سماع موتی کا مسئلہ زیر بحث ہوا ہے، کبھی آپ نے یہ بھی سنا ہے کہ مردوں کے بولنے کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا ہو؟ آخر اس کی کیا وجہ ہے اگر وہ زندہ ہیں تو انہیں بولنا بھی چاہئے۔ آپ اس مسئلہ پر جتنا غور کریں گے یہی حقیقت سامنے آئے گی کہ اس مسئلہ کی تہ میں ”دنیوی مال اور عترت و جاہ کی طلب“ ہی کارفرما ہیں۔ اور انہی دو باتوں کے واسطے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

”وَمَنْ جُوعًا يَبْتَغِيهِ أَوْ يَبْتَغِيهِ لِمَا يَبْتَغِيهِ أَوْ يَبْتَغِيهِ لِمَا يَبْتَغِيهِ أَوْ يَبْتَغِيهِ لِمَا يَبْتَغِيهِ“ (ترمذی) ان تصریحات کے باوجود ہمارے صوفیاء نے صاحب قبر کی روح کو قبر میں موجود ہونے اور بیرونی معاملات سے پورا علم رکھنے کو اپنے ایمان کا جزو بنا دیا ہے۔ جیسا کہ درج ذیل واقعہ سے ظاہر ہے:

”نقل ہے کہ ایک بار آپ (شبلی) حضرت جنید کے مزار پر انوار پر کھڑے تھے۔ کسی نے ایک مسئلہ پوچھا: آپ نے جواب نہ دیا۔ اس نے عرض کیا ”آپ جواب کیوں نہیں دیتے؟“ فرمایا: ”صاحب قبر سے حیا آتی ہے۔ ان کے سامنے جواب کیسے دوں؟“ پھر یہ شر چڑھا:

انہی لامتحییت فی التراب بیننا کما کنت استحییت و هو یراف

بلاشبہ میں ان کے قبر میں ہونے کے باوجود ایسے ہی حیا کرتا ہوں جیسے کہ میں زندگی میں کرتا تھا اور وہ مجھے دیکھ رہے ہوتے تھے۔

صحابِ قبر کی حاجت برآری

قرآن و حدیث سے یہ واضح ہے کہ صاحبِ قبر کی رُوح نہ اس دنیا میں واپس آتی ہے۔ نہ وہ کسی پکارنے والے کی پکار سنتی ہے، نہ اسے کچھ خبر ہوتی ہے اور اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ کب اس کے جسم کا ٹھکانہ ٹھکانا جائے گا۔ لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ قبروں پر مراقبہ کرنے والوں کو بسا اوقات صاحبِ قبر کی رُوح ملتی ہے۔ اس سے سوال و جواب ہوتے ہیں اور مکاشفات کا داؤ مدار ہی اسی بات پر ہے۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اہل قبر سے مرادیں مانگنے والوں کی بعض اوقات مرادیں بھی پوری ہو جاتی ہیں، تو آخر یہ کیا معتمہ ہے؟

پھر یہ بھلا صرف اتنا ہی نہیں کہ قبر سے حاجت برآری ہوتی ہے بلکہ بتوں سے بھی ہو جاتی ہے بہت بھی بسا اوقات اپنے ہجاریوں کے سوالوں کے جواب دے کر انہیں مطمئن کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے باب میں بتوں کی کرامات کے تحت دو واقعات درج کر آئے ہیں۔ پھر یہ بات اتنی ہی نہیں۔ ایسی مرادیں درختوں، پتھروں، سوچ، چاند، ستاروں، آگ وغیرہ کی پرستش کرنے سے بھی پوری ہو جاتی ہیں۔ ورنہ انسانوں کی اتنی کثیر تعداد انہیں کبھی نہ لپو جتی۔ پھر یہ بات اس سے بھی آگے چلتی ہے۔ آپ بغیر مُردہ کے ایک قبر تعمیر کر کے اس پر باقاعدہ غلاف وغیرہ چڑھا کر یا ایسے ہی کوئی لکڑی یا مرام ہوا جانور دفن کر کے اس پر قبر تعمیر کر دیں اور مجاور بن کر بیٹھ جائیں تو مرادیں وہاں سے بھی پوری ہونا شروع ہو جائیں گی۔ اور بعض دفعہ آپ کو آپ کی دعا و پکار کا جواب بھی مل جائے گا۔

ایک بزرگ سات قبریں اور حار و آبیان

سیرت خواجہ اویس قرنی کا تذکرہ نگار لکھتا ہے کہ خواجہ اویس کہاں فوت ہوئے اور کہاں دفن ہوئے؟ اس

مختلف ہے۔ سات مقامات کا نام لیا جاتا ہے اور سات جگہ ہی آپ کا مزار ہے اور یہ ساتوں مرجع

خاص و عام ہیں۔“ (الادیس، ص ۸۶-۸۵، اولیٰ سہ بشر لاہور)

اب اس گھر کی شہادت کے بعد بھی کچھ شبہ رہ جاتا ہے کہ مراقبہ کی صُوت میں صاحبِ قبر کی رُوح سے سوال و جواب نہیں ہوتے بلکہ وہ کوئی اور ہی چیز ہوتی ہے، جو انسانوں، قبروں، بتوں، درختوں اور پتھروں

سے جواب دیتی اور بزم خود ان کی بعض مراءیں پوری کرتی ہے شرابی کا قول ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے ہر ولی کی قبر پر ایک فرشتہ مقرر کر دیا ہے، جو اس ولی سے مانگی گئی حاجتیں پوری کرتا ہے۔" (غایۃ الامانی، ص ۱۴۱)

لیکن یہ حاجت برآری کا مسئلہ اگر صرف قبروں تک محدود ہوتا تو شاید یہ بات بلا سہ تہجی تسلیم کر لی جاتی۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ حاجت برآری کا مسئلہ تمام مذکورہ اشیاء میں یکساں پایا جاتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ انسان چلہ کشی، ریاضتوں اور بعض دوسرے فنون کے ذریعہ غیر مرنی مخلوق کو دیکھنے اور اس سے استفادہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس غیر مرنی مخلوق یا عالم ارواح میں بھی کئی طرح کی مخلوق پائی جاتی ہے۔ ان میں فرشتے بھی پائے جاتے ہیں، جنات بھی، شیطان کے لشکر بھی اور بقول ان لوگوں کے فوت شدہ انسانوں کی روہیں بھی۔ انسانوں کی فوت شدہ روہوں کے متعلق وضاحت ہو چکی کہ وہ دُنیا میں نہیں آ سکتیں۔ فرشتے پہلے ہی مامورین اللہ ہوتے ہیں، جیسے چاند و سورج وغیرہ ہیں۔ ان کی عبادت بھی انہی چیزوں کی طرح اختیاری نہیں بلکہ اضطراری ہے۔ باقی جن اور شیطان ہی رہ جاتے ہیں۔ جن بھی کو انسان کی طرح شرعاً مکلف ہیں۔ مگر ان میں سے بھی انسانوں کی طرح بیشتر طبقہ گمراہ ہی رہا ہے۔ اور یہ شیطان اور جن۔ ہر طرح کی شکل اور ہر ایک کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ البتہ وہ حضور اکرم ﷺ کی شکل نہیں دھار سکتے، تاہم یہ ضرور کر سکتے ہیں کہ کسی اور بزرگ کی شکل دھار کر مراقبہ کرنے والے سے یہ کہہ دیں کہ میں ہی حضور اکرم ﷺ ہوں۔ ایلیس کو خدا نے وسوسہ کا تصرف بھی دیا ہے اور اس نے سینہ پر ہاتھ مار کر کہا تھا کہ "اے خدا! میں تیرے اکثر بندوں کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔" وہ انسانوں سے زیادہ بخیر اور ہوشیار ہے۔ ہم پچھلے صفحات میں عنوان "دیدار الہی اور شیطانی فریب" کے تحت ایک واقعہ نقل کر چکے ہیں، جو شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا اپنا نقل کردہ ہے کہ شیطان نے انہیں بھی گمراہ کرنے کی کوشش کی، مگر وہ اللہ کی مہربانی سے بچ گئے۔ اس وقت شیطان نے کہا کہ میں تمہارے جیسے ستر ناپوں کو گمراہ کر چکا ہوں، اسی ایک واقعہ سے شیطان کی کارستانیوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

محولہ بالا واقعہ کی اہمیت کے پیش نظر ہم اسے دوبارہ یہاں نقل کر رہے ہیں:

پیران پیر اور شیطانی فریب

"ایک مرتبہ ایک بڑی عظیم الشان روشنی ظاہر ہوئی۔ جس سے آسمان کے کنارے بھر گئے۔ اس سے ایک صورت ظاہر ہوئی۔ اس نے مجھ سے خطاب کرتے ہوئے کہا: "اے عبدالقادر! میں تمہارا رب ہوں، میں نے تمہارے لئے سب محرمات حلال کر دیئے۔" میں نے کہا: "دور ہو مزدود۔" یہ کہتے ہی وہ روشنی ظلمت

سے بدل گئی اور وہ صورت دھواں بن گئی اور ایک آواز آئی کہ ”عبدالقادر! تم کو تمہارے علم و توفیق نے پہچایا اور اسی طرح میں ستر صوفیوں کو گمراہ کر چکا ہوں۔“ میں نے کہا: ”محض اللہ کی مہربانی سے۔“

کسی نے عرض کیا کہ حضرت! آپ کیسے سمجھے کہ یہ شیطان ہے؟ فرمایا: ”اس کے کہنے سے کہ میں نے حرام چیزوں کو تمہارے لئے حلال کر دیا۔“ (الطبقات النجفی الشیرازی، ج ۱، ص ۱۳۰، طبقات ابن ابی رجب، کمال تہذیب و عروت و عزیمت، ج ۱، ص ۱۰۴، مصنفہ الامام حسن علی ندوی)

اس واقعہ سے درج ذیل نتائج مستنبط ہوتے ہیں:

- ۱۔ شیطان بھی اپنے ظہور پر پہلے تمہاری ڈال سکتا ہے۔ اکثر صوفیاء اس تجلی کو تجلی الہی یا مشاہدہ حق سمجھ لیتے ہیں۔
- ۲۔ شیطان نمودار ہو کر رب ہونے کا بھی دعویٰ کر سکتا ہے، تو اُسے کسی دوسری ہستی کے متعلق دعویٰ کرنا اس سے بہت آسان ہے۔ وہ حضور اکرم ﷺ کی شکل اختیار تو نہیں کر سکتا، لیکن اور کی شکل بن کر یہ جھوٹ بول سکتا ہے کہ میں ہی محمد ﷺ ہوں یا آپ کی شکل میں جلوہ گری کرتا ہے، تو دیکھنے والا اس وجہ سے فریب میں آجاتا ہے کہ اُس نے آپ کو زندگی میں نہیں دیکھا۔ اس دھوکے سے صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی محفوظ رہ سکتے تھے۔ اور صاحبِ قبر کی شکل اختیار کرنا تو اس کے لئے بہت ہی آسان ہے۔
- ۳۔ اس طرح شیطان سے جو سوال و جواب ہوتے ہیں۔ یہی باتیں مکاشفات کی اصل بنیاد ہے۔
- ۴۔ اکثر صوفیاء دانستہ دروغ گوئی نہ کرنے کے باوجود گمراہ ہوتے ہیں۔
- ۵۔ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اولیاء اللہ کی تاریخ میں عبدالقادر جیلانیؒ کے پائے کے کل کتنے ولی ... ہو گئے ہیں۔ جن میں سے ستر، کو تو شیطان نے گمراہ کر دیا۔ باقی اولیاء الرحمن کتنے بڑے گئے ہوں گے؟

انہی امور کے متعلق قرآن کریم کی درج ذیل آیت روشنی ڈالتی ہے:

إِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونََ لَكُمْ بِغَايِبَاتٍ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُخَوِّفُ لَوْمَاتِهِمْ
اُولَٰئِكَ سَمِعْتُمُوهُ
(۶۶/۱۱) ہیں۔

اور منید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ ”خدا کی راہ میں بہت سے راہزن (شیطان) ہوتے ہیں جو طرح طرح کے جال پھیلاتے ہیں مثلاً: نور کا جال، لطف و کرم کا جال، کبر کا جال، بکھو و فریب کا جال اور سب سے بڑھ کر استدراج کا جال جس میں شیطان فریب خوردہ کو ولی، نبی اور مسیح تک بنا دیتا ہے، لیکن مردِ حق وہ ہے جو نور حق اور نور

شیطان میں تفریق کرے اور اس وقت شیطان کے فریب میں آنے سے محفوظ رہے شیطان لعین نے ایسے ہی انوار واستیلا ج سے سیکڑوں عابدوں کو مہرہا کر دیا ہے۔ (مقرآن حق، ص ۱۲۸)

اب اس شیطانی فریب کی مزید چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

۲۔ جنید بغدادی کا مرید اور بہشت کی سیر | شیخ جنیدؒ کے مریدوں میں سے ایک نے اہل دُنیا سے کٹنا

کیا۔ ہر رات ایک اونٹ لایا جاتا اور اس پر بٹھا کر اسے بہشت کی سیر کرائی جاتی اس چیلنے اس کے دماغ میں غلط پیدا کر دی۔ رفتہ رفتہ شیخ جنیدؒ کو بخوبی پہنچی، تو آپ ہاں تشریف لے گئے اور سب احوال پوچھے۔ شیخ نے کہا کہ آج رات تو جب بہشت میں پہنچے، تو تین بار لا حول پڑنا۔ رات کو جب حبیب مہول سے انہی مقامات کی سیر کرائی گئی تو اس نے براؤ امتحان لا حول پڑھا۔ شیاطین، جو اس کام کے موکل تھے، فرار ہو گئے اور وہ تنہا رہ گیا اور اپنے آپ کو ایسی گندگی کے دھیر پر پایا جس کی عفونت سے دماغ پھٹنا جاتا تھا۔ اس پاس مردار جانوروں کی ہڈیاں بکھری پڑی تھیں۔ اپنی غلطی پر آگاہ ہو کر بے حد شیمان ہوا۔ تو بکی اور دوبارہ شیخ کی خدمت میں رہنے لگا۔ (ضررۃ الاصفیاء، ص ۱۳۱)

۳۔ مردہ زندہ کرنے والا جنات کا عمل | نقل ہے کہ ایک شخص نے عملیات کے ذریعے ایک جن کو مسخر کر رکھا تھا۔ اسے پرانی قبر کے نیچے چھپا کر اس سے جو چاہتا

کہوتا۔ اس چیز نے اسے عوام میں صاحب کرامت مشہور کر رکھا تھا اور اکثر جہلاء اس کے دام فریب میں گرفتار تھے۔ ایک روز عبداللہ شاہ بلوچ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: ”یا تو مجھے کوئی کرامت دکھائیے یا پھر میں دکھاتا ہوں۔ تب آپ کو میرا مرید ہونا پڑے گا۔ میں مردوں کو زندہ کر سکتا ہوں“ چنانچہ وہ انہیں میانہ کے قبرستان میں لے جا کر کہنے لگا: ”بتلائیے کون سا مردہ زندہ کروں“ آپ نے قبر کا نشان دیا۔ اس نے قبر کے سر ہانے کھڑے ہو کر کہا: ”یٰلین“ اندسے آواز آئی: ”والقرآن الحکیم“ کہنے لگا: ”دیکھئے مردہ زندہ ہو گیا۔“ آپ نے قبر پر پاؤں دبا کر فرمایا کہ: ”جو شخص قبر کے اندر چھپا ہے باہر آجائے“ اسی وقت ایک چودہ پندہ سالہ لڑکا قبر سے باہر آگیا۔ آپ نے پوچھا: ”تو کون ہے؟“ کہنے لگاتیں جن ہوں اور کئی سالوں سے اس شخص کی قید میں ہوں۔“ آپ نے فرمایا: ”میں تمہیں اللہ کے حکم سے آزاد اور اس شخص کے عمل تسخیر کو باطل کرتا ہوں۔“ جن اسی وقت غائب ہو گیا۔ (ضررۃ

۴۔ ابوالقاسم قشیری اور سماع کا جواز | اب ہم ایک مثال کے ذیلے آپ کو بتلائیں گے کہ شیطان کس طرح لوگوں کو حضو اکرم ﷺ کی شکل بتلا کر صوفیاء کو گمراہ کر رکھا ہے۔

ذیلے تصوف میں ابوالقاسم قشیری اور ابوسعید البوخیمر دونوں مانی ہوئی بزرگ شخصیتیں ہیں اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ سماع کو صرف علماء ہی ناجائز قرار نہیں دیتے، بلکہ بہت سے صوفیاء نے بھی اسے ناجائز قرار دیا ہے اب واقعہ یہ ہے کہ استاد ابوالقاسم قشیری سماع کو ناجائز اور حرام سمجھتے تھے اور شیخ ابوسعید البوخیمر اسے جائز سمجھتے اور محفل سماع منعقد کرتے تھے۔ ایک دن ابوسعید البوخیمر نے محفل سماع رچانی ہوئی تھی، استاد ابوالقاسم وہاں سے گزے تو دل میں کہا کہ یہ لوگ جو یوں برہنہ سر برہنہ پا، ماسے ماسے پھرتے ہیں، شریعت میں اُن کا ثقہ ہونا مستند نہیں اور ان کی گواہی کا اعتبار نہیں۔ شیخ ابوسعید نے اسی وقت ایک شخص کو دوڑایا کہ استاد (ابوالقاسم) سے ذرا پوچھو کہ ہم بے حیثیت گواہ حاضر ہوئے تھے، جو ہماری گواہی کے معتبر ہونے یا نہ ہونے کا سوال پیدا ہوا، رگوں یا جو خیال ابوالقاسم کے دل میں آیا تھا وہ فوراً شیخ ابوسعید کو معلوم ہو گیا اور اس کی جوابی کاروائی بھی کر دی۔

خیبران دونوں بزرگوں کی آپس میں ٹوک جھوک ہوتی رہی۔ ایک دن استاد ابوالقاسم نے حضو اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ کہیں جا رہے ہیں۔ پوچھا کہاں کا قصد ہے؟ حضو اکرم ﷺ نے فرمایا: ”مجلس ابوسعید کا، کہ جو شخص وہاں حاضر نہ ہو گا وہ بد نصیب یا مردود ہے۔“ استاد ابوالقاسم گھبرا کر بیدار اور ابوالخیمر کے پاس گئے۔ ایک دفعہ پھر دل میں بدگمانی پیدا ہوئی کہ ابوسعید مجھ سے نہ تو علم میں زیادہ ہے نہ مرتبہ روحانی میں، پھر یہ کیا قصہ ہے؟ ابوسعید پر استاد ابوالقاسم کے اس خیال کا کشف ہو گیا اور دل کی بات ابوالقاسم کو بتلا دی۔ اب ابوالقاسم کا دل صاف ہو گیا۔ دونوں بغل گیر ہوئے۔ ابوالقاسم اپنے خیالات سے تائب ہوئے اور برسرِ منبر فرمایا کہ جو شخص ابوسعید کی مجلس میں حاضر نہ ہو وہ مجھ یا مردود ہے۔“ (اقتباس از تصوف اسلام، ص ۶۶)

اقتباس بالا سے مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے:

- ۱۔ شیخ ابوسعید البوخیمر جو محفل سماع رچاتے تھے وہ مرتبہ روحانی کے لحاظ سے ابوالقاسم سے بلند تھے۔
- ۲۔ ابوالقاسم جو سماع کو ناجائز سمجھتے تھے انہیں خود حضو اکرم ﷺ نے خواب میں متنبہ فرمایا کہ ابوسعید کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ ہم اس کی مجلس میں خود جاتے ہیں اور جو نہ جاتے وہ بد نصیب یا مردود ہے۔
- ۳۔ حضو اکرم ﷺ کے اس انتباہ پر ابوالقاسم صرف سماع کے قائل ہی نہیں ہوئے، بلکہ باقاعدہ ابوسعید

کی فضیلت کا اعلان فرمایا۔

اب دیکھئے کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنی زندگی میں تو گانا بجانا حرام فرمایا تھا مگر خواب میں اگر اہل سماع کو افضل قرار دے رہے ہیں، تو اس کا واضح مطلب یہ ہوا یا تو یہ افسانہ سرے ہی سے غلط ہے یا جو ہستی خواب میں ملی وہ رسول اللہ کی ہستی نہ تھی کوئی اور تھی۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی زندگی میں کوئی ادا تعلیم دیں اور خواب میں کچھ اور۔

بعض دفعہ یوں بھی ہوتا ہے کہ صاحب قبر بزرگ تو مذاب
شدید میں مانخوڑ ہوتا ہے، لیکن چونکہ یہاں اس عالم آب و گل
میں بحیثیت ولی اور قطب مشہور ہوتا ہے لہذا لوگ اس کا عالیشان مزار بھی بنا دیتے ہیں۔ پھر اس کی مجاورت، اندوینا،
چڑھاوے وغیرہ سب کچھ اس قبر پر ہوتا ہے اور لطف کی بات یہ کہ حاجتیں اس کی قبر سے بھی پوری ہو رہی ہوتی ہیں
چنانچہ ایسے ہی ایک دو واقعات مولانا اللہ یار خان صاحب نے اپنی کتاب ”دلائل السلوک“ میں درج کیے ہیں جو
یہ ہیں :

”ایک مزار پر جانے کا اتفاق ہوا۔ روضہ بنا ہوا ہے۔ قبر پر چادریں چڑھی ہوئی ہیں، بوسے دیئے جا رہے
ہیں مگر صاحب قبر زنجیروں میں بکھرا ہوا ہے۔ کتے کی طرح اٹھ اٹھ کر حملے کرتا ہے..... ایک اور ایسے غوث
کے مزار پر ہر ہفتہ میلہ لگتا ہے۔ حالانکہ صاحب قبر کافر سادھو ہے۔ کسی نے غلطی سے دفن کر دیا۔ رفتہ رفتہ
غوث بن گیا اور روضہ کھرا کر دیا گیا۔ اس کو ایسا دردناک اور بھیاں کھنکھم کا عذاب ہو رہا ہے کہ اس سے کوئی
بات معلوم نہیں کی جاسکتی۔“ (دلائل السلوک ص ۱۳۴)

اور ہمارا خیال یہ ہے کہ صاحب مزار حضرات کی کثیر تعداد ایسے ہی بزرگوں اور غوثوں پر مشتمل ہوتی ہے۔
لیکن جاہل انسانوں پر شیطان کا فریب کچھ اس طرح مستط ہوتا ہے کہ زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی پہنچے
ہوئے بزرگ سمجھ کر لوگ ان کی قبروں پر مشرکانہ افعال بجالاتے رہتے ہیں اور لطف یہ کہ حاجتیں ان کی بھی پوری
ہوتی ہیں کائناتوں کی زیادہ تر عقائد سے ہوتا ہے۔ حقائق سے نہیں۔

حاجت روائی کیسے ہوتی ہے؟
اب رہا حاجت روائی کا مسئلہ، تو ایسے تنوں، تنہاؤں، او
قبروں سے حاجت روائی کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ لیکن وہ

بھی مشیت الہی کے تحت ہی ہوتی ہیں اور وہ ان قبروں پر دعاء و استغاثہ کے بغیر بھی پوری ہوا تھیں شیطان کو یہ اختیار

ضرور دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالے، انہیں جھوٹے وعدے دے دے (جن پر اس کی قدرت ہیں) اور انہیں گمراہ کرے، لیکن اُسے تصرف فی الامور میں قطعاً کوئی اختیار نہیں ہے۔ چنانچہ وہ قیامت کے دن صاف طور پر کہے گا کہ :

وَقَالَ الشَّيْطَانُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ اللَّهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَعَدْتُكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِي عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي فَهَلْ تَنْفَكُونَنِي وَلَوْ مَوْأَنَافْسُكُمْ

اور جب احساب کتاب کا کام فیصل ہو چکے گا، تو شیطان کہے گا (جو) وعدہ خدا نے تم سے کیا تھا (وہ تو) سچا تھا اور (جو) وعدہ میں نے تم سے کیا تھا وہ جھوٹا تھا اور میرے پر کسی طرح کا زور نہیں تھا۔ ہاں میں نے تم کو (گمراہی اور باطل کی طرف) بلایا، تو تم نے (جلدی سے بے دلیل) میرا کھتا مان لیا، تو

(آج) مجھے طاعت دکر، اپنے آپ ہی کو طاعت کرو۔ (۱۶۲۶)

مندرجہ بالا آیت کا ترجمہ مولانا فتح محمد جالندھری کا ہے۔ ہم نے اپنی طرف سے برکیٹوں وغیرہ میں کوئی نظر شامل نہیں کیا۔ اس آیت میں لفظ سلطان کا معنی غلبہ، قوت، زور، اقتدار، تصرف اور دلیل سب کچھ لیا جاسکتا ہے۔ اس آیت سے واضح ہے کہ شیطان کا تصرف فی الامور میں کوئی حصہ نہیں۔ وہ اپنی شکل حسب احوال تبدیل کر کے سامنے آسکتا ہے۔ پکائے والے کو یا مصیبت زدہ کو اس کے پیر کی شکل میں دکھائی دے سکتا ہے اے تئیاں اور جھوٹے وعدے کر سکتا ہے۔ جین وعدے دکھلا کر گمراہ کر سکتا ہے، دل میں وسوسے ڈال سکتا ہے اور وہ یہ سب کام اپنا ایٹری چوٹی کا زور لگا کر اپنی تمام ذریت سمیت اور اس کے تعاون سے کرتا ہے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کو گمراہ کر سکے۔ اور وہ گمراہی کے یہ سب کام ہر انسان کے علم اور مرتبہ کے مطابق اور اسی مناسبت سے معیاری سے سرانجام دیتا ہے۔ اس نے خدا سے یہ بھی کہا :

وَقَالَ لَا تَخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَمْلُوءًا وَلَا تَضِلَّهُمْ وَلَا مَتِّبْتَهُمْ وَلَا مُرْتَبِّئَهُمْ فَلْيُبَيِّنَنَّ لَكَ

شیطان (خدا سے) کہنے لگا: میں تیرے بندوں سے (غیر خدا کی نذر دلوں کا) ایک مقررہ حصہ لے لیا کروں گا اور ان کو گمراہ کرنا اور امیدیں دلاتا رہوں گا اور دکھاتا رہوں گا کہ

الْمَنَاعِمِ وَلَا مُرْتَبِّئَهُمْ فَلْيَغْيِرَنَّ خَلْقَ

جانوروں کے کان چرتے رہیں اور یہ بھی کہتا رہوں گا کہ وہ خدا

اللہ کی بنی ہوئی مخلوق کو بدلتے رہیں۔ (۲۱۸۱)

اس آیت میں کچھ ایسے افعال کا ذکر ہے جو بتوں یا صاحب قبر کے نام پر کئے جاتے ہیں، تو شیطان کہہ رہا

ہے کہ لوگ ایسے افعال میری ہی ترغیب پر سرانجام دیتے ہیں۔ اور اس نے خدا سے یہ بھی کہا کہ :

قَالَ فِيمَا اغْوَيْنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ ثُمَّ لَا يَنبَغِي لَهُمْ أَنْ يَكُونَ لَهُمْ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ (۱۶۱)

شیطان نے (خدا سے) کہا کہ مجھے تو تونے سونے کیا ہے میں بھی تیرے سیدے راستے پر (ان کو گمراہ کرنے کے لئے) بیٹھوں گا۔ پھر ان کے آگے سے اور پیچھے سے، دائیں سے اور بائیں سے (مغرض ہر طرف سے) آؤں گا تو ان میں سے اکثر اُنہیں شاکر نہیں پائے گا۔

ان آیات میں اور تو سب کچھ ہے مگر شیطان کے تصرف فی الامور کا کہیں ذکر نہیں ملتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اگر خدا سے دعا کی جائے، تو وہ اپنی مرضی سے بعض دفعہ قبول فرماتا ہے اور بعض دفعہ قبول نہیں کرتا (جس کے متعدد وجوہ ہیں جن کا یہاں موقع نہیں) لیکن قبروں اور آستانوں پر ندیں مینے اور دعاؤں کا کرنے میں بسا اوقات حاجات جلدی پوری ہو جاتی ہیں۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان صرف اپنی صوت یا اپنی کلام سے ہی مطمئن نہیں کرتا بلکہ وہ اور اس کا لشکر اس کو لوہا کرنے میں حتی الامکان کوشش کرتے ہیں۔ یہاں اگر اس شیطانی کاروبار میں کہانت اور جادو بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ کہانت اور جادوگری کے کام بھی انہیں شیطانی ذریعہ سرانجام پاتے ہیں۔ جن کے دلائل ہم پہلے دے چکے ہیں کہ یہ صریح کفر ہے، لیکن کہانت و جادو کے نتائج ضرور سامنے آتے ہیں۔ شیطانی کاروبار کی وسعت شیطان اور اس کے لشکر کی استعداد پر منحصر ہوتی ہے۔

شیطان بھی حقیقت میں جنوں کی جنس سے تھا۔ جو اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے عموماً فرشتوں میں رہا کرتا۔ کیونکہ دونوں غیر مرفی مخلوق تھے۔ خدا نے فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا، تو اس کی اصلی جنت عود کر آئی۔ سچا کہ میں حضرت آدم علیہ السلام سے بزر مخلوق ہوں اور اس کی فضیلت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تب سے جنت کی جنس یعنی ابلیس اور اس کی پوری ذریت انسان کی گمراہی کے لئے ہر ہتھکنڈا استعمال کرنے پر تلی بیٹھی ہے۔ پھر خبیث قسم کے دوسرے جن بھی اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ لہذا ان رجال الغیب سے استفادہ کا کاروبار بھی قدیم سے رائج ہے۔ قرآن میں ہے :

وَ أَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِنَ الْإِنْسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِنَ الْجِنِّ فَزَادُوهُمْ رَهَقًا (۱۶۲)

اور یہ کہ بعض بنی آدم بعض جنات کی پناہ پکارتے تھے اس سے ان کی سرکشی بڑھ گئی تھی۔

اور آج بھی مسلمانوں میں رجال الغیب سے استمداد کے کئی وظیفے اور جنت منتر رائج ہیں جنہیں اکثر صوفی

قسم کے لوگ ہی سرانجام دیتے ہیں۔ یہ "شش قفل" مختلف اقام کے وضعی درود اور "بہت میل" جو اکثر پنجورہ شریفوں میں مذکور ہیں۔ اسی پرانے شریک فعل کی تازہ شکل میں آج بھی موجود ہیں۔

اصل سوال یہ ہے کہ اگر قبروں سے حاجت برآری ثابت ہو بھی جائے، تو کیا یہ بات ان افعال کے صحیح اور جائز ہونے کی دلیل بن سکتی ہے؟ تو اس کا جواب سراسر نفی میں ہے۔ اور اس کی مثال ایسی ہی ہے، جیسے جادو کے عمل کے اثرات قرآن کریم سے ثابت ہونے کے باوجود وہ لے صریح کفر قرار دیتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ چوری اس لئے جائز ہے کہ اس سے فی الواقع مال مل جاتا ہے اور اس کی شہادتیں بھی پیش کر دے، تو اس سے چوری کا فعل جائز تو نہیں ہو جائے گا، ہمیں از روئے شرع صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ آیا ان اعمال و افعال کا کچھ جواز بھی ہے یا نہیں؟ ان کے نتائج و اثرات کا ہونا یا نہ ہونا زیر بحث نہیں لایا جاسکتا۔

قبروں کے متعلق ارشادات نبوی

دین طریقت اور اس کے شریک اعمال و افعال

نبیوں اور ولیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنانے والوں پر اللہ کی لعنت

بن قبر سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی ہر دلعزیزی کے اسباب ہم پہلے تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ چونکہ ان سب شریک امور کی جڑ قبر ہے، لہذا اس جڑ کو ختم کرنے کے لئے شریعت نے بہت واضح احکام صادر فرمائے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

عن عائشۃؓ قَالَتْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي مَرَضِهِ لَمَنْ يَقُمْ مِنْهُ: لَعَنَ اللَّهُ الْيَهُودَ إِتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ قَالَتْ عَائِشَةُ: لَوْلَا ذَلِكَ لَا بُدَّ لِي أَنْ أَخْشِيَ أَنْ يَتَّخِذَ مَسْجِدًا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس بیماری میں جس سے (اچھے ہو کر) بنیں انہیں فرمایا: اللہ یہودیوں پر لعنت کرے جنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنالیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہستی ہیں، اگر بھی یہ ڈرنے ہو تاکہ لوگ آپ کی قبر کو سجدہ گاہ بنالیں گے، تو

آپ کی قبر مرجع خاض و عام بادی جاتی۔

(بخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی)

حضرت اکرم ﷺ کی قبر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تھی۔ اس کی صوت یہ تھی کہ پیچھے قبر شریف اس

کے آگے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رہائش اور اس سے آگے بیرونی دروازہ تھا۔ قبر تک سوائے حضرت عائشہ
یاریشتہ داروں کے علاوہ دوسرے لوگ جا ہی نہ سکتے تھے، کیونکہ قبر کے پیچھے پھر دیوار تھی، تو حضرت
عائشہ رضی اللہ عنہا فرما رہی ہیں کہ اگر آپ کی قبر کے متعلق یہ خطرہ نہ ہوتا کہ مبادا صحابہ اور معتقدین سجدہ کرنے لگیں
تو بغرض زیارت پھلی دیوار کھول دی جاتی! درود ذیل حدیث میں قبر پرست یہو کے علاوہ عیسائیوں کا بھی ذکر ہے۔

۲۔ اَنَّ عَائِشَةَ وَعَبْدُ اللَّهِ بْنَ عَبَّاسٍ
قَالَا: لَمَّا نَزَلَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ طَلِقَ يَطْرَحُ خُمِيصَةً لَهُ عَلَى
وَجْهِهِ فَإِذَا اغْتَمَرَ كَشَفَ عَنْ وَجْهِهِ
وَهُوَ كَذَلِكَ يَقُولُ: لَعَنَهُ اللَّهُ عَلَى
الْيَهُودِ وَالنَّصَارَةِ اتَّخَذُوا قُبُورَ
أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ يُحَدِّثُونَ مَا
صَنَعُوا (بخاری ج ۱ ص ۱۵۷)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما
دونوں نے کہا: ”جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بیماری آن پڑی
اور وفات کی علامات ظاہر ہوئیں، تو آپ اپنی چادر اپنے
منہ پر اوڑھ لیتے اور کبھی جب بیماری بڑھتی تو چادر کو اپنے
چہرے سے ہٹا دیتے اور یوں کہنے لگتے: یہو اور نصاریٰ
پر اللہ کی لعنت ہو، انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ
بنالیا۔ آپ ہم لوگوں کی بے کام سے ڈراتے تھے، جو
انہوں نے کیا تھا۔“

۳۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ میں حضرت جناب صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی مضمون کی جو سوایت ہے، اس کے
الفاظ میں نبیوں کے ساتھ ”لیوں“ کی قبروں کا بھی ذکر ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

أَلَا وَإِنَّ مَنْ كَانَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوا يَتَّخِذُونَ
قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ وَصَالِحِيهِمْ مَسَاجِدَ ۖ أَلَا
فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُورَ مَسَاجِدَ ۚ إِنْ أَنْهَكُمُ
عَنْ ذَلِكَ .

تو جہ سے سنو! تم سے پہلے لوگوں نے اپنے نبیوں اور برگزیدگان
کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا تھا۔ خبردار! تم قبروں کو
سجدہ گاہ نہ بنانا۔ میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں۔

مزارات بنانا، اُن کی تزئین، چراغ جلانا اور مجاوری کرنا | اب صحیح مسلم، کتاب الجنائز
کی درج ذیل احادیث

ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ إِنَّ يَخْصَنَّ الْقَبْرَ وَأَنْ يَقْعَدَ عَلَيْهِ وَ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کو
پختہ بنانے (پلستر کرانے)، اور اس پر دجلو، بیٹھنے اور اس

پر تعمیر کرنے سے منع فرمایا۔

أَنْ يَبْنَىٰ عَلَيْهِ

۲۔ عَنْ أَبِي مَرْثَدٍ الْغَنَوِيِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ

اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: لَا تَصَلُّوا إِلَى الْقُبُورِ

وَلَا تَجْلِسُوا عَلَيْهَا

اور درج ذیل حدیث، احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ سب میں موجود ہے :

۳۔ لَعَنَ اللَّهُ تَعَالَى زَائِرَاتِ الْقُبُورِ

وَالْمُتَعِمِّدَاتِ عَلَيْهَا الْمَسَاجِدُ

وَالشُّرُجَ۔

ان پر چرخ روشن کرتے ہیں۔

اب ایسی قبریں جن میں کوئی میت نہیں ہوتی، یا کوئی کھڑی، پتھر

یا کھئی مرده جانور کی ہڈیاں وغیرہ دفن کر کے مزارات بنائے جاتے

ہیں اور وہاں بھی حاجت والی اور مشکل کشائی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے متعلق حضور اکرم

ﷺ کا ارشاد ملاحظہ فرمائیے۔ فرمایا :

مَنْ زَارَ قَبْرًا يَلَامُ مَقْبُورَهُ كَأَنَّمَا عَبَدَ

جس شخص نے ایسی قبر کی زیارت کی جس میں میت نہیں۔

اس نے گویا کسی بت کی پوجا کی۔

(الحدیث، طبرانی، بیہقی)

غور فرمائیے یہ تہدید صرف زیارت کی ہے۔ پھر جو شخص ایسی بلامقبر قبروں پر دوسرے افعال بھی سجا

لائے، تو آپ اس کی سزا کا خود اندازہ کر لیجئے۔

سابقہ مزارات کا انہدام

میں مسلم کتاب الحسب میں ہے :

عَنْ أَبِي الْهَيَّاجِ الْأَسَدِيِّ قَالَ قَالَ

لِي عَلِيٌّ : أَلَا أَبْشُرُكَ عَلَى مَا بَعْثَنِي

عَلَيْهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ

لَا تَدْعُ مِمَّا لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَلَا تَقْرَأُ مِثْرًا

إِلَّا سَوَّيْتَهُ۔

حضرت ابو الہیاج اسدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے حضرت

علی رضی اللہ عنہ نے کہا : کیا میں تمہیں ایسے کام پر نہ بھیجوں جس پر

مجھے رسول اللہ ﷺ نے بھیجا تھا، اور وہ یہ ہے کہ تو کوئی

مجسمہ نہ چھوڑے جو لوگوں کے سامنے اور نہ کوئی ایسی قبر چھوڑے جو زمین سے

بند ہو مگر یہ کہ کٹے زمین کے برابر کر دے۔

احادیث سے صرف قبر کی اتنی بندی کی اجازت ہے، جیسے اونٹ کی کوہان ہوتی ہے وہ بھی اس لئے کہ اتنی مفتی بیج جاتی ہے۔

اس مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ قبر کو تو سجدہ گاہ نہ بنایا جائے۔ بلکہ قبر کے پاس مسجد بنائی جائے۔

قبر کے پاس مسجد بنالینا | صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ میں ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ بعض ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا

تو انہوں نے جثہ میں "ماریہ" نامی ایک کنیہ (یہودیوں کی عبادت گاہ) دیکھا ہے۔ جس میں مجھے تھے، تو آپ نے فرمایا:

إِنَّ أَوَّلَ مَا كَانَ فِيهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ
فَمَلَتْ بَنُو آدَمَ قَبْرَهُ مَسْجِدًا وَصَوَّرُوا فِيهِ
ثَلَاثَ الصُّوَرِ أَوَّلُكَ شِرْكَاءُ الْمُتَّقِينَ عِنْدَ اللَّهِ عَزَّ
وَجَدَّ

جب ان لوگوں میں سے کوئی صالح مرد مر جاتا، تو اس کی قبر پر مسجد بنالیتے اور پھر اس میں اس کے مجسمے رکھ لیتے، ایسے لوگ اللہ عزوجل کے نزدیک بدترین مخلوق ہیں۔

(صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ)

اور اس مسئلہ کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ قبرستان میں نماز پڑھنا ہی ناجائز ہے۔ خواہ وہاں کسی ولی یا بزرگ کی قبر ہو یا نہ ہو۔

قبرستان میں نماز ناجائز ہے

عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ
النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: الْأَرْضُ
كُلُّهَا مَسْجِدٌ إِلَّا الْمَقْبَرَةَ وَالْحَمَامَةَ (تذوی)

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمام زمین نماز کے قابل ہے۔ سوائے قبرستان اور حمام کے۔

اب ان احادیث کی روشنی میں خود فیصلہ کر لیجئے کہ آیا شریعتِ مطہرہ میں پختہ قبر، مزار یا روضہ بنانے، اس پر مجاور بیٹھنے، اس پر روشنی کرنے، اس پر جھاڑو دینے، غلاف چڑھانے، وہاں اشکاف بیٹھنے، نماز پڑھنے یا ساتھ ہی مسجد بنانے کی کوئی گنجائش ہے۔ پھر جو اولیاء دوسرے اولیاء اللہ کے مزارات پر تکلف ہوتے، مراقبے کرتے یا چلہ کشی کرتے ہیں وہ قطعاً سنت کبھلا سکتے ہیں؟

اب مزارات کی ضرورت اور مجاورت کی اہمیت متعلق صوفیہ کی ایک مایہ ناز سنتی علی ہجویری کا بیان ملاحظہ فرمائیے:

حضرت علیؓ جویری فرماتے ہیں:

صوفیاء اور قبروں کی مجاورت

”اور مجھے بھی یعنی حضرت علی بن عثمانؓ (جلابی کو) ایک دفعہ ایک ایسا واقعہ کڑا۔ میں نے اس اہمیت پر بہت کوشش کی کہ کسی طرح یہ واقعہ حل ہو، مگر حل نہ ہوا اور ایک دفعہ اس سے قبل بھی ایسا واقعہ پیش آیا تھا تو میں مزار حضرت شیخؒ بایزید کا اس وقت تک مجاور بنارہا جب تک کہ حل نہ ہوا۔ آخر حل ہو گیا۔“ (کلام المرغوب ص ۱۷۱، اردو ترجمہ کشف المحجوب، مصنفہ علیؓ جویری عرف آغا گنج بخش)

یہ واقعہ جہاں مزارات کی بزرگی کی روشن دلیل ہے، وہاں اس سے حل مشکلات کے لئے اس کی مجاوری کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

آپ کو یہ بھی یاد ہو گا کہ معین الدین چشتیؒ اجمیری نے انہی علیؓ جویری کی قبر کا چلہ کاٹا تھا اور مجاورت اختیار فرمائی تھی اور جاتی دفعہ یہ شعر کہہ گئے۔

گنج بخش فیض عالم منظر نور خدا ناقصاں را پیر کامل، کاٹاں را ہلنا
اور یہ شعر آج تک ان کے مزار کی زینت اور اجمیری صاحب کی یادگار ہے۔ عرض صوفیاء میں یہ مزارات اور ان کے فیوض کا سلسلہ ایک لامبدي حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

قبر النبیؐ متعلق موضوع احادیث شریعت نے قبروں کے ذیلے پیدا ہونے والے ایک ایک چور دروازے کو بند کر دیا تھا۔ ان حضرات نے ایک

ایک کو کے ان کو پھر سے کھول دیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے خود اپنے متعلق فرمایا تھا کہ:

لَا تَتَّخِذُوا قَبْرِیْ عِبَادًا وَصَلُّوا عَلَیْ
حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَإِنَّ صَلَاتَكُمْ
مِیرِیْ قَبْرِیْ عَمِید (عمرس یا سید) نہ بنانا اور جہاں ہمیں تم
ہو وہیں سے درود پڑھ لیا کرو۔ بلاشبہ تمہارا درود مجھے
پہنچا دیا جاتا ہے۔

اس ارشاد کی روش سے اپنے مسلمانوں کو اپنی قبر پر حاضری دینے کو پسند نہیں فرمایا۔ رہی درود پڑھنے کی فضیلت اور ضرورت، تو اس کے متعلق بھی آپؐ نے وضاحت فرمادی کہ تمہارا درود جہاں بھی تم ہو، مجھے پہنچا دیا جاتا ہے۔ لہذا اس غرض کے لئے میری قبر پر آنے کی ضرورت نہیں۔ پھر آپؐ نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی فرمائی کہ:

اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلَ قَبْرِیْ وَشَنًا
اے اللہ! میری قبر کو آستانہ نہ بنا دینا کہ لوگ اگر پوجا
کرنے لگیں۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود یاد گلوں نے آپ کی قبر کی زیارت، فضیلت اور اہمیت کی بھی حدیثیں گھڑ لیں؛ مثلاً یہ حدیث:

(۱) مَنْ زَارَنِي بَعْدَ مَمَاتِي فَكَأَنَّمَا زَارَنِي فِي حَيَاتِي
جس نے میرے مرنے کے بعد میری زیارت کی۔ گویا اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔

یہ حدیث مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر موضوع ہے:

۱۔ حدیث کی معتبر کتابوں میں اس کا کوئی نشان نہیں۔ ابن قدامہ نے اپنی کتاب الصارم المنک علی نحر ابن سبک میں آپ کی قبر کی زیارت کے متعلق سب حدیثوں کو پرکھ کر ان کا داہی ہونا ثابت کیا ہے (مشکوٰۃ، باب حرم المدینہ، الفصل الثالث، حاشیہ بروایت مذکورہ)۔

۲۔ فقہائے امت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ بعد کے لوگ کبھی صحابہ کرام ؓ کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتے صرف قبر کی زیارت سے یہ درجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

۳۔ اگر اس بات میں صداقت ہوتی، تو حضور اکرم ؐ کی قبر بند نہ رکھی جاتی سوائے تک حضرت عائشہ زندہ رہیں۔ اس وقت تک کوئی غیر محرم وہاں داخل ہی نہ ہو سکتا تھا۔ اگر یہ حدیث صحیح ہوتی تو زیارت کا اہتمام ضروری تھا۔

اب زیارت قبر سے متعلق چند دوسری موضوع احادیث بھی ملاحظہ فرمائیے:

(۲) مَنْ حَجَّ وَلَمْ يَزِرْنِي فَقَدْ جَفَّافٍ
جس نے حج کیا اور میری قبر کی زیارت نہ کی، تو اس نے مجھ پر جفا کی۔

(۳) مَنْ زَارَ قَبْرِي وَجَبَتْ لَهُ شَفَاعَتِي
جس نے میری قبر کی زیارت کی، اس کے لئے میری شفاعت واجب ہوگئی۔

(۴) مَنْ زَارَ قَبْرِي (أَوْ قَالَ) مَنْ زَارَنِي كَتَبَ لَهُ شَفِيعًا أَوْ شَهِيدًا
جس نے میری قبر کی زیارت کی (یا راوی نے کہا) میری زیارت کی میں اس کا شفیع یا شہید ہوں گا۔

ایسی سب روایات جو آپ کی قبر کی زیارت کی فضیلت بتلاتی ہیں، تیسرے اور چوتھے درجہ کی کتابوں میں درج ہیں اور مذکور بالا وجوہ کی بنا پر مجرح یا موضوع ہیں اور یہی وہ موضوعات ہیں جن پر صوفیاء کے عقائد متعلقہ قبور، کشف قبور اور مراقبات وغیرہ کی بنیاد استوار ہوتی ہے۔

قبروں سے متعلق صوفیاء کا ذہنی انتشار

پھر بہت سے حضرات ایسے بھی ہیں جو ماثرا اللہ علم شریعت کے ماہر ہیں۔ مگر ان کا دامن طریقت میں اُلجھا ہوا ہے۔ جب چھبرات شریعت کی بات کرتے ہیں، تو تمام زوالات اس کی حقانیت میں صرف کر دیتے ہیں، لیکن جب طریقت کی طرف آتے ہیں جو پہلی سب باتیں اور دلائل مجہول جانتے ہیں اور یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ یہ دونوں قسم کی تصانیف فرد واحد کی نہیں ہو سکتیں اور ایسے علما کی تعداد بہت زیادہ ہے ہم اس انتشار کی دو مثالوں سے وضاحت کریں گے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی خدمات اسلامی کسے انکار ہو سکتا ہے؟ آپ نے ایک کتاب 'البلاغ المبین (فارسی) میں پیر پستی اور قبر پستی کا نہایت مدلل اور تحقیقی انداز سے رد کیا ہے۔ اس کتاب کے صفحہ ۳۰ پر صبح بخاری کے حوالے سے یہ واقعہ نقل فرماتے ہیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو قبر کے پاس نماز پڑھتے دیکھا تو فرمایا: الْقَبْرُ الْقَبْرُ وہ گویا حضرت انس رضی اللہ عنہ کو ڈرا ہے تھے کہ اس کام سے بچو۔ جیسے کسی کو شیر شیر یا سانپ سانپ کہہ کر ڈرایا جاتا ہے کہ محتاط ہو جائے۔

اب انہی شاہ صاحب کا درج ذیل بیان بھی ملاحظہ فرمائیے:

شاہ ولی اللہ اور کشف قبور

ذکر کشف قبور۔ جان کہ ذکر کشف قبور کے واسطے اول جب مقبرہ میں آئے دو گنا ان بزرگ کی روح کے واسطے پڑھے اگر سوۂ فاتحہ یا دو پہلی رکعت میں پڑھے اور دوسری میں سورۂ اخلاص اور نہیں تو ہر رکعت میں پانچ پانچ بار اخلاص پڑھے اور پھر قبلہ کی بیٹھ کر کے بیٹھے اور ایک بار آیت الکرسی اور بعض سویتیں جو زیارت کے وقت پڑھتے ہیں، جیسے سوۂ ملک اور اس کے سوا۔ بعدہ قل کہے بعد فاتحہ کے گیارہ بار سورۂ اخلاص پڑھے اور ختم کرے اور تمجید کرے۔ بعدہ سات دفعہ طواف کرے اور اس میں تمجید پڑھے اور پھر پاؤں کی طرف رخسار کے اور نزدیک میت کے منہ کے بیٹھے اور کہے یا رب اکیس دفعہ۔ بعدہ دل طرف آسمان کے کہے یا روح اور دل میں ضرب کرے یا روح الروح۔ جب تک کہ انشراح پائے یہ ذکر کرے۔ انشا اللہ کشف قبور و کشف ارواح حاصل ہوگا۔ (انتساب فی سلاسل اولیاء اللہ)

مصفیہ شاہ ولی اللہ صاحب، ص ۱۱۳، ۱۱۴

شاہ صاحب کے مندرجہ بالا بیان سے درج ذیل چیزوں کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

۱۔ مقبروں اور مزاروں کا جواز۔

۲۔ نذر لیلہ اللہ کا جواز۔ کیونکہ دو رکعت نماز محض ایصالِ ثواب کے لئے نہیں پڑھی جا رہی۔ بلکہ اس کے پیچھے ایک مقصد بھی ہے اور یہی چیز نذر کہلاتی ہے۔

۳۔ قبروں کے گرد طواف کا جواز۔ ۴۔ صاحب قبر کے پاؤں کی طرف رخسار رکھنے کا جواز۔

۵۔ غیر اللہ کو پکارنے کا جواز، اور

۶۔ قبلہ کی طرف بیٹھ کر کے بیٹھنے کی حکمت و آداب تو شاہ صاحب غمدی بہتر سمجھتے ہیں۔

اب اگر اتنی باتیں شاہ صاحب جیسے بزرگ اور عالم دین سے ثابت ہو جائیں، تو اگر عام لوگ اس میں قبروں پر چراغ جلانے، جھاڑو دینے اور ان صاحب قبو سے مرادیں مانگنے کا اضافہ کر لیں تو ان بے چاروں کا کیا قصور؟ اسی طرح ایک اور بزرگ ابن حجر مکی (م ۷۹۲) میں ان کے متضاد بیانات بھی ملاحظہ فرمائیے:

ابن حجر مکی کا ذمہ انتشار

نبہانی نے جن لوگوں سے استفادہ کیا، ان میں سے ایک ابن حجر مکی ہے۔ ابن حجر اپنی کتاب "الزواجر" میں کہتے ہیں: "شُرک کا سب سے

بڑا سبب قبروں کے پاس نماز پڑھنا اور ان کو مساجد بنالینا ہے۔ جتنے منکرات مزاروں اور قبروں پر ہوتے ہیں ان کو بٹانا اور مٹانا واجب ہے۔ قبروں پر تعمیر شدہ قبوؤں اور مزاروں کو جلد از جلد گرا دینا چاہیئے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے روکا اور قبروں کو گرانے کا حکم دیا۔ لہذا قبروں پر دیئے، قندیلیں اور قمقمے عبتسم کر دیئے جائیں۔ ایسی جگہوں کے لئے کوئی چیز وقف کرنا اور نذر و نیاز ماننا اور اس کو پورا کرنا صحیح نہیں ہے۔ قبروں پر دیئے جلانا، ان کو بت بنانا، ان کا طواف کرنا اور ان کی طرف نماز پڑھنا۔ سب بکیرہ گناہ ہیں۔

مگر ابواہر المنظم میں خود ہی ان سب باتوں کی تردید کر دی اور "تحفہ" اور "الزواجر" میں جن کاموں کو بکیرہ گناہ اور سبب شرک بنایا تھا ان کو جائز کر دیا۔ یہاں تک کہ قبروں کو سجدہ کرنا۔ اہل حال کے لئے جائز قرار دیا اور اتنا غلو کیا کہ خالیوں کی آنکھیں ٹھنڈی کر دیں۔ (غایۃ الامانی فی الرد علی البہانی، مصنفہ علامہ اوسی)

یہ دو مثالیں ہم محض بطور نمونہ پیش کی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو علمائے دین بھی اس طریقیت کے میدان میں گھسے ہیں۔ آپ ان کی مختلف تصنیفات کا مطالعہ کریں گے تو ایسی ہی صورت حال سامنے آئے گی۔

کچھ ولایت کی تعلیم اور اولیاء اللہ کے بارے میں

۱۔ تعلیمات ولایت

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ دور نبوی، صحابہ یا تابعین میں لفظ ولی جمع اولیاء، ان معنوں میں استعمال نہیں ہوتا تھا۔ جن معنوں میں تیسری صدی کے صوفیاء نے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ قرآن نے یہ لفظ حمایتی اور دوست کے معنوں میں استعمال کیا تھا اور جو شخص دین اسلام کو قبول کر لیتا، اسے اللہ کا ولی کہہ کر پکارا جاتا، لیکن تیسری صدی میں صوفیہ نے یہ لفظ جن معنوں میں یادہ کچھ اس طرح ہے:

ولایت کا نیا مفہوم | ولایت سے مراد محبت و تصرف قرب ہے۔ پس جو شخص محبت الہیہ میں مستغرق ہو کر تصرف میں کمالیت اختیار کر کے قرب حاصل کر لیتا ہے، وہ والی ولایت ہو کر ولی کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ چنانچہ پیشوائے کامل چاہے تو ایک نگاہ سے طالب کو

منزلِ مقصود پر پہنچا دیتا ہے۔ (دریاض السالکین، ص ۵، ۶)

اس اقتباس سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ ولایت کے مفہوم میں تصرفِ امو کا اضافہ مابعد کے دور کی پیداوار ہے۔

۲۔ فی الحقیقت اس قسم کی ولایت کی منزل مقصود یہی تصرفِ امو ہے۔

۳۔ اور یہ منزل مقصود کسی "مرشدِ کامل" کے بغیر ہاتھ نہیں آسکتی۔

اب دیکھئے کتاب و سنت کی رُو سے تصرف فی الامو کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ ارشادِ باری ہے:

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ
یاد رکھو! اگر پیدائش اللہ کی ہے، تو حکم بھی اسی کا چلے گا۔

اور دوسرے مقام پر فرمایا:

قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهُ لِلّٰهِ
(اے پیغمبر ﷺ) آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ امر

پوسہ کا پورا اللہ کے لئے ہے۔ (۳/۱۵۴)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہ کسی کا کچھ سنوار سکتا ہے اور بگاڑ سکتا ہے اب اگر کسی دوسرے شخص یا چیز سے ایسا تصرف ظاہر ہو تو وہ کتاب سنت کے خلاف ہی کوئی بات ہو سکتی ہے۔ جیسے جادوگر اپنے جنتِ مفر کے ذریعے لوگوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور ہم پہلے باب میں بحوالہ شاہ ولی اللہ صاحب یہ بھی بتلا چکے ہیں کہ جادو، کہانت، رمل، سمریزم وغیرہ کئی علوم و فنون ایسے ہیں جن سے مخاطب کے دل کا حال اور اس کی کیفیت (اشراف) اور آئندہ کے غیب کے احوال (انکشاف) معلوم ہو جاتے ہیں۔

اب یہ دیکھنا چاہئے کہ ہمارے ناموس و صفیاء نے یہ تصرف فی الاموال کی منزل مقصود کو اپنانے کے لئے کیا طریق اختیار کیا ہے۔ صاحب ریاض السالکین سورۃ فاتحہ کے خواص کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ:

ولایت کی تعلیم | ”دعوتِ سورۃ فاتحہ حضرت محمد ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تعلیم فرمائی۔ انہوں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو انہوں نے امام زین العابدین

کو، انہوں نے امام باقر کو، انہوں نے امام جعفر کو، انہوں نے امام موسیٰ کاظم کو اس کے عمل کی اجازت دی۔ حضرت بایزید فرماتے ہیں کہ میں نے انیس برس دعوت چہل اسماء اور قرشیہ اور شیخ میں صرف کئے ہیں فائدہ کماتھ نہ دیکھا۔ اتفاقاً امام حسن و انس حضرت موسیٰ کاظم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض حال بیان کیا۔ آپ نے کمال لطف سے فرمایا: ”یا طیفو! (بایزید کا اصل نام) ابھی منزل مقصود دور ہے۔“ (ریاض

السالکین، ص ۳۳۳)

اس اقتباس سے درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ ہم نیچے بیان کر آئے ہیں کہ جب عثمان ہادی رضی اللہ عنہ آنکھیں بند کر کے دیکھا کہ کیا تھا، تو پانچ مرتبہ سورۃ فاتحہ پڑھی اور جب ایک ہندو بچہ کو بادشاہ نے ظلم کے تختہ دار پر کھینچا تھا، تو اپنے سورۃ فاتحہ کے عمل ہی سے اسے زندہ کر دکھایا تھا۔ پھر ایک فرد ایک لڑکے کو جو کسی جڑ میں قید تھا، آزاد کر کے سورۃ فاتحہ کے عمل سے گھر لے آئے تھے۔ دوسرا ولی اللہ بھی سورۃ فاتحہ کے اس عمل سے بکثرت فائدہ اٹھاتے اور کلمات دکھاتے ہیں۔

- ۱۔ سورہ فاتحہ کے خواص اور اس کی دعوت کا طریقہ بھی دین کا حصہ ہیں۔
- ۲۔ یہ دین کا حصہ حضور اکرم ﷺ نے صرف حضرت علیؓ کو بتلایا یا اس کی اجازت دی۔ پھر حضرت علیؓ نے بھی صرف اُن صاحبزادوں کو بتلایا، جو حضرت فاطمہؓ کے بطن سے تھے۔ اپنے دوسرے بیٹوں کو بھی نہیں بتلایا۔
- ۳۔ یہ دین کا حصہ دعوت چہل اسماء، قریشیہ اور شیخ پر مشتمل ہے۔
- ۴۔ اس دعوت چہل اسماء، قریشیہ اور شیخ سے ہی منزل مقصود حاصل ہوتی ہے۔
- ۵۔ بایزیدؒ گروہ موقوفہ نہیں سلطان العارفین کے لقب سے پکارتے ہیں) نے انیس برس اس دعوت پر صرف کئے مگر کما حقہ فائدہ نہیں ہوا، کیونکہ انہوں نے کسی ”مرشد کامل سے اجازت“ نہیں لی تھی۔ لہذا منزل مقصود کے لئے یہ اجازت انتہائی لازمی شرط ہے۔
- ۶۔ اہم موسیٰ کامل انسانوں کے علاوہ جنوں (رجال الغیب) کے بھی اہم تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس چہل اسماء، قریشیہ اور شیخ کی دعوت چہل اسماء اور منزل مقصود ہے کیا چیز؟ اور منزل مقصود کیا ہے؟ تو ان سوالوں کا جواب اگلی عبارت میں ملاحظہ فرمائیے، بایزید فرماتے ہیں کہ:

”میں نے عاجزی سے اپنا سر اہام (موسیٰ کلیم) کے آگے رکھ دیا اور عرض کیا کہ یا اہام مجھے تعلیم فرمائیے کہ راہ ہدایت میسر ہو اور قوت دعوت کی حاصل ہو اور مجھ پر مکاشفات اور مراقبات کھل جائیں۔ اہام نے فرمایا کہ واللہ اگر ہزار برس تک دعوت کرتا ہے گا کچھ حاصل نہ ہو گا جب تک ہماری اجازت سے سوہ فاتحہ کی دعوت نہ کرے۔ میں نے پھر عرض کی کہ یا حضرت تعلیم فرمائیے۔ بعد مدت کے آپ نے خلوت کی اجازت دی۔ ۳۹ دن تک دعوت میں مشغول رہا۔ ۳۸ ویں روز چار نوکل بہت سے کو اکب کے ساتھ میسر پاس آئے اور السلام علیکم کی اور میں نے سلام کا جواب دیا، تو انہوں نے کہا کہ اے صاحب دعوت! ہم اس لئے حاضر ہوئے کہ تیری خدمت بجالائیں، اپنا مذہب بیان کر۔ ہم سب فرمانبردار (اسماء چہل اسماء) ہیں جس قدر اللہ تعالیٰ نے مکاتبات میں تمام جن والس کے پیدا کیے ہیں، ہمارے تحت و تصرف میں ہیں۔ ان میں سے ایک نے فرمایا: ”میرا نام ارفائیل ہے اور جبرائیل بھی کہتے ہیں۔ چار ہزار گروہ فرشتوں کا میرے تحت و تصرف میں ہے اور تمام ارواح اس عمل کے پڑھنے والے کیے حاضر ہوتے ہیں۔ دوسرے نوکل نے کہا: کہ

میرانم میکائیل ہے۔ لاکھ ارواح جن وائس میکے فرمان میں ہیں۔ صاحب دعوت جس کام کا حکم دے فوراً بجالائیں۔ تیسرے مؤکل نے کہا کہ میرانم سرفائیل ہے اور اسرافیل بھی کہتے ہیں۔ تمام جن وائس شیطان اور ارواح ارضی و سماوی اس اسم کے تابع ہیں اور سب میرے مطیع و فرمانبردار ہیں، جو فرمایا جائے فوراً بجالائیں۔ چوتھے مؤکل نے کہا کہ میرانم شیخ ہے اور عزرائیل بھی کہتے ہیں۔ اللہ پاک نے مجھ کو سب بزرگیاں عنایت فرمائی ہیں۔ میرے بارہ ہزار تین سو کم اور ساٹھ ہزار جن وائس تابع ہیں۔ جب صاحب دعوت مجھ کو طلب کرے حاضر ہوں۔ میں نے بخور آگ میں ڈال کر ان کو رخصت کیا۔ چالیس روز کے بعد ام زمان کے قدم بوس ہوا۔ ام نے میرے اوپر بہت سے لطف اٹھا کر مجھے رخصت کیا اور فرمایا جس کو لائق سمجھو اسے اجازت دینا۔“ (ریاض البکین، ص ۳۳۲، ۳۳۳)

یہ تھا وہ سورۃ فاتحہ کی دعوت کا خاص الخاص ”طریقہ جسے حضور اکرم ﷺ نے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تعلیم فرمایا تھا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بیٹوں کو بتلایا۔ پھر آئمہ شیعہ کے واسطے سے ہوتے ہوئے بایزید تک پہنچ گیا۔ پھر بایزید نے امام موسیٰ کاظم کا دل سے شکریہ بھی ادا کیا، کیونکہ وہ انیس سال سے کشف و مجاہدہ میں پڑے ہوئے تھے اور انہیں منزل مقصود ہاتھ نہ آئی تھی۔ اس اقتباس سے مندرجہ ذیل باتوں کا مزید پتہ چلتا ہے:

مؤکلین کی قوت

۱۔ تصرف فی الامور، جو ولایت کا ایک حصہ ہے، رجال الغیب سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ کتاب و سنت کی پیروی سے۔

۲۔ سب سے کمزور مؤکل ارفائیل یا جبریل (فرشتہ ہے) جس کے تحت صرف چار ہزار فرشتوں کا گروہ ہے۔ دوسرا مؤکل میکائیل پہلے مؤکل جبریل سے بہت زیادہ طاقتور ہے کیونکہ اس کے تحت ایک لاکھ یا ۲۵ لاکھ زیادہ جن وائس ہیں۔ تیسرا مؤکل سرفائیل یا اسرافیل دوسرے سے بھی بہت زیادہ طاقتور ہے کیونکہ اس کے تحت تمام ارضی و سماوی ارواح اور جن وائس ہیں۔ چوتھے مؤکل شیخ یا عزرائیل کی شان سب سے بالا ہے۔ اگرچہ اس کے تابع جن وائس تو صرف ساٹھ ہزار ہیں مگر اس کے پاس بارہ ہزار تین سو ملک بھی تو ہیں۔

۳۔ اگر ”مرشد کامل“ کی اجازت ہو تو ۴۰ دن کے چلنے کے آخر تک سب حاضر ہو کر اپنے مسخر ہونے کی اطلاع دیتے ہیں اور اس طرح صاحب دعوت ہر طرح کے تصرف فی الامور پر قادر ہو جاتا ہے۔

۴۔ یہ مؤکل جب اپنی فرمانبرداری کا اعلان کرنے آتے ہیں، تو اس وقت تک رخصت نہیں ہوتے جب تک آگ پر بخور نہ ڈالا جائے۔

اس کے بعد صاحب ریاض السالکین اس چلہ بیٹھنے کا طریقہ بتلاتے ہوئے دعوت سورہ فاتحہ کو زکوٰۃ سورۃ فاتحہ میں بدل دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ :

”طریقہ زکوٰۃ سورۃ فاتحہ شریف یہ ہے کہ اول نرک حیوانات جلالی و جمالی کرے اور عروج ماہ میں دوشنبہ کے روز روزہ رکھے اور رات کو خلوت میں بیٹھ کر ہر شب میں ہزار ہزار مرتبہ چیس یوم تک پڑھا کرے اور جب تک چہ تہام نہ ہو خلوت سے باہر نہ آئے مگر ضرورت پر مضائقہ نہیں اور بعد ہر صدی کے درود پڑھے۔ پھر جس کام کے لئے پڑھے وہ کام پایہ تکمیل کو پہنچے۔ پھر ہمیشہ کے لئے اسی مقدار میں پڑھتا رہے نہایت مجرب عمل ہے۔“ (ریاض السالکین، ص ۳۳۴)

دیکھ لیا آپ نے ہمارے یہ بزرگان دین، اولیائے کرام جلتے جو کاٹتے پھرتے ہیں، تو ان کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ پھر کوئی بزرگ تو اس کے لئے ویرانہ کا انتخاب کرتے ہیں یا جنگل کا۔ کچھ قبر کھود کر اس میں بیٹھ جاتے ہیں اور ڈھکنا رکھ دیتے ہیں۔ کوئی دریا کا کنارہ تلاش کر لیتے ہیں اور فرید الدین گنج شکرؒ نے تو یہ چلہ کنوئیں میں بیٹھ کر کاٹا تھا تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۷۸، اور یہی مخفی وہ منزل مقصود جس کے لئے بایزیدانیس سال تک محنت کرتے رہے۔ غور فرماتے ان باتوں میں سے کوئی بات بھی شریعت سے مطابقت رکھتی ہے؟

ہمارے خیال میں یہ روایت کئی لحاظ سے غلط ہے۔ ہم نہ حنفی اکرم ﷺ کو اور ہی دوسرے اماموں کو اس قدر نجلی سطح پر لانا چاہتے ہیں اور بایزید کے متعلق بھی معتبر روایت تو یہی ہے کہ وہ کشف و کرامات کو قطعاً معیار ولایت نہیں سمجھتے تھے۔ تاہم یہ بات بھی ثابت ہے کہ وہ خود تیس سال تک شام کے جنگلوں میں ریاضت و مشاہدہ میں مشغول رہے۔ (صوفیائے تشبند، ص ۸۹) ہو سکتا ہے پہلے وہ اسی منزل مقصود کے لئے جنگلوں میں ریاضت و مشاہدہ کرتے رہے ہوں اور آخری عمر میں انہیں احساس ہو گیا ہو کہ یہ کشف و کرامات معیار ولایت نہیں ہوتے۔ اور بمصادق ”من نہ کردم شامہد رکبکند“ آپ نے یہ ارشاد فرمایا ہو کہ :

”اگر کسی کو پانی پر چلتا یا ہوا میں اڑتا ہوا دیکھو.... یہ ولایت کے لئے ضروری ہیں“ (صوفیائے نقشبندیہ)

کچھ بھی ہو عوام الناس کا ذہن بھی کچھ ایسا ہی بن گیا کہ
ولایت اور کشف و کرامات کا تعلق وہ ولایت اور کشف و کرامات کو لازم و ملزوم سمجھنے لگے

تیسرے مہمدی کے بعد آنے والے بیشتر صوفیائے کرام بھی انہیں طوطیوں، یعنی جھگمگوں میں ریاضتوں، چاروں ترک چٹوں، مزاروں اور قبروں پر چلے کشیوں کے ذریعہ کشف و کرامات کو حاصل کر کے اپنی ولایت کا ثبوت مہیا کرنے لگے۔ جو کوئی جتنا صاحبِ کرامات ہوتا اتنا بڑا ولی اور ابدال و قطب یا غوث سمجھا جانے لگا۔ پھر تحریر کی صوت میں ان صوفیائے کرام کے تذکروں نے بھی یہ ثبوت مہیا کر دیا کہ اصل ولایت محض نام ہے۔ کشف و کرامات کا اور توجہ کے ذریعہ تصرف فی الاموال۔

۲۔ اولیاء اللہ کے باہمی مقابلے

صوفیائے نقشبندیہ کے مصنف
۱۔ اولیاء ہند اور اولیائے افغانستان کا مقابلہ
 سید امین الدین احمد قسری ہیں کہ:

”ایک وز ایک درویش، جو خاندانِ چشتیہ سے منسلک تھے۔ عجب نور و جوشنبندی تھے، کے پاس آئے اور اس موضوع پر گفتگو ہوئی کہ اولیائے ہندوستان زبردست ہیں یا اولیائے افغانستان۔ بعد نمازِ عشاء اللہ نور (عجب نور کے بھائی اور نقشبندی) نے ایک پتھر لاکر رکھ دیا اور چشتی صاحب سے کہا کہ آپ اس پر توجہ کریں، فقیر بھی توجہ کرے گا۔ چشتی صاحب نے اسمائے الہی کی ضربات کا بہت زور لگایا لیکن اس پتھر پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اس کے بعد ضیفہ اللہ نور نے بسم اللہ شریف اور کلمہ تجید پڑھ کر اسم ذات کی ضربات لگانا شروع کیں۔ بفضلِ الہی پتھر حرکت میں آگیا۔ گاؤں کا سردار اس پتھر کو تبر کا اپنے گھر لے گیا اور باقی گاؤں کے تمام لوگ حضرت خواجہ صاحب کے سلسلہ نقشبندی میں داخل ہو گئے“ (صوفیائے نقشبندیہ)

اس اقتباس سے درج ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:

- ۱۔ عوام و خواص کا ذکر تو درکنار، ان ”اولیاء اللہ“ کا اپنا ذہن بھی یہی رہا ہے کہ کرامات و تصرف ہی کا دوسرا نام ولایت ہے۔
- ۲۔ اسمائے الہی سے ضربات لگانے اور کرامات دکھلانے کے لحاظ سے طریقہ نقشبندیہ، چشتیہ

سے زیادہ کارگر اور مضید ہے۔

۳۔ اِن اولیاء اللہ کا عوام کو اپنے قریب کرنے، اپنے سلسلہ میں داخل کرنے یا اسلام کی طرف مائل کرنے کا یہی گُر تھا۔

۲۔ رجال الغریب کا مقابلہ پہلا مقابلہ تو توجہ کے ذریعے کرامات دکھلانے کا تھا کہ اب اولیاء اللہ کے براہ راست تصرف کے مقابلہ کا واقعہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ حساب ریاض السالکین لکھتے ہیں کہ :

”جب شاہ ایران نے بغداد پر فوج کشی کی تو خلیفہ اس کے مقابلے کی تاب نہ لا کر آپ (پیران پیر) سے مدد کا طالب ہوا۔ آپ نے علی بن ابیہتی سے فرمایا کہ تم عجم کے لشکر میں جاؤ۔ سب سے پہلے ایک چادر کا خیمہ ملے گا۔ اس میں تین شخص ہوں گے ان سے کہدو کہ وہ واپس چلے جائیں۔ اگر وہ کہیں کہ ہم کسی کے حکم سے آئے ہیں، تو تم بھی یہی جواب دینا کہ میں بھی کسی کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔ غرض شیخ علی بن ابیہتی نے اس طرح جا کر خیمہ تلاش کیا۔ اس میں واقعی تین شخص تھے۔ ان کو کہا، تو انہوں نے یہی جواب دیا کہ ہم کسی کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ اُن کے جواب میں آپ کے خدام نے بھی یہی کہا کہ میں بھی کسی اور ہی کے حکم سے آیا ہوں۔ یہ سن کر وہ سب واپس چلے گئے۔ ان کی واپسی کے ساتھ ہی عجمی فوج میں ایک گڑبڑسی مچ گئی اور وہ بھی بھاگ نکلے۔ آپ (یعنی پیران پیر) کی کرامات بے شمار ہیں۔“ (ریاض السالکین ص ۱۳۱)

اس اقتباس سے درج ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے :

۱۔ پیران پیر کے زمانہ تک ”اولیاء اللہ“ کی کرامات و تصرفات کا عقیدہ اتنی ہمہ گیر صورت اختیار کر چکا تھا کہ شاہان وقت، خواہ وہ عرب کے ہوں یا عجم کے، مسلمان ہوں یا کافر، جنگ میں فتح و شکست تک کے معاملات میں اِن اولیاء اللہ کے تصرفات پر انحصار کرتے تھے۔

۲۔ شاہ ایران نے تین مختلف اولیاء اللہ سے استدعا لی اور انہوں نے اپنا اپنا ایک نمائندہ بھیجا۔ یا ایک ہی ولی سے استدعا پر اس نے اپنے تین نمائندے بھیجے؛ یہ وضاحت تہ کرنا بھول گئے۔ جو کچھ بھی ہوا بہر حال یہ ضرور ثابت ہو گیا کہ شاہ ایران کے ولی یا اولیاء کے نمائندے، پیران پیر کے نمائندے کے مقابلے میں دم و دبا کر بھاگ نکلے۔ یہ بار دراصل شاہ ایران کی نہیں، بلکہ اِن اولیاء اللہ اور ان کے رجال الغریب کی تھی۔

۳۔ جنگ میں فتح حاصل کرنے کے یہ طریقے نہ رسول اللہ ﷺ کو معلوم تھے نہ خلفائے اشدین کو۔ ایسے یقول کی ایجاد بہت دیر بعد کی پیداوار ہے۔

۴۔ عبد القدوس گنگوہی (م ۹۴۴ھ) اور محمد غوث گوالیار کا مقابلہ ”محمد غوث گوالیاروی، جو کتاب ”جواہر خمسہ“ کے

مصنف ہیں، عامل تھے۔ انہوں نے عبد القدوس گنگوہی کو لانے کے لئے ایک مرتبہ جنوں کو بھیجا۔ شیخ مسجد میں مشغول تھے۔ جن پہنچے، تو خود ہی سراٹھا کر دیکھا اور پوچھا کون؟ جنوں نے جواب دیا کہ ”محمد غوث“ نے بھیجا ہے وہ زیارت کا مشاق ہے۔ اجازت ہو تو ہم اس طرح لے چلیں کہ تکلیف نہ ہو۔“ حضرت نے فرمایا: ”میں حکم دیتا ہوں کہ محمد غوث کو لے آؤ۔“ چنانچہ جنات واپس پہنچے اور محمد غوث کو لے کچلے انہوں نے جنات سے دریافت کیا کہ ”اس کی کیا وجہ ہے، تم تو میرے مطیع تھے، یہ سرکشی کیسی؟ جنوں نے جواب دیا کہ ”سب کے مقابلہ میں تو تھکے مطیع ہیں، مگر شیخ عبد القدوس گنگوہی کے مقابلے میں تمہاری اطاعت نہیں۔“ غرض ان کو لے کر شیخ کی خدمت میں پہنچے، تو شیخ نے محمد غوث کو دیکھ کر فرمایا ”تہیں شرم نہیں آتی۔“ اور بہت ڈانٹا۔ آخر وہ بیعت ہو کر صاحب نسبت ہو گئے۔ گوالیار میں ان کا مزار ہے۔“ (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۲۰۶)

اس اقیاس سے دو باتیں سامنے آتی ہیں :

۱۔ محمد غوث اور عبد القدوس گنگوہی دونوں جنات یا رجال الیقب کے عامل تھے۔ لیکن عبد القدوس اس فن میں ماہر تھے، جنہوں نے محمد غوث اور ان کے جنوں کو بھی مطیع کر لیا، لہذا عبد القدوس بڑے ولی ہوئے اور محمد غوث چھوٹے ولی۔

۲۔ مروجہ ولایت اسی طرح کی تسخیر رجال الیقب اور شعبہ بازیوں کا مقصد نام ہے اور اس کا شریعت محمدی کی اتباع سے کوئی تعلق نہیں۔ شریعت کی اتباع کا نام صرف جاہل مسلمانوں کو اس جاہل میں پھنانے کے لئے لیا جاتا ہے۔

۴۔ مولانا دریش محمد اور شیخ خوارزمی کا نسبت سلب کرنے کا مقابلہ شیخ حسین خوارزمی اپنے وقت کے

مقتدر تھے۔ جہاں کہیں جاتے وہاں کے مشائخ آپ کے تصرفات کے مقابلے میں ماند ہو جاتے تھے۔

جب کوئی درویش آپ سے ملنے آتا تو آپ اس کی نسبت سلب کر لیتے۔ ایک دفعہ شیخ مولانا درویش کے شہر میں آئے تو وہاں کے مشائخ آپ کی ملاقات کے لئے گئے۔ مولانا نے فرمایا کہ میں شیخ کی ملاقات کو جانا چاہتے اور ساتھ ہی شیخ حسین کی نسبت بھی سلب کر لی۔ اس نسبت کی سبلی سے شیخ بہت پریشان ہوئے اور اونٹ پر سوار ہو کر نسبت کی خوشبو کے پیچھے چل دیے۔ ادھر سے مولانا بھی شیخ کی طرف چل پڑے تھے۔ شیخ، مولانا سے جتنا قریب ہوتے جاتے اُسی قدر گم شدہ نسبت کی بُتیر ہوتی جاتی۔ جب راہ میں دونوں کی ملاقات ہوئی، تو وہ نسبت کی بُو میں منقطع ہو گئی، تب جا کر شیخ کو معلوم ہوا کہ میری نسبت مولانا نے اپنے تصرف سے سلب کر لی ہے۔ شیخ نے بڑی انحراسی سے کہا، مجھے علم نہ تھا کہ یہ اقلیم آپ کے زیر حکومت ہے۔ اب میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ مولانا کو شیخ پر رحم آگیا اور سلب شدہ نسبت واپس دے دی۔ شیخ نے اسے غنیمت سمجھا اور اپنے وطن کو واپس ہوئے۔
(صوفیائے نقشبند، ص ۱۸۵)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے:

۱۔ ہمارے اولیاء اللہ اپنی نمود و نمائش کے لئے بڑے حریص واقع ہوئے ہیں اور فوراً مقابلہ پر بھی اُتر آتے ہیں اور اپنے سے کم تر کے تصرفات چھین کر ان سے اپنی ولایت کا سکہ تسلیم کروانے چھوٹتے ہیں۔
۲۔ نسبت کی سبلی غالباً تصرفات کی سبلی سے بڑی سزا ہے، کیونکہ تصرفات میں بُو نہیں ہوتی جبکہ نسبت میں خوشبو بھی ہوتی ہے۔ اگر نسبت سلب ہو جائے، تو اس کی خوشبو کے پیچھے چلنے سے یوں سراغ لگایا جاسکتا ہے جیسے چور کا اس کے پاؤں کے نشانات سے۔

۳۔ تصرف یا کرامات اور ولایت لازم و ملزوم ہیں۔ چھترتنا زیادہ حساب تصرف کوئی ولی ہوگا۔ اتنا ہی وسیع علاقہ اس کے زیر حکومت ہوگا، گویا تصرف حکومت (باطنی) بھی لازم و ملزوم ہوئے۔

۵۔ پیر شمس اور بہاؤ الدین زکریا کی کرامتوں کا مقابلہ
افراد کا معیار رشید امامیہ کے ایک مبلغ پیر شمس الدین زکریا
شہر بنی روم ۷۵۵ھ کا ذکر ہو رہا ہے۔

”حضرت پیر شمس کی شہرت بڑھنے سے بہاؤ الدین زکریا نامی ایک درویش کو اپنی عزت کی نسبت ڈر پیدا ہوا مگر پیر شمس کی روایت کے بموجب اس نے اپنے خاص مرید خان محمد سید حاکم شہید کو حکم دیا کہ پیر شمس ملتان آئیں گے تو ہمیں بھی ان کی اطاعت کرنی پڑے گی اس لیے تمام کشتیوں کو شہر میں لے لو تاکہ وہ شہر میں داخل نہ ہو سکیں مرید نے اس حکم پر عمل کیا اور جب پیر شمس

نے کنارہ پر آکر دیکھا تو ایک بھی کشتی نظر نہ آئی۔ بے حوصلہ آیا۔ ایک کاغذ کی کشتی بنائی اس میں خود بیٹھ گئے اور کشتی کے ساتھیوں کو اپنی انگلی پکڑنے کے لیے کہا۔ سبوں نے اس پر عمل کیا۔ کشتی اسی وقت ندی میں بننے لگی مگر چکر کھانے لگی۔ پیرشس نے دریافت کیا کہ کسی کے پاس جنوبی مال و متاع ہے کیا؟ شاہزادہ محمد کو ان کی والدہ نے زاوراہ کے لیے چند زیورات دیئے تھے اس کو انہوں نے پیرشس کے سامنے رکھ دیا۔ آپ نے ان جواہرات کو دریا میں پھینک دیا۔ ویسے ہی کشتی ندی میں بہنے لگی اور جب بیچ میں پہنچی تو بہاؤ الدین ذکر کیا کی نظر اس پر پڑی اور اس نے بددعا دی اس لیے کاغذ کی کشتی وہیں رک گئی۔ پیرشس بہت حیران ہوئے آخر ان کی نظر بہاؤ الدین ذکر پر پڑی جو کھڑکی میں بیٹھا تھا۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ میری کشتی اس نے روک لی ہے۔ پیرشس نے اس کی طرف جنوبی نظر اٹھائی تو بہاؤ الدین کے سر پر دو سینگ پیدا ہو گئے۔ اور سر کھڑکی میں اٹک گیا۔ بہاؤ الدین اس مصیبت سے گھبرا گیا اور اپنے دو بیٹوں کو معافی کے لیے پیرشس کے پاس بھیجا۔ ان لڑکوں کی مسجد قدیم میں پیرشس سے طاعات ہوئی۔ لڑکوں نے والد کی طرف سے معافی مانگی۔ پیرشس نے اس کے حق میں دعا فرمائی۔ اس طرح بہاؤ الدین کو اس مصیبت سے نجات ملی۔ اب تک وہ دونوں سینگوں کی نشانی ان کے ذکر و فرزندوں میں باقی ہے۔ اور وہ کھڑکی بھی موجود ہے۔ جس میں بہاؤ الدین بیٹھا تھا۔ بقائے نسر کے سیاحت کرنے والوں کو یہ چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں۔

اب دیکھئے درج بالا کرامت دراصل بہت سی کرامات کا یا خرق عادت امور کا مجموعہ ہے۔ مثلاً:-

۱۔ آج تک اتنا چڑا کاغذ ایسا نہ پہنچا جس کی اگر کشتی بنائی جائے تو آدمی اس میں بیٹھ سکے مگر پیرشس کو ایسا کاغذ مل گیا تھا۔

۲۔ پھر وہ کاغذ اس قدر وڈا ہوا کہ پروف تھا کہ پانی میں گلتا تک نہ تھا۔

۳۔ نیز وہ کاغذ اس قدر مضبوط اور توازن بدوش تھا کہ پیرشس کے اس میں بیٹھنے اور ساتھیوں کے پیرشس کی انگلی پکڑنے یعنی کئی آدمیوں کا بوجھ اٹھانے کے باوجود نہ تو ٹوٹا۔ اور نہ ہی ان کو لے ڈوبا۔

۴۔ اتنے پائیدار کاغذ کے ناؤ کے چکر کھانے کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ خواجہ خضر خواجہ جے اولیاء اللہ کی دنیا میں پانیوں کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے کا تدار نہ پیرشس نے دیا تھا۔ چنانچہ پیرشس نے شاہزادہ محمد سے چند زیور لیے۔ لیکن جب پیچھے تو وہ زیور کے بچے نے جواہرات بن گئے ان جواہرات کے ملنے پر خواجہ خضر خوش ہو گئے۔ اور کشتی کو آگے چلنے دیا۔

۵۔ پیرشس کی نظر جلالت پڑنے پر بہاؤ الدین ذکر یا ملتان کے سر پر دو سینگوں کا اسی وقت آگ آنا بھی بڑی عالی شان کرامت ہے۔ معافی مانگنے پر یہ سینگ تو غائب ہو گئے۔ لیکن یہ فلک کا سیکر ان کی اولاد کو بھی باقی رہ گیا کہ کیسے ہمارے جد امجد مبارک ذکر یا ملتان نے شکست کھائی تھی۔

۶۔ شیخ خرقانی اور شیخ ابوالعباس کا آگ میں کودنے کا مقابلہ | اس مقابلہ کی تفصیل ہم بعد کے ذیلی عنوان ”یا نار کوئی بردا و سلاما کے تحت درج کر رہے ہیں، وہاں دیکھ لی جائے۔

کشف کرامات کے حصول کا بہترین نسخہ

جب ولایت اور کشف و کرامات کے لازم و ملزوم ہونے کا عقیدہ ہمہ گیر شکل اختیار کر گیا، تو ضروری تھا کہ جو سند یا بندہ کے مصداق کشف و کرامات یا ولایت کے حصول کے طریقے بھی دریافت کئے جائے چنانچہ ان ”اولیاء اللہ“ نے ایسے سینکڑوں اور اودا و ذکار اور وظائف بھی ایجاد کر لئے۔ نمونہ ایک نسخہ حاضر خدمت ہے۔ صاحب ریاض البیہکن ”اسمِ اعظم“ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

”یہ وظیفہ مخدوم جہانیاں جلال الدین جہاں گشت کا ہے۔ اس اسمِ اعظم سے نو ہزار کشف و کرامات حاصل ہوتی ہیں۔ ترکیب اس کی یہ ہے کہ اول ترک حیوانات جلالی و جمالی کرے اور ہر وقت پانچ سو باطہارت ہے۔ ایک کروڑ مرتبہ ”اللہ الصمد“ یا ”اسرافیل یا دوفائیل“ اول آخر درود شریف پڑھے اور ایک تعداد مقرر کر کے روزانہ اسی تعداد کے مطابق ایک ہی جانناز پر وظیفہ کرے۔ جب ۲۵ لاکھ پورا ہو چکے، تو اس کا ثواب تمام پیغمبروں کی دوحوں کو پہنچائے۔ پھر ۲۵ لاکھ پورا کر کے اس کا ثواب حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دوح کو پہنچائے۔ پھر ۲۵ لاکھ پورا ہونے پر اس کا ثواب تمام شہیدوں اور غوث قطب ابدال اور تمام برگزیدہ بزرگوں کی دوح کو پہنچائے۔ پھر ۲۵ لاکھ پورا ہونے پر اس کا ثواب تمام امت رسول اور جمیع مسلمانوں کی ارحام پاک کو پہنچائے۔ پس عمل پورا ہو گیا۔۔۔ تین مرتبہ یا گیارہ مرتبہ اسمِ اعظم پڑھ کر جو چاہے فوراً حاضر ہو۔ تمام کائنات تسخیر میں ہوگی۔ تین ماہ گزرنے کے بعد بے شمار کشف و کرامات حاصل ہوں گے، لیکن حلال و حرام کی تمیز ہو۔ ناجائز، خلاف شرع کوئی بات نہ ہو۔۔۔ یہ میرا آزمودہ ہے۔ نااہل کو اس کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ مجھے اس کی اجازت سید محمد عبد اللہ نے ۱۹۳۰ء میں دی تھی۔ ہر چیز اضی و سماوی تابع فرمان ہوگی۔ یہ اسمِ اعظم ننگی تلوار ہے بغیر اجازت مرشد کامل ہرگز نہ پڑھے۔“ (ریاض السابکین، ص ۳۵۴)

اس اقتباس سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں :

۱۔ اس وظیفہ کے موجب جلال الدین مخدوم جہانیاں، اجازت دہندہ سید محمد عبد اللہ اور راقم کتاب مذکورہ "مرشدین کامل" ہیں۔

۲۔ ان تینوں کے نزدیک اللہ الصمد کے ساتھ "اَجَب" یا "اسرافیل" یا "دَفَائِل" بھی اہم اعظم کا حصہ ہے، جو صریح شرک ہے اور یہی رجال الغیب سے استمداد ہے۔ لیکن ان حضرات کے نزدیک یہ خلاف شرع کیا عین شرع کے مطابق ہے۔

۳۔ اور ہمارا خیال یہ ہے کہ اس شرکیہ وظیفہ میں یہی حصہ "اَجَب" یا "اسرافیل" یا "دَفَائِل" ہی اصل الاصول ہے کیونکہ ہندو جوگی اور سادھوؤں سے بھی بے شمار کرامات ظاہر ہوتی ہیں اور وہ بھی اپنے جنتر و منتر کے ذریعے رجال الغیب سے استفادہ کرتے ہیں اور "اللہ الصمد" کے قائل بھی نہیں ہوتے۔

۴۔ یہ حرام حلال کی تمیز اور طہارت وغیرہ کی پابندیاں بھی محض تقدس پیدا کرنے کے لئے لگائی گئی ہیں۔ کیونکہ دوسرے مذاہب کے مرشدان کامل ایسی پابندیاں روا نہیں رکھتے اور اس کے باوجود کشف و کرامات کے ماہر ہوتے ہیں۔

۳۔ اولیاء اللہ کی اقسام

تعلیم و تربیت یا کرامات کے صدور کے لحاظ سے ان اولیاء اللہ کی مندرجہ ذیل اقسام ہیں :

مختلف تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ سب پہلے مادر زاد ولی سید الطائفہ ،

۱۔ مادر زاد ولی

بازید بسطامی (م ۲۶۱ھ) تھے۔ آپ کی والدہ سے روایت ہے "جب کبھی میں شبہ

کا لقمہ کھا لیتی تو اندبے قراری شروع ہو جاتی تھی۔ اور تا وقتیکہ قے نہ کر دیتی آرام نہ آتا تھا" (صوفیائے سنیہ ص ۱۱۸)

آپ کا سلمہ طریقت امام جعفر صادق سے ملایا جاتا ہے۔ جنہیں آپ نے دیکھا بھی نہیں یعنی آپ امام موصوف کی وفات کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ (حوالہ ایضاً)

۲۔ علوم ثانیہ (م ۲۹۸ھ) "اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ شیخ ہمیشہ روزہ رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ رطپن

میں بھی کبھی دن میں ماں کا دودھ نہیں پیتے تھے۔ اسی وجہ سے مادر زاد ولی کہلاتے ہیں۔" (تاریخ شیخ پختہ ص ۱۱۸)

۳۔ خواجہ محمد یابو محمد (م ۱۱۱۱ھ) "آپ کا لقب ولی الدین یا نا صح الدین تھا، مادر زاد ولی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ حل کے زمانہ میں والدہ کے پیٹ سے ذکر اللہ کی آواز آتی تھی، پیدا ہوتے ہی سات مرتبہ کلمہ پڑھا۔ ایام رضاعت میں مشغول بند کر رہتے تھے۔" (تاریخ مشائخ چشت، از مولانا زکریا، ص ۱۵۵)

۴۔ شیخ عبدالقادر جیلانی (م ۵۹۱ھ) "آپ کی والدہ بھی صاحب کشفِ کرامات تھیں۔ آپ فرماتی ہیں رمضان بھر میں کبھی دودھ منہ میں نہیں لیا۔ ایک روز مطلع ابر آلود تھا۔ چاند نظر نہ آسکا۔ لوگوں نے آکر مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہا۔ "آج دن بھر میکہ لڑکے عبدالقادر نے دودھ نہیں پیا ہے۔" بعد میں معلوم ہوا کہ اس دن رمضان کی پہلی تاریخ تھی۔" (غزنیۃ الاصفیاء، ص ۱۵۹)

اگرچہ لوگوں کو اس کرامت سے کوئی فائدہ نہ ہوا، ان کا روزہ توقضا ہو ہی گیا تھا۔ تاہم آپ کی یہ کرامت مشہور ہو گئی۔ اس کرامت کے لحاظ سے مشائخ چشت سبقت لے گئے کہ ان کے علوم و تدوینوں ایک تو بہت پہلے کے ہیں (م ۶۹۸ھ) دوسرے وہ رمضان کے علاوہ بھی دن بھر میں ماں کا دودھ نہیں پیتے تھے۔ یعنی پیدائش سے ہی صائم الدھر تھے۔

۵۔ خواجہ امیر کمال (م ۷۷۲ھ) "ایامِ حمل میں اگر آپ کی والدہ محترمہ کوئی مشتبہ لقمہ کھالیتیں تو پیٹ میں درد شروع ہو جاتا اور جب تک وہ نکل نہ جاتا، چین نہ آتا تھا۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۱۵۷)

۶۔ عبدالقدوس گنگوہی (م ۹۴۴ھ) "آپ مادر زاد ولی تھے۔ بچپن ہی میں صاحب کرامات ہو گئے تھے۔" (تاریخ مشائخ چشت از مولانا زکریا، ص ۱۹۴)

۷۔ شاہ بلاول قادری لاہوری (م ۱۰۴۶ھ) "محبوب الصلین میں مرقوم ہے کہ آپ مادر زاد ولی تھے۔ سات برس کا سن تھا کہ ان کا ایک ہم عمر لڑکا فوت ہو گیا۔ آپ یہ سن کر اس کے سر ہانے گئے اور کہا "اے یار! بے وقت سونا اچھا نہیں ہے آؤ چل کر کھیلیں۔ لڑکے نے اسی وقت آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر ساتھ چلا گیا۔" (غزنیۃ الاصفیاء، ص ۲۲۳)

۸۔ خواجہ خاوند المعروف حضرت ایشاں (م ۱۰۵۲ھ) "آپ مادر زاد ولی اور قطب الارشاد بزرگ تھے۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۲۶۱) تذکرہ نویس نے ثبوت کے لئے کوئی کرامت بیان نہیں فرمائی۔

۹۔ محمد شاہ گنج بخش (م ۱۱۰۳ھ) آپ مادر زاد ولی اللہ صاحب جذب (مجبذب) صحو و صکر

اور محبت عشق اور شوق و ذوق اور زہد و ریاضت تھے۔ ولایت کے بادشاہ اور صاحب خوارق و کرامات تھے۔ طریقہ نوشاہیہ قادریہ کے امام اور پیشوا تھے۔^۹... آپ نو ماہ کی عمر میں جھولے میں تھے کہ ایک ہمسائی نے آکر آپ کو گود میں لینا چاہا۔ دیکھا تو ایک سیاہ سانپ حضرت نوشاہ عالی جاہ کے گرد پٹا ہوا ہے۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹی اور چلائی۔ آپ کی والدہ بی بی جیونی جیج سن کر دوڑی آئیں دیکھا تو کوئی سانپ نہیں تھا حیران ہو گئیں۔ اسی اثنا میں گوشہ سے آواز آئی کہ ”یہ عورت ناپاک حالت میں چاہتی تھی کہ ہمارے جسم کو ہاتھ لگائے۔ اس لئے اس کام سے اس کو باز رکھا۔ حیران ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔“

(ضرینۃ الاصفیاء، ص ۲۶۸)

یہ کرامت تو بہت خوب ہے مگر یہ سمجھ نہیں آسکی کہ یہ گوشہ سے آواز دینے والا کون تھا، جو آپ کے جسم کو ہاتھ نہیں لگانے دیتا تھا۔ نیز یہ کنوسی شریعت میں ناپاک عورت کا بچے کو ہاتھ لگانا منع ہے۔

۱۰۔ نور محمد تیراہی المشہو بابا جیو (م ۱۲۸۵) یہ بھی مادر زاد ولی ہیں (صوفیائے نقشبند، ص ۲۸۶) ان کے مادر زاد ولی ہونے کی وجہ تذکرہ نویس نے بیان نہیں فرمائی۔ غالباً یہ وہی ولی ہیں جنہوں نے اولیائے ہندوستان اور اولیائے افغانستان کے درمیان مقابلہ رچایا تھا اور ایک پتھر پر بسم اللہ کی ضربات لگانے سے اس کو حرکت میں لانے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اولیائے ہندوستان (نقشبند) کی لاج رکھ لی تھی۔

۱۱۔ میاں شیر محمد شر قیوی (م ۱۳۲۷) ”عام طور پر مشہور ہے اور دیکھنے والے معتبر اور مستند راوی بیان کرتے اور لکھتے ہیں کہ آپ نے پیدا ہوتے ہی جسم اظہر اور چہرہ ذرا لئی سے دلی کال ہونے کے آثار روز روشن کی طرح ظاہر تھے اور ہر شخص جو حضرت کو دیکھتا تھا، بے اختیار پکار اٹھتا تھا کہ یہ بچہ تو مادر زاد ولی ہے۔“ (صوفیائے نقشبند، ص ۳۵۹)

مندرجہ بالا اقتباسات سے درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں :

- ۱۔ اگرچہ بعض اولیائے کرام کشف و کرامات کو ولایت کے لئے لازم قرار نہیں دیتے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس طبقہ میں ان کی یہ پکار صلاحت ثابت ہوئی ہے۔ ابتداء سے لے کر آج تک عمومی ذہن یہی رہا ہے کہ ولایت اور کرامات لازم و ملزوم ہیں۔ جس میں کرامت نہیں وہ ولی کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔
- ۲۔ ان مادر زاد ولیوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو احکام شریعت کا پاس رکھنا تو درکنار، شرعی کبار میں مبتلا

وہ نماز روزہ کی چنداں پرواہ نہ کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود تذکرہ نویسوں کے ہاں اسی طرح قابل احترام اور بلا ریب ولی ہیں۔ جس سے صوفیاء کے اس دعوے کی تائید ہو جاتی ہے کہ طریقت شریعت سے ہی مانع ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

۳۔ ان مادر زاد ولیوں کی جو کرامات بیان کی گئی ہیں وہ کرامت کی شرائط پوری نہیں کرتیں۔ ان سے نہ کوئی اشد ذہنی ضرورت پوری ہوتی ہے نہ دنیوی۔ لہذا یہ کرامات نہیں، بلکہ استجابات ہیں۔

۲۔ اک نگاہ کرم سے بننے والے ولی

پیران پیر جناب شیخ عبدالقادر جیلانی کے دو واقعات پہلے درج کر آئے ہیں کہ کس طرح ان کی ایک نگاہ کرم نے ایک چور کو دوسری دنیا کا فخر کو ابدال کے مقام پر پہنچا دیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس میدان میں کئی دوسرے ولی ان سے بھی سبقت لے گئے ہیں۔ مثلاً مولانا محمد کریم صاحب اپنی تصنیف ”تاریخ مشائخ چشت نظام الدین العری نھامی سری ام ۱۰۳۴ھ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ :

۱۔ ”جس شخص پر نظر ڈالتے تھے ایک ہی وہلہ میں صاحب شہو ہو جاتا تھا۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں نے ولی تراش نام رکھ دیا تھا۔“ (تاریخ مشائخ چشت، ص ۲۱۵)

۲۔ یہی مولانا زکریا صاحب خواجہ ابوبصیرہ بصری (م ۷۸۷ھ) کے متعلق لکھتے ہیں :

”آپ کا جو شخص منظور نظر ہو جاتا تھا۔ ایک توجہ سے فوراً اس کا معلوم منکشف ہو جاتے تھے۔“

(تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۱۷)

اور یہ تو ظاہر ہے کہ یہ علوم لدنی یا باطنی ہی ہو سکتے ہیں جن کی ان اولیاء اللہ کو ضرورت ہو کر تھی ہے۔

۳۔ حضرت نور محمد بدایونی کی مرزا مظہر جان جاناں پر توجہ ڈالنے کا ذکر ہوا ہے۔

”مگر اس وقت بغیر درخواست کے (نور محمد صاحب نے) مرزا صاحب سے فرمایا کہ آنکھیں بند کر کے دل کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ اور ایک ہی توجہ میں لطافت خمسہ کا ذکر بنا کر نصرت کیا۔ آپ کی توجہ کی تاثیر نے باطن کو اس قدر متاثر اور متوجہ کر دیا کہ دوسرے روز جب (مرزا مظہر جان جاناں نے) حضرت سید صاحب کی خدمت میں حاضری کا قصد کیا اور حسب عادت آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو بعینہ حضرت سید کی معلوم ہوئی۔“ (صوفیائے نقشبند، ص ۲۱۷)

گویا سید صاحب کی ایک توجہ نے کئی مرحلے طے کروا دیئے۔ ایک تو تصویر شیخ میں کامل بنا دیا۔ دوسرے لطائف خمسہ کا ذکر بھی بنا دیا۔ یہ لطائف پانچ ہیں یا چھ ہیں یا سات؟ اس بات میں بھی ان حضرات نے اختلاف کیا ہے اور یہ لطائف کون کون سے ہیں۔ اس کی تفصیل باطنی علوم کے عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔ بہر حال سید صاحب نے اس توجہ میں مرزا مظہر کو پانچ لطائف کا ذکر بنا ڈالا تھا۔ ۴۔ خواجہ محمد فضیل صاحب قادری نوشاہی کے تذکرہ میں صاحبِ غریبۃ الاصفیاء فرماتے ہیں:

”جس فاسق و فاجر پر حالتِ جذب و سکر میں (فضیل صاحب نوشاہی کی) نظر پڑ جاتی۔ عارفِ کامل ہو جاتا۔ کسی مُردہ پر نظر پڑتی تو زندہ ہو جاتا۔ نگاہِ غضب سے کسی کو دیکھتے تو اس کی جانِ حق سے نکل جاتی۔ غرض آپ کے احوال و مقامات عجیب و غریب تھے۔“ (غریبۃ الاصفیاء، ص ۲۴۴)

یہ یاد رہے کہ یہ نوشاہی حضرات انتہا درجہ کے بے دین، تارکِ صوم و صلوٰۃ، بھنگ چرس اور سماع و وجد کے ریا ہوتے ہیں۔ انہیں میں سے ایک مجذوب کی یہ کلمات بیان ہو ہی ہیں۔ بخمد یہ کہ وہ ایک ہی نظر میں فاسق و فاجر لوگوں کو بھی عارفِ کامل بنا ڈالتے تھے۔ اب جیسے یہ عارفِ کامل بنتے ہوں گے اس کا اندازہ خود فرمایا لیجئے۔

۵۔ اسی طرح کے ایک اور نوشاہی شاہ عبدالرحمن ہیں۔ مجذوب تھے۔ لوگ انہیں رحمان دیوانہ کہا کرتے تھے۔ ان کے فضائل و مناقب یہ ہیں کہ:

”گر میوں کے موسم میں سوچ کی دھوپ میں بیٹھتے اور سردیوں میں برہنہ تن رات کو جھگل میں جا کر بیٹھ جاتے اور کبھی سردیوں میں دریا میں کھڑے ہو کر ذکرِ حق میں مشغول ہوتے۔ آپ کی گرمی ذکر سے دریا کا پانی گرم ہو جاتا جس شخص پر نگاہِ شفقت ڈالتے وہ صاحبِ کشف و کرامات ہو جاتا۔“ (غریبۃ الاولیاء، ص ۳۸)

۶۔ اس نظرِ گرم یا توجہ کا اثر اتنا ہمہ گیر ہوتا ہے کہ عام انسان یا فاسق و فاجر تو درکنار کتوں پر پڑ جاتے تو انہیں بھی صاحبِ کشف و کرامت اور ولی بنا دیتی ہے۔ چنانچہ اشرف علی تھانوی صاحب جنید بغدادی کے فضائل و مناقب بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

”۲۲۸۔ فرمایا (یعنی اشرف علی صاحب کے پیر امداد اللہ مہاجر کی نے) حضرت جنید بغدادی بیٹھ تھے۔ ایک کُتا سامنے سے گزرا۔ آپ کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ اس قد صاحبِ کمال ہو گیا کہ شہر کے کُتے اس کے پیچھے دوڑے۔ وہ ایک جگہ بیٹھ گیا۔ سب کُتوں نے اس کے گرد حلقہ باندھ کر مراقبہ کیا۔“ (امداد اللہ شفیق

یہ کتے بچاے تو غیر مکلف مخلوق تھے۔ اس بچاے کو خواہ مخواہ صاحب حال بنا دیا۔ پھر دوسرے یہ کہ اس کا مراقبہ بھی شروع ہو گیا اور اس طرح کتوں میں ولایت کی داغ بیل ڈال دی۔ پھر لطف یہ کہ یہ نگاہ بھی اتفاقاً پڑ گئی تھی۔ اگر آپ عمداً نگاہ کر م فرماتے تو خدا معلوم اس کتے کو کتنا بلند مقام حاصل ہو جاتا۔ رہے وہ انسان جن پر آپ کی زندگی میں نظر پڑ گئی یا آپ نے ڈالی تھی، تو ان کے ولی ہونے میں کسی کو کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

۳۔ تربیت یافتہ ولی اور طریق تربیت

کہا جاتا ہے کہ تزکیہ نفس کا دوسرا نام تصوف ہے۔ قرآن کریم کی رُف سے تزکیہ نفس پر حضور اکرم بھی مامور تھے اور یہی کام صوفیاء بھی کرتے ہیں۔ اب درج ذیل طریقہ ہائے تربیت ملاحظہ فرمائے اور فیصد خود فرمایا جیسے کہ آیا رسول اکرم ﷺ اسی طرح سے اور اسی طرح کا تزکیہ نفس فرمایا کرتے تھے۔

آپ کا ایک مرید ۳۰ سال آپ کی خدمت میں رہا وہ رات کو نہ کبھی سوتا اور نہ ہی کبھی روزہ چھوٹا تھا، مگر

۱۔ بایزید بسطامی (م ۲۶۱ھ) کا طریقہ کار

باطنی علوم اس پر مکشف نہ ہوتے تھے۔ آخر تنگ اگر حضرت شیخ سے اس بات کی شکایت کی تو بایزید نے فرمایا ”تم تین سو سال بھی لگے رہو تو یہ علم حاصل نہ کر سکو گے۔“ مرید نے پوچھا: ”اس کا کوئی علاج؟“ فرمایا ”علاج تو ہے، مگر تم نہ کر سکو گے۔“ جب مرید نے اصرار کیا تو آپ نے علاج یہ بتلایا کہ ”اپنی ڈاڑھی اور سر منڈا دو، گوڈی پین لو، باداموں کا ایک کشتول ہاتھ میں لے کر اپنے گرد پتھوں کو جمع کرو اور کہو جو بچہ مجھے ایک گھونٹا مائے گا، اسے ایک بادام دوں گا۔ اسی طرح گلی گلی پھرو۔“ مرید نے کہا: ”سمان اللہ کیا علاج ہے؟“ بایزید نے کہا ”تیرا سمان اللہ کہنا بھی شرک ہے، کیونکہ تو یہ کہہ اپنی پاکیزگی بیان کرنے کے لئے کہہ رہا ہے۔“ مرید نے کہا مجھ سے یہ علاج نہیں ہو سکتا کوئی اور بات بتلاتے۔“ بایزید نے کہا ”اگر یہ علاج نہیں کر سکتا تو تیرا کوئی علاج نہیں۔“ (احیاء العلوم، ص ۳۵۸، ج ۴، مصنفہ ام غزالی)

یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد ام غزالی لکھتے ہیں کہ ”جس شخص کا دل بیمار ہے وہ اپنے نفس کے تابع ہے اس کا وہی علاج ہے، جو بایزید نے تجویز کیا۔“ (حوالہ ایضاً)

اب دیکھتے اس مرید بیمار سے نے تین خلاف شرع کام تو پہلے ہی کر لئے تھے۔ (۱) رات کبھی نہ سونا،

(۲) روزہ کبھی نہ چھوڑنا اور (۳) دینِ طریقت پر ایمان۔ اب بایزید صاحب نے ولایت کی تکمیل کے لیے بیچارہ خلافت سنت اور کام بتلا دیتے: (۱)، داڑھی منڈوانا (۲)، گودڑی پہننا (۳) دُر در کی گدائی اور (۴) بچوں سے گھونٹے کانا۔ پھر جب ایسے کاموں پر معدّت کرنے لگا، تو آپ نے اسے ولایت کے لئے نااہل اور لاعلاج مریض قرار دے دیا۔

پھر اہم غزالی صاحب نے بھی ان تمام خلاف سنت کاموں کے علی الرغم بایزید کے علاج کی ہی حمایت فرمائی اور اس دل کے بیمار، مرید پر ہی عتاب فرمایا:

۲۔ جنید بغدادی (م ۲۹۸ھ) کا طریق تربیت | ”ایک روز شبلیؒ نے حضرت جنیدؒ سے کہا: آپ کو اللہ تعالیٰ نے گوہر آشنائی (معرفت) عطا فرمایا ہے اسے یا تو بیچ دیجئے یا بخش دیجئے۔“ شیخ جنید نے فرمایا: ”نہ فروخت کروں گا نہ بخشوں گا۔“ فروخت کروں تو تیسرے پاس ادا کرنے کے لئے کچھ نہیں۔ مفت دوں تو یہ موتی تیرے ہاتھ مفت میں آ جائے گا۔ مردانِ باہمت کی طرح اپنے آپ کو دریائے معرفت میں ڈال اور گوہر مقصود حاصل کر۔“ شبلی نے پوچھا: ”پھر کیا کروں؟“ فرمایا: ”ایک سال تک کبریت فروشی کر (دیا سلائی بیچ) ایک سال گزرنے کے بعد شیخ شبلی، مُرشد کی خدمت کی حاضر ہوئے فرمایا: ”اب ایک سال تک بغداد کے کوچہ و بازار میں گدائی کر مگر اس طرح کہ کسی دوسرے کام میں مشغول نہ ہونا۔“ شیخ شبلی فرمودہ مُرشد کے مطابق بغداد کے بازاروں میں گدائی کرتے رہے۔ مگر کسی شخص نے آپ کو ایک جہہ بھی نہ دیا۔ سال گزرنے کے بعد خدمتِ شیخ میں حاضر ہوئے۔ فرمایا: ”کیوں شبلی! اپنی قدر و قیمت معلوم ہوئی؟ کوئی شخص تیری طرف متوجہ بھی نہ ہوا۔ اچھا اب نہادند جا، جہاں تو حکومت کرتا رہا ہے۔ وہاں ایک سال درویشگری کر۔“ چنانچہ آپ وہاں پہنچے۔ کسی نے آپ کو روٹی کا ایک ٹکڑا بھی نہ دیا۔ سال گزار کر خدمتِ مرشد میں آئے۔ شیخ جنید نے فرمایا: ”شبلی! ابھی ایک سال اور بغداد کے کوچہ و بازار میں گدائی کر۔“ چنانچہ حکمِ شیخ کے مطابق آپ بغداد کی گلیوں میں بھیک کا ٹھیکہ لائے بھک منگائیں کر بھیک مانگتے رہے۔ بٹام کو خانقاہِ شیخ میں بھی حاضر ہوتے اور بھیک کے ٹکڑوں کو خدمتِ مرشد میں پیش کرتے اور شیخ انہیں درویشوں میں تقسیم کر دیتے۔ ایک سال گزرنے کے بعد حضرت جنید نے پوچھا: ”کیوں شبلی! اب تیرے نفس کا حال تیرے نزدیک کیا ہے؟“ عرض کیا پیر و مُرشد! اپنے آپ کو خلقِ خدا کی کمترین مخلوق سمجھتا ہوں۔“ فرمایا: ”اب نیزا ایمان درست

دیکھا آپ نے سید الطائفہ تجانب جنید بندا دی نے اپنے بعد میں ہونے والے خلیفہ ابو بکر شبلی کی تربیت کے لئے کیسا شاندار پروگرام تجویز کیا۔ پہلے سال تو خیر انہوں نے ماچیس پیچیں۔ دوسرے اور تیسرے سال شبلی کو گداگری کے ذریعہ نہ کہیں سے حجتہ ملا نہ ٹکڑا۔ یہ بھی دراصل سید الطائفہ کی کرامت ہی تھی کہ انہیں دو سال کچھ نہ ملا۔ ورنہ بھگ گئے گداگر آج بھی موجود ہیں۔ ایسا ہونا ناممکن ہے کہ کسی کو دو سال تک کچھ نہ ملا ہو۔ اور چوتھے سال جو گداگری کے ٹکڑے آتے رہے وہ گویا سب کے سب حلال و پاکیزہ رزق کے تھے، جو آپ درویشوں میں بانٹتے رہے۔ خیر کچھ بھی ہو چار سال بعد آپ نے شبلی کے ایمان کو درست کر دیا، جس کے بغیر معرفت کا موتی ہاتھ نہ آسکتا تھا۔

اور اس طرح جو معرفت ابو بکر شبلی کو ملی اس کے متعلق حسب غزنیۃ الاصفیاء فرماتے ہیں: ”روایت ہے شیخ شبلی کچھ عرصہ اپنے مقام سے غائب رہے۔ ہر چند تلاش کیا نہ پایا۔ ایک روز مختشوں کے گروہ میں دیکھے گئے (شاید نازک بھی انہیں کے ساتھ پڑھتے رہے ہوں گے) لوگوں نے پوچھا، ”کیا بات ہے؟“ فرمایا: ”یہ گروہ دنیا میں نہ مرد ہے نہ عورت۔ میں بھی اسی حالت میں گرفتار ہوں۔ نہ مرد ہوں نہ عورت۔ پس ناچار میری جگہ انہی میں ہے۔“ (غزنیۃ الاصفیاء، ص ۱۳۰)

اب دیکھتے رسول اللہ بھی تزکیہ نفس فرمایا کرتے تھے لیکن طریق کار جداگانہ ہونے کی وجہ سے دو ہیں:

- ۱۔ شرعی اصطلاح میں تزکیہ نفس سے مراد دلوں کو شرک اور کفر کی آلائشوں نیز اخلاق رزیدہ سے پاک کرنا ہے۔ جبکہ طریقت میں تزکیہ نفس سے مراد معرفت کا موتی تلاش کرنا ہے جن سے کشف و کرامات کا صدور ہو۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ اس مقصد کے حصول کے لئے شرعی تعلیمات پر زور دیتے اور نگرانی فرماتے تھے۔ جو کہ شریعت کی نظر میں انسان تمام مخلوقات سے برتر ہے۔ لہذا رسول اللہ ﷺ کا طریق تربیت ایسا تھا جس سے کسی کی عزت یا وقار مجروح نہیں ہوتا تھا۔ لیکن یہ گروہ صوفیہ نفس کشی کے درپے ہوتے ہیں اور انسان کو تمام مخلوق سے کمتر درجہ پر لانا چاہتے ہیں۔ اور اسے انتہائی ذلیل بنا دینا ان کا طریق کار ہے۔

گداگر کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے تو فرمایا تھا کہ قیامت کے دن اٹھے گا تو اس کے چہرے پر گوشت نہ ہوگا۔ لیکن صوفیوں کے ہاں یہی گداگری کا طریقہ حصولِ ولایت کے لیے ضروری ہے۔ یہ بچہ لوگوں کی اتباع سنت کا نمونہ۔ اور پھر اس تربیت کا منطقی نتیجہ بھی یہی کچھ نکلنا چاہئے تھا کہ شبلی مختش بن گئے۔ نہ مرد ہے نہ عورت۔

شیخ نظام العمری (م ۱۰۳۲ھ) ولی تراش کا طریق تربیت
نظام الدین اپنے ایک مُرید ابوسعید نعمانی کو طریقت

سکھلا رہے ہیں :
”جب کئی دن گزر گئے تو شاہ ابوسعید نے عرض کیا کہ حضرت میں گنگوہ سے بلخ تک پیدل چل کر دعوتوں کے لئے نہیں آیا۔ فرمایا : ”صاحبزادے پھر جو خاص مطلب ہو بیان فرمائیے۔“ کہا : ”میں وہ دولت لینے آیا ہوں جو آپ سے گھر سے لاتے ہیں۔“ نظام الدین، ابوسعید کے ابا و اجداد کے مُرید تھے۔ یہاں بھی دولت سے مراد وہی معرفت کا موتی ہے۔ بس یہ سنتے ہی شیخ کا رنگ بدل گیا اور فرمایا : ”صاحبزادے! اگر دولت لینا چاہتے ہو تو پھر یہ شان و شوکت رخصت کر دو اور آج سے حمام کی خدمت تہہ سے سپرد ہے جا کر حمام جھونکو اور نقیب سے فرمایا کہ ان کو لنگ کی روٹی صبح و شام دے دیا کرو اور فرمایا جب تک ہم اجازت نہ دیں اس وقت تک ہمارے سامنے نہ آؤ۔“ نہ ذکر بتلایا نہ شغل۔ بس نماز روزہ کرتے اور حمام جھونکتے رہے۔ اسی حالت میں ایک عرصہ گزر گیا۔ اس کے بعد حضرت شیخ نے بھنگن سے فرمایا کہ ”آج کوڈا کرکٹ ابوسعید کے سر پر ڈال دینا۔“ بھنگن نے ایسا ہی کیا، تو شاہ ابوسعید نے غصہ سے فرمایا کہ ”نہ ہوا گنگوہ و نہ آج تجھے حقیقت معلوم ہو جاتی۔“ بھنگن نے عرض کر دیا کہ آج ابوسعید نے یہ کہا تھا۔ فرمایا : ”ارے ابھی تو خناس دماغ میں گھسا ہوا ہے۔ گنگوہ کی بُرائی ریاست نہیں نکلی، ابھی اور حمام جھونکیں۔“ چنانچہ اور عرصہ گزر گیا، پھر دوبارہ بھنگن کو حکم دیا۔ چنانچہ اس نے پھر ایسا ہی کیا۔ اس وقت شاہ ابوسعید نے زبان سے کچھ نہیں کہا مگر تیز نظروں سے گھوکر دیکھا۔ شیخ نے یہ حال سن کر فرمایا کہ ”ابھی تو کسر باقی ہے۔“ چنانچہ ایک عرصہ تک اور یہی خدمت جاری رہی۔ اس کے بعد پھر وہی حکم ہوا۔ بھنگن نے پھر ایسا ہی کیا کہ سارا کوڈا کرکٹ ابوسعید کے سر پر ڈال دیا۔ اس وقت شاہ ابوسعید کا حال بالکل بدل گیا تھا۔ کوڈا جو گر گیا تھا وہ اپنے اوپر ڈالنے لگے۔ بھنگن نے جا کر شیخ سے یہ حال عرض کیا، تو فرمایا : ”اکھد شدہ اول قدم تو طے ہوا۔ واقعی

یہ بکتر ہی راستہ میں حائل ہوتا ہے۔ یہ نکل جیسا، تو پھر بہت جلد طریق طے ہو جاتا ہے۔ اس یا منت کے بعد شاہ ابوسعید کو اتنی اجازت ملی کہ شیخ کی مجلس میں آجایا کریں۔ کچھ عرصہ بعد ذکر تعلیم کیا گیا۔ ذکر شروع کرنے کے بعد کچھ حالات و کیفیات طاری ہوئیں تو شیخ کو معلوم ہوا کہ ابوسعید میں عجب پیدا ہو گیا ہے تو سب نے فرد شغل چھڑا دیئے اور کتوں کی خدمت سپرد ہوئی۔ دو شکاری کتے تھے۔ ایک من شاہ ابوسعید ان کو جنگل لے گئے۔ راستہ میں کوئی شمار نظر آیا جس کو دیکھ کر کتے اس کے پیچھے دوڑے شیخ سبید کچھ راستہ تو ان کے ساتھ چلے مگر تھک گئے۔ پھر اس خیال سے کہ کتے بے قابو نہ ہو جائیں اور شیخ ناراض نہ ہوں۔ زنجیر کو اپنی کمر سے باندھ لیا۔ اب حال یہ ہے کہ کتے بھاگے جا رہے ہیں اور یہ ساتھ ساتھ گھٹتے جا رہے ہیں کہیں ڈھیلوں پر سرنگتا ہے کہیں کانٹوں سے بدن زخمی ہوتا ہے۔ اسی حالت میں ان پر غیبی فضل ہوا کہ ایک تجلی خاص ان کے اوپر ہوئی جس کی لذت نے تمام تکلیف کو بھلا دیا۔ ادھر حضرت شیخ کو یہ حالت منکشف ہوئی اور انہوں نے خدام سے فرمایا کہ ”اس وقت ابوسعید پر فضل ہو گیا اور ایک تجلی خاص سے حق کٹا نے ان کو مشرف فرمایا۔ جاؤ جنگل سے انہیں اٹھا لاؤ۔“ خدام تو ادھر دوڑے اور ادھر سلطان نظام الدین پر شیخ المشائخ عبدالقدوس کی روحانیت منکشف ہوئی اور فرمایا: ”نظام الدین تم کو اس سے زیادہ مشقت لینے کا بھی حق تھا، مگر ہم نے تو تم سے اتنی مشقت نہیں لی تھی۔ یہ ایک محبت آمیز عتاب تھا جس سے سلطان نظام الدین کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ ابوسعید آئے تو اسے سینے سے لگایا اور خاطر و مدارات ہونے لگی۔“ شاہ ابوسعید کو اس روز کی تجلی کا بہت اشتیاق تھا۔ روزانہ ذکر کر کے اس کے مشتاق رہتے جب کئی روز تک نہ ہوئی تو ایک دن جس دم کر کے بیٹھ گئے اور پختہ ارادہ کر لیا کہ جب تک وہ تجلی نہ ہوگی سانس نہ چھوڑوں گا۔ چاہے مر جاؤں کیونکہ ایسی زندگی سے مرنا ہی اچھا ہے۔ بالآخر وہ تجلی ہوئی اور اس کی مسرت میں سانس اس زور سے چھوٹا کہ پسلی پر ضرب پہنچی اور ٹوٹ گئی۔ اس وقت غیب سے ایک ہاتھ نمودار ہوا جس میں چمچہ کے اند کوئی دوا تھی وہ ان کے منہ میں لگا دی گئی اور اس کے کھاتے ہی فوراً پسلی جڑ گئی اور اسی کے ساتھ یہ ارشاد بھی ہوا کہ ”چوزہ کا شو با چند روز تک سہینا۔“ شیخ نے فوراً چوزہ کا انتظام کر دیا اور کئی روز تک چوزے کھلاتے گئے۔ بالآخر شیخ نے تکمیل کے بعد اپنا نائب بنا کر گنگوہ واپس کیا۔ ”تاریخ مشائخ چشت

۱۔ طریقت کی تربیت کی جو منازل جنید بغدادی نے گداگری کے ذریعہ طے کرائیں۔ نظام الدین صاحب نے وہی منازل بھنگن کے کوڑا پھینکنے کے ذریعہ طے کرائیں اور یہ بھنگن اس کا طریقت کا ایک اہم رکن تھی۔
 ۲۔ سنا تھا کہ بعض پیرا دے شکاری کتوں کا شوق فرماتے ہیں، اب معلوم ہوا کہ ان سے راہ طریقت کی تربیت میں بھی مدد لی جاسکتی ہے۔

۳۔ جس چیز کو شیخ نظام الدین بکتر سے تعبیر فرما رہے ہیں، وہ بکتر نہیں بلکہ ذلت و تحقیر اور اہانت و فحاشی ہے جو ایک مومن کو کسی قیمت پر گوارا نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ نے بکتر کی تعریف یوں بیان فرمائی کہ: ”بکتر یہ ہے کہ تو حق بات کی پرواہ نہ کرے اور دوسرے لوگوں کو حقیر سمجھے۔“ اب بتلایئے کہ یہ تعریف بھنگن کے کسی مسلمان پر غلاظت کا ڈھیر پھینکنے پر صادق آسکتی ہے۔ عزت نفس کو بکتر کہنا تو وہی درست قرار دے سکتا ہے جو نفس نشی کے درپے ہوا اور معرفت کے موتی تلاش کر رہا ہو۔ جس کا شریعت نے قطعاً کوئی حکم نہیں دیا۔ نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے ایسا موتی اس طرح طرح کے بیہودہ طریقوں سے تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

۴۔ ابوسعید پر جو تختی ہوئی وہ چونکہ شریعت کے تابع نہ تھی لہذا وہ یقیناً استہاج تھا۔ جیسا کہ جنید بغدادی کا ایک مرید ہر رات کو بہشت کی سیر کیا کرتا تھا اور یہ شیطانی عمل تھا۔

۵۔ ان مُرشد و مرید دونوں کے شیخ المشائخ عبد القدوس گنگوہی (م ۱۹۴۴ء) وہی صاحب ہیں جنہوں نے پانی بننے میں ہندو جوگی سے مقابلہ رچایا تھا اور فرق یہ رہ گیا تھا کہ جوگی کے پانی سے بُوائی تھی اور آپ کے پانی سے خوشبو۔

۶۔ ندائے غیب کی باتیں تو خیر صوفیاء کے تذکروں میں اکثر ملتی ہی رہتی ہیں البتہ ہاتھ کے برآمد ہونے اور اس ہاتھ میں چمچ اور اس چمچ میں پسلی ٹوٹنے کے علاج والا لطیفہ بھی خوب ہے اور اچھے مقام پر فٹ کیا گیا ہے۔

۴۔ ابوسعید چشتی صائے گنگوہی (م ۱۰۴۰ھ) کا طریق تربیت | اب وہی ابوسعید جنہوں نے اپنے مُرشد نظام الدین عمری

سے اس طرح تربیت پا کر فیض حاصل کیا تھا، ان کا طریقہ واردات بھی ملاحظہ فرمائیے:
 ”سواطع الانوار میں لکھا ہے کہ ایک شخص منکر حال آپ کے پاس آیا اور عرض کی۔ میں طالب خدا ہوں

مگر طاقتِ مجاہدہ و ریاضت کی مجھ میں نہیں۔ چاہتا ہوں کہ آپ کی نظر فیض اثر سے مقصود دل چل کر اڑیں۔“
 حضرت کے ہاتھ میں اس وقت عصا تھا فرمایا کہ ”ہاں ہم اس عصا کی تین ضربیں طالب کو خدا تک پہنچا دیتے ہیں۔“ یہ کہہ کر ایک ضرب عصا کی اس کے سر پر لگائی۔ عالم ملکوت اس پر کھل گیا اور دوسری ضرب میں عالمِ جبروت، تیسری ضرب میں عالمِ شہود اس پر منکشف ہو گیا۔ تین دن تک بے ہوش رہا۔ جب ہوش میں آیا صدقِ دل سے مرید ہو گیا۔“ (مدنیۃ الاولیاء، ص ۹۳)

یہ طریق کار تکلیف دہ ضرر ہے مگر اس لحاظ سے اچھا ہے کہ کم از کم ابوسعید صاحب نے خلافِ شرع کوئی تلقین نہیں فرمائی اور وہ مرید بڑا ہی سخت جان تھا کہ سر میں عصا کی تین ضربیں کھانے پر اس پر صرف عالم ملکوت، جبروت اور شہود ہی روشن ہوئے۔ اُس پر نوحہ طبعِ روشن ہو جانے چاہئیں تھے۔ البتہ اس بات کی سمجھ نہیں آئی کہ جب اس پر تینوں عالم منکشف ہو گئے اور وہ خدا تک بھی پہنچ چکا، تو پھر بعد میں مرید ہونے کا کیا فائدہ تھا۔

۴۔ حضرت خضر علیہ السلام کی تعلیم سے بننے والے ولی

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام ان اولیاء اللہ کو کیا تعلیم دیا کرتے تھے؛ جو انہیں ولایت کے درجہ تک پہنچا دیتی تھی۔

عبدالحق عجمی (م ۵۵۰ھ) کو خضر کی تعلیم ایک دن حضرت خضر علیہ السلام سے آپ کی ملاقات ہوئی اور حضرت

خضر نے فرمایا کہ ”میں تم کو اپنی فرزندگی میں لیتا ہوں اور تم کو ایک سبق پڑھاتا ہوں۔ اگر تم اس کی پابندی نہ معلوم ہوتا ہے کہ گروہ صوفیاء میں سب سے پہلے بزرگ جنہیں حضرت خضر علیہ السلام سے شرفِ ملاقات نصیب ہوا وہ ابراہیم بن ادم (م ۱۲۴) ہیں۔ صوفیاء کے مخصوص اور ادھارت کا آغاز بھی غالباً اسی بزرگ سے ہوا ہے۔ صاحب سیر الاولیاء ص ۴۲ پر لکھتے ہیں کہ:

”منقول ہے کہ خواجہ ابراہیم ادم نے ایک نہایت شخص کو صحرائیں دیکھا۔ اس نے آپ کو اسمِ عظم کی تلقین کی جس کے پڑھنے کی برکت سے آپ نے حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کی۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ ”اے ابراہیم! میرے برادر ایسا نے تہیں اسمِ عظم تعلیم کیا ہے یہ تمام برکتیں اسی کی ہیں۔“ یہ بھی واضح رہے کہ جس طرح صوفیاء کے ہاں حضرت خضر علیہ السلام کو ایک نہادِ جاوید متبی تسلیم کر لیا گیا ہے (بانی اہل صوفیاء)۔

اور مواظبت کرو گے تو تم پر اسرارِ باطنی کُل جائیں گے۔ پھر حضرت خضر ؑ نے آپ کو وقوفِ عدی کی تعلیم دی اور فرمایا: ”حوض میں غوطہ لگاؤ اور دل سے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہو۔“ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور اس کا ورد کرتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ پر اسرار و رموز منکشف ہونے لگے۔“ (صوفیائے نقشبند، ص ۱۳۲)

پھر اسی بیان کی تصدیق یعقوب چرخي (م ۸۵۱ھ) کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ”اس کے بعد آپ (یعنی یعقوب چرخي کے پیر خواجہ بہاؤ الدین نقشبند م ۹۱۱ھ) نے اپنے شاخ کا سلسلہ بیان کیا اور خواجہ عبدالخالق غجدانی تک بیان کیا اور پھر مجھ کو وقوفِ عدی کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ علم لدنی کا پہلا سبق ہے اور یہ حضرت خضر ؑ نے خواجہ غجدانی کو بتایا تھا۔“ (صوفیائے نقشبند ص ۱۴۹)

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خضر ؑ کا علم لدنی کا یہ پہلا سبق جو وقوفِ عدی سے تعلق رکھتا ہے اسرارِ ربو کے انکشاف میں اتنا اہم ہے کہ اس سلسلہ میں سبقت متورث چلا آ رہا ہے۔ یہ وقوفِ عدی ہے کیا بلا ہ اس کی تصریح تذکرہ نگار نے نہیں فرمائی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عمل کا کچھ نہ کچھ تعلق پانی کے حوض سے بھی ہے کیونکہ حضرت خضر کا پانی سے گہرا تعلق بتلایا جاتا ہے۔

حضرت خضر ؑ سے وایت پھر خواجہ اولیاء اللہ حضرت خضر ؑ یا ان کے واسطے سے ”ولایت“ کی تعلیم پاتے ہیں۔ ان سے روایت بھی بیان کرتے ہیں۔ مثلاً:

”حضرت خضر ؑ سے منقول ہے کہ جو کوئی اذان کے وقت اپنے ہاتھوں کے دونوں انگوٹھوں کے ناخنوں کو اکٹھوں پر پھپھیکے دروچم سے امن پائے جب مؤذن کہے اَشْهَدُ اَنْ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰہِ“ (ریاض السالکین، ص ۳۲۰) (نیز دیکھئے کتاب ہذا ص ۲۳۳)

اگر آپ خود خضر بننا چاہتے ہیں تو اس کا نسخہ بھی حاضر خدمت ہے۔

خضر بننے کا طریقہ ”اگر مجموعہ اسمائے عظام کو اوقات مذکورہ پر پچیس پچیس مرتبہ اور جمعہ کو پچتر مرتبہ اسی وقت پڑھے اپنے وقت کا خضر ہوگا۔“ (ریاض السالکین، ص ۳۳۰)

ایشیائے گزشتہ صفحہ، اسی طرح حضرت الیاس کو بھی وہ زندہ جاوید تسلیم کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس طبقہ میں راہنمائی اور تعلیم کے لئے حضرت خضر ؑ حضرت الیاس ؑ سے بہت زیادہ مشہور و معروف ہیں۔ اس روایت میں حضرت خضر ؑ کی زبانی حضرت الیاس ؑ کی شخصیت اور تعلیمات سے بھی متعارف کروایا گیا ہے۔

ان اقتباسات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کی تعلیم نقوش و عملیات سے رکھتی ہے اور حضرت خضر علیہ السلام کسی مخصوص ہستی کا نام نہیں۔ بلکہ جو کوئی ان نقوش و عملیات کا ماہر ہو، وہی اپنے وقت کا خضر ہوتا ہے۔ اگر آپ اس طرح سے خضر بن جائیں تو سنتے بننے والے ولیوں کی غائبانہ طو پر رہنمائی فرما سکتے ہیں اور غائبانہ ولایت کا کوئی بلند درجہ ہے۔

۵۔ صرف صحبت بزرگان سے بننے والے ولی

صاحب "صوفیائے نقشبند" فرماتے ہیں کہ :

"آپ (خواجہ علی رام تینی م ۱۵، ۱۶) اپنے مذہب خفیہ کے پابند اور اپنے زمانہ کے قطب تھے جو شخص ایک روز آپ کی صحبت میں بیٹھ جاتا۔ حقیقت اور معرفت الہی تک پہنچ جاتا۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۱۳۸) ہمارے خیال میں ولایت کے حصول کا یہ طریقہ سب آسان ہے۔ وقت بھی بہت کم لگتا ہے۔ ہر طرح کے جمیلوں سے بھی چھٹی مل جاتی ہے اور کچھ تکلیف بھی نہیں ہوتی۔

خواجہ ابوالیوسف بن سمان (م ۴۵۹ھ) "بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ جو شخص حضرت شیخ کی خدمت میں تین دن رہتا تھا۔ صاحب کرامت ہو جاتا تھا۔ گویا اس سلسلہ میں سلسلہ چشت سے نقشبند بازی لے گئے۔" (تاریخ شائع چشت، مولانا زکریا، ص ۱۵)

۶۔ مجذوبین

صوفیاء ایسے اولیاءوں کے لئے جذب و مسکرا اور استغراق کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ظاہری حالت میں یہ لوگ بالکل دیوانوں طرح ہوتے ہیں۔ کچھڑ میں لیٹنا، گرمیوں میں دھوپ میں بیٹھ کر رہنا، برہنہ پھرنا، حواس باختہ ہونا یہ سب کچھ انہی لوگوں کی علامات ہیں۔ مجذوب کا مطلب یہ ہے کہ یا اللہ کی طرف سے اسے جذب ہو رہا ہے یا وہ خود اللہ کی ذات میں جذب ہو رہا ہے اور استغراق کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ سے ٹوٹ گئے ہیں۔ باقی دنیا جہان کی اسے کوئی خبر نہیں۔ صوفیاء کے نقطہ نظر سے ایسے حضرات بھی

مقبول ولی اور مستجاب الدعوات ہوتے ہیں۔ رہا تکالیف شرعیہ کا معاملہ، تو ان سے اس کا تصور بھی محال ہوتا ہے بلکہ بعض عیار صوفی تکالیف شرعیہ سے نجات حاصل کرنے کے لئے بھی شکر و استغراق کی مصنوعی کیفیت پیدا کر لیتے ہیں۔

ایسا ولی بننے کے بھی دو طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ کسی ”مرشدِ کامل“ کی نظرِ کیمیا اثر کے طفیل کوئی شخص مجذوب بن جائے جیسے :

عبدالرحمان قادری نوشاہی (م ۱۱۵۲ھ) المعروف رحمان پاک | ان کا وطن موضع بھڑی ضلع گوجرانوالہ ہے

ابھی صرف پانچ برس کے تھے کہ ادھر نوشہ گنج بخش کا گڑھ ہوا۔ نوشاہ صاحب کی ان پر ایسی نظرِ کیمیا اثر پڑی کہ بے خودی اور جذب و مستی اسی عمر میں پیدا ہو گئی اور اپنے گاؤں میں رحمان دیوانہ مشہور ہو گئے۔ والدین نے ایسا بچہ نوشاہ صاحب کو ہی دے دیا۔ جنہوں نے ان کی ظاہری و باطنی تربیت بحدِ کمال کی۔ رحمان صاحب کا مجاہدہ اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ تمام رات جب س دم، ذکرِ خفی کرتے اور بعض اوقات معکوس لشک کر رات بھر ذکر میں مشغول رہتے۔ خلوت اختیار کرتے تو قبر کھدوا کر اس میں بیٹھ جاتے اور چالیس چالیس روز اسی حالت میں گزار دیتے۔ ساتھ ہی ساتھ ذوقِ سماع و وجد بھی بے انداز تھا۔ حالتِ سماعِ موجد میں مدہوشا کا یہ عالم تھا کہ کبھی آپ اپنے آپ کو بکیوں کے پیچھے باندھ کر زمین پر گھسٹتے جاتے۔ گرمیوں کے موسم میں سونچ میں بیٹھتے۔ سردیوں میں برہنہ تن رات کو جنگل میں جا بیٹھتے اور کبھی دریا میں کھڑے ہو کر ذکرِ حق میں مشغول ہوتے آپ کی گرمی ذکر سے دریا کا پانی گرم ہو جاتا۔ جس شخص پر نظر ڈالتے وہ صاحبِ کشف و کرامت ہو جاتا۔ ذریعہ

(الصغیر، ص ۳۰۵)

یہ ہیں ہاں سے اولیاء اللہ جو خواہ کس قدر مدہوش ہوں۔ وجد و سماع پر پھر بھی ہوش میں آجائے اور مرٹتے ہیں اور یہ دریا کے پانی کا ذکر سے گرم ہونے کا لطیفہ بھی خوب ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی جد بے اثر ہو جاتی ہے۔ اسی لئے وہ پانی صرف آپ ہی کے لئے گرم ہوتا تھا۔ دوسروں کے لئے آپ کی گرمی ذکر کے باوجود وہ ٹھنڈے کا ٹھنڈا ہی ہوتا تھا۔ اب اگر ایسے لوگ بھی ایک ہی نظر سے دوسروں کو صاحبِ کشف بنانے لگیں۔ تو یہ دنیا اب تک کشف و کرامات سے بھرپور ہو جاتی۔ پھر یہ بھی یاد رہے کہ یہ نوشاہی حضرات جس کردار کے مالک ہوتے ہیں۔ اس کا ذکر ہم پہلے کی چمکے ہیں۔

دوسرا طریق یہ ہے کہ کسی ولی اللہ کا پس خود کھالیا جائے، تو اس قسم کی ولایت حاصل ہو جاتی ہے۔
 بیسیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب اپنی تاریخ مشائخِ چشت کے صفحہ ۱۶۲ پر خواجہ شریف زبیدی (م ۶۱۲ھ)
 کے متعلق فرماتے ہیں کہ، ”اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ حضرت کا پس خود جو شخص کھالیتا تھا، مجذوب ہو
 جاتا تھا۔“

بتلائے سلام کو ایسے اولیاء اللہ کی کچھ ضرورت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی نظر کیا اثر نے کسی
 کو بھی مجذوب نہ بنایا۔ نہ ہی آپ کے پس خود کھانے سے کوئی مجذوب بنا۔ پھر ان مجذوبوں کا کوئی بھی
 پہلو شریعتِ اسلامیہ کے مطابق ہوتا ہے؟

ایسے چند اولیاء اللہ کا ذکر ہم عشقِ مستی
 کے بیان میں پہلے ذکر کر چکے ہیں ایسے
عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی تک پہنچنے والے ولی
 اولیاء اللہ اپنا کام عشقِ مجازی سے شروع کرتے ہیں۔ پھر از خود عشقِ حقیقی کی منزل پر پہنچ کر ولی بن جاتے ہیں۔
 پھر ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو ولی تو پہلے سے ہوتے ہیں مگر عشقِ حقیقی کی منزل ادھوری سمجھ کر عاشقہ کے لئے
 کسی لوٹنے کو پسند فرماتے ہیں۔ اس طرح یہ مسد کہ ”پہلی منزل مجازی عشق ہے یا حقیقی؟“ لایکل ہی رہ
 جاتا ہے۔

۸۔ پاخانہ کھانے سے بننے والے ولی باقی۔ راجہ نے اس سے پوچھا کہ ”مہاراج (یعنی میر صاحب)
 آپ کو یہ کمال کیونکر حاصل ہوا؟“ اس نے جواب دیا کہ: ”میں بارہ برس سے اپنا پاخانہ، پیشاب کھاتا پیتا ہوں
 اس کی بدولت میری زبان میں یہ تاثیر ہے کہ ایک فقیر کو بادشاہ یا راجہ کہوں، تو فوراً ہو جائے۔“ راجہ نے
 کہا: ”پھر آپ کو کیا؟“ بادشاہ بنا تو دوسرا راجہ ہوا تو اور، تمہاری قسمت میں تو وہی پاخانہ پیشاب: (تذکرہ
 غوثیہ، ص ۳۴۹، بحوالہ رضا خانی مذہب ۱۳۲)

اب آپ ہی بتلائے کہ پاخانہ پیشاب کو شریعت نے حرام قرار نہیں دیا؟ اور کیا حرامِ خور ولی بن
 سکتا ہے۔ لیکن ولایت کی دنیا بڑی وسیع ہے۔ اس میں حرامِ خوری بھی بندی درجاست کا سبب
 بن سکتی ہے۔

۹۔ اولیاء اللہ کی انوکھی قسم — خدا کی بیوی | جناب احمد رضا خان بریلوی فرماتے ہیں:

میں اُن کی زیارت سے مشرف ہوا ہوں۔ زنانہ وضع رکھتے تھے۔ ایک بار شدید قحط پڑا۔ قاضی اکابر جمع ہو کر حضرت کے پاس دُعا کے لیے گئے۔ آپ انکار فرماتے رہے کہ میں کیا دُعا کے قابل ہوں۔ جب لوگوں کی التجار و زاری حد سے گزری تو ایک پتھر اٹھایا اور دو سکر ہاتھ کی چوڑیوں کی طرف لائے اور آسمان کی طرف منہ اٹھا کر فرمایا: **میں نے بھیجے یا اپنا سہاگ واپس لیجئے۔** ”سہاگ بیوی کا یہ کہنا تھا کہ گھٹائیں پہاڑ کی طرح اُٹھیں اور جل تھل ہو گیا۔“ (مفوضات احمد رضا خان، ص ۹۴، ج ۲ بحوالہ رضا خان مذہب، ص ۲۰)

پھر اس میاں بیوی کے تعلق کی مزید تشریح جناب احمد رضا خان یوں فرماتے ہیں کہ:

”حضرت موسیٰ سہاگ ایک دن نماز جمعہ کے وقت بازار میں جا رہے تھے۔ ادھر سے قاضی شہر جامع مسجد کو جاتے تھے۔ انہیں دیکھ کر کہا کہ یہ وضع مردوں کو حرام ہے۔ مروانہ لباس پہنیے اور نماز کو چلیے اس پر انکار و مقابلہ نہ کیا۔ چوڑیاں، زیور اور زنانہ لباس اتار اور مسجد کو ساتھ ہو لئے۔ خطبہ سنا۔ جب جماعت قائم ہوئی اور امام نے بخیر تحریم یہی اللہ اکبر سنتے ہی اُن کی حالت بدلی۔ فرمایا: **اللہ اکبر!** میرا خاوند حنی لاہوت ہے کہ کبھی نہ مرے گا اور یہ مجھے بیوہ کئے میتے ہیں۔ اتنا کہنا تھا کہ سر سے پاؤں تک وہی سُرخ لباس تھا اور وہی چوڑیاں۔“ (حوالہ ایضاً)

اس اقتباس کے آخری جملہ کو جناب احمد رضا خان نے مکمل ہی چھوڑ دیا کہ آیا ”وہی سُرخ لباس اور وہی چوڑیاں“ وہ تھیں جو موسیٰ سہاگ نے پہلے اتار کر اپنے پاس رکھ لی تھیں، وہی بہن لیں یا وہ الگ ہی رکھی رہیں۔ اور پردہ غیب سے ایسا ہی سُرخ لباس اور چوڑیاں نمودار ہو کر موسیٰ سہاگ کے زیرِ تن ہو گئی تھیں۔

یہ اللہ کی بیوی سُرخ لباس پہنتی اور زیور اور چوڑیاں پہنتی تھی اور نماز کے نزدیک تک نہ جاتی تھی۔ کیونکہ نماز ادا کرنے سے اس کا سہاگ چھین جاتا اور وہ بیوہ ہو جاتی تھی اور زبان سے علی الاعلان کہتی تھی کہ اللہ حنی لاہوت میرا خاوند ہے جبکہ خاوند میاں یا اللہ تعالیٰ کو موسیٰ سہاگ کو بیوی بنانے سے شدید انکار ہے۔ وہ تو فرماتا ہے: **وَلَمْ تَكُنْ لَهُ صَاحِبَةً** (۲۰) اس کی کوئی بیوی نہیں۔ اور ایسا خیال کرنا بھی صریح کُفر اور شرک ہے۔ شاید اس دنیائے طریقت میں یہ سب کچھ جائز ہے۔ سبحانہ و تعالیٰ عما

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ان مختلف طریقوں سے بننے والے اولیاء اللہ کی تکمیل ولایت کا معیار کیا ہے؟ تو اس سلسلہ میں اکابر صوفیاء میں بہت اختلاف واقع ہوا اور وہ کسی ایک معیار پر متفق نہیں ہو سکے لہذا بنفیل میں مختلف اکابرین کا معیار پیش کرتے ہیں:

۴۔ تکمیل ولایت کا معیار

۱۔ امام باقر (م ۱۱۴ھ) کا معیار

”ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا: ”مجھے بتلایئے مومن کا اللہ تعالیٰ پر کیا حق ہے؟“ فرمایا: ”مومن کا حق یہ ہے کہ اگر وہ اس کھجور کے درخت کو کہے کہ ادھر آؤ، تو وہ درخت توقف نہ کرے۔“ یہ بات سنتے ہی کھجور کا وہ درخت چل کر آپ کے پاس آگیا، تو آپ نے کہا: ”درخت! میں نے تو یہ بات برسبیل تذکرہ کہی تھی۔ تم اپنی جگہ پر چلے جاؤ۔“ (غزنیۃ الاصفیاء، ص ۸۲)

یہ روایت بھی بلا سند لہذا غلط ہے اور اس کے غلط ہونے کی اصل وجہ یہ ہے کہ ”رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے پوچھا، معاذ! کیا تو جانتا ہے کہ اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے اور بندوں کا اللہ تعالیٰ پر کیا حق ہے؟“ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: ”اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔“ آپ نے فرمایا: ”بندوں پر اللہ کا حق یہ ہے کہ وہ اُسی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور بندوں کا اللہ تعالیٰ پر حق یہ ہے کہ وہ ان کو عذاب نہ کرے الا یہ کہ کسی نے اس کے ساتھ شرک کیا ہو۔“ (مشفق علیہ، بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب الایمان، الفصل الاول)

بات دراصل یہ ہے کہ ایسی روایات جن سے کرامات کا ثبوت ہوتا ہو۔ بعد میں آنے والے صوفیوں نے گھر گھر پہلے بزرگوں سے منسوب کر دیں جیسا کہ ابو نعیم اصفہانی (م ۴۸۱ھ) نے حلیۃ الاولیاء کی تصنیف کے دوران کیا۔ البتہ اتنی احتیاط ضرور کی گئی ہے کہ تکمیل ولایت کے بجائے ”اللہ پر حق“ کے الفاظ سے سوال کیا ہے۔ ورنہ بات ایک ہی ہے۔

اور وہ درخت بھی کچھ زیادہ ہی فرمانبردار تھا جو برسبیل تذکرہ بات کرنے پر بھی دوڑا آیا اور امید ہے کہ وہ واپسی کے آرڈر پر واپس تو ضرور چلا ہی گیا ہوگا۔

۲۔ ابراہیم بن ادھم (م ۱۶۲ھ) کا معیار | آپ ایک مرتبہ جبل القویس پر تشریف فرما تھے۔ تذکرۃ فرمایا کہ بعض ائمہ کے بسکے لیے ہوتے ہیں کہ پہاڑ کو اگر

کہیں چلے تو وہ چلنے لگتا ہے۔ یہ فرماتے ہی پہاڑ کو جنبش ہونے لگی۔ آپ نے فرمایا: ”ٹھہر جائیں تو قصہ بیان کر رہا تھا۔“ وہ ٹھہر گیا۔“ (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۳۹)

یہ معیار بھی بہت حد تک امام باقر کے معیار سے ملتا جلتا ہے اور روایت بھی۔

شیخ علی خواص کا معیار | ”عبد الوہاب شعرانی (م ۹۰۳ھ) فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنے شیخ علی خواص کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ ”ہمارے نزدیک مرد کامل اس وقت

تک نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے مرید کی حرکاتِ شبیہ کو روزِ ميثاق سے لے کر اس کے جنت یا دوزخ میں داخل ہونے تک نہ جان لے۔“ (کبریٰ تہامر بعاشیہ البواقیۃ دیکھا ہوا، بحوالہ سیرۃ غوث، ص ۱۶۵)

شیخ شبلی (م ۳۳۲ھ) کا معیار | ”شیخ شبلی فرماتے ہیں کہ ”اگر ایک سیاح چوٹی، اندھیری رات میں سخت پتھر پر چل رہی ہو اور میں اُس کی آواز نہیں سنتا، تو میں خیال کرتا ہوں کہ میں فریب میں آگیا۔“

”اور ایک اور بزرگ نے فرمایا ہے کہ ”نہ میں یہ بات کہتا ہوں جو شبلی نے کہی اور نہ اس کو سمجھتا ہوں اس لئے کہ وہ (چوٹی) حرکت کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہے مگر میری قدرت کے ساتھ۔ اور میں اس کا محرک ہوں۔ پھر میں کس طرح کہوں کہ میں اس کو نہیں جانتا۔“ (انسانِ کامل، ص ۲۰۴)

اب دیکھئے کہ یہ ”ایک اور بزرگ“ تو شیخ شبلی کے بھی استاد نکلے۔ شیخ شبلی نے تو صرف علمِ غیب کی گاد دینی فرمایا تھا۔ اس بزرگ نے ساتھ ہی ساتھ اسی قدر تصرف کا دعویٰ بھی فرمادیا۔ شبلی کے نزدیک تکمیلِ ولایت کا معیار وہ تھا۔ اس ایک اور بزرگ کے نزدیک یہ ہے۔

معین الدین اجمیری (م ۶۳۲ھ) کا معیار | ”کسی نے آپے پوچھا: ”مرید ثابت قدم کب ہوتا ہے؟“ آپ نے فرمایا کہ ”جب فرشتہ بیس سال تک

کوئی بُرائی اس کے نامہ اعمال میں نہ لکھے۔“ (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۰۰)

غویہ کجئے: ثابت قدمی کا کتنا کڑا معیار آپ نے مقرر فرمادیا۔ جس پر لوگ اتنا ناممکنات ہے حضور اکرم ﷺ کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

يَغْفِرْ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ
 تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے۔ (۴۸/۲)

لیکن اجیری صاحب کے ثابت قدم مریدوں کی شان یہ ہے پیر اجیری صاحب کی اپنی شانِ نوبہِ جلال سے بھی بلند ہی ہونی چاہئے۔

”آپ سے پوچھا گیا کہ حضرت کیونکر معلوم ہو کہ اب لوگ کا مرتبہ تمام ہو گیا اور
 خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (م ۷۳۴ھ) کا معیار

یہ شیخ کمال کو پہنچ گیا؛ فرمایا: ”اگر وہ کسی مردہ پر دم کرے اور وہ مردہ خدا کے حکم سے زندہ ہو جائے تو اس وقت سمجھ لو کہ وہ کمالیت کو پہنچ گیا۔“ اتنے میں ایک ہندو عورت روتی ہوئی آئی اور قدموں میں سر رکھ دیا اور کہا کہ ”میرا ایک ہی بچہ تھا جسے بادشاہ نے بیگناہ دار پر کھینچا دیا۔“ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ عصا ہاتھ میں لئے وہاں پہنچے اور فرمایا: ”الہی! اگر اسے بادشاہ نے بے گناہ دار پر کھینچا ہے تو اسے زندہ کر دے۔“ آپ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ لڑکا زندہ ہو کر ساتھ چلنے لگا۔ یہ کرامت دیکھ کر کئی ہزار ہندو مسلمان ہو گئے۔ پھر اپنے اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا کہ ”مرد کی کمالیت اس سے زیادہ نہیں ہے۔“

(ملفوظات خواجہ فرید الدین، ص ۱۱۰، ۱۱۱، مرتبہ بدایونی۔ ترجمہ غلام احمد زبیاں)

”عارف کی پہچان ان کے نزدیک یہ ہے کہ وہ عورتوں کے اندام تکمیل ولایت کا انوکھا معیار“
 مخصوصہ کو ہر وقت نظر رکھتا ہو۔... یعقوب فرماتے ہیں کہ وہ مرد

کامل پر اس محل کی حالت پر مطلع ہوتا ہے جو ابھی تک ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے (یعنی کسی عورت کو حمل قرار نہیں پاتا، مگر وہ اُسے جانتا ہے۔) (بخارحان، ص ۱۰۴، ۱۰۶)

”لا تستقر نطفة في فرج انثى الا ينظر ذلك
 کسی مادہ کی شرکاء میں کوئی نطفہ قرار نہیں پاتا مگر وہ کامل
 الرجل (اکامل) الیہا (بخارحان، ص ۱۰۴، ۱۰۶) جو الہ

(مذاہب، ص ۱۳۰)

مندرجہ بالا اسطو میں ہم نے سات مشہور و معروف اولیاء اللہ کا تکمیل ولایت سے تعلق قائم کردہ معیار بیان کر دیا ہے۔ البتہ یہ سب معیار کسی ”بہت بڑی کرامت“ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب اگر کچھ بزرگ زبان سے یہ کہتے بھی جائیں کہ کرامت ولایت لازم و ملزوم نہیں تو ان بیانات کے سامنے ان کے اس زبانی دعوے

کی کچھ حقیقت رہ جاتی ہے؟

۵۔ اولیاء اللہ اور کیمیاگری

اولیاء اللہ کے تذکرے پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کیمیاگری کا فن بھی آتا تھا۔ ان میں سے بعض حضرات تو اسے بطور علم و فن جانتے تھے اور بعض بطور کرامت وقت آنے پر سونا بنادیا کرتے تھے۔ چند اولیاء اللہ کے واقعات حاضر خدمت ہیں :

۱۔ شیخ نظام الدین عمری (م ۱۰۳۳ھ) ”آپ کو علوم اسرار و رموز کے علاوہ کیمیا وغیرہ کے علوم بھی حاصل تھے بعض نے کہا ہے کہ علوم ظاہری آپ نے پڑھا ہی نہیں تھا۔ بلا تحصیل ہی کمال حاصل تھا۔ آپ جس شخص پر نظر فرماتے ایک ہی دہرہ میں صاحب شہود ہو جاتا تھا اسی وجہ سے بہت لوگوں نے ”ولی تراش“ نام رکھ دیا تھا۔“ (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۱۵)

۲۔ میاں ننھا فادری (م ۱۰۲۷ھ) شہزادہ محمد داراشکوہ اپنی کتاب کینۃ الاولیاء میں رقمطراز ہیں کہ نباتات اور جمادات تک میاں ننھا فادری

۱۰۲۷ھ۔ یہ میاں میر لاہوری کے خاص انخاص مرید تھے) سے ہم سخن ہوتے تھے۔ ایک وزمیاں ننھا جب جنگل میں جا رہے تھے کہ ایک درخت سے آواز آئی کہ ”اگر قلعی کو چرخ دے کر اس پر سیکھ پتے ڈالے جائیں تو وہ چاندی ہو جائے گی۔ میاں ننھا نے یس کر کوئی جواب نہ دیا۔ آگے بڑھے تو دوسرے درخت سے آواز آئی۔ ”اگر تانبا کو چرخ دے کر میری ٹھوڑی سی لکڑی اس میں ڈالی جائے، تو وہ زر خواص بن جائے گا۔“ میاں ننھا اس پر بھی متوجہ نہ ہوئے اور آگے بڑھ گئے۔“ (غزنیۃ الاصفیاء، ص ۲۳۱)

معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو پہلے ہی یہ معلومات حاصل تھیں کہ اس پر متوجہ بھی نہ ہوئے یا پھر یہ کرامت آپ کی رفعتِ شان کے لحاظ سے حقیر اور کتر تھی۔

۳۔ عبد اللہ بلوچ (م ۱۰۴۲ھ) ”شیخ عبد اللہ بلوچ فادری (م ۱۲۱۲) کی خدمت میں ایک ہندو آیا عرض کیا ”میں علم کیمیا کا شائق ہوں۔ بڑی محنت اور پیسہ صرف کرنے کے بعد بھی اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ معلوم نہیں کہ کیا یہ بھی کوئی علم ہے یا نہیں۔ اگر آپ

اس معاملے میں میری رہنمائی فرمائیں، تو ممنون ہوں گا۔“ آپ نے فرمایا: ”بہتر، جاؤ کچھ تاجے کے پیسے، ستم الفار اور گندھک لے آؤ۔“ وہ ہندو اسی وقت بازار جا کر یہ چیزیں لے آیا۔ آپ نے فرمایا کہ: ”جن مٹی کے پیالے میں ہم کھانا کھاتے ہیں وہ اٹھالاف اور تاجے کے پیسے اس میں ڈال کر ستم الفار اور گندھک بھی اس میں شامل کر دو۔ اوپر کوئلے بھر کر آگ مے دو۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ کچھ دیر کے بعد فرمایا: ”چھٹے سے اسے بچڑ کر ایک پیسہ باہر نکالو۔“ میں نے ایک پیسہ نکال کر زمین پر رکھ دیا۔ اس ہندو سے فرمایا: ”اے کوٹو جب سیاہ پردہ دور ہو گیا تو زرخاں نکل آیا۔ وہ ہندو اسی وقت حلقہ بگوش اسلام ہو کر آپ کا مرید ہو گیا۔“

(خزینۃ الاصفیاء، ص ۳۱۹)

ایسے تجربے تو سب مہوسی تمام ٹمکر تے ہی ہتے ہیں اور وہ ہندو بھی کرتا رہا ہو گا لیکن سونا نہ بن سکا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آپ کے کھانے کے مٹی کے پیالے کی کرامت تھی۔ شاید مرید ہونے کے بعد اس کے اپنے کھانا کھانے کے مٹی کے پیالے میں بھی یہ کرامت پیدا ہو گئی ہو۔

۴۔ شاہ بلاول (م ۱۰۴۶ھ) | ”صاحب محبوب المومنین لکھتے ہیں کہ عتقہ شیخ ابوالفتح میں آپ (شاہ بلاول قادری لاہوری م ۱۰۴۶ھ) کے ایک ہمسایہ کے

ہاں لڑکا پیدا ہوا اور رسم کے مطابق نقال زربارک بادلینے آئے۔ وہ بڑا تنگ دست اور مفلس تھا۔ آپ اس کے حال سے واقف تھے۔ آپ ایک مٹی کا ٹونا لے کر حجرے سے باہر آئے اور اسے دیوار ہمسایہ پر مار کر توڑ ڈالا۔ تمام ٹمکرے زرخاں بن گئے۔ جنہیں نقال اٹھا کر لے گئے اور ہمسایہ کو ان سے خلاصی ہوئی۔“

(خزینۃ الاصفیاء، ص ۲۳۵)

ہمارے خیال میں اگر آپ یہ لوٹا دیوار کی اندرونی جانب ٹوٹے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ اس بیچارے مفلس کا افلاس بھی ختم ہو جاتا اور وہ بھانڈوں کو بقدر ضرورت زربارک باد دے کر خود بطریق احسن رخصت کر سکتا۔

۵۔ میاں جی نور محمد (م ۱۲۵۹ھ) | ایک سادھو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور رخصت ہوتے وقت بھنے لگا: ”میری زبیل میں تھوڑی سی اکیر

ہے یہ لے لے۔ معلوم ہوتا ہے تہاے پاس سوپے پیسے کی کمی ہے۔“ آپ نے انکار کر دیا۔ جب اس نے دو تین بار اصرار کیا، تو آپ نے ایک ڈھیلا اٹھا کر سامنے کی دیوار پر مارا اور اسے کہا کہ سامنے دیکھ۔

اس نے دیکھا تو ساری دیوار سونے کی ہو گئی تھی۔ یہ دیکھ کر کہنے لگا ”تب تو میاں جی تھے اس کی ضرورت نہیں۔“ تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۷۳۸

معلوم ہوتا ہے کہ سادھو کے جانے کے بعد وہ دیوار پھر اپنی اصلی حالت پر آگئی تھی اور اس کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہ تھی، جیسے قرآن میں آیا ہے :

وَسَحَّوْا أَعْيُنَ النَّاسِ وَ
اِشْرَهِبُوهُمْ۔ اور ان دفرعونی صوفیوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور وہ ڈر بھی گئے تھے۔

اگر وہ دیوار علیٰ حالت قائم رہتی تو کیا اچھا تھا سینکڑوں من سونا پورے ملک سے افلاس کو دور کرنے میں بہت مدد ثابت ہوتا اور تاریخوں میں اس کا ذکر ہوتا۔

۱۔ توکل شاہ انبالوی (م ۱۳۵ھ) اور سونے چاندی کی نہریں ”مولوی محبوب“ روایت کرتے ہیں

کر میرے سامنے ایک فقیر آپ کی خدمت میں آیا اور کہا: مجھے سونا بنانا سکھا دیجئے۔ آپ یس کر جوش میں آگئے اور اسے اپنے جڑہ میں گئے اور بڑی دیر کے بعد حقیقت کو نمازِ ظہر کا وقت بھی آخر ہو گیا، باہر نثر لطف لائے۔ میں نے اس فقیر کو مسجد میں لے جا کر دریافت کیا کہ ”تجھ پر کیا گزری؟“ اس کی آنکھیں سُرخ تھیں اور محویت کا عالم طاری تھا۔ اس نے بنایا کہ ”مجھ کو حجرہ میں لے جا کر نماز کے پینچے میرا سر دے دیا۔ میں نے دیکھا کہ سونے، چاندی اور جواہرات کی نہریں جاری ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے ہنسا کیا حال ہے؟“ پھر فرمایا: ”آگے چل کر دیکھو کہ نہریں انجھاں سے آرہی ہیں۔ اور مجھے ایک دھکا اور دے دیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک جگہ پر ایک نوری تختہ پر لفظ ”اللہ“ لکھا ہوا ہے اور اس کے ہر ایک حرف سے ایک نہر جاری ہے۔ فرمایا: ”دیکھ لے اس کے کیمیا آتی ہے۔“ اور پھر میرے قلب پر لفظ اللہ لکھ کر مجھ کو توجہ دی۔ اب میرے جسم کے جوڑ جوڑ سے اللہ اللہ جاری ہے۔“ وہ ایسی حالت میں جھجکل کو چلا گیا۔ کیمیا کی خواہش اُس کے دل سے محو ہو گئی اور خدا کے نام میں محو ہو گیا۔ (صوفیائے نقشبند، ص ۲۵۶)

۱۔ اب دیکھتے جنت میں تھرے پانی، دودھ، شہد اور شرابِ خالص کی نہروں کا ذکر قرآن و حدیث میں بھی آیا ہے لیکن یہ سب خیال چیزیں ہیں۔ ان کی تو نہریں بہہ سکتی ہیں لیکن سونا، چاندی اور جواہرات ٹھوس چیزیں ہیں۔ اگر شاہ صاحب ان چیزوں کی کانیں دکھلا دیتے تو روایت ذرا مستغرب ہو جاتی۔

۲۔ دھاتیں بھی شدت کی گرمی سے گچھل کر بننے لگتی ہیں۔ لیکن اس حالت میں ان سب کا رنگ ایک ہی جیسا لگ کی مانند سُرخ ہو جاتا ہے اور یہ تمیز نہیں رہتی کہ یہ سونے کی نہر ہے اور یہ چاندی کی اور یہ چوہدری کی۔
 ۳۔ اللہ کے حرف چار ہیں، لیکن نہرں آپنے صرف تین جاری کیں۔ ایک اور بھی کہتے تو کیا مضائقہ۔ بہر حال نتیجہ یہ حکایت اچھی ہے۔ اچھا ہوا کہ وہ فقیر بے چارہ ساری عمر کیپا گری میں برباد کرنے کی بجائے خدا کے نام میں محو ہو گیا اور جنگلوں کی راہ لی۔

۷۔ محمد بن اہل طوسی اور سونے کا تراشہ

”نقل ہے کہ آپ ان درویشوں کی خدمت، جو آپ کے پاس آتے تھے قرض لے کر کرتے۔ ایک بار ایک یہودی جس کے آپ قروض تھے آیا اور اپنی قم طلب کی۔ آپ نے فرمایا: ”اس وقت اس تراشہ قلم کے سوا کچھ نہیں، اسے اٹھا لے۔“ اس نے جو ہاتھ لگایا، تو وہ خالص سونا تھا۔ اس نے اسی وقت کلمہ پڑھا اور کہا: یقیناً وہ دین برحق ہے جس میں اس شان کے بزرگ موجود ہیں، جن کے قلم کا تراشہ سونا ہو جائے۔“ (دستربان حق، ص ۱۸۴)

حضرت اکرم ﷺ بھی درویشوں کی خدمت کے لئے اکثر یہودیوں سے قرض لیتے تھے۔ پھر ایک دن ایک یہودی نے مسجد نبوی ﷺ میں اگر شہید تعاضد کیا اور سخت سُست باتیں بھی کہیں، مگر حضرت اکرم ﷺ نے معذرت چاہی اور ادائیگی کا وعدہ کیا۔ آپ اسی ”کرامت“ صادر نہ ہو سکی۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ ”بزرگ“ ایسے بکرامت تھے تو انہیں یہودیوں سے قرض لینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ پہلے ہی تراشہ کا سونا بنا لیتے۔ پھر ان صوفیاء کا ایک مخصوص مسد اہل حلال میں بحال احتیاط کا بھی ہے تو کیا یہ بزرگ یہودیوں کو جو پیسے لے کر درویشوں کو کھلاتے تھے، وہ ان کے معیارِ رحمت پر پورا اتر آتا تھا۔

۸۔ طلائی دیناروں کی بارش

منقول ہے کہ درویشوں کی ایک جماعت خواجہ عبد الواحد بن زید کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور بھوک کی وجہ سے بے قرار تھی۔ سب نے اتفاق کر کے آپ سے حلو کی درخواست کی۔ پہلے تو آپ نے اس طرف توجہ نہ کی، لیکن جب ان کا اصرار حد سے بڑھ گیا تو آپ نے آسمان کی جانب منہ کر کے درخواست کی۔ فوراً طلائی دینار برسنے لگے۔ آپ نے درویشوں سے کہا کہ ان دیناروں میں سے صرف اتنا ہی لے لو جس سے حلو بقدر کفایتیہا ہو سکے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، لیکن خواجہ نے اس حلو میں سے کچھ نہیں کھایا۔ (ریز اولیاء، ص ۳۸)

خواجہ صاحب نے آسمان سے گرے ہوئے طلائی دیناروں پر ضرورت سے زیادہ اٹھانے پر پابندی لگا دی۔ باقی دینار تو ضائع ہی ہو گئے ہوں گے۔ کیا اس سے بہتر یہ نہ تھا کہ طلائی دیناروں کے بجائے نقد ضرورت حلوے کی ہی بارش ہو جاتی۔ جب کوئی خرق عادت واقعہ ہونا ہی ہے، تو حلو اُترنے سے کیا فرق پڑتا تھا۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ آپ نے حلال و طیب حلو امیں سے خود کچھ بھی نہیں کھایا۔

اور ابراہیم بن ادھم کا وہ واقعہ تو بہت مشہور ہے کہ انہوں نے اپنی لوہے کی سوئی دریا میں گرانی تو ہزار ہا مچھلیاں سونے کی ایسی سوتیاں لے کر آپ کے پاس حاضر ہو گئیں، لیکن خواجہ محمد حشمتی (م ۱۱۴۷ھ) غالباً ابراہیم بن ادھم سے زیادہ باکرامت بزرگ تھے۔ کیونکہ ان کے لئے دجلہ کی مچھلیاں سونے کی سوئیوں کے بجائے طلائی دینار منہ میں لئے اُبل پڑی تھیں۔ (سیر الاولیاء، ص ۴۴)

۱۔ صوفیاء کا اشاعتِ اسلام کا طریقہ

انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد یہی رہا ہے کہ وہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں اور اس کی تبلیغ و اشاعت کریں اور ہوتا یہ رہا ہے کہ جب کسی نبی نے اپنی قوم کو دعوت دی تو قوم نے انبیاء کو جھٹلادیا۔ بعض قوموں نے انبیاء سے معجزات کا مطالبہ کیا، لیکن معجزات دیکھنے کے بعد اس معجزہ کو جادو قرار دے کر انبیاء کی دعوت کو مسترد کر دیا اور انبیاء کو جھٹلایا۔ ارشاد باری ہے:

وَإِنْ يَدْرَأْآ آيَةً يُعْرَضُوا وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُّسْتَمَرٌّ
اور کافر جب بھی کوئی نشان دیکھتے ہیں، تو منہ پھیر لیتے ہیں۔
(۵۴/۶)

انبیاء پر صرف وہ لوگ ایمان لاتے رہے جو ان کی پاکیزہ زندگی اور اخلاق و کردار سے متاثر ہوئے۔ معجزات کے طالب کم ہی ایمان لاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے عصا کے سانپ بن کر ساحروں کی رسیوں کو کھٹا جانے پر صرف جادوگر ہی ایمان لاتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جادوگر بحیثیت فن دان یہ سمجھ گئے تھے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا معجزہ جادو کے فن سے کوئی ماوراء چیز ہے۔ قوم فرعون سے ایک آدمی بھی یہ معجزہ دیکھ کر ایمان نہ لایا۔

لیکن ہمارے اولیاء اللہ کی دنیا ہی الگ ہے۔ ان کا طریق کار یہ ہے کہ یہ اسلام کی تعلیمات پیش نہیں

فرماتے۔ بلکہ طلب کئے بغیر کوئی نہ کوئی کرامت پیش کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کافر دھڑا دھڑا اسلام لانا شروع کر دیتے ہیں۔ اب ان کی مثالیں ملاحظہ فرماتے :

حضرت علی ؓ اور صلوٰۃ خمسہ

”راحت القلوب میں لکھا ہے کہ ایک من مابینہ کے بازار میں چند یہودی بیٹھے تھے۔ ایک مسلمان سائل اُن کے پاس آیا اور کہا: ”میں بھوکا ہوں، کھانے کو کچھ دیجئے۔“ انہوں نے ازراہ تمسخر کہا: ”علی شاہ مڑاں کے پاس جاؤ، جو چاہو گے پاؤ گے۔“ ابھی سائل نے کوئی جواب بھی نہ دیا تھا کہ دُور سے حضرت علی ؓ آتے دکھائی دیئے۔ وہ سائل اُن کے پاس گیا، اپنی داستانِ غم بھی بیان کی اور یہودیوں کے طعنہ کا بھی ذکر کیا۔ اتفاق سے اُس وقت حضرت علی ؓ کے پاس کچھ نہ تھا۔ آپ نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور پانچ بار صلوٰۃ خمسہ پڑھی اور سائل کے ہاتھ پر دم کر دیا اور پنجہ بند کر دیا اور کہا: ”جاؤ یہودیوں کو دکھلاؤ۔“ وہ اسی طرح پنجہ بند کئے یہودیوں کے پاس گیا۔ جب کھولا، تو اس میں سونے کے پانچ دینار تھے۔ حیران ہو کر دوڑے دُور سے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر تائب ہو گئے اور مسلمان ہو کر ہدایت یافتہ ہو گئے۔“ ذخیرۃ

(الاصفیاء، ص ۶۷)

اب دیکھتے راحت القلوب کی اس روایت میں درج ذیل اُمور قابلِ غور ہیں :

- ۱۔ دورِ نبوی — میں یہ یہودیوں کو مدینہ سے جلا وطن کر دیا گیا تھا۔
- ۲۔ دورِ عثمانی — میں مسلمانوں کے پاس اتنی دولت آگئی تھی کہ کوئی زکوٰۃ لینے والا نہ ملتا تھا۔ کسی مسلمان کے مفکوکِ اِعمال ہونے کی وجہ سے سائل ہونا ہی خارج از بحث تھا۔
- ۳۔ حضرت علی ؓ نے پانچ بار صلوٰۃ خمسہ پڑھی تو پانچ دینار نکلتے اگر دس بار پڑھتے تو یقیناً دس دینار نکلتے۔

۴۔ یہ صلوٰۃ خمسہ کیا بلا ہے؟ کب ایجا دہوئی؟ اس کی صاحبِ راحت القلوب نے تصریح نہیں فرمائی۔ بہر حال اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی دُم جھاڑ اور جنتِ منترِ قسم کی کوئی چیز ہوگی، جو اس دورِ صحابہ سے بہت بعد کی پیداوار ہے اور حضرت علی ؓ کے نام جڑ دی گئی ہے۔

یہ بات بہر حال شک و شبہ سے بلا ہے کہ وہ سارے یہودی یہ کرامت دیکھ کر مسلمان ہو گئے تھے۔ اب اسی قسم کی چند کرامات، جنہیں دیکھنے پر لوگ اسلام لاتے رہے۔ بلا تبصرہ حاضرِ خدمت ہیں:

”آپ کسی نے پوچھا، آپ
اتنا کیوں مٹتے ہیں؟“ فرمایا

نہ خواجہ حذیفہ المرعشی (م ۲۰۲ھ) اور ندائے غیب

مجھے فَفَرَّقُوا فِي الْجَنَّةِ وَفَرَّقُوا فِي السَّعِيرِ رُلا تہے۔ نہ معلوم میں کون سے فریق سے ہوں؟
اس نے کہا: ”اگر ایسی بات ہے تو آپ بیعت کیوں لیتے ہیں؟“ آپ نے بیعت کر ایک آہ کھینچی اور بیہوش
ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے تو غیب سے بشارتِ جنت کی ندا آئی، جو سب نے سنی۔ کہتے ہیں کہ اس آواز پر
تین سو کافران کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے۔“ (تاریخ شائع چشت، مولانا زکریا، ص ۱۳۶)

نہ خواجہ ابوالاحمد ابدال چشتی (م ۳۵۷ھ) ”ایک مرتبہ دورانِ سفر آپ کاگز ایک کافروں
کی بستی پر ہوا۔ جہاں قربِ مجاور میں بھی کوئی مسلمان

نہ تھا۔ ان کافروں کی عادت تھی کہ جب کوئی مسلمان اُدھر کو آ جاتا تو اس کو نہایت مار پیٹ کر آگ میں جلا دیا
کرتے۔ اسی طرح حضرت شیخ کے ساتھ بھی معاملہ کیا مگر رُعب کی وجہ سے آگ میں ڈالنے کی جرأت نہ ہوئی
شیخ نے کہا کہ تم فکر نہ کرو۔ میں خود ہی آگ میں گر جاؤں گا۔ یہ کہہ کر حضرت شیخ اپنا مصلیٰ آگ پر ڈال کر خود چلے
گئے۔ حضرت کا وہاں پہنچنا تھا کہ آگ دفتہ ٹھنڈی ہو گئی۔ یہ قصہ دیکھ کر سب متحیر ہو گئے۔ دل و جان سے
قربان ہو گئے اور سینکڑوں نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔“ (تاریخ شائع چشت، مولانا زکریا، ص ۱۵۴)

اب دیکھئے کہ:

۱۔ حضرت شیخ کا رُعب بھی یہاں نرالا تھا کہ مار پیٹائی کے وقت تو کچھ اثر نہ دکھایا مگر جلانے کے وقت
سب کافر مرعوب ہو گئے۔

۲۔ پھر جب رُعب کی وجہ سے کافروں کو آگ میں ڈالنے کی جرأت ہی نہ ہو سکی، تو پھر از خود آگ میں پڑنے
کا فائدہ بھی کیا تھا؟

۳۔ تاہم آپ نے آگ پر مصیٰ ڈالا اور خود مصیٰ پر ہی بیٹھے ہوں گے ورنہ مصلیٰ کا کچھ مصرفِ نظر نہیں آتا، تو مصیٰ
کی برکت کی وجہ سے بچنے سے آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ اور آپ مصیٰ سمیت زمین پر آ گئے ہوں گے۔ یہ الٹی کیب
ہے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذہن میں بھی نہ آئی تھی۔

۴۔ جو کچھ بھی ہوا بہر حال سینکڑوں کافر ضرور مسلمان ہو گئے تھے اور یہ ایسی سعادت ہے جو حضرت
ابراہیم علیہ السلام کو بھی نصیب نہ ہوئی۔

۴۔ خواجہ محمد بن احمد (م ۵۲۱ھ) | ”مادر زاد ولی تھے۔ حمل کے زمانہ میں والدہ کے پیٹ سے ذکر اللہ کی آواز آتی تھی۔ پیدا ہوتے ہی سات مرتبہ کلمہ پڑھا۔ اہم رضاعت

میں مشغول بذکر رہتے تھے اور پانچوں وقت (یعنی نمازوں کے وقت) آنکھیں آسمان کی طرف اٹھا کر ان گنت کلمہ پڑھتے۔ جو شخص آزمائے آنا وہی مسلمان ہو جاتا۔“ (ایضاً، ص ۱۵۵)

گویا جو لوگ آزمائے گئے تھے وہ سب کافر ہی ہوتے تھے اور یہ بات ہے بھی دل لگتی۔ بھلا جو لوگ پہلے ہی مسلمان ہوں ان کو ایسی شنید پر کیسے شک ہو سکتا تھا؟

۵۔ احمد خضرویہ کی کرامت | ”احمد خضرویہ کے ہاں ایک درویش مہمان ہوئے۔ اس درویش کے ساتھ ستر اور بھی درویش تھے۔ آپ نے بطور مہمان نوازی

ستر شمعیں روشن کیں اور وہ شمعیں ایسی تھیں کہ بھونک تو درکنار، اوپر خاک ڈالنے سے بھی نہ بجھتی تھیں آپ کی اس کرامت کا یہ اثر ہوا کہ دوسرے دن جب آپ اس مہمان درویش کے ساتھ ایک راہب کے پاس سے گزرے، تو وہ اپنے گھر کے ستر آدمیوں سمیت مسلمان ہو گیا۔ آپ نے اپنے ساتھی درویش سے فرمایا ”میں نے خدا کے لئے ستر شمعیں روشن کی تھیں۔ خدا نے میرے ہاتھ ستر گمراہوں کے دلوں کو نور ایمان سے روشن کر دیا۔“ (مقربان حق، ص ۱۸۰)

راہب تو تارک الدنیا ہوتے ہیں۔ وہ راہب بھی خوب تھا، جو اپنے گھر کے ستر آدمیوں کے ساتھ ہی رہتا تھا۔

۶۔ سید مودودی جشتی (م ۵۲۷ھ) کا جنازہ اڑنا | ”آپ کی وفات ۹۷ سال کی عمر میں جب ۵۲۷ھ میں ہوئی۔ آپ کی نماز جنازہ

اول رجال الینب نے پڑھی۔ پھر عام آدمیوں نے اور نماز کے بعد جنازہ خود بخود اڑنے لگا۔ خواجہ صاحب کی اس کرامت سے بے شمار لوگوں نے اسلام قبول کیا۔“ (تاریخ شاخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۶۰)

اور سیر الادبیاء صفحہ ۴۹ پر یوں لکھا ہے کہ: ”خواجہ کی یہ کرامت دیکھ کر اس دن ہزاروں کافر مسلمان ہو گئے۔“

۷۔ خواجہ عثمان ہارونی (م ۶۰۳ھ) کا آگ میں داخل ہونا | ”ایک دفعہ آپ آتش پرستوں پر گزر ہوا۔ انہیں نصیحت فرمائی کہ آگ ہرگز

پرستش کے قابل نہیں۔ یہ تو خود مخلوق ہے۔ اگر اس کی پرستش کرو گے تو بھی تم کو جلانے میں کمی نہیں کرے گی۔ پھر قیامت کے دن بھی جلانے گی اور اگر اللہ کی پرستش کرو گے تو آگ نہیں قیامت کے دن نہیں جلانے گی انہوں نے کہا: ”اچھا تم جو اللہ کو پوجتے ہو۔ اس میں داخل ہو کر دکھلاؤ کہ وہ اثر کرتی ہے یا نہیں۔ آپ نے وضو کر کے دو گنا ادا کیا۔ پھر سردار کے ایک کمن پچے کو گود میں لے کر اس آگ میں چلے گئے اور دو گھنٹہ اس میں رہے۔ آگ نے اس بچہ پر کوئی اثر نہ کیا۔ اس پر وہ سب آتش پرست مع سردار کے مسلمان ہو گئے۔“

(تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۲۴)

۸۔ معین الدین چشتی (۵۳۷ - ۶۳۷) اور شیعی امیر | ”ایک دفعہ دوران سفر آپ ہرات تشریف لے گئے۔ وہاں کا شیعی امیر سخت متعصب تھا۔ او

جو شخص حضراتِ ثلاثہ کے نام پر نام رکھتا۔ اسے قتل کر دیتا تھا۔ آپ اس کے خاص باغ میں لبِ حوض تشریف فرما ہوئے۔ اس نے جب آپ کو اس حالت میں دیکھا تو غضب ناک ہو کر تکلیف دہی کا ارادہ کیا۔ آپ نے ایک نگاہ اس پر ڈالی وہ بے ہوش ہو کر گر گیا۔ حضرت نے غصہ دیر میں اس پر حوض کا پانی ڈالا جس سے وہ ہوش میں آیا، لیکن اس حال میں کہ سخت معتقد تھا۔ اور مع اپنے اراکین حضرت سے بیعت ہو گیا اور خلافت ظاہری و باطنی سے آپ کا نائب امیر بنا۔“ (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۶۸)

۹۔ قصب البان (م ۵۷۲ھ) کی تبدیلی اشکال | ”آپ غوث الاعظم کے کامل ترین مریدوں سے تھے، مگر بے نماز تھے۔ کس نے

غوث الاعظم سے اس بات کی شکایت کی، تو فرمایا: ”اُن کا سر ہمیشہ کعبہ کی دہلیز پر رہتا ہے۔“ قاضی موصل کو ان سے سخت اختلاف تھا۔ ایک روز موصل کے کسی بازار سے گزرتے ہوئے قاضی سے دوچار ہو گئے۔ قاضی نے دل میں کہا۔ آج موقع ہے۔ گرفتار کر کے حاکم کے پیش کر دینا چاہتے۔ قاضی نے اچانک دُور سے دیکھا کہ گرداڑ رہی ہے۔ جب وہ گردِ قریب ہوئی تو معلوم ہوا کہ کوئی مغرور قوی ہیکل پہلوان ہے اور قریب ہوا تو ایک اعرابی کی صورت میں منکشف ہو گیا۔ پھر عالم و فقیہ کی شکل میں ظاہر ہوا اور قریب آکر کہنے لگا۔ کہو ان تین شکلوں میں سے کون سی شکل حاکم کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہو۔ قاضی اس تبدیلی ہیئت

سے خوفزدہ ہو کر شیخ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوا۔“ (ذریعۃ الانصار، ص ۱۶۸)

اب دیکھئے کہ :

- ۱۔ قصبہ البان بے نماز ہونے کے باوجود پیران پیر کے کامل ترین مریدوں میں سے تھا۔
- ۲۔ غوث الاعظم نے نزکۃ نماز کی شکایت پر اس بے نماز ہی کی طرف داری فرمائی۔ آخر مرید جو تھا۔
- ۳۔ ایسے بے نمازوں سے بھی ایسی عظیم الشان کرامات صادر ہو سکتی ہیں کہ پڑھے لکھے اور پابندِ شرع قاضی قسم کے لوگ بھی ان کے مرید بن جاتے ہیں۔

”حضرت نظام الدین فرمایا

کرتے تھے کہ حضرت شیخ

۱۰۔ فرید الدین گنج شکر (م ۶۶۰ھ) چھ سال کی عمر میں کرامت

(فرید الدین) کی والدہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ ایک چور چوری کرنے آیا۔ جب اس کی نگاہ والدہ پر پڑی، فوراً اندھا ہو گیا۔ اس نے آواز دی: ”اگرچہ میں چوری کی نیت سے آیا تھا اور نابینا ہو گیا ہوں، مگر اب عہد کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی چوری نہ کروں گا۔“ حضرت شیخ کی عمر اس وقت چھ سال کی تھی۔ حضرت نے دعا کی۔ اللہ کے فضل سے اچھا ہو گیا۔ صبح جا کر مجد اہل و عیال مشرف بہ اسلام ہوا۔ عبد اللہ نام تجویز ہوا۔ اور اخیر تک حضرت شیخ کی خدمت میں رہا۔ زنا یسج مشائخِ حشت۔ مولانا زکریا ص ۱۴۷۔

غور فرمائیے چھ سال کے شیخ کے دستِ حق پرست پر یہ کافر چور مجد اہل و عیال مشرف بہ اسلام ہو رہا ہے اور اس وقت سے لے کر انہیں کاہر رہتا ہے۔ اس نے اس چھ سالہ شیخ سے اسلام کا کیا سیکھا ہوگا؟

”آپ کے پاس ایک عورت روتی ہوئی آئی اور کہا کہ بادشاہ نے میرے بے گناہ بچہ کو

۱۱۔ خواجہ فرید الدین گنج شکر (م ۶۶۰ھ)

تختہ دار پر کھنچوا دیا۔ آپ اپنا عصا ہاتھ میں لے لے اپنے اصحاب سمیت اس کے ساتھ ہو لئے اور دار کشیدہ لڑکے کے پاس پہنچے۔ ہندو مسلمان کی ایک بھیڑ لگ گئی۔ خواجہ نے کہا: ”الہی! اگر اسے بادشاہ نے بے گناہ دار پر کھینچا تو اسے زندہ کر دے۔ آپ کہہ ہی رہے تھے کہ لڑکا زندہ ہو گیا اور ساتھ چلنے لگا۔ یہ کرامت دیکھ کر کئی ہزار ہندو مسلمان ہو گئے۔“ (اسرار الاولیاء، محفوظات خواجہ فرید الدین گنج شکر، ص ۱۱۰-۱۱۱ مرتبہ خواجہ بڑا ساقی، ترجمہ نظام احمد بریل۔ مطبع مجتہدی دہلی، ص ۱۹۱۶۔)

”قطب عالم عبدالقدوس گنگوہی جب باطنی علوم سے فارغ ہو کر گنگوہ

۱۲۔ عبدالقدوس گنگوہی (م ۹۴۴ھ) کا پانی بننا

تشریف لائے، تو ایک ہندو جوگی سے سابقہ پیش آیا۔ آپ نے اس سے پوچھا: کتنی روحانی ترقی کر لی ہے۔ کہنے

لگا۔ بہت، جو صورت چاہوں بن سکتا ہوں۔ دیکھو ابھی پانی بنا ہوں۔ چنانچہ وہ اسی وقت پانی بن گیا آپ نے کپڑے کی ایک دھتی اس سے نر کر کے رکھ لی۔ پھر اس جوگی کے ہوش میں آتے ہی فرمایا کہ اب میں پانی ہوتا ہوں، تو اس میں سے ایک کپڑا تر کر کے رکھ لینا۔ اس کے بعد یہ کپڑے سونگھے گئے، تو پہلے کپڑے میں بدبو کی وجہ سے دماغ چٹا جاتا تھا اور دوسرے میں خوشبو کی وجہ سے دماغ مسطہ ہوتا تھا۔ جوگی بولا میں تو اپنے فن و ہنر میں کامل تھا۔ کپ بھی کامل نکلے۔ صرف خوشبو اور بدبو کا فرق رہا۔ فرمایا: ”یہ کفر و اسلام کا فرق ہے۔ چنانچہ وہ اسی وقت آپ کا فرید ہو کر مسلمان ہو گیا۔ اس جوگی کو آپ نے صاحب ولایت مقرر کر کے کہیں اور بھجوا دیا۔ حضرت کا روضہ بھی اسی جگہ ہے۔“ (ماہنامہ دارالعلوم دیوبند جنوری ۱۹۶۰ء، ص ۲۔ گلخان اعلیٰ قاری محدث صاحب)

دراغور فرماتے کہ یہ جوگی صاحب ولایت مقرر ہو کر جہاں گئے ہوں گے، تو وہ لوگوں کو وہی کچھ سکھاتے ہوں گے جو کچھ انہیں آتا تھا۔ اسلامی تعلیمات سے جب وہ خود ہی بے بہرہ تھے تو دوسروں کو اسلام کیا سکھاتے ہوں گے؟

۱۳۔ امیر کلال (۳۴، ۷۷ء) کی کشتی کا فلسفہ | امیر کلال بابا ساسی سے بیعت ہونے سے پہلے کشتی لڑا کرتے تھے۔ ایک بار کشتی لڑ رہے تھے کہ بابا ساسی

کا ادھر سے گزرا۔ لوگوں کے دل میں خیال آیا کہ کشتی لڑنا تو بدعت ہے۔ ایسے بزرگ اور سید زائے کو ان بدعتوں سے کیا واسطہ۔ اسی وقت ان لوگوں پر نیند اور غرور کی طاری ہو گئی۔ خواب دیکھا کہ قیامت برپا ہے اور لوگ کیچڑ میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اتنے میں امیر کلال تشریف لائے اور ان کو کیچڑ سے نکال دیا۔ جب وہ لوگ نیند سے بیدار ہوئے، تو حضرت امیر کلال نے ان کے کان پکڑ کر فرمایا کہ ”ہم اس روز کے لئے نبرد آزما کی کشتی لڑتے ہیں۔ بزرگوں کی طرف سے بدعتیہ نہ ہونا چاہئے۔“ اس پر سب نے توبہ کی اور آپ کی تربیت سے مردانِ خدا بن گئے۔“ (صوفیائے نقشبند، ص ۱۸۱)

غور فرمایا اپنے کتنی لا جواب کرامت ہے۔ ابھی امیر کلال بیعت بھی نہیں ہوئے، نہ فقیری لائن میں داخل ہوئے، لیکن کرامت ظاہر ہو گئی جس کا آدھا حصہ خواب سے متعلق رکھتا ہے آدھا بیداری سے۔ ابھی امیر کلال کشتی ہی لڑا کرتے ہیں، خود ابھی بابا ساسی نے ان کی طرف توجہ بھی نہیں فرمائی، لیکن سب لوگ آپ کے دستِ حق پرست پر توبہ بھی کرتے اور مردانِ خدا ابھی بن جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس روایت اور کرامت نے مل کر بدعت

کی کسی جامع و مانع تعریف بیان فرمادی اور اس کا فلسفہ بھی بیان کر دیا کہ پہلوان حضرات ہی قیامت کے دن سب سے زیادہ کار آمد ثابت ہوں گے۔

۱۲۔ پیر حسین کبیر الدین (م ۸۵۳ھ کی دعوت) | پیر حسین کبیر الدین شیعہ امامیہ اسماعیلیہ کے پیر اور مبلغ تھے۔ ان کے متعلق نور مبین میں بحوالہ کتاب گوزارشمن لکھا ہے کہ:-

”آپ نے چالیس سال تک ایک پاؤں پر کھڑے رہ کر عبادت کی تھی اور اپنی کرامت سے گلگانڈی کا پانی اوجھ گاؤں میں منگوا کر اس میں ہندوؤں کو اشتنان کرواتے تھے جس کے باعث کثرت سے لوگ مذہب اسماعیلی میں داخل ہوتے تھے ریز آپ نے ایک مردہ بونج کو زندہ کیا تھا۔ (نور مبین، مترجم اے جے چنار۔ مطبوعہ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن، برائے ہند، بمبئی)

۸۔ اولیاء اللہ کا وعظ اور تاثیر کلام

اولیاء اللہ چونکہ معرفت کے خزانے ہوتے ہیں، لہذا ان کا کلام بھی خالق معرفت سے لبریز ہوتا ہے ان کا وعظ ایسا نہیں ہوتا جیسے رسول اللہ ﷺ کا تھا کہ اس پر کافروں کی طرف سے آپ کو بے شمار ذلتیں پہنچانی گئی تھیں۔ نہ ہی ان کا وعظ عام علمائے اُمت کی طرح ہوتا ہے جو لوگوں کو خوفِ خدا کی تلقین کرنے اور احکامِ شرعیہ کی پابندی کے لئے دعوت دیتے ہیں، پھر کسی پر کچھ اثر ہو جاتا ہے کسی پر نہیں ہوتا۔ بلکہ اولیاء اللہ کا وعظ اور تاثیر کوئی جدا گانہ چیز ہی ہوتی ہے جس سے پہلے سے سمان سامعین بھی مرنا شروع ہو جاتے ہیں چند ایک مثالیں ملاحظہ فرماتے:

جنید بغدادی (م ۲۹۸ھ) کا پہلا وعظ | شیخ جنید نے جب معلوم ظاہر و باطن کی تکمیل کر لی تو شیخ سریؒ (ان کے مُرشد، م ۲۵۰ھ) نے انہیں

وعظ کی اجازت دی، لیکن شیخ جنید نے اپنے استاد کے پاس ادب کی وجہ سے وعظ نہ کہا۔ رات کو خواب میں رسول اللہ ﷺ نے کہا: ”اے جنید! وعظ کیوں نہیں کہتا۔ اللہ نے تیری زبان میں بڑی تاثیر دی ہے۔“ صبح کو شیخ سریؒ نے تو کہا: ”میں نے نہ کہا تھا کہ لوگوں سے کلام کر۔ پس اب رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق وعظ کر۔“ چنانچہ جنیدؒ کی پہلی مجلس میں چالیس آدمی حاضر ہوئے۔ جن میں سے سترہ شیخ کی تاثیر کلام سے جان بحق ہو گئے اور میں بے ہوش ہو گئے۔“ (غزنیۃ الاصفیاء، ص ۱۳۹)

۱۳۔ شیخ سریؒ (م ۲۵۰ھ) آپ جنید بغدادی کے مُرشد ہیں۔ بغداد میں سب سے پہلے آپ ہی نے برسرِ نہر حقائق توحید (یعنی توحید وجودی کے اسرار و رموز بیان کئے۔ غزنیۃ الاصفیاء، ص ۱۳۱)

معلوم ہوا آپ کو کہ تاثیر کلام کس چیز کو کہتے ہیں اور وعظ کس چیز کو؟ پہلے ہی وعظ میں چائیس میں سے سترہ تو فوراً مر گئے اور بیس بے ہوش ہو گئے، وہ گھر جا کر مر گئے ہوں گے یا دوسرا وعظ سن کر مر جائیں گے۔ یہ وعظ تھا یا کسی بس کا شدید اکیڈنٹ یا آسمانی صاعقہ اور جو تین ٹھیک ٹھاک رہے ہڑے سخت جان یا شقی الغلب ہونگے

”۵۲۱ھ میں اسٹارہ رسول اکرم ﷺ اور حضرت علیؓ منبر پر وعظ کھنا شروع کیا۔ آنجناب اکثر حالت وعظ میں فرمایا کرتے تھے کہ ”اے اہل آسمان وزمین! آؤ اور میری بات سنو کہ میں نائب و وارث رسول ﷺ ہوں۔“ آپ کی مجلس میں ستر ہزار حاضرین کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ چار شخص آپ کے کلام کو کہتے: ”تائیر کلام کا یہ حال تھا کہ سامعین میں سے اکثر لذت ذوق و شوق و غلبہ حال میں جان بقی ہو جاتے بعض پر بے خودی و وجد طاری ہو جاتا اور وہ کئی کئی دن تک ہوش میں نہ آتے شیخ البوسعید فیہوی فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کی مجلس وعظ میں بار بار رسول اللہ ﷺ، دیگر غیبروں نیز ملائکہ اور جنات کو صف بہ صف دیکھا ہے۔“ (خریۃ الاصفیاء ص ۱۵۹)

لے اس اشارہ کی تفصیل سیرۃ غوث الثقلین کے صفحہ ۷۰ پر یوں دی گئی ہے۔

”غوث عظیم حالت بیداری میں نماز پڑھتے پہلے رسول اللہ کی زیارت سے مشرف تھے تو آپ نے فرمایا: ”اے میرے بیٹے! وعظ نصیحت کیوں نہیں کرتے؟“ پیران پیر نے کہا: ”کیونکہ شیخ شخص ہوں فصحاء عرب کے سامنے کیسے تقریر کروں؟“ آپ نے فرمایا: ”اچھا منہ کھولو۔“ پیران پیر نے منہ کھولا تو آپ نے سات مرتبہ اپنا لعاب مبارک منہ میں ٹھوکا اور کہا: ”اب وعظ نصیحت کرو اور لوگوں کو نیکی کی دعوت دو۔“

پھر نماز پڑھ کر بعد حضرت علیؓ تشریف لائے اور کہا: ”یسا منہ کھولو۔“ پیران پیر نے منہ کھولا تو حضرت علیؓ نے چہرہ منہ میں تھما کر فرمایا: ”وعظ نصیحت کرو۔“ پیران پیر نے پوچھا: ”آپ نے سات بار کیوں نہیں تھما کر؟“ حضرت علیؓ نے فرمایا: ”ادباً مع رسول اللہ یعنی رسول اللہ کے پاس ادب کی خاطر۔“

اس کے ساتھ ہی پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حاضر ہوتے ہیں اور کہتے ہیں: ”اے بیٹا! بیعت پھنو۔“ پیران پیر نے پوچھا: ”یہ بیعت کیسی ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ تمہاری ولایت کی بیعت ہے جو قلب اولیاء سے مخصوص ہے۔“

پیران پیر کہتے ہیں کہ اس کے بعد ان یعنی رسول اللہ ﷺ اور حضرت علیؓ کے فیوض و برکات سے میں نے حقائق و معارف کو جان لیا

علقہ ارادت وسیع ہو گیا۔ (ہجۃ الاسرار ص ۲۵-۲۶) تلا ما بکجاہ ص ۱۳ سیفینۃ الاولیاء ص ۶۴ (اخبار الانبیاء فارسی ص ۱۸-۱۹) تحفہ قادریہ ص ۱۵۹

دیکھا آپ نے کتنی معتبر روایت تھی جسے صاحب خریۃ الاصفیاء نے صرف بہ اشارہ رسول اکرم ﷺ اور حضرت علیؓ بغیر کچھ صفحہ

بات ہے بھی دل لگتی۔ بھلا جس مجلس میں رسول اللہ ﷺ اور دوسرے پیغمبر، ملائکہ اور جنات اور انسان سب آئیں، وہاں ستر ہزار کی تعداد معمولی بات ہے اور چار سو کھنے والوں میں بھی شاید ملائکہ اور جنات شامل ہوں۔ البتہ یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ ملائکہ تو غیر مخلوق ہیں ان کے لئے وعظ و نصیحت بے کار چیز ہے۔ وہ اس مجلس وعظ میں کیا لینے آتے تھے؟ ممکن ہے کہ ”اہل آسمان وزمین“ کافرانِ مَن کر اور حکمِ عدلی کی تاب نہ لاکر حاضر ہو جاتے ہوں۔

رسول اللہ ﷺ نے بھی زندگی بھر وعظ فرمایا لیکن کبھی ایک آدمی بھی جاں بحق نہ ہوا نہ کوئی وجد و حال سے جلے ہوؤش ہوا۔ اب پیرانِ پیر کے وعظ کے متعلق تین ہی احتمالات ہو سکتے ہیں:

- ۱۔ آپ کا وعظ رسول اللہ سے بہت زیادہ پُر تاثیر ہوتا ہو۔
 - ۲۔ آپ کا وعظ وہ کچھ نہ ہو، جو کچھ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے بلکہ کسی سری نوعیت کا جداگانہ موضوع رکھتا ہو۔
 - ۳۔ تذکرہ نویسوں نے اشتہاتی مبالغہ آرائی اور بے اقتیاطی سے کام لیا ہو۔
- ہم اے خیال میں تیسری بات زیادہ قرینِ قیاس ہے، آپ جو چاہے سمجھ لیجئے۔

۹۔ برصغیر پاک و ہند میں اشاعتِ اسلام میں صوفیاء کا کردار

صوفیاء کی طرف سے بڑے شد و د سے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں اشاعتِ اسلام کا سہرا صوفیائے کرام کے سر پر ہے۔ پھر وہ لوگ جو صوفیائے کرام سے کچھ زیادہ ہی حسنِ عقیدت رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ:

”پہلی بات تو یہ ہے کہ محمد اہل اسلام ان بے نوا فقیروں کے ممنونِ احسان ہیں۔ جن کے صدقے ان کے دلِ نورِ اسلام سے منور ہوئے۔ ورنہ کیا خبر آج ہم کسی منہ میں دیوی کے چرنوں میں اتنی پالتی مارے بیٹھے اس کی دُند و نت بھلا سہے ہوتے۔“ (روحِ تعوف، ص ۱۰۷)

جنابِ علامہ رشید احمد گیلانی کے خیال کے مطابق تو پہلی بات یہ ہے جو اقتباس بالا میں مندرج ہے اور ہمارے خیال میں صوفیاء اور ان کے حسنِ عقیدت رکھنے والے حضرات جس طرح کئی دوسری باتوں میں مبالغہ اور غلو

کہہ کر گول مول کر دیا، و باءِ البتہ ہم کہنے سے قاصر ہی رہے کہ فیوضِ دبرکات تو آپ رسول اللہ ﷺ اور حضرت

علیؑ سے حاصل کریں اور مصلحا کا اثر باطل ان کے متضاد ہو۔ یہ کیا منہ ہے؟

سے کام لیتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے اس معاملہ میں بھی مبالغہ اور بے احتیاطی سے کام لیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تاریخی حقائق صوفیاء کے اس دعویٰ کی پرزور تردید کرتے اور منہ چلاتے نظر آتے ہیں۔

صوفیاء کی برصغیر پاک و ہند میں آمد
برصغیر پاک و ہند میں اسلام اس وقت آچکا تھا جب کہ ابھی نہ کسی صوفی کا اس دنیا میں وجود تھا نہ تصوف کا۔ گودوسری صدی

ہجری کے اواخر یا تیسری صدی کے اوائل میں چند ایک بزرگوں کو صوفی کہا جانے لگا تھا۔ تاہم ان کی ابتدا تیسری صدی ہجری میں شمار ہوتی ہے اور جو صوفیائے کرام برصغیر پاک و ہند میں تشریف لائے اور ان کی وساطت سے ہند میں اشاعت اسلام کا کام ہوا، ان میں سے دو ہندیاں ہی زیادہ مشہور ہیں جو پہلے پہل تشریف لائیں۔

پہلے حضرت علی ہجویری (۱۰۹۹ھ - ۱۱۰۶ھ) ہیں۔ یہ ہندوستان میں ۱۰۹۹ھ میں تشریف لائے اور دوسرے بزرگ خواجہ معین الدین چشتی جمیسری (۱۱۳۲ھ - ۱۲۳۵ھ) ہیں۔ جن کی ہندوستان میں آمد کی تاریخ دس محرم ۵۹۱ھ بمطابق ۱۱۹۱ء بتلائی جاتی ہے، جو کہ سخت مشکوک ہے۔ تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق بھی یہ تاریخ ۵۹۱ھ اور ۵۸۰ھ کے درمیان ہونی چاہئے۔

ان دو مشہور بزرگوں کے علاوہ دو اور بزرگوں کی آمد کا بھی تذکرہ سبھی پتہ چلتا ہے۔ ان میں ایک تو ملے آپ کی تاریخ پیدائش ۵۳۶ یا ۵۳۷ھ ہے۔ پندرہ سال کے تھے کہ والد نے اور پھر ایک سال بعد والدہ نے وفات پائی۔ آپ کو ایک باغ اور ایک مکتی ورثہ ملی اور آپ نے باغبانی کو ذریعہ معاش بنایا۔ اس اثناء میں ایک مہذب ابراہیم قندرزکی سے ملاقات ہوئی اور زندگی نے چمکایا، تمنا تھی کہ رقم خزاں کو ملے دی۔ پھر پہلے مکرند اور بنار گئے اور وہاں حفظ قرآن، تفسیر فقہ، حدیث اور دوسرے علوم ظاہری میں مہارت حاصل کی۔ (انسائیکلو پیڈیا فیروز سنز ص ۱۲۷) ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ نے علوم ظاہری سے فراغت حاصل کی تھی اس وقت آپ کی عمر کم از کم بیس سال تو ضرور ہوگی۔ اس کے بعد آپ حواجہ ہارونی کی بیعت ہوئے اور ایک ہی دن میں تکمیل ہوگئی اور ساتھ ہی ساتھ حضرت شیخ کی توجہ سے سب علوم حاصل ہوئے اور اس کے بعد متحمل امر کی وجہ سے بیس سال حضرت کی خدمت میں اور رہے (تاریخ مشائخ چشت مولانا زکریا، ص ۱۶۶) گویا جب آپ عثمان ہارونی سے فارغ ہو کر ہندوستان آئے، تو آپ کی عمر کم از کم چالیس سال کی ہوگی یا یہ ۵۳۷ھ کا واقعہ ہے۔ لیکن یہی مولانا زکریا آپ کی ہندوستان میں آمد محرم ۵۳۷ھ بتلاتے ہیں۔ یعنی ۴۴ سال کی عمر میں آپ امیر تشریف لائے اور یہ بات قطعاً غلط ہے کیونکہ آپ ہارونی صاحب سے فراغت کے بعد کئی دوسرے بزرگوں سے ملے اور فیض حاصل کرتے رہے۔ پھر علی ہجویری کے مزار پر چند بھی کاٹا۔ پھر پہلے دہلی گئے بعد میں امیر آئے، تو اس لحاظ سے کی امیر آنے کی تاریخ ۵۳۷ھ کے لگ بھگ ہونی چاہئے۔

شیخ محمد اسماعیل بخاری ہیں جو ۱۰۰۵ھ میں لاہور تشریف لائے۔ (روحِ تصوف، ص ۹۹ اور ۱۰۲) اور دوسرے بزرگ خواجہ ابو محمد بن ابوالاحد جو محمود غزنویؒ کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے تھے۔ (تاریخِ مشائخِ چشت، غلیقِ نظای، ص ۱۴) اور محمود غزنویؒ نے ۱۰۲۵ء سے ۱۰۲۷ء تک ہندوستان پرستہ حملے کئے تھے۔ آخری حملہ سومناٹ پرستہ میں کیا گیا۔

ان تمام تر تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی صوفی بزرگ، وہ مشہور و معروف ہو یا غیر معروف، سلطان محمود غزنویؒ سے پہلے یرضغیر پاک و ہند میں وارد نہیں ہوا تھا۔ لیکن مسلمان جہاں اس سے بہت پہلے یہاں نظر آتے ہیں۔ جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔ اور تفصیل ہم ”تاریخِ پاک و ہند“ (مصنف پروفیسر عبداللہ ملک صد شہنشاہ، تاریخِ اسلامیہ کالج، ریوے، ڈو، لاہور، ساتواں ایڈیشن ۱۹۷۸ء) سے پیش کر رہے ہیں۔ آپ کی یہ کتاب کابھوں میں بطور نصاب پڑھائی جاتی ہے۔

”اسلام مذہب کی حیثیت سے پہلے جنوبی ہند میں پہنچا۔ مسلمان تاجر اور مبلغین ساتویں صدی عیسوی میں (یاد رہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات ۶۳۲ء میں ہوئی تھی۔ یعنی آپ کی وفات کے بعد جلد ہی مسلمان) مالِیبا اور جنوبی سواحل کے دیگر علاقوں میں آنے جانے لگے۔ مسلمان چونکہ بہترین اخلاق و کردار کے مالک اور کاروباری لیکن دین میں دیانتدار واقع ہوئے تھے، لہذا مالِیبار کے راجاؤں، تاجروں اور عام لوگوں نے ان کے ساتھ واداری کا سلوک و دارکھا۔ چنانچہ مسلمانوں نے یرضغیر پاک و ہند کے مغربی ساحلوں پر قطعاتِ اراضی حاصل کر کے مسجدیں تعمیر کیں۔ (یاد رہے کہ اس وقت خانقاہوں کی تعمیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا) اور اپنے دین کی تبلیغ میں مصروف ہو گئے۔ ہر مسلمان اپنے اخلاق اور عمل کے اعتبار سے دینِ اسلام کا مبلغ تھا۔ نتیجہ عوام ان کے اعمال و اخلاق سے متاثر ہوتے چلے گئے۔ تجارت اور تبلیغ کا یہ سلسلہ ایک صدی تک جاری رہا یہاں تک کہ مالِیبار میں اسلام کو خاطر خواہ فروغ حاصل ہوا اور وہاں کا راجہ بھی مسلمان ہو گیا۔ جنوبی ہند میں فروغِ اسلام کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانے میں جنوبی ہند مذہبی کشمکش کا شکار تھا۔ ہندو دھرم کے پیروں کا بدھ مت اور جین مت کے شدید مخالف اور ان کی سخت کُنئی میں مصروف تھے۔ ان حالات میں جب مبلغینِ اسلام نے توحیدِ الہی اور ذاتِ پات اور چھوٹ چھات کو لایعنی اور خلافِ انسانیت قرار دیا، تو عوام جو ہزاروں سال سے تفرقات اور امتیازات کا شکار ہو رہے تھے۔ بے اختیار اسلام کی طرف مائل ہونے لگے۔ چونکہ حکومت اور معاشرہ کی طرف سے تبدیلیِ مذہب پر کوئی پابندی نہ تھی۔ لہذا ہزاروں غیر مسلم

مسلمان ہو گئے۔“ (تاریخ پاک و ہند، ص ۳۹۰)

۱۔ اس اقتباس سے مندرجہ ذیل اُمُو واضح ہوتے ہیں :

- ۱۔ پہلی ہی صدی ہجری میں اسلام جنوبی ہند بالخصوص مالدیپ اور مغربی سواحل میں پھیل گیا تھا۔ ان علاقوں کے ہزار ہا غیر مسلم مسلمان ہو چکے تھے اور راجہ بھی مسلمان ہو گیا تھا۔
- ۲۔ اشاعتِ اسلام کی اصل وجوہات تین تھیں :

۱۔ عقیدہ توحید الہی کی سادگی۔ (۲)۔ ذاتِ پات اور چھوٹ چھات کو خلافِ انسانیت قرار دینا اور (۳)۔ مسلمانوں کے اعمال و اخلاق کی پاکیزگی اور شائستگی۔

گویا ہندوستان میں اشاعتِ اسلام کا اصل سبب اولیاء اللہ یا صوفیاء کی معمولہ کرامات نہیں بلکہ درج بالا وجوہات تھیں۔

اب اس پہلی صدی ہجری میں برصغیر پاک و ہند میں جن جن مقامات پر اشاعتِ اسلام ہوئی اس کی مزید تفصیل درج ذیل اقتباس میں ملاحظہ فرمائیے :

”برصغیر پاک و ہند میں عربوں کے تجارتی مراکز میں سراندیپ، مالدیپ، مالابار، کار و منڈل، گجرات اور سندھ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ جنوبی ہند اور ساحلی علاقوں میں بھی جا بجا عرب تاجروں کی نوآبادت موجود تھیں۔ جہاں عراق اور عرب کے تاجر موجود تھے۔ ظہورِ اسلام کے بعد عربوں کی سیاسی، مجلسی اور اقتصادی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں۔ اب وہ تبلیغِ اسلام کے شوق سے سرشار، اخلاق و اطوار کے لحاظ سے بلند معیار کے حامل اور صداقت و دیانت کے پیکر تھے۔ ان میں سے اکثر نے برصغیر میں ہی رہائش اختیار کر لی۔ آہستہ آہستہ جنوبی ہند کے اکثر مقامات پر مسلمانوں کی نوآبادت قائم ہو گئیں۔ انہوں نے مقامی لوگوں کو مشرف بہ اسلام کرنا شروع کر دیا۔ مقامی راجاؤں سے مسلمان تاجروں کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے اور انہیں تبلیغِ اسلام اور عبادت کی پوری آزادی حاصل تھی۔“ (ایضاً، ص ۱۷، ۱۸)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ :

پہلی صدی ہجری میں اسلام صرف مالابار اور مغربی سواحل پر ہی نہیں پھیلا بلکہ جزائر سراندیپ، مالدیپ اور علاقہ بامنے کار و منڈل، گجرات اور سندھ میں اسلام کی اشاعت ہو چکی تھی۔ ان مقامات پر مسلمان عربوں کی نوآبادیات بھی قائم تھیں اور بہت سے عرب مسلمان مستقل یہاں قیام پذیر ہو کر اسلام کی تبلیغ اور اشاعت میں

منہک ہو گئے تھے۔

بڑے صغیر میں اشاعت اسلام کے سلسلہ میں یہ کچھ تو بخوبی سطح پر ہوا۔ اب جو کچھ سرکاری سطح پر ہوا اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

۱۔ دورِ فاروقی — میں بحرن و عمان کے حکم عثمان بن ابوالعاص ثقفی نے ۶۳۶ء - ۶۳۷ء میں (وفات نبوی ﷺ) سے صرف چار سال بعد، ایک فوجی ہم نخوانہ نزدیکی میں بھیجی۔ پھر اس مہم کی اطلاع حضرت عمر کو دی۔ آپ ناراض ہوئے اور لکھا کہ ”تم نے میری اجازت کے بغیر سواحل ہند پر فوج بھیجی۔ اگر ہمارے آدمی وہاں مارے جاتے تو میں تمہارے قید کے اتنے ہی آدمی قتل کر دیتا۔“ (ایضاً، ص ۱۸)

۲۔ عہدِ عثمانی — میں عراق کے حکم عبداللہ بن عامر نے حکیم بن جبہ کو بڑے صغیر کے سرحدی حالات کی تحقیق پر مامور کیا۔ واپسی پر انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنی رپورٹ میں بتلایا کہ ”وہاں پانی کھمبات ہے۔ پھل نکتے ہیں ڈاکو بہت دیر ہیں اگر قلیل اتنا دفع بھیجی گئی تو ہلاک ہو جائے گی اور اگر زیادہ لشکر بھیجا گیا، تو بھوکوں مر جائے گا۔“ اس رپورٹ کی بنا پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مہم بھجھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ (ایضاً، ص ۱۹)

۳۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں مشہور سپہ سالار مہذب بن ابی صفرہ نے بڑے صغیر کی سرحد پر حملہ کیا اور لاہور تک بٹھا آیا۔ انہی ایام میں خلیفہ اسلام نے ایک اور سپہ سالار عبداللہ بن سوار عبدی کو سواحل بڑے صغیر کے کمرش لوگوں کی گوشمالی کے لئے چار ہزار کی عسکری جمیعت کے ساتھ بھیجا۔ اس نے قیقان کے باشندوں کو سخت شکست دی اور مال غنیمت لے کر واپس چلا گیا۔ اس نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں قیقانی گھوڑے پیش کئے، لیکن کچھ مدت بعد عبداللہ بن سوار قیقان واپس آگیا، جہاں ترکوں نے یورش کر کے اسے قتل کر دیا۔“ (ایضاً، ص ۱۹)

۴۔ بعد ازاں ۱۷ھ یعنی ۶۳۳ء میں ولید بن عبد الملک کے زمانہ میں وہ واقعہ پیش آیا جس نے بڑے صغیر میں اسلام کی اشاعت کے سلسلہ میں بڑا متحرک کردار ادا کیا یعنی محمد بن قاسمؒ نے اس سال سندھ کے سارے علاقہ کو فتح کر لیا۔ اس حملہ کے اسباب اور محرکات ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ ہم تو یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس مہم میں محمد بن قاسمؒ نے دیبل، نیرن، سیرستان، سیسم، رادڑ، برہمن آباد، ادور، باتیہ (موجودہ بہاولپور کے قریب) جوار میں واقع تھا، اور ملتان کو فتح کر لیا اور قنوج کی تخریب کا ارادہ کر لیا تھا کہ اسے واپس بلایا گیا۔

محمد بن قاسمؒ کے جانے کے بعد فتوحات کا سلسلہ اچانک رُک گیا۔ بہر حال عرب سندھ و ملتان برد و سوا

سے زیادہ عرصہ تک (یعنی دسویں صدی عیسوی تک) قابض رہے۔ چوتھی صدی ہجری تک خلیفہ المسلمین والیاء سندھ کا تقرر کرتا رہا۔ اس کے بعد سندھ میں عربوں کی نویم آزاد ریاستیں قائم ہو گئیں۔ ان میں سے ایک مٹان اور دوسری منصورہ تھی۔ (ایضاً، ص ۳۵)

محمد بن قاسم کی ان فتوحات نے اشاعت اسلام کے سلسلہ میں کیا کردار ادا کیا؛ وہ پروفیسر عبد العت درو شجاع الدین کی زبان سے سنتے:

”فتح سندھ کے بعد بے شمار علماء، متبعین، تاجرا و صنایع عرب آ کر سندھ میں آباد ہوئے۔ مقامی باشندوں میں اسلام رائج ہوا اور یہ سرزمین فرزندانِ توحید کا گہوارہ بن گئی۔ آج سندھ اسی طرح اسلامی خطہ ہے جس طرح عراق اور مصر۔ ہم عربوں کی فتح سندھ کی عظمت، اس کی تاریخی اہمیت اور اس کے نتائج کے منکر نہیں ہو سکتے۔“ (ایضاً، ص ۴۰)

۵۔ ۹۸۶ء (چوتھی صدی ہجری) میں بکتیگیں غزنوی نے پٹور کے قریب جے پال کو شکست دے کر مٹان (جلال آباد) سے دریائے سندھ تک کے تمام علاقے کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ان لڑائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ برصغیر کی عسکری کمزوری مسلمانوں پر عیاں ہو گئی اور سندھ پار کے علاقے میں ایک طاقتور اسلامی حکومت قائم ہو گئی جو بعد ازاں پنجاب اور برصغیر کے دو سر حصوں پر چھا گئی۔ نیز برصغیر کی فتح کے دروازے کھل گئے۔

بکتیگیں کے عہد کا دوسرا اہم واقعہ افغان قوم کے معرض وجود میں آنے کا ہے۔ افغان پشاور اور غزنی کے درمیانی علاقہ کے باشندے تھے اور متعدد قبائل میں بٹے ہوئے تھے۔ بکتیگیں نے ان کا تعاون حاصل کرنے کے لئے ان سے دوستانہ مراسم استوار کئے اور وہ تمام علاقے جو ان کے قبضہ میں تھے ان کے سپرد کر دیے۔ نتیجتاً افغان قوم کی بنیاد پڑی۔ نیز یہ قبائل نہ صرف علاقہ بگوش اسلام ہوئے بلکہ سلاطین غزنوی کی افواج میں بھرتی بھی ہو گئے۔“ (ایضاً، ص ۶۴)

۶۔ بکتیگیں کے بعد سلطان محمود غزنوی (۹۹۷ء تا ۱۰۳۰ء) کا دور آتا ہے جس نے پہلا حملہ ۱۰۰۱ء میں برصغیر پر کر کے درہ خیبر کے نواحی علاقوں کی تسخیر کی۔ اس نے کل ۷ حملے برصغیر پر کئے تھے۔ آخری حملہ ۱۰۲۵ء میں کیا جس میں سومنات کو فتح کیا۔ اس دوران محمود غزنوی نے برصغیر کے جن علاقوں کو فتح کیا ان کے نام یہ ہیں:

درہ خیبر اور اس کے نواحی علاقے، مٹان دیہاں کا حکم شیخ حمید بوی سمان تھا، لیکن محمود غزنوی کی مخالف اور بھرہ

کے راجہ بجے رائے کا حلیف تھا، پنجاب، کانگڑہ، بنگرکوٹ، تھانیسر، سندھ، کشمیر، قنوج، کالجھر، گوالیار اور سومات۔

فتح سومات کے متعلق ابن اثیر، ابن خلدون اور فرشتہ کا بیان ہے کہ :

”جب محمود نے برصغیر پاک و ہند کے مختلف اہلجان کو شکست دی اور ہندوؤں کے متعدد مند اس کے ہاتھوں تاخت و تاراج ہوئے، تو ہندوؤں نے کہا شروع کر دیا کہ جن دیوتاؤں کے مند برباد ہوئے ہیں ان سے شوجی (سومات کا بڑا دیوتا) ناراض تھے۔ اگر محمود نے سومات پر حملہ کیا، تو منہ کی کھائے گا۔“ چنانچہ محمود نے ہندوؤں کے اس خیال کو باطل ثابت کرنے کے لئے اور پتھوں کی جھوٹی عظمت کو ختم کرنے کے لئے سومات پر حملہ آور ہونے کا عزم مصمم کیا۔ تاکہ لوگوں پر پتھوں کی بے بسی اور بے ثباتی واضح ہو جائے اور لوگ بت پرستی اور شرک کو ترک کر دیں۔ پھر جب سومات نے سومات کو بھی فتح کر لیا۔ تو اس فتح کی خبر نے عالم اسلام میں مسرت کی ہر دوڑا دی۔ اور خلیفہ بغداد نے خوش ہو کر سلطان محمود اس کے بیٹوں اور بھائی کو خطابت اور اعزازات سے نوازا۔ سومات کا بت تباہ و برباد ہو گیا، لیکن سلطان محمود کے نام کو شہرت و دوام حاصل ہو گئی۔“ (ایضاً ص ۱۱۸۶)

سلطان محمود غزنوی (۱۰۳۰ء) کے بعد اس کے جانشین مزید ڈیڑھ سو سال یعنی ۱۱۸۶ء تک ان علاقوں پر قابض رہے جن کے نام ہیں :

- ۱۔ سلطان مسعود (۱۰۳۰ء تا ۱۰۴۰ء) ۲۔ سلطان مودود (۱۰۴۲ء تا ۱۰۴۹ء)
- ۳۔ ابوالحسن علی (۱۰۴۹ء تا ۱۰۵۱ء) ۴۔ عزالدین عبدالرشید (۱۰۵۱ء تا ۱۰۵۲ء)
- ۵۔ فرخ زاد (۱۰۵۳ء تا ۱۰۵۹ء) ۶۔ ابراہیم (۱۰۵۹ء تا ۱۰۹۹ء)
- ۷۔ مسعود سوم (۱۰۹۹ء تا ۱۱۱۴ء) ۸۔ شیر زاد (۱۱۱۴ء تا ۱۱۱۵ء)
- ۹۔ ارسلان (۱۱۱۵ء تا ۱۱۱۷ء) ۱۰۔ بہرام شاہ (۱۱۱۷ء تا ۱۱۵۲ء)
- ۱۱۔ خسرو شاہ (۱۱۵۲ء تا ۱۱۶۰ء) ۱۲۔ خسرو ملک (۱۰۶۰ء تا ۱۱۸۶ء)

غزنی خاندان کے بعد خاندان غور ہند پر قابض ہوتا ہے۔ سلطان شہاب الدین محمد غوری نے سب سے پہلے حملہ ۱۱۷۵ء میں غزنی کو فتح کیا۔ جس پر غزنویوں کے بعد دوبارہ قرامطی برسرِ اقتدار آ گئے تھے۔ محمد غوری نے بھی ہندوستان کے بہت سے علاقوں کو فتح کیا۔ پھر غزنویوں کے بعد ہندوستان میں خاندان غلاماں خلجی، تغلق، سادات اور لودھی برسرِ اقتدار آئے پھر ۱۵۲۶ء میں بابر نے ہندوستان میں مغلیہ خاندان کی بنیاد رکھی اور یہ مغلیہ

خاندان ۱۸۵۷ء تک برصغیر پاک و ہند میں برسرِ اقتدار رہا۔

یہ وہ تاریخی حقائق ہیں جن سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۷۱ء یا ۱۲۹۳ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک کوئی وقت ایسا نہیں گزر ا جب کہ برصغیر کے کسی نہ کسی حصے پر مسلمانوں کی حکومت موجود نہ رہی ہو۔ اب صوفیاء کی طرف سے دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ پہلے صوفیاء ہندوستان گئے۔ انہوں نے وہاں اشاعتِ اسلام کا فریضہ انجام دیا اور مسلمان حکمرانوں کے حملہ اور فتح کے لئے زمین ہموار کرتے رہے۔ لیکن تاریخی حقائق کی روشنی میں صوفیاء کے اس مزعومہ دعوے کو کیوں کر باور کیا جاسکتا ہے جبکہ صوفی تو پیداوار ہی تیسری صدی ہجری کی ہیں اور پہلے صوفی جو ہندوستان تشریف لائے وہ اسماعیل بخاری ہیں جو ۱۲۹۵ھ میں محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان تشریف لاتے ہیں جبکہ مسلمان حکمرانوں کا ۱۲۷۱ء (۱۲۹۳ھ) سے لے کر ۱۸۵۷ء تک ایسا تسلسل قائم رہا ہے کہ اس میں ایک دن کا بھی انقطاع واقع نہیں ہوا۔

زیادہ سے زیادہ جو چیز باور کی جاسکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ محمود غزنوی چونکہ خود بھی صوفی منش اور صوفیاء کا قدردان تھا۔ اس لئے اس نے یہ تحریک پیدا کی کہ دوسرے علمائے دین کی طرح صوفیاء بھی اس سرزمین میں تشریف لائیں اور مفتوحہ علاقوں میں اشاعتِ اسلام کا فریضہ سرانجام دیں۔ چنانچہ پہلے صوفی، جن کا نام تذکروں میں ملتا ہے وہ اسماعیل بخاری ہیں جنہیں ۱۲۹۵ھ میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ حالانکہ وہ خود ۱۲۹۵ھ سے ہندوستان پر حملے کر رہا تھا۔

۱۔ صوفیائے کرام کی تعلیم کی خصوصیات

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ صوفیاء کی آمد سے پہلے برصغیر میں جو بھی اسلام پھیلا تھا وہ خالص اسلام تھا اور اس میں دینِ طریقت کی آمیزش نہ تھی اور ان میں سے زیادہ تر اہلِ الحدیث تھے۔ چنانچہ عرب کے مشہور سیاح علامہ شبزاری مقدسی ۳۷۵ھ میں ہندوستان تشریف لائے۔ وہ اپنی کتاب "حسن التقاسیم" میں صوبہ سندھ کے شہر منصوہ کے حال میں لکھتے ہیں کہ وکانوا اکثر من اهل الحديث یہاں کے مسلمانوں میں سے اکثر اہلِ الحدیث ہیں۔ (تاریخِ سندھ، ص ۱۲۲، ج ۲)

مگر جو اسلام صوفیاء کے ذریعہ پھیلا وہ درج ذیل خصوصیات کا حامل تھا۔

۱۔ کشف و کرامات

۱۔ اس اسلام کی اشاعت کا انحصار اسلامی تعلیمات پر نہیں بلکہ کرامات پر ہوتا تھا یعنی جو بزرگ زیادہ اور بڑی

کرامتیں دکھلا سکتا تھا۔ اس کی اشاعتِ اسلام کا دائرہ بھی اسی مناسبت سے وسیع ہوتا تھا۔ چنانچہ علیق نظامی صاحب اپنی کتاب ”تاریخ مشائخِ چشت“ میں گلزار ابرار کے حوالہ سے نظام الدین اولیاء کی کلمات اور ان کلمات کے ذیلے اشاعتِ اسلام کے سلسلہ میں یوں قیصر فرماتے ہیں کہ :

”آپ کی بارگاہِ خلافت سے وقتاً فوقتاً نئے نئے خلیفہ روانہ ہوتے تھے۔ ان کی فیض پاشی سے ہند کا ہر مکان اور ہر قطعہ زمین آباد تھا۔ آپ نے بڑے بڑے شہروں میں بڑے بڑے مرتبہ اور بڑی بڑی کرامتوں والے سات سو ایسے خلیفہ روانہ کئے تھے کہ ہر شخص کے سینہ سے عرفان کا آفتاب طلوع ہوا کرتا تھا۔ نیز ان سینوں سے بزرگوار پیر کے اسرار عیاں ہوتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ جب کسی شخص کو کسی بزرگ کی خدمت سے معرفت کا سرمایہ ہاتھ آجاتا ہے اور ایک منزل سے دوسری منزل کو اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور فنا کے درجات سے عبور کر کے بقائے اصلی کے مقام کو پہنچ جاتا ہے تو اس وقت نام اور صوت میں فرق کے سوا کسی قسم کی دوئی کی شکل ان دونوں شخصوں میں قائم نہیں رہتی۔“ (گلزار ابرار (دوم) ص ۸۳، ۸۵)

۲۔ قبوی شریعت اور شریکۂ افعال | شریعتِ اسلامیہ نے قبروں کو پختہ کرنا، ان پر مزارات تعمیر کرنا ناجائز قرار دیا تھا مگر صوفیاء کا کام ہی چونکہ کشفِ قبور اور مزارات پر چڑھ کر کیوں پر منحصر تھا۔ لہذا اس طرح کا اسلام یہاں بڑے صغیر میں رائج ہو گیا۔ پروفیسر سلیمان اظہر سیرت محمد بن عبد الوہاب کے مقدمہ میں اس صوتِ حال کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں :

”عوام عموماً ہندومت سے تائب ہو کر صوفیاء کے توسط سے مسلمان ہوئے تھے لیکن تبدیلیِ مذہب سے ان کی معاشرت میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہوا تھا۔ اگر وہ پہلے مندروں میں بتوں کے سامنے سجدہ تھے تو اب مقابلہ سجدہ گاہ بن گئے پہلے دیوتاؤں کے سامنے دستِ دعا راز کیا جاتا تھا، تو اب صوفیاء اور پیروں سے ملا دیں مانگی جانے لگیں۔ احکامِ اسلام کی پابندی اور اعمالِ حسنہ کی کوئی قیمت نہ تھی۔ روحانی مدارج ہشکریہ وظاہف، قبروں پر چڑھ کر کشتی اور مرشد کی توجہ کے محتاج ہو کر رہ گئے تھے۔“ (مقدمہ سیرت محمد بن عبد الوہاب، ص ۵)

پھر ان بزرگوں کی غیبِ ذاتی، حاجتِ روائی، مشکل کشائی اور تصرف فی الامور اور تصورِ شیخ جیسے مشرکانہ عقائد اس فہم عام ہوئے کہ کوئی ایسی بانوں کو شرک سمجھنا بھی نہ تھا۔ اس ظلمتِ کفر و شرک میں چند عالم صوفیاء مثلاً

لے شریعتِ اسلامیہ نے کسی دیوی کے پرلوں میں دموت بہا لانے اور کسی قبر پر چڑھ کاٹنے یا محکف ہونے دونوں کو شرک قرار دیا ہے۔ پھر صوفیاء کے بڑے صغیر کے سامان پر جس احسانِ عظیم کا تذکرہ جناب نور شید احمد گیلانی صاحب نے فرمایا ہے۔ اس کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ دہلوی نے بعض مشرکانہ افکار و نظریات پر کاری ضرب لگائی مگر چوں کہ ان کا دامن بھی طریقت میں الجھا ہوا تھا۔ اس لئے خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہو سکے۔

۳۔ غیر مسلموں کے ساتھ مخلوط معاشرت ان بزرگوں نے اعلیٰ خیال اللہ کی غلط تعبیر پیش کر کے ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں سب کو اپنی خالقانہ ہوں میں جمع کر لیا تھا

اور ایک ایسا مخلوط معاشرہ پیدا کیا جو اپنے خیالات، عقائد اور مذہب کے مختلف ہونے کے باوجود ان بزرگوں کو یکساں عزت و تحکیم کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اور یہی دین طریقت کا وہ عنصر ہے جو دین طریقت کو اسلام سے جدا کر دیتا ہے۔ خلیق نظامی صاحب اپنی کتاب تاریخ مشائخ چشت "میں اس حقیقت کو بولوں پیش کرتے ہیں :

”اگر تاریخ کے اشاروں پر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ سماجی نظام مشائخ چشت کی کوششوں کا مہم جو بن منت تھا۔ انہوں نے ان علاقوں میں بسنے والے مختلف الخیال اور مختلف المذہب لوگوں میں اتحاد و عمل اور اتحاد فکر پیدا کیا اور ان منتشر طبقوں کو ایک ایسے سماجی رنگ میں رنگ دیا جس نے ایک مضبوط معاشرہ کی شکل اختیار کر لی۔ ان بزرگوں کی خالقانہ ہوں میں ہندو اور مسلمان سب ہی جمع ہوتے تھے۔ ان مشائخ نے ان اختلافات کے پردوں کو ہٹا کر ان میں ہم دلی اور ہم زبان پیدا کی اور عمدہ سماجی ماحول پیدا کر دیا۔“

(تاریخ مشائخ چشت، خلیق نظامی، ص ۱۹۷)

نیر شیعوں کے ذمہ اسماعیلیہ کے ایک تذکرہ نگار اپنی تصنیف نور مبین میں رقمطراز ہیں کہ :-

”پیر صدر الدین ۸ - رجب ۸۱۹ھ نے ہندوستان واپس آکر امام حاضر اسلام شاہ کی زیارت کے بعد خود مختار راہ اسماعیلی مذہب کی دعوت کو نہایت زور سے کرنا شروع کیا۔ نتیجتاً تین شہروں میں بڑی جاتی قائم ہو گئیں۔ پنجاب جماعت کے کمپی سیٹم شام س لاہوری، کشمیر جماعت کے کمپی سیٹم تلسی واس اور سندھ جماعت کے کمپی ترکیم کو قائم کیا اور ضلع سندھ کے شہر کوٹری میں پیر صدر الدین کی حاضری میں پہلا جماعت خانہ تعمیر ہوا۔ اور مال و اجابات حضرت امام زمانہ کے حق کو تمام جاغظوں سے وصول کر کے پیر صدر الدین نے ایران میں امام کی خدمت میں مریدوں کے ذریعہ بھجوا دیا۔ پیر صدر الدین ہندوستان کے اولیاء اللہ میں سید صدر الدین الحسینی کے نام سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے بارہ قبائل کے آدمیوں کو فہمائش کر کے امام زمانہ کا انعقاد

کرایا تھا۔ اس لیے انہیں باؤگرمی کہتے ہیں۔ ہندو کے قدیم وید شاستر کی انہیں خوب واقفیت تھی۔ اس لیے پیر صدر الدین، پرنسپل اور سوہیو یعنی بڑے درویش کے نام سے بھی مشہور ہیں (نومبر ۱۹۸۸ء - ۱۹۸۸ء مطبوعہ اکامیلڈ ایسوسی ایشن برہنہ ممبئی)۔
 مندرجہ بالا اقتباس بار بار پڑھیے اور دیکھئے کہ ہمارے اولیاء اللہ اور پیر جو ہندوؤں کو مسلمان بناتے تھے۔ تو وہ کس قسم کا اسلام ہوتا تھا مسجد کے بجائے جماعت خانے بنائے جاتے تھے۔ جن میں ایسے نو مسلم اکٹھے ہوتے تھے۔ جہاں بالادستی ہندوؤں کی ہی ہوتی تھی۔ یکسی دراصل جماعت خانے کا بڑا منتظم ہوتا ہے جو پنجاب کی جماعت کا بھی ہندو تھا اور کشمیر کی جماعت کا بھی، اور غالباً سندھ کا یکسی بھی ہندو ہی تھا۔ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بہتر نہ ہوگا کہ ہمارے اولیاء اللہ اور پیر ہندوؤں کو مسلمان نہیں بناتے تھے۔ بلکہ خود ہی ہندو بن جاتے تھے جیسا کہ صدر الدین، پرنسپل چندریا سوہیو اور بڑا درویش کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ -

بیر صغیر میں مندرجہ بالا اوصاف سے متصف طرز کی اشاعت اسلام کرنے والے مندرجہ ذیل صوفیاء کے نام قابل ذکر ہیں:

- ۱۔ معین الدین چشتی بخاری اجمیری (م ۶۳۳ھ) - ۲۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (م ۶۳۴ھ)
- ۳۔ مخدوم ملاؤ الدین صابری (م ۶۹۰ھ) - ۴۔ بابا فرید گنج شکر (م ۶۹۴ھ)
- ۵۔ نصیر الدین محمود چرخ دہلوی (م ۷۵۷ھ) - ۶۔ شیخ نظام الدین اولیاء (م ۷۲۵ھ)
- ۷۔ بہاؤ الدین زکریا ملتانی (م ۶۶۷ھ) - ۸۔ سید محمد گیسو دراز (م ۸۲۵ھ)
- ۹۔ شیخ زکریا الدین الباقی ملتانی (م ۷۳۵ھ) - ۱۰۔ شیخ صدق الدین عارف (م ۶۸۴ھ)
- ۱۱۔ شیخ جلال الدین تبریزی (م ۶۶۲ھ) - ۱۲۔ مخدوم جہانیاں چہل گشت (م ۷۸۵ھ)
- ۱۳۔ بوعلی قلندر (م ۷۲۲ھ) - ۱۴۔ سید محمد غوث گیلانی قادری (م ۹۲۳ھ)
- ۱۵۔ پیر صدر الدین (م ۸۱۹ھ) - ۱۶۔ لال شہباز قلندر

۱۷۔ مٹھوپیر المعروف مگرچھ پیر (ہندو انہیں لالہ بے راج کے نام سے مانتے تھے)۔

چونکہ یہ بزرگ صوفیاء موجودہ حکومت کے وفادار ہوتے تھے اور کسی بھی غیر شرعی حکومت کے خلاف علم چاہے بلند کرنا ان کی تعلیمات سے خارج تھا۔ لہذا یہ گروہ صوفیاء سلاطین وقت کا ہمیشہ سے منظور نظر رہا ہے۔ سلاطین وقت ان کا اسی وجہ سے احترام کرتے، ان کے آستانوں اور مزاروں پر حاضر ہوتے اور ان کی خانقاہوں کے لیے جاگیریں وقف کر دیا کرتے تھے۔ تاکہ یہ حضرات ان کی حکومتوں کو مضبوط و مستحکم بنانے کے سلسلہ میں موثر کردار

ادا کرتے رہیں اور قوم کو کسی طرح کے اشتغال میں مصروف و منہمک رکھیں تاکہ سیاسی صورتحال میں مداخلت کی طرف انہیں بھولے سے خیال بھی نہ آ سکے۔ مزارات اور خانقاہوں کے ساتھ جاگیروں کا الحاق آج بھی اس حقیقت کا زندہ ثبوت مہیا کر رہا ہے۔

ابتداء میں کچھ صوفیاء ایسے بھی تھے جو سرکاری درباروں میں آمد و رفت کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ البتہ ان کے عطا کردہ وظائف اور جاگیریں قبول فرمایا کرتے تھے مگر بعد میں آنے والے بزرگوں نے بیریت بھی ختم کر دی اور سرکاری درباروں سے باقاعدہ مراسم بھی شروع کر دیے۔

۱۱۔ صوفیاء کی تعلیم و تربیت کا ردِ عمل (بھگتی تحریک)

اب ہندوؤں نے یہ سوچا کہ اگر مسلمان فقیر اور بزرگ اپنی خانقاہوں میں ہندوؤں کو رکھ سکتے ہیں تو آخر ہم اپنے تیرتھوں میں مسلمانوں کو کیوں نہیں رکھ سکتے۔ پھر چند باتیں ایسی بھی تھیں جو ان سب مذاہب میں مشترک تھیں، مثلاً:

۱۔ اگر مسلمان صوفیاء اتحاد و حلول کے قائل تھے تو ہندو رشی منی، سادھو، سنت بھی اس اتحاد و حلول کے قائل تھے۔

۲۔ اگر مسلمان فلی کلمات دکھلا سکتے تھے تو اس طرح کی کلمات جو گیوں اور رشیوں میں موجود تھیں۔

۳۔ ہندو اپنے دیوی دیوتاؤں کی (جو ان کے بزرگوں کے جمنے ہوتے تھے) حیاتِ جاودانی تسلیم کرتے تھے۔ جبکہ مسلمان اپنے فوت شدہ بزرگوں کی حیاتِ جاودانی کے قائل تھے اور جہاں تک حاجتِ روائی اور مشکل کشائی کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں بھی دونوں یکساں تھے۔ ہندو اپنے دیوی دیوتاؤں کے سامنے نذر و نیاز پیش کرتے اور مرادیں مانگتے تھے، تو مسلمان بھی یہی کام اپنے بزرگوں کی قبروں اور آستانوں سے لے لیا کرتے تھے۔ اس طرح غیرتہ سے حاجتِ روائی اور مشکل کشائی پر بھی دونوں کا اتحاد ہو جاتا ہے اور مسلمان بزرگوں نے انہیں یہ سمجھا دیا تھا کہ اگر نذر و نیاز اور مرادیں دیوی دیوتاؤں کے سامنے پیش کی جائیں تو یہ عین شرک ہے مگر وہی کام اگر قبروں پر سربام دے لے جائیں تو اس سے توحیدِ الہی میں چنداں خلل نہیں پڑتا۔

البتہ ایک بات مابہ انزاع ضرور تھی اور وہ تھی ذات پات کی تیسر۔ جس کا اسلام میں کوئی تصور نہ تھا اور فی الحقیقت فرد متہند و طبقہ کو اسلام کی طرف مائل کرنے والی یہی چیز تھی۔

اب ہندوؤں نے یہ سوچا کہ اگر ہم ذات پات کی تیسر کو ختم کر دیں تو ہم مسلمان صوفیاء کی اس اشاعت اسلام کا سبب باب کر سکتے ہیں۔ رہی صوفیاء کی توحید الہی تو ایسی توحید جس میں صرف یہ فرق ہو تو ہوں، دیوی دیوتاؤں کے بجائے قبروں کے بزرگوں کو حاجت واد اور مشکل کشا سمجھا جائے تو ایسی توحید انہیں بھی گوارا تھی۔ چنانچہ ہندوؤں کے کچھ پیروں فقیروں نے کمر ہمت باندھی اور بھگتی تحریک کے نام سے اس مشن کا آغاز کیا گیا۔ چند ایک ایسے ہندو اولیاء کا مختصر تذکرہ درج ذیل ہے:

۱۔ رامنچ | یہ بھگتی تحریک کے بانی ہیں ۱۶۷۷ء عیسوی میں مدراس کے ایک نواحی گاؤں میں ایک برہمن کے گھر پیدا ہوئے (یاد ہے کہ پہلے بزرگ صوفی شیخ اسماعیل بخاری ۱۰۵۵ء میں برصغیر میں وارد ہوئے تھے) وہ وحدانیت کے حامی تھے۔ آپ کے نزدیک برہما اور ایشور ایک ہی ہے اور وہی رُوح اعظم ہے اس کی ذات و صفات میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ ہر فعل سے متبرک ہے۔ اسی سے رُوح اور مادہ نکلتے ہیں۔ رُوح خدا کو صرف بھگتی ریاضت شاد سے حاصل کر سکتی ہے۔ پہلی منزل ادا نے فرض ہے، دوسری منزل ریاضت ہے اور تیسری بھگتی۔ یعنی اپنے شریعت و طریقت دونوں کی پابندی کو اصلی عبادت اور باعث نجات قرار دیا اگرچہ آپ ذاتوں کی تقسیم کے قائل تھے، لیکن آپ نے شوروں اور جنڈالوں کے حق عبادت کو تسلیم کیا۔

۲۔ سوامی رامنند | ۱۶۹۹ء میں الہ آباد میں ایک برہمن کے ہاں پیدا ہوئے۔ رامنچ کے پانچویں خلیفہ تھے۔ انہوں نے اپنے گرو (روحانی پیشوا) کے بعد گلا قدم یہ اٹھایا کہ ذات پات کی بھی سخت مخالفت کی اور زبان سنسکرت کو بھی ترک کر کے عام زبان میں وعظ کرتے۔ ہر ذات کے لوگ ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے۔ انہوں نے تمام تیرنھوں کا سفر کیا۔ رامنند اور سیتاجی کو شنو کا منظر (اوتار) قرار دے کر ان کی پوجا کو رواج دیا۔ ان کے ۱۲ چیلے (مخلفاء) بڑے مشہور ہیں۔

۳۔ سوامی ولجھ اجاریہ | وکن کے ایک برہمن کے ہاں ۱۴۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ کم عمری میں ہی علم و فضل میں کمال حاصل کیا۔ کرشن جی کو شنو کا اوتار قرار دیتے تھے۔ ولجھ اجاریہ نے ریاضت

نفس کشی اور ترک دنیا کی تعلیم دی۔ وہ بھگتی (مجاہدہ و ریاضت) کو دولت کے جال سے نکلنے کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک کرشن اور رادھا کی محبت میں شریک ہونا دائمی مسرت اور بھگتی کا آخری مقصد تھا۔

۴۔ سوامی جے نیتہ

بنگال کے ایک برہمن کے ہاں ۱۴۸۵ء میں پیدا ہوئے ۲۵ برس کی عمر میں تارک الدنیا ہو کر سنیا سی بن گئے۔ بھگتی کے مشہور چارک تھے۔ مک بھر میں دورہ کر کے پریم اور شانتی کا پرچار کرنے لگے۔ ان میں بلا کی کش و جاذبیت تھی۔ ان کی تعلیم بھی کہ کرشن ہر آتما میں موجود ہے۔ اس لئے ہر ذی رُوح سے محبت کرو۔ وہ ذات پات کی تمیز کے قائل نہیں تھے۔ اچھوتوں اور جندالوں کو گلے لگا لیا کرتے تھے۔ آج تک لاکھوں ہندو انہیں سری کرشن کا اوتار (مظہر) مانتے ہیں۔

۵۔ بھگت کبیر

۱۴۲۰ء میں ایک برہمن بھوکھاں پیدا ہوئے جو انہیں بنارس کے ایک تالاب کے کنارے چھوڑ گئی۔ وہاں سے زونامی ایک جولاہا اٹھا کر اپنے گھر لے آیا۔ نیرد اور اس کی بیوی نے انہیں اپنا متبلی بنالیا اس طرح بھگت کبیر نے ایک مسلم گھرانے میں پرورش پائی۔ وہ راماند کے چیلوں میں سب زیادہ ممتاز تھے۔ تذکرہ اولیائے ہند میں ان کا نام شیخ کبیر مرقوم ہے۔ انہوں نے اسلامی تصوف کے خیالات بھیکچشتی اور شیخ تفتی سہروردی اور ہندو ویدانت کے خیالات راماند سے سیکھے اور دونوں قوموں کو متحد کرنے کی کوشش کی۔ وہ وحدانیت کے علمبردار اور بت پرستی کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے ذات پات کی تمیز اور چھوت چھات کو گمراہ کن قرار دیا اور عرفان یا معرفت الہی پر اُمت زور دیا۔ ان کی پاکیزہ تعلیم کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے لوگ ان کے مرید تھے۔ ہندو انہیں کبیر پن্থی اور مسلمان انہیں شیخ کبیر کہتے تھے۔ اسرار معرفت اور حقائق زندگی سے محو ان کے سادہ اور دلاویز دوہے آج بھی برصغیر کی ادبی میراث کا ایک انمول حصہ ہیں۔

۶۔ بابا گورو نانک

۱۴۶۹ء میں ضلع شیخوپورہ کے ایک قصبہ تونڈی (ننکانہ صاحب) میں پیدا ہوئے۔ ۲۰ سال کی عمر میں تارک الدنیا ہو کر دُور دُور کے ممالک کی سیاحت اور وہاں کے تیرتھوں، خانقاہوں اور مقدس مقامات پر جا کر سادھوؤں، سنتوں، یوں کی صحبت سے استفادہ کیا۔ پھر اپنے مسلک کی تبلیغ شروع کر دی اور بھگت کبیر کے انداز پر نہ صرف ذات پات بلکہ اختلاف مذاہب کی بھی مخالفت کی۔ آپ کے خیالات پر سلام کا گہرا اثر تھا۔ انہوں نے اپنی تصانیف میں مسلمانوں کی مذہبی تہذیب اور تصوفانہ خیالات سے بہت استفادہ کیا۔ چنانچہ آپ کے خیالات میں اسلامی تصوف کا رنگ نمایاں ہے۔ ان کی وسیع الشرب تعلیمات نے آگے چل کر سکھ کی شکل اختیار کر لی۔ اگرچہ مسلم حکومت سے سکھوں کا تصادم بھی ہوا لیکن سکھ آج تک توحید پرستی کے قائل بت پرستی کے دشمن ہیں۔ ان کی عبادت و ریاضت اور ادب و وظائف کے طریقے بڑی حد تک مسلمانوں سے

مختے جلتے ہیں۔ آپؐ ۱۹۳۸ء میں کرتار پور کے مقام پر وفات پائی۔

مندرجہ بالا اقتباسات میں ہم نے ایک لفظ بھی اپنی طرف سے اضافہ نہیں کیا البتہ اختصار ضرور کیا ہے اور یہ سب اقتباسات تائیدِ پاک و ہند مصنفہ عبداللہ ملک سے لئے گئے ہیں۔ اب آپ خود ہی ملاحظہ فرمائیے کہ مسلمان صوفیوں اور ہندو سادھوؤں اور سنتوں کے طریقِ تعلیم و تربیت میں کس قدر یکسانیت تھی وہی ترک دنیا، وہی ریاضت و مجاہدات، وہی اتحاد و حلول کے عقیدے، وہی اسرارِ معرفت اور عرفانِ الہی کے سبق، ایک ہی قسم کے اوراد و وظائف کے طوطی، خانقاہوں اور تیرتھوں میں یکساں طریقِ تربیت۔ اگرچہ فرق ہے تو ناموں کا۔ اسی حقیقت کو کسی مسلمان صوفی شاعر نے یوں بیان کیا کہ

ملت عشق از ہمہ ملت جداست عاشقان را مذہب و ملت خداست
اور عبد الغفور عرشِ حب اپنی کتاب ریاض السالکین کے صفحہ ۲۵۶ پر لکھتے ہیں:

ہو گیا میں ہری محمدؐ سے نہ خیالِ ثوابِ عذابِ نہ تو مسلم نہ ہی کافر رہا، سوا عشق کے میرا ایمان نہ رہا
اور کسی دریدہ دہن شاعر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ :

در مذہب عاشقان یک رنگ ایلیس و محمد ہست ہم سنگ

یعنی عاشقوں کے مذہب میں ایلیس لعین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم سنگ و ہم وزن ہیں۔ نفوذِ باللہ من

ذٰلک الخرافات۔ (تذکرہ غوثیہ، ص ۲۵۵ بحوالہ رضا خانی مذہب، ص ۹۲)

پھر یہ بھی دیکھ لیجئے کہ مندرجہ بالا امور میں سے کوئی بات بھی تعلیماتِ اسلامیہ سے مطابقت نہیں رکھتی

اور ایسا ہی اسلام ہمارے صوفیائے کرام نے برصغیرِ پاک و ہند — اور اسی طرح بعض دوسرے ممالک — میں پھیلا یا تھا۔ گو آج کا مسلمان ان حقائق سے کسی حد تک آگاہ ہو چکا ہے اور سہری مریدی کے سوا پہلا سادہ غم نہیں رہا۔ اور بعض حقیقت پسند صوفیہ نے ایسے باطل عقائد پر کڑی تنقید بھی کی ہے۔ تاہم خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ابھی ایسے باطل افکار و نظریات اور عقائد و اعمال کو مٹانے میں ابھی مزید کتنی مدت درکار ہوگی۔

معجزات، کرامات اور استدراج

معجزہ کی غرض اور اقام | معجزہ اور کرامت میں فرق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اگر کسی خرق عادت بات کا ظہور کسی نبی کی ذات سے ہو تو وہ معجزہ ہے اور اگر کوئی ایسی بات یا واقعہ کسی ولی سے صادر ہو تو وہ کرامت ہے۔ لہذا کرامت کا صحیح مفہوم متعین کرنے سے پہلے معجزہ اس کی حقیقت اور اقام کو سمجھنا ضروری ہے۔ معجزہ کی بڑی اقام دو ہیں جو درج ذیل ہیں :

۱۔ ایسا معجزہ جو کسی نبی کو اس کی نبوت کی دلیل کے طور پر عطا کیا جاتا ہے۔ پھر اس کی بھی دو ذیلی اقام ہیں :

۱۔ ایسے معجزات جن کی حیثیت کسی حد تک دائمی ہوتی ہے اور نبی کو جب ضرورت پیش آتی ہے وہ ایسا معجزہ دکھا سکتا ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایسے دو معجزے عطا ہوئے تھے۔ (۱) لاٹھی کا سانپ بن جانا اور (۲) ید بیضا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام ہوا اور جنات پر حکومت کرتے تھے۔ نیز پرندوں کی بولی سن اور سمجھ سکتے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں میں لوہا موم کی طرح نرم ہو جاتا تھا۔ حضرت یسے علیہ السلام مردوں کو زندہ کیا کرتے تھے۔

انبیاء علیہم السلام کو اپنی نبوت کا دعویٰ پیش کرنا فرض ہوتا ہے۔ لیکن اولیاء اللہ کو اپنی ولایت کا دعویٰ تو دور کی بات ہے۔ اس کا پھپھا بہتر ہوتا ہے۔ لہذا اولیاء اللہ کو اس دائمی قسم کی کرامات کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔

اب، ایسے معجزات جو ہونے تو نبوت کی دلیل کے طور پر ہیں، لیکن ان کی حیثیت عارضی اور وقتی ہوتی ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آگ کا گلزار بن جانا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پتھر پر لاٹھی مارنا اور چٹھوں کا

پھوٹ نکھنا یا سمندر پر لالچی مارنا اور درمیان میں خشک راستہ بن جانا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور وفات، رسول اللہ ﷺ کے واقعہ معراج اور انشاقی قمر وغیرہ اسی قبیل سے ہیں۔ بنی کو ایسے واقعات کا نہ پہلے سے علم ہوتا ہے، نہ اُن کے متعلق کوئی دعویٰ کر سکتا ہے۔

ج۔ ایسے معجزات جن کا خود کفار کی طرف سے مطالبہ کیا جاتا ہے۔ ایسے معجزات کبھی تو اللہ تعالیٰ عطا کر دیتے ہیں۔ جیسے حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے مطالبہ پر پہاڑ میں سے حاملہ اونٹنی برآمد ہوئی اور کبھی یہ مطالبہ اللہ تعالیٰ منظور نہیں فرماتے۔ جیسے کفارِ مکہ نے رسول اللہ ﷺ سے مطالبہ کیا کہ آپ کے لئے یا تو سونے کا گھر ہو یا عمدہ قیم کا باغ ہو یا ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ کر کتاب لاؤ، وغیرہ۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ مطالبات تسلیم نہیں کئے اور نہ ہی حضور ﷺ کو یہ معجزات عطا فرمائے۔ اس قسم کے معجزات میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ اگر کفار کے مطالبہ پر کسی نبی کو کوئی ایسا معجزہ دیا جائے اور وہ پھر بھی ایمان نہ لائیں، تو اُن پر عذاب الیم نازل ہوتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے آپ کو اس قسم کے معجزات عطا نہیں کئے گئے اور اس طرح کی کلمات کی اولیاء اللہ کو بھی ضرورت نہیں ہوتی۔

۲۔ ایسے معجزات جو کسی اہم دینی یا دنیوی غرض کو پورا کرنے کے لئے عطا کئے جاتے ہیں۔ اور اس قسم کے بکثرت معجزات رسول اللہ ﷺ کو عطا کئے گئے تھے۔ مثلاً جنگِ بدر میں آپ کا مٹھی بھر بیت کفار کی طرف پھینکا۔ جس کو اللہ نے کفار کی آنکھوں تک پہنچا دیا اور وہ اندھے ہو گئے اور بالآخر شکست کھائی یا مثلاً دورانِ جہاد شکرِ اسلامی سخت پیاسا ہو گیا۔ اور پانی کے آثار کہیں نظر نہ آئے۔ تو آپ نے پانی کے پیالہ میں اپنا دستِ مبارک ڈالا تو انگلیوں سے پانی کے سوتے پھوٹنے لگے۔ اور اس پیالہ سے سارا اسلامی لشکر سیراب ہو گیا۔ پھر بھی پانی ختم ہونے کو نہ آتا تھا یا جیسا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لئے چشمہ زمزم اور حضرت مریم علیہا السلام کے لئے ایک چھوٹی سی نہر جاری ہو گئی تھی، رسول اللہ ﷺ کے دور کا دوسرا واقعہ بھی دورانِ جہاد اور پیاس سے متعلق ہے۔ آپ نے ایک خشک اور دُہلی سی بکری پر ہاتھ پھیر کر اتنا دودھ دیا کہ اس سے آپ اور آپ کے سب صحابہ سیراب ہو گئے۔ جنگِ خندق کے دوران جب حضور اکرم ﷺ اور باقی تمام صحابہ بھی شہوت کرتے تھے اور کھانے کو کچھ نہ ملتا تھا اور سب بھوک سے نہ حال اور پیٹوں پر پتھر باندھے ہوئے تھے، تو اس دوران کسی صحابی نے صرف آپ کی دعوت کی۔ تو آپ نے چولہے پر رکھی ہنڈیا اور اٹا گوندتے وقت آگے میں اپنا لعابِ مبارک شامل کر دیا جس سے اتنی برکت ہو گئی کہ تمام مجاہدین نے سیر ہو کر کھانا

کھالیا۔ اس قسم کے واقعات اللہ کی طرف سے ہوتے اور برکت سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلے کسی نہ کسی صورت میں ٹھوسی بہت چیز موجود ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ضرورت کے مطابق اس میں نبی کی دعا سے برکت ڈال دیتے ہیں۔ آپ کے بیشتر معجزات اسی قبیل سے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس نعمت کو خوب سمجھتے تھے۔ غزوہ تبوک کے دوران جب صحابہ کی رسد ختم ہونے لگی، تو آپ نے رسول اللہ ﷺ سے فرمایا:

يَا رَسُولَ اللَّهِ اَدْعُهُمْ بِفَضْلِ اَزْوَاجِهِمْ ثُمَّ ادْعُ اللَّهُ لَهُمْ عَلَيْهَا بِالْبَرَكَةِ فَقَالَ نَعَمْ. فَدَعَا بِخَلِيعِ قَبِصَاطٍ ثُمَّ دَعَا بِفَضْلِ اَزْوَاجِهِمْ. فَعَلَّ الرَّجُلُ يَجِيْءُ بِكَفٍّ ذَرَّةٍ وَيَجِيْءُ الْاٰخَرُ بِكَفٍّ تَمْرٍ وَيَجِيْءُ الْاٰخَرُ بِكَرَّةٍ حَتَّى اجْتَمَعَ عَلَى النَّطْعِ شَيْءٌ يَسِيْرٌ. فَدَعَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْبَرَكَةِ فَقَالَ: اخْذُوا فِيْ اَوْعِيَتِكُمْ فَاخْذُوا فِيْ اَوْعِيَتِهِمْ حَتَّى مَا تَرْكُوْا فِي السَّنَكِرِ وَعَاءٌ اِلَّا مَلُوْهُ قَالَ: فَآكَلُوْا حَتَّى شَبِعُوْا وَفَضَلَتْ فَضْلَةً وَبَدَتْ بَيِّنَاتٌ بِالْاٰثَرِ.....

اے اللہ کے رسول! لوگوں سے کہئے کہ بچا کمپاداشن لائیں۔ پھر اس پر آپ برکت کی دعا فرمائیے۔ آپ نے فرمایا: ٹھیک ہے۔ آپ نے ایک چمڑے کا دسترخوان منگوایا۔ جو چھلادیا گیا۔ پھر لوگوں کو بچا کمپاداشن لالے کو کہا تو کوئی ٹھکی چنے لاتا، کوئی ٹھکی بھر کھڑا اور کوئی دلی کے ٹکڑے۔ حتیٰ کہ دسترخوان پر جو سامان جمع ہوا وہ قھوڑا ہی تھا۔ پھر آپ نے اس پر برکت کی دعا فرمائی۔ پھر فرمایا: اپنے اپنے برتن بھر کر لیتے جاؤ۔ لوگ برتن بھر بھر کر لے جانے لگے۔ حتیٰ کہ شکر میں کوئی ایسا برتن نہ رہا جس کو بھرنا نہ گیا ہو۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی کہتے ہیں کہ پھر سارے شکر نے سیر ہو کر کھایا مگر پھر بھی خوراک بچ رہی۔

یابھر ایسے معجزات ملتے ہیں مثلاً، ہجرت کے وقت سمرقہ کا گھوڑا ادھنس گیا۔ غارِ ثور کے منہ پر میٹھی نے جال اتن دیا۔ رکانہ پہلوان نے آپ کو کشتی کی دعوت دی، تو آپ نے اسے نین بات بچھاڑ دیا۔ یہ سب واقعات و معجزات کوئی نہ کوئی غرض پوری کر رہے ہیں پیغمبر کو پہلے سے اس قسم کے معجزات کے صدور کا کچھ علم نہیں ہوتا۔ اور معجزات یا غرقِ عادت امور کی یہی قسم ہے جس کا صدور اولیاء سے ممکن ہے اور یہ کرامت کہلاتی ہے۔

کرامت کا مفہوم | کرامت کے لفظی معنی ”بزرگی“ ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ کبھی کبھار کسی بزرگ سے ایسا واقعہ صادر ہو جائے جو عام حالات میں ناممکن ہو۔ مثلاً ایک پہلوان ہے۔ جو پانچ من وزن اٹھا سکتا ہے وہ اگر کسی وقت پانچ من کا وزن اٹھالے تو یہ اس کی کرامت

نہیں۔ البتہ ایک ایسا شخص جو صرف ایک من بوجھ اٹھانے کی قوت رکھتا ہے اگر وہ کسی وقت اللہ کی مہربانی سے کسی معرکہ، مقابلہ یا ضرورت کے وقت پانچ من کا بوجھ اٹھائے تو یہ کرامت ہوگی۔ حضور اکرم ﷺ نے رکانہ پہوان کو تین بار مقابلہ میں پکھاڑ دیا۔ یا جگب خندق کے موقع پر ایک ایسے پتھر کو ٹوڑ دیا جسے کئی صحابہ مل کر بھی نہ ٹوڑ سکے، تو یہ معجزہ تھا۔ اور اگر یہی واقعہ کسی دوسرے بزرگ سے واقع ہو تو کرامت کہیں گے۔

انہی واقعات سے مسند علم غیب اور تصرف فی الامور کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ سب باتیں کسی نبی یا ولی کی ذات کا خاصہ ہرگز نہیں۔ اللہ اگر چاہے تو کسی خاص موقع پر نبی کو وحی کے ذریعہ اور ولی کو الہام کے ذریعہ مطلع کر دے تو یہ اس کی مہربانی ہے۔ نہ کہے تو بھی اس کی مرضی ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو مطلع کر دیا کہ ایک عورت عاتب بن ابی بلتہ کا رقبہ لے کر مکہ کو جا رہی ہے۔ مگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے افک کے موقع پر آپ پوئے ایک ماہ پریشان رہے اور وحی نہ ہوئی حضرت یعقوب کو مصر سے روانہ ہونے والے کی خوشبو تو آگئی۔ مگر کنگان ہی کے ایک کنویں میں پڑے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام کی جدائی میں ہلکان ہوئے اور اس کا علم اللہ تعالیٰ نے نہیں دیا۔ تو ایسے واقعات کبھی کبھار پیش آتے ہیں روزانہ معمول کی بات نہیں ہوتی۔ چنانچہ پورے دور صحابہ کرام ایسی کرامات کی دس بارہ سے زیادہ مثالیں نہیں ملتیں۔ اب دیکھتے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ چوبیس ہزار کے لگ بھگ تھی، جو وہاں موجود تھے اور وفات نبویؐ کے وقت صحابہ کی کل تعداد چار لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ پھر یہ دور صحابہ

بھی پوری ایک صدی یعنی ۱۰۰ سال تک پھیلا ہوا ہے مگر ایسے واقعات صرف دس بارہ ہیں۔ پھر ان میں سے بھی بعض کی صحت محل نظر ہے۔ صحاح ستہ میں صحابہ کی کرامات علیحدہ عنوان کے تحت مذکور نہیں خطیب بغدادی نے آٹھویں صدی میں مشکوٰۃ المصابیح کو مرتب کیا، تو اس میں علیحدہ باب الکرامات کا اندراج کیا۔ یہ کل بارہ واقعات ہیں جو حدیث کی درجہ اول، دوم، سوم، چہارم سب قسم کی کتابوں سے اکٹھے کیئے گئے ہیں۔ واضح رہے کہ اول درجہ کی کتب بخاری اور مسلم ہیں۔ دوم درجہ کی باقی صحاح ستہ کی چار کتابیں۔ باقی کتب احادیث کی دلیلیات علی قدر مراتب سوم اور چہارم درجہ کی شمار ہوتی ہیں۔ درجہ سوم اور چہارم کی بیشتر احادیث ناقابل اعتماد و احتجاج ہیں۔ اب جو بارہ واقعات مشکوٰۃ میں درج ہیں۔ ہم انہیں انہی درجات کی ترتیب سے یہاں پیش کر رہے ہیں۔

کراماتِ صحابہ

اول درجہ کی کتب سے

(۱) عبدالرحمن بن ابوبکر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ اصحابِ صفہ فقیر لوگ تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس دو شخصوں کا طعم ہو وہ میرے

کو بھی لے جائے اور جس کے پاس چار آدمیوں کا کھانا ہو وہ پانچویں بلکہ چھٹے کو بھی لے جائے۔ سو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تو تین شخصوں کو لائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس شخصوں کو لے گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رات کا کھانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں کھایا۔ پھر عشاء کی نماز آپ کے ساتھ پڑھی۔ نماز کے بعد پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا کھایا۔ پھر کافی رات گئے گھر آئے تو بیوی نے کہا مہانوں کا پتہ نہیں۔ آپ نے پوچھا ”انہوں نے ابھی کھانا نہیں کھایا۔“ بیوی نے کہا ”وہ کہتے تھے جب تک آپ نہ آئیں گے ہم کھانا نہ کھائیں گے۔“ اس بات سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رنجیدہ ہو گئے اور کہا کہ میں تو کبھی کھانا نہ کھاؤں گا۔ پھر بیوی نے بھی اور اسی طرح مہانوں نے بھی کھانا نہ کھانے کی قسم اٹھائی۔ تب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کہنے لگے یہ تو شیطان کا کام ہے۔ آپ نے کھانا منگا کر کھانا شروع کیا اور مہانوں نے بھی کھایا۔ ہوتا یہ تھا کہ جتنا کھانا وہ کھاتے اُس سے زیادہ پیچھے سے اُبھر آتا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی سے کہا ”اے خوفِ رس کی بہن! یہ کیا؟“ بیوی کہنے لگی۔ ”میری آنکھوں کی ٹھنڈک! یہ کھانا پہلے سے تین گنا زیادہ ہو گیا ہے۔“ پس ان سب نے کھانا کھایا۔ پھر اس میں سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بیجا۔ روایت کیا گیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کھانے میں سے کھایا۔

اس باب مندرج ۱۲ روایات ہیں سے سب معتبر روایت یہی ہے جو کھانے میں برکت سے تعلق رکھتی ہے۔ کیونکہ یہ روایت بخاری و مسلم دونوں نے روایت کی ہے۔ اب یہ برکت مہانوں کی وجہ سے تھی۔ یا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وجہ سے یا آپ کی بیوی کی وجہ سے یا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی وجہ سے؟ یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اس کرامت کو کسی خاص ایک شخص سے منسوب کرنا بھی مشکل ہے اور قرین قیاس بات یہ ہے کہ یہ برکت ہر ایک کے خلوص کی وجہ سے اجتماعی شکل میں صادر ہوتی تھی۔

۲۔ عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک عورت ازوی بنت اوس نے سعید بن زید بن عمرو بن نوفل

سے جھگڑا کیا اور مروان بن حکم (گورز زمینہ) کے پاس دعوے کر دیا کہ سعید نے میری زمین کے کچھ حصہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ سعید بن زید کہنے لگے: "میں کیسے قبضہ کر سکتا ہوں جبکہ میں نے اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے۔" مروان نے کہا: "آپ نے رسول اللہ ﷺ سے کیا سنا ہے؟" حضرت سعید رضی اللہ عنہ کہنے لگے: "میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ 'جو شخص نے ازراہ ظلم کسی کی ایک بالشت زمین پر قبضہ کر لیا، تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سات زمینوں تک اس کے گلے کا طوق بنا دے گا۔' مروان کہنے لگا: 'میں اب یہ سننے کے بعد تجھ سے ثبوت کا مطالبہ نہیں کرتا۔' حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کہنے لگے: 'یا اللہ! اگر یہ عورت جھوٹی ہے تو اس کی بیانی کو اندھا کر اور اس کی زمین میں اسے موت دے۔' حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ (راوی) کہتے ہیں کہ وہ عورت فی الواقع اندھی ہو گئی۔ ایک دن جب وہ اپنی زمین میں چل رہی تھی تو ایک گٹھے میں گر کر مر گئی (متفق علیہ) اور سلم بن محمد بن زید بن عبد اللہ بن عمر سے اسی مضمون کی روایت ہے کہ انہوں نے اس عورت کو دیکھا کہ اندھی ہو گئی تھی۔ دیواروں کو ٹٹول ٹٹول کر چلتی اور کہتی تھی کہ مجھے سعید کی بدعالمی گئی۔" اس کے گھر میں ہی ایک کنواں تھا اور اسی جگہ کے لیے اس نے جھگڑا کیا تھا وہ اس میں گر گئی اور وہ اس کی قبر بن گیا۔

یہ روایت متفق علیہ ہونے کی وجہ سے معتبر ضرور ہے لیکن یہ اصطلاحی معنوں میں کرامت ہے ہی نہیں۔ مقدمہ یا جھگڑا کے درمیان ظالم یا مظلوم کی بدعا ہے۔ جیسا کہ لعان کی صُوت میں بھی ہوتی ہے اور ایسی بدعا بسا اوقات اپنا رنگ دکھلاتی ہے۔

(۳) حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب جنگِ اُحد کا وقت آیا تو میرے باپ نے رات مجھے بلایا اور کہا مجھے یوں گمان ہوتا ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں پہلے پہلے شہید ہو جاؤں گا اور رسول اللہ ﷺ کی ذات کے بعد تم سب سے زیادہ میرے عزیز ہو اور دیکھو! مجھ پر فرض ہے اے ادا کرنا اور اپنی بہنوں سے بہتر سلوک کی میں نہیں وصیت کرتا ہوں۔" پھر جب جنگ شروع ہوئی تو میرا باپ پہلا شہید تھا جسے میں نے ایک اور شہید کے ساتھ قبر میں دفن کیا۔ (بخاری)

یہ روایت معتبر ہے لیکن یہ بھی معروف معنوں میں کرامت نہیں۔ یہ تو ایک مومن کی شہادت کی اُرد ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پورا فرمادیا۔

(۴) حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اسید بن حضیر اور عباد بن بشر ایک دفعہ اپنی کسی ضرورت کے

سلسلہ میں رات گئے تک سُول اللہ ﷺ سے باتیں کرتے رہے۔ جب جانے لگے تو رات گھمپ اندھیری تھی۔ جب گھروں کو روانہ ہونے لگے تو ان دونوں کے ہاتھوں میں ایک ایک لالٹھی تھی۔ ان دونوں میں سے ایک کی لالٹھی روشن ہوئی۔ جس کی روشنی میں دونوں چلنے لگے اور جہاں دونوں کا راستہ جدا ہوتا تھا تو دوسرے کی بھی لالٹھی روشن ہو گئی۔ جس کی لو میں وہ چلنے لگا۔ یہاں تک کہ اپنے گھر پہنچ گیا۔ (بخاری)

یہ روایت معتبر اور صحیح معنوں میں کرامت یا معجزہ ہے۔ اگر تو یہ رسول اللہ ﷺ کی برکت یا دعائے ہوا تھا تو یہ معجزہ تھا۔ ورنہ یہ فی الواقعہ کرامت تھی جو ایک اہم ضرورت پوری کر رہی تھی اور اقرب الی الحق یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ آپ کا معجزہ تھا۔

دوسرے درجہ کی روایات

(۵) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ”جب نباشی (شاہ حبشہ) مر گیا تو ہم سے لوگ بیان کرتے تھے کہ نباشی کی قبر پر ہمیشہ نور نظر

آتا ہے۔“ (البوداؤد)

البوداؤد کی یہ روایت معتبر ہے لیکن اس میں دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب نباشی کا اسلام لانا ہی مل نظر ہے، تو یہ کرامت کیسے ہوئی۔ دوسرے یہ لوگوں کی باتیں ہیں جن کا تعلق زیادہ جن فلن سے تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نہ اس بات کی تصدیق کرتی ہیں نہ تکذیب۔

(۶) ابو خالد قتالی، کہتے ہیں کہ میں نے ابوالعالیہ سے سنا، ”کیا حضرت انس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے حدیثیں سنی ہیں؟“ تو ابوالعالیہ کہنے لگے کہ ”حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بارہ سال سول اللہ ﷺ کی خدمت کی اور رسول اللہ نے ان کے حق میں دُعا فرمائی۔ اُن کا ایک باغ تھا جو سال میں دو بار پھل لانا اور اس باغ سے کستوری کی خوشبو کی طرح خوشبو آتی تھی۔“ اسے ترمذی نے روایت کیا اور کہا کہ یہ حدیث ”حسن غریب ہے۔“

یہ حدیث ایک تو صحیح حدیث کے قلعے پورے نہیں کرتی۔ امام ترمذی جس حدیث کو حسن غریب کہہ رہے وہ ”مومنا“ کا قابل احتجاج ہی ہوتی ہے۔ دوسرے اگر یہ صحیح بھی تصور کر لی جائے تو یہ رسول اللہ ﷺ کی دُعا کا نتیجہ اور برکت ہے۔ اس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی کیا کرامت ہے؟ یہ ہمیں سمجھ نہیں آتی۔

یہ ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ صحاح ستہ کے بعد باقی کتب احادیث کی روایات میں سے بیشتر ناقابل اعتماد

تیسرے اور چوتھے درجہ کی روایات

اور ناقابلِ احتجاج ہیں اور جو روایات واقعی صحابہ کی کرامات ثابت کرتی ہیں وہ کچھ اسی قسم کی ہیں مثلاً:

(۷) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب صحابہؓ نے آپ کو غسل دینا چاہا، تو صحابہؓ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آپ کو ایسے ہی تنگاکے غسل دیا جائے، جیسے دوسروں کو دیا جاتا ہے یا کپڑوں سمیت غسل دے دیا جائے۔ جب اختلاف ہوا تو اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ پر نیند طاری کر دی۔ حتیٰ کہ اُن کی ٹھوڑیاں سینوں پر لگ گئیں۔ اسی حالت میں گھر کی ایک جانب سے کسی کہنے والے نے، جسے کوئی نہیں جانتا تھا، کہا کہ ”رسول اللہ ﷺ کو کپڑوں سمیت غسل دو۔“ پس صحابہؓ نے کپڑوں سمیت غسل دینا شروع کیا۔ آپ کی قیص پر پانی گراتے پھر اسی قیص سے بدن کو ملتے تھے۔ (بیہقی فی دلائل النبوة)

اب دیکھئے کہ اس روایت میں کرامت یا معجزہ ”ہاتفِ نبوی کی ندا“ ہے۔ یہ روایت اسنادی حیثیت سے جیسی بھی ہے یہ خیال رہنا چاہئے کہ بیہقی نے اسے نبوت کے دلائل میں بیان کیا ہے نہ کہ بطور کرامت صحابہ۔

(۸) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک کتہ تیار کیا جس پر ایک ساریہ نامی شخص کو سپہ سالار بنایا۔ ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ کے دوران کہا یا ساریہ فجبَل (اے ساریہ! پہاڑ کی طرف ہو جاؤ) پس ایک ایچی شکر سے آیا اور بھنے لگا۔ ”اے امیر المؤمنین! ہماری دشمن سے ٹھہر بھیڑ ہو گئی تو اس نے ہمیں شکست دی۔ اس وقت ہم نے ایک پکھانے والے کی پکھار سنی کہ یا ساریہ فجبَل تو ہم نے اپنی پشتیں پہاڑ کے ساتھ لگالیں پس اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست دی۔“ (بیہقی فی دلائل النبوة)

اس روایت کو امام بیہقی نے (پانچویں صدی ہجری) میں واقعی کذاب کی تاریخِ مغازی سے اپنی کتاب دلائل النبوة میں درج کیا۔ یہ روایت دوسندوں سے مذکور ہے۔ پہلی سند میں ابن عجلان راوی محروک اور منکر الحدیث ہے۔ اور دوسری میں فرات بن السائب منکر الحدیث ہے۔ (التاریخ الجعفی للبخاری، ج ۴، ص ۳)

(۹) ابو الجوزا کہتے ہیں کہ ”ایک دفعہ مدینہ میں شدید قحط پڑ گیا۔ لوگوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس شکایت کی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ”رسول اللہ ﷺ کی قبر کو دیکھو۔ اس کی چھت میں ایک دُشندانہ بناؤ کہ قبر اور آسمان کے درمیان کوئی چھت نہ ہے۔“ لوگوں نے ایسا ہی کیا تو بارش ہوئی اور گھاس اُگی اور اُونٹ اس قدر موٹے ہوئے کہ چربی سے پٹھے جاتے تھے۔ اسی وجہ سے اس سال کا نام عام الفسق پڑ گیا۔“ (دردی)

یہ روایت منقطع بھی ہے اور ضعیف بھی۔ ام بخاری کہتے ہیں ف اسنادہ نظرو دستار

الکبیر البخاری، ص ۱۸۱، ج ۲ (میزان الاعتدال، ج ۱، ص ۱۲۹، تہذیب التہذیب، ج ۱، ص ۲۸۳)

۱۰۔ ابن المنکدر سے روایت ہے کہ "رسول اللہ ﷺ کا ایک سفینہ نامی غلام زینب شام میں لشکر کا راستہ بھول گیا۔ یا کافروں کے ہاتھوں اسیر ہوا۔ پھر وہاں سے بھاگ نکلا اور لشکر کی تلاش میں تھا کہ ایک شیر یک دم ظاہر ہوا۔ حضرت سفینہ ﷺ نے کہا "اے ابوالمحارث! دشیر کی کینت ہیں رسول اللہ ﷺ کا آزاد کردہ غلام ہوں اور میرے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا ہے۔ شیر دم ہلانا ہوا آگے آیا اور حضرت سفینہ ﷺ کے پہلو میں کھڑا ہو گیا۔ پھر جب کوئی خوفناک آواز سننا تو شیر اس کی طرف قصد کرتا۔ پھر پہلو میں آکر آگے آگے چلنے لگتا۔ یہاں تک کہ حضرت سفینہ ﷺ شکر میں پہنچ گئے پھر شیر واپس ہو گیا۔" (رداء البغوی فی شرح السنۃ)

۱۱۔ سعید بن عبد العزیز سے روایت ہے کہ "جب حرہ کا واقعہ (۶۳ھ) پیش آیا تو مسجد نبویؐ میں تین دن نہ اذان دی گئی نہ جماعت ہوئی۔ اس دوران حضرت سعید بن المسیبؓ مسجد نبویؐ میں ہی ٹھہرے ہوئے۔ آپ کو نماز کا وقت صرف اس طرح معلوم ہوتا تھا کہ قبر نبویؐ سے ایک خفیف سی آواز سننے لگتی تھی۔" (دارمی)

۱۲۔ نبیہ بن وہب کہتے ہیں کہ حضرت کعبؓ (اجار تابعی) حضرت عائشہؓ کے پاس آئے تو رسول اللہ ﷺ کا ذکر چھیڑ گیا۔ کعب کہنے لگے کہ کوئی دن ایسا نہیں چڑھتا کہ اس میں ستر ہزار فرشتے اترتے ہیں اور قبر نبویؐ کو گھیر لیتے ہیں اپنے پر ملاتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ پر رُود بیچتے ہیں۔ یہاں تک کہ شام ہو جاتی ہے تو وہ آسمانوں کی طرف چڑھ جاتے ہیں۔ پھر اتنے ہی فرشتے اترتے اور ایسا ہی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ زمین پھٹے گی (یعنی قیامت کو) تو آپ اسی حال میں قبر سے باہر نکلیں گے کہ ستر ہزار فرشتے آپ کو گھیرے ہوئے ہوں گے۔ (دارمی)

مندرجہ بالا تفصیل ہم نے اس لئے پیش کی ہے کہ صحابہ کی کرامات کی تعداد اور صحیح پوزیشن واضح ہو جائے جو عوارق عادت باتیں اسنادی حیثیت سے قوی ہیں ان کا تعلق رسول اللہ ﷺ کی ذات سے ہے یعنی وہ معجزات ہیں اور جن بانوں کا تعلق صحابہ یا تابعین (مثلاً کعب اجار) سے ہے۔

۱۳۔ ان دونوں کہانوں کا تعلق سورج سے اور آندھ اور فجر کی نماز کے اوقات کا تعلق چاند سے بھی ہو سکتا ہے۔ تو ہم اس خفیف سی آواز سے نمازوں کے اوقات معلوم کرنا عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ ۱۴۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس میں کئی صحابی کی کرامت کی کیا بات ہے؟

ان کی اسنادی حیثیت کمزور ہے اور ان سے احتجاج مشکل ہے۔

صحابہؓ اور تابعینؓ سے کرامات کا صدور کیوں نہ ہوا؟

اگرچہ بعض حقیقت پسند صوفیہ نے اس بات کا برملا اعتراف کر لیا ہے کہ کشف و کرامات ولایت کے لئے ضروری نہیں۔ مگر اولیاء اللہ کے تذکرے پکار پکار کر یہی کہتے ہیں کہ ولایت اور کشف و کرامات لازم و ملزوم ہیں۔ اور کشف و کرامات کی کمی بیشی ہی کسی ولی کی ولایت کا معیار نہیں ہے۔ مولانا انساریا خان اپنی کتاب دلائل السلوک کے صفحہ ۱۷ پر فرماتے ہیں کہ تصوف کے لئے کشف و کرامات شرط نہیں۔ اور صفحہ ۲ پر اس میں کچھ لپک پیدا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خرق عادت امور نہ شرط ولایت ہیں نہ جزو ولایت ہاں دلائل و علامات ولایت کی حیثیت سے بطور سند عطا کئے جاتے ہیں۔ اور صفحہ ۱۹۸ پر فرماتے ہیں کہ کشف و الہام کا ہونا تصوف کے لوازمات سے ہے۔ اس لئے کہ دین کو تسلیم کرنے کے ساتھ اس کے ہم جزو تصوف و احسان کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ اسے تسلیم کیا تو کشف و الہام کو ماننا پڑے گا کیونکہ یہ لازم و ملزوم ہیں۔ گویا سچی بات آپ کے منہ سے نکل ہی گئی۔ اب اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرونِ ثلثہ کے مسلمانوں نے کشف و کرامات کا صدور کیوں نہ ہوا، تو اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

’اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان چیزوں کا تحقق علوم کے قوت و ضعف ایمانی کے ساتھ ہے۔ ایمان قوی ہو تو کشف و کرامات کے صدور کی چنداں ضرورت نہیں۔ ایمان میں ضعف آگیا تو ایسے امور کی زیادہ ضرورت پیش آئی۔ دورِ صحابہ میں ان حضرات کے ایمان نہایت قوی تھے۔ لہذا انہیں ایسی چیزوں کی ضرورت نہ تھی۔ بعد میں ایمان کمزور ہو گئے تو ان اسناد کا مطالبہ ہونے لگا۔۔۔۔۔ دورِ صحابہ میں جب خود وحی موجود تھی، حضور اکرم ﷺ کی ذات آفتاب عالم تاب کی طرح برابر دنیا پاشی کر رہی تھی تو نائب وحی (کشف و الہام) کی کیا ضرورت تھی اور مروج کے مقابلے میں ان چاند ستاروں اور قندیلوں کی کیا ضرورت تھی۔ قاعدہ ہے کہ آفتاب کے غروب ہونے کے بعد فوری طور پر تاریکی نہیں چھا جاتی، بلکہ آہستہ آہستہ روشنی کم ہوتی، تاریکی بڑھتی اور بھیتی جاتی ہے۔ یہی صورت صحابہ، تابعین اور جمع تابعین کے معاملہ میں پیش آئی۔ صوفیاء کرام نے بعد کی تاریکیوں میں روشنی پھیلانے کا اہتمام جاری رکھا۔ ان کے فیض سے کہیں کوئی چراغ روشن ہوا، کہیں شمع، کہیں کوئی ستارہ ابھرا، کہیں کوئی چاند نکلا۔ بہر حال ان کے دم قدم سے روشنی خواہ

کسی درجے کی ہی موجود رہی۔ بہر حال ہمیں یہ بتانا مقصود ہے کہ کشف و الہام کی کئی بیشی قوت وضعف ایمانی کے تناسب سے ہوتی ہے۔ دورِ صحابہ کے بعد ہی کشف و کرامات کا اظہار اصولاً ہونا چاہئے تھا اور ایسا ہی ہوا۔“ (دلائل السکوک، ص ۲۰۰، ۲۰۱)

مولانا موصوف کے اقتباس بالا سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دورِ صحابہ، تابعین اور متبع تابعین میں نہ کشف و کرامات کی ضرورت تھی نہ ان چیزوں کا صدور ہوا۔ اور چونکہ کشف و الہام اور تصوف لازم و ملزوم ہیں۔ لہذا تصوف کی از خود نفی ہو گئی۔ بالفاظِ دیگر تصوف ایک بدعت ہے۔ پھر جب یہی بات ہمس کہتے ہیں تو مولانا اس کا انکار کر کے دوسری تاویہوں میں مصروف ہو جاتے ہیں جن کا ہم جائزہ لے چکے ہیں۔ پھر آپ کے اس جواب میں بھی کئی باتیں محلِ نظر ہیں، مثلاً:

۱۔ آپ یہ فرماتے ہیں کہ کشف و کرامات کا تعلق ضعفِ ایمان کے ساتھ ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو کیا وجہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے آخری ایام میں بھی آپ سے بے شمار معجزات کا صدور ہوا۔ مثلاً غزوہ تبوک ۹ھ میں دورانِ جنگ قدرتِ رسد کا سندہ معجزہ کی برکت سے حل ہوا۔ اس وقت مسلمانوں میں ایمان کی کمزوری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوا اور عرب کا تقریباً سارا علاقہ بھی مسلمان ہو چکا تھا لہذا کفار کے لئے سند کی ضرورت نہ تھی۔ پھر اس زمانہ میں اور بھی بہت سے معجزات آپ سے صادر ہوئے۔ جن کا بیان کرنا یہاں صرف طوالت کا باعث ہوگا۔

۲۔ نبوت کا سَوَج تو صرف ۲۳ سال چمکا۔ پھر اس کے بعد ۲۰ سال تک تاریکیاں ہی بڑھتی رہیں اور اس دو سو سال کے عرصہ میں کسی قبیل، شمع یا چاند ستارے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ حالانکہ واقعاتی اور مادی دنیا میں ہوتا یہ ہے کہ سَوَج تقریباً ۱۲ گھنٹے چمکتا ہے تو اس کے غروب ہونے کے صرف ایک گھنٹہ بعد اتنی تاریکی چھا جاتی ہے کہ شمعوں اور قندیلوں کے بغیر گزارہ مشکل ہوتا ہے۔ لہذا یہ بیان کردہ وجہ بھی معقول معلوم نہیں ہوتی۔

۳۔ جو لوگ حضور اکرم ﷺ کے فیض اور تربیت یافتہ اور ایسی شمعوں اور قندیلوں کے اہل تھے۔ انہوں نے تو ایسی عینِ دروزاں نہیں اور جو لوہا ان سے درج میں کم تھے انہوں نے ایسے چاند ستارے روشن کر دیئے جو آفتابِ عالم تاب کو بھی ماند کرنے لگ گئے۔

بات دراصل وہی ہے جو ہم بوضاحت پیش کر آئے ہیں کہ کشف و کرامات کا معاملہ جب ایک کسبِ

اور فن کی شکل اختیار کر گیا اور اس کے حصول کے ذرائع شریعتِ اسلامیہ کے بجائے خارجی دنیا سے مہیا ہونے لگے تو جن لوگوں نے اس کسبِ فن پر خصوصی توجہ مبذول فرمائی۔ وہ اس تصوف کی دنیا میں چندے آفتاب و چندے ماہتاب بن کر سامنے آئے اور یہ دور یسری صدی ہجری سے شروع ہو کر ساتویں صدی ہجری میں اپنے عروج تک پہنچا ہے۔

کرامات اور استدراج

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے اکثر بزرگوں کو ان کرامتوں پر قدرت بھی حاصل ہوتی ہے وہ ہر ملاقاتی کے دلی حالات سے واقف ہوتے ہیں اور اس کو اس خیالات سے مطلع بھی کر دیتے ہیں۔ پھر کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی شکلیں تبدیل کرنے پر قادر ہیں۔ کچھ ایسے ہیں کہ ادھر ہاتھ بڑھایا، تو انگوڑا خوشہ ہاتھ میں آگیا۔ کچھ ایسے ہیں جو اپنی جوتی آسمان پر بھیجتے ہیں جو کسی ہند کی جوتی کو مار مار کر پیچھے لے آتی ہے۔ وہ بلند بانگ دعوے بھی کرتے ہیں۔ پھر ان کو پورا کر کے بھی دکھا دیتے ہیں۔ یہ تو واضح ہے کہ ایسے واقعات پر مغہوم کے اعتبار سے 'کرامت' کا لفظ فٹ نہیں بیٹھتا۔ اب کرامت کے بعد استدراج ہی باقی رہ جاتا ہے۔ جس کے لئے شیطانی قوتیں مصروفِ عمل رہتی ہیں اور جس کا ذکر ہم پہلے باب میں شاہ ولی اللہ کے اقتباس پیش کر چکے ہیں۔ لہذا ہمیں سنجیدگی سے کرامت اور استدراج کے درمیان فرق کر امت کا معیار اور اہمیت

کو سمجھ لینا چاہئے۔ جو درج ذیل ہے :

- ۱۔ کرامت کا صدرِ رکھی کھار یا شاہی ہوتا ہے اور اس کا صاحب کرامت کو نہ پہلے سے علم ہوتا ہے نہ وہ اس کا دعویٰ کر سکتا ہے کیونکہ اگر وہ کوئی چیز دعوے سے پیش کر سکتا ہے، تو یہ قدرت ہے کرامت نہیں۔
- ۲۔ معجزات کی طرح کرامت بھی وہی چیز ہے۔ کسی چیز استدراج ہے جسے دعویٰ ہے بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔ لہذا ہمیں سب سے پہلے صاحب کرامت کی زندگی پر غور سے نگاہ ڈالنی چاہئے کہ کوئی چیز سنت کے خلاف تو نہیں؟ سنت کے خلاف یہ باتیں ہیں۔ مجاہدات و ریاضت کی خاطر جنگلوں میں مدتوں قیام کرنا۔ مزارات پر چڑکشتیاں، کشفِ قبور کے طریقے سیکھنا، نکاح سے خود پرہیز اور دوسروں کو متفر کرنا۔ منگوکس ٹک کر عبادت کرنا، جس دم، ذکر و اذکار کے بدعہ اور شرکیہ طریقے۔ متواتر اور وصلی روزوں کے ذریعہ بدن کو نحیف و کمزور بنانا اور نفس کشی کرنا۔ ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر عبادت کرنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب طریقے غیر شرعی ہیں اور یہی کسی اور احتسابی ہیں جن کے

ذریعہ کشف و کرامات کے فن کو حاصل کیا جاتا ہے۔ ان طریقوں سے حاصل شدہ کمال اسنادِ حج ہوگا کرامت ہوگی
۳۔ کرامت کسی اہم دینی یا دنیوی غرض کو پورا کرنے کے لئے عطا کی جاتی ہے اور یہ بالعموم اتفاقی
سرزد ہوتی ہے۔ جبکہ استدراج دعوت سے پیش کیا جاتا ہے اور بسا اوقات اس سے مقصود اظہار
نمود و نمائش اور اپنی ولایت کی دھاک بٹھانا ہوتا ہے اور اس سے اگر کوئی غرض پوری ہوتی بھی ہے
تو وہ حقیر، ادنیٰ اور انفرادی قسم کی ہوتی ہے۔

کرامات سے متعلق جنید بغدادی کا فتوے

حضرت جنید بغدادیؒ جو صوفیاً
میں سید الطائفہ کے لقب سے مشہور

ہیں — کافران ہے کہ ”اگر کسی شخص کو ہوا میں چار زانو بیٹھا ہوا دیکھو، پھر بھی اس کی پیروی اس
وقت تک نہ کرو۔ جب تک کہ اللہ تعالیٰ کے امر و نہی میں اس کا عمل درست نہ پالو۔“ (عترانِ حق ص ۳)
انہی حضرت جنید کا ایک واقعہ بھی سن لیجئے :

”ایک شخص کچھ عرصہ تک آپ کی خدمت میں رہا۔ پھر رخصت کی اجازت چاہی۔ آپ نے پوچھا
”کیوں جاتا ہے؟“ اُس نے کہا: ”میں نے سنا تھا کہ آپ بہت بڑے صاحبِ کرامت بزرگ ہیں۔
میں اتنی مدت آپ کی خدمت میں رہا مگر کوئی کرامت نہ دیکھی، اس لئے رخصت چاہتا ہوں۔“ آپ نے
فرمایا: ”اس تمام عرصہ میں تو نے میری کوئی کام خلافِ شریعت بھی دیکھا؟“ اُس نے کہا: ”یہ تو میں نے
نہیں دیکھا۔“ آپ نے فرمایا: ”بس یہی میری کرامت ہے۔ اب جانا چاہیے تو چلا جا۔“
اس واقعہ سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے :

۱۔ مریدوں کو اتباعِ رسول کی پرواہ نہیں ہوتی، کرامات کی جستجو ہوتی ہے اور یہی اُن کے نزدیک
بزرگی کا معیار ہے۔

۲۔ ولایت کا اصل معیار اتباعِ رسول ہے، کرامات نہیں۔

لیکن اکثر پیر اپنی بزرگی کو جتلانے کے لئے یا مریدوں کو مطمئن کرنے یا اپنی دکان چمکانے کے لئے
شیطانی راستوں پر پڑ کر کرامات کے حصول ہی کی کوششوں میں مصروف ہوتے ہیں اور مرید بھی یہی کچھ
سیکھنے کے لئے ”استانہ عالیہ“ پر تشریف لاتے ہیں اور جب ایسے شیطان کے جال میں پھنس گئے
تو سمجھتے ہیں کہ ہم کامل ہو گئے۔ چنانچہ انہی حضرت جنید بغدادیؒ سے متعلق صحیح ذیل واقعہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

”نقل ہے کہ آپ کے ایک مُرید پر یہ دیوانگی چھانی کہ وہ کامل ہو گیا ہے۔ اسے ہر رات دکھائی دیتا کہ فرشتے اسے سواری پر بٹھا کر جنت کی سیر کراتے اور طرح طرح کے میوے کھلاتے ہیں۔ آپ اس کے پاس گئے، دیکھا بڑے ٹھاٹھ سے بیٹھا ہے۔ آپ نے کیفیت پوچھی تو اس نے بڑے فخر سے اپنے بندہ مقام اور بہشت کی سیر کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا: ”آج جب بہشت میں جاؤ، تو میوے کھانے سے پہلے لاحول و لا قوۃ پڑھنا۔“ چنانچہ محب مہول جب وہ بہشت میں پہنچا، تو حضرت کا فرمان یاد آگیا اس نے جب لاحول پڑھا تو ایک بیچ سنی اور بہشت کو اُن واحد میں غائب دیکھا اور اپنے آپ کو خود ایک گندی جگہ پر بیٹھے ہوئے پایا۔ کربت اور مُردوں کی ہڈیاں آگے پڑی ہوئی تھیں۔ سمجھا کہ یہ شیطانی جال تھا اور وہ شیطانی استدراج میں مبتلا تھا۔ پس حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر تائب ہوا۔“ (مقریان حق، تصنیحات بالا سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

- ۱۔ اولیاء اللہ کی صحیح پہچان یہ ہے کہ وہ قبیح سنت ہوں خواہ ان سے کبھی کسی کرامت کا ظہور ہو یا نہ ہو۔
- ۲۔ جس بزرگ سے بکثرت کرامات کا ظہور ہونے لگے وہ سمجھ لے کہ شیطان کے جال میں پھنس گیا۔ اسے اپنے متعلق جلد از جلد غور کرنا چاہیے اور توبہ و استغفار کرنا چاہیے۔

چنانچہ التعرف جو صوفیاء کی مستند کتاب اور اولین التعرف میں کرامت پر تبصرہ | مآخذ میں شمار ہوتی ہے۔ اس کے مصنف کلابازی (م ۲۸۰ھ) لکھتے ہیں کہ:

”جب ولی سے کوئی کرامت ظاہر ہو تو اس کا معجز و انکار بڑھ جاتا ہے.... ولی سے جو کرامات ظاہر ہوتی ہیں، انہیں ان کا علم ہی نہیں ہوتا.... ولی کی کرامت ان اُمُو میں ہوتی ہے دُعا کی قبولیت، حال کی تکمیل، عمل کرنے کے لئے مزید قوت اور رُزی سے بے فکری۔ جس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ لے لیتے ہیں اور انبیاء کے معجزات کسی معدوم چیز کو عدم سے لانا اور ایک چیز کی ہیئت بدل ڈالنا ہوتا ہے.... ولی کو اپنی ولایت کا علم ہونا جائز نہیں اس لئے کہ اس سے ولی سے خوف جاتا رہتا ہے۔“ (اقتباس از ص ۱۰۸، ۱۰۹ ترجمہ التعرف، مطبوعہ المدف، مترجم پیر محمد حسن)

”بعض بزرگوں کا قول ہے الحکامات حیض الرجال، یعنی جس طرح عورت حیض سے شرفاتی ہے اسی مولانا اشرف علی تھانوی کا تبصرہ

طرح اہل اللہ اپنی کرامتوں سے شرماتے ہیں۔ بہت سے اہل کرامت بزرگوں نے تمنا کی رکاش ہم سے کرامت کا صدف نہ ہوتا۔ وجہ یہ کہ انہوں نے بقدر اپنی کرامت کے آخرت کے درجات میں کمی محسوس کی۔ ”تہذیب تصوف سلوک، ص ۹۱)

اب خدا را کہیے کہ اولیاء اللہ یا ان کی جو کرامات تذکروں میں مندرج ہیں یا جو ہم نے درج کتاب کی ہیں وہ اس معیار پر پوری اُترتی ہیں؟ پھر یہ کرامات ہیں بھی ایسی کہ ان کے سامنے انبیاء کے معجزات بھی بیچ نظر آنے لگتے ہیں۔ ہم ذیل میں ایسی ہی چند کرامات کا ذکر کریں گے۔

اولیاء اللہ کی کرامات ا۔ مُردہ کو زندہ کرنا

حضرت عیسیٰ ﷺ کا مُردوں کو زندہ کرنا ایک عظیم الشان معجزہ ہے اور اسی بنا پر اُن کو خدا سمجھا گیا تھا۔ اب ہمارے اولیاء کا کم از کم معیار یہ ہے کہ مُردوں کو تو زندہ کر کے دکھا سکیں۔ مثلاً خواجہ فرید الدین گنج شکر کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

”پھر آپ نے فرمایا کہ اے درویش! خواجہ قطب الدین (بختیار کاکی) چشتیہ کا معیار ولایت ہی مُردوں کو زندہ کرنا ہے

چشتی قدس سرہ العزیز سے پوچھا گیا کہ حضرت یہ کیونکر معلوم ہو کہ اب سلوک کا مرتبہ تمام ہو گیا اور یہ شیخ کمال کو پہنچ گیا۔ فرمایا: ”اگر وہ کسی مُردہ پر دم کر دے تو وہ مُردہ خدا کے حکم سے زندہ ہو جائے تو اس وقت سمجھ لو کہ وہ کمالیت کو پہنچ گیا۔“ پھر آپ نے فرمایا: ”خواجہ قطب الدین چشتی قدس سرہ العزیز اسی محل پر یہ فائدہ فرمائی ہے تھے کہ ایک عورت روتی ہوئی آئی اور قدموں میں سر رکھ دیا اور کہا کہ ایک بچہ رکھتی تھی کہ اسے بادشاہ نے بے گناہ دار پر کھینچا دیا۔ خواجہ اس کی عرض داشت سن کر کھڑے ہو گئے۔ اور عصا ہاتھ میں لے کر اس کے ساتھ ہو لئے۔ آپ کے اصحاب بھی آپ کے ساتھ ہو لئے اور اس دار کشیدہ لڑکے کے پاس پہنچے۔ ہندو مسلمان کی ایک بھیڑ لگ گئی۔ خواجہ نے کہا: ”الہی! اگر اسے بے گناہ بادشاہ نے دار پر کھینچا تو اسے زندہ کر دے۔ آپ کہہ ہی ہے تھے کہ وہ لڑکا زندہ ہو گیا اور ساتھ

چلنے لگا۔ یہ کرامت دیکھ کر کئی ہزار ہندو مسلمان ہو گئے۔ پھر آپ اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ، ”مرد کی کمالیت اس سے زیادہ نہیں ہے۔“ داسرا اولیاء مغلظات خواجہ فرید گنج شکر، ص ۱۱۱ مرتبہ خواجہ بدراشتی، ترجمہ غلام احمد ریاں، مطبع محبتائی دہلی ۱۹۶۱ء

مندرجہ بالا اقتباس سے مندرجہ ذیل باتیں مستفاد ہوتی ہیں:

- ۱۔ انبیاء سب ہی کامل ہوتے ہیں لیکن ان میں سے صرف حضرت عیسیٰ ﷺ کو باذن اللہ مردہ زندہ کرنے کا معجزہ عطا ہوا لیکن خواجگانِ چشت کے کئی باکمال کم از کم اتنا ”تعصّف“ ضرور کہتے ہیں۔ اور وہ یہ معجزہ دعوائے کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔
- ۲۔ یہ بزرگ دوسروں سے سجدہ کرنا اپنی شان سمجھتے ہیں۔ اگر یہ انہیں ناپسند ہوتا تو ضرور اس عودت کو روک دیتے۔

۳۔ کاش کہ انبیاء کو اللہ تعالیٰ ہی طریقہ تبلیغ و اشاعتِ دین سمجھا دیتے اور عطا کر دیتے کہ لوگ ایک ہی کرامت دیکھ کر ہزار ہا کی تعداد میں مسلمان ہو جاتے۔ اور انہیں ”مثنیٰ نصر اللہ“ بھی نہ پکارنا پڑتا۔ پھر جو لوگ اس طرح کی کرامتیں دیکھ کر مسلمان ہوتے، وہ ان پیروں کے خادم تو ضرور بن جائیں گے، لیکن اسلام وہ بے چارے کیا سمجھ سکیں گے؟

اب دیکھئے صاحبِ حدیقۃ الاولیاء صفحہ ۹۷ پر شاہ ابوالمعالی حقی صابری کے بیان میں لکھتے

لَا إِلَهَ سِوَا اللَّهِ اور لَا إِلَهَ سِوَا اللَّهِ سے زندہ کرنا

ہیں کہ:

”عند التذکرہ حضرت شاہ نے فرمایا کہ مرگ و حیات کلمہ فی اثبات لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ میں ہے جنہوں نے دل سے یہ کلمہ پڑھا ہے اگر وہ لفظ لَا إِلَهَ زندہ کے کان میں کہہ دیں تو مر جائے اور اگر لَا إِلَهَ کہہ دیں تو جی اٹھے۔ حاضرین مجلس نے التماس امتحان کی۔ حضرت مجلس سے اُٹھے اور ایک گاؤں میں کے کان میں جو اسی گھر میں بندھی تھی لَا إِلَهَ کا لفظ کہا۔ وہ فی الفور گر پڑی اور مر گئی پھر وہ سکر کان میں لَا إِلَهَ کا لفظ کہانی الفور گھڑ میش جی اٹھی اور چارہ چرنے لگی۔“

اسے کہتے ہیں، پتیلی پر سرسوں جھاڑنا۔ کیا جادو کی اس سے طرح کرنا شیر ہو سکتی ہے۔ افسوس کہ قرونِ ماضی کے مسلمانوں، صحابہ اور خود حضور اکرم ﷺ کو لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کی اس تاثیر کا علم نہ ہو سکا، ورنہ

حضرت اکرم ﷺ کم از کم اپنے چچا ابوطالب اور زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو ہی زندہ کر لیتے، جن کی غمی کی وجہ سے اس سال کا نام ہی عام الحزن قرار پایا۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ اسی مندرجہ کتاب کے صفحہ ۱۵۱ پر مذکور ہے جو سید جلال الدین شیر شاہ سے تعلق رکھتا ہے، فرماتے ہیں :

”ناگاہ آپ کاگز ایک مجمع پر ہوا، پوچھا کیسا مجمع ہے؟ لوگوں نے کہا اس مردہ کی نماز جنازہ پڑھتے ہیں۔ کہا کہ: ”نماز پڑھ کر پھر کیا کرو گے؟“ کہا ”اس کو زمین میں دفن کر دیں گے۔ یہ بات سن کر حضرت جلال جلال میں آگئے اور نعرہ اللہ اکبر مار کے مردہ کے منہ سے پردہ اٹھایا اور فرمایا: ”قم یا ذن اللہ! مردہ فی القبر اٹھا اور چالیس برس تک زندہ رہا۔“

پیران پیر کی مسیحائی | ”پیران پیر تو اس کام میں یہ طوعلیٰ رکھتے تھے۔ ایک دفعہ ایک چیل آپ کے وعظ کے دوران اوپر منڈلانے لگی اور چلنے لگی تو آپ نے ہوا کو حکم دیا کہ اس کا سر قلم کر دے۔ پجاری چیل کا سر تن سے جدا ہوا اور اس کا سر اور دھڑ آپ کے سامنے زمین پر آپڑے پھر آپ نے لوگوں کے سامنے اس کا دھڑ اور سر جوڑ کر اسے اڑا بھی دیا۔“ (سیرت غوث، ص ۱۹۷۔ پانچ کتب تذکرہ کے حوالہ سے گویا یہ روایت نہایت ثقہ ہے)

پھر ایک دفعہ یوں ہوا کہ آپ نے مرغی کا سالن کھا کر ہڈیاں ایک طرف رکھ دیں۔ پھر ان ہڈیوں پر ہاتھ رکھ کر فرمایا ”قُم یا ذن اللہ۔ تو وہ مرغی زندہ ہو گئی تھی۔“ (سیرت غوث، ص ۱۹۱۔ آٹھ کتب تذکرہ کے حوالہ سے۔ گویا یہ روایت پہلی سے بھی ثقہ ہے)

اور آپ کا اصل شاہکار یہ ہے کہ ایک دن ایک عیسائی اور مسلمان جھگڑا رہے تھے۔ عیسائی کہتا تھا کہ حضرت عیسیٰ ﷺ افضل ہیں اور مسلمان کہتا تھا کہ ہمارے رسول ﷺ افضل ہیں۔ آپ کا دھڑ سے گزر ہوا تو عیسائی سے آپ نے پوچھا کہ حضرت کیسے افضل ہیں؟ وہ کہنے لگا کہ حضرت عیسیٰ ﷺ قُم یا ذن اللہ کہہ کر مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا ”میں رسول کریم ﷺ کا تابع اور غلام ہوں۔ اگر میں زندہ کر دوں تو ایمان لے آؤ گے؟“ عیسائی کہنے لگا ”ہاں!“ آپ نے عیسائی کو کہا کہ کوئی بہت پرانی قبر دکھاؤ۔ اس نے قبر دکھائی تو آپ نے فرمایا: ”دیکھو! یہ ایک گوتی کی قبر ہے اگر تم چاہو تو میں یہ بھی کر سکتا ہوں کہ وہ گوتا ہوا اٹھے۔“ عیسائی نے کہا میں بھی چاہتا ہوں۔ ”اب حضرت

عیسیٰ علیہ السلام تو قم باذن اللہ کہہ کر مُردہ زندہ کرتے تھے، مگر پیران پیر نے 'قم باذنی' کہا جس کے ساتھ ہی قبر کھلی اور مُردہ کُتا ہوا نکل آیا۔ یہ کرامت دیکھ کر وہ آپ کے ہاتھ پر سِلماں ہو گیا۔ "ذفرۃ الخاطر" سے
 عیسیٰ کے معجزوں نے مُردے جلا دیئے محمد کے معجزوں نے مسیحا بنا دیئے
 (سیرت طوط، ص ۱۹۲)

اب دیکھئے کہ :

۱۔ عیسائی کے جھگڑے کی دلیل ہی یہ تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو مُردوں کو زندہ کیا کرتے تھے لیکن تہائے نبی ایسا نہیں کرتے تھے اور یہ ہے بھی درست۔ پھر محمد ﷺ کے کونے معجزوں نے مُردوں کو زندہ کرنے والے مسیحا کیسے بنا دیئے۔ جو کام استاد نہیں کر سکتا وہ شاگرد کیسے کر سکتا ہے؟ کیا پتہ گرد اپنے استاد سے یا ظلام آقا سے بڑھ گئے ہیں؟

۲۔ پیران پیر کی کرامت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزہ سے بد جہاڑ بھیا ہے اور اس کی وجہ درج ذیل ہیں :

۱۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قم باذن اللہ کہہ کر مُردہ زندہ کرتے تھے لیکن آپ قم باذنی کہہ کر مُردوں کو زندہ کرتے تھے۔

ب۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کسی کہنے قبر کا مُردہ زندہ نہیں کرتے تھے۔

ج۔ اور نہ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں یہ کمال تھا کہ اگر مُردہ گویا ہے تو وہ گناہی لٹے۔

شیخ علی بن ہبیتی اور مستول کا کلام | قرآن کریم میں بنی اسرائیل کا ایک واقعہ مذکور ہے ، کہ کوئی شخص قتل ہو گیا ، لیکن قاتل کا سراغ نہیں ملتا تھا

سب ایک دوسرے پر الزام توہوتے تھے ، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ لوگوں سے مجھیں کہ ایک گائے ذبح کریں۔ پھر اس مذبح گائے کا ایک ٹکڑا اس مقتول کے جسم پر ماریں تو وہ لاش قاتل کا نام بتلا دے گا۔ (سورہ بقرہ) چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اب ہمارے اولیاء اللہ کی کرامات ایسے معجزات سے بلند ہیں۔ کیونکہ وہ مقتول اور اس کی کلام کے درمیان کسی قسم کا واسطہ لائے بغیر ان سے جواب حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ علی بن ہبیتی کے متعلق مذکور ہے کہ :

"ایک روز آپ قصبہ ہز ملک میں گئے۔ دیکھا کہ وہاں کے لوگ ایک مقتول کے سر ہانے کھڑے

جھگڑ رہے ہیں اور ایک دوسرے پر قتل کا الزام رکھ رہے ہیں۔ اپنے یہ نزاع دیکھی تو مرنے سے مخاطب ہو کر کہا ”بندۂ خدا! خود کیوں نہیں بتا دیتا کہ تیرا قاتل کون ہے؟“ مرنے نے فی الفور آنکھیں کھولیں اور کہا کہ: ”میرا قاتل فلاں بن فلاں ہے۔“ اور پھر آنکھیں بند کر کے مر گیا۔“ (غزنیۃ الاصفیاء، ص ۱۵۴)

ان بزرگوں کے بعد تو ایسے ایسے عظیم الشان اولیاء اللہ پیدا ہونے لگے کہ ان کی صرف نظر پڑنے سے

صرف نظر پڑنے سے مردہ کا زندہ ہو جانا

ہی مرنے زندہ ہو جایا کرتے تھے مثلاً:

۱۔ خواجہ محمد فضیل قادری نوٹش ہی (م ۱۱۱۱ھ) کا ذکر ہوا ہے:

”جس فاسق و فاجر پر حالت جذب و سکر میں نظر پڑ جاتی۔ عارف کامل ہو جاتا۔ کسی مردہ پر نظر پڑتی تو زندہ ہو جاتا۔ نگاہ غضب سے کسی کی طرف دیکھتے تو اس کی جان تن سے نکل جاتی۔ غرض آپ کے احوال و مقامات عجیب و غریب تھے۔“ (غزنیۃ الاصفیاء، ص ۲۷۷)

اب دیکھئے صاحب غزنیۃ الاصفیاء فرما رہے ہیں کہ ”جس فاسق و فاجر پر حالت جذب و سکر میں نظر پڑ جاتی وہ عارف کامل ہو جاتا۔“ اس سے آج اندازہ لگا ہی سکتے ہیں کہ خود خواجہ محمد فضیل کس پایہ کے عارف کامل ہوں گے۔ پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ ان نوٹشاہی اولیاء اللہ کے کردار کا تعارف ہم کسی دوسرے مقام پر کرا چکے ہیں۔

پیشکش سبزواری (تبریزی م ۵۵۵ھ) کا مردہ کو زندہ کرنا پھر سبوح کو زمین کے قریب لانا

ابن فرقہ شیعہ
امامیہ اسماعیلیہ

کے ایک ولی اللہ پیشکش سبزواری تبریزی ثم ملتان کی کرامات ملاحظہ فرمائیے:-

جس زمانہ میں پیشکش ملتان میں تھے۔ اسی زمانہ بادشاہ کا اکلوتا فرزند مر گیا۔ بے حد غموم ہوا۔ اس نے فقراء و حکماء اور صوفیاء سے کہا: تمہارا دعویٰ ہے کہ تم اللہ کے مقرب ہو۔ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو میرے لڑکے کو زندہ کر دو۔ ورنہ میں سب کو کوہو میں پلوا دوں گا۔ یہ ماجرا سن کر سب گھبرا گئے۔ اور اپنی زندگی کی سلامتی کے لیے ان سب کی نظر انتخاب پیشکش پر پڑی۔ پیشکش نے مطالبہ منظور کر لیا۔ اور مردہ فرزند کے پاس جا کر فرمایا فرمایا۔ فَهَذَا بَذَنَ اللہ سبزواری نے اٹھا۔ پھر آپ نے کہا قُمْ بِأَوْنِي۔ تو شاہزادہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا۔ اگلی فقراء پیشکش کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے اس پر تہمت لگائی کہ اس نے اپنے حکم سے فرزند کو زندہ کیا۔ لہذا اس پر شرعی حکم نافذ ہونا چاہیئے۔ اور ان کی جیتے جی جسم کی کھال اتار لینی چاہیئے۔ پیشکش نے جب یہ صورت حال دیکھی تو اپنے جسم پر ایک کالی کبلی ڈالی۔ اور اپنے

۲۔ اسی طرح کے ایک اور نوشاہی "اولیاء اللہ" ہیں۔ عبدالرحمن المعروف بہ پاک رحمان یا رحمن دیوانہ بھڑی والا۔ یہ بزرگ خواجہ محمد فضیل سے بازی لے جاتے ہیں۔ کیونکہ خواجہ فضیل کی تو اپنی "نظر" یہ او وہ کرشمے دکھلاتی تھی۔ لیکن آپ ایسے کرشموں کا تصرف دوسروں کو بھی عطا فرما سکتے تھے چنانچہ صاحب خزینۃ الاصفیاء رقمطراز ہیں کہ:

"ایک وز آپ اپنے خادم شیخ سعدی (صحیح نام شادی ہے جو کیلیا نوالہ کا باشندہ تھا۔ تذکرہ نوشاہی) پر بے حد مہربان ہو کر فرمانے لگے: "ہم نے اللہ تعالیٰ سے تنہائے لئے یہ چاہا ہے کہ جس مریض پر تیری نظر پڑے وہ صحت یاب ہو جائے۔ جس مردہ کی طرف تو متوجہ ہو وہ زندہ ہو جائے اور جس فاسق و فاجر پر تیری نظر پڑے وہ ولی کامل ہو جائے۔" بارگاہِ خداوندی میں آپ کی یہ دُعا قبول ہو گئی۔" (غزینۃ الاصفیاء، ص ۳۵)

اب بتلایئے کہ انبیلہ کے معجزات ہمارے ان اولیاء اللہ کی کرامات کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟

۲۔ ہوا پر حکومت

اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حضرت سلیمان ؑ کے لئے مسخر کر دیا تھا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کا ہوا پر حضرت سلیمان ؑ سے زیادہ کنٹرول ہے۔

اصیب اعجمیؒ کی ہوا پر حکومت | "نقل ہے کہ ایک عورت حضرت حبیب اعجمیؒ کے پاس روتی ہوئی آئی اور کہا کہ میرا لڑکا عرصہ سے گم ہے۔ دُعا کریں خدا اسے ملا دے۔" آپ نے فرمایا: تیرے پاس کچھ ہے؟ اس نے ٹھوڑی سی چاندی پیش کی۔ آپ نے لے کر درویشوں میں بانٹ دی اور کہا "جاؤ تیرا لڑکا تیس گھر کے دروازے پر کھڑا ہے۔" وہ آئی تو لڑکے کو موجود پایا۔ سینہ سے لگا کر پوچھا "بیٹا! تو کہاں تھا؟" اس نے کہا "میں کرمان میں تھا۔ میں نے سنا کوئی کہہ رہا ہے" اے ہوا اس کو اٹھا کر اس کے گھر پہنچا دے، حبیب کی دُعا اور صدقہ کی برکت سے" پس میں نے اپنے آپ کو یہاں پایا۔" (مقربان حق، ص ۴۲)

اب حضرت سلیمان ؑ کا معجزہ توفیق انا تھا کہ وہ ایک ماہ کا سفر چند گھنٹوں میں طے کر بیٹے تھے لیکن معاملہ یہاں تک نہیں، بلکہ ہمارے صوفیاء کا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص بقیس کا تخت پاک جھکنے میں لایا تھا وہ ولیؑ تھا اور اس کا تصرف حضرت سلیمان ؑ (جو کہ نبی تھے) سے زیادہ تھا اس کی تحقیق ہم پہلے پیش کر چکے ہیں کہ وہ نہ جن تھا نہ کوئی انسان بلکہ اللہ کے ان فرشتوں سے ایک فرشتہ تھا جو مشیت الہی کے تحت تدبیر کائنات پر مامور ہیں۔ البتہ ہمارے ولی اس کے مقابلہ میں پورے اترتے ہیں۔

کرامات کا معجزات سے بڑھیا ہونے کا شرعی ثبوت

اب نبوت سے ولایت کی
فہمیت کا اقرار انہی صوفیاء کی

زبان سے سنتے۔ اسی واقعہ سے آگے نہ کوہے :

حضرت عطارؒ فرماتے ہیں اگر کوئی اعتراض کرے تو اسے تخت بقیس مع بقیس کے ایک طرفۃ العین میں حضرت سلیمان ؑ کے پاس پہنچنے کی حکایت قرآن سے پڑھنی چاہئے۔ اگر اس پر ایمان ہے تو یہ اس سے سہل تر ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ :

”میری امت کے علماء پہلے انبیاء کی مثل ہوں گے (اور کرامات کا ظہور اس سے بھی بڑھ کر ہوتا رہا ہے)“ (مقرآن حق، ص ۴۳)

اب دیکھئے کہ صاحب مقرآن حق نے :

۱۔ تخت بقیس کے ساتھ مع بقیس کا اضافہ اپنی طرف سے کر لیا ہے۔

۲۔ جس حدیث سے (یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کَانَ جِیْءٌ بِکُمْ مِّنْ عِندِ اللّٰهِ لَعَلَّ کُمْ تَقْوٰی) آپ استدلال فرما رہے ہیں یہ حدیث آئمہ حدیث کے نزدیک مجروح اور ناقابل اجتماع ہے۔ علاوہ ازیں کہ کسی امتی کا (خواہ وہ امت محمدیہ ﷺ ہی سے کیوں نہ ہو) درجہ کسی بھی نبی کے برابر نہیں ہو سکتا۔

۳۔ پھر اس حدیث میں بھی ذکر علماء کا ہے۔ عباد، زہاد، صالحین، صوفیاء، اولیاء اللہ کا ذکر نہیں اور یہ تو ظاہر ہے کہ کشف و کرامات کا تعلق دوسرے گروہ سے ہے نہ کہ علماء سے۔

۴۔ پھر اس مجروح حدیث کے ساتھ برکیٹوں میں ان الفاظ کا اضافہ کرامات کا ظہور اس سے بڑھ کر ہوتا رہا ہے۔ اپنی طرف سے کر لیا ہے اور اس طرح یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ اگر ہمارے اولیاء اللہ کی کرامات

انبیاء کے معجزات سے زیادہ عظیم الشان ہیں، تو اس کی بھی شرعی بنیاد موجود ہے۔ اَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ۔

۲۔ رابعہ بصریہ کی پانی اور ہوا پر حکومت

”حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت رابعہ کو دجلہ کے کنارے بیٹھے دیکھا

میں نے اپنا مصلیٰ دجلہ میں ڈالا اور کہا: ”رابعہ! یہاں آکر نفل پڑھو۔“ آپ نے فرمایا: ”آپ اپنی بزرگی دنیا پر ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔“ پھر اپنا مصلیٰ ہوا میں پھادیا اور کہا: ”یہاں آؤ تاکہ دنیا کی نظر سے چھپ جائیں۔“ (مقربان حق، ص ۴۷)

اس کرامت پر تبصرہ کرنا کچھ زیب نہیں دیتا، کیونکہ شرعی نقطہ نظر سے اجنبی عورت اور مرد کا اس طرح کا اختلاط حرام ہے، خواہ وہ اولیاء اللہ ہی کیوں نہ ہوں، بلکہ اولیاء اللہ کے لئے اور زیادہ پرہیز ضروری ہے۔ پھر یہ واقعہ تاریخی لحاظ سے بھی غلط ہے، کیونکہ حسن بصری اور رابعہ بصریہ کی ملاقات بھی ثابت نہیں۔ حسن بصری کا سن وفات بالاتفاق ۱۱۰ھ ہے اور رابعہ بصری بقول بعض ۹۵ھ او بقول بعض ۹۹ھ میں پیدا ہوئیں۔ بچپن ہی میں آپ کو کسی نے پکڑ لیا، پھر آگے فروخت کر دیا۔ آپ کی پاک طبیعت کی وجہ سے مالک نے آپ کو آزاد کر دیا۔ (دائۃ المعارف الاسلامیہ ج ۱۰، ص ۱۹۲) اب ان حالات میں اندازہ فرمایجئے کہ ان کی ملاقات کا کوئی امکان ہے؟

۳۔ ہوائی سفر اور عثمان ہارونی

منقول ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی فرماتے تھے کہ ایک دفعہ میں خواجہ عثمان ہارونی کے ساتھ سفر میں تھا۔ ہم دجلہ کے

کنارے پہنچے تو کوئی کشتی موجود نہ تھی۔ خواجہ عثمان نے فرمایا ”تم اپنی آنکھیں بند کر لو۔“ میں نے ایسا ہی کیا۔ پھر جو آنکھیں کھولتا ہوں تو اپنے آپ کو خواجہ کے ہمراہ دریا کے اُس پار پاتا ہوں۔ میں نے خواجہ سے پوچھا: ”خواجہ آپ نے کیا کیا؟“ فرمایا: ”پانچ دفعہ سوہ فاتحہ پڑھی۔“

دیکھتے! اگر آپ پانچ دفعہ سوہ فاتحہ پڑھیں، تو چنداں فائدہ نہ ہوگا۔ بلکہ اگر صحابہ کرام بھی پڑھتے تو اس طرح کبھی دریائے دجلہ عبور نہ کر سکتے۔ مقصد اسی صوت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ پہلے کسی شیخ کامل کا فیض حاصل کر کے سورہ فاتحہ کی زکوٰۃ نکالی جائے۔ سوہ فاتحہ کی زکوٰۃ کیا ہے؟ اس کی تفصیل باب زیر عنوان ”ولایت کی تعلیم میں ملاحظہ فرمائیے!“

عثمان ہارونی صاحب نے اس سوہ فاتحہ کی زکوٰۃ سے کئی بار کرامات دکھلائی تھیں۔ جن کا ذکر اس کتاب میں مناسب مقامات پر آچکا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے اولیاء اللہ ہیں، جو اس کام میں یدِ طولی رکھتے تھے مثلاً:

۴۔ خواجہ ابوالحسنی چشتی (م ۳۲۹ھ) ”جب سفر کا ارادہ فرماتے، تو دو سو آدمیوں کے ساتھ آنکھ بند کر کے فوراً منزل مقصود پہنچ جاتے۔“ (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۵۲)

اب بتائیے کیا حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہوائی تخت بہتر تھا یا آپ کی یہ کرامت۔ جس میں آپ اپنے علاوہ مزید دو سو آدمیوں کو آنکھ جھپکنے میں منزل مقصود تک پہنچا دیتے تھے۔

۵۔ ایک اور ولی اللہ خواجہ مودوحشتی (م ۱۵۲۷ھ) کو طی الارض حاصل تھا۔ چنانچہ جب طواف کوجی چٹا ہوا کے ذریعہ مکہ مکرمہ پہنچ جاتے تھے۔ (تاریخ مشائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۵۹)

۵۔ حسین لاہوری کا کرشمہ بعد ازیں تو یہ ہوا پر حکومت اور طی الارض کا کسبِ فن اتنا عام ہوا کہ حسین لاہوری جیسے ولی بھی اس میں یدِ طولی رکھتے تھے۔ حسین لاہوری خود داڑھی مونچھ

چٹ، کسی کو اس وقت تک مرید ہی نہ بنانا جب تک وہ داڑھی نہ منڈانا اور شراب نہ پیتا۔ شراب کا ریا، ہر وقت صراحی و جام ساتھ رہتا۔ ڈھول کی تھاپ پر رقص کرتا اور ہندو لوندے مادھو لال سے عشق بازی فرمایا کرتا تھا۔ ایک شخص حاجی یعقوب مدینہ منورہ کا رہنے والا شیخ کو ہر روز روضہ نبوی ﷺ میں محکف دیکھتا۔ ایک دفعہ ہندوستان آیا تو حسین کو لاہوری میں شراب میں دھت، ڈھول کی تھاپ پر رقص کرتے دیکھ کر کھچاڑ کیا حال؟ حسین لاہوری کہا، آنکھیں بند کرو۔ اس نے آنکھیں بند کرتے ہی اپنے کو مدینہ منورہ میں اور حسین لاہوری کو روضہ نبوی ﷺ میں محکف پایا۔ وغیرہ (الاصفیاء) پھر ہی حسین لاہوری اپنے معشوق کو اسی طرح آنکھیں بند کر کے گنگا جل میں ابھٹان کرانے لے گیا اور پھر اسی طرح واپس لاہور بھی لے آیا تھا۔ اسی کرامت سے متاثر ہو کر مادھو لال مسلمان ہو کر حسین لاہوری کی بیعت ہوا، پھر خلیفہ بنا اور اسی عشق بازی کی بنا پر یہ دونوں پیرانِ طریقت لاہوریوں میں ایک ہی جگہ مدفون ہوئے۔ واضح ہے کہ حسین لاہوری نے بھی ۲۷ سال جنگوں میں ریاضت و مجاہدہ کیا تھا۔ یہ سب شعبہ بازیوں اسی مجاہدہ کا ثمرہ تھیں، لہذا یہ بات خوب فہم نشین کر لیجئے جس ولی اللہ نے صغریٰ زیادہ ریاضت و مجاہدہ جنگوں میں کیا ہوگا۔ اسی

طرح کی شہدہ بازیاں ضرور جانتا ہوگا۔ پھر ہمیں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تصوف اور کشف و الہام لازم و ملزوم ہیں اور تصوف و احسان دین کا اہم جز ہی نہیں بلکہ جسد میں رُوح کی مانند ہے، البتہ صحابہ کرام ؓ کو اس رُوح فی الجسد کی ضرورت نہ تھی۔

۱۔ ابو الحسن خرقانی قطبِ عالم کی ہوا پر حکومت

ابو الحسن خرقانی کے ایک مرید نے آپ سے اجازت چاہی کہ میں کوہِ لبنان میں جا کر قطبِ عالم کی زیارت کروں۔ آپ نے اجازت دے دی۔ جب وہ مرید وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک حبزہ رکھا ہے اور لوگ قبہ رُوم بیٹھے کسی کی انتظار کر رہے ہیں۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ قطبِ عالم آئیں گے اور اس کی نماز جنازہ پڑھائیں گے اور وہ پانچوں وقت یہاں تشریف لاکر ہر نماز کی امامت کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھتا ہوں کہ شیخ خرقانی تشریف لائے اور امامت کرائی۔ میں منظر دیکھ کر بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو لوگوں سے پوچھا کہ یہ امام صاحب کون تھے اور اب دوبارہ کب آئیں گے؟ جواب ملا کہ ”یہ ابو الحسن خرقانی تھے اور اب دوسری نماز کے وقت تشریف لائیں گے“ مجھے اپنے آپ پر سخت افسوس ہوا کہ آپ کا مرید ہونے کے باوجود اتنا بھی نہیں جانتا کہ قطبِ عالم آپ ہی ہیں اور خواہ مخواہ یہ دُور دراز کا سفر اختیار کیا۔ پھر جب نماز کا وقت ہوا آپ تشریف لائے اور امامت کرائی۔ جب سلام پھیرا تو میں نے آپ کا دامن پکڑ کر کہا۔ میں بے حد شرمندہ ہوں، براہِ کرم مجھے واپس لے چلیے۔ آپ نے فرمایا: ”اس شرط پر لے چلتا ہوں کہ جو کچھ یہاں دیکھا ہے، کسی کے سامنے بیان نہ کرنا۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی ہے کہ مجھ کو دنیا میں خلقت سے پوشیدہ رکھیں۔“ (صوفیائے نقشبند، ص ۱۱۰)

اس اقتباس سے درج ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ قطبِ عالم کا کوہِ لبنان سے بڑا گہرا تعلق ہے اور یہ تعلق اتنا مشہور و معروف ہے کہ آپ کے مرید بھی اس کا علم تھا۔

۲۔ کوہِ لبنان میں غالباً کوئی بہت بڑی مسجد ہے جہاں جنائے بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ اس مسجد کی امامت قطبِ عالم ہی کے سرِ اوار ہے۔

۳۔ آپ خرقان سے مہینوں کا سفر لمحوں میں طے کر کے دن میں پانچ بار کوہِ لبنان پر اکرامت فرمایا کرتے تھے۔ جب کہ حضرت لیمان ؑ کو ایک ماہ کا سفر طے کرنے میں ایک پہر یا تقریباً نین گھنٹے درکار ہوتے

تھے۔ لہذا آپ کی یہ کرامت حضرت سلیمان علیہ السلام کے معجزہ سے بہت بڑی ہے۔

۴۔ حضرت سلیمان علیہ السلام صرف ایک مقام پر موجود ہوتے تھے لیکن شیخ خرقانی صاحب بیک وقت خرقان میں بھی موجود رہتے تھے اور کوہ لبنان میں بھی موجود ہوتے تھے اور یہی ہمارے اولیاء اللہ کی وہ شان ہے جو انبیاء سے بڑھ کر ہے۔

۳۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات اور اولیاء اللہ

ہاتفِ غیبی یا ندائے غیبی | اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ایک بہت بڑی فضیلت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے بلا واسطہ فرشتہ کلام فرمایا۔ اور اس کا قرآن میں کئی جگہ ذکر فرمایا۔ اسی وجہ سے وہ کلیم اللہ مشہور ہوئے۔ لیکن ہمارے اولیائے کرام ہر وقت خدا سے مخاطب ہوتے، بالمشافہ سوال و جواب کرتے اور ہاتفِ غیبی کی آوازیں سنتے رہتے ہیں۔ اور ایسے واقعات اس کثرت سے ہیں کہ ان کا حصر ناممکن ہے۔ اور اس کتاب میں ضمناً بہت سے ایسے واقعات مذکور ہو چکے ہیں۔ پھر کچھ اولیاء اللہ ایسے بھی ہیں کہ ندائے غیبی کے ساتھ ایک مجمع بھی غیب سے برآمد ہوتا ہے۔ جس میں تیل ہوتا ہے۔ اور ندائے غیبی یوں پکارتی ہے کہ اس تیل کو درد کے مقام پر اس طرح لگاؤ۔ اور فلاں فلاں چیر کھاؤ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے۔ باب زیر عنوان ”نظام الدین عمری کا طریق تربیت۔“

یہ بھینسا | حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک معجزہ دیا گیا تھا کہ اپنا ہاتھ بغل میں ڈالتے پھر باہر نکالتے تو وہ روشن ہو جاتا تھا، لیکن ہمارے اولیاء بغل میں بھی ہاتھ نہیں ڈالتے بلکہ انگلیوں پر صرف پھونک مار دیتے ہیں تو وہ دھک سے شمع کی مانند روشن ہو جاتی ہیں مثلاً : ”نقل ہے کہ ایک بار حضرت حسن بصری اپنے اصحاب کے ہمراہ حضرت ابہ بصری کی زیارت کو گئے۔ ان کے پاس چراغ نہ تھا۔ آپ نے انگلیوں پر پھونک ماری۔ انگلیاں دھک سے شمع کی مانند روشن ہو گئیں۔“ (مقربان حق، ص ۴۶)

یہ کرامت اس لئے غلط ہے کہ حضرت ابہ بصری کی تاریخی اعتبار سے ملاقات بھی

ثابت نہیں کی جاسکتی۔ اور اس کی تفصیل ہم کسی دوسری جگہ پر لکھ چکے ہیں۔ پھر کچھ ایسے اولیاء اللہ بھی ہیں کہ ہر ایک مہمان کے لئے الگ الگ شمعیں روشن کرتے ہیں۔ پھر شمعیں اتنی راسخ ہوتی ہیں کہ چھونک مارنے سے نہیں بجھتیں۔ حتیٰ کہ اوپر مٹی ڈالنے سے بھی نہیں بجھتیں۔ چنانچہ جب احمد خضروفیہ کے ہاں ستر درویش مہمان ہوئے تو آپ نے ان کے لئے ایسی ہی ستر شمعیں روشن کی تھیں۔ اور ان شمعوں کا دوسرا کرشمہ یہ تھا کہ انہوں نے ۷۰ کافروں کے تاریک دلوں کو جانور کیا تھا اور وہ اسلام لے آئے تھے (مقرآن حق، ص ۱۸۰)۔ اسی طرح ایک دفعہ ابو بکر شبلی نے انہیں صفات کی حامل چالیس شمعیں مہمانوں کے لئے روشن فرمائیں لیکن ان شمعوں نے کسی کافر کے ظلمت کو روشن نہیں کیا تھا۔

(مقرآن حق، ص ۱۵۲)

لاٹھی مارنے سے چشمہ چھوٹنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک معجزہ یہ بھی تھا کہ جب آپ کی قوم نے پانی کا مطالبہ کیا۔ پینے کو پانی دُور دُور تک کہیں نہ تھا۔ ادھر ستر ہزار بنی اسرائیل پیا سے مرہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ پتھر (یا پہاڑ) پر اپنی لاٹھی مارو، تو اس سے بنی اسرائیل کے قبیلوں کی تعداد کے تناسب سے بارہ چشمے چھوٹ نکلے۔ اس میدان میں بھی ہمارے اولیاء اللہ کسی سے کم نہیں رہے۔ "ایک دفعہ ابولوسف سمان چشتی (م ۴۵۹) اپنے ہمراہیوں کے ساتھ گرمیوں میں تشریف لے جا رہے تھے سخت گرمی کے وقت رفتار کو پیاس لگی۔ پانی کہیں نہ تھا۔ حضرت نے اپنی لاٹھی پتھر پر ماری تو اس سے فوراً چشمہ ابھنے لگا۔" (ذریعہ شائع پست، مولانا زکریا، ص ۱۵۰)

عصائے حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک معجزہ یہ بھی عطا ہوا تھا کہ وہ اپنا عصا پھینکتے تو اڑدہا بن جاتا تھا۔ جہاں تک ہمارے علم کا تعلق ہے۔ ایسی کوئی کرامت کسی ولی اللہ سے ظاہر نہیں ہوتی۔ نہ ہی کسی تذکرہ نگار نے بیان فرمائی۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ خود بھی ایسی کرامت سے ڈرتے ہوں۔ ایک اور وجہ بھی ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ کرامت بیانی کا اصل مقصد تو عوام کو پیروں کے جال میں پھنسانا ہوتا ہے۔ ایسی کرامت دیکھ کر اگر لوگ ہدک جائیں تو ایسی کرامت دکھانے کا نفاذ ہ کے بجائے نقصان ہوگا۔ ایسی کرامت سے اولیاء اللہ اور تذکرہ نگاروں نے پرہیز ہی مناسب سمجھی۔ وہ اپنے عصا کو البتہ روشن کر سکتے ہیں مثلاً:

پیران پیر نے تھیلی پر سرسوں جاکر ایسا کرشمہ دکھلادیا تھا "عبداللہ زیاں کہتے ہیں کہ میں آپ کے مدسہ میں کھڑا تھا آپ عصا لے باہر آئے کس عصا سے کوئی کرامت دکھلائیں۔ آپ نے اسے پھینک کر سانپ نہیں بنایا، بلکہ زمین میں گاڑ دیا، تو وہ روشن ہو کر چمکنے لگا اور گھنٹہ بھر اس طرح چمکتا رہا۔ اُس کی روشنی آسمان پر چڑھتی جاتی تھی۔ وہ جگہ نور علی نور ہو گئی۔ (یعنی سورج کی روشنی بھی اور عصا کی بھی) گھنٹہ بعد آپ نے عصا زمین سے نکالا تو وہ اپنی پہلی حالت میں آگیا۔ پھر پیران پیر نے فرمایا: اے زیاں! تم اسی چیز کے خواہشمند تھے، "دیوبہ الاسرار" ص ۷۷۔ قلندار بجاہر ص ۲۶۔ بحوالہ سیرتِ غوث، ص ۱۵۷

اب بتلائیے اس کلامتے کوئی اہم دینی یا دنیوی غرض پوری کی ہے، اگر ایسا نہیں تو کیا اسے کرامت ہی کہیں گے؟

دَریا میں خشک راستہ بننا | حضرت مولے رحمۃ اللہ علیہ کو ایک معجزہ یہ بھی عطا ہوا تھا کہ آپ نے فرعون کے بت کے وقت دریا پر اپنا عصا مارا تو پانی درمیان سے کٹ

گیا اور پانی اپنی جگہ پر رُک گیا۔ اس میدان میں بھی ہمارے اولیاء اللہ حضرت مولے رحمۃ اللہ علیہ سے پیچھے نہیں رہے۔ ایک دفعہ دریائے دجلہ میں شدت کی طغیانی آئی اور لوگ حیران و پریشان ہو گئے۔ لوگوں کی استدعا پر پیران پیر اپنا عصا لے دریا کی طرف چل پڑے اور کنارے پر پہنچ کر اپنا عصا دریا کی اصلی مد پر نصب کر دیا اور دریا کو فرمایا بس یہیں تک۔ یہ فرمانا ہی تھا کہ اسی وقت پانی کم ہو کر آپ کے عصا مبارک تک

آگیا۔ (دیوبہ الاسرار، ص ۷۶۔ قلندار بجاہر ص ۲۸ بحوالہ سیرتِ غوث، ص ۱۸۲)

اب دیکھتے! دریا کی شدید طغیانی سے دریا کے آس پاس کا سارا علاقہ زیرِ آب آیا ہوا تھا اور اسی فوج سے لوگ پریشان تھے۔ ہم یہ تومان لیتے ہیں کہ پیران پیر پانی کے اوپر ہی اوپر چل کر دریا کے کنارے پہنچ گئے ہوں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پانی کی اصلی حد تک پانی میں آپ کا عصا نصب کیسے ہو گیا اور پانی کے اندر سے آپ کو کیسے معلوم ہو گیا کہ پانی کی اصلی حد یہ ہے۔ پھر آپ کے وہاں کھڑے کھڑے اتنا کثیر پانی فوراً اُڑ کر غائب بھی ہو گیا۔ حضرت نوح رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں سیلاب آیا تھا پانی جمع تو چالیس دن میں ہوا مگر اُترنے میں چھ ماہ لگ گئے۔ مگر پیران پیر میں اتنا کثیر پانی غائب فرماتے ہیں۔ آخر پیران پیر جو ہوتے۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ کا کسی دیوار پر گزرا ہوا۔ ملاح اہل ثروت سے دام لے کر کشتی

عبداللہ بن زید کا دریا کو خشک کر دینا

پر بیٹھا رہا تھا اور جن کے پاس دام نہ تھے اُن کو چھوڑتا جاتا تھا آپ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ دریا سے عبد الواحد کی طرف سے کہہ دو کہ خشک ہو جاوے۔ ان فقراء نے آپ کا پیغام پہنچا دیا۔ دریا اس قدر کم ہو گیا کہ لوگ بے تکلف گزر گئے۔“ (تاریخ مشائخ حث، مولانا ذکر بہا، ص ۱۲۷)

اب دیکھئے کہ : عبد الواحد خود دریا پر موجود ہیں۔ پھر بھی دریا کو پیغام ان غریبوں کے واسطے سے بھجواتے ہیں، جو آپ کے پاس ہی کھڑے تھے اور جنہوں نے آپ سے ایسی کوئی التجا نہ کی تھی۔ پھر دریا جو پایاب ہو گیا تو جو لوگ کشتی پر سوار تھے وہ بھی اُتر آئے ہوں گے کیونکہ اب کشتی تو چل ہی نہ سکتی تھی اور طاح جو مزدور بھی ہوتے ہیں آپ کو دُعائیں بھی دیتے ہوں گے کہ ان کی روزی کا ذریعہ چند فقراء پر اس ہمدی اور کرامت کی وجہ سے تم ہو گیا۔

حضرت علیؑ اور دریائے فرات کی طغیانی | ایک دفعہ کوفہ کے نواح کے لوگوں نے حضرت علیؑ سے شکایت

کی کہ دریائے فرات میں بڑی طغیانی آئی ہے اور ہماری فصلیں تباہ ہو گئی ہیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ پانی کا بہاؤ کوفہ کو بھی اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔ دُعا فرمائیے کہ پانی حد اعتدال سے نہ بڑھے اور لوٹ جائے۔ آپ نے یہ شکایت سنتے ہی سکر دو عالمؑ کا جبہ پہنا۔ (یاد رہے کہ یہ جبہ حضرت علیؑ اور حضرت عمرؓ رسول اللہؐ کے فرمان کے مطابق پہنے ہی خواجہ ادیس قمری کوئے آئے تھے) پیراہن نبویؐ بغل میں لیا۔ عصا محمدیؑ ہاتھ میں اور عمامہ محمدیؑ سر پر رکھا اور شہریوں کے ہمراہ دریائے فرات کے کنارے پہنچ گئے۔ دو رکعت نماز ادا کی اور فرات کے کنارے کھڑے ہو کر اسی عصا سے دریا کی طرف اشارہ کیا۔ ایک اشارے سے ہی ایک گز پانی اُتر گیا۔ اسی طرح آپ نے تین بار کیا اور تین گز پانی نیچے اُتر گیا۔ جب پتھ گز کی نو بوت آئی تو اہل شہر حلا اٹھے۔ ”یا حضرت! اس سے کم نہیں ہونا چاہئے۔ نہیں تو ہم پانی سے محروم ہو جائیں گے۔“ (غزینۃ الامنیاء، ص ۶۱)

اب دیکھئے کہ :

۱۔ حضرت علیؑ دریائے فرات کے کنارے پہنچ کر دو رکعت نماز ادا کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ طغیانی کا قصہ سراسر غلط ہے، کیونکہ کنارہ نوزیر آب تھا۔ وہ طغیانی ہی کیا ہوتی جس میں لوگوں سے دریا کے کنارے پہنچ کر دو رکعت نماز ادا کر لی جئے۔ ان دونوں میں ایک ہی بات ہو سکتی ہے، یا

طیانی ہی نہ آئی تھی یا پھر آپ نے کنا سے پہنچ کر نماز ادا نہیں کی تھی یا پھر شامیانی پر یہی معنی ڈال کر کر لی ہو۔

۲۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود بھی کوفہ کے رہنے والے تھے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ عصا سے اشارہ کرنے میں اتنے محتاط تھے کہ انہیں اتنا بھی معلوم نہ ہو سکا کہ اگرچہ حق بار بھی عصا سے اشارہ کر دیا، تو پانی کہاں سے پس گئے۔ لوگ چلاتے تو پھر آپ عصا کے اشارے سے رُکے۔ اگر لوگ نہ چلاتے تو عصا کے اشاروں سے دریا کو کیسے خشک ہی کر چھوڑتے، تو کیسا برا حال ہوتا۔

مہم متفرق کرامات جو معجزات کا چہرہ ہیں

یا نَارُ کُونِی بَرْدًا وَسَلَامًا | یہ معجزہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے۔ جب آپ نے توحید باری کی خاطر اپنے آپ کو آگ میں جھونک دیا جانا بھی گوارا کر لیا تب جا کر اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ دکھلایا اور آگ کو حکم دیا کہ "حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے ٹھنڈی اور سلامتی والی بن جا۔" چنانچہ آگ گلزار بن گئی اور آپ اس میں سے صمیم سلامت باہر نکل آئے۔ لیکن رفاہی سلسلہ کے پیروں فقیروں نے اپنی ولایت کا معیار ہی یہ مقرر کیا ہوا تھا کہ وہ آگ میں کود جاتے اور آگ ان پر اثر نہیں کرتی تھی۔ اگرچہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ان کی اس شعبہ بازی کا پول کھول کے رکھ دیا تھا۔ مگر یہاں بحث یہ تو ہے ہی نہیں کہ ان کا یہ فعل شعبہ بازی تھا یا کرامت۔ یہاں سوال یہ ہے کہ یہ اولیاء اللہ لوگوں کو ایسی کرامات دکھلا سکتے ہیں۔ اور جب چاہے دکھلا سکتے ہیں تو پھر ان کے طلسم کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معجزہ کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے؟

اسی طرح عثمان ہارونی صاحب ام، ابابکر شہر بنائے دعویٰ اور محض اپنی ولایت کی نمائش کی خاطر دکھلا دیا تھا۔ ہوا یہ کہ:

"ایک دفعہ آپ آتش پرستوں کے شہر تشریف لے گئے اور نصیحت کی کہ آگ قابلِ پستش چیز نہیں اگر تم اس کی پوجا کرتے ہو تو مجھ پر یہی نہیں جلائے گی۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور اگر اس کی پوجا نہ کرو گے تو یہ آخرت میں نہیں جلائے گی۔" وہ کہنے لگے "اچھا! آپ آگ کو نہیں پوجتے تو اس میں جا کر دکھلائیے کہ جلاتی ہے یا نہیں۔" آپ نے یمن کو حضور فرمایا اور دو گانہ ادا کیا اور سردار کے ایک کسں بچے کو گود میں لے کر اس آگ میں

چلے گئے۔ اور دو گھنٹہ اس میں ہے۔ آگ نے پختہ تک میں کوئی اثر نہیں کیا۔ یہ ولایت ابراہیمی تھی، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معجزہ کا پر تو تھا۔ اس پر وہ سب کچھ سب مع اس سردار کے مسلمان ہو گئے۔“ تاریخ مشرقِ چشت۔ مولانا کریم، ص ۱۶۴

اس اقتباس میں درج ذیل امور قابلِ غور ہیں :

- ۱۔ ولایت ابراہیمی کے الفاظ لاکر شیخ احمد ریت مولانا زکریا صاحب نے صوفیائے کے اس عقیدہ کی طرف واضح اشارہ فرمادیا کہ نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہے۔
- ۲۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کافروں نے اپنے بتوں سے گستاخی کی سزا کے طور پر انتقاماً آگ میں جھونک دیا۔ آپ کو مجبوراً اور اضطراباً آگ میں جانا پڑا، لیکن ہارونی صاحب اپنی مرضی سے اور برہنہ دعوئے اس میں داخل ہوتے ہیں۔
- ۳۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قطعاً یہ یقین نہ تھا کہ آگ ان پر کوئی اثر نہ کرے گی۔ وہ اپنی جان، جانِ آفرین کے سپرد کرنے پر تیار تھے۔ جبکہ ہارونی صاحب کا مقصد کرامت کا اظہار تھا۔
- ۴۔ اس اقتباس میں یہ بات کہ سردار کے پتھر کو ہارونی صاحب اپنے ساتھ آگ میں لے گئے۔ ”غلاماً محال ہے۔ کیونکہ سردار تو اپنا پتھر اسی صُوت میں ہارونی صاحب کے حوالے کر سکتا تھا کہ اسے بھی ہارونی صاحب کی طرح پہلے یقین ہونا کہ آگ اس پر کچھ اثر نہ کرے گی۔ اگر انہیں پہلے سے یقین ہوتا تو وہ ہرگز امتحان نہ لیتے۔
- ۵۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب آگ سے صحیح سلامت نکلے تو ایک شخص بھی اسلام نہ لایا، مگر جب ہارونی صاحب آگ سے صحیح سلامت نکلے ہیں، تو سب کے سب مسلمان ہو جاتے ہیں۔ اب جس معاملہ کی ابتداء مقصد اور نتیجہ سب میں تضاد ہو، تو پھر ہارونی صاحب کی یہ کرامت معجزہ ابراہیمی علیہ السلام کا پر تو کیسے ہوا، بلکہ اس سے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ ہارونی صاحب کی کرامت کے مقابلہ میں بالکل ہیچ تھا۔

شیخ ابوالحسن خرقانی کا ذکر چل رہا ہے :

آگ میں کودنے کی مقابلہ بازی

”ایک روز شیخ المشائخ ابوالعباس آپ (ابوالحسن خرقانی

کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو آپ کے سامنے پانی کا بھرا ہوا ایک طشت رکھا تھا۔ شیخ انشت نے پانی میں اتھ ڈال کر ایک زندہ مچھلی نکال کر آپ کے سامنے رکھ دی۔ شیخ خرقانی کے قریب ایک گرم

تصور تھا۔ آپ نے اس میں ہاتھ ڈال کر ایک زندہ مچھلی شیخ المشائخ کے سامنے رکھ دی اور فرمایا کہ پانی میں سے مچھلی نکالنا آسان ہے۔ آگ سے نکالنی چاہئے شیخ المشائخ نے کہا۔ آؤ ہم دونوں اس جلتے ہوئے تنور میں کود پڑیں اور دیکھیں کہ کون اس میں سے زندہ نکلتا ہے۔ اس پر شیخ خرقانی نے فرمایا: ”آؤ ہم اپنی نیستی میں غوطہ لگا دیں اور دیکھیں کہ اس کی ہستی سے زندہ ہو کر کون باہر نکلتا ہے۔“ یہ سن کر شیخ المشائخ ابوالعباس خاموش ہو گئے۔ “ (صوفیائے نقشبند، ص ۱۰۸)

اقباس بالا سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

- ۱۔ شیخ المشائخ کے لئے کم از کم اتنی کرامات ہونا ضروری ہیں کہ وہ (۱) پانی کے طشت میں ہاتھ ڈال کر زندہ مچھلی نکال سکتا ہو۔ (ب) دعوے کے ساتھ آگ میں کود جائے۔ پھر اس پر آگ کچھ اثر بھی نہ کرے۔
- ۲۔ شیخ خرقانی کے مقابلہ میں شیخ المشائخ کی یہ کرامات بالکل ہیچ تھیں کیونکہ آپ (۱) پانی کے بجائے آگ سے بھی دعوے کے ساتھ زندہ مچھلی نکال سکتے تھے۔ اور (ب) آگ لوگوں کو جلا کر مارتی ہے پھر بھی مادی جسم کے اجزاء کسی نہ کسی صورت میں باقی رہ جاتے ہیں۔ پوری نیستی نہیں ہوتی۔ شیخ المشائخ انہیں جلے ہوئے اجزاء سے غالباً دوبارہ زندہ ہو کر نکلتے ہوں گے، مگر شیخ خرقانی نے جو مکمل نیستی کے سمنہ میں غوطہ لگانے کا ذکر کیا، تو شیخ المشائخ کے لئے چُپ ہو جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا، کیونکہ شیخ خرقانی دعوے کے ساتھ نیستی کے سمنہ میں غوطہ لگانے کے بعد بھی واپس آ سکتے تھے۔
- ۳۔ ولایت کے اس مقابلہ میں شیخ المشائخ نے بالآخر زک اٹھائی اور اس کی وجہ شلیہ یہ بھی ہو کہ انہوں نے خود مقابلہ کی دعوت دی تھی۔

شیخ محمد فضیل قادری نوشاہی (م ۱۱۱۱ھ) اور چٹان کا پھٹنا

”دور نبوی میں جبکہ خندق کی کھدائی کے دوران ایک سخت چٹان آگئی۔ جس کی وجہ سے کھدائی رگ گئی۔ ادھر دشمن سر پر آ رہا تھا۔ صحابہ کرام ؓ نے عاجز آ کر رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دی، تو آپ نے گیتی پکڑ کر زور سے ضرب لگائی اور نعرہ بجکر بند کیا، تو یخت پتھر پاش پاش ہو گیا اور یہ آپ کا معجزہ تھا۔

اب شیخ محمد فضیل قادری، نوشاہی کی کرامت بھی ملاحظہ فرمائیے :

”نقل ہے کہ کابل کے ایشاہی باغ میں پہاڑ کی ایک چٹان آگری۔ وہ اس قدر وزنی تھی کہ اٹھائے

نہیں اٹھتی تھی۔ باغبان لوگ آپ کی خدمت میں آتے اور چٹان اٹھانے میں مدد مانگی۔ آپ نے چٹان کے قریب کھڑے ہو کر ”اللہ کا نعرہ لگایا۔ چٹان اسی وقت پھٹ گئی اور اُس کے ٹکڑے دُور دُور جا پڑے۔ زمین خالی ہو گئی۔“ (غزیتہ الاصفیاء، ص ۲۷۸)

اب دیکھتے یہ کرامت کئی لحاظ سے معجزہ نبوی ﷺ سے بڑھیا ہے۔ ایک تو رسول اللہ ﷺ نے گیتی استعمال فرمائی، لیکن فضیل صاحب کو اس کی بھی ضرورت نہیں پڑی مددِ خدقِ والی چٹان پھٹنے کے بعد وہیں کی وہیں رہی، لیکن شیخ صاحب کی پھٹی ہوئی چٹان کے ٹکڑے بھی دُور دور پڑ کر زمین بھی خالی ہو جاتی ہے۔

۵۔ چند دلچسپ کرامات

یہاں ہم ایسی کرامات درج کریں گے، جو محض اولیائی کی تلاش کھیلے تیار کی گئی ہیں اور کوئی دینی یا دنیوی اہم غرض پوری نہیں کرتیں۔
حضرت ابراہیم بن ادھم کا ذکر ہوا ہے :

”نقل ہے کہ ایک بار آپ نے کنویں میں ڈول ڈالا۔ نکالا تو چاندی سے بھرا ہوا تھا۔ پھینک دیا پھر ڈالا، تو سونے سے لبریز آیا، اُسے بھی الٹ دیا۔ پھر نکالا، تو موتیوں سے بھر پور تھا۔ کہنے لگے : ”الہی! مجھے خزانہ نہیں چاہتے، پانی چاہتے تاکہ میں وضو کروں اور تیری بندگی بجالاؤں۔“ اللہ اللہ !“ (مقربان اب دیکھئے کہ حضرت ابراہیم بن ادھم کو ضرورت تو پانی کی ہے، وہ تو آتا نہیں اور سونے چاندی اور موتیوں کے ڈول نکلتے آرہے ہیں۔ لہذا ایسی ”کرامت“ کرامت نہیں، کچھ اور ہی چیز ہے۔ یا پھر یہ واقعہ ہی من گھڑت ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور گراہوا دی

”ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ درہ ہاتھ میں پکڑے جا رہے تھے۔ ایک دی فروش راہ میں کھڑا دیکھ رہا

تھا۔ آپ نے پوچھا : ”کیا ہوا؟“ کہنے لگا : ”میرا دی زمین پر گر گیا۔ زمین اس دی کو نگل گئی۔“ حضرت عمرؓ کو اُس کی سادگی پر ہنسنے آیا۔ آپ نے زمین پر درہ مار کر کہا : ”زمین ! اس غریب کا دی واپس کر دو۔ ورنہ انصاف کے درے سے تمہیں سزا دلواؤں گا۔“ زمین اسی وقت پھٹ گئی اور وہ دی جو نگل چکی تھی اس دی فروش کو لوٹانے میں کامیاب ہو گئی۔ اُس نے ہنسنے بھرا اور چلتا ہوا۔“ (غزیتہ الاصفیاء، ص ۵۶)

اب دیکھئے کہ :

۱۔ اگر دہی زمین پر گر جائے، تو زمین صرف اس میں موجود پانی کو جذب کرتی ہے۔ دہی کا اصل مواد زمین کے اوپر ہی رہتا ہے۔ چنانچہ جب دہی فروش نے کبھا کہ میرا دہی زمین نکل گئی، تو حضرت عمر نے اس بات کو ماننے کے بجائے اس کی سادگی پر محمول فرمایا۔

۲۔ تاہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ترس کھانے کی وجہ سے اور زمین کے اس ظلم کی وجہ سے زمین کو دوزخ ماری دیا۔ اور مزید سزا کی وعید بھی سنائی، تو زمین واقعی پھٹ گئی اور دہی جو کھا گئی تھی اسے واپس بھی لوٹا دیا۔ تب تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی یقین آگیا ہو گا کہ دہی فروش سادہ ہی نہ تھا بلکہ سچا بھی تھا۔

۳۔ اب جو دہی فروش نے دہی سے اپنا برتن بھرا، تو اس میں تو زمین کے مٹی کے ذرات بھی ضرور شامل ہوں گے۔ اس بات پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انصاف حرکت میں نہ آیا کہ دہی فروش اپنی دہی کے ساتھ مٹی کے ذرات بھی لے گیا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ زمین دوزخ کھا چکی تھی۔ اس لئے اس نے اپنے ظلم کی شکایت ہی نہ کی ہوگی۔

۳۔ سری سقطی کی بھنگن

”ایک روز شیخ کی بہن آئی۔ دیکھا کہ گھر میں ہر طرف کوڑا کرکٹ بکھرا پڑا ہے، شیخ سے جھاڑو دینے کی اجازت مانگی۔ آپ نے اجازت نہ دی۔ دوسرے روز شیخ کی بہن پھر آئی۔ دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت گھر میں جھاڑو دے رہی ہے۔ کہا ”سبحان اللہ! بھئی تو جھاڑو دینے کی اجازت نہ دی مگر اس نامحرم عورت کو دے دی“ فرمایا: ”اے ہمشیر! یہ بوڑھی عورت نہیں ہے، یہ دنیا ہے، جو میرے عشق میں جلتی تھی اور مجھ سے محروم تھی۔ اب اس نے اللہ سے چاہا کہ اپنا نصیب مجھ سے حاصل کرے۔ اس لئے اس کو میری جاؤب کشی کا حکم پہلے ہے۔“ (غریۃ الاصفیاء ص ۱۳۲)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ :

۱۔ سری سقطی گھر میں رہائش پذیر تھے۔ بس عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ گھر کی صفائی کا مطلق خیال نہ ہوتا تھا۔ نہ آپ کو نہ آپ کے گھر والوں کو۔ بس ہر طرف کوڑا کرکٹ ہی بکھرا رہتا تھا۔

۲۔ دنیا بڑی بدست ہے اس عاشق الہی کے عشق میں جل رہی تھی اور شیخ سے اپنا نصیب حاصل کرنے کی دعا بھی کرتی رہی تھی، مگر اس کی یہ دعا اسی روز ہی قبول ہوئی، جب آپ کی بہن نے شیخ کے گھر میں کوڑا کرکٹ کا ڈھیر دیکھا۔

۴۔ شاہ مقیم حجرہ والے کا درجہ کا علاج ”نقل ہے کہ آپ کے برادر حقیقی کی بیوی کو وضع حمل کے وقت شدت کا درد ہوا۔ شاہ مقیم صاحب سے

دُعا کی درخواست کی گئی تو فرمایا: ”انشاء اللہ درد دور ہو جائے گا اور نہ ہے گا۔“ آپ کی زبان سے یہ لفظ نکلتے ہی آپ کی بھانجہ کا عمل غائب ہو گیا اور جب تک زندہ رہیں، حاملہ نہ ہوئیں۔“ (غریبۃ الاصفیاء، ص ۴۴۹)
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ سے دُعا کی درخواست کی گئی، تو آپ سخت جلالت میں تھے کہ دُعا بددعا سے بدل گئی اور بیچاری بھانجہ کو ہمیشہ کے لئے بانجھ بنا دیا۔ دراصل خاندانی منصوبہ بندی والوں کو ایسے اولیاء اللہ کی بہت ضرورت ہے، مگر افسوس یہ محکمہ دیر بعد معرض وجود میں آیا ہے۔

۵۔ میاں میر بالا پیر اور سانپ کا طواف
ایک روز آپ دریائے راوی کے کنارے بیٹھے تھے کہ ایک باریاہ آپ کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور ایسی زبان میں گفتگو کی جسے کوئی اور نہ سمجھ سکتا تھا۔ پھر تین بار آپ گئے کہ طواف کیا اور لوٹ گیا۔ حاضرین کے دریافت کرنے پر آپ نے فرمایا: ”سانپ یہ کہتا تھا کہ میں نے عہد باندھ رکھا تھا کہ جب آپ کو دیکھوں گا، تو تین بار آپ کا طواف کروں گا۔ میں نے اجازت دے دی اور وہ طواف کے چلا گیا۔“ (غریبۃ الاصفیاء، ص ۷۳۷)
اب دیکھئے کہ :

- ۱۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو صرف منطق الطیر کھلائی گئی تھی، لیکن بالا پیر انہوں کی بولی بھی سمجھتے تھے۔
- ۲۔ کسی جاندار نے کسی نبی کا طواف نہیں کیا، کیونکہ طواف ایک عبادت ہے جو صرف اللہ کے گھر کے لئے سزاوار ہے، لیکن سانپ نے اس شرکِ کبیر کا عہد باندھا تھا۔
- ۳۔ سانپ ایک غیر مکلف مخلوق ہے، جسے شرعی عبادات کا نہ علم ہو سکتا ہے نہ شعور۔ لہذا یہ قصہ ہی سراسر غلط ہے۔
- ۴۔ ان سب باتوں کو اگر درست تسلیم کر بھی لیا جائے تو بتلایئے کہ اس سے کون سی ایم دینی یا دنیوی غرض پوری ہوئی۔ سوائے اس کے کہ میاں میر صاحب کی ولایت کی نمائش ہو۔ پھر یہاں سند ولایت کی ضرورت بھی نہیں۔ کیونکہ حاضرین آپ کو پہلے ہی ولی سمجھتے تھے۔

بات وہی ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں کہ طیفہ عوام پر اپنی اولیائی کی صھاک بٹھانے کے لئے ایسی کراہتیں تراشتا اور پھر انہیں مشہور کرتا رہتا ہے۔

دلائل صوفیاء

اس باب میں ہم ایسی باتوں کا ذکر کریں گے جن کی کچھ نہ کچھ صورت شریعت میں موجود ہے۔ ہمارے صوفیہ نے ان امور میں غلو سے کام لے کر اور انہی امور کو پوری شریعت سمجھ کر ان پر دین طریقت کا عمل کھڑا کر دیا ہے۔ پھر اس عین طریقت کو شریعت ہی سے مانع و ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

۱۔ مجاہدہ اور ریاضت

مجاہدہ و ریاضت کو جائز ثابت کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کے قبل از بعثت غارِ حرا میں تشریف لے جانے اور وہاں قیام فرمانے سے استدلال کیا جاتا ہے۔ یہ استدلال کئی لحاظ سے غلط ہے، مثلاً:

۱۔ یہ واقعہ قبل از بعثت کا ہے، جو حجت نہیں بن سکتا۔ پھر آپ نے اس قسم کے مجاہدہ سے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کو سختی سے منع بھی فرمادیا، جو صوفیوں کے ہاں رائج ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کسی نے بھی اس قسم کا مجاہدہ نہیں کیا۔ نہ ہی آپ نے کبھی ایسا مجاہدہ کیا۔ گویا آپ کو پہلی وحی کے بعد ہی ایسے مجاہدہ سے انکھال گیا تھا۔

۲۔ غارِ حرا آپ کے گھر سے صرف چند میل کے فاصلہ پر تھا۔ آپ ہر تیرے چوتھے دن گھر تشریف لاتے تھے اور گھر سے آب و دانہ ساتھ لے جاتے تھے۔ پھر آپ نے اپنی بیوی اور بال بچوں سے بھی تعلق منقطع نہیں کیا تھا۔ جبکہ ہمارے بزرگ کئی کئی سال جنگلوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ نکاح نہیں کرتے اور اگر پہلے سے شادی شدہ ہوں تو بیوی بچوں سے تعلق منقطع کر لیتے ہیں۔ پھر آب و دانہ کا انتظام تو درکنار، یہ نفس کو مارنے کے لئے بھوکوں رہنا پسند فرماتے ہیں۔ ان کے ہاں جو مقولہ معلول الفقراء الجوع رائج ہے۔ یہ اس کی پابندی ضروری خیال کرتے ہوئے ایسے فقر کے متلاشی ہوتے ہیں جس کی سرحدیں قدیم رہبانیت سے ملتی ہیں۔ اسلامی فقر سے ان کا چنداں تعلق ہوتا۔

۳۔ دیکھئے بابائیں عبادات میں ہر گز کے کمت

۳۔ آپؐ غارِ حرا میں جا کر ذکر و فکر الہی میں مشغول رہتے تھے جبکہ یہ حضرات مختلف اور دو وظائف کے چلتے تھے ذریعے تغیرِ جنات اور کلمات کے حصول کا فن سیکھتے ہیں۔

اب ان اولیاء اللہ کے مجاہدات کا مختصر ذکر بھی ملاحظہ فرمائیے :

۱۔ بایزید بسطامی (م ۲۶۱ھ) تیس سال تک شام کے جنگوں میں ریاضتِ مجاہدہ کرتے رہے۔ ایک سال آپ (بسطام سے) حج پر گئے تو ہر قدم پر دو گنا ادا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بارہ سال میں محکمہ معظّم پہنچے اور فرمایا کہ "دنیا کے بادشاہ کی بارگاہ نہیں، جو کبارگی چلا جائے۔" (صوفیائے نقشبند، ص ۸۹)

۲۔ عبدالواحد بن زید (م ۷۸۸ھ) آپؐ نے بیعت سے قبل چالیس سال مجاہدہ کیا۔ (تاریخ شام، ج ۱، ص ۱۲۲) ۳، ۴۔ ابو بھیرہ بصری (م ۲۸۷ھ) اور عطاء اللہ دینوری (م ۲۹۸ھ) دونوں نے تیس تیس سال مجاہدہ فرمایا۔ (ایضاً ص ۱۳۷-۱۳۹)

۵۔ شریفِ ندنی (م ۵۸۰ھ) چالیس سال ایک متوحش جنگل میں قیام فرمایا اور درختوں کے پتوں پر گزارا کرتے رہے۔ (ضلع) ۶۔ عثمان ہارونی (م ۶۰۳ھ) آپؐ نے ستر (۷۰) سال مجاہدہ فرمایا۔ ساتویں دن منہ بھر پانی پیتے تھے۔ (ایضاً ص ۱۶۳) ۷۔ نظام الدین عمری (م ۱۰۲۳ھ) نے اس قدر سخت مجاہدہ کیا کہ حجرہ کے دروازہ پر دیوار کھینچ لی تھی اور اندر ہی مہینہ بھر تک رہے۔ (ایضاً ص ۲۱۳)

۸۔ پیرانِ پیر شیخ عبدالقادر جیلانی (م ۵۷۱ھ) فرماتے ہیں کہ مدتِ مدید تک شہر کے ویران اور بے آباد مقامات پر زندگی بسر کرتا رہا، پچیس سال تک عراق کے جنگلوں میں تنہا پھرتا رہا۔ ایک سال تک ساگ، گھاس اور پھینگی ہوئی چیزوں پر گزارا کرتا رہا اور پانی مطلقاً نہ پیا۔ پھر ایک سال تک پانی بھی پیتا رہا۔ پھر تیس سال صرف پانی پر گزارا کرتا رہا پھر ایک سال نہ کچھ کھایا نہ پیا اور نہ ہی سویا۔ (طبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۲۹۹ جامع کلمات اولیاء، ج ۱، ص ۲۰۲۔ علامہ اعجاز ص ۱۱۰ بحوالہ غوث الثقلین، ص ۸۰)

غالباً پہلے بزرگ جنہوں نے مجاہدہ کے لئے اٹھا لکھتا بھی ضروری سمجھ کر اس کا آغاز فرمایا وہ خواجہ محمد حشتی ہیں۔ چن چن

صاحب سیر الاولیاء لکھتے ہیں کہ :

۹۔ معکوس لٹک کر عبادتِ الہی کرنا۔ منقول ہے کہ خواجہ محمد حشتی (م ۷۴۱ھ) اکثر اوقات عالمِ تجرید میں ڈوبے رہتے تھے اور سالہا سال آپؐ کا مبارک پہلو زمین پر نہ پہنچتا۔ آپؐ مجاہدہ کے انتہائی درجہ اور غلبہ شوق میں سسنگوں ہو کر عبادت کرتے تھے۔ آپؐ کے مکان میں ایک عقیق اور گہرا کنواں تھا۔ اس میں اٹھ لٹک کر عبادتِ الہی میں مصروف

پھر بعض اولیاء اللہ ایسے بھی پیدا ہوئے جنہوں نے مجاہدہ میں منکوس لیکن کے علاوہ جس دم کو بھی ضروری سمجھا صاحب خزانۃ الاصفیاء لکھتے ہیں کہ :

۱۰ شیخ عبدالرحمن نوشاہی (م ۱۱۵۲ھ) "مجاہدہ یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ تمام رات جس دم ذکر خفی کرتے اور بعض اوقات منکوس لٹک کر رات بھر ذکر میں مشغول رہتے۔ خلوت اختیار کرتے تو قبر کھدوا کر اس میں بیٹھ جاتے اور اوپر سے بند کر دیتے۔ چالیس چالیس روز ایسی حالت میں مراقبہ اور ذکر و فکر میں محو رہتے" (ذخیرۃ الاصفیاء، ص ۳۰۵)

اب آپ خود ملاحظہ فرمائیے کہ ان حضرات کے مجاہدہ و ریاضت اور رسول اللہ کے قیم خارجہ میں کوئی نسبت؟

۲۔ بیعت

بیعت دین طریقت میں شہولیت کے لئے لازمی امر اور اس کا اہم رکن ہے۔ لیکن اسلام میں اس بیعت کی یہ اہمیت ہرگز نہیں۔

بیعت دو قسم کی ہوتی ہے۔

(۱) بیعت، اطاعتِ خلیفہ یا امیر: اسلام میں یہ بیعت ضروری قرار دی گئی ہے تاکہ مسلمان تشدد و انتشار کا شکار نہ ہوں۔ اسی لئے آپ کا ارشاد ہے: "کہ اگر دو غلیفوں کی بیعت ہونے لگے، تو بعد والے کو قتل کر دو۔" ظاہر ہے کہ اس قسم کی بیعت کا اطلاق ان اولیاء اللہ کی بیعت پر نہیں ہو سکتا اور اس کی منہ جو ذیل وجوہ ہیں :

۱۔ اس پورے شجرہ طریقت میں کوئی بزرگ ایسا نہیں جسے زہم کا یا خلافت نصیب ہوئی۔ یہ حضرات حسن بصری کے ذیل حضرت علی ؓ تک سلسلہ ملا تے تو ہیں، مگر محدثین اور محققین کے نزدیک ان کی طاقت بھی ثابت نہیں۔

۲۔ اس سلسلہ طریقت میں کئی ایک بزرگ بیک وقت موجود ہوتے ہیں اور الگ الگ بیعت لیتے رہتے ہیں۔ لہذا ان حضرات کی بیعت کا اس بیعت سے چٹا تعلق نہیں، جسے اسلام میں اہم کی اطاعت کے سلسلے میں ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ایسی بیعت صرف ایک ہی امام کی ہو سکتی ہے۔

پھر ایسی بیعت بھی ممکنہ کے تمام مسلمانوں کے لئے ضروری نہیں۔ بلکہ دار الخلافہ کے مسلمانوں کی بیعت تمام مملکت کے مسلمانوں کی بیعت سمجھی جائے گی۔

دوسری قسم کی بیعت کسی بھی بزرگ کے ہاتھ پر کسی نبی کے نام یا خدا کے احکام کی تعمیل کی شکل میں ہو سکتی ہے مثلاً:

۱۔ بیعت رضوان : یہ وہ بیعت ہے جو رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر موجود صحابہ سے جان کو جان آفرین کے سپرد کرنے کے سلسلے میں لی تھی۔ یہ بیعت بھی ان اولیاء اللہ کے کام کی چیز نہیں۔ کیونکہ یہ حضرات

جہاد اکبر (نفس کشی) کے مقابلہ میں جہاد اصغر (جہاد باسیف یا جان جان آفرین کر دینے کو چننا) اہمیت نہیں دیتے۔
۲۔ بیعت نسواں : یہ بیعت رسول اللہ نے چند شہ سی احکام کی پابندی پر لی تھی۔ جن کا ذکر قرآن کریم میں مذکور ہے۔ تمام مسلمان عورتوں سے یہ بیعت نہیں لی گئی، لیکن جس قسم کی غیر مشروط اطاعت (یعنی غیر شہ سی احکام کی تعمیل) یہ بزرگ حضرات اپنے مریدوں سے لیتے ہیں۔ اس قسم کی بیعت قطعاً حرام ہے۔ جس کی چند مثالیں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔
بیعت اگر مسنون طریقہ سے احکام شرعیہ کی پابندی کی بنیاد پر کی جائے، تو اس کا فائدہ ضرور ہے۔ بیعت لینے والا مرشد مرید نظر رکھتا ہے اور مرید بھی ایسا ہے وعدہ اور یادگیری کی بنا پر اس کو پاس رکھتا ہے، لیکن اس فائدہ کے باوجود یہ بیعت اسلام میں ضروری قرار نہیں دی گئی۔ اولیں قرنیہ کو رسول اللہ ﷺ نے مسلمان ہی نہیں خبیثہ اہل بعین کے لقب سے نوازا۔ حالانکہ اولیں قرنیہ نے آپ کی بیعت تو دو رکہ کر، آپ کو دیکھا تک نہ تھا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام میں اس بیعت کو لازم قرار نہیں دیا گیا۔ جبکہ دین طریقت میں بیعت اہم رکن سلوک سمجھا جاتا ہے۔ جس کے بغیر سلوک کی منازل طے کرنا ممکن نہیں۔

اویسی نسبت

بیعت کے سلسلہ میں صوفیہ نے ایک اور شاندار کارنامہ سر انجام دیا ہے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ اولیں قرنیہ نے رسول اللہ ﷺ کو نہ دیکھا نہ بیعت کی، تو ان کی ارواح کی آپس میں بیعت کرادی۔ اور اسے نسبت اویسیہ کا نام دیا اور راستہ کی اس رکاوٹ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ فلاں شیخ کی فلاں شیخ سے ملاقات ہی ثابت نہیں، یا پیر کی وفات کے بہت عرصہ بعد مرید کی پیدائش ہو تو وہ ہی نسبت اویسیہ قائم کر کے اپنا سلسلہ جاری فرما کر لے جاتے ہیں ان پر براہ راست رسول اللہ ﷺ کے اویسی ہیں۔ اسی طرح ابوالحسن غرقانی بایزید بطنی کے اویسی ہیں۔ حالانکہ ان میں چھ واسطے ہیں، جو اس طرح ہیں۔ ابوالحسن غرقانی۔ ابو ظفر ترک طوسی۔ خواجا اعرابی خواجہ محمد مغربی۔ بایزید بطنی۔ لیکن سلسلہ طریقت میں بایزید کے بعد فوراً دوسرا نمبر ابوالحسن کا آتا ہے (صرفیائے نقشبند ص ۱۲۳) اسی طرح حضرت ایشاں کی خواجہ بہاؤ الدین نقشبند سے نسبت اویسیہ محمدیہ (ص ۲۶) پیر طریقت کی طرح نسبت میں بھی علی و فضل کا سلسلہ چلتا ہے یعنی اولیاء اللہ دو کسے اولیاء کی یہ نسبت سلب بھی کر لیتے ہیں مثلاً مولانا درویش محمد (م ۱۹۷۰ء) سے جب کوئی درویش ملے آتا تو آپ اس کی نسبت سلب کر لیا کرتے تھے (ایضاً ص ۱۸۵) اسی طرح شیخ محمد ہار بندگی لاہوری بھی (م ۱۹۵۰ء) بھی دوسروں کی نسبت چھین لیا کرتے تھے۔

پھر یہ اویسی سلسلہ صرف نسبت میں ہی نہیں چلتا۔ خلافت میں بھی چلتا ہے۔ گویا ابوالحسن غرقانی بایزید کے اویسی ظیفہ ہیں۔ ان صوفیاء نے خلافت کے ساتھ ساتھ ذیل طریق اختیار کر رکھے ہیں۔ جن میں آخری طریق ”اویسی“ ہے۔
خلافت کے ساتھ ساتھ

۱۔ اصالت۔ جب کوئی شیخ اللہ کے حکم سے کسی کو معین بنائے، اسے خلافت الہی کہتے ہیں۔ ۲۔ اجازت۔ جب کوئی شیخ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۳۔ توجہ یا تصرف باطنی

توجہ اور تصرف باطنی کو مشروع اور اس کے ذریعہ حصول فیض کو درست ثابت کرنے کے لئے مولانا اللہ یار رضا صاحب نے اپنی کتاب دلائل السلوک میں پانچ واقعات استنباد فرمایا ہے جن میں سے پہلے چار درج ذیل ہیں :

۱۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رُوح القدس سے تائید فرمائی۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے لئے دُعا کی کہ یا اللہ! بحمان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی رُوح القدس کے ذریعہ تائید فرما۔

۳۔ جبکہ بد میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو فرشتوں کی تائید سے ثابت قدم رکھا۔

۴۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلی بار وحی ہوئی، تو جبریل علیہ السلام نے آپ سے کہا کہ "اقرأ" تو آپ نے فرمایا کہ مَا أَنَا بِقَارِئٍ۔ دوسری بار بھی ایسا ہی سوال و جواب ہوا۔ پھر حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ کو سینہ سے لگا کر بھیجنا جس کا اثر یہ ہوا کہ تیسری بار جب جبریل علیہ السلام نے "اقرأ" کہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ بھی سینہ سے لگا کر بھیجنا بھی دراصل توجہ اور تصرف باطنی ہی کی قسم سے تھا۔

ان مندرجہ بالا چاروں واقعات استنباد درست نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ سب فرشتوں کا عمل ہے جو امور میں اللہ ہوتے ہیں اور اس کے حکم سے سرتابی بھی نہیں کر سکتے۔ اسی لئے فرشتوں کے عمل کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف ہی منسوب فرماتے ہیں۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ تو ایسی توجہ کے بغیر بھی حصول فیض سے بہت زیادہ کچھ بھی کر سکتا ہے بلکہ واقعات پر اور مرید کے درمیان توجہ اور باطنی تصرف اور حصول فیض کو کیونکر ثابت کیا جاسکتا ہے۔ لے دے کے ایک پانچواں واقعہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا رہ جاتا ہے جس میں ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے اور دوسری طرف حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ۔ اس لئے اس واقعہ پر ہم ذرا تفصیل سے بات

(بقیہ حاشیہ گوشتہ صفحہ)

اپنی مرضی سے کسی کو غیب بنائے، اسے خلافت ضائی کہتے ہیں۔ اور یہ عام ہے۔ ۳۔ اجماعاً۔ جب شیخ کی وفات کے بعد قوم علی ہاشم یا مرید کو غیب بنائے، اسے خلافت قرائی کہتے ہیں۔ یہ بزرگوں کے اہل غیر متبرہ ہے۔ ۴۔ وارثانہ۔ مرنے کے بعد کسی نااہل وارث کی خلافت۔ یہ بھی غیر متبرہ ہے۔ ۵۔ یک بال میں فوت شدہ شیخ اس کا حکم ہے۔ ۶۔ محض۔ حکم وقت کسی فوت شدہ شیخ کا تمام مقام با دے یہ بھی متبرہ ہے۔ ۷۔ تلفاً۔ وہ خلافت جو حاکم کی سنار شس سے مال ہو۔ ۸۔ اولیہ۔ وہ خلافت جس میں تربیت بزرگ خیر ہو۔ (تایید شاخ چشت مولانا زکریا، ص ۱۴۱)

کریں گے۔ آپنے مشکوٰۃ ص ۱۹۲ کے حوالہ سے متعلقہ حدیث کا محکمہ ترجمہ نقل فرمایا ہے، جو یہ ہے :

فَسَقَطَ فِي هَيْبَةٍ مِنَ التَّكْدِيبِ وَلَا إِذْ كُنْتُ
حضرت ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں سلام کی تکذیب نماز
فی النجاء حلیۃً فَلَمَّا رَسُلُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
جہالت سے بھی زیادہ مسیح کے دل میں واقع ہو گئی جب رسول اللہ
مَا قَدْ غَيَّبَ بَيْنِي مَضْرُوبٌ فِي صَلَاتِي فَفَضَّتْ عِرْفَا
نے مجھے دیکھا تو میرے سینے پر ہاتھ مارا تو میں پسینہ
وَكَاذِبٌ أَنْظُرْ إِلَى اللَّهِ ﷻ (دلائل السلوک ص ۱۱۱)
پسینہ ہو گیا اور حالت یہ ہو گئی کہ گویا میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں۔

بعد ازاں آپنے صاحب مرقاة (شرح مشکوٰۃ) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ آپ کے سینہ میں ہاتھ مارنے سے حضرت ابی بن کعبؓ کو مقام مشاہدہ و حضورؐ حاصل ہو گیا۔ پھر اس واقعہ اور تشریح سے درج ذیل نتائج پیش کئے گئے ہیں :

- ۱۔ توجہ کی غرض غفلت کو دور کرنا اور نور ایمان کو تیر کرنا ہوتا ہے۔ ۲۔ توجہ سے انکشاف ہوتا ہے۔
- ۳۔ مجاہدات اور ریاضت فیہ سالہا سال میں بھی اتنا فائدہ نہیں ہوتا جو شیخ کی تھوڑی سی توجہ سے حاصل ہو جاتا ہے۔
- ۴۔ شیخ کی توجہ کے بغیر محض مجاہدات سے منازل سلوک طے نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ تصوف اور سلوک الہی اور انوکھی عمل ہے۔

۵۔ توجہ کے لئے قلب میں قبولیت کی استعداد ہونا ضروری ہے۔ اس لئے اس اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں کہ ابولہب پر رسول اللہ ﷺ نے تصرف کیوں نہ کیا ؟

اب دیکھتے کہ :

۱۔ ان نتائج میں مولانا موصوف نے بار بار توجہ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ حالانکہ یہ تادیب و تکریم کا عمل تھا۔ آپنے

ملاحظہ فرمائیے کہ حدیث کا صرف اتنا محکمہ نقل کرنے میں بھی آپنے چار مقامات غلطی کی یا تعریف فرمایا ہے۔ مثلاً :

(۱) مَضْرُوبٌ کی جگہ اصل لفظ مَضْرَبٌ ہے۔ (۲) فَضَّتْ کی جگہ اصل لفظ فَضَّتْ ہے (۳) كَاذِبٌ کے بجائے اصل لفظ كَاذِبًا ہے (۴) أَنْظُرْ إِلَى اللَّهِ کے بعد آپنے فَرْخًا کا لفظ درج نہیں فرمایا جس کا معنی غریزی حرم مشکوٰۃ میں ”ڈر کی جوسے“ اور مجاہدین فَرْقٌ کے معنی گھبراہٹ اور ڈرنا درج ہے۔ (دیکھیے مسلم کتاب فضائل القرون۔ باب بیان ان القرآن انزل علی سبعة احوال) صوفیاء کی یہ بے احتیاطی یا غفلت اَلْقُلُوبِ تَوَقُّدٌ اولی سے زبان زد ہے۔ اب اگر صرف نقل کے سلسلہ میں بھی مولانا اللہ یار خان جیسے

نویں کی کتاب کا یہ حال ہو تو دوسرے نہ کہ نگاہوں کا حال آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے سینہ پر ہاتھ مارا جس کی وجہ سے آپ گھبرا بھی گئے تھے۔

کیا ہمارے ہاں مروجہ سلسلہ ہائے طریقت میں ایسی توجہ کسی مرشد نے اپنے مرید پر فرمائی ہے؟ اور اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو پھر آپ کے اس عمل پر توجہ کا اطلاق کیسے ہو سکتا ہے؟

۲۔ آپ فرماتے ہیں کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو حضورؐ اور مشاہدہ کا مقام حاصل ہو گیا تھا۔ اب کسی بات کے فی الواقعہ ”ہونے“ اور ”گویا کہ ہونے“ ہیں۔ جیسا کہ ”کائنات“ کے لفظ سے ظاہر ہے۔ جو فرق ہے وہ واضح ہے اس کی مثال یوں سمجھئے کہ حدیث جبریل میں ہے کہ احسان یہ ہے کہ توجہ بات اس طرح کرے گویا کہ ”تو اللہ کو دیکھ رہا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اکثر صحابہ کی جلالت ایسی ہی تھی۔ پھر کہیں یہ بھی منقول ہے کہ وہ فی الواقعہ اللہ کو عبادت کے وقت دیکھتے تھے؟ یا انہیں صوفیاء کا تجویز کردہ مقام حضور و مشاہدہ حاصل ہو گیا تھا؟

۳۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ رسول اللہ کا یہ عمل توجہ ہی کی ایک قسم تھا اور یہ بھی فرض کر لیں کہ اسلام کا فناء کے مقصود سلوک تصوف کی منازل طے کرنا اور مقام حضور و مشاہدہ تک، اس سے آگے، مقام فناء فی اللہ تک لے جانا ہے، تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی اور صحابی پر ایسی توجہ فرمائی تھی؟ کیا باقی سب صحابہ میں ابوطالب کی طرح اس توجہ کی قبولیت کی استدعا نہ تھی؟

۴۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ”توجہ“ سے مقام حضور و مشاہدہ پر پہنچ جاتے ہیں، صوفیہ کا کوئی بھی سلسلہ اپنے شجرہ طریقت کو آپ تک نہیں پہنچاتا اور جن صحابہ کو یہ حضرات اپنے شجرہ حریقت میں یا اپنے تذکروں میں شمار کرتے ہیں مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ یا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ یا حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ یا حضرت سلیمان فارسی رضی اللہ عنہ بن میں سے کسی پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی توجہ ثابت نہیں۔

۵۔ مروجہ سلسلہ ہائے طریقت میں ”توجہ“ سے پہلے بیعت بھی ضروری ہے۔ بیعت کے بغیر توجہ کا کوئی امکان نہیں اور اس بیعت کا بھی ایک مخصوص طریق مروج ہے۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے اس مخصوص طریقہ کی بیعت لیا کرتے تھے؟ اور بالخصوص آپ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے ایسی بیعت لینے کے بعد ”توجہ“ فرمائی تھی؟ علاوہ ازیں منازل سلوک طے کرانے کے لئے مرشد کو کئی بار اور مسلسل توجہ کرنا پڑتی ہے۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل سے پہلے یا بعد پھر کبھی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ پر ایسی توجہ فرمائی تھی؟ مرشد کامل تو اپنے صاحب استدعا و مریدوں پر بار بار توجہ ڈالتے رہتے ہیں۔

بات سیدھی سی تھی جسے مولانا نے خواہ مخواہ پڑیج بنا دیا۔ ہوا یہ تھا کہ اختلاف قرأت کی بنا پر حضرت ابی بن کعب

کو ایسا رد و لاحق ہوا کہ انہیں اللہ کے فرمان نازل کرنے اور آپ کی رسالت پر بھی شک ہونے لگا تھا رسول اللہ نے یہ کیفیت بھانپ لی اور آپ کے سینہ پر ہاتھ مارا۔ جس سے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو انشراح صدر ہو گیا اور اللہ قرآن کے نازل کرنے والے پر ایسا پختہ یقین ہو گیا جیسا کہ عین یقین کی بنا پر ہوتا ہے اور اس درجہ کا ایمان دوسرے بھی بہت سے مومنوں کو نصیب ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زندگیاں بھر کے اس ایک عمل کو بھلا صوفیاء کے معمولات و توجہ سے کیا تعلق؟ جس کے ذریعہ مریدوں کو بار بار توجہ کرنے سے ایک منزل سے دوسری پھر دوسری سے تیسری منزل تک پہنچایا جاتا ہے۔

۴۔ مشاہدہ حق

ہم پہلے باب میں بیان کر آئے ہیں کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ممکن نہیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر بھی اس دیدار الہی کی تاب نہ لاسکے تو اور کسی کی کیا مجال ہے؟ لیکن ہمارے صوفیاء کرام بضد ہیں کہ دیدار الہی صرف ممکن ہی نہیں، بلکہ بڑے بڑے بزرگوں کو ایسا دیدار الہی ہوتا بھی رہتا ہے اب ان کے دلائل یا تاویلات ملاحظہ فرمائیے: اسی آیت قرآنی کی تاویل کرتے ہوئے صاحب تفسیر روح البیان لکھتے ہیں:

دیدار الہی کا قرآنی ثبوت تاویل نمبر (۱)

وَإِذَا نَظَرْتُ إِلَيْكَ
إِلَّا لَأَن تَوَافَّ يَاسْتَه لَا يَزَانُ
إِلَّا مَبْكُتٌ لَهُ بَصِيرَةٌ فِيهِ
يَبْصُرُ

اور توجہ اپنے ساتھ میری طرف نظر کرے گا تو مجھ نہ
دیکھ سکے گا۔ کیونکہ مجھے وہی دیکھ سکتا ہے جس کے لئے
میں خود بصیر ہوں۔ پھر وہ اس (بصارت) کے ساتھ
دیکھے۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ کوئی اس کو اپنے ساتھ دیکھے گا تو نہیں دیکھ سکتا۔ اس کے ساتھ اسی کو دیکھے گا۔

(ریاض الیقین، ص ۷۷، بحوالہ تفسیر روح البیان، ص ۷۷، جلد ۱، سطر ۱)

اس گورکھ دھند سے کو کچھ سمجھے آپ؟ اگر نہیں سمجھے تو کوئی بات نہیں۔ جب یہ گورکھ دھند حضرت موسیٰ خود بھی نہ سمجھ سکے، تو پھر ہمارا اور آپ کا ذکر ہی کیا ہے؟ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام ان صوفیاء زہاد و رموز کو جانتے ہوتے تو شاید اللہ تعالیٰ کا دیدار فرمالیتے اور مایوس نہ ہوتے مگر وہ تو اپنے ساتھ اللہ کو دیکھ رہے تھے۔ اگر اللہ کو اللہ کے ساتھ دیکھتے تو ضرور کامیاب ہو جاتے۔

تَبْلُ قَالَ رَبِّ ارْنِ اَنْظُرْ اَيْنَكَ وَهُوَ
حُجَّةٌ اَهْلُ السَّنَةِ وَالْجَنَاحَةُ عَلَ جَوَارِ
رُؤْيَا اللّٰهُ تَعَالٰی
بلو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ مجھے اپنا آپ دکھا کر
میں تیری طرف دیکھ سکوں۔ یہ بات اہل السنۃ والجماعۃ کے
لئے رویت اللہ تعالیٰ کے جواز پر حجت ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اللہ کے دیدار کا سوال کرنا تمام حدوں سمیت پورا پورا دیکھ
لینا، یعنی اس کا احاطہ کر لینا اور عدم احاطہ سے عدم رویت لازم نہیں آتی جیسا کہ علم کو احاطہ نہ کر لینے سے عدم علم
لازم نہیں آتا مگر جائز ہے کہ رویت ہو مگر احاطہ کے ساتھ نہ ہو جس کی آیت میں نفی کی گئی ہے۔ ”دریاض السالکین“ میں ہے۔
اب دیکھئے کہ ۔

۱ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوال دیدار الہی کو تو آپ اہل السنۃ والجماعۃ کے لئے دیدار الہی کے جواز
پر حجت بتلا رہے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے انکار رویت الہی کا ذکر تک نہیں فرماتے۔ کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام
کا سوال ہمارے لئے حجت ہے یا اللہ تعالیٰ کا تردید جواب ؟

۲ پھر عرشی صاحب ”دریاض السالکین“ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دیدار الہی کے سوال کے ساتھ جو
”تمام حدوں سمیت پورا پورا دیکھ لینا“ یعنی اس کا احاطہ کر لینا کے اپنی طرف سے اضافے فرمائے ہیں۔ کیا
آیت مذکورہ میں ایسی پابندیوں کی کہیں گنجائش نظر آتی ہے ؟

۳ نیز عرشی صاحب کا طرز استدلال بھی ملاحظہ فرمائیے کہ : ”علم کو احاطہ نہ کر سکنے سے عدم علم لازم نہیں
آتا۔“ یعنی اگر آپ کسی بات کے عالم نہیں، تو ضروری نہیں کہ وہ بات ہی نہ ہو اور اس کا علم ہی نہ ہو جس سے یہ
واضح ہوتا ہے کہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کو نہیں دیکھ سکتے، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی دوسرا بھی نہ
دیکھ سکے۔ ہم تو ایسے خیال کو بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ صوفیاء کے ہاں اگر یہ درست ہو تو بھی ایسے نظریات انہی کو مبارکباد
یہی عرشی صاحب اپنی کتاب ”دریاض السالکین“ کے صفحہ ۲۴۴
حدیث قدسی سے دیدار الہی کا ثبوت
پر مشکوٰۃ کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں :

حضرت ابی قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ :

مَنْ رَآَنِي فَقَدْ رَآَنِيَ الْحَقَّ (مشکوٰۃ، ۳۶۲ ص) جس نے مجھ کو دیکھا، اس نے خدا کو دیکھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ جب میں نے یہ پڑھا، تو دم بخود ہو گیا اور خیال آیا کہ اگر یہ حدیث صحیح ہے تو اس کا
مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ خود تو درکنار تمام صحابہ نے بھی اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا تھا۔ بہر حال مشکوٰۃ میں محول بالا روایت
لے ان جہات میں عربی عبارات صحابہ تفسیر روح البیان کی ہیں، ترجمہ ہمدانی طرف سے ہے اور شرح صاحب ”دریاض السالکین“ کی طرف سے ۔

دیکھی تو معلوم ہوا کہ یہ روایت مشکوٰۃ میں "باب الرویا" میں مندرج ہے اور اس سے پہلے ایک متفق علیہ حدیث بھی اسی مضمون کی مندرج ہے اور وہ یہ ہے :

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : مَنْ رَأَى فِي الْمَنَامِ حَقَّقَ رَأْيَهُ فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَتَعَثَّلُ فِي مَوْزُونٍ
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے بچے عذاب میں دیکھا، یکک اس نے مجھے ہی دیکھا کیونکہ شیطان میری موت اختیار نہیں کر سکتا۔
(متفق علیہ مشکوٰۃ، ص ۳۹۴) (بخاری و مسلم)

اب اسی باب میں اگلی روایت وہ ہے، جو عرشی صاحب نے درج فرمائی ہے جس کا واضح مطلب تو یہ ہے کہ جس نے مجھے دیکھا اس نے فی الحقیقت مجھے ہی دیکھا۔ اب عرشی صاحب نے ایک تو یہ ذکر نہ کیا کہ یہ روایت خواب سے متفق ہے۔ دوسرے "حق" یعنی حقیقت پر یہ سچائی کے کرنے کے اس کا ترجمہ "خدا" کر کے دیدار الہی کو ثابت کر دکھایا۔ ان صوفیاء کی یہی وہ بے اعتدالیاں اور کارستانیاں ہیں جن کی وجہ سے تھمیں ابتداء ہی سے ان سے بدگمان رہتے اور ان سے مروی روایت قبول کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔

در اصل عرشی صاحب بھی مجبور ہیں کیونکہ ان کے بڑے بڑے بزرگ ایسا ہی کچھ لکھ گئے ہیں۔ چنانچہ اسی کتاب ریاض السالکین کے صفحہ ۱۷ پر لکھتے ہیں کہ : "تفسیر مرالس البیان میں (ص ۱۷، ۱۸) شیخ روزبہان تعلبی شیرازی جو ایک بہت بڑے بزرگ، ولی کامل اور عارف باللہ ہوئے ہیں، فرماتے ہیں کہ

مَنْ رَأَى عِشْرَةً لَا يَزُجُّونَ عَنْهُ عَنْ
دُؤِبَاتُهَا بِجَلَالِ الْحَقِّ سِيمَاءُ الْأُولِيَاءِ
حق تعالیٰ کے جمال کے انوار نہیں دیکھتے۔

دیکھئے! عرشی صاحب نے صرف "عشیرۃ" کا مطلب بتلایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے "عشیرۃ" کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ وہ اولیاء اللہ کی بات نہیں سنتے اور کلمہ کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ ایسے اولیاء اللہ کی ہاں میں ہاں نہیں ملا تے اور ان کی تصدیق نہیں کرتے اور فہم لایزجوں کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ ان اولیاء اللہ کی طرف لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ اور یہ صفات اللہ تعالیٰ نے چونکہ منافقین کی بیان فرمائی ہیں۔ لہذا معلوم ہوا کہ جن لوگوں کو اولیاء اللہ کی بیشانیاں دیکھنے سے دیدار حق یا شاہدۃ النوار جلال حق نہیں ہوتا وہ سب منافق ہیں۔

اس کے بعد صاحب اس البیان لکھتے ہیں کہ :

كَانَ الشَّيْطَانُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِرَاةَ الْحَقِّ
نبی اکرم ﷺ اللہ تعالیٰ کا آئینہ ہیں جلال اور جمال کیساتھ

يَتَجَلَّىٰ بِجَلَالِهِ وَبِجَالِهِ الْإِسْمَاءُ وَالْجَبَلُ يُعْبَنُ
 مِنْهُ يَوْمَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ عَلَيْهِ السَّلَامُ مَنْ
 زَانِيَ فَقَدْ زَانَى الْحَقَّ (تفسیر صراط البیان ص ۱۷۱ ج ۱ ش)
 ایٹوں اور صدیقیوں کے لئے۔ اور وہ حضور ﷺ کو دیکھنے
 سے اٹھ تے کو دیکھ لیتے ہیں کہ جو کچھ آپ نے فرمایا ہے کس
 نے مجھ کو دیکھا، اس نے خدا کو دیکھا۔ (دیلمی ص ۱۷۱ ج ۱)

اسے کہتے ہیں: بنائے فاسد مل الفاسد یعنی پہلے حدیث کے مفہوم میں فریب کا لیا اور یہ ثابت کیا کہ جس
 نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا اس نے خدا کو دیکھا۔ پھر اس غلط مفہوم کو اصل بنیاد قرار دے کر یہ ثابت
 کر دکھایا کہ اولیاء اللہ کو دیکھنے سے بھی دیدار حق نصیب ہو جاتا ہے۔ گویا طریقت کی دنیا میں یہ چیز اتنی ارزاں
 ہے کہ کسی بھی ولی کو دیکھنے سے مل جاتی ہے لیکن شریعت کی دنیا میں یہ اتنی منگی ہے کہ حضرت موسیٰ
 کو التما کے باوجود نزل سکی۔

۵۔ دیدار رسول اللہ

احادیث صحیحہ سے یہ تو ثابت ہے کہ جس نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا اس نے
 واقعی آپ ہی کو دیکھا، کیونکہ شیطان آپ کا روپ نہیں دھا سکتا، لیکن علماء اس پر بشرط ضرور عائد کرتے ہیں
 کہ یہ خوشخبری صرف صحابہ کے لئے ہے جنہوں نے آپ کو دیکھا تھا اور شکل پہچانتے تھے، دوسروں کو شیطان
 خواب میں دھوکا بھی دے سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ وہ یہ یقین دلا دے کہ میں فی الواقعہ (نعوذ باللہ) رسول اللہ
 ہوں جبکہ حقیقتاً ایسا نہ ہو۔ لیکن طریقت کی دنیا ہی الگ ہے۔ وہ صرف کتب احادیث میں مذکور علیہ مبارک کی
 بنا پر ہی یقین کر لیتے ہیں حالانکہ کئی آدمیوں کا علیہ ایسا ملتا جلتا ہوتا ہے کہ ان کا فرق واضح کرنا مشکل ہوتا ہے چنانچہ
 رسول اللہ ﷺ کا علیہ مبارک بھی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ سے ملتا جلتا تھا۔ اسی بنا پر جنگِ اُحد کے
 دوران جب حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے، تو ابنِ قتیبہ نے مشہور کر دیا کہ (نعوذ باللہ) حضرت
 محمد ﷺ شہید ہو گئے۔ (دیرت ابن ہشام اردو، غزوہ اُحد، ص ۵۵)

یہ تو خیر خواب کی بات تھی، لیکن صوفیاء کرام تو حالتِ بیداری میں بکثرت آپ کی زیارت سے مشرف ہوتے
 رہتے ہیں اور اس کی بنیاد درج ذیل حدیث ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ
 عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ زَانِيَ فِي الْمَنَامِ فَتَيَّرَ لِي فِي
 الْفَيْطَةِ وَلَا يَمُوتُ إِلَّا بِمَنْشَلِ الشَّيْطَانِ فِي (متفق علیہ)
 حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ
 نے فرمایا: جس نے بچے خواب میں دیکھا تو مخترب وہ
 مجھے بیداری میں بھی دیکھ لے گا، کیونکہ شیطان میری صورت

اس حدیث کی شرح میں علماء نے درج ذیل اقوال نقل کئے ہیں:

۱۔ یہ بیداری کی زیارت قیامت کو ہوگی، اس سے پہلے نہیں (حاشیہ نمبر، مشکوٰۃ، ص ۳۹۲)

۲۔ صحیح مسلم میں ان الفاظ کے بعد یہ الفاظ بھی موجود ہیں:

أَوْ لَكُنَّا زَافِفٌ لِّمَن كَرِهَ جِئَاكَ
اس نے مجھے جاگتے میں دیکھا یعنی راوی حدیث کہتا ہے کہ

دسلسلہ، کتاب الروایا، ج ۲، ص ۲۴۲ مجھے یاد نہیں کہ رسول اللہ نے پہلے الفاظ کہے تھے یا دوسرے۔

اہم نووی نے اس حدیث کی شرح میں تین اقوال نقل فرمائے ہیں:

(i) اس سے صرف آپ کے اہل عصر مراد ہیں، یعنی جو لوگ متحید ہیں اور ہجرت کر کے مدینہ ابھی نہیں آئے۔ وہ ہجرت کر کے آکر آپ کو بیداری میں بھی دیکھیں گے۔

(ii) آپ کی یہ زیارت آخرت میں ہوگی۔

(iii) یہاں روایت سے مراد روایت خاصہ ہے یعنی قیامت میں اسے آپ کا قرب حاصل ہوگا اور آپ اس کی شفاعت کریں گے۔ (مسلم، حوالہ ایضاً)

۳۔ شارح بخاری احمد علی سہارنپوری محدث نے بھی یہی مندرجہ بالا تینوں اقوال اس کی شرح میں نقل فرمائے ہیں۔ (بخاری، کتاب التبیان، ج ۲، ص ۱۰۳۵، حاشیہ ۳)

یہ ہے حدیث مذکورہ بالا کی وہ تشریح جو شارحین حدیث اور علمائے اُمت نے بیان فرمائی، لیکن صوفیاء اس کا بالکل الگ اور زالا مطلب بیان فرماتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جس کسی صوفی نے آپ کو خواب میں دیکھا وہ اپنی زندگی میں ہی آپ کو بیداری کی حالت میں بھی ضرور دیکھ لے گا۔ چنانچہ ان اولیاء اللہ کے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی بزرگ بھی آپ کی زیارت سے بیسیوں مرتبہ مشرف ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم پیران پیر کا ایک مشہور واقعہ نقل کرتے ہیں، جو تذکروں کی اکثر کتابوں میں درج ہے:

”ایک دن آپ وعظ فرما رہے تھے۔ شیخ علی بن العیتقی پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اُن کو نیند آگئی۔ پیران پیر نے حاضرین کو خاموش بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خود منبر سے اتر کر شیخ علی بن العیتقی کے سامنے تودب کھڑے ہو گئے۔ جب شیخ موصوف بیدار ہوئے، تو پیران پیر نے پوچھا، آپ کے پاس رسول پاک تشریف لائے، تو انہوں نے کیا کہا؟ شیخ نے جواب دیا: ”آپ کی خدمت میں حاضری کی تاکید فرمائی۔“ پیران پیر نے کہا: میں اس لئے تودب کھڑا ہو گیا تھا اور جو کچھ تم نے خواب میں دیکھا ہے وہ سب کچھ میں نے حالت

بیدار می دیکھا ہے۔“ (نغمات الانس قدسی، صفحہ ۲۵۶۔ مدارج النبوت فارسی بحوالہ سیرت غوث، ص ۲۱۸)

اس واقعہ کو ہمیں خود غلط ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ انہیں تذکروں کے دوسرے اقتباسات سے اس واقعہ کا غلط ہونا ثابت ہو جاتا ہے مثلاً:

۱۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ:

”آپ کی مجلس شریف میں کل اولیاء اللہ اور انبیائے کرام جہاں جیات کے ساتھ اور ارواح کے ساتھ تشریف فرما ہوتے تھے۔“ (انوار الانوار مصنف شیخ عبدالحق، ص ۱۷۔ قلام الجواہر، ص ۷۴۔ سفینۃ الاولیاء، ص ۶۲۔ ہجرت الاسرار، ص ۲۴۔ بحوالہ سیرت غوث، ص ۷۴)

۲۔ یہ اشتباہ بھی نہ رہنا چاہیے کہ شاید ان انبیائے کرام میں سے رسول اللہ متضمن ہیں۔ چنانچہ ابوسیدہ قبیلوی فرماتے ہیں کہ:

”میں نے کئی مرتبہ رسول اللہ ﷺ کو اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کو آپ کی مجلس مبارک میں رونق افروز ہوتے دیکھا۔“ (ہجرت الاسرار، ص ۹۵۔ قلام الجواہر، ص ۷۴۔ بحوالہ سیرت غوث، ص ۷۵)

اب دیکھئے یہ تینوں اقتباسات، جو ایک ہی کتاب سیرت غوث الثقلین سے لیے گئے ہیں ایک دوسرے کی تفسیل کر رہے ہیں۔ وہ اس طرح کہ:

۱۔ جب حضور اکرم ﷺ حالت خواب میں شیخ علی بن الہیثمی کے پاس تشریف لائے تو آپ کی یہ تشریف آوری صرف پیران پیر ہی پر کیوں ظاہر ہوئی، جبکہ دوسرے انبیاء کرام اور کل اولیاء بھی آپ کی مجلس میں موجود تھے کیا ان کی قلبی آنکھیں داغ تھیں؟

۲۔ رسول اکرم ﷺ تو اکثر پیران پیر کی مجلس وعظ میں تشریف لایا کرتے تھے، تو آپ ان کی موجودگی میں وعظ کیسے فرمایا کرتے تھے؟ علی بن الہیثمی کے پاس حالت خواب میں آمد پر آپ نے حاضرین کو خاموش بیٹھنے کی تاکید فرمائی اور خود بھی اس وقت تک مودب کھڑے رہے جب تک آپ واپس نہ چلے گئے، تو کیا دوسری مجالس میں آپ نے حضور اکرم ﷺ کے لئے یہ طریق ادب ختم کر دیا تھا، یا پھر وہ پہلا فسانہ بھی محض تراشیدہ ہے۔

۳۔ آپ کی مجالس میں رسول اللہ ﷺ اور دوسرے انبیاء کرام کس غرض کے تشریف لاتے تھے؟ کیا

لہ اور صاحب ریاض المساکین نے یہ واقعہ درج کرنے کے بعد یہ اضافہ بھی فرمایا ہے: کہ اس وقت سات آدمی وجد میں آکر داخل ہوتے۔“ (ریاض المساکین، ص ۳۱۱)

وہ خود آپ کی مجلس وعظ سے متغیہ ہونے کے لئے آتے تھے؛ اگر ایسا ہے تو یہ تو اٹلے بانس بریلی کو جانے لگے۔ یا وہ انبیاء دوسرے لوگوں کو ترغیب دلانے کے لیے آتے تھے کہ دیکھو! جب ہم اللہ کے نبی ہو کر پیرانِ پیر کی مجلس وعظ میں آگئے ہیں تو تم کیوں نہیں آتے؟

وفاتِ نبوی کے بعد حضور ﷺ کی زندگی کیسی ہے؟ | وفات کے بعد اور یوم البعثت سے پہلے کے درمیانی عرصہ کی زندگی کے

توسب قائل ہیں اور حقیقی زندگی نہیں بکھر زخی زندگی کہا جاتا ہے، لیکن صوفیاء کا دعوئے یہ ہے کہ رسول اللہ اور اسی طرح دوسرے اولیاء مَرتے نہیں بلکہ عوام کی نظروں سے پس پردہ چلے جاتے ہیں۔ پھر وہ خواص جن کی قلبی آنکھیں واہوتی ہیں وہ انہیں دیکھتے اور ان سے فیوض و برکات حاصل کرتے رہتے ہیں، لیکن عوام انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ اس سلسلہ میں مولانا اللہ یار خان صاحب دلائل السلوک کا تو یہاں تک دعوئے ہے کہ وہ چھ ماہ کی تربیت کے بعد سالک کو دربارِ نبوی میں پہنچا کر آپ سے بیعت بھی کروا دیتے ہیں۔ (دلائل السلوک، ص ۴۴، ۴۵) اب سوال یہ ہے کہ کیا صحابہ کرام نے بھی کبھی ایسے کام کئے تھے؛ کیا ان کی قلبی آنکھیں واہتھیں؛ کہ وفاتِ النبی کے بعد اس دربارِ نبوی کو دیکھ سکتے اور تابعین کی بیعت کروا دیتے۔

اب یہ تو واضح ہے کہ عملائے حق ایسی باتوں کو کسی قیمت پر قبول نہیں کرتے اور ہمیشہ سے صوفیاء پر گرفت کرتے چلے آئے ہیں۔ اور صوفیاء کا طریقِ کاریہ ہوتا ہے کہ جب دلائل شرعیہ کے سامنے ان کی کچھ پیش نہیں جاتی، تو منکرین کو اپنے رنگ میں رنگ کر ان سے اقرار کروا لیتے ہیں۔ یعنی علمائے شریعت جب تک صوفیاء کے رنگ میں نہ رنگے جائیں کبھی ایسی باتوں کو تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ ایسا ہی ایک ائمہ علاؤ الدین عطار نقشبند (م ۷۸۰۲) کے زمانہ میں پیش آیا۔ حکیم سید امین الدین صاحب صوفیائے نقشبند علاؤ الدین عطار کی کرامات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ایک دن بخارا میں علماء کے درمیان روایتِ باری تعالیٰ پر بڑا مباحثہ ہوا۔ جب کسی نتیجہ پر نہ پہنچے تو سب نے بالاتفاق حضرت خواجہ (علاؤ الدین عطار) کو ثالث تسلیم کر لیا۔ آپ نے منکرینِ روایت سے کہا کہ تم تین دن خاموشی کے ساتھ با وضو ہمارے پاس بیٹھو۔ ہم تین دن کے بعد فیصلہ دیں گے۔ تیسرے روز ان پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ بے ہوش ہو کر لوٹنے لگے، جب ہوش آیا، تو کہنے لگے ہم روایتِ حق پر ایمان چلے آئے۔ اور اس کے بعد ہمیشہ آپ کی صحبت میں رہے۔“ (صوفیائے نقشبند، ص ۱۴۵)

اگر یہ واقعہ صبح ہے تو اس سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں :

۱۔ تیسرے دن خواجہ موصوف نے ان پر کوئی ایسا عمل یا توجہ کی تھی جس کی وجہ سے وہ علماء بے ہوش ہو کر لوٹنے لگے تھے اور ایسے عمل جو گیوں، سادھوؤں اور مسمریزم کرنے والوں سب کے پاس ہوتے ہیں اور ان کا شریعت اسلامیہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

۲۔ جب تک خواجہ موصوف نے علماء پر یہ کفایت طاری نہیں کی، انہوں نے روقیت حق کا اقرار نہیں کیا۔ البتہ اس کیفیت کے بعد اقرار کر لیا۔

۳۔ شریعت اور طریقت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ اگر شریعت کا رنگ غالب ہو تو صوفیانہ نظریات کا انکار ناگزیر ہے اور صوفیانہ رنگ غالب ہو تو ایسی باتوں کا اقرار کر کے شریعت کو اس کے تابع بنانے کی کوشش کی جاتی اور تاویلات اور حیلوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ پھر بعض بے باک صوفیاء تو شریعت کو ذخرا اعتقاد سمجھتے ہی نہیں۔

۶۔ ذکر الہی

اللہ کے ذکر کی قرآن میں بار بار تاکید آئی ہے۔ ذکر کے معنی اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا بھی ہے۔ بذریعہ تسبیح و تہلیل وغیرہ اور یاد رکھنا بھی۔ یعنی دل میں ہر وقت اللہ تعالیٰ کا دھیان اور خیال رہے اور افضل الذکر لا الہ الا اللہ ہے۔ ذکر اللہ اس گروہ صوفیاء کا موضوع خاص ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں بھی ان حضرات نے بیسیوں قسم کے بدعیہ اذکار دریافت کر لئے ہیں۔ جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں :

۱۔ ذکر لاہوتی، ذکر جبروتی، ذکر ملکوتی، ذکر ناسوتی، ذکر مکاشفہ، ذکر مشاہدہ، ذکر ثلاثی گنبدی، ذکر ثلاثی مجرّد، ذکر آہ، ذکر روح، ذکر ستر، ذکر اہارست، ذکر آوردہ برد، ذکر ضرب راست، ذکر مدور بکلی، ذکر ثلاثی مغربی بہ دروازہ، ذکر بیکدم مجلس، ذکر قربان، ذکر حدادی، ذکر مقدس، ذکر بودہ، ذکر مصلیٰ، ذکر حیران، ذکر قلندریہ، ذکر ضیاء، ذکر نور، ذکر تجلی، ذکر ذجاج، ذکر جلابی، ذکر کاپٹور، ذکر پاس انفاس، ذکر خفی استیلائے عشق۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے اذکار ہیں جو بخوف طوالت درج نہیں کئے۔ دریں

اب ہم اسے لئے یہ بہت مشکل ہے کہ ان تمام اذکار و اوراد کے طریق اور ان کے فوائد بیان کریں۔ تاہم نمونہ

چند ایک حاضر خدمت ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ بزرگان کرام بیسوں سال مجاہدات میں صرف کر کے کیا کچھ حاصل کرتے رہے ہیں۔

۱۔ ذکرِ قلندیہ اور ارواحِ مقدسہ | چاہیے کہ جلسہ معبودہ متین کر کے ہر روز انوکے درمیان یا حُسنِ ناف پر یا حُسنِ دائیں شانے پر یا فاطمہؑ بائیں شانے پر یا علیؑ کی

ضرب لگائے اور یا محمدؐ کی ضرب اپنے وجود میں لگائے اور پھر از سر نو شروع کر دے۔ اس ذکر کی مواظبت سے ان حضرات کی ارواحِ مقدسہ شریعتِ لائیں گی، اور امداد فرمائیں گی اور طالب کو مطلوب تک پہنچائیں گی۔ (دیانِ الساکین، ص ۳۲۲)

۲۔ ذکرِ نور اور کشفِ قبور | اس ذکر سے کشفِ الارواح ہوتا ہے۔ طریقہ اس کا یہ ہے کہ جلسہ معبودہ متین کر کے دائیں طرف سُبُوحِ بائیں طرف قُدُوس سانس کی طرف

یا رُوحِ الروح آسمان کی طرف رَبُّ الْمَلٰٓئِکَۃِ اور دِل پر الروح کی ضرب لگائے۔ اس ذکر سے اور بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ جو عمل کرنے سے خود روشن ہو جائیں گے۔ کشفِ قبور حاصل ہوگا۔ (ایضاً)

۳۔ افضل الذکر کا صحیح مقام | لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ کے ذکر کا طریق بھی ملاحظہ فرمائیے :
"درمیان ذکر کل طیبہ بطریقِ جہر" اَوَّلًا با وضو، قنہ رُو، دوزانو بیٹھ

کر گیارہ مرتبہ سورۃ اخلاص بالتواذ باسم اللہ پڑھ کر ختم بر رُوح پر فتوح حضرت غوث الاعظم کی خدمت میں بھیجے بعدہ آنکھیں بند کر کے اور مرشد کی صورت کا دل میں تصور کئے ہوئے ہزار بار کلمہ پاک لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ جہر سے پڑھے۔ ہر تسبیح کے خاتمہ پر محمد رسول اللہ کہے بعد ہزار بار اِلَّا اللّٰہُ ہزار بار بعدہ ہزار بار "ہُو" پڑھے اور اٹھائے ذکر میں کلمہ شریف کے معنی کو ملحوظ رکھے۔ جب یہ ذکر ختم ہو تو متوجہ بقلب صنوبری ہو کر جو کہ بائیں پستان سے دو انگلی نیچے ہے مراقبہ میں بیٹھے اور نہایت توجہ و حضورِ دل کے ساتھ اپنی تمام ہمت کو اسم اللہ کی یاد میں مصروف کرے (دیانِ الساکین، ص ۳۱۶)

دیکھا آپ نے کہ اس افضل اور سنون ذکر میں بھی ان حضرات نے شرک و بدعات کو کس طرح داخل کر دیا ہے۔ کیا رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ذکر کے یہی طریق سکھایا کرتے تھے؟

پھر ان حضرات نے کتنی قسم کے دُرود، مثلاً درود تاج، لکھی، ہزارہ وغیرہ کئی طرح کی نمازیں مثلاً صلوة غوثیہ، صلوة فاتح، صلوة خضر، صلوة الاسرار، صلوة التبیح اور کتنی قسم کے ختم شریف، شش قفل، ہفت،

ہیکل، چہل کاف اور اسمائے عظام وغیرہ دریافت کر رکھے ہیں۔ جن سے رجال النیب کے استہاد کی جاتی اور استعاذہ کیا جاتا ہے جن کے ذریعہ کبھی رُوحوں کو حاضر کرتے، کشف قبور حاصل کرتے اور مختلف بیماریوں کے لئے تعویذ اور دُم جھاڑتے کرتے، عورت اور مرد کے درمیان جدائی یا محبت ڈالتے اور اپنی ولایت کی دھاک بٹھاتے ہیں۔ ہمارے صوفیاء کرام میں سے بیشتر ولیوں کی ولایت اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہے۔ وہی پرانی کہانت اور ساعری تقدس کا روپ اڑھ کر "ولایت" کی صورت میں ہمارے سامنے جلوہ گر نظر آتی ہے۔ نقوش و عملیات نے قوم کو جس طرح "بے عمل" بنا دیا ہے، وہ مستزاد ہے۔

۲۔ محبت الہی

اللہ تعالیٰ کی محبت ہر مسلمان کے دین اور ایمان کا جزو ہے جس کے بغیر نہ دین مکمل ہوتا ہے نہ ایمان۔ اللہ تعالیٰ فرمایا:

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ (۲۱۵)

اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ سے محبت رکھنے والے ہیں۔

پھر اس محبت الہی کا معیار یہ بتلایا گیا:

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ (۲۱۶)

دے یہ نمبر! لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا۔

گویا اتباع رسول اور محبت الہی لازم و ملزوم ہیں جتنا زیادہ کوئی متبع سنت ہوگا اتنا ہی وہ اللہ سے محبت رکھنے والا ہوگا اور اللہ اس سے محبت رکھنے والا ہوگا۔

اب دیکھتے کہ رسول اللہ کا اسوہ حسنہ یہ ہے کہ آپ ات کو سوتے بھی تھے اور جاگتے بھی تھے۔ نفل روزے رکھتے بھی تھے اور چھوڑتے بھی تھے۔ لذات دنیا سے متبع ہوتے تھے۔ جلوہ آپ کی پسندیدہ اور مرغوب غذا تھی۔ عطر کا استعمال فرماتے تھے۔ صاف ستھرے لباس پہنتے تھے۔ مقدمات کے فیصلے کرتے تھے۔ جہاد میں شرکت فرماتے اور سپہ سالاری کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ آپ کی کئی بیویاں تھیں۔ ان سے اور اپنی اولاد سے محبت کرتے تھے۔

معاشرتی تعلقات کو بحسن و خوبی نبھاتے تھے۔ زکوٰۃ و صدقات وصول فرماتے اور انہیں مستحقین میں تقسیم فرماتے تھے۔ غرضیکہ معاشرتی، سیاسی، معاشی اور گھریلو زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جس میں آپ نے رہائی نہ فرمائی ہو۔

ان سب کاموں کے باوجود آپ اللہ سے سب سے زیادہ محبت رکھنے والے تھے اور آپ اللہ کے حبیب و محبوب تھے۔

اب صحابہ کرام کی طرف آئیے۔ صحابہ کرام اللہ سے محبت کھنے والے تھے پھر وہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت و اتباع کے ساتھ ان سے بھی محبت رکھتے تھے حتیٰ کہ آپ کی محبت ہی معیار ایمان قرار پایا۔ پھر صحابہ کرام اپنے بال بچوں سے بھی محبت کرتے تھے۔

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ کی محبت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اب کسی دوسرے سے محبت کی ہی نہیں جاسکتی۔ ہر ایک سے اس کے مقام اور احکام شرع کے مطابق محبت کرنا یا اس کے برعکس کسی سے بغض رکھنا بھی عین اللہ کی محبت کا تقاضا ہے۔

لیکن ہمارے صوفیاء کے ہاں محبت الہی کا معیار بالکل جدا گانہ ہے | **محبت الہی بھی اور چہار ترک بھی** انہوں نے محبت الہی کا جو طریق اختیار کیا ہے وہ بالکل راہبانہ

اور غیر شرعی قسم کا ہے، جو چہار ترک سے شروع ہوتا ہے۔ خواجہ شریف ندنی (ولادت ۱۲۹۲ھ) نے خواجہ عثمان ہارونی (ولادت ۱۵۲۶ھ) کو خلافت کے وقت کلاہ چہار ترک یعنی چار کلیوں والی ٹوپی پہنائی اور ارشاد فرمایا کہ اس سے چہار ترکوں کی طرف اشارہ ہے۔ (۱) ترک دنیا (۲) ترک آخرت بجز ذات حق سبحانہ و تعالیٰ۔

(۳) ترک خواب و نوم (۴) ترک ہوا و نفوس۔ (تاریخ شائع پشت ملاحظہ فرمایا۔ ص ۱۶۳)

اب دیکھئے ان کے ہاں ترک دنیا سے مراد، معاشرتی زندگی کا بائیکاٹ اور ترک نکاح وغیرہ ہے۔ ترک آخرت سے مراد یہ ہے کہ زہد و زنج کے عذاب کی پرواہ نہ جنت کے حصول کی آرزو۔ ترک خواب و نوم سے مراد رات اور دن میں کسی وقت بھی نہ سونا۔ اور ترک ہوا و نفوس سے صرف لذائذ نفس ہی مراد نہیں بلکہ یہ لوگ ضروریات نفس کو بھی ترک کر دیتے ہیں اب دیکھ لیجئے ان میں سے کون سی بات سنت کے مطابق ہے۔ نیز قرآن کے بیان کردہ معیار کے مطابق اللہ سے اُن کو کس قدر محبت ہو سکتی ہے اور اللہ کو ان سے کس قدر؟

یہ حضرات دراصل ایسے صلیوں پرانے راہبانہ طریقوں سے تعبیرات ندائے غیب، اور رجال الغیب کی آمد اور ان سے ہمکلام ہونے کے منتظر رہتے ہیں۔ بس یہی ان کی محبت الہی ہے۔ اس طرح کی محبت الہی کے اس دنیا میں خواہاں اور اسی طرح کی محبت الہی کے عالم آخرت میں آرزو مند ہیں۔

ترک دنیا ترک دنیا کا جواز بھی اس کی افضلیت ثابت کرنے کے لئے مسجد نبوی میں درس گاہ صفہ

اور اس میں قیام پذیر صحابہ کی زندگی سے استدلال کیا جاتا ہے کہ یہ صحابہ رضی اللہ عنہم دنیا سے آزاد ہو کر وہاں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ یہ استدلال مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر درست نہیں :

۱۔ امت کے افضل ترین بزرگ اصحاب صفہ سے باہر کے لوگ تھے۔ مثلاً چاروں خلفائے راشدین بالترتیب۔ علاوہ ازیں عشرہ مبشرہ میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا، جو اصحاب صفہ کا کون ہو۔ اسی ایک بات سے ترک دنیا کا اصل مقام سامنے آ جاتا ہے کہ اسلام ایک معاشرتی دین ہے۔ رہبانیت کا دین نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی کچھ جاسکتا ہے کہ اسلام نے ترک دنیا کو ناجائز یا حرام قرار نہیں دیا۔

۲۔ اصحاب صفہ کی تعداد بالعموم ستر (۷۰) رہا کرتی تھی۔ اگرچہ کسی ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو بھی ہو گئے تھے جبکہ اس دور میں مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ گویا ترک دنیا کرنے والوں کی نسبت مسلمان معاشرہ میں ایک فی ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ ایک ہزار میں نو سو ننانوے صحابی تو معاشرتی زندگی بسر کرتے تھے اور ہزار وال آدمی اصحاب صفہ کا کون تھا۔ اتنی ہی اس ترک دنیا کی گنجائش ہے۔ لیکن تصوف کی دنیا میں ترک دنیا اصل الاصول سمجھی جاتی ہے۔

۳۔ صفہ علم شریعت کی درس گاہ تھی جہاں سے معلم اور متبع دوسرے مقامات پر بھیجے جاتے تھے۔ نہ کوئی تصوف و کمالات کی تربیت گاہ۔ جس میں شرعی علوم کو جب تک پہلے محو کر دیا جائے۔ اس فن کی تفصیل ممکن نہیں ہو سکتی۔ اصحاب صفہ اور ترک دنیا کی درست اور واضح مثال وہ دینی مدارس ہیں جہاں طلباء ترک دنیا کر کے کئی کئی سال تک علوم شرعیہ کی تعلیم و تربیت حاصل کرتے ہیں۔ موجودہ اولیاء اللہ کی خانقاہوں کا بھلا اس صفہ سے کیا تعلق ؟

۸۔ صحبت بزرگان

صحبت کا اثر ایک فطری بات ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس اثر کو ایک مثال سے سمجھایا کہ اگر تم کسی عطر کی دکان پر بیٹھے ہو تو اگر عطر خرید کر استعمال نہ بھی کرو گے تو جب تک اس دکان میں بیٹھے رہو گے اس کی عطر بہ فضا سے تمہارا دماغ مضطر رہے گا اور اگر تم کسی لوہار کی دکان پر بیٹھو گے تو تم چاہو یا نہ چاہو کوئی شرارہ اڑ کر تمہارے کپڑوں کو جلا دے گا۔

پھر اس صحبت کے اثر کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ کوئی بھی اُمت کا بزرگ سے بزرگ شخص یا پیغمبر قطب صحابہ کرام کے درجہ کو پہنچ سکتا، کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کی مصاحبت میں ہے تھے لیکن

یہ بات بھی یاد رکھنا چاہئے کہ کسی شخص کے درجات کی بندی کا انحصار محض صحبت پر نہیں ہونا بلکہ کئی دوسرے عوامل بھی اثر انداز ہوتے ہیں اس کی مثال یوں سمجھئے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں حضرات کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مصاحبت کی مدت برابر ہے، لیکن افضل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ قرار پائے۔ وجہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دینی خدمات اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے لئے خدمات، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زیادہ تھیں۔ تو معلوم ہوا کہ کسی شخص کے تزکیہ نفس اور اس کے متقی بننے میں بہت سے عوامل کا عمل دخل ہوتا ہے جن میں سے ایک یہی صحبت صالحہ بھی ہے اور یہی چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ مثال سے بھی واضح ہوتی ہے۔

لیکن اس طبقہ صوفیاء نے اس صحبت بزرگان کی اہمیت کو اتنا بڑھایا کہ اتقا کے حصول اور تزکیہ نفس کے لئے اسی ایک عامل کو اصل الاصول قرار دے دیا۔ اور کسی صوفی شاعر نے انہی خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا ہے

یک زمانہ صحبتے با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

پھر شیر مساجد کے محراب منبر پر جھوم جھوم کر اور سرتال سے یوں پڑھا جانے لگا، گویا یہ کوئی قرآنی آیت یا اس کا ترجمہ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر اس شعر کی کچھ حقیقت ہے، تو عوایدِ اولیں قرنی کی عبادت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جنہیں ایک منٹ کی صحبت بھی نصیب نہ ہوئی اور اس کے باوجود آپ نے انہیں خیر الالبین قرار دیا تھا۔

بات دراصل یہ ہے کہ اس طبقہ نے اپنے اس دینِ طریقت کی اہمیت کو بھلانے کے لئے ہر بات میں افراط و تفریط اور مبالغہ آرائی اور غلو سے کام لے کر کسی لچھی بات کو بھی خواہ مخواہ مشکوک بنا دیا ہے جبکہ شریعت ہر بات کو اس کے جائز مقام پر رکھتی ہے۔ شرعی نقطہ نگاہ سے صحبت بزرگان اتقا کے حصول کے لئے مستحسن اور منجید دیگر عوامل کے ایک عامل ہے جبکہ دینِ طریقت اسے اصل الاصول کے طور پر پیش کرتا ہے۔

۹۔ معرفتِ الہی

گردہ صوفیاء میں معرفتِ الہی کا موضوع جس اہمیت کا حامل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ معرفت کا لفظ ان کے ہاں علم (جو بذریعہ وحی حاصل ہوتا ہے) سے بہت بلند درجہ رکھتا ہے۔ معرفت نفس و معرفتِ الہی کے لئے ان کے ہاں ایک مشہور ضمنی حدیث بھی موجود ہے یعنی مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ اب دیکھئے مِللَانِ اللہِ یَا خَلَا صاحب کتنی زبردست دلیل سے معرفت کی ضرورت قرآن کریم سے پیش کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِعِبَادَتِي
 میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے
 (اعمالیٰ عَزَّوَجَلَّ)
 کہ وہ میری عبادت کریں، یعنی میری معرفت حاصل کریں۔

جب معرفت الہی حاصل ہوگئی تو مقصد تخلیق پورا ہو گیا۔ پس ایسے مقبولینِ خدا جو غایتِ تخلیق کا مصداق ہیں۔ ان سے دشمنی رکھنا کوہِ باطنی کی دلیل ہے۔ (دلائل السلوک، ص ۹۰)

اب دیکھتے مولانا موصوف نے پہلے ”لِعِبَادَتِي“ کے آگے ”بِکَيْفُونِ“ میں ”اَنْیَ لِعِبَادَتِي“ شامل کیا۔ گویا کہ یہ مترادف الفاظ ہیں۔ حالانکہ یہ الفاظ قطعاً مترادف نہیں ہیں۔ پھر ترجمہ میں ”بِکَيْفُونِ“ کے بغیر یہ لفظ شامل کئے۔ پھر تشریح میں عبادت کا لفظ ختم کر کے اس کی جگہ معرفت الہی لے آئے۔ اس طرح تخلیق جن والہ کا مقصد عبادت الہی کے بجائے معرفت الہی ثابت کر دکھایا۔ اسے سمجھتے ہیں مہتمبلی پرسروں جمانا۔ پھر اس سے معرفت رکھنے والے طبقہ کی شان بھی واضح ہوگئی کہ ان عارفین کے علاوہ عام عابدین کی عبادت بے کار ہے کیونکہ معرفت کے بغیر زری عبادت تخلیق کا مقصد پورا نہیں کرتی اور اس سے ضمنی نتیجہ بھی نکلا کہ اس معروف طبقہ اولیاء اللہ سے دشمنی اللہ سے دشمنی ہے۔ چنانچہ مولانا موصوف نے اس عنوان کے تحت یہ آیت درج فرما کر ایسے نادرسائل کا استخراج فرمایا ہے۔

۱۰۔ اَلْخَلْقُ عِبَادُ اللّٰهِ

عنوان بالا حدیث کا ایک ٹکڑا ہے جس کا مفہوم کئی دوسری حدیثوں سے بھی واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً
 اِدْعُوا مَنْ فِي الْمَدِينَةِ يَحْكُمُ مَنْ فِي السَّمَاءِ اِسی حدیث کا ترجمہ مولانا حالی نے ان الفاظ میں بیان کیا کہ
 ”خدا مہربان تم اہل زمین پر خدا مہربان ہو گا عرش بریں پر“
 ان احادیث کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کے علاوہ جانور بھی ہماری ہمدی کے حقدار ہیں۔ جیسا کہ احادیث صحیحہ سے مروی ہے کہ ایک فاحشہ عورت صرف اس وجہ سے جنت میں چلی گئی کہ اس نے ایک ایسے پیاسے کتے کو پانی پلایا تھا، جو شدتِ پیاس کی وجہ سے مر رہا تھا۔ یا ایک عبادت گزار عورت محض اس وجہ سے دوزخ میں گئی کہ اُس نے ایک بلی کو بانہ مار کر جھوکوں مار دیا تھا۔

پھر اس انسانی رحم اور ہمدی کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے جسے پہلوان کو کافروں کے لیے بھی اپنانا
 انسانی حقوق ضروری ہے، مثلاً یہ کہ :

۱۔ انسان کا خون بہر حال محترم ہے اور حق کے بغیر نہیں بہایا جاسکتا۔

۲۔ عورت، بوڑھے، بچے، بیمار اور زخمی پر کسی حالت میں دست درازی درست نہیں۔

۳۔ عورت کی عصمت بہر حال قابلِ احترام ہے۔ اسے کسی حالت میں بھی بے ابرو نہیں کیا جاسکتا۔

۴ بھوکا آدمی روٹی کا، ننگا آدمی کپڑے کا یا بیمار آدمی علاج یا تیمار داری کا مستحق ہے خواہ وہ دشمن کی قوم سے ہی کیوں نہ تعلق رکھتا ہو۔

ان چند امور کے بعد ایک مسلمان اور ایک غیر مسلم کی معاشرتی زندگی بالکل جداگانہ نوعیت کی ہوتی ہے۔ باقی تمام تر معاملات میں مسلم تو آپس میں ایک دوسرے کے ہمدرد اور خیر خواہ ہوتے ہیں، لیکن غیر مسلموں کے معاملہ میں وہ سخت گیر ہوتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَرَاءِ وَرَحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (۴۶/۲۹)

محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھی ہیں وہ کافروں کے حق میں سخت مگر آپس میں رحمدل ہیں۔

اور یہی وہ اسوۂ حسنہ ہے، جو رسول اللہ ﷺ نے اپنا یا اور صحابہ نے آپ کی اتباع میں اس عمل پیرا ہو کر دکھایا تھا۔

لیکن ہم اے صوفیاء جو وحدت الوجود پر ایمان رکھتے ہیں اور وحدت الوجود کی عینک چر دھا کر اسلامی تعلیمات کا مطالعہ فرماتے ہیں، تو ان کے نزدیک الخلق عیال اللہ کا مفہوم یکسر بدل جاتا ہے، وہ اپنے ذکر و فکر اور عشق الہی کی منازل کی تکمیل میں مسلم اور غیر مسلم سب کو ایک سطح پر لے آتے ہیں اور مسلم و کافر میں کچھ امتیاز روا رکھنے کو تنگ نظری اور تعصب کا نام دیتے ہیں۔ جناب خلیق نظامی صاحب اپنی کتاب تاریخ مشائخ چشت میں اس بات کو یوں بیان کرتے ہیں :

’نظر بوحث الوجود میں اعتقاد کا اثر عملی زندگی میں بڑا زبردست پڑتا ہے۔ اس پر اعتقاد رکھنے والے کا مطلع نظر بند، ہمہ دیاں وسیع اور مقاصد اعلیٰ ہوتے ہیں۔ وہ عملاً الخلق عیال اللہ کا قائل ہوتا ہے۔ وہ ہر نظریہ کو ہمدانہ سمجھنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر میں حقیقت تو ایک ہی ہے۔ وحدت الوجود پر ایمان لانے کے بعد انسان میں تنگ نظری اور تعصب کا وجود نور ہوتا ہی نہیں۔“ (تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۱۳)

اب دیکھئے قرآن جس کو ارکواۃ اشداء علی الکفار کے الفاظ کے ساتھ مومنوں کی صفت بیان کرتا ہے۔ اسی بات کو وحدت الوجود پر ایمان رکھنے والے صوفی تنگ نظری اور تعصب قرار دیتے ہیں۔ یہ اسی نظریہ کا اثر ہے کہ ان اولیاء اللہ نے جو نفاق میں قائم کیں ان میں ہندو مسلم، کچھ عیسائی سب اکٹھے رہتے اور پیر کاہل ان سب کی یکجا تربیت فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ یہی خلیق نظامی صاحب اپنی اسی کتاب کے صفحہ ۱۹۷ پر ذرا وضاحت فرماتے ہیں کہ :

’اگر تاریخ کے اشادوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ سماجی نظام مشائخ چشت کی کوششوں کا مرہون بنتا تھا۔ انہوں نے ان علاقے میں بسنے والے مختلف النیال اور مختلف المذہب لوگوں میں اتحاد، عمل اور اتحاد فکر پیدا

کی اور ان منتشر طبقوں کو ایک ایسے رنگ میں رنگ دیا۔ جس نے ایک مضبوط معاشرہ کی شکل اختیار کر لی۔ ان بزرگوں کی خاتما ہوں میں ہندو اور مسلمان سب ہی جمع ہوتے تھے۔ ان مشائخ نے ان اختلافات کے پردوں کو ہٹا کر ہم دلی اور ہم زبانی پیدا کی۔“ (ایضاً، ص ۱۹)

اب تو غالباً آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ الخلق عیال اللہ کا صوفیاء مفہوم کیا ہے اور اس میں وحدت الوجود کا عقیدہ کیا بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ پھر ان لوگوں کا یہ دعوے بھی ہے کہ ان کی خانقاہیں رسول اللہ ﷺ کے اصحاب صفہ کا نمونہ ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا کسی کافر کو اصحاب صفہ میں شامل کر کے اس سے بھی ایسی ہم دلی اور ہم زبانی پیدا کی گئی تھی؟

اور ہم کئی ایسے واقعات درج کر چکے ہیں کہ ان اولیاء اللہ کے ہندو سکھ بھی مرید اور عقیدت مند ہوتے تھے اور مسلمانوں ہی کی طرح ان کے مزارات کی زیارت کر کے کیاں فیض حاصل کرتے رہے۔ پھر کئی اولیاء اللہ ایسے بھی ہیں کہ ان کی موت پر مسلمان بھی تجسیم و تکفین کے ایسے ہی دعویدار ہوتے تھے جیسے ہندو اور سکھ۔ مثلاً بھگت کبیر، گوراندتہ، باباناٹک اور مادھولال وغیرہ۔ یہ تو خیر دور آخر کی اور ہندوستان کی بات ہے۔ صوفیاء کے جذامہ معروف کرنی (م ۲۰۶) کی وفات پر بھی ایسا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ چنانچہ صاحب خزینۃ الاصفیاء لکھتے ہیں: ”جب وفات پائی تو یہود و نصاریٰ دعوے کرنے لگے کہ شیخ ہمارے مذہب پر تھے۔ مسلمانوں نے تردید کی، نزاع بڑھی، خدام کہنے لگے کہ ہمارے شیخ کی وصیت تو یہ ہے کہ ”جو ہمارا جنازہ زمین سے اٹھائے گا ہم اسی سے ہیں۔“ اس پر یہود و نصاریٰ نے باری باری جنازہ اٹھانے کی کوشش کی مگر اٹھانے سکے۔ پھر مسلمان آئے۔ انہوں نے جنازہ اٹھایا اور جس جگہ شیخ نے وفات پائی تھی، وہیں دفن کیا۔ شیخ معروف تجریداً تقریر اور بے سوسامانی میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ شیخ ہجویری لکھتے ہیں کہ شیخ معروف کے فضائل و مناقب بے شمار ہیں۔ علوم میں قوم کے مقتدار اور امام ہیں۔“ (خزینۃ الاصفیاء، ص ۱۲۹)

اب سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ آخر معروف کرنی میں وہ کیا صفات تھیں جن کی وجہ سے یہود و نصاریٰ بھی ان کا ہم مذہب ہونے کا دعوے کرنے لگے۔ کیا نفوذ باللہ کسی صابائی کی وفات پر بھی ایسا دعوے ہوا تھا۔ یہ صوفیاء کا گردہ بھی عجیب متضاد نظریات کا شکار ہے۔ ایسے واقعات بھی بیان کرتے جاتے ہیں۔ وحدت الوجود کے فضائل و مناقب بھی بیان کرتے جاتے ہیں۔ جیسا کہ ہجویری صاحب بھی معروف کرنی کے اسی وجہ سے مدح میں ہیں۔ پھر اس تصوف کو شریعت سے خود ثابت کرنے بھی بیٹھ جاتے ہیں۔ اور الخلق عیال اللہ کی آڑ میں اپنے غیر شرعی اعمال

کا شرعی جواز بھی تلاش کر لیتے ہیں۔

زُہد سے یہ حضرات ترکِ دنیا مراد لیتے ہیں یعنی دنیا سے ہر قسم کے تعلقات منقطع کر کے جھگول و بیلوں کا صحراؤں، دریا کے کناروں پر جا کر سال ہا سال چلے کاٹتے پھرنا، جس کا مقصد خرقِ عادت امور کا حصول اور وقوع پذیر ہونا ہے جبکہ اسلامی زُہد یہ ہے کہ یہ دنیا کی محنتِ دل میں جاگزیں نہ ہو حصولِ دنیا یا کسبِ حلال کو تو اسلام نے صرف جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن قرار دیا ہے۔ یہ حضرات اس معاملہ میں احکامِ نبویؐ کی صریح خلاف ورزی کرتے ہیں۔

۱۱- زُہد

مثلاً تقویٰ، اخلاص، صبر، توکل، قناعت وغیرہ وغیرہ۔ ان چیزوں سے جو کچھ یہ حضرات مراد لیتے ہیں اسے بھی ہم پہلے "اسرار و رموز" کے عنوان کے تحت بیان کر چکے ہیں اور ان پر امام ابنِ قیمؒ کا تبصرہ بھی۔

۱۲- اخلاقیات

صوفیائے کرام کا تفسیری انداز

اب ہم صوفیاء کی ان کوششوں کا جائزہ لیں گے جو انہوں نے طریقت کو شریعت ہی سے مانعاً ثابت کرنے کے سلسلہ میں کی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ جب فقہِ قرآن و سنت سے مانعاً ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں تو اسی طرح تصوف بھی قرآن و سنت ہی سے مانعاً ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ جن لوگوں نے ظاہری معانی اور اعمال و افعال میں اجتہاد کیا وہ فقہاء کہلائے اور جن بزرگوں نے باطنی معانی اور اعمال و افعال میں اجتہاد کیا، وہ صوفی کہلائے حقیقتاً دونوں گروہوں کا ماحذ قرآن و سنت ہی ہیں ہم صوفیہ کے اس دعویٰ کے مطابق ان کے اجتہاد و استنباط کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

یہ تو ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ صوفیاء کے بنیادی نظریہ وحدت الوجود کی رُو سے مظاہر پرستی جائز قرار پاتی ہے اس کے باوجود قرآن اے صریحاً شرک بتلاتا ہے۔ اب صوفیاء کا کہنا یہ ہے کہ انہوں نے اس نظریہ کو اسلام کے بنیادی کلمہ لا الہ الا اللہ ہی سے ثابت کر دکھایا ہے۔ وہ اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں لا الہ الا اللہ اللہ۔ نہیں کوئی معبود مگر وہ اللہ ہی تو ہے یعنی جس چیز کی بھی عبادت کی جائے وہ اللہ ہی ہوتا ہے۔

اہم غزالی نے خواص کی توحید یوں بیان کی تھی کہ لا ہُوَ اِلَّا ہُوَ۔ وہ نہیں مگر وہی۔

اور ہم صوفیاء لا الہ الا اللہ کی تفسیر بھی یوں کرتے ہیں لا مَوْجُودَ الْاَھْوِ گویا اللہ کا ترجمہ مَوْجُود کے نظریہ

وحدت الوجود کو ثابت کر دکھلاتے ہیں۔

۲۔ اسی طرح آیت وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدَ إِلَّا الْآيَاتِہُ (۱۶۳) کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے "اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم نہ عبادت کرو گے مگر وہ اسی کی ہوگی۔ یعنی جس چیز کی بھی عبادت کرو گے وہ اللہ کی عبادت ہی منظور ہوگی۔ یہ ترجمہ ایسا نصیب کے صریحاً خلاف ہے۔

۳۔ اسی طرح ایک آیت ہے فَاسْتَعِذْ بِالْفِتَنِ وَّجْہُ اللہ (۱۶۵) یعنی جب ہر تم رُخ کرو اُدھر خدا کی ذات ہے۔ اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے۔ "تم چیز کی طرف بھی منہ کر کے اس کی عبادت کرو گے اس طرف اللہ ہی کا منہ ہوگا، چنانچہ خواجہ حسن بھری کا یہ شعر انہی معانی کو بیان کر رہا ہے۔

کافراں سجدہ کر پڑے بتاں می گردند ہمدرد سوسے تو بود و ہمدرد سورسے تو بود

ترجمہ: کافر جو بتوں کو سجدہ کرتے ہیں تو ان سب کا منہ تیری ہی طرف ہوتا ہے کیونکہ ہر طرف تیرا ہی چہرہ ہے۔ منہ جہ بالا آیات کی تشریح تو صرف نظریہ وحدت الوجود سے ملتی رکتی ہے اور ان کا ذکر ہم اس عنوان میں پہلے کر بھی چکے ہیں۔ اب ہم ایسی مثالیں دیں گے جن سے علی الاطلاق دین طریقت کے نظریات اور اعمال و افعال کو ثابت کیا جاتا ہے۔

۱۔ نہانی کا تفسیری انداز

نہانی صاحب ایک عالم دین شخصیت ہیں۔ دیکھئے وہ کس طرح درج ذیل آیت کی تشریح کر کے اس سے دین طریقت کی راہ ہموار کر رہے ہیں۔

اتَّخَذُوا لِلنَّاسِ بِالْبَیِّنَاتِ
بڑے فعل جمیل ہے جس سے دل صاف اور نفس ذریع ہو اور تم ایسے افعال نہیں کرنے ہو جس سے تم تجلی افعال کے منہم سے ترقی کر کے ترقی صفات تک پہنچ جاؤ۔

وَأَنْتُمْ تَشْتَوْنَ الْكُتُبَ
اور تم اپنی فطرت کی کتاب پڑھتے ہو جو تم کو ایسے دین کا حکم کرتی ہے جس سے تم توحید کی راہ کے مالک بن جاؤ۔

أَفَلَا تَعْقِلُونَ
تم اپنی آزاد صفات ذمیرہ کو انوار قدیمہ کے فیضان کی سی سے باندھتے ہو جس کو حقیقی قدمت حاصل ہے۔ تم اسی سے مدد مانگو۔

اس سلوک پر ممبر کے ساتھ جو تنہا کے ساتھ رہا رکھا جاتا ہے تاکہ تم متام رضا نگاہ پہنچ سکو۔ اس سے مراد مراقبہ اور حضور قلب ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات کو حاصل کیا جاسکے اور مراقبہ گراں ہے سوائے اُن لوگوں کے جن کے دلوں میں انجماری اور نرمی موجود

بِالْمَعْنَى
وَالْمَعْلُومَةِ

ہے تاکہ تجلیات رب کو اور اس زبردست سطوت کے غلبے کو قبول کر سکیں یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے حضور میں ہونے کا یقین رکھتے ہیں اور یہی اپنی صفات

کو اس کی صفات میں فنا اور گم کر کے اس کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ وہ بادشاہ باریک بین اور زبردست کی شان و صفات کے علاوہ اور محسوس نہیں کرتے

یہ اتامرون انکس بالبر سے لے کر انهم البیدراجون (۲۴/۶) کی تفسیر ہے (غایۃ الامانی فی الرد علی البہانی ترجمہ اردو)۔

غور فرمائیے! علامہ نبہانی صاحب نے کس طرح صرف ایک آیت کی تشریح سے تصوف کے کتنے اہم مسائل مثلاً مراقبہ، نفس کشی، تجلیات الہی، مقام رضا اور مقام فنا تک کو قرآن سے ثابت کر دکھایا ہے۔ جب آپ کی ایسی تشریح رسائل میں چھپنا شروع ہوئی تو غالی صوفیاء کے دلوں کو ٹھنڈا کر دیا۔

اسی طرح کے ایک اور علامہ عبد الغنی نابلسی ہیں۔ ان کا لکھا اجتہاد واستنباط بھی ملاحظہ فرمایا جائے :

يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ مَخْصَرًا
عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ (۳/۷۱) یہ

۲۔ شیخ عبد الغنی نابلسی (م ۱۱۴۳ھ) کا تفسیری انداز

لوگ تو دنیا کی ظاہری زندگی کو جانتے ہیں اور آخرت سے غافل ہیں۔

نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ ”جو شخص ظاہری امور میں مشغولیت اختیار کرتا ہے لیکن اس کے حقائق اور باطنی علم سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ وہ انسان غافل الدین، اسلام سے اس کا کچھ لگاؤ نہیں۔ حالانکہ مقصود علم باطنی ہے اور اسی پر نجات کا دار مدار ہے۔“

اس آیت میں آخرت کا معنی باطنی علم کر کے ان علوم کا قرآن سے ثبوت ہٹا کیا گیا ہے۔

ایک دوسرے مقام پر فرمایا ہے : ”جو شخص کفر و فسق کی نسبت اپنی طرف کرتا ہے وہ زندیق ہے اور جو ہر چیز کی نسبت خدا کی طرف کرے وہ صدیق ہے۔“ اور ثبوت میں یہ آیت پیش کی ہے :

مَا تَرٰهُ فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِن تَفٰوُتٍ (۱۶)

تو اُن کی مخلوق میں کچھ فرق نہ پائے گا۔

نابلسی نے اس آیت کے سیاق اور سابق و دونوں سے صرف نظر کر کے یہ مطلب نکال لیا۔ حالانکہ اس آیت میں سات آسمانوں اور نظام کائنات کا ذکر ہوا ہے۔ یہ تفسیر صوفیوں کے نظریہ ”جبر“ کا ثبوت پیش کر رہی ہے جو وحدت الوجود کے عقیدہ کا لازمی نتیجہ ہے۔

پس یہ ہے وہ طریق اجتہاد و استنباط، جس کے ذریعے طریقت کو شریعت سے ہی اخذ کیا جا رہا ہے۔ باطنی

علوم کے لئے آخر طریقہ استنباط بھی باطنی قسم کا ہی ہونا چاہیئے۔

یہی وہ بات ہے جس کا اعتراف مولوی فضل میراں مترجم "انسان کامل" نے اس کے مقدمہ میں کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ "شرعی علوم بطریق اعتبار و اشارہ ان (باطنی علوم کی) کی تائید کرتے ہیں نہ کہ بطریق تفسیر و فحوائض کلام اور یہ شرعی علوم کمالات نبوت کی ایک اعجازی صفت ہے۔ ورنہ شریعت کی راہ اور ہے اور ان صوفیوں کی راہ اور۔" (انسان کامل، ص ۹)

اب دیکھئے! فضل میراں چونکہ خود بھی اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہذا ان باطنی علوم کی طرف داری ان کے طبعی میلان کا تقاضا تھا، جو انہوں نے یہ لکھ دیا کہ شرعی علوم بطور اعتبار و اشارہ ان باطنی علوم کی تائید کرتے ہیں اور یہ شرعی علوم و کمالات کی ایک اعجازی صفت ہے۔ اس کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ واضح نصوص شرعیہ موجود ہوں وہاں اعتبار و اشارہ کی ضرورت ہی کیا ہے! کیا یہی ضرورت ہے کسی نہ کسی طرح ان باطنی علوم کو جو صریح شرک و بدعت کا مرقع ہیں، کا تعلق نصوص شرعیہ سے جوڑا جاسکے۔ خواہ یہ تعلق اشارہ کنایہ، اسرار و رموز ہی کے ذریعہ ہو؟

سودہ فاتحہ کی تفسیر کا آغاز فرما رہے ہیں۔

۳۔ عبد الکریم جلی کا تفسیری انداز

"جان کہ فاتحہ الکتاب کا نام سبع مثانی ہے اور وہ سات صفات نفیہ ہیں کہ وہ حیات، علم، ارادت، قدرت، سمع، بصر، کلام ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سودہ فاتحہ کو اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان تقسیم کیا ہے۔ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وجود خلق اور حق پر منقسم ہے پس انسان باعتبار اپنے ظاہر کے خلق اور باعتبار اپنے باطن کے حق ہے.... عبد اور رب کے مابین اس کا انقسام اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ انسان اگرچہ خلق ہے پر حق اس کی حقیقت ہے۔ پھر جیسا کہ وہ اوصاف عبودیت کو حاوی ہے ایسا ہی اوصاف ربوبیت کو بھی حاوی ہے۔ اس لئے کہ اللہ اس کی حقیقت ہے.... پس وہ یعنی عبد فاتحہ الکتاب ہے اور وہ سبع مثانی ہے اور اس میں بہت سے اسرار ہیں جن کی ان اوراق میں گننا نہیں۔" (انسان کامل، ص ۱۲۴)

اب بسم اللہ اور الحمد سے وحدت الوجود کا ثبوت ملاحظہ فرمائیے :

"پھر جب بحر تجید میں قلب کا طالع اسم کی کشتی پر سوار ہو گیا اور رحمانیت کی ہوا اِنِّیْ لَا اَجِدُ لَفْظِیْ الرَّحْمٰنِ مِنْ جَانِبِ الْاَیْمَنِ کی جوت میں چلنے لگی۔ معنی اس حدیث کے یہ ہیں کہ میں یمن کی جانب سے رحمن کی ریح طیبہ

کو محسوس کر رہا ہوں۔ یعنی نفس اہم جہیم کی رحمت کی ہدایت سے ذات کے کناسے تک پہنچ گیا۔ پھر وہ (بندہ) اپنے ذات و صفات میں منزہ ہوا اور وجود کی فائز کو کھولا اور ثابت ہو گیا کہ عابدین معبود ہے۔ پھر کہا الحمد للہ اللہ کے نفس کی ثناء کی ساتھ اس چیز کے جس کا وہ مستحق ہے اور اس کے نفس کی ثناء عین اس کا ظہور ہے اور اس چیز میں اس کی تجلی ہے۔“ (انسان کامل، ص ۱۱۵)

اب لفظ ”حق“ سے وحدت الوجود کے اثبات کے دلائل بھی ملاحظہ فرمائیے :

”فرمایا اللہ تعالیٰ نے وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَبَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ۔ آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے ہم نے حق سے ان کو پیدا کیا ہے۔ اسی سے ظاہر ہے کہ ہر چیز حق سے پیدا ہوئی اور حق مادہ عالم ہے۔ اس کی مثال پانی و برف کی سی ہے جس (یعنی مخلوق، مؤلف) میں حق مثل پانی ہے، جو برف کی اصل ہے اور عالم مثل برف کے ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بستہ چیز پر برف کا نام عاریتہ ہے اور پانی کا حقیقتاً۔“ (انسان کامل، ص ۱۱۵)

اس آیت میں بالحق کا ترجمہ من الحق کر کے جلی صاحب نے اپنے فلسفہ کی بنیاد استوار فرمائی ہے۔

یہ تو حق وحدت الوجود کے اثبات کے مستحق قرآنی دلیل۔ اب مصنف صاحب کے عقلی دلائل بھی ملاحظہ فرمائیے :

۱۔ ”جان کہ خیال جب فہن میں کوئی صُوت بناتا ہے، تو وہ صُوت مخلوق ہے، جس میں خالق موجود ہے یعنی تخلیق و تھفل تجھ میں موجود ہے اور تو اس کا خالق ہے۔ اس مثال سے ظاہر ہے کہ تو حق ہے۔ اس اعتبار سے کہ حق کا وجود تجھ میں ہے۔ پس تیری تصویر حق میں واجب ہوئی اور حق اس میں پایا گیا۔ اس باب میں ایک جلیل القدر راز پر ہم نے تجھے آگاہ کیا۔“ (انسان کامل، ص ۸۵)

۲۔ کیا تو اس اعتبار سے اپنے آپ کو نہیں دیکھتا کہ حق بے سزا و تعالیٰ تیرا عین اور تیری ہوتیت ہے۔ حالانکہ تو اپنی حقیقت سے، جس کا تو زیادہ حذر ہے، غافل ہے۔ پھر اس اعتبار سے تو اپنے آپ سے علماء (اندھیرے) میں ہے اور تو بے حیثیت اپنے حق کے اپنے آپ سے پوشیدہ نہیں ہوا۔“ (انسان کامل، ص ۹۲)

۳۔ یا ہم دونوں مثل اس شخص کے ہیں جس کے دو نام ہیں اور ذات ایک ہے۔ جن نام سے ذات کو پکارا جاتا ہے وہ نام اسی کو پہنچتا ہے۔ میری ذات، اس کی ذات ہے اور میرا نام، اس کا نام ہے۔ اس سے اتحاد میں میرا نام عجیب و غریب ہے۔ علی التبعین ہم دو ذاتیں نہیں ہیں کہ دونوں مل کر ایک ہو گئی ہوں، بلکہ خود نفس عجب ہی عجیب ہے۔“ (انسان کامل، ص ۱۱۵)

بتلایئے کیا سمجھے آپ؟ اگر مصنف کے اتنے عقلی اور نقلی دلائل کے باوجود بھی آپ نہ سمجھیں، تو مصنف

۴۔ صوفیاء کے شیخ اکبر ابن العربی کا تفسیری انداز
شیخ اکبر نظریہ حُلُول کو قرآن سے ثابت فرما
ہے ہیں اور حروف مقطعات کی تفسیر کرتے

ہوئے رسول اللہ ﷺ کو اللہ کا اوتار بتلاتے ہیں۔ چند حروف مقطعات کی تفسیر ملاحظہ فرمائیے :

۱۔ اَلْحَمْدُ اٰمَنٌ حَقٌّ الْمُتَحَنِّجُ مُحَمَّدٌ طُم - یعنی حق تھائی، محمد ﷺ میں چھپا ہوا ہے۔
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْوَ حَقٌّ پس آپ حقیقت میں حق ہیں اور حقیقت میں محمد
بِالْحَقِّیْقَةِ مُحَمَّدٌ بِالْخَلْقِیَّتِ (تفسیر ابن عربی، ج ۱، ص ۹۸، ۹۹)
(المومن) بکوالریاض السالکین، ص ۵۵

ایک دوسرے مقام پر انہی حروف کی تفسیر ذرا آسان الفاظ میں یوں بیان فرمائی :
۲۔ حَمْدٌ - ظَهَرُوا الْحَقَّ بِالْصُّنُوفِ اَلْمُحَدِّثَةِ طُم کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ظہور صوتِ محمدی
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ میں ہے۔ (ایضاً، ص ۱۰۲، سطر ۱۱)
بکوالریاض السالکین، ص ۶۶

اور اگر طُم کے ساتھ عَمَقٌ بھی شامل تو اس کی تفسیر یوں ہے :
۳۔ حَمْدٌ عَمَقٌ - اٰمَنٌ حَقٌّ ظَهَرَ بِمُحَمَّدٍ ظَهَرَدِ حق اللہ محمد ﷺ کے ساتھ ظاہر ہوا۔ جیسا علم الہی
عَلَيْهِ سَلَامَةٌ قَلْبٌ فَالْحَقُّ مُحَمَّدًا کا ظہور سلامتی قلب کے ساتھ ہے۔ پس حق تعالیٰ ظاہر
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ظَاهِرًا اور باطن میں محمد ﷺ ہیں۔ (ایضاً، ص ۱۰۴،
سطر ۹، بکوالریاض السالکین، ص ۵۵)

یعنی اگر صرف حَمْدٌ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ظاہر میں محمد ﷺ اور باطن میں حق
تعالیٰ ہیں اور اگر طُم کے ساتھ عَمَقٌ بھی ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ محمد ﷺ ظاہر میں بھی حق تعالیٰ ہیں اور
باطن میں بھی۔ یا حق تعالیٰ ظاہر میں بھی محمد ہے اور باطن میں بھی۔

۴۔ قَ - اِشَارَةٌ اِلَى الْقَلْبِ الْمَحْمُودِ قَ سے قلبِ محمدی ﷺ کی طرف اشارہ ہے
السَّادَةُ هُوَ الْعَرْشُ الْاَلَمِيُّ الْمَحِيطُ اور وہ عرش الہی ہے، جو کہ ہر شے کو محیط ہے۔ (ایضاً
ج ۲، ص ۲۰۱، سطر ۱۱، بکوالریاض السالکین، ص ۶۶)

۵۔ مولانا الشریار خاں صاحب مصنف دلائل السلوک کا تفسیری انداز | آپ فرماتے ہیں:

”ہر انسان کے سینے میں ایک ہی دل ہے اور وہی محل تجلیات باری کے لیے مخصوص ہے۔ اس لیے باری تعالیٰ اس میں غیر کا قبضہ پسند نہیں فرماتا۔ جب قلب تجلیات باری کا مسکن بن جاتا ہے تو تمام رذائل ذلیل ہو کر چلے جاتے ہیں اِنَّ الْمُلُوكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْا اَعْزَّةَ اَهْلِهَا اَذَلَّةً (دلائل السلوک، ص ۲۸)

اب دیکھتے مولانا موصوف نے اپنے دعوے کی تائید میں جو آیت پیش فرمائی ہے اس کا انطباق مشکل ہے اگر لوگ سے مراد تجلیات الہی مراد ہوں اور قریہ سے مراد دل ہو، تو تجلیات الہی تو دل کو سکون بخشتی ہیں، ہنس نہیں تو نہیں کرتیں، پھر بادشاہ اس بستی کے رہنے والے معزز حضرات کو ذلیل تو بنا دیتے ہیں مگر بستی سے نکال تو نہیں دیتے جبکہ تجلیات سے رذائل نکل جاتے ہیں اور جو پہلے ہی رذائل ہیں اُن کے ذلیل ہونے کا کیا سوال؟ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دنیا دار حکمرانوں کا کردار بتلایا تھا۔ آپ نے اس سے تجلیات الہی اور رذائل کا ذلیل ہو کر چلے جانا ثابت کر دکھایا ہے۔

معرفت الہی کا ثبوت | آپ فرماتے ہیں:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (اعلیٰ علیہ غوب)

مبادت کریں یعنی میری معرفت حاصل کریں۔ جب معرفت الہی حاصل ہو گئی تو مقصد تخلیق پورا ہو گیا۔ پس اپنے مقبولین خدا، جو غایت تخلیق کا مصداق ہیں، ان سے دشمنی رکھنا کو رہا باطنی کی دلیل ہے۔ (دلائل السلوک، ص ۹۰)

اس آیت کے ترجمہ اور تشریح میں جس طرح آپ نے تصرف فرمایا ہے وہ ظاہر ہے کہ پہلے ’لِیَعْبُدُوْنَ‘ کا معنی ’لِیَعْرِفُوْنَ‘ لکھا۔ تفسیر شریح میں ’لِیَعْبُدُوْنَ‘ کو ختم کیا اور صرف ’لِیَعْرِفُوْنَ‘ لاکر ثابت کر دکھایا کہ معرفت الہی ہی تخلیق انسانی کا اصل مقصد ہے۔ معرفت تو اس طرح ثابت ہو گئی، لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر زید یہ کہے کہ ’لِیَعْبُدُوْنَ‘ کا معنی ’لِیَجْهَدُوْنَ‘ ہے، تو آپ اس کے دعوے کو کس دلیل سے باطل کر سکتے ہیں؟

ہم نے ممدوے چند نمونے پیش کر دیئے ہیں۔ ورنہ یہ سلسلہ بھی خاصا طویل ہے۔ آخر کس کس صوفی کی کون

کون سی تفسیر اس مختصر مضمون میں درج کی جاسکتی ہے۔ بالآخر یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ "اس خاندانہ آفتاب است حج فرمایا تھا علامہ اقبالؒ نے کہ:

زمن بر صوفی ملامت سلاے کہ پنیم خدا گفتند مارا

وئے تاویل شان رحیرت انداخت خدا و جبریل و مصطفیٰ را

یعنی میں صوفی اور ملامت کو سلام کہتا ہوں، جنہوں نے خدا کا پنیم ہم تک پہنچایا، مگر انہوں نے تاویل ایسی زالی بنائی کہ خدایا، جبریلؑ بھی اور حضور اکرم ﷺ بھی سرپیٹ کے رہ جائیں۔ (کہ ہم نے کیا کہا تھا اور ان لوگوں نے اس کا کیا مضموم بنالیا۔)

موضوعات اور غلط تاویلات کے سہارے

اگر مہذبہ جبرائیل کا تفسیری لانا از احتیاج کر لیا جائے تو احادیث کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی لیکن شکل یہ ہے کہ ایسے مفسرین بہت بعد کی پیداوار ہیں۔ تیسری صدی ہجری تک ایسی تفسیر میں گناہ و راج تھا اور نہ ہی ان کی ضرورت تھی۔ البتہ وہ دور ایسی موضوع احادیث اور رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر کے واقعات تراشنے کا مہذبہ تھا۔ ملاح علی قادری (اپنی تصنیف) موضوعات کبیر میں لکھتے ہیں کہ "روافض نے حضرت علیؑ اور اہل بیت کے فضائل و مناقب میں نہیں لاکھ روایات وضع کی تھیں۔" اسلامی تصوف میں باطل نظریات کی آمیزش، از پر و فیروز علی ہاشمی، ص ۱۱۹، ۱۲۱) روافض کی طرح صوفیاء نے بھی اس میدان میں دل کھول کر حصہ لیا۔ صوفیاء کی اہمات کتب میں سے اکثر سچو سچی اور پانچویں صدی یا بعد میں تصنیف ہوئیں۔ جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

(۱) حسین بن منصور حلاج (م ۳۰۹) کی کتاب "الطواسین"

(۲) ابوالنصر سران طوسی (م ۳۶۸) "اللمع فی التصوف"

صوفیاء کی اہمات کتب

(۳) ابوبکر محمد کلاباذی (م ۳۸۰) کی کتاب "التعرف فی مذہب اہل التصوف"

(۴) ابوطالب بختی (م ۳۸۲) "قوت القلوب"

(۵) ابوعبدالرحمن السلی (م ۴۱۳) "طبقات الصوفیاء"

(۶) ابوالحسن جہضمی (م ۴۱۴) "ہجۃ الاسرار"

(۷) حافظ البیہقی (م ۴۳۰) "حلیۃ الاولیاء" (جلد ۱۰)

(۸) ابو القاسم قشیری (م ۴۶۵ھ) کی کتاب ”رسالہ قشیریہ فی التَّوْف“

(۹) شیخ علی ہجویری (م ۴۶۵ھ) ”کشف المحجوب“

(۱۰) ابوالمیل عبداللہ ہروی (م ۴۸۱ھ) ”منازل السائرین“

(۱۱) امام غزالی (م ۵۰۵ھ) ”احیاء العلوم“ اور ”کیبائے سادت“

(۱۲) شیخ عبدالقادر جیلانی (م ۵۶۱ھ) ”فتوح الغیب“

(۱۳) شہاب الدین سہروردی (م ۶۳۲ھ) ”عوارف المعارف“

(۱۴) عبدالکریم جیلی (م ۸۰۵ھ) ”الانسان الکامل“

پانچویں صدی کے بعد ان کتب میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ ان تمام ترکتب میں ضعیف اور موضوع احادیث کی بھرمار ہے۔ حتیٰ کہ امام غزالی جیسے فضلاء نے بھی اپنی تصانیف میں ایسی احادیث کو درج کرنے کے سلسلہ میں تساہل سے کام لیا ہے۔ تاج الدین سبکی نے صرف ”احیاء العلوم“ کی بے بنیاد حدیثوں کو جمع کر کے ۳۷ صفحات پر مشتمل فہرست اپنی کتاب ”الطبقات الشافعیہ“ میں شامل کی ہے۔ (امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ، کوکن ٹری، ص ۲۵۷)

صوفیہ نے دینِ طریقت کو شریعت ہی سے مانو ذکر کرنے کے لئے چار طرح کے اقدامات کئے ہیں۔ جو درج ذیل ہیں :

۱۔ قرآنی آیات کی غلط تائید و تفسیر، جس کا نمونہ ہم پیش کر چکے ہیں۔

۲۔ احادیث صحیحہ کی غلط تائید و تفسیر، جو ضمناً اس کتاب میں اپنے اپنے مقام پر درج کی گئی ہیں۔

۳۔ موضوع احادیث، یعنی ایسے اقوال، جو رسول اللہ ﷺ کی طرف خواہ مخواہ منسوب کر دیئے گئے ہیں۔

پھر ان کے ہاں بعض احادیث ایسی بھی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ جسے عرف عام میں حدیث قدسی کہتے ہیں۔

۴۔ موضوع واقعات، یعنی ایسے واقعات جنہیں خود زائش کر رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ سردست ہم صرف نمبر ۲ اور نمبر ۳ کے موضوعات کا مختصر تذکرہ کریں گے۔

موضوع احادیث

ان کا پورا شمار تو ہمارے موضوع سے خارج اور احاطہ سے باہر ہے۔ تاہم چند مشہور موضوع احادیث

کا تذکرہ مختصراً ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔

۱۔ ابتدائے کائنات سے متعلق

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

كُنْتُ كُنْزًا خَفِيًّا فَاحْبَبْتُ أَنْ أُعْرَفَ
فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ (حدیث قدسی) دریا میں لایکھن، ص ۴۴) میں نے خفیت کو پیدا کیا۔
اور ایک دوسری روایت میں "خَلَقْتُ الْفَلَاحَ" کے الفاظ ہیں۔ ملا علی قاری نے اس روایت کو
موضوع قرار دیا ہے۔ (اسلامی تصوف میں باطل نظریات، ص ۱۱۹)

۲۔ نور محمدی

إِنَّ أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللَّهُ نُورُ نَبِيِّكَ
يَا جَابِرُ
اے جابر! اللہ نے سب سے پہلے تیرے نبی (محمدؐ)
کے نور کو پیدا کیا۔

اسی موضوع حدیث کو یوں بھی روایت کیا گیا ہے:

إِنَّ أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللَّهُ
نُورِي
رسول اللہ نے فرمایا: پہلے پہلی چیز جو اللہ نے پیدا
کی وہ میرا نور تھا۔

یہ حدیث یونانی فلسفہ سے متاثر ہو کر گھڑی گئی ہے۔ فلاسفہ جس چیز کو عقل دوم کہتے ہیں۔ صوفیاء اسے
ہی نور محمدی کہتے ہیں۔ اس حدیث اور اس فلسفہ پر تفصیلی بحث ص ۴۸۱، ۴۸۲ پر ملاحظہ فرمائیے۔
اب موضوع حدیث کی مزید تفسیر بھی ملاحظہ فرمائیے:

۳۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا: "اے جابر! تحقیق اللہ تعالیٰ نے
تمام اشیاء سے پہلے تیرے نبی کا نور پیدا کیا اپنے نور سے۔ پھر وہ نور قدرت الہیہ سے، جہاں اللہ کو منظور ہوا،
کرتار ہوا اور اس وقت نہ لوح تھی نہ قلم تھا اور نہ بہشت نہ دوزخ اور نہ فرشتے۔ نہ آسمان نہ زمین۔ نہ سورج نہ چاند
نہ جن نہ انسان۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کرنا چاہا، تو اس نور کے چار حصے کئے۔ حصہ اول کا قلم بنایا۔
حصہ دوم کی لوح، تیسرے حصے کا عرض، چوتھے کے کائنات۔ (شرح قصیدہ حمزہ، ص ۱۵، بحوالہ ریاض السکین ص ۴۲)
یہ حدیث سننے کے بعد ممکن ہے آپ کو یہ یوں کرنے کی خواہش پیدا ہو کہ اس نور نبی کو پیدا ہوئے کتنی مدت

گزری؛ تو لیجئے ایسی موضوع حدیث بھی حاضر خدمت ہے:

۴۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبریل علیہ السلام سے سوال کیا کہ تمہاری عمر کتنی ہے؟ تو حضرت جبریل علیہ السلام نے عرض کی کہ اے آقا! میں اچھی طرح عسہ نہیں جانتا، مگر اتنا جانتا ہوں کہ چوتھے حجاب میں ستارہ تھا، جو ستر ہزار سال کے بعد طلوع ہوا کرتا تھا اور میں نے اس کو ... ۲۰ (بہتر ہزار مرتبہ دیکھا ہے۔) تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ: ”مجھے پروردگار کے عزت و جلال کی قسم! وہ ستارہ میں ہی ہوں۔“

اب دیکھئے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے اپنی عمر ... $\times 42000 = 420000000$ ، ایک ارب چوں کروڑ سال بتلائی ہے اور یہ ستارہ یعنی نور نبی اس سے بہر حال مدتوں پہلے کا تھا۔ یہ کتنا پہلے کا تھا؟ اس موضوع حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنے نور کی عمر نہیں بتلائی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث تراش “کو اس سے زیادہ حساب آتا ہی نہ تھا۔

۵۔ یہ بھی یاد ہے کہ اس نور نبی کو اللہ تعالیٰ نے اپنے چہرے کے نور سے پیدا کیا تھا اور اس بات کا اقرار اللہ تعالیٰ خود کرتے ہیں۔ چنانچہ روایت ہے:

قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: "خَلَقْتُ مُحَمَّدًا مِنْ نُورٍ وَجْهِهِ".
وَالْمُرَادُ مِنَ الْوَجْهِ ذَاتُ الْمُنْتَهَى. (سرالامہ)

ص ۱۳، ۱۴، بحوالہ ریاض السالکین ص ۹۰

۶۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس موضوع حدیث قدسی کی تائید ایک اور موضوع حدیث سے فرمادی۔ اور وہ حدیث یوں ہے:

در حدیث قدسی وارد است:

يَا مُحَمَّدُ! أَنْتَ أَنَا وَأَنَا أَنْتَ

”اے محمد ﷺ! تُو میں ہوں اور میں تُو ہے“

جو انہریسی ص ۲۰۲، بحوالہ ریاض السالکین ص ۹۲

۷۔ پھر خود رسول اللہ ﷺ اس کی یوں تائید فرماتے ہیں کہ ”میں اللہ کے نور سے ہوں“ اور اس کی مزید تشریح یوں بھی کرتے ہیں کہ ”میں اللہ کے نور سے ہوں اور کل میرے نور سے ہیں“ (مدارج النبوت ص ۲۵، ۲۶، بحوالہ ریاض السالکین ص ۲۳۹)

اب بات یوں ہوئی کہ اللہ نے سب سے پہلے نور نبی کو پیدا اور یہ نور نبی ایک۔ تارہ تھا، جس سے حضرت جبریل

نے اپنی عمر کا حساب بتایا تھا۔ اب اس نور بنی یا تارہ سے ہی عرش، لوح و قلم، کرسی، بہشت و دوزخ اور شمس و قمر پیدا کئے جائے ہیں۔ یعنی ایک تارہ سے ہی پوری کائنات کی تخلیق بتلائی جا رہی ہے۔

۷۔ حضرت آدم ﷺ سے جب گناہ سرزد ہوا، تو یہی نور بنی اس گناہ کی مغفرت کا سبب بنا تھا۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ :

”جب حضرت آدم ﷺ جنت سے نکال کر دنیا میں بھیجے گئے، تو ہر وقت روتے اور استغفار کرتے تھے ایک مرتبہ آسمان کی طرف منکب کیا اور عرض کی : ”اے باری تعالیٰ، حضرت محمد ﷺ کے وسیلہ سے مغفرت چاہتا ہوں۔“ وحی نازل ہوئی۔ ”محمد کون ہیں؟“ عرض کیا : ”جب آپ نے مجھے پیدا کیا تھا، تو میں نے عرش پر کھایا اور کھا تھا کہ : لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔“ تو میں سمجھ گیا تھا کہ حضرت محمد ﷺ سے اوپری کوئی ہستی نہیں ہے۔ جن کا نام تم نے اپنے نام کے ساتھ لکھ رکھا ہے۔“ وحی نازل ہوئی کہ ”وہ خاتم النبیین ہیں، تمہاری اولاد میں سے ہیں، لیکن وہ نہ ہوتے تو تم بھی پیدا نہ کئے جاتے۔“ (ریاض السالکین، ص ۳۰۶)

اب دیکھئے ! اس موضوع حدیث میں یہ ذکر کہیں نہیں آیا کہ پھر حضرت آدم ﷺ کی توبہ بھی قبول ہوئی یا نہیں اٹا اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر حضرت آدم ﷺ کو اور بھی مایوس کر دیا کہ اگر وہ نہ ہوتے تو تم بھی نہ ہوتے۔ کسی سال کو اگر ایسا جواب دیا جائے تو بتلایئے کہ اس کے دل پر کیسی بیتی ہے۔

البتہ اس حدیث نے اور کئی مسئلے حل کر دیئے۔ مثلاً (۱) خواہ کتنے ہی برس اللہ سے دور ہو کر مغفرت چاہیں قبول نہیں ہوتی، جب تک کسی کا وسیلہ نہ پکڑیں اور (۲) یہ وسیلہ اپنے نیک اعمال کا نہیں، ایسی ہستی کا بھی ہو سکتا ہے جو ابھی تک وجود میں نہ آئی ہو۔

کاش ! یہ بات حضرت آدم ﷺ کو اتنی مدت رونے سے پہلے ہی معلوم ہو جاتی۔
تیسری بات یہ یاد رکھئے کہ یہ نور بنی اور حضور اکرم ﷺ ایک ہی چیز ہیں، کیونکہ ایک اور موضوع حدیث قدسی میں بھی ہے۔

۳۔ رسول اللہ ﷺ کی عظمت

۹۔ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ يَقُولُ اللَّهُ : وَبِعِزَّتِي وَ جَلَالِي لَوْلَاكَ لَمَّا خَلَقْتُ الدُّنْيَا۔
”اے محمد ﷺ ! اگر تم نہ ہوتے، تو میں دنیا کو پیدا

ہی نہ کرتا۔“

(ریاض السالکین، ص ۲۳۴)

۱۰۔ ایک دوسری روایت میں یہ موضوع حدیث قدسی یوں بھی آئی ہے :

لَوْلَا لَنَا خَلَقْتُ الْاَخْلَاقَ (دِیَاخُ السَّالِکِین ص ۱۹) ”اگر تم نہ ہوتے، تو میں کائنات کی کوئی چیز بھی پیدا نہ کرتا۔“

۱۱۔ پھر چونکہ آپ اللہ کے نور سے نور تھے، لہذا آپ کا سایہ نہ تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہ تھا۔ آپ کبھی سوچ کے ساتھ نہیں ہوتے مگر آپ کا نور پاک سوچ کی روشنی پر غالب ہوتا۔“ اور ابن سنی نے کہا: ”جب سوچ یا چاند میں چلتے تو آپ کا سایہ ظاہر نہ ہوتا، کیونکہ نور کا سایہ نہیں ہوتا۔“ (زرقانی ۲/۲۲۰، بحوالہ ریاض السالکین ص ۳۴۸)

اب مشکل یہ ہے کہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ”ہمارے گھر میں چراغ جلتا تھا اور آپ کا سایہ بھی ہوتا تھا۔“ ہو سکتا ہے کہ سوچ اور چاند کی روشنی میں ہی آپ کا نور چمکتا ہو۔ رات کے اندھیرے میں نہ چمکتا ہو۔ پھر یہ چراغ کی روشنی میں آپ کے سایہ کی سمجھ نہیں آتی، حالانکہ یہ چراغ بھی تو آپ کے نور سے ہی پیدا ہوا تھا۔
۱۲۔ پھر یہ اللہ کے نور سے نور ہی کا اثر تھا کہ آپ ہر جگہ حاضر و ناظر ہوتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ ہوتا ہے۔ اس کی دلیل عرشی صاحب ریاض السالکین نے صفحہ ۲۲۴ پر اس قرآنی آیت سے دی ہے :

وَيَكُونُ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (۱۴۴/۲) ”اور رسول تم پر گواہ یعنی حاضر و ناظر رہتے ہیں۔ جب رسول پاک ہر وقت گواہ ہستے ہیں، تو پھر اپنے ہر انتہی کے اعمال سے باخبر ہیں کہ فلاں کے اعمال کیسے ہیں اور دین کس درجہ پر ہے۔“ (ریاض السالکین ص ۲۳۴)

حاضر و ناظر کی یہ دلیل تو خوب ہے لیکن مشکل یہ اڑتی ہے کہ اس آیت کا پہلا حصہ یوں ہے کہ ”لَيَكُونُوا شَهِدًا عَلَى النَّاسِ“ پھر کیا تمام صحابہ بھی حاضر و ناظر ہیں، جو دوسرے لوگوں پر گواہ اور ان کے اعمال کے نگران ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر آپ کی خصوصیت کیا رہی؟

البتہ اس کھینچا تانی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر و ناظر ثابت کرنے کا ایک فائدہ ضرور ہو جاتا ہے اور وہ کہ یہ تمام بیرون، فقیروں یعنی اولیاء اللہ کے حاضر و ناظر ہونے اور اپنے مریدوں کے اعمال پر نگران بنے رہنے کا راستہ صاف ہو جاتا ہے۔

۱۳۔ آپ کے اللہ کے نور سے نور ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ جس طرح اللہ کے لئے یا نور کے لئے موت نہیں، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دائمی زندگی ثابت کی جاتی ہے۔ آپ کا دربار بھی لگتا ہے اس میں باقاعدہ بیست بھی لگائی جاتی ہے۔ اولیاء آپ کے پاس اور آپ اولیاء کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں اور آپ نے وہ تمام امور بھی سنبھال رکھے ہیں جو اللہ کے ذمہ ہیں اور قیامت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیراض

بجالاتے رہیں گے اور یہ سب کچھ صحیح حدیث کے ایک ٹکڑے "اَتَمْنَا اَنَّا قَاسِمًا وَاللّٰهُ مُنْعِلٌ" (میں نو صرف بانٹنے والا ہوں، عطا کرنے والا نواہدہ نکالتے ہیں) سے ثابت کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ الفاظ اپنے اس وقت ادا فرمائے تھے جب آپ مال عنیت تقسیم فرما رہے تھے۔

ہمارے اولیاء اللہ نے اس تاویل سے بھی جی بھر کر فائدہ اٹھایا ہے۔

۴۔ قبر النبی ﷺ کی زیارت کے متعلق موضوعات

اسی عقیدہ کی بنا پر لوگوں نے آپ کی قبر کی زیارت کی فضیلت پر بہت سی

حدیثیں تراشی ہیں، جن میں سے چار پانچ ہم قبروں کے بیان (باب ششم) میں ذکر کر آئے ہیں اور علماء نے یہ وضاحت کر دی ہے کہ ایسی تمام احادیث جو قبر النبی ﷺ کی زیارت اور فضیلت سے تعلق رکھتی ہیں سب موضوع ہیں۔ البتہ صوفیاء کے لئے ایسی موضوعات بہت کار آمد ہیں کیونکہ یہ اُن کی قبوری شریعت کے لئے بنیاد فراہم کرتی ہیں اور پختہ قبروں اور مزاروں کی تعمیر، عرسوں، میلوں، مجاورت اور نذرانوں اور چڑھاؤں کے لئے راہ ہموار ہو جاتی ہے۔

۵۔ اولیاء اللہ کی شان کے متعلق موضوعات

۱۵۔ اَوْلِيَائِیْ تَخْتَقِبَانِ لَا یَعْرِضُ لَہُمْ

غَیْرُ (حدیث قدسی)

اللہ تعالیٰ فرمایا: ہیکے اولیاء میری قبایں ہیں جنہیں میرے

سوا کوئی نہیں جانتا۔ (تذکرہ خواجہ، بکوالریاض السالکین، ص ۱۱۹)

بیک اولیاء اللہ میرے شکر گرد ہیں۔ (جمال، ص ۱۱۹)

بکوالریاض السالکین، ص ۲۳۶)

بنی کریم ﷺ نے فرمایا: شیخ اپنے مریدوں میں ایسا ہوتا

ہے، جیسے نبی اپنی امت میں۔

۱۸۔ معرفت نفس کے متعلق یہ حدیث "من عرف

نفسہ فقد عرف ربہ" بھی موضوع ہے۔ مجدد الف ثانی

۶۔ معرفت کے متعلق احادیث موضوعہ

نے اس کو موضوع تو نہیں سمجھا مگر اس کی تاویل کر کے اُسے صحیح رُخ کی طرف ضرور موڑ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ: "ابن عربی نے 'من عرف نفسه فقد عرف ربہ' کی تاویل میں بھی غلطی کی ہے۔ یعنی اپنے نفس کی معرفت میں خدا کی معرفت سے باوجود سبھی اس بنا پر سنت رسول ﷺ سے بلند تھے، وہ کہتے تھے کہ ان راویوں سے احادیث بیان کرتے ہو، جو میرے جیسے جیسے ہم اللہ سے باور راست ہم کلام ہوتے ہیں، جو کئی لایوت ہے۔

معرفت سمجھتا ہے۔ اس کے معنی نہیں کہ وہ عین یک دیگر ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنی فطرت کے نقائص اور عیوب کو محسوس کر لیتا ہے، وہ پالیتا ہے کہ فضائل اور کمالات صرف خدا کی ذات میں ہیں۔ “حضرت مجدد کا نظریہ توحید، بحوالہ مکتوب ہانی، دفتر ۲، مکتوب ۲۳۴)

حضرت مجدد کی یہ تاویل، حضرت علی ؓ کے اس قول عَزَفْتُ رَبِّي بِنَسِيخِ الْغَزَائِدِ سے البتہ مطابقت رکھتی ہے۔

۱۹۔ قَالَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ : مَنْ عَرَفَنِي
رَسُولُ اللَّهِ ﷺ نَفَعَنِي مَا هُوَ كَمَا هِيَ كَمَا هِيَ
فَقَدْ عَرَفَ الْحَقَّ وَمَنْ لَمْ يَرَنِ فَقَدْ رَأَى الْحَقَّ
اس نے اپنے خدا کو پہچانا اور جس نے مجھے دیکھا اس نے خدا کو دیکھا۔
(تفسیر عرائض البیان ج ۳، صفحہ ۱۳، بحوالہ ریاض السالکین ص ۷۹)

معلوم ہوا کہ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے بھی اپنے رب کو پہچان لیا اور جس نے رسول اکرم کو پہچان لیا اس نے بھی اپنے رب کو پہچان لیا۔ اب اس معرفت الہی کا فائدہ درج ذیل مجموعہ حدیث میں ملاحظہ فرمائیے۔
۲۰۔ مَنْ عَرَفَ اللَّهَ لَا يَخْشَى عَبْدًا شَيْئًا (مرشد کامل، ص ۹)
جس نے اللہ کو پہچان لیا۔ اس پر کوئی چیز غمخیز نہیں رہتی۔

۷۔ دین طریقت اور باطنی علوم کی فضیلت

۲۱۔ الشريعة أقرأت، الطريقة أعمال والحقيقة حال
رسول الله ﷺ نے فرمایا: شریعت میرے اقوال،
طریقت میرے افعال اور حقیقت میرا حال ہے۔
(مرشد کامل، ترجمہ حدائق الاخیار، ص ۹)

۲۲۔ حدیث شریف، اِنَّ لِلْقُرْآنِ ظَهْرًا وَ
بَطْنًا وَ بَطْنُهُ كَبُطْنِ الْجَلِ
سبعة ابطین وَ فِي رَوَايَةٍ اِلَى سَبْعِينَ
بَطْنًا۔ (ریاض السالکین، ص ۳۶۲)
بے شک قرآن مجید کا ایک ظاہری پہلو ہے اور ایک باطنی۔ پھر باطنی پہلو کا ایک اور باطنی پہلو ہے، جو سات پہلوؤں تک ہے۔ اور ایک دوسری روایت ہے کہ ستر باطنی پہلوؤں تک ہے۔

اب بتلایئے کہ جہاں باطنی پہلوؤں کی اتنی گنجائش ہو وہاں تصوف پر باطنیت کی چھاپ نہ ہو تو اور کیا ہو؟ پھر جب ہم یہی بات کہتے ہیں تو ان کرم فرماؤں کو یہ بات بھی بھلی نہیں لگتی۔

۸۔ سماع و وجد کے متعلق موضوعات :

۲۳۔ السَّمْعُ مَبْنَاهُ لَا هَلْهُ (مرشد کامل ترجمہ حدائق الاخیار، ص ۱۵۰)
سماع اس کے اہل کے لئے مباح (جائز) ہے۔

اور وہ اہل کون ہے؟ یہ حدیث بھی حاضر ہے :-

۲۳۔ سماع اس شخص کے لئے جائز ہے جس کا دل زندہ لیکن دنیا کی طرف سے مردہ ہو۔

الْتَّعَامُ مَبَاحٌ لِّمَنْ كَانَ قَلْبُهُ حَيًّا عَنِ الدُّنْيَا مَيِّتًا (حوالہ ایضاً)

۹۔ سماع موتی سے متعلق موضوع حدیث :

۲۵۔ ”حدیث شریف میں ہے کہ : کسی بھی قبر پر چڑیا یا چڑیا بیٹھے تو صاحب قبر کو اتنا بھی معلوم ہوتا ہے کہ قبر پر نذر جانور ہے یا موتی ۔“ (ریاض السکین، ص ۲۴۳)

پھر ہی صاحب ریاض السکین ایک صحیح حدیث سے سماع موتی کا استدلال کرتے ہیں :

۲۶۔ ”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب مردہ کو اس کی قبر میں اتار آتے ہیں اور لوگ واپس ہوتے ہیں تو مردہ جانے والوں کی جوتیوں کی آواز سننا ہے۔“ پس اس سے ثابت ہوگا کہ اولیاء اللہ ہمیشہ زندہ ہی ہوتے ہیں۔ (ریاض السکین، ص ۲۳۴)

دیکھا آپ نے کیسا جواب ثبوت مہیا فرمایا ہے عرشی صاحب نے۔ بات مردہ کی ہو رہی ہے اور وہ کافر و مشرک بھی ہو سکتا ہے۔ اور اس سے دائمی زندگی آپ اولیاء اللہ کی ثابت فرما رہے ہیں۔ اگر اس سے دائمی زندگی ثابت کرنا ہی ضروری ہے، تو اس میں اولیاء اللہ کی خصوصیت کہاں سے اگنی ؟

۱۰۔ شیعیت سے لگاؤ کے متعلق موضوعات :

ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا : ”میں جس آسمان پر گزرا، وہاں کے رہنے والوں کو علی ابن ابی طالب کا شتاق پایا۔“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ علی رضی اللہ عنہ کی محبت گن ہوں کہ اس طرح کہا جاتی ہے جیسے اگ لکڑی کو۔

۲۷۔ عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

مَا مَرَزْتُ بَشَرًا إِلَّا وَأَهْلُهَا مُتَنَاوِفُونَ إِلَيَّ

علی ابن ابی طالب (زین العابدینؑ) بقراریض السکین، ص ۱۵۸

۲۸۔ عن ابن عباس قال : حب علی بن ابی طالب باكمل الذنوب كما تاكل النار الحطب

(ریاض النظر، ص ۲۸۵)

۲۹۔ كَانَ أَبُو بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ يَكْثُرُ النَّظَرَ

إِلَى وَجْهِ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ فَسَالَتْ

غَاثَةً فَقَالَ : سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ

يَقُولُ : النَّظَرُ إِلَيَّ وَجْهُهُ عِبَادَةٌ -

(المصاوغ المحرقه بحوالہ ریاض

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اکثر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف

دیکھا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے باپ

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے پوچھا : آپ ایسا کیوں کرتے

ہیں، تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا : میں نے رسول اللہ

ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ : ”علی کے چہرہ کی طرف

دیکھنا عبادت ہے۔

الساکنین، ص ۱۹۹

۳۰۔ ”حضور فرماتے ہیں کہ: ذکر علی عبادۃ یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر عبادت ہے۔ یعنی ”علی، علی، علی“

کہنا عبادت ہے۔“ (ریاض الیقین، ص ۱۹۹)

۱۱۔ عشق بازی کی فضیلت :

جس نے عشق کیا اور پکارا اور عشق کو چھپایا۔ پھر مر گیا
تو وہ شہید کی موت مرا۔

۳۱۔ مَنْ عَشِقَ قَتَعَتْ وَكُتِمَ قِمَاتٌ، مَاتَ شَهِيدًا

(تجدید، بقصر و سلوک، ص ۱۳۷)

۱۲۔ مجاہدہ و ریاضت کی فضیلت :

ہم جہادِ اصغر (جہادِ بائیں) سے جہادِ اکبر (مجاہدہ
نفس) کی طرف لوٹ آئے

۳۲۔ رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْأَصْغَرِ إِلَى الْجِهَادِ الْأَكْبَرِ

۱۳۔ خرقہ کی فضیلت :

جس نے اپنے کپڑے کو نرم بنایا اس نے اپنے دین کو نرم
بنایا۔

۳۳۔ مَنْ رَقَّ قَوْبُهُ رَقَّ دِينُهُ (مرشد کامل)

ترجمہ حقائق الاخیار، ص ۱۶۵

۱۴۔ رجال الغیب سے استفادہ :

یعنی اگر کوئی شخص جہل میں ہو اور اس کی کوئی چیز نگم جائے یا اسے کسی طرح کی مدد درکار ہو تو اسے چاہیے کہ پکارے۔

اے اللہ کے بندو! میری مدد کرو

۳۴۔ اَعِينُونِي يَا عِبَادَ اللَّهِ

تو رجال الغیب مدد کو پہنچتے ہیں۔ یہ حدیث بھی موضوع اور شرکِ صریح ہے۔ اگرچہ اس طرح فائدہ ہو بھی
جائے۔ تب بھی اس کے شرک ہونے میں کوئی شک نہیں۔ یہی حدیث شش فصل اور مفت مہیکل جیسے مشرکانہ
افعال کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔

۱۴۔ دنیوی زندگی میں شاہدِ باری تعالیٰ :

تم سے جزو کوئی نہ کوئی مرنے سے بیشتر اپنے رب
کو دیکھ لے گا (تہذیب نویر، ص ۲۶، بحوالہ ریاض السالکین ص ۲۲۹)

۳۵۔ حَدِيثٌ قُدْسِي : اِنَّ اَحَدَكُمْ يَرَى رَبَّهُ

حَتَّى لَا يَمُوتَ

موضوع رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب من گھڑت واقعات

اس طرح کی کئی فعلی موضوع احادیث ہم ”شیعیت سے لگاؤ“ کے عنوان کے تحت درج کر آئے ہیں

۱۔ فائدہ انوار میں مذکور شبِ معراج میں رسول اللہ ﷺ کو خرقہ عطا ہونے کا۔ پھر آپ کا چاروں اصحاب

کو بلا کر سوال کرنے اور بالآخر یہ خرقہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عطا کرنے کا واقعہ۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یزید کو کندے پر اٹھا کر گزرنے کا واقعہ اور یہ فرمان کہ ”دوزخی، بہشتی کے کندے پر سوار ہے۔“ یہ واقعہ بھی فوائد الفوائد میں مذکور ہے۔

۳۔ آپ کا حضرت اہم سلمہ رضی اللہ عنہ کو کر بلا کی سُرُخ مٹی لا کر دینا اور فرمانا کہ اس کو شیشی میں بٹھال رکھو۔ میں گھڑت قصہ غزنیۃ الاصغیر میں مذکور ہے۔ علاوہ ازیں چند اور اسی طرح کے موضوعات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

۴۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور درختوں کی شہادت

کہ ایک روز حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے

ہذا مُحَمَّدٌ سَيِّدُ الْأَنْبِيَاءِ وَهَذَا عَلِيٌّ سَيِّدُ الْأَوْلِيَاءِ أَبُو الْأَمْنَةِ الظَّاهِرِينَ

اس کے بعد دوسرا درخت بولا :

هَذَا مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللهِ وَهَذَا عَلِيٌّ سَيِّدُ الْأَمْنَةِ

یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہیں اور یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی توار ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ دور نبوی میں درختوں کی شہادت کا دستور بہت عام تھا۔ پاس کوئی کافر ہو یا نہ ہو وہ شہاد

ضرور دے دیا کرتے تھے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں درخت بڑے ڈھیٹ اور بے شرم قسم کے

تھے۔ جنہوں نے شہادت کا پہلا جملہ تو ٹھیک ادا کیا، لیکن دوسرا جملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں غلط

کہہ گئے۔ وجہ یہ ہے کہ :

۱۔ اولیاء اللہ نے تو تین سو سال بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا سید تسلیم کیا۔ نقشبندیہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو

اپنا سید تسلیم کرتے ہیں۔ پھر اس وقت یہ شہادت کیسے درست ہو سکتی تھی۔

۲۔ اور آئمہ ظاہرین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا باپ یا اہم تسلیم ہی نہیں کرتے۔ بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی

اپنا اہم اور رہبر تسلیم کرتے ہیں۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سیف اللہ کہا تھا، لیکن یہ دوسرا درخت آپ

کے سامنے آپ کے قول کے خلاف شہادت دینے لگا، جو کچھ بھی ہوا، کم از کم درختوں نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے

اپنی محبت کا ثبوت تو ہمیا کر دیا۔

۵۔ سَوَاج کی واپسی | ایک موضوع واقعہ مشہور ہے کہ ایک دن حضرت علی ؓ کی نمازِ عصر قضا ہو گئی، تو حضور اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ سَوَاج کو واپس لوٹایا جائے چنانچہ سَوَاج مغرب سے چمکا اور حضرت علی ؓ نے نماز ادا فرمائی۔

اب صاحبِ خزینۃ الاصفیاء نے اس موضوع قصہ کے آگے ایک فقرہ مزید بڑھالیا کہ اس دن غروبِ آفتاب کے وقت ایک دہشت ناک آواز سنائی دی اور دوسرے اس سے ملتا جلتا حضرت علی ؓ سے منسوب ایک اور واقعہ بیان فرمایا، جو یہ ہے :

”ایک بار حضرت علی ؓ بابل کی طرف تشریف لے جا رہے تھے۔ آپ نے دریائے فرات عبور کرتے وقت دیکھا کہ نمازِ عصر قضا ہو رہی ہے، تو آپ نے اور آپ کے چند دوستوں نے تو نماز ادا کر لی، لیکن کچھ دوسرے احباب نماز ادا نہ کر سکے اور سَوَاج غروب ہو گیا۔ یہ لوگ حیران ہو کر آپ کے پاس آئے۔ آپ نے دُعا کی تو اللہ تعالیٰ نے سَوَاج کو حکم دیا پھر طلوع ہو جائے۔ اس وقت سَوَاج سے ایک ہولناک آواز سنائی دی۔ یہ تمام تسبیح و تہلیل کی آوازیں تھیں۔“ (خزینۃ الاصفیاء، ص ۶۵)

اب دیکھئے ! ان حضرات سے عجوبہ پرستی اور کرامت بیانی کا شوق کیا کچھ کر دیتا ہے۔ یہ جی سی بات ہے کہ ایسی مجبوری کی صورت میں انسان نماز قضا ادا کر سکتا ہے۔ پھر اس کے لئے حیران و پریشان ہونا اور سَوَاج کی واپسی کی دعائیں۔ پھر سَوَاج کی واپسی۔ اور اس کے ہولناک آوازوں کے منظر پیش کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے !

حضرت علی ؓ کی اس کرامت کے بعد
حاجی محمد قادری نوشاہی کا سَوَاج اور چاند کو ٹھہرانا
 راستہ اور بھی صاف ہو گیا اور ایسے ایسے

اولیاء اللہ پیدا ہونے لگے جو سَوَاج کے علاوہ چاند کو بھی حکم ایک جگہ ٹھہرا سکتے تھے۔ چنانچہ صاحبِ خزینۃ الاصفیاء حاجی محمد قادری نوشاہی کے فضائل و مناقب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”آپ کا ایک مرید جیون جھام موضع باہوک کے (جو نوشہرہ سے دو میل کے فاصلہ پر ہے) میں رہتا تھا۔ ایک دن اس نے عرض کی کہ میری کھیتی پر شریف لائیں، تو میرے لئے باعثِ عزت و برکت ہو گا۔ آپ التماس منظور فرما

لے لا علی قادری مصنف موضوعات کبیر لکھتے ہیں کہ ”دوافض نے حضرت علی ؓ کے فضائل میں تین لاکھ روایات وضع کی تھیں۔“ (اسلامی

کر چل پڑے۔ نوشہرہ پہنچنے پر نماز عصر کا وقت ہو گیا۔ خدام نے چاہا پہلے نماز ادا کریں، پھر چلیں گے۔ یارانِ طریقت یوں کر خاموش ہو گئے مگر سب کے دل میں یہ غمزدہ تھا کہ وہاں پہنچنے تک نماز قضا ہو جائے گی۔ مگر جب آپ (یعنی باہو کے) پہنچے، تو سوج ابھی تک اسی جگہ قائم تھا۔ دیر تک وہاں آرام کیا اور نماز ادا کرنے کا خیال تک نہ تھا۔ سوج بھی اپنی جگہ سے آگے نہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد جون جہاں کی زمین پر جا کر نماز پڑھی۔ نماز ادا کرنے کے بعد حاضرین مجلس سے فرمایا: ”دوستو! خدا تعالیٰ کے بسے اب بھی ایسے موجود ہیں کہ اگر وہ چاند اور سوج کو یہ حکم دیں کہ ٹھہر جائیں، تو وہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کریں گے۔“ (غزیرۃ الاصغیر، ص ۲۰۰)

دیکھا آپ نے کہ ایک موضوع حدیث کو بنیاد قرار دے کر خارقِ عادت کا کتنا عظیم الشان قصہ تیر کر لیا گیا ہے پہلے سوج کی دلچسپی کا معجزہ تراشا گیا۔ پھر حضرت علیؓ کی کرامت۔ اب یہ بزرگ سوج کے علاوہ چاند کو بھی حکم ٹھہرانے والے پیدا ہو گئے۔ تاہم ان تینوں واقعات میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ حکم عصر کے وقت ہی دیا جاتا ہے۔ آگے کیچھے نہیں۔ شاید اس وقت سوج ان حضرات کا زیادہ فرمانبردار ہوتا ہے۔ اب اقتباسِ بالا کے پروگرام کے مطابق تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سوج تقریباً تین گھنٹے اپنی جگہ کھڑا رہا۔ پھر یہ سوج صرف باہو کے یا نوشہرہ پر تو نہیں چلتا، بلکہ پوری آدمی دُنیار چمک رہا تھا۔ کیا کسی اور جگہ سے بھی اس دن کے تین گھنٹے بڑا ہونے کی شہادت مہیا ہو سکتی ہے؟ نظامِ کائنات میں اتنی بڑی تبدیلی کا علم آخر حاجی محمد نوشا ہی اور اس کے مریدوں کو ہی کیوں ہوا

بی بی اسماء بنت عیسٰیؓ روایت کرتی ہیں کہ مجھے بی بی فاطمہؓ نے شب

۶۔ حضرت علیؓ اور زمین کی سرِ غرسانی

عربی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ مجھے اس وقت حضرت علیؓ سے بہت ڈر آیا، کیونکہ میں نے سنا کہ زمین آپ سے باتیں کر رہی ہے۔ صبح میں نے سنا کہ دو عالم سے بات کی توجہ ریز ہو گئے۔ پھر سراٹھا کر فرمایا: ”فاطمہ! تمہیں پاکیزگی نسبِ نسل کی بشارت ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے شوہر کو تمام خلافت سے فضیلت دی ہے اور زمین کو حکم دیا کہ اپنی خبریں اسے سنا دیا کرے اور مشرق و مغرب کے حالات اس پر واضح کرے۔“ (غزیرۃ الاصغیر، ص ۲۱۱)

معلوم ہوتا ہے کہ زمین اپنی اس ڈیوٹی سے غفلت شمار ہی رہی ہے۔ بلکہ تین مواقع پر تو اس کی یہ غفلت افوسناک ہے۔ ایک جب آپ نے جنگِ صفین کے موقع پر قرآن کو حکم تسلیم کیا، تو آدمی فوج آپ کے برخلاف ہو گئے۔ دوسرے جب آپ نے حضرت موسیٰؑ اشعریؓ کو حکم تسلیم کر کے بنابنا یا کھیل بگاڑ دیا اور تیسرے جب ایک خارجی عبد اللہ بن بلعم نے آپ کو صبح کی نماز کی حالت میں شہید کر دیا، تو زمین نے اس کے آنے کی مطلق اطلاع نہ دی اور

آپ ضرور اس کا کوئی مداوا سوچ لیتے۔

۷۔ حضرت ابراہیم بن محمد رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی اصل وجہ

سرکارِ دو عالم ﷺ حضرت حسین کو اپنی دائیں ران پر بٹھاتے تھے

اور بیٹے حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ کو بائیں ران پر۔ اسی حالت میں ایک روز حضرت جبریل علیہ السلام حاضر ہوئے، اور پیغامِ خداوندی سنایا (گویا یہ حدیثِ قدسی ہے) کہ تم دونوں کو آپ کے پاس جمع نہیں ہونے دیں گے۔ ایک کو اٹھالیا جائے گا۔ اب آپ کی مرضی ہے جسے چاہیں رکھیں۔ آپ دل میں بڑے فکر مند ہوئے اور سوچا کہ اگر حضرت حسین رحمۃ اللہ علیہ فوت ہو گئے، تو حضرت علی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت فاطمہ رحمۃ اللہ علیہا اور خود مجھے بڑا صدمہ ہوگا، لیکن اگر حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ فوت ہوئے، تو صرف مجھے صدمہ ہوگا، چنانچہ مجھے اپنا صدمہ گوارا ہے، لیکن یہ گوارا انہیں کہ حضرت علی رحمۃ اللہ علیہ و حضرت فاطمہ رحمۃ اللہ علیہا علیہما السلام کی مرگیں ہیں غرضیکہ اس واقعہ کے تین دن بعد حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ واصلِ جنت ہو گئے، غزیرۃ

(الاصفیاء، ص ۴۳)

روایت نگار یہ نہیں حضرت امام حسن رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر خیر کیوں بھول گئے۔ کہیں یا کبھی کبھی انہیں بھی بھلا دینے، تو اچھا تھا۔ آخر حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ بھی تو حضرت حسین رحمۃ اللہ علیہ سے صرف ۱۱ ماہ ہی بڑے تھے۔ ان سے ایسی بے امتنانی کیوں؟ پھر حضرت امام حسن رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر خیر سے فضائلِ اہل بیت، جو کہ روایت نگار کا اصل مقصد ہے۔ اور بھی زیادہ واضح ہو جاتے۔ یہی حضرت ابراہیم کی ماں کس صدمہ کی بات، تو یہ بات کرامتِ تراش بھول ہی گئے۔

”حضرت نظام الدین مجتوب الہی دہلوی، راحتِ القلوب“ میں لکھتے ہیں کہ ”ایک دفعہ حضرت عمر

۸۔ سوچ کا گناہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ

اپنے گھر میں آفتاب کی روشنی میں طرف رخ کئے اپنے کپڑوں کو مانکنے لگا ہے تھے، چونکہ وقت لگ گیا اس لئے سوچ کی گرمی نے آپ کو متاثر کیا۔ اپنے اپنی خلیق نگاہ آفتاب کی طرف اٹھائی، تو آفتاب سیاہ ہو گیا اور ساری دنیا پر سیاہی چھا گئی۔ اس حال سے سرکارِ دو عالم ﷺ بڑے متفکر ہوئے۔ اسی وقت حضرت جبریل علیہ السلام نازل ہوئے اور کہنے لگے: ”یا رسول اللہ! آج آفتاب نے آپ کے عمر کو خشمگین کر دیا تھا۔ لہذا نورِ آفتاب گہنا گیا ہے۔ ہاں اگر عمر سوچ کا گناہ معاف کر دیں تو آفتاب کی روشنی لوٹائی جاسکتی ہے۔ ورنہ قیامت تک آفتاب کو اسی طرح رو سیاہ رہنا پڑے گا۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو طلب کیا اور فرمایا کہ آفتاب کا گناہ معاف کیا جائے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے درگزر کیا اور آفتاب کا نور عالم تاب اسے لوٹایا گیا۔“ (غزیرۃ

(الاصفیاء، ص ۵۴)

خود فرمایا، آپ نے نظام الدین صاحب جیسے بزرگوں کی باتیں کسی بزرگ اور لاجواب ہوتی ہیں۔ سیدھی سی بات تھی کہ اگر حضرت عمر ؓ کو دھوپ لگ گئی تھی، تو سایہ میں آ بیٹھتے، لیکن اس طرح شاید نگاہ خستگی کی کرامت کا ظہور ممکن نہ رہتا۔ لہذا نہ تراشش کو حضرت عمر ؓ کی نگاہ خستگی یا توجہ کا قصہ تراشٹا پڑا۔ ہم تو یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ بچا سے آفتاب کا گناہ کیا تھا؟ وہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی ڈیوٹی پر مامور ہے اور آدم اور بنی آدم کی پیدائش سے بہت پہلے سے یہ فریضہ سرانجام دے رہا ہے۔ آخر اس نے حضرت عمر ؓ کی شان میں وہ کون سی انوکھی گستاخی کی تھی جس پر اس قدر برہمی ہوئی تھی کہ قیامت تک کے لئے اس سے نور بچیں کہ اللہ تعالیٰ کے امر پر پانی پھیر دینا چاہتے تھے۔ حضور اکرم ﷺ کے دور میں سوچ اس دن گہنایا تھا جب آپ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم ؑ کی وفات ہوئی۔ صحابہ نے یہ تاثر لیا کہ شاید اس سانحہ کی وجہ سے سوچ گھنایا ہے تو رسول اکرم ﷺ نے اس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ ان دونوں واقعات کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ سوچ کا گھننا تو اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ اس موقع پر آپ نے نماز کسوف اور فرائض اور اللہ کے حضور مغفرت کے لئے اپنے اور صحابہ نے گڑا گڑا دعائیں کی تھیں، مگر نظام الدین فرما رہے ہیں کہ سوچ گہنایا گیا، تو فوراً آپ پر حضرت جبریل ؑ اترے اور کہا کہ عمر سے کہو کہ جلد سوچ کا گناہ معاف کر دیا جائے۔ پھر آپ نے بھی حضرت عمر ؓ سے استعفا کی۔ انہوں نے سوچ کو معاف کیا اور اس کی جان بخشی ہوئی۔ پھر اسے دشمنی واپس لوٹائی گئی۔

۹۔ استمداد غیبی کا ثبوت

”حضور اکرم ﷺ اپنی زوجہ حضرت میمونہ ؓ کے ہاں اپنی باری کی رات میں تشریف فرما تھے۔ آپ نے وضو فرمایا اور وضو کے درمیان تین مرتبہ لبیک (حاضر ہوں، امداد کیا گیا، یعنی میں نے تیری مدد کی)، فرمایا۔ حضرت میمونہ ؓ نے پوچھا: ”آپ کس کے ساتھ ہم کلام ہیں؟“ فرمایا: ”راجز مجھ سے فرما دیکر تا ہے۔“ عمرو بن سلم راجز جب مکہ سے مدینہ روانہ ہوا، تو کفار مکہ اسے قتل کرنا چاہتے تھے، تو آپ نے نبی کریم ﷺ کو غائبانہ پکارنا شروع کیا اور آپ امداد طلب کی۔ پس رسول اللہ سے مدد مانگ کیونکہ آپ کی امداد ہر وقت تیار ہے اور اللہ کے بندوں کو پکارو وہ تیری مدد کو پہنچیں گے۔“

(ریاض السالکین ص ۲۲۶ بحوالہ ابنِ عسیر ص ۲۰۱)

اب دیکھئے کہ صاحب ریاض السالکین عرشی صاحب نے اس موضوع حدیث کا صرف ترجمہ نقل فرمایا ہے۔ یہ موضوع تو اس لئے ہے کہ قرآن کی لصوص صریحہ کے خلاف ہے پھر آپ نے اس کے ترجمہ کے آخر میں اپنی طرف سے جو اضافے فرمائے ہیں وہ لے اور بھی چار چاند لگا ہے ہیں۔

غرض اس ولایت کی دنیا میں ایسے واقعات بھی بے شمار ہیں۔ جن میں رسول اللہ ﷺ کی طرف نسبت کر کے آپ کے ذمہ جھوٹ لگایا گیا جس کے بارے میں آپ نے یوں فرمایا تھا کہ :-

من كذب على متعمداً فليتبوا مقعده
 جس نے مجھ پر دانستہ جھوٹ بانٹا، تو وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ

میں بنالے۔

(متفق علیہ)

من النار

گھر پو شہادت

اس قسم کی موضوعات اور ایسے بعض دوسرے اولیاء کی کرامات کے من گھڑت قصوں پر جناب پروفیسر حبیب اللہ صاحب تعارف نگار "تاریخ مشائخ چشت" یوں نظر آرا

ہیں کہ :

"لیکن اس کتاب "غزنیۃ الاصفیاء مصنف غلام سرور لاہوری کا بڑا نقص یہ تھا کہ مصنف نے عقائد کا سہارا لے کر ان تمام اصول اسناد کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا، جو علما کے اسلام کی نظر میں صدیوں تک علم و حکمت کی روح سمجھے جاتے رہے ہیں۔ تنقیدی اصولوں سے چٹم پوشی کر کے محض عقائد پر علم کی عمارت تعمیر کرنا سمجھی نہیں تو کیا ہے اس قسم کی تحریریں متضاد افکار کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہیں اور بالآخر ان کا نتیجہ برعینہ کی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ صاحب غزنیۃ الاصفیاء نے اپنی کتاب میں ہیبت ناک قسم کی کرامات کی تفصیل دی ہے جن کو پڑھ کر انسانی عقل و غرہ کو شرم آجاتی ہے۔" (تاریخ مشائخ چشت، زیر عنوان تعارف از پروفیسر حبیب اللہ، ص ۸)

اب دیکھئے پروفیسر حبیب اللہ صاحب کو غزنیۃ الاصفیاء میں صرف دو خامیاں نظر آئیں :-

۱ اس کی روایات بلا اسناد ہیں۔

۲ اس میں بیان کردہ کرامات ہیبت ناک قسم کی ہیں، جن کو پڑھ کر انسانی عقل و غرہ کو شرم آجاتی ہے۔

اور ہم یہ عرض کریں گے کہ ان کو تاہیوں کے ترکب بچا سے ایکلے صاحب غزنیۃ الاصفیاء ہی نہیں، بلکہ تمام تذکرہ نگاروں کا یہی حال ہے۔ اور ان کی روایات یوں شروع ہوتی ہیں، نقل ہے، منقول ہے، فرمایا فلاں نے فرمایا۔ اس قسم کی تھوڑی بہت تفصیل ہم پہلے باب میں لکھ چکے ہیں۔ کرامات کی ہیبت اور عقل و غرہ کو شرمانے والی تصویر پیش کرنے میں بھی سب تذکرہ نگار غلام سرور مفتی صاحب کے ہی ساتھی نظر آتے ہیں۔ علاوہ انہیں ان تذکروں میں تاریخی لغزشیں، اور بے احتیاطیاں بھی کافی حد تک موجود ہیں۔

شریعت اور طریقت کا تضاد ۱۔ توحید

پچھلے ابواب میں ہم یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ جو توحید ہمیں اسلام سکھاتا ہے۔ اہل طریقت اسے تفسر کا نام دیتے ہیں اور جن بزرگوں نے کچھ قرآن و سنت کا پاس رکھا انہوں نے بھی اتنا ضرور کہہ دیا کہ لا الہ الا اللہ عوام کی توحید ہے۔ خواص کی نہیں اور جو خواص کی توحید (یعنی نظریہ وحدت الوجود) ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے وہ خالصاً شرک ہے۔ پھر جب توحید کی تعریف اور قدیم تبدیلی اور تضاد واقع ہو گیا، تو شرک کی تعریف خود بخود ہی بدل جائے گی۔ لہذا ان دونوں ادیان میں منافقت ناممکن ہے یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں ایسا دور بھی آیا کہ ہندو لوگ مسلمان فقیروں کے مرید بن گئے اور مسلمان ہندو جوگیوں کے گیان دھن حاصل کرنے میں کوئی عیب نہ سمجھتے تھے۔ کیر حالانکہ مسلمان تھا مگر اسی وجہ سے جگت کیر مشہور ہوا کہ دین اسلام کے بچا سے دین طریقت کا پیروکار تھا اور اس کے بیشتر مرید ہندو تھے۔ بابا فرید اور گورو نانک جیسے بزرگوں نے اہل صوفیاء کے نزدیک توحید کی تعریف یہ ہے:

اَلتَّوْحِيْدُ تَحْتُ التَّوْحِيْدِ فِي التَّوْحِيْدِ، یعنی توحید کو توحید میں ترک کر ڈالنا ہی توحید ہے۔

یہ عبدالقادر جیلانی فرمایا کرتے تھے کہ جب مومن تمام توحید تک پہنچ گیا، تو اس میں مومن ہا نہ توحید واحد، نہ ایک، نہ سبب، نہ خودی، نہ خدا، نہ بندہ، نہ بندگی، نہ سہی، نہ نفسی، نہ ذات، نہ صفات، نہ جبریل، نہ قرآن، نہ نبی، نہ ولی، نہ ولایت، نہ معرف، نہ صفت، نہ موصوف، نہ اسم، نہ مستی، نہ ناقل، نہ آخر، نہ ظاہر، نہ باطن، نہ بہشت، نہ دوزخ، نہ دشمنی، نہ مائیک، نہ نفی، نہ اثبات، نہ آسمان، نہ زمین، نہ عرش، نہ فرش، نہ مقام، نہ عظیم، نہ طالب، نہ مطلوب، نہ عشق، نہ حقوق، نہ آدم، نہ ایس، نہ کافر، نہ اسلام، نہ کافر، نہ مسلمان، نہ ایمان، نہ کفر، نہ حرام، نہ وجود، نہ دفع، نہ مقام، نہ استقامت، جب مومن اس مقام پہنچ گیا گویا وہ توحید میں آگیا، تو توحید فی التوحید کا مقام حاصل ہوا۔ * (دریاض السالکین، ص ۱۵۱)

غور فرمایا اپنے، ان اہل طریقت کی توحید کسی لا جواب چیز ہے۔ کیا یہ وہ توحید ہے، جو کتاب سنت میں مذکور ہے یا رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے صحابہ کرام کو سکھائی تھی۔ پہلے پہر کیا یہ وہ شاندار وعظمت تھا جیسے انسانوں کے علاوہ جن، رجال الغیب، ملائکہ جن کی رسول اللہ اور دوسرے پیغمبر سننے آیا کرتے تھے اور جس کی تاثیر سے کئی لوگ فرمانبردار کیا کرتے تھے اور بعض دوسرے ہیروش ہوجایا کرتے تھے۔

ہندوؤں کو مسلمان بنانے کے لئے ایسی ملی جلی تبلیغ چلائی جس کے نتیجے میں داراشکوہ (برادرِ حقیقی مانگیر) جیسے صوفی پیدا ہوئے اور جس سے اسلامی نظریات کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ اس قسم کی تبلیغ کے نتیجے میں بے علم صوفی گمراہ ہو گئے۔

گویا طریقت کا دین اپنے نظریات کی اتباع چاہتا ہے۔ اسے دینِ اسلام یا دوسرے ادیان سے کوئی سروکار نہیں۔ اسی لئے صوفیاء میں یہ مقولہ مشہور ہے کہ :

الصُّوفِي لَا مَذْهَبَ لَهُ صوفی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا

یہاں مذہب سے مراد الہامی مذہب ہے، جو کسی پیغمبر کے متبعین کا مذہب ہو۔ ورنہ طریقت بذاتِ خود مذہب اور ایک دین ہے۔ اب اگر کوئی شخص، خواہ ہندو ہو یا سکھ، عیسائی ہو یا یہودی، اگر اس مذہب میں شکل ہو گا تو اسے اپنے الہامی مذہب کے نظریات و عقائد کو ثانوی حیثیت دینا پڑے گی۔ کیونکہ اب اس کا اصل ایمان طریقت کے عقائد پر ہے۔ ایک دو مثالیں ملاحظہ فرمائیے :

معروف کرخی کی وفات پر جھگڑا جب اپنے وفات پائی تو یہود و نصاریٰ دعوائے کرنے لگے کہ شیخ ہمارے مذہب پر تھے۔ مسلمانوں نے زید کی۔ نزاع

بڑھی۔ خدام کہنے لگے کہ ہمارے شیخ کی وصیت تو یہ ہے کہ ”جو ہمارا جنازہ زمین سے اٹھائے گا، ہم اسی سے ہیں۔“ اس پر یہود و نصاریٰ نے باری باری اٹھانے کی کوشش کی، مگر اٹھانے سکے۔ پھر مسلمان آئے، انہوں نے جنازہ اٹھایا تو اٹھ گیا۔ پھر بس جگہ شیخ نے وفات پائی وہیں انہیں دفن کیا۔ شیخ معروف تجرید و تفرید اور بے سرو سامانی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔“ (عونۃ الاصفیاء ص ۲۹)

کچھ سمجھے آپ کہ یہ تفرید و تجرید کیا ہے؟ یہود و نصاریٰ کے راہبوں اور مسلمان صوفیوں میں یہی وہ قدر مشترک ہے جس کی بنا پر معروف کرخی کی میت متنازعہ بن گئی تھی اس تجرید و تفرید کو آسان الفاظ میں توحید و وجودی کا بند درجہ سمجھ لیجئے۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا کہ یہ جھگڑا بھی ایک ”کرامت“ ہی کے ذریعہ ختم ہوا اور یہی کچھ ایسے لوگوں کا مطلوب ہوتا ہے۔

زبدۃ العارفین قدوة السالکین حافظ غلام قادر کی شخصیت آپ اپنے زمانے کے قطبِ قطاب اور غوثِ الاغواث اور محبوبِ خدا

تھے۔ جن کا فیضِ روحانی ہر خاص و عام کے لئے اب تک جاری ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندو، سکھ، عیسائی، ہر قوم

اور فرقہ کے لوگ آپ فیضِ روحانی حاصل کرتے تھے۔ خاص طور پر کبیر سنگھ بار ایٹ لاء کا تمام خاندان آپ کے بے حد معتقد تھے۔ آپ کے عرس میں تمام فرقوں کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ آپ بے شمار کشف و کرامات سرزد ہوئی ہیں۔ آپ کے تمام مریدان باصفا فیضِ روحانی سے مالا مال اور ”پابندِ شریعہ شریف“ ہیں۔ ”ریاض السبکین“ میں اب یہ مرید جس شریعہ شریف کے پابند ہوں گے۔ وہ آپ خود اندازہ لگایں گے۔

مشہور متصوف عبدالکَریم جلی دم ۸۲۰ھ کی تصنیف ”الانسان الکامل“ کے مترجم فضل میرا صاحب جب اس کتاب کا ترجمہ لکھنے بیٹھے، تو اس حقیقت کا آغاز مقدمہ میں ہی بڑا الفاظ میں یوں اعتراف فرماتے ہیں، حالانکہ وہ خود بھی اسی طبقہ صوفیاء سے تعلق رکھتے ہیں :

”اکثر صوفیاء کرام کے حقائق و معارف مسئلہ وجود کے متعلق ہوتے ہیں اور اس مسئلہ نے خلق کثیر کو گمراہ کر رکھا ہے۔ صوفیاء کے اس قسم کے علوم سے اکثر اہل نفس و ہوا دلیر ہو کر شرعی قیود سے نکل گئے۔ شرعی علوم کو قسور (چھلکے) اور ان علوم کو لبِ باب یا مغز خیال کر کے وسطِ الحاد و زندہ میں جا پڑے ہیں۔ اول وہ شخص جس نے دلائل عقلیہ و براہین نقلیہ سے اس مسئلہ کے متعلق گفتگو کی ہے، وہ محی الدین ابن عربی ہیں، جنہوں نے علاوہ توفیق کے عقلی تصرف کو بھی اس میں دخل دیا ہے۔ مصنف ”انسان کامل“ کے علوم بھی اسی قبیل سے ہیں۔۔۔۔۔ علمائے ظاہر جب دیکھتے ہیں کہ ایسے علوم جن میں عابد و مسبوق کی ایک ہی حقیقت ہے، تکلیفِ شرعی کو بالکل ساقط کر دیتے ہیں اور جو آیات و احادیث بطورِ شواہد کے حقائق و وجودیہ کی تائید میں پیش کی جاتی ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسی ہوتی ہیں، جو خالی از تکلفات نہیں ہوتیں، تو اکثر علمائے کرام صوفیاء سے بد اعتقاد ہو جاتے ہیں۔“ (مقدمہ از زمزم، ص ۹)

پھر اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”لیکن ان (صوفیاء کے علوم) کے موطن، ماخذ اور سرچشمنے علومِ نبوت کے موطن اور سرچشمے سے جدا گانہ ہیں شرعی علوم بھی بطریق اعتبار و اشارہ ان کی تائید کرتے ہیں نہ کہ بطریق تفسیر و فحوائے کلام اور یہ شرعی علوم و کلماتِ نبوت کی ایک اعجازی خاصیت ہے۔ ورنہ شریعت کی راہ اور ہے اور ان صوفیوں کی راہ اور، جو مسائل وحدتِ الوجود بقا و فنا، لطائف کائنات فطرت کی تہذیب و ترتیب میں اپنی تصنیفات چھوڑ گئے ہیں۔“ (ایضاً، ص ۱۰)

دیکھا آپ نے مولوی فضل میرا صاحب نے کس قدر وسعتِ ظرفی سے ان حقائق کا اعتراف کر لیا ہے کہ علمائے شریعت کے کیا علومِ نبوت کے موطن اور سرچشمے الگ ہیں اور وہ موطن اور سرچشمے وحی الہی ہے اور صوفیاء کے موطن اور سرچشمے الگ ہیں اور یہ موطن اور سرچشمے ان کے اپنے مکشوفات اور مشاہدات ہیں۔ لہذا شریعت کی

راہ اور ہے اور طریقت کی راہ اور۔ اور ان دونوں میں اتحاد ناممکن ہے اور یہیں سے خدا کی ذات کے متعلق یعنی عقیدہ توحید سے متعلق اختلاف شروع ہو جاتا ہے۔

بعض صوفیوں نے اپنے اس دین طریقت کے دین اسلام سے الگ ہونے کا بڑا اعتراف کر لیا۔ وہ اپنے اس دین کی ترجمانی درج ذیل شعر سے کرتے ہیں :-

ملت عشق از ہر ملت جداست عاشقان از ہر ملت خداست

یعنی عشق کا مذہب تمام مذہبوں سے الگ ہے۔ عاشقوں کا ملت اور مذہب سب کچھ خدا ہی ہوتا ہے ان کا رسول سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔

۲۔ رسالت

توحید کے بعد رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ وہ تاقیامت رسول ہیں اور سب نبی نوع انسان کے لئے رسول ہیں۔ وہ آخری نبی ہیں ان کے بعد کوئی نہیں آئے گا اور ہر مسلمان پر ان کی اتباع لازم و واجب ہے۔ وہ خیر البشر اور افضل الانبیاء ہیں ان کی اطاعت اور محبت ایمان کا لازمی حصہ ہے۔

اس معاملہ میں بھی اہل طریقت بھٹک کر اور افراط و تفریط سے کام لے کر کئی راہوں پر چل سکے : ایک فریق جو ابن عربی کو شیخ اکبر تسلیم کرتا ہے، اس بات کا قائل ہے کہ نبوت سے ولایت افضل ہے اور خاتم الانبیاء سے خاتم الاولیاء افضل ہوتا ہے۔ اس فریق نے لائقہ دلیوں کو رسول اکرم ﷺ سے برتر قرار دے کر آپ کی شان میں اتہاد درجہ کی گستاخی کی اور آپ کی قدر و منزلت کو اپنے اصل مقام سے نیچے گرا دیا۔ اور شیخ اکبر خود خاتم الاولیاء کے مقام پر فائز ہوئے اور نبوت کو اکتسابی قرار دے کر اس قدر کے لئے نبوت کا دروازہ کھول دیا۔ چنانچہ مرزا غلام احمد قادیانی اور دوسرے قادیانی حضرات ان کے اقوال سے بکثرت استفادہ کرتے ہیں۔

اب دیکھئے ! عبد الکیم جلی صاحب کس انداز میں مقام رسالت بیان فرماتے ہیں :
 ”نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے لئے تصریح فرمائی، جبکہ اس نے ان کو خواب میں دیکھا اور کہا کہ اے رسول خدا ! مجھے معذور رکھئے، محبت الہی نے مجھے آپ کی محبت سے

باز رکھا ہے۔ پھر آپ نے اے فرمایا کہ اے مبارک! اللہ کی محبت ہی میری محبت ہے۔ پس جب محمد ﷺ وہاں اللہ کے خلیفہ تھے، تو اللہ یہاں محمد ﷺ کا نائب تھا۔ اور نائب خلیفہ کو کہتے ہیں اور خلیفہ نائب کو۔ پس وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) یہ (یعنی محمد ﷺ) ہیں۔ اور یہ (محمد ﷺ) وہ (اللہ تعالیٰ) ہیں۔ یہیں سے ہے کہ محمد ﷺ کمال میں متفرد ہوئے۔“ (انسان کامل، ص ۲۴۷)

اس اقتباس میں جلی صاحب نے :

۱۔ اپنے دل سے گھڑی ہوئی بات کو حدیث بنا کر پیش کر دیا اور یہ وضع حدیث کا فتنہ اس طبقہ میں موڈنی طور پر پایا جاتا ہے۔

۲۔ پھر اس موضوع حدیث کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کی محبت کو جو ایمان کا جزو اعلیٰ ہے خارج از بحث قرار دے دیا، حالانکہ اللہ کی محبت کا دعوے تو تمام ادیان باطلہ بھی کرتے ہیں اور یہی دین طریقت کا نچوڑ ہے کہ وہ اللہ تک تو رسائی چاہتے ہیں مگر انہیں رسول کی ضرورت نہیں ہوتی۔

۳۔ اس موضوع حدیث کے ذریعہ عقیدہ حلول کو بھی ثابت کر دکھایا۔

پھر ایک دوسرے مقام پر جلی صاحب صوفیانہ اصطلاح قطب اور رسول کا تعلق بیان فرما کر رسالت کا اجر اثابت کرتے ہیں اور بعد میں آنے والے رسولوں کی نشاندہی بھی فرما رہے ہیں جیسا کہ درج ذیل اقتباس سے واضح ہے :

”انسان کامل وہ قطب ہے جس پر اول سے آخر تک وجود کے فلک گردش کرتے ہیں اور وہ جب سے وجود کی ابتدا ہوئی اس وقت سے لے کر ابد الابد تک ایک ہی شے

نئے رسول

ہے۔ پھر اس کے لئے رنگارنگ لباس ہیں اور کیمسوں اور گرجوں میں ظاہر ہوتا ہے اس کا اصلی نام محمد ﷺ ہے، کینت الواقام، وصف عبد اللہ اور لقب شمس الدین ہے۔ پھر ہر زمانہ میں زمانہ کے لباس کے مطابق اس کا ایک نام ہے۔ پس میں (یعنی مصنف عبد الکیم جلی) محمد ﷺ کے ساتھ اپنے شیخ شرف الدین سلیمان الجیرقی کی صورت میں جمع ہوا اور میں نہیں جانتا کہ وہ نبی ﷺ ہیں۔ میں یہی جانتا تھا کہ وہ میرے شیخ ہیں۔ جن کو میں نے زبیدیہ میں مشاہدہ کیا ہے اور اس امر کا بحیدہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ ہر صورت میں متصور ہو سکتے ہیں۔ البتہ صورت کے لحاظ سے نام بدل دیا جاتا ہے۔ اور دراصل وہ نام بجز حقیقت محمدیہ کے کسی اور شے پر واقع نہیں ہوتا۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ جب آپ ﷺ کی صورت میں ظاہر ہوئے تو

لے اسی نظریہ کو داراشکوہ کے استاد غلام بخشی نے یوں ادا کیا ۔

شبلی نے اپنے تلمیذ سے کہا کہ میں اس امر کی شہادت دیتا ہوں کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ تلمیذ صاحب کشف تھا۔ اس نے نور کشف سے پہچان لیا اور کہا کہ میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ تو اللہ کا رسول ہے اور یہ ایک ایسی بات ہے جس کا انکار نہیں کیا جاتا۔“ (انسان کامل، ص ۲۲۵)

دوسرا فریق وہ ہے جس نے آپ کی شان کو اتنا بلند کیا کہ خدا کے ساتھ ملا دیا۔ آپ کو ہر جگہ حاضر ناظر اور عالم الغیب مسمیٰ قرار دیا۔ آپ کے جسم میں اللہ تعالیٰ کو اتنا اور اس طرح آپ کو خدا ہی تسلیم کر لیا۔ یہ بھی دراصل دین طریقت کے نظریات کی مجبوری ہے کہ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی امت ہونے کی وجہ سے جب تک آپ کو اس مقام پر فائز نہ کر لیں، ان کی اپنی راہ صاف نہیں ہوتی۔

رسول اکرم ﷺ کا نور | ایک تیسرا فریق اس سے بھی آگے بڑھا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ جملہ کائنات سے پہلے حضور ﷺ کا نور پیدا کیا گیا۔ پھر اس نور سے باقی تمام کائنات وجود میں آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں کہ:

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (۲۱۰)

اور ہم نے پانی سے ہر چیز کو پیدا کیا۔

لیکن یہ حضرات آپ کے نور سے ہر چیز کے پیدا ہونے کا دعوے کرتے ہیں۔

پہلے دو فرقوں کے نظریات پر ہم مناسب مقامات پر بحث کر آئے ہیں۔ اب اس تیسرے فرقے کے دعوے کا بھی جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ اس کے دعوے کی بنیاد درج ذیل موضوع حدیث ہے۔

أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللَّهُ نُورِي

اللہ نے جو چیز سب سے پہلے پیدا کی وہ میرا نور تھا۔

یہ حدیث موضوع ہونے کے باوجود صونبار میں بہت مقبول ہے اور یہ تو ہم بتلا چکے ہیں کہ ان کے ہاں حدیث کی صحت کا معیار ان کے اپنے مشاہدات، مکاشفات اور نظریات ہوتے ہیں اگرچہ وہ روایت یا درایت کے لحاظ سے کتنی ہی ضعیف ہو۔

اب دیکھئے، اس حدیث کے موضوع ہونے کے دلائل یہ ہیں:

- ۱۔ صحاح ستہ میں اس حدیث کا سراغ تک نہیں ملتا۔
- ۲۔ اس حدیث کا اخذ ”مصنف عبدالرزاق“ ہے، جو تیسرے درجہ کی کتاب ہے اور اس میں ضعیف و متروک تو درکنار موضوعات تک شامل ہیں۔
- ۳۔ اس حدیث کے راوی حضرت جابر رضی اللہ عنہ بتلاتے گئے ہیں، لیکن اسناد کو رد نہیں۔ لہذا ویسے بھی

مردود ہے۔ پھر مصنف عبدالرزاق کی حدیث اور اس حدیث کے الفاظ بھی نہیں ملتے، صرف مفہوم ملتا جلتا، اور وہ الفاظ یوں ہیں، اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُورَ سَبْتِیْلَہٗ یَا جَابِر۔

۴۔ اس کے بجائے ترمذی باب القدر میں ایک صحیح حدیث بھی موجود ہے جو یوں ہے:-
اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْفَلَکُ اللّٰہ نے سب سے پہلے فکرم پیدا کیا۔

لیکن یہ حضرات فکرم کو بھی آپ کے نور سے پیدا کر کے صحیح حدیث کو ذکر کرتے ہیں اور اس موضوع حدیث کو اپناتے ہیں۔
اب سوال یہ ہے کہ صوفیاء میں یہ حدیث کیوں اس قدر مقبول ہے؟ تو اس کا پس منظر یہ ہے کہ اسلامی تصوف پر یونانی فلسفہ کی گہری چھاپ ہے، جو مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ جو کچھ انسان کے بدن میں موجود ہے، وہی کچھ کائنات میں ہے۔ گویا انسان عالمِ اصغر ہے اور کائنات عالمِ اکبر۔ بالفاظ دیگر کائنات "انسان اکبر" اور انسان "کائنات اصغر" انسان کے افعال و اعمال اس کے ارادہ کے تابع ہوتے ہیں۔ ادھر انسان کے کسی کام کا ارادہ کیا۔ ادھر اعضا و جوارح نے خود بخود حرکت شروع کر دی اور اس کا منبغ انسان کا دماغ یا اس کی عقل ہے۔ گویا اعمال و افعال کے ظہور اور صدور سے پیشتر عقل کا ہونا ضروری ہے۔ پھر چونکہ انسان عالمِ اصغر ہے اس لئے اس کی عقل بھی عقلِ جزر ہوئی۔ اب عالمِ اکبر یا کائنات کا نظم چلانے کے لئے جس کے تحت کائنات میں ہر وقت حوادث کا ظہور و صدور ہو رہا ہے، ایسی عقل کا پہلے سے موجود ہونا ضروری ہے، جو کل کائنات پر محیط اور اس پر کنٹرول کر سکے، لہذا وہ عقل بھی عقلِ کل ہوئی۔ اسی عقلِ کل کو عقلِ اول کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اسی عقلِ اول یا عقلِ کل کو مذہب کی زبان میں خدا کہا جاتا ہے۔

نور محمد ﷺ اور عقولِ عشرہ

اب اس فلسفہ کا اگلا مرحلہ یہ ہے کہ عقلِ اول صرف ایک نئی چیز کو وجود میں لا سکتی ہے اور وہ عقلِ دوم کہلائے گی۔ پھر یہ دونوں عقول

مل کر تیسری چیز پیدا کریں گی، جو عقلِ سوم کہلائے گی۔ اسی طرح یہ سلسلہ دس عقول یا عقولِ عشرہ تک چلتا ہے ان عقولِ عشرہ کے بعد عالم کائنات وجود میں آئی یا لائی گئی۔ انہیں یہاں شدہ مختلف عقول کو مذہب کی زبان میں خدا عرش کرسی اور افلاک وغیرہ وغیرہ کہا جاتا ہے۔

اب صوفیاء کا عقیدہ یہ ہے کہ عقلِ اول یا خدا نے جو عقلِ دوم پیدا کی تھی، وہ حضو اکرم ﷺ کا نور تھا، اب سوال یہ ہے کہ وہ دوسری چیز حضو اکرم ﷺ کا نور کیوں تھا؟ تو اس نکتہ کی باریکیاں تو متکلمین سمجھیں یا فلاسفہ بہر حال صوفیاء کے ہاں یہ سلسلہ مسلم ہو گیا کہ وہ دوسری چیز حضو اکرم ﷺ کا نور تھی۔ اب اس نور کے متعلق اور اس کی

ہمبیری کے متعلق صوفیاء کے ارشادات ان کی اپنی زبان میں سینے :

”ظاہر ہے کہ دنیا کی اشیاء کا ہدایت پر قائم رہنا الہام الہی کے سوا ممکن نہیں اور الہام الہی بحر وسیدہ نبی حامل نہیں پس سب کائنات کا پیغمبر کے زیر سایہ رہنا ضروری ہوا۔“ (سرچشہ حیات، ص ۵۰)

”دربار خاص سلطان باہو کی تصانیف نور الہدی وغیرہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہی فضاؤں میں کسی جگہ سرور عالم ﷺ کا دربار خاص ہر روز انعقاد پذیر ہوتا ہے۔ جہاں روحانی ہستیوں کی وساطت سے ہاریابی حاصل کی جاسکتی ہے۔“ (سرچشہ حیات، ص ۴۳)

”سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے جو چیز پیدا کی ہے وہ آنحضرت ﷺ کا نور ہے۔ پھر اس سے ایک جوہر پیدا کر کے اسے بنظر قبولیت دیکھا وہ پانی ہو گیا اور اس پر جھاگ آگئی جھاگ سے خدائے رُوحیں پیدا کیں۔ سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی رُوح، پھر انبیاء، پھر مومنین کی ارواح پیدا کیں۔ اسی طرح اس سے اجسام پیدا کئے۔ اسی وقت ارواح کا اجسام سے تعلق پیدا ہو گیا۔ پہلے عالم ارواح ہے، پھر عالم اجسام۔ ارواح کے مدارج مختلف ہیں۔ سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کی رُوح۔ پھر اولو العزم زل کی ارواح، پھر انبیاء، پھر صدیق، پھر اولیو، پھر عارف، پھر زاہد، پھر عابد اور سب گنیمات المسلمین کی ارواح ہیں۔“

”اہل معرفت کہتے ہیں کہ کافروں کی رُوحیں ایمان کے مقام تک نہیں پہنچتیں۔ حیوانات و نباتات کی رُوحیں عالم سفل سے ہیں۔ عالم علوی کی طرف چڑھ نہیں سکتیں۔ عالم علوی کی رُوحیں اپنے مقام سے عالم سفل کی طرف اترتی او جسموں میں قرار پکڑتی ہیں اور جب تک قالب میں رہتی ہیں کمال حاصل کرتی رہتی ہیں۔“ اس کے بعد ہندوؤں کے سندناس کا بیان شروع ہو جاتا ہے۔ (مرشد کامل، ص ۲۸)

اب اس عقلِ اول کے متعلق دیگر صوفیاء اسرار و رموز عبد الکرم جلی کی زبان سے سینے :

عقلِ اول کی مختلف توجہات

”پھر جان کہ عقلِ اول کا علم اور قلمِ اعلیٰ ایک ہی نور ہیں کہ جب بندہ کی طرف اس کی نسبت کرے گا، تو اس کا نام عقلِ اول ہوتا ہے اور جب حق کی طرف اس کی نسبت کریں، تو اس کا نام قلمِ اعلیٰ ہوتا ہے۔ پھر عقلِ اول جو محمد ﷺ کی طرف منسوب ہے۔ اولاً اس سے اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو پیدا کیا ہے پس آنحضرت ﷺ اس جہت سے جبریل علیہ السلام کے باپ اور جمیع عالم کے اصل ہیں۔ عقلِ اول کا نام رُوح ابن اس جہت سے رکھا گیا ہے کہ وہ علم الہی کا خزانہ اور امین ہے اور حضرت جبریل علیہ السلام کا یہ نام اصل کے نام پر فرع کا نام رکھا ہے۔ اس لئے کہ وہ عقلِ اول کی فرع ہیں۔ فافہم۔“ (انسان کامل، ص ۲۸۸)

اس گورکھ دھندے کو بار بار پڑھتے اور بتلاتے ہیں کہ عقلِ اولِ قلمِ اعلیٰ ہے یا آنحضرت ﷺ یا حضرت جبریل علیہ السلام (روح الامین)؛ نیز یہ بھی کہ حضور اکرم ﷺ حضرت جبریل علیہ السلام کے باپ کیسے ہوئے اور یہ بھی کیا ابتداء کائنات سے متعلق اسلام کی سادہ اور فطری تعلیم کا صوفیاء کے اس فلسفیانہ گورکھ دھندے سے کچھ تعلق ہے؟

پھر اس کے بعد جلی صاحب فرشتوں کی پیدائش کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں کہ :

’جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے فکرِ محمدی کو اپنے اسمِ ہادی، رشید کے نور سے پیدا کیا اور اس پر اپنے اسمِ مبدی و معید سے تجلی فرمائی۔ پھر اس کی طرف اپنے اسمِ باعثِ شہید کی آنکھ سے دیکھا، جب فکر (محمدی) نے ان اسماءِ حسنیٰ کے اسرار جمع کر لیے اور ان صفاتِ علیا کے لباس میں عالم میں ظاہر ہوئی، تو اللہ تعالیٰ نے فکرِ محمدی سے تمام آسمانوں اور زمینوں کے فرشتوں کی رُو میں پیدا کیں۔‘ (انسان کامل، ص ۲۸۵)

۳۔ قرآن

قرآن کریم وہ ہدایت کی کتاب ہے، جو وحی کے ذریعے رسول اکرم ﷺ پر نازل ہوئی، وہ ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اس پر ایمان لانا اور اس کے جملہ احکام کی پیروی کرنا، سب مسلمانوں پر لازم و واجب ہے۔

اس سلسلہ میں بھی اہلِ طریقت افراط و تفریط کا شکار ہوئے ہیں۔ ایک فریق تو ابنِ عربی کا ہے۔ یہ صوفیاء کے شیخِ اکبر قرآن کا جواب لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ جب یہ وحدتِ الوجود کی عینک لگاتے ہیں، تو انہیں تمام مشرک لوگ موصوف نظر آنے لگتے ہیں۔ پھر ان ہی کے خوشنشین تلمیذانی صاحبِ فرشتے ہیں کہ ”قرآن میں توحید ہے کہاں۔ وہ تو مشرک ہے پڑ ہے۔ ایسے قرآن و حدیث کو دروازے باہر پھینک دو۔ وغیرہ وغیرہ، جن کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں۔

دراصل یہ لوگ جب اپنے مشاہدات و نظریات کی سان پر قرآن کو چڑھانے ہیں اور یہ ان کے معیار پر پورا نہیں اترتا، تو انہیں کتابِ اللہ میں بھی شک پیدا ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض مسلم بزرگِ مہتممیں سے بھی ایسے الفاظ نکل گئے مثلاً

اللہ تعالیٰ نے ان سب فرشتوں سے اشرف المخلوقات حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کروایا تھا۔ اس کی خبر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم

فرشتوں کا سجدہ اور مجدہ الف ثانی

میں دو مقامات پر ان الفاظ سے دی ہے۔

فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ پھر سب کے سب فرشتوں نے اکٹھے ہو کر سجدہ کیا۔

(ص ۳۸، آیت ۴۳، الحجر ۱۵، آیت ۳۰)

اب حضرت محمد الف ثانی نے فانی اللہ ہونے کی حیثیت سے ذات الہی سے متصل ہو کر انسانیت کی ابتداء سے متعلق جو چشم خود نظارہ فرمایا، وہ یوں ہے :

”اس فقیر کو بھی اللہ کے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صدقے بعض اوقات یہ حالت پیش آتی ہے اور میں نے ملائکہ کو عین سجدہ کی حالت میں پایا ہے، جو وہ حضرت آدم ﷺ کو کر رہے تھے کہ اب تک انہوں نے سجدہ سے سر بھی نہیں اٹھایا تھا اور ملائکہ علیہم کو جنہیں سجدہ کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ ان سجدہ کرنے والے فرشتوں سے الگ دیکھا کہ وہ اپنے مشہود میں (جس کا وہ مشاہدہ کر رہے تھے) فا اور غرق ہیں۔“ (ترجمہ مبارک و معاد مصنفہ

شیخ احمد سرہندی۔ مترجم زقار حسین صاحب، ص ۱۸۸)

آپ کے مکاشفہ یا مشاہدہ سے دو باتیں معلوم ہوئیں :

۱۔ ایک تو یہ کہ قرآن کریم کی دو آیتوں کی تصحیح ہو گئی۔ یہ غلطی کس مقام پر واقع ہوئی۔ حضرت جبریل

سے یا حضور اکرم ﷺ سے ؟ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ ملائکہ میں بھی دینِ طریقت رائج ہے اور کچھ اونچے درجہ کے فرشتے اللہ کی ذات میں

فا اور غرق رہتے ہیں۔ وہ اس کے احکام کے پابند نہیں ہیں۔

مجدد الف ثانی سے بیشتر عبد الکریم جلی نے بھی فرشتوں کے متعلق اپنا ذاتی مشاہدہ اسی طرح اور زیادہ تفصیل سے پیش کیا تھا، بلکہ اس نے تو بعض مقررین کے نام بھی بتلا دیئے۔ چنانچہ لکھتا ہے کہ :

پھر میں نے (یعنی عبد الکریم جلی نے ساتویں آسمان پر) ان سو فرشتوں میں سے سات کو دیکھا کہ وہ ان سب سے آگے ہیں اور ان کا نام قائمۃ الحکوم و سبعین ہے اور ان سات میں سے تین کو دیکھا، جو ان سات پر مقدم تھے اور ان کا نام اہل المراتب والیکین تھا اور ایک کو میں نے سب پر مقدم پایا، جس کا نام عبس تھا اور یہ تمام وہ عالین فرشتے ہیں، جو سجدہ آدم کے لئے مامور تھے اور ان کے اوپر بھی فرشتے ہیں مثلاً نون فرشتہ اور قلم فرشتہ اور ان کی مانند اور بھی کہ وہ بھی عالین میں داخل ہیں اور باقی ملائکہ مقررین ان سے ادنیٰ اور ان سے نیچے ہیں۔ مثلاً جبرائیل، میکائیل، اسرافیل، عزرائیل اور ان کی مانند اور فرشتے۔“

دیکھ لیا آپ نے ان لوگوں کے مشاہدات و مکاشفات کس قدر وحی الہی سے متصادم ہوتے ہیں۔

قرآن کا ثواب

پھر ایک دوسرے گروہ کو قرآن کے احکامات اور تعلیمات سے کچھ سروکار نہیں۔ وہ اس قرآن کے تمویذ اور عملیات بنانے اور محض اس کی تلاوت میں اتنا ثواب حاصل کرنے یا فوت شدہ لوگوں کو بھیجنے میں مصروف ہے جس کا آپ وہم و گمان بھی نہیں کر سکتے۔ دیکھئے ایک بزرگ حضرت بشیر حافی قرآن کی برکات اور اس کا ثواب کس انداز میں پیش کر رہے ہیں :

آپ نے فرمایا : ”ایک بار میں نے قبرستان میں مردوں کو دیکھا کہ آپس میں کچھ بانٹ رہے ہیں، میں نے دعا کی : ”الہی ! ان کے حال سے آگاہ فرمائیے۔“ حکم ہوا ”ان ہی سے پوچھو۔“ میں نے پوچھا : ”کیا بانٹ رہے ہو؟“ انہوں نے کہا : ”آٹھ روز ہوئے کہ ایک اللہ کا بندہ اس طرف سے گزرا۔ اس نے تین بار غلّ شریف کا ثواب پٹہ کریم کو بخشا، اسی کو اب تک بانٹ رہے ہیں اور ابھی ختم نہیں ہوا۔“ (مقرآن حق، ص ۸۱)

دیکھئے ! اس کرامت کی اختراع سے کتنے تنازعہ مسائل حل ہو گئے۔ ایک تو یہ کہ رُوحیں اس جہاں میں قبرستانوں میں واپس آتی ہیں، دوسرے سماع موتی کا مسئلہ حل ہوا، تیسرے صوفیاء کے کشف اور ان رُوحوں کے جواب دینے کا اور چوتھے قبروں میں بیٹھ کر قرآن پڑھنے کی بدعت کا۔ آخر کیوں نہ ہو، ثواب بھی تو اتنا زیادہ تھا۔

۴۔ اتباع سنت

کہنے کو تو صوفیاء اتباع سنت کی تلقین کرنے ہی رہتے ہیں مگر جو حضرات نبوت سے ولایت کو افضل اور قرآن و حدیث کے علم سے کشفی علم کو زیادہ متبرک سمجھتے ہوں وہ بھلا کہاں تک سنت کی اتباع کر سکتے ہیں۔ ایسے بہت سے احکامات کی ہم نشان دہی کر چکے ہیں۔ جہاں یہ لوگ رسول کے حکم کی پرواہ تک نہیں کرتے مثلاً مزارات کے وجود سے حضور اکرم ﷺ نے بہت سختی سے منع فرمایا۔ اب کتنے بزرگ ہیں جنکے اپنے منبر سے نہیں بنتے یا وہ متھروں پر جا کر مراقبہ نہیں کرتے۔ ایسے مسائل تو بے شمار ہیں مگر ہم یہاں صرف فعلی عبادات نماز، وزہ اور شب بیداری کا ذکر کریں گے۔ اس کے بعد نکاح کے متعلق تبصرہ کریں گے۔ فعلی عبادات کے متعلق رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی درج ذیل ہیں :

عَبْدُ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ	عبد اللہ بن عمرو بن ماس (رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ میرے والد
أَنَّكَ عِنِّي أَبِي امْرَأَةً ذَاتَ حَسَبٍ	(عمرو بن ماس) ایک حبشیہ (قریشی) کی عورت سے
فَكَانَ يَتَعَاهَدُ كَتَبَهُ فَيَسْأَلُهَا عَنْ بَعْثِنَا	میرا نکاح کر دیا اور ہمیشہ اس کی خبر گیری کرتے رہتے

اور اس کے خاندان (یعنی میرے متعلق پوچھتے رہتے۔ وہ

بہتی: ”اچھا آدمی ہے مگر جب اس کے نکاح میں آئی

ہوں، ان کو اس نے میسر بستر پر قدم رکھا اور میرے

کپڑے میں ہاتھ ڈالا۔ پھر جب ایسے ہی ایک مدت گزر

گئی، تو میرے والد نے رسول اللہ ﷺ سے اس

بات کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا: ”اے میرے پاس لو!“

چنانچہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو آپ نے پوچھا:

”روئے کیسے رکھتا ہے؟“ میں نے کہا: ”ہر روز روزہ

رکھتا ہوں۔“ پھر آپ نے پوچھا: ”قرآن کتنے دنوں میں ختم

کرتا ہے؟“ میں نے کہا: ”ہر رات میں ختم کرتا ہوں۔“

آپ نے فرمایا: ”ہر مہینہ میں تین روزے رکھ اور ایک ماہ

میں قرآن ختم کر۔“ میں نے کہا: ”میں اس سے زیادہ

طاقت رکھتا ہوں۔“ آپ نے فرمایا: ”اچھا تو پھر ہر ہفتہ

میں تین روزے رکھ۔“ میں نے کہا: ”میں اس سے

زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔“ آپ نے فرمایا: ”اچھا تو پھر

دو دن روزہ چھوڑ اور ایک دن روزہ رکھ۔“ میں نے عرض

کیا: ”مجھ میں اس سے زیادہ طاقت ہے۔“ آپ نے

فرمایا: ”اچھا تو روزوں میں سے سب سے بہتر روزہ یعنی حضرت

داؤد علیہ السلام کا روزہ اختیار کر لو۔ ایک دن روزہ رکھ

اور دس دن روزہ چھوڑ۔ اور قرآن کو سات راتوں میں

صرف ایک ہاڑم کیا کر۔“ (عبدلبن عمرو کہا کرتے تھے،

کاٹش: میں رسول اللہ ﷺ کی رخصت کو قبول کر لینا اب

میں بوڑھا احاد ضعیف ہو گیا ہوں۔ مجاہد کہتے ہیں کہ بڑھاپے

فَقُولُ: يَنْعَمُ الرَّجُلُ مِنْ رَجُلٍ لَمْ يَطْلَأْ

فِرَاشًا وَلَمْ يَقْتَسِبْ كِفَا مَدَّ آتِنَاهُ“

فَلَمَّا طَالَ ذَلِكَ عَلَيْهِ ذَكَرَ النَّبِيَّ

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ أَلْقِيْ رِيْبَهُ“

فَلَقِيْتُهُ بَعْدُ فَقَالَ: كَيْفَ تَصُومُ؟“

قَالَ كُلَّ يَوْمٍ“ قَالِ وَيَكْفُ تَخْتِمُ؟“ قَالَ

كُلَّ لَيْلَةٍ“ قَالَ صُمْ فِي كُلِّ

ثَهْرٍ ثَلَاثَةً وَأَقْرَأَ الْقُرْآنَ

فِي كُلِّ ثَهْرٍ“ قُلْتُ: أَطِيعُ

أَكْثَرَ مِنْ ذَلِكَ“ قَالَ: ”صُمْ

ثَلَاثَةً أَيَّامًا فِي الْجُمُعَةِ“ قُلْتُ:

أَطِيعُ أَكْثَرَ مِنْ ذَلِكَ“ قَالَ:

”أَفْطِرْ يَوْمَيْنِ وَصُمْ يَوْمًا“

قُلْتُ: أَطِيعُ أَكْثَرَ مِنْ ذَلِكَ“

قَالَ: ”صُمْ، أَفْضَلُ الصَّوْمِ

صَوْمَ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ صِيَامَ

يَوْمٍ وَافْطَرَ يَوْمٍ وَأَقْرَأَ

فِي كُلِّ سَبْعٍ لَيْلًا مَرَّةً“

فَلَمَسْنِي قِيلْتُ رُخْصَةً رَسُولِ

اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَذَلِكَ

إِنِّي كُنْتُ وَصَّيْتُ فَكَانَ

يَقْدَرُ عَلَى بَعْضِ أَهْلِهِ

السَّبْعَ مِنَ الْقُرْآنِ بِالنَّهَارِ

میں حبشہ بن عمرو یوں کرنے کہ قرآن کا ساتواں حصہ یعنی ایک منزل دن میں کسی کو سنا دیتے یعنی جو رات کو پڑھنا ہوتا وہ دن کو سنا رکھتے تاکہ رات کو اس کا پڑھنا آسان ہو جائے۔ اور قوت حاصل کرنے کے لئے یوں کرتے کہ چند روز تک برابر افطار کرتے اور دن گنتے جاتے۔ پھر اتنے ہی دن برابر روزہ رکھتے، کیونکہ انہیں یہ بڑا معلوم ہوا کہ جو بات نبی ﷺ سے ٹھہرائی تھی اس میں کمی واقع ہو۔

اہم بخاری و صحاح کہتے ہیں کہ بعض راوی تین راتوں یا پانچ راتوں میں ختم کرنے کے مستحق بھی کہتے ہیں، مگر ان کی اکثریت سات راتوں میں ختم کرنے کی ہی روایت کرتی ہے۔
عبد اللہ بن عمرو بن عاص کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”قرآن بیسے میں ایک بار ختم کر۔“ میں نے کہا ”میں اس سے زیادہ طاقت اپنے آپ میں پاتا ہوں۔“ آپ نے فرمایا: ”اچھا تو پھر سات راتوں یا دنوں، میں ختم کرو اور اس سے زیادہ مست پڑھ۔“

حضرت انس رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ”وصلی روزہ نہ رکھا کرو۔“ لوگوں نے کہا: ”یا رسول اللہ ﷺ آپ تو صل کرتے ہیں۔“ آپ نے فرمایا: ”تم میں سے کوئی بھی میرے جیسا نہیں۔ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھانا اور پیلا ہوا ہوں۔“
حضرت ابوالباس بن صائب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے سنا جو کہتے تھے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا

وَالَّذِي يَقْرَأُ وَهُوَ يَعْرِضُهُ
مِنَ النَّارِ لِيَكُونَ أَخْفَ
عَلَيْهِ بِاللَّيْلِ وَ إِذَا أَرَادَ
أَنْ يَتَقَوَّلَهُ أَفْطَرَ آيَاتًا
وَ أَحْصَى وَ صَامَ مِثْلَهُنَّ
كَرَاهِيَةً أَنْ يَتَرَكَ شَيْئًا
فَارَقَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ.

وَقَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ وَ قَالَ بَعْضُهُمْ فِي
ثَلَاثٍ وَ فِي خَمْسٍ وَ أَكْثَرَهُمْ وَ عَلَى سَبْعٍ
(بخاری و کتاب فضائل القرآن باب فی کم یقرء القرآن)

(۲) عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ جَعْفَرٍ وَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ
اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اقْرَأُوا
الْقُرْآنَ فِي شَهْرٍ قُلْتُ: إِنْ أَيْدِ قُوَّةُ
قَالَ: فَاغْرَاهُ فِي سَبْعٍ وَ لَا تَرُدْ عَلَى
ذَلِكَ. (بخاری، حوالہ ایضاً)

(۳) عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ”لَا تَوَاصِلُوا“
قَالُوا: إِنْ أَنْتَ تَوَاصَلْتَ قَالَ: ”لَسْتُ كَأَحَدٍ
مِنْكُمْ إِنْ أَنْتُمْ أَطَعْتُمْ وَأَسْتَقَى“
ر. بخاری، کتاب الصیام، باب الوصال

(۴) عَنْ أَبِي الْقَبَّاسِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ
قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عَمْرٍو قَالَ:
قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ”لَا تَوَاصِلُوا“

اُخْبِرْ أَنَّكَ تَقْتَرُ الْمَلِيْدَ وَ تَصُومُ
 الْهَارَ قُلْتُ اِنِّيْ اَفْعَلُ ذَلِكَ قَالَ فَيَا نَكَ
 اِذَا فَعَلْتَ كَجَمَعْتَ عَيْنَكَ وَ تَهَضَّتَ نَفْسَكَ
 وَ اِنْ لِنَفْسِكَ حَقًّا وَاِذَا مَلَكَ حَقًّا فَصُمْ
 وَ اَفْطِرْ وَ قُمْ وَ نَمْ۔
 (بخاری، کتاب المتجد)

’مجھے خبر ملی ہے کہ تو ساری رات عبادت کرتا اور دن کو
 روزہ رکھتا ہے۔‘ میں نے کہا: ’ہاں! میں ایسا کرتا ہوں۔‘
 اپنے فرمایا: ’اگر تو ایسا کرے گا، تو تیری آنکھیں میٹ جائیں
 گی اور تیری جان کمزور ہو جائے گی اور تو یہ سمجھ لے کہ تیری
 جان کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے۔
 روزہ رکھ بھی اور افطار بھی کر اور رات کو قیام کر بھی اور سو بھی۔‘

مندرجہ بالا احادیث سے درج ذیل نتائج نکلتے ہیں :

- ۱۔ نفل روزوں کی زیادہ سے زیادہ حد یہ ہے کہ ایک دن روزہ رکھا جائے اور دوسرے دن نہ رکھا جائے بعض دوسری صحیح احادیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جس نے متواتر نفل روزے رکھے، اس کا نہ روزہ ہے نہ افطار۔ یعنی اُسے ثواب ملنا تو دور کار، الّا آپ کے حکم خلافِ عمل کا مرتکب ہوگا۔
- ۲۔ وصلی روزہ (یعنی متواتر بلا روزہ کھولے کئی دن کا روزہ رکھنا) صرف حضور اکرم ﷺ کے لئے و امت کا ہے۔ وصلی کو آپ نے وصلی روزہ سے منع فرمایا۔ اس کی مثال بالکل وہی ہے کہ نماز تہجد آپ پر فرض تھی، مگر امت پر فرض نہیں اور یہ باتیں خصائص انبسیہ سے تلقین رکھتی ہیں۔ ایک دوسری حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ اجازت، جو آپ نے دی وہ یہ ہے کہ شام کو اگر چاہے تو نہ کھائے مگر صبح ضرور کھائے اور یہ روزہ ۲۴ گھنٹے کا ہوگا۔ جیسا کہ ابتدائے اسلام میں روزہ کا دستور تھا۔ کہ وہ ۲۴ گھنٹے کا ہوتا تھا۔ بعد میں آسانی پیدا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس میں تخفیف کر کے روزہ طلوع فجر سے غروب آفتاب تک قرار دیا۔
- ۳۔ مرفوع احادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن سات من یا رات سے پہلے ختم نہ کرنا چاہیئے اور رسول اللہ ﷺ سے یہ بات حکماً ثابت ہے۔ اسی بنا پر قرآن کی سات منازل مقرر کی گئیں کہ ہر روز ایک منزل پڑھ لی جائے۔ تاہم بعض صحابیات تابعین سے تین دن یا پانچ دن میں بھی ختم کرنا منقول ہے۔ جیسا کہ امام بخاری نے ذکر کر دیا۔ پھر بھی ترجیح سات دنوں میں ختم کرنے کو دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرفوع احادیث کے مقابلہ میں صحابیات تابعین کے اقوال حجت نہیں ہیں اور اس کی بے شمار مثالیں احادیث میں مذکور ہیں۔ اسی بنا پر علماء نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ تین دن سے پہلے قرآن ختم کرنا حرام ہے (بخاری، حوالہ مذکور۔ حاشیہ از وحید الزمان) پھر بعض روایات ایسی بھی ملتی ہیں کہ بعض صحابیات تابعین نے ایک دن میں قرآن ختم کیا، تو اس کی دوہی توجیہات ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ

وہ روایت بذاتِ خود ضعیف ہو، دوسرے یہ کہ ان حضرات تک یہ مرفوع اور منقل احادیث نہ پہنچی ہوں اور یہی دوسری توجیہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ کسی صحابی کو رسول اللہ ﷺ کی صیح مرفوع حدیث مل جائے اور وہ اس کا خلاف کرے۔

۴۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ جو نفل عبادات کے سلسلہ میں بہت زیادہ عریص اور اپنے میں ان نفل عبادات کے لئے بہت قوت پاتے تھے انہیں بھی زیادہ سے زیادہ یہی اجازت ملی کہ (۱) قرآن سات دن یارات میں ختم کریں۔ (۲) روزہ ایک دن چھوڑ کر رکھ سکتے ہیں۔ (۳) وصلی روزہ کی کوئی اجازت نہیں۔ پھر عبداللہ بن عمروؓ کو اپنی اس نفل عبادت میں زیادتی کےاطر کے باوجود بعد میں پچھتا نا پڑا۔ اور فرمایا کرتے تھے۔ "کاش! میں رسول اللہ ﷺ کی نصحت کو قبول کر لیتا۔"

۵۔ ساری رات کی شب بیداری خلاف سنت ہے اور اس سے آنچے سختی سے منع فرمادیا۔ کیونکہ اس سے ایک توجہ و جان کمزور پڑ جاتے ہیں اور نفیس پر ظلم ہے۔ دوسرے انسان اپنی بیوی کے حقوق ادا نہیں کر سکتا اور یہ اس پر ظلم ہے اور یہی شکایت لے کر حضرت عبداللہؓ کے والد رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے تھے۔ ہم اب واضح احکامات کی روشنی میں اولیاء اللہ کی زندگی پر نظر ڈال کر دیکھیں گے کہ وہ کس طرح کے متن سنت ہیں اور اس کے لیے بنیاد "تم تاریخ مشائخ چشت، از مولانا زکریا صاحب" کو بنائیں گے، کیونکہ آپ کم از کم شیخ الحدیث تو ہیں۔ گوვნہ بعض دوسرے اولیاء کا ذکر بھی آجائے گا۔

اولیاء اللہ کے خلاف شرع کام

۱۔ وصلی روزہ

- ۱۔ خواجہ عبدالواحد بن زید (م ۱۷۰ھ) تین دن کے بعد روزہ افطار کرتے تھے۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۲۲) ۲۔ خواجہ فضل بن عیاض (م ۱۸۷ھ) آپ پانچ دن کا وصلی روزہ رکھتے تھے۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۳۱) ۳۔ خواجہ حذیفہ المرعشی (م ۲۰۲ھ) آپ چھ دن کا وصلی روزہ رکھتے تھے (تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۴۹) ۴۔ خواجہ ابوالاسحاق (م ۲۲۹ھ) آپ سات دن کا وصلی روزہ رکھتے تھے (ص ۱۵۳) دیکھا آپ نے کس طرح یہ اولیاء اللہ مردِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس سنت کی خلاف ورزی میں بتدیج آگے بڑھ رہے ہیں، حتیٰ کہ پیرانِ پیر، (۵) کا زمانہ آیا، تو آپ چالیس دن کا روزہ رکھتے تھے اور چالیس روز کے بعد جنگل کے پتوں اور اشیائے مباح یا بانی سے روزہ افطار فرمایا کرتے تھے۔ (غزنیۃ الاصفیاء، ص ۱۶۴)

خواجہ فضل بن عیاض (م ۱۸۷ھ) آپ ایک توہ دن کے بعد روزہ افطار فرماتے

۲۔ متواتر روزے

دوسرے صائم الدھر تھے۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۳۱) ۲۔ علوشاد دینیوری (م ۲۹۸ھ)

آپ مادر زاد ولی اور صائم الدھر تھے۔ آپ نے بچپن میں بھی کبھی مال کا دودھ نہ پیا تھا۔ (تاریخ شائع چشت، ص ۱۴۹)

۳۔ خواجہ محمد بن ابی احمد (م ۶۴۱ھ) آپ مادر زاد ولی تھے۔ پیدا ہوتے ہی مکہ پڑھا۔ ۱۲ سال حجرہ میں تنہا رہے ہمیشہ روزہ رکھتے تھے۔ (تاریخ شائع چشت، ص ۱۵۵) ۴۔ خواجہ سید ابویوسف (م ۶۵۹ھ) آپ ایک مرتبہ عبادت میں کچھ کاہل ہو گئے تھے، تو بیس برس تک پانی نہ پیا۔ (تاریخ شائع چشت، ص ۱۵۸)

۱۔ سری سقطی (م ۶۵۰ھ) آپ نے پورے ۹۸ سال زمین پر پہلو نہیں رکھا۔ سوائے

۳۔ ساری رات جاگنا بیماری اور مرض الموت کے۔ (غریۃ الاصفیاء، ص ۱۳۲) ۲۔ جنید بغدادی (م ۲۹۸ھ)

آپ نے کل تیس سال عشاء کی نماز پڑھ کر اور ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر اللہ اللہ کی ہے۔ (صفیائے نقشبندیہ)

۳۔ خواجہ ابوالاحمد ابدال چشتی (م ۶۵۵ھ) آپ تیس برس تک بستر پر نہیں ہوئے۔ قطب ابدال تھے۔ (تاریخ شائع چشت، ص ۱۵۵) ۴۔ پیران پیر (م ۵۹۱ھ) آپ نے چالیس سال تک عشاء کے وضو سے صبح کی نماز ادا کی۔ (غریۃ الاصفیاء، ص ۱۴۲) ۵۔ معین الدین چشتی (عجمی) (م ۶۳۲ھ) حضرت کثیر الحجاب تھے بستر برس ۹۰ کو نہیں سوتے۔ (تاریخ شائع چشت، ص ۱۴۲)

۱۔ ابوہریرہ بصری (م ۲۸۷ھ) آپ وزانہ دو کلام مجید ختم فرمایا کرتے تھے۔ (ایضاً ص ۱۴۷)

۴۔ قرآن خوانی ۲۔ خواجہ ابوالاحمد ابدال چشتی (م ۶۵۵ھ) آپ کی عادت ایک قرآن دن میں اور دو قرآن

شب میں ختم کرنے کی تھی (ایضاً ص ۱۵۵)

یعنی تین قرآن وزانہ ۳۔ ابویوسف بن سمان (م ۶۵۹ھ) آپ نے سوہ فاتحہ ستر دفعہ پڑھی قرآن حفظ ہو گیا۔ آپ وزانہ پانچ قرآن ختم کرتے تھے۔ (تاریخ شائع چشت، ص ۱۵۰) ۴۔ پیران پیر (م ۵۹۱ھ) آپ پندرہ سال تک نماز عشاء کے بعد طلوع صبح سے پہلے ایک قرآن شریف ختم کرتے تھے اور آپ میں دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر یہ قرآن شریف ختم کئے (غریۃ الاصفیاء، ص ۱۶۴) ۵۔ کشف المحجوب میں علی، بخاری فرماتے ہیں۔ میں نے ابوالعباس عطار سے پوچھا۔ آپ ہر روز کتنا قرآن پڑھ لیتے ہیں تو فرمایا: "اس سے قبل رات دن میں دو مرتبہ قرآن ختم کیا کرتا تھا۔ مگر اب چودہ سال ہو گئے کہ ابھی تک سورۃ انفال تک پہنچا ہوں۔" (ریاض السالکین، ص ۲۸۸) ۷۔ بہین تفاوت، راہ از کجاست تا بہ کجا

بہ نے لغرض اختصار صرف چار پانچ مثالیں قرون اولی کے اولیاء اللہ سے پیش کر دی ہیں۔ اب ان کے عمل اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کا موازنہ آپ خود فرمایا لیجئے۔

نکاح مسنون اور اس کی اہمیت

اسلام جن عائلی بنیادوں پر معاشرہ کی تعمیر چاہتا ہے ان میں نکاح کو بہت اہمیت حاصل ہے
 حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

النِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِي فَمَنْ رَزَّعَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْتَ مِنْهُ
 نکاح میری سنت ہے۔ جس نے میری سنت سے منہ
 موڑا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر کوئی مستحق نکاح کی قدرت نہیں رکھتا، تو اسے چاہئے کہ روزے رکھے تاکہ اس
 کی شہوت قابو میں رہے اور وہ حرام کاری کی طرف مائل نہ ہو۔ بس یہی ایک جائز صوٹ ہے۔ حرام کاری کو
 قابلِ مدِّ جرم قرار دیا گیا اور اس کے تمام چور دروازے بھی بند کر دیئے گئے۔

نکاح سے گریز | اب دیکھئے کہ صوفیاء کا بیشتر طبقہ نکاح سے گریز کرتا اور اس کو اپنی راہ میں سب سے
 بڑی رکاوٹ سمجھتا ہے۔ اس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ علی ہجویریؒ جیسے
 بزرگ نے زندگی بھر نکاح نہیں کیا اپنے آپنی آپنی میں اعتراف فرمایا کہ ”ایک مرتبہ کسی کی تیرنگاہ سے سبیل ہو
 گئے تھے۔ کچھ عرصہ بے تاب رہے، لیکن آخر کار فضل ایزدی نے زخم کامرہم پیدا کر دیا۔“ (خلاصہ تصوف اسلام، ص ۱۰)
 اسی طرح خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے زندگی بھر نکاح نہیں کیا اور یہ داستان بھی عجیب ہے۔ صاحبِ حدیقتہ
 الاولیاء فرماتے ہیں:

”یہ مہربانی کا کلام سن کر سلطان الشائخ نظام الدین اولیاء (اپنے پیر فرید الدین گنج شکر) کی تنظیم کو اٹھے،
 چونکہ پاجامہ آپ کا اس وقت پھٹا ہوا تھا حضرت (فرید الدین) نے اپنا پاجامہ منگو کر ارشاد کیا کہ پہن لے سلطان
 الشائخ نے اپنے پاجامہ کے اوپر اس کو پہن لیا، جب ازار بند باندھنے لگے، تو مائے جلدی کے ازار بند
 ہاتھ سے چھوٹ کر پاجامہ پاؤں پر گر پڑا۔ حضرت نے فرمایا کہ ازار بند مضبوط کر کے باندھ لے۔ عرض کی کہ کس
 قدر مضبوط باندھوں؟ فرمایا: اس قدر کہ سوائے روزِ قیامت کے نہ کھلے اور اگر کھلے تو عورتانِ بہشت پر کھلے۔ عرض
 کی کہ ”بہتر ہے؟“ اس وزن سے سلطان الشائخ نے ارادہ نکاح فسخ کیا اور تمام عمر مجرد رہے۔ (خدایۃ الاولیاء، ص ۴۴)

سو یہ ہے مرید اور مرشد دونوں کی سنت رسول ﷺ سے محبت اور اتباع کا نمونہ۔

ایک اور بزرگ شیخ شاہ محمد مشہور بہ ملا شاہ قادری ہیں جنہوں نے عمر بھر نکاح نہیں کیا۔ فرمایا کہ تھے۔ ”عمر
 ہم کو غسلِ جنابت اور احتلام کی حاجت نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ دونوں غسلِ نکاح اور نیند سے متعلق ہیں اور ہم

نے نہ تو نکاح کیا اور نہ سوسے ہیں۔“ (غنیۃ الاولیاء، ص ۵۷)

پھر صرف یہی نہیں کہ خود نکاح نہیں کرتے بلکہ اس کو بُرا سمجھتے اور اس سے روکتے بھی ہیں :

نکاح ایک عہدِ پیمان کا نام ہے
نکاح ایک عہدِ پیمان کا نام ہے۔ نکاح کی مجلس میں میاں بیوی اس عہدِ پیمان کو نباہنے کے لئے گواہوں کے سامنے اقرار کرتے ہیں اور اس عہدِ پیمان کو بغیر و خوبی نباہنے سے ہی اسلام کے تجویز کردہ عائلی نظام کے مقاصد پورے ہو سکتے ہیں مگر ان بزرگوں میں سے اگر کچھ حضرات نکاح کرتے بھی ہیں، تو اسے ایک کھیل تماشا بنا کے رکھ دیتے ہیں۔ درج ذیل واقعات ملاحظہ فرمائیے :

عبداللہ خفیف کا نکاح اور طلاق
(حضرت عبداللہ خفیف کا ذکر ہو رہا ہے) نقل ہے کہ ایک بار آپ نے اپنے غلام سے کہا ”مجھے نکاح کی حاجت

ہے کوئی نیک عورت لاؤ تاکہ نکاح کروں۔“ خادم نے حکم کی تعمیل کی اور آپ نے نکاح کیا۔ آپ کو خدا نے ایک خوب عورت لڑکا عطا کیا۔ کچھ مدت کے بعد لڑکا فوت ہو گیا، آپ نے بیوی سے فرمایا۔ اب چاہو تو طلاق لے لو۔ اگر رہنا چاہو تو مجھے ضرورت نہ ہوگی۔ بیوی نے سبب پوچھا، تو فرمایا: ”میں نے خواب دیکھا تھا کہ قیامت قائم ہے۔ بے شمار مخلوق غرقِ گناہ ہے۔ ناگاہ ایک لڑکا آیا اور اس نے، هجوم میں سے اپنے ماں باپ کو پکڑا اور پل صراط سے گزر کر بہشت میں لے گیا۔ پس میں نے سمجھا کہ اس معصوم کی شفاعت سے اس کے ماں باپ بخشے گئے۔ اس سبب میں نے نکاح کیا تھا۔ (مقرآن حق، ص ۱۹۰)

اب یہ ملاحظہ فرمائیے کہ یہ بزرگ کس جرم میں اس عورت کو طلاق دینے یا اس سے ترکِ تعلیق پر آمادہ ہو گئے۔ کیا قرآنی ارشاد ”وَ اَوْفُوا بِالْعُقُودِ“ کا یہی مطلب ہے ؟

گویا آپ کو ایک معصوم بیٹے کی شفاعت مطلوب تھی، جب یہ مطلب حاصل ہو گیا، تو رسول اللہ کے اس ارشاد ”إِنْ أَبْغَضَ الْحَلَالُ عِنْدَ اللَّهِ الْقَلَاقَ“ کی بھی چنداں پروا نہ کی۔

ابو محمد ترش کا نکاح اور طلاق
اب ایک دوسرے بزرگ ابو محمد ترش کا معاشرت، نکاح اور پھر اس سے فرار کا قصہ سنئے :

”نقل ہے کہ آپ نے ابتدا کی کسی گل میں گزرتے ہوئے دروازے پر کھڑے ہو کر پانی مانگا۔ ایک لڑکی پانی لائی، تو آپ اس کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو کر وہیں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد صاحبِ خانہ آیا اور دریافت کیا

کہ کیوں بیٹھے ہو؟“ آپ نے فرمایا: ”تیرے گھر سے ایک لڑکی پانی پلا کر میرا دل لے گئی۔“ صاحب خانہ سمجھدار اور نیک آدمی تھا، آپ کو جانتا تھا، کہنے لگا: ”وہ میری ہی لڑکی ہے اگر آپ چاہیں، تو نکاح کر دوں۔“ فرمایا: ”یہ نہایت مہربانی ہوگی۔“ اس نے نوکروں کو حکم دیا کہ آپ کے بوسیدہ کپڑے اُتار کر نہلا لیں اور اچھی پوشاک پہنائیں پھر قاضی کو بلایا اور نکاح کر دیا، جب آپ دہن کے خلوت کدے میں پہنچے، تو ادا لے کر شکر کے طوطے پہلے نماز میں مشغول ہوئے۔ یکایک آپ نے شور مچا دیا کہ ”میری گدڑی لاؤ، میری گدڑی لاؤ اور اپنی پوشاک لے لو۔“ غرض آپ نے وہ ریشمی لباس اُتار پھینکا اور اپنی گدڑی پہن لی اور عورت کو طلاق کہہ کر بھاگ نکلے۔ لوگوں نے پوچھا: ”کیا معاملہ ہوا؟“ فرمایا: ”جب میں نے نماز شروع کی، تو میرے سر میں ندا آئی کہ ایک نظر کے بدلے، جو تو نے ہمارے مخالف پر کی، ہم نے تیرے بدن سے اپنے دوستوں کا ظاہری لباس (گدڑی) اتروالیا۔ یاد رکھ! اگر تو نے دوسری نظر ڈالی، تو تیرے باطن سے بھی اپنی دوستی کا لباس اتار لیں گے۔“ پس میں ڈر گیا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔“ (مقرآن حق، ص ۲۰۶)

اب اس بزرگ کے واقعہ سے مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلتا ہے :

- ۱۔ نکاح ملنے کے کا طریق یہ ہے کہ جو لڑکی اچھی لگے۔ اس کے مکان کے سامنے دھرم مار کے بیٹھ جاؤ۔
- ۲۔ اگر عورت بغیر خلوت طلاق کی ضرورت پیش آئے تو بھی نصف حق مہر جس کی ادائیگی جس کا قرآن نے حکم دیا ہے، کی ضرورت نہیں۔ شاید نکاح بھی بغیر حق مہر کے تعین کے ہوا ہو۔
- ۳۔ بیوی پر نظر ڈالنا بھی غیر لغتہً نظر ڈالنا ہے جس کی سزا بڑی سخت ملتی ہے۔ یہ ہے ان بزرگوں کی اتباع سنت کا نمونہ اور جو حضور ﷺ نے اتنے نکاح کئے تھے۔ اس کے متعلق کیا ارشاد ہے؟

قطب الدین بختیار کاکی (م ۶۳۶) کے طلاق دینے کی وجہ | آپ فرماتے ہیں کہ ایک شخص رئیس نامی نے خواب میں

ایک عظیم الشان قبۃ دیکھا جس کے گرد خلق کا ہجوم تھا اور ایک ٹھکانہ شخص بار بار اس قبۃ میں آمد و رفت کر رہا ہے اور خلق جو اپنے پیغام دیتی ہے، قبۃ میں جا کر ان کے پیغام پہنچاتا اور جواب لا کر لاتا ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس قبۃ میں رسول اللہ ﷺ ہیں اور یہ ٹھکانہ شخص حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ میں نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر کہا کہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کیجئے کہ میں آپ کے دیدار سے شرف ہونا چاہتا ہوں۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ گئے اور باہر آکر مجھے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ کہتے ہیں

کہ: ”ابھی تجھ میں میسر دیکھنے کی قابلیت نہیں ہوئی۔ البتہ تو بختیار کاکی کے پاس جا کر میرا سلام پہنچا اور کہہ کہ تیرا بھیجا ہوا تجھ مجھے پہنچا تھا، مگر تین روز سے یہ تحفہ نہیں پہنچا، اس کی کیا وجہ ہے؟“ رئیس کہتا ہے جب میں پیدا ہوا، تو بختیار کاکی کے پاس جا کر سلام بھی پہنچایا اور پیغام بھی دیا۔ شیخ قطب الدین نے اسی وقت اپنی بیوی کو جس سے ابھی ابھی نکاح ہوا، طلب کیا اور مقررہ حق مہر اس کے حوالے کر کے طلاق دے دی بعد ازاں فرمایا کہ: ”بیلک میں تین اتوں سے تزویج میں مشغول تھا اور یہ تزویج کا شغل رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں تحفہ پیش کرنے سے مانع تھا اور وہ تحفہ یہ تھا کہ آپ تین ہزار مرتبہ درود شریف پڑھ کر سویا کرتے تھے۔“ (سیر الاولیاء، ص ۵۶)

غور فرمایا آپ نے! رسول اللہ ﷺ کو تحفہ بھیجنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ یہ صحیح طریقہ بیوی کو طلاق دینے کے بعد ہی ہاتھ آ سکتا ہے۔ پھر صاحب میلادِ اولیاء کا کمال یہ ہے کہ اُس نے ایسا جواب قصہ تراشا کہ اسے تحفہ کے نام پر رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے اس بلا وجہ طلاق کے استعجاب کا سامان بھی مہیا کر دیا اور بختیار کاکی کے اس صریح خلاف سنت اجتہاد کو مستحسن قرار دیا۔ تاہم اس قصہ میں ایک خوبی بھی ہے اور وہ یہ کہ ایسے قصے نکاح و طلاق کے سلسلہ میں ان اولید اللہ کے ذہن کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔

ابتداء اگر امت تراش کر حساب لگائے کہ تین ہزار مرتبہ درود پڑھنے پر کم از کم کتنا وقت لگتا ہے تو یقیناً وہ تعداد کم لگتا۔ اب ایک بہت جلیل القدر بزرگ محی الدین ابن عربی ہیں، جو ان صوفیاء کے شیخ اکبر ہیں۔ وہ دلائل سے ثابت کرتے ہیں کہ مشاہدہ حق ہوتا ہی

شیخ اکبر کا فلسفہ نکاح

اس وقت ہے جب انسان عورت سے جماع کرتا ہے۔ اپنی عورت سے ہو یا غیر سے۔ وہ اپنی دو سالہ عمر کی بچی سے بھی نکاح کا سلسلہ لپیٹھ سکتے ہیں اور حلال و حرام کی تمیز سے بے نیاز۔ اس کی تفصیل ہم عشق و مستی، (باب صوفیہ کے مخصوص مسائل) میں ذکر کر آئے ہیں اور ان کے خوشہ چیں عین الدین تلمسانی نے ایسا فتوے بھی دے دیا تھا۔

اتباع سنت کرن باتوں میں؟

صوفیاء کی ان سب باتوں کے باوجود جہیں یہ تسلیم کرنے میں باک نہیں کہ ان بزرگ ہستیوں کو بھی بعض دفعہ شریعت کی پاسداری اور اتباع سنت کا خیال آ ہی جاتا ہے اب جس طرح کی باتوں کا انہیں خیال آتا ہے وہ بھی چند مثالیں حاضر خدمت ہیں:

۱۔ اوّل قرنِ گدانت توڑنا | آپ کے متعلق یہ قصہ زبانِ زد ہے کہ آپ نے اپنے سائے دانت محض اس خیال سے شہید کر ڈالے تھے کہ معلوم نہیں کہ جبکہ اُمّ میں رسول اللہ ﷺ کے کون سے دو دانت نہیہ ہوئے تھے۔ اور یہ خواجہ صاحب کی رسول اللہ ﷺ سے محبت کا تقاضا تھا۔ غور فرمائیے! کیا سائے کے سائے دانت توڑنے سے واقعی اتباعِ سنت ہو گئی تھی؟

۲۔ بایزید بسطامی (م ۲۶۱ھ) اور والدین کا حق | ”بچپن میں آپ مکتب میں پڑھتے تھے جب اس آیت پر پہنچے اِنَّ الشُّكْرَ لَوْلَا الَّذِيكَ یعنی شکر کر میرا اور اپنے والدین کا۔“ گھر آکر والدہ سے کہنے لگے کہ میں نے قرآن میں سبق پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”شکر کر میرا اور اپنے والدین کا۔“ تو اب میری عرض یہ ہے کہ میں دو گھروں سے تعلق نہیں بنا سکتا یا تو مجھے آپ خدا سے مانگ لیجئے کہ بالکل آپ ہی کا ہو رہوں یا خدا کو سو نپ دیجئے کہ بالکل اسی کا بن جاؤں۔“ والدہ نے فرمایا: ”میں نے تمہیں اپنا حق بخش دیا۔ یسّٰن کر آپ بسطام سے نکلے اور تیس سال تک شام کے جنگلوں میں ریاضت مجاہدہ کرتے رہے۔“ (صوفیائے نقشبند، ص ۸۶)

اس اقتباس سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

- ۱۔ اللہ کا شکر اور والدین کا شکر، دونوں احکام کی بجا آوری، اولیٰ رائے کی بساط سے باہر ہے کیونکہ قرآن کے احکام عام لوگوں کے لیے ہیں۔
- ۲۔ والدہ کی اجازت لے لیں، تو والد کا حق از خود ادا ہو جاتا ہے۔
- ۳۔ اللہ کا شکر جنگلوں میں جا کر ہی ادا کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ معین الدین چشتی اور انگلیوں کا خلال | ایک بار آپ وضو میں انگلیوں کا خلال کرنا بھول گئے تو غیب سے آواز آئی کہ ”محبت رسول کا دعوئے اور سنت کا ترک؟ آپ نے فوراً توبہ کی کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا۔“ (تاریخ شائخ چشت، مولانا زکریا، ص ۱۶۷)

آپ جب علی جوہری کی قبر پر چڑھ کٹی فرما رہے تھے، تو اس وقت آپ کو سنت رسول یا و نہیں آئی۔ پھر ستر برس تک ات بھر سوتے بھی نہیں۔ اس وقت بھی سنت رسول یاد نہ آئی۔ انگلیوں کا خلال شاید ان باتوں سے بڑھ کر ہو۔ آپ کی مرض الموت میں آپ کو کھانے کی دوا دی گئی۔ صاحبِ فراسش تھے۔ خادموں سے فرمایا: مجھے چہنچہ

۴۔ جلال الدین عمری (م ۹۸۰ھ)

بٹھلا دو۔ جب بیٹھ گئے، اس وقت دوا لوش فرمائی اور فرمایا: ”نبی اکرم ﷺ سے یہ ثابت نہیں کہ اپنے تخت سر پر بیٹھ کر کوئی چیز کھاتی ہو۔“ (تاریخ شاخِ پشت، مولانا زکریا، ص ۲۱۰)

۵۔ میاں جی نور محمد (م ۱۲۵۹ء) | حضرت میاں جی صاحب کا مزار خام ہے۔ البتہ اس کا حلقہ پختہ ہے۔ بعض لوگوں نے چاہا کہ اس کو ایک ہاتھ سے

اوپر اٹھادیں، مگر آپ نے کسی کو خواب میں ارشاد فرمایا: ”یہ خلاف سنت ہے۔ ایسا نہ کرو۔ ایک ہی ہاتھ اٹھاؤ نہ چاہئے۔“ (تاریخ شاخِ پشت، مولانا زکریا، ص ۲۳۶)

یہ وہی میاں جی صاحب ہیں جنہوں نے فرمایا کہ فقیر نہیں مریا۔ اس کی قبر سے وہی فائدہ ہوگا، جو ظاہری زندگی میں ہوتا تھا۔ (تاریخ شاخِ پشت، مولانا زکریا، ص ۲۳۲)

۶۔ بایزید بسطامی (م ۲۶۱ھ) کا نقوی | ایک روز آپ نے صحرا میں اپنا کپڑا دھویا۔ ایک ارادتمند ساتھ تھا، وہ بولا: ہم اس کو انگوروں کی دیوار پر لٹکا دیتے

ہیں۔ فرمایا: ”لوگوں کی دیوار میں بیخ نہ لگاؤ۔“ مرید نے سجا: ”درخت پر لٹکا دیتے ہیں۔“ فرمایا: ”ایسا نہ کرنا۔ درخت کی شاخیں ٹوٹ جائیں گی۔“ عرض کیا: گھاس پر پھیلا دیتے ہیں۔“ فرمایا: ”ایسا نہ کرنا، گھاس چار پائوں کا چارہ ہے۔ ہم کپڑے سے اس کو نہیں چھپاتے۔“ پس آپ کپڑے کو پشتِ مبارک پر رکھ کر دھوپ میں کھڑے ہو گئے۔ جب ایک طرف سوکھ گئی تو دوسری طرف الٹ دی۔ (صوفیائے نقشبندیہ ص ۹۲)

دیکھ لیا آپ نے نقوی کے کہتے ہیں۔ اگر بایزید جیسے بزرگ کے علاوہ آپ کے سامنے کوئی اودھخص ہوتا تو آپ ایسے سوال و جواب پر اسے یقیناً دیوانہ سمجھتے۔ نہ تو انگوروں کی دیوار میں بیخ لگانے کی ضرورت تھی۔ نہ ہی کپڑا ڈالنے کی نیت کی شاخیں ٹوٹتی ہیں اور نہ ہی اس چند فٹ کی جگہ پر کوئی مویشی چرنے آگئے تھے۔ بہر حال یہ مرید و مرشد کی اسرار و رموز کی مقدس باتیں ہیں۔ ہم اور آپ انہیں کیا جانیں۔ یا پھر یہ تذکرہ نگاروں کی پرواز نہیں ہے۔

۷۔ خواجہ امیر کلال (م ۷۷۳ھ) کا نقوی | خواجہ صاحب نے سب بالکل سی طرح کپڑے سے تھے اور ساتھ ہی اس کی وجہ یوں بیان فرمائی کہ اگر ہاڑ کو نقصان

پہنچ جائے یا شاخیں ٹوٹ جائیں یا مویشیوں کی گھاس خواب ہو جائے، تو باغ کے مالک کو کیا جواب دو گے، دوسروں کی محبت میں تصرف کرنا خلافِ شرع ہے۔ گناہِ صغیرہ کو معمولی ادا آسان نہیں سمجھنا چاہیئے۔ (صوفیائے

۵۔ جنت اور دوزخ کا استہزاء

دین اسلام کی تیسری نظریاتی بنیاد آخرت میں اپنے اعمال کی جزا و سزا کا عقیدہ ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ أَفْئُتْكُمْ وَ
أَعْلَيْكُمْ سَارًا (۳۶/۹) جہنم سے بچو۔

نیز یہ بھی فرمایا :

سَلْبِقُوا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ (۴۶/۱۱) اپنے پروردگار کی بخشش اور جنت کی طرف بچو۔

اور حضور اکرم ﷺ نے اپنی سچے کی تیرہ سالہ زندگی اسی جزا و سزا کے عقیدہ اور جنت اور دوزخ کے اوصاف بیان کرنے میں گزار دی، چنانچہ کئی سوتوں میں جنت اور دوزخ کا یہ تصور نمایاں طور پر پایا جاتا ہے اور اس عقیدہ کو کئی انداز سے ذہن نشین کر لیا گیا ہے اور حقیقت میں یہی عقیدہ انسان کی عملی زندگی کی جان ہے لیکن ابن عربی نے وحدت الوجود کا نظریہ پیش کر کے اس قدر کو بھی بل ڈالا۔ جب سب چیزیں اللہ کا حصہ اور اس کی مین قرار پائیں، تو پھر بھلا وہ کون سا اللہ ہے، جو اپنے آپ کو جہنم کے سپرد کر دے گا۔ اس نظریہ سے خیر و شر کی کوئی تمیز باقی نہ رہی۔ جزا و سزا اور جنت و دوزخ بے معنی چیزیں بن گئیں۔ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتے ہیں کہ :

”اللہ نے مسلمانوں سے اُن کی جانیں اور اموال خرید لئے ہیں اور اس کے عوض انہیں جنت عطا فرمائی گا۔“ مگر یہ لوگ جنت کو خاطر میں ہی نہیں لاتے اور یہ نظریہ اتنا عام ہوا کہ عام لوگ بھی اس کے تاثرات سے نہ بچ سکے۔ کسی شاعر نے اس نظریہ کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے :

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے او بے خبر جزا کی تنہا بھی چھوڑ دے

”آپ کے وصال کے وقت ایک بزرگ
پاس بیٹھے تھے۔ وہ جنت کے طے

علوم مشاد نبوی (م ۲۹۸ء) کی جنت سے بے نیازی

کی دعا کرنے لگے۔ حضرت مشاد نے ہنس کر فرمایا : ”تیس سال تک جنت اپنی ساری دلچسپیوں سمیت میرے سامنے آتی رہی، مگر میں نے ایک مرتبہ بھی اُن کو نگاہ بھر کر نہیں دیکھا۔ میں تو جنت کے مالک کا مشتاق ہوں۔“

(تاریخ شاخِ پشت، مولانا زکریا، ص ۱۵۱)

اب دیکھئے ! معراج نبوی کے دوران جنت آپ کو بھی دکھائی گئی تھی۔ پھر کیا آپ نے ایسی بے اعتنائی فرمائی تھی جیسا کہ مشاد صاحب فرما رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو وفات کے وقت یوں فرمائیں کہ ”اگر میں

برابر سراسر چوٹ جاؤں تو غنیمت ہے۔ لیکن آپ پرتیس سال سے جنت اپنی پوری رعنائیوں سے پیش ہوتی رہی، لیکن آپ اسے خاطر میں ہی نہیں لاتے۔

دوزخ مقام لذت ہے | اب جنت اور دوزخ کی حقیقت اور اس کا فلسفہ مشہور متصوف عبد الکریم جلی، جو ابن عربی کی کتاب فصوص الحکم کے شارح ہیں، کی زبان سے سینے، فطرت سے ہیں :

”اور میں (یعنی عبد الکریم جلی مصنف انسان کامل) ایک مزینہ افلاطون سے (کشف میں) ملا۔ جس کو اہل ظاہر (یعنی علمائے دین) کا فرکتے ہیں۔ میں نے ایسی حالت میں اس کو پایا کہ عالم غیبی نور اور بہجت (روشنی) سے بھر گیا تھا۔ اور اس کا ایسا مرتبہ میں نے دیکھا کہ بعض کے سوا کسی ولی کو بھی یہ تہ نصیب نہیں ہوا۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ تو کون ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں قطبِ زمان اور اپنے وقت کا یحنا (یعنی خدا) ہوں۔ ہم نے اس قسم کے تہا سے لئے بہت سے عجائب و غرائب دیکھے ہیں۔ جن کا ظاہر کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس باب میں ہم نے تیرے لئے رمز کے طور پر بہت سے اسرار رکھے ہیں۔ جس میں لسانِ رمز کے سوا کلام کرنے کی ہم کو گنجائش نہیں ہے۔ پس میرے کلام کے پوست کو پھینک دے اور اگر تو عقلمند ہے تو مغز کو لے لے۔ ان اوراق میں میں نے وہ علوم جمع کئے ہیں کہ دوزخیوں کے حالات معلوم کرنے کے لئے کسی دوسری شے کی احتیاج باقی نہیں رہتی۔“ (انسان کامل ص ۳۰۶)

پھر جو کچھ افلاطون نے مصنف کتاب انسان کامل عبد الکریم جلی کو بطور رمز بتلایا، اس کا خلاصہ آپ نے ان الفاظ میں پیش فرمایا ہے :

”دوزخیوں کو دوزخ میں لذت ہوگی۔ جیسے اس شخص کو لڑائی بھڑائی میں لذت آتی ہے، جو اس کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ ہم نے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ لڑائی بھڑائی میں لذت پاتے ہیں۔ حالانکہ وہ جانتے ہوتے ہیں کہ وہ اس میں تکلیف پارہے ہیں، لیکن وہ روبریت جو ان کے نفس میں پوشیدہ ہے۔ ان امور میں غور کرنے پر ان کو آمادہ کرتی ہے۔ پھر ان کے لئے ایک اور بھی لذت ہے، جو خدش والوں کی لذت کے مشابہ ہے کہ اگرچہ کھلا کھلا کر ان کا بدن کٹ جاتا ہے اور پھیل جاتا ہے، مگر وہ اس کے کھیلنے میں لذت پاتا ہے اور وہ عذابِ لذت کے نایاب ہوتا ہے۔ پھر ان کے لئے ایک مختلف لذت ہے۔ حتیٰ کہ میرا ایک جماعت سے (کشف میں) ملنے کا اتفاق ہوا، جو دوزخ کے سخت ترین عذاب میں تھے۔ اس حالت میں میں نے

اُن کو دیکھا کہ جنت اُن پر پیش کی جاتی تھی اور وہ اسے اچھا نہیں جانتے تھے.... پھر جاننا چاہیے کہ دوزخیوں میں ایسے آدمی بھی ہیں جو اللہ کے نزدیک بہت سے خبیثوں کی نسبت اچھے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے ان کو دارالاشفاق میں داخل کیا ہے تاکہ اس میں ان پر تعمیل کرے اور اشیاء میں سے وہ شخص اس (یعنی خدا) کی نظر کا محل ہو اور یہ ایک عجیب و غریب امر و ازہے **يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ وَيَحْكُمُ مَا يُرِيدُ** (انسان کامل، ص ۳۰۸)

پھر اپنے فلسفہ کی تائید میں قرآن کریم کی آیت **وَمَا تَشْتَعِلُ اَنْفُسٌ** سے ثبوت یوں پیش فرماتے ہیں:

”کیا تو اس بات کی طرف خیال نہیں کرنا کہ جب تک وہ (آدم ﷺ) جنت میں تھے۔ جس چیز کا اپنے جی میں تصور کرتے تھے۔ خدا تعالیٰ اُن کی حس میں اس کو پیدا کر دیتا تھا اور جو جنت میں داخل ہو گا۔ اس کے لئے بھی یہی ہو گا۔ اور جب عالم دیوی میں وہ (آدم ﷺ) نازل ہوئے تو یہ بات ان کے لئے نہ رہی۔ اس لئے کہ ان کی حیات مصدہ یعنی وہ زندگی کہ جس چیز کا وہ تصور کرتے تھے وہ موجود ہو جایا کرتی تھی۔ جنت میں بالذات تھی۔ اور اس دیوی زندگی میں رُوح کے ساتھ کہ وہ اہل دنیا کے لئے مُردہ کا حکم رکھتی ہے مگر اس شخص کی رُوح جس کو حیاتِ ابدیہ سے خدا تعالیٰ نے زندہ فرمایا اور اسے اس نظر سے دیکھا جس نظر سے اپنی ذات کو دیکھا۔ اور اپنے اسماء و صفات سے اسے مستحق کیا۔ پس ایسے شخص کو (یعنی اس گروہ صوفیاء میں سے اکثر کو۔ مؤلف) دنیا میں قدرتِ ماحل ہوتی ہے، جو اہل جنت کو دارالآخرت میں ماحل ہوگی۔ وہ جس کا تصور اپنے جی میں کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ اس کی حس میں اس کو پیدا کر دیتا ہے۔“ (انسان کامل ص ۳۱۲)

یہ تو غیر ان لوگوں کا دوزخ کو لذت کا مقام ثابت کرنے کا فلسفہ تھا۔ اب جس طرح ان لوگوں نے مذاق اڑایا ہے یہ داستان بھی ملاحظہ فرمائیے خواجہ حسن دہلوی راوی ہیں :

”اسی اثنا میں اولیائے حق اور ان کے کمالِ محبت کا معروف کرخمی کا جنت میں جانے سے انکار ذکر چلا۔ اس موقع پر آپ نے فرمایا: کل قیامت کے دن

حشر کے میدان میں معروف کرخمی کو لایا جائے گا اور وہ یوں نظر آئیں گے جیسے کوئی حد سے زیادہ مست ہو خلقت انہیں دیکھ کر حیران ہو جائے گی اور پوچھے گی: ”یہ کون ہیں؟“ پھر وہ یہ آواز سننے لگی کہ یہ ہماری جنت میں مست ہے۔ اسے معروف کرخمی کہتے ہیں۔ اس وقت معروف کرخمی کو حکم ہو گا کہ بہشت میں چلو۔ وہ کہیں گے میں نہیں جاتا۔ میں نے تیری بہشت کیسے عبادت نہیں کی۔“ بعد ازاں فرشتوں کو حکم دیا جائے گا کہ انہیں نور کی زنجیروں میں جکڑ کر کینچنے کینچتے بہشت میں لے جاؤ۔“ (فوائد الغوار۔ محفوظ، حضرت

خواجہ نظام الدین اولیاء، مرتبہ حسن دہلوی، ترجمہ: پروفیسر محمد سدر، ص ۳۵۲، طابع: علی ریکیڈی، پنجاب سٹیٹ پریس (نواں شہر)

اب فراحت شر کے میدان کی دہشت ذہن میں لائیے۔ جس میں حضور اکرم ﷺ کے سوا سب نفسی نفسی پکار رہے ہوں گے۔ اور حضور اکرم ﷺ اپنے متعلق یہ فرماتے ہیں کہ ”میں اس وقت تک جنت میں داخل نہ ہو سکوں گا، جب تک کہ مجھے اللہ کی رحمت نہ ڈھانپ لے۔“ لیکن یہ بزرگ اس دہشت سے بالکل مامون اور مست ہوں گے اور جب خدا ان سے حساب کتاب لئے بغیر بہشت میں جانے کا آرڈر دے گا، تو یہ اٹھکیں گے، لیکن خدا کو انہیں جنت میں بھیجنے کی اتنی ضرورت ہوگی کہ دوبارہ فرشتوں کو حکم دے گا کہ ”اے نور کی بنجیروں“ سے جلد کر کھینچتے کھینچتے بہشت میں لے جاؤ۔ یہ نور کی زنجیریں جیسا کہ اللہ کے اپنے نور کی ہوں گی۔ آخر یہ بزرگ واصل باللہ جوتھے۔ اور ان کی بزرگی کی شان یوں نمایاں کی جائے گی۔ پہلے ایک آواز آئے گی: ”یہ کون ہیں؟“ پھر دوسری آواز جواب دے کہ ان کا تعارف کر لے گی۔

جنت کے خیال سے عبادت بھی جرم ہے | البوکر کلابازی اپنی کتاب الترفیہ لہذہب اہل النصف کے ص ۱۵۵ پر ایک واقعہ درج کرتے ہیں۔ (یہ واقعہ بہت سی کتابوں میں مذکور ہے) کچھ لوگ رابعہ بصری کی خدمت میں بیمار پرسی کے لئے حاضر ہوئے۔ پوچھا کیا حال ہے۔ رابعہ بصری نے جواب دیا: ”واللہ! مجھے اپنی بیماری کا کوئی سبب نظر نہیں آتا۔ سوا اس کے کہ مجھ پر جنت پیش کی گئی اور میرا دل اس طرف مائل ہو گیا۔ اس پر میں نے آقا نے مجھ پر عقاب کیا ہے۔“

غور فرمائیے! اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں کہ ”اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور اموال جنت کے بدلے خرید لئے ہیں اور یہ لوگ جنت کے تصور اور اس کی طرف میلان کو جرم قرار دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جنت اور اس کی نعمتوں کو نہ لایا من غفور ورحیم فرمائیں اور یہ لوگ اللہ کی اس مہمان نوازی کا یوں تمسخر اڑائیں۔ فی اللعجب انہی رابعہ بصری نے ایک بار فرمایا: ”اگر میں تیری عبادت، بہشت کی چاہت میں کروں، تو مجھے اس سے محروم رکھنا اور اگر تیرے دوزخ کے در سے کروں، تو مجھے اس میں جلا نادر اگر تیری عبادت صرف تیری محبت میں کروں، تو مجھے اپنے جہاں بے مثال سے محروم نہ رکھنا۔ سبحان اللہ!“ (مترجم حق، ص ۱۵)

یہ ہے ارشاد خداوندی وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا (۵۰٪) صبح تاول و تبسیر۔

خواجہ معین الدین امیری کی زبان سے سینے :
بایزید بطنی کا ایک آہ سرد، جہنم کو ٹھنڈا کر دینا | ایک بار خواجہ بایزید بطنی مقام قرب میں تشریف لے گئے۔ ہاتف نے آواز دی اے بایزید! تمہاری خواست گاری اور ہمارے بخشش و عطا کا وقت ہے مانگو

کیا مانگتے ہو، میں تم کو دوں گا۔ خواجہ نے سجدہ میں سر جھکایا اور کہا: ”بندہ کو خواستگاری سے کیا کام؟ بادشاہ کی بخشش اور انعام و اکرام جس قدر ہو جائیں بندہ اس میں راضی ہے۔“ پھر آواز آئی ”ہم نے تجھ کو آخرت کی خوبی اور دستگاری عطا کی۔“ بایزید نے عرض کیا: ”اے الہی! آخرت تو دوستوں کا بندی خانہ ہے۔“ پھر آواز آئی: ”اچھا ہم نے بہشت اور دوزخ اور عرش اور کرسی، جو کچھ ہماری ملکیت ہے تم کو دی۔“ عرض کیا: ”خیر!“ پھر بندہ آئی: ”اچھا تمہارا کیا مطلب ہے؟ کچھ مانگو تو دیں۔“ عرض کیا: ”الہی! جو میرا مطلب ہے وہ تو خود جانتا ہے۔“ آواز آئی: ”لے بایزید! تو ہم کو کم سے مانگتا ہے اگر ہم تجھ کو تجھ سے مانگیں، تو تو کیا کرے گا؟ جیسے ہی یہ آواز آئی خواجہ نے قم کھا کر عرض کیا کہ ”قم ہے تیرے عزت و جلال کی۔ اگر تو مجھ کو کل قیامت میں طلب کرے گا اور آتش دوزخ کے سامنے کھڑا کرے گا تو حاضر ہوں گا اور کھڑا ہو کر ایسی سزا دے گا کہ دوزخ کی حرارت زائل ہو جائے گی حتیٰ کہ کچھ نہ رہے گی۔ کیونکہ آتش محبت کے سامنے اس کی کیا اصل ہے۔ جب بایزید نے یہ فرمایا نہ آئی کہ ”لے بایزید! ابھر چو جستی یافتی“ (یعنی جس چیز کی تجھ کو تلاش تھی پالی)

اس اقتباس سے دوزخ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

- ۱۔ جس طرح حضور اکرم ﷺ کو معراج کے دن قرب الہی حاصل ہوا تھا۔ اولیاء کے لئے ایسے بے شمار مواقع آتے رہتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کو تو خود اللہ تعالیٰ نے لے گیا تھا، لیکن یہ خود پہنچ جاتے ہیں۔
- حضور اکرم ﷺ کی گفتگو عبد اور مسبو کے درمیان تھی۔ لیکن یہاں گفتگو اس انداز سے ہو رہی ہے

جیسے ۱۔ خدا کے ساتھ کے کیسے ہوئے ہیں

جو خدا کی ساری ملکیت لے کر عجب راضی نہیں ہوتے۔

- ۲۔ اللہ نے جو اتنی مدت سے جہنم تیار کر رکھا ہے وہ بس اُن کی ایک آہ سیر کی مار ہے۔ بھلا اس آتش جہنم کو آتش محبت سے کیا نسبت؟ اگر خدا اس آگ میں پھینک بھی دے تو وہ ان کا کیا بگاڑ لے گی۔

- ۳۔ آخر خدا نے مجبوراً انہیں واصل باللہ (اپنے ساتھ ملانے کی) خواہش پوری کر دی۔ اس کے بغیر چارہ بھی کیا تھا۔

یہ تو تھا ان بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ کا جنت اور دوزخ سے متعلق تصور۔ رہی انسان کے اعمال کی جزا و سزا اور حساب کتاب کی بات، تو اس کو جس طرح ان اولیاء اللہ نے اپنے مریدوں سے وعدے کر کے نجات انہی کی ضمانت دے رکھی ہے وہ ہم اولیاء اللہ کے تصرف میں بیان کر چکے ہیں۔

۶۔ ارکانِ اسلام کا استہزار

دینِ اسلام کا سبک اہم اور بنیادی عقیدہ توحید اور پھر اس کے بعد جزا و سزا کا عقیدہ ہے۔ دینِ طریقت نے جب بنیادی عقائد پر ہی ہاتھ صاف کیا تو ارکان و اعمال پر اس کا اثر مرتب ہونا لازمی تھا۔ بہت سے پیرائے تھے اور ہیں جن کے ہاں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور علی الاعلان بکواس کہتے، لوگوں کو گالیاں دیتے، فحاشی اور بعض کبیرو گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ وہی جنت و دوزخ سے متعلق ان کا تصور ہے، جو وحدت الوجود کے عقیدہ کا لازمی نتیجہ ہے۔ اب مشکل یہ ان پڑی کہ عام مسلمان، جاہل ہونے کے باوجود، قرآن، حضور اکرم ﷺ اور سنت سے گہری عقیدت رکھتے تھے اس شکل سے نجات حاصل کرنے کے لئے شریعت، طریقت اور معرفت و حقیقت کا عقیدہ تراشا گیا۔ شریعتی اصطلاحات کے ”باطنی معنی“ تراشے گئے۔ مثلاً تعلق و محبت، ایمان کے مترادف قرار پایا۔ گویا جس مذہب کے لوگ بھی اس طریقت کے رستے پر گامزن اور عشق و محبت خدا کا دعوے کرتے ہیں۔ سب ”مومن“ ٹھہرے اسی طرح ”دین کے معنی“، تفرقہ کے مقام سے توحید کے مقام میں آنا۔ یہاں تفرقہ سے مراد کائنات کا ہر چیز کو الگ الگ سمجھنا ہے اور یہ سلوک کی پہلی منزل ہے اور توحید (وحدت الوجود) جو ان کی پانچویں منزل ہے اس مقام پر پہنچ کر آدمی دنیا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ”نماز کے معنی“، دل کا خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر یہ بزرگ اپنے آپ کو نماز وغیرہ کا مکلف قرار نہیں دیتے۔ ان کا دل، جو خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو گویا ہر وقت وہ نماز ہی ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ ”حج اور زکوٰۃ کے معنی برائیوں کو ترک کر کے نیکیوں کو اختیار کرنا اور کبر کے معنی مقام وصل ہے۔ (مرشد کمال رحمہ اللہ، مباحث اخلاقیہ، صنف صادق فرغانی، ص ۲۴۸)

گویا اللہ تعالیٰ کے احکام، اسلام کے ارکان اور شعارِ اللہ کا استہزار و استخفاف ان کا شعار ٹھہرا۔ یہ لوگ نماز، حج، زکوٰۃ کی تحقیر کرتے اور عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کے شیخ کی دعا اس سے افضل و اعلیٰ ہے اور یہ عقیدہ شیعوں کے علاوہ شیعوں میں بھی موجود ہے۔ ان کا ایک گیت ملاحظہ ہو :

نَعَا لَوْ اُخْرِجَ الْجَمِيعُ وَجَعَلَ فِيهِ حَمَارَهُ	اَدِّمِ لَوْ كَسْبُكَ كَوْنُكَ اِنْ كَرِهَ اِلَاسِ فِي شَرْبِ كِي دُكَانِ قَامِ كَرِهَ
فَتَكْبِيرُ الْمُنْبَدِ وَنَجْعَلُ مِنْهُ طَبَايَهُ	اِدِّمِ لَوْ كَسْبُكَ كَوْنُكَ اِنْ كَرِهَ اِلَاسِ فِي شَرْبِ كِي دُكَانِ قَامِ كَرِهَ
فَتُخْرِقُ الْمَصْحَفَ وَتَجْعَلُ مِنْهُ ذَمَارَهُ	اِدِّمِ لَوْ كَسْبُكَ كَوْنُكَ اِنْ كَرِهَ اِلَاسِ فِي شَرْبِ كِي دُكَانِ قَامِ كَرِهَ
وَتَنْتَفِعُ بِحَيَّةِ الْفَاضِلِ وَتَجْعَلُ مِنْهُ اَوْسَارَهُ	اِدِّمِ لَوْ كَسْبُكَ كَوْنُكَ اِنْ كَرِهَ اِلَاسِ فِي شَرْبِ كِي دُكَانِ قَامِ كَرِهَ

مرثیت، ص ۱۹۳ از ابوالحسن علی ندوی

حج بیت اللہ شریف

ان لوگوں کی تحقیر و تضحیک کا سب سے بڑا ہدف حج اور کعبہ ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ان کے آئمہ و شیوخ کی زیارت حج بیت اللہ سے افضل ہے یہی وجہ ہے کہ جو مناسک بیت اللہ شریف سے مخصوص ہیں مثلاً اس کے سامنے سجدہ ریز ہونا، اس کو چومنا۔۔۔۔۔ اس پر غلاف چڑھانا، غلاف پکڑ کر دُعا کرنا۔ اس گھر کا طواف کرنا اور سی وغیرہ، غرض یہ سب شائریہ لوگ اپنے بزرگوں کی قبروں پر بجالاتے ہیں۔ حج کی طرح سال میں ایک بار سالانہ عرس کا دن مقرر کر کے اس کو حج کے مثل یا اس سے بہتر قرار دیتے ہیں۔ یہ بزرگ کعبہ کے متعلق عجب عجیب خرافات بکھتے ہیں سب سے پہلے منصوٰ علاج نے یفوتے دیا کہ اگر کسی کا حج فوت ہو جائے، تو اپنے ہاں کعبہ بنا کر اس کا طواف کر سکتا ہے اور اس پر جتنی رقم خرچ ہو سکتی ہے، وہ صدقہ دے سکتا ہے۔ (مجموعۃ الرسائل البحرۃ، ام ابن تیمیہ، ۲ ج، ص ۹۷)

ابن عربی نے اپنا ایک واقعہ لکھا ہے کہ کعبہ اپنی بنیادوں سے اٹھ کر مجھ پر حملہ آور ہونا چاہتا تھا۔ اس جرم میں کہیں عارفین کے مقابلہ میں اس کی تحقیر کرتا ہوں۔ پھر میں نے اس کی تعریف شروع کی، تو اس کا غضب ٹھنڈا ہو گیا۔ (یہ واقعہ تفصیل سے ہم پہلے درج کر آئے ہیں) ابن عربی بھی یہ فتویٰ دیتا تھا کہ حج پر جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ البتہ اس حج پر جتنا خرچ متوقع ہو صدقہ کر دینا چاہیے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: **وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا** یعنی اللہ کا لوگوں پر یہ حق ہے کہ وہ اس کے گھر کا حج کریں، جو کوئی استطاعت رکھتا ہو۔ لیکن یہ بزرگ اس اللہ کے حق اور دکن سلام کو چنداں اہمیت نہیں دیتے۔ آپ نے ملاحظہ کیا ہو گا کہ بہت سے پیر لوگ حج کرنے نہیں جاتے۔ اس کی نہہ میں ہی فلسفہ کار فرما ہے کہ جس طرح کعبہ انوار الہی کا جاتے زول یا مہبط ہے۔ اسی طرح عارفین کا دل بھی انوار الہی کا مہبط یا جاتے زول ہے چنانچہ ان میں یہ مقولہ بھی بہت مشہور ہے :

دل بدست آور کہ حج اکبر است

اور اس کی اصل وجہ وہی ہے جو ان کے اکابر حلاج اور ابن عربی نے پیش کی ہے کہ ان عارفین کو کعبہ کا حج کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ کعبہ کو خود اگر ان عارفین کا طواف کرنا چاہئے۔ چنانچہ درج ذیل واقعہ خواجہ معین الدین چشتی سے منسوب ہے۔ آپ بایزید بسطامی کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں :

”پھر خواجہ بایزید نے اسی مقام پر فرمایا کہ ”میں مذکور خانہ کعبہ کا طواف کرتا رہا۔ جب مجھ کو قرب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گئی اس وقت خود خانہ کعبہ نے میرے گرد طواف کیا۔“ (ترجمہ دلیل العارفین، مفضولات معین الدین چشتی، مرتبہ سیدتیار علی)

خانہ کعبہ کا رابعہ بصریہ کے طواف کو جانا

مزید برآں کہ خانہ کعبہ خود بزرگوں کے گرد طواف کرنے کے لیے چلا جاتا ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی لکھتے ہیں کہ خواجہ عثمان ہارونی نے فرمایا کہ: ”حقی کہ ابراہیم بن ادم (چودہ برس کی مدت میں بلخ سے خانہ کعبہ تک پہنچے، تو اس مقام پر خانہ کعبہ کو نہ پایا۔ نہایت متحیر ہوئے۔ اس حال میں ہاتھ فیضی نے آواز دی کہ: ”اے ابراہیم! ٹھہرو اور صبر کرو۔ خانہ کعبہ ایک ضعیفہ کی زیارت کو گیا ہے۔ ابھی آیا جا رہا ہے۔“ خواجہ یہ آواز سن کر متحیر ہوئے اور عرض کیا کہ ”الہی! وہ ضعیفہ کون ہیں؟“ حکم ہوا کہ جنگل میں ایک ضعیفہ ہیں۔ خواجہ علیہ السلام روانہ ہوئے۔ تاکہ ضعیفہ کی زیارت سے مشرف ہوں۔ جب جنگل میں پہنچے تو حضرت اربعہ بصری کو دیکھا اور دیکھا کہ خانہ کعبہ ان کے گرد طواف کر رہا ہے۔“ (انیس الارواح، ص ۷۱، ملفوظات خواجہ عثمان ہارونی، مرتبہ: خواجہ معین الدین چشتی)

سوال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم بن ادم کا زمانہ دوسری صدی ہجری ہے جبکہ بے شمار مسلمان شب و روز خانہ کعبہ کے طواف میں مشغول رہتے تھے۔ اتنا اہم تاریخی واقعہ کسی نے کیوں ذکر نہ کیا۔ پھر حضرت اربعہ بصری پر ہی کیا موقوف ہے۔ دوسرے اس پایہ کے بزرگوں کے پاس بھی جانا ہوگا، تو اس طرح خانہ کعبہ کی غیر حاضری بہت پریشان کن بات ہے اور اس سے بھی حیرانگی کی بات یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر چودہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سمیت محو سے صرف چھ میل کے فاصلہ پر تھے اور طواف کعبہ کی غرض سے تشریف لائے جنہیں روک دیا گیا۔ کعبہ سے اس وقت تو یہ نہ ہو سکا کہ وہاں چلا جائے۔ کعبہ شیکان کا طواف کرنا چلا تو جاتا۔ تاکہ صحابہ ہی اس کا طواف کر لیتے۔ کیا ان میں سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سمیت کوئی بھی ان بزرگوں کے پائے کا نہ تھا۔ پھر ابراہیم بن ادم بھی بڑے پائے کے بزرگ ہیں۔ معلوم نہیں انہیں کشف کے ذریعہ یہ کیوں نہ علم ہو سکا کہ کعبہ تو وہاں موجود ہی نہ ہوگا لہذا سیدہ رابعہ بصری کے پاس ہی چلے جاتے۔

پھر خانہ کعبہ کا ایسا طواف صرف اربعہ بصریہ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں اور بھی کئی ایسے اولیاء اللہ ہیں جن کے گرد خانہ کعبہ خود وہاں پہنچ کر طواف کرتا رہا ہے۔ مثلاً درج ذیل واقعات ملاحظہ ہوں:

خانہ کعبہ کا معین الدین چشتی کے گرد طواف کرنا

آپ فرمایا کرتے تھے کہ حاجی لوگ قالب اوجھ سے خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں لیکن عارف لوگ دل سے عرش و حجاز کے گرد گھومتے ہیں اور تقار الہی چاہتے ہیں۔ آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ایک مدت تک خانہ کعبہ کا طواف کیا لیکن اب خانہ خدا خود میرا طواف کرتا ہے۔ (سیر الاولیاء، ص ۵۲)

خانہ کعبہ کا خواجہ مودود چشتی (م ۵۲۷) کے ہاں جانا | ارمنقول ہے کہ جب خواجہ مودود چشتی کو خانہ کعبہ کی زیارت کا اشتیاق

غالب ہوتا تو فرشتے خانہ کعبہ کو خدا کے حکم سے خواجہ کے سامنے لا رکھتے۔ خواجہ نہایت فوق و شوق سے طواف کرتے۔ جب آپ طواف و نماز سے فراغت پالیتے تو فرشتے خانہ کعبہ کو اٹھالے جاتے۔ (سیرالایام) | اب حج کے متعلق بشیر حافی کے خیالات ملاحظہ فرمائیے۔ یہ بالکل ابن عربی کے بشیر حافی کا نظریہ حج خیالات یا فتوے سے ملتے جلتے ہیں :

”نقل ہے کہ ایک شخص نے کہا: ”میرے پاس ہزار درہم ہیں، میں چاہتا ہوں کہ حج کو جاؤں۔“ آپ نے فرمایا: ”تو حج کو نہیں جانا، سیر و تفریح کو جاتا ہے۔ اگر حج سے خدا کی رضا مندی چاہتا ہے، تو یہ درہم کسی آزرہ دل حاجت مند کو دے یا کسی عیالدار شکستہ دل کو دے تاکہ اس کا دل خوش ہو اور فکر عیال سے آرام پائے یا کسی قرضدار کا قرض ادا کرے تاکہ وہ غم قرض سے خلاصی حاصل کرے۔ اس کے علاوہ بہت سے مسکین، یتیم اور بیوا ہیں تیرے ان درہموں کے حاجت مند ہیں۔ ان کی خبر گیری اور بھلائی میں صرف کر۔ کیونکہ تیرے اس ایک حج سے ہزار گنا بڑھ کر اس کا درجہ ہوگا۔“ (مغربان حق، ص ۸۰)

دیکھئے فریضہ حج کی کس خوبصورت انداز میں نفی کی جا رہی ہے اگر یہی انداز فکر تہلماجی کبھی حج پر نہیں جا سکتا، کیونکہ حاجت مند تو ہر وقت دنیا میں موجود رہتے ہیں۔ یہ ہے اس ”اللہ کے لوگوں پر حق“ کی توہین جس کے متعلق حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر استطاعت کے باوجود کسی نے حج نہیں کیا، تو اللہ کو اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرنے یا نصرانی ہو کر۔

عبداللہ بن مبارکؓ کا نظریہ حج | نقل ہے کہ آپ ایک سال حج کو گئے۔ ادائے حج کے بعد تنھوڑی دیر سو گئے۔ خواب میں دیکھا کہ دو فرشتے اترے۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا: اس سال کتنے لوگوں نے حج کیا؟ دوسرے نے جواب دیا: چھ لاکھ آدمی حج میں آئے پہلے تو کسی کا بھی حج قبول نہ ہوا، لیکن پھر حق تعالیٰ نے علی بن موفی نام کفش دوز کے طفیل جو دمشق میں رہتا ہے اور خود حج میں شامل نہیں ہو سکا، سب کا حج قبول کیا ہے۔

”آپ تحقیق کے لئے دمشق روانہ ہوئے اور علی بن موفی کو مل کر صوٹ حال دریافت کی، تو اس نے کہا: ”تیس سال سے حج کی آرزو کرتا رہا ہوں اور جوتوں کو پیوند لگا کر زلوازاہ جمع کرتا رہا۔ اس سال میں سودرہم ملے وافر کی صحت کی ذمہ داری بڑھ گئی۔“

ہو گئے تو میں حج کے لئے تیار ہوا۔ میری بیوی عاظمیٰ۔ ایک اہل اس نے مجھے کہا: ”ہماریہ کے گھر سے سالن کی خوشبو آرہی ہے۔ تھوڑا سا ہانگ لاؤ۔“ میں ہمسائے کے گھر گیا، تو اس نے کہا: ”بھائی! دینے میں تو کچھ حذر نہیں، لیکن نہ مانگو تو اچھا ہے۔“ میں نے وجہ پوچھی، تو اس نے کہا: ”کئی دنوں سے بچے بھوکے مر رہے تھے۔ آج جھل میں جاکر مردار کا گوشت لایا ہوں اور وہی پکایا ہے۔“ یہ سن کر میرے دل میں اک آگ سی لگی۔ اسی وقت گھر گیا۔ وہ تین سو دہم اس کو فے دیئے اور کہا یہ لو اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرو، میں اسی کوچ بھول گا۔ بس میرا یہ عمل ہوا۔“ آپ نے فرمایا: ”تو نے سچ کہا۔“ (مترجم حق، ص ۱۹۶)

ملاحظہ فرمائیے! کہ چھ لاکھ آدمیوں کے ہتھکے ہوئے حج صرف اس کفش دور کے اس نیک عمل کی وجہ سے قبول ہو رہے ہیں جن میں عبداللہ بن مبارک کا اپنا حج بھی شامل ہے۔ جذبہ رحم و ہمدردی کے پردہ میں کس طرح فریضہ حج سے انکار اور اس کی توہین کی جا رہی ہے۔ چھ لاکھ حج اور ان کی مقبولیت اور ثواب کو اس موچی کے صدقہ سے کمتر قرار دیا جا رہا ہے۔ کیا لا جواب افسانہ گھڑا ہے کسی ولی اللہ نے۔

لیکن بات حج بیت اللہ کی توہین تک محدود نہیں۔ اس کے آگے یوں چلتی ہے کہ مزارات کی زیارت کی اہمیت، بیت اللہ کی زیارت سے بہت زیادہ ہے اور وہ سب اعمال و افعال، جو وہاں جاکر کئے جاتے ہیں ان مزاروں اور مقبروں پر بجالانے کی بھی فضیلت اس سے کسی صوت کم نہیں جس کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔ اب دیکھئے ”عارف“ لوگوں کو نماز میں کعبہ کی طرف منہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

عارفوں کی نماز

سلطان الشائخ نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں:

”شیخ جلال الدین تبریزی بدایوں آئے اور قاضی شہر کے مکان پر ملے گئے۔ خادموں نے کہا نماز میں مشغول ہیں۔ شیخ نے قسم کے ساتھ فرمایا: ”قاضی صاحب نماز پڑھنا جانتے بھی ہیں؟“ دو سکر دن قاضی صاحب شیخ کو ملنے آئے اور کہا: ”یہ آپ نے کیسے کہہ دیا تھا کہ قاضی صاحب نماز پڑھنا جانتے بھی ہیں؟“ شیخ نے کہا: ”عالموں کی نماز دوسری ہوتی ہے اور فقیروں کی دوسری۔“ قاضی صاحب بولے: ”کیا فقیر کوئی اور قرآن پڑھتے ہیں؟ یا کو سجدہ کسی نئے طریقہ پر کرتے ہیں؟“ شیخ نے فرمایا: ”عالموں کی نماز بس اسی قدر ہے کہ کعبہ کی طرف نظریں کریں یا اگر دور ہیں، تو چہت کعبہ کو۔ لیکن درویشوں کی نمازوں میں نہیں ہوتی وہ جب تک عرش الہی پر نظر نہیں جمالتے نماز شروع نہیں کرتے۔“ (تصوف اسلام، ص ۱۲۰ جلد المجد دیبادی، بحوالہ فوائد القواد، ص ۱۳۴ ۱۳۵)

دیکھا آپ نے تبریزی صاحب نے کیا دو لوک فیصلہ فرما دیا کہ عارفین شریعت اسلامیہ کے احکام کے قوانین کے پابند نہیں ہوتے۔ ان کا مذہب مجذگانہ ہے اور یہی کچھ ہم سمجھتے ہیں۔

اشرف علی تھانویؒ کا اعترافِ حقیقت اور مساعی

تو یہ ہیں وہ شرعی بنیادیں جن کے ذریعے طریقت کو شریعت کا ہموایا تابع قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن ان کوششوں کے باوجود بھی طریقت ہمیشہ علمائے دین کی نظروں میں کھٹکتی ہی رہی ہے۔ چنانچہ تجدیدِ تصوف و سلوک کے مصنف اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید خاص عبدالباری سابق استاد فلسفہ و دینیات اس منہایت کا اظہار ان الفاظ میں کر رہے ہیں :

”پھر یہی اہل دنیا ہی نہیں بلکہ ان سے بڑھ کر اکابرین دین تک کو تصوف کے غیر دین یا طریقت کے خلاف شریعت ہونے اور اس کی بدولت اس سے انکار و توختل کا بہت بڑا مشاہدہ ہوتا ہے کہ حضراتِ صوفیائے بہت سے حقائق و معارف، افکار و اشغال، مجاہدات و مراقبات، اسوال و کیفیات، توجہ و تصرفات، کشف و کرامات، ترک لذت و تعلقات، بیعت و نسبت اور رسوم و عبادات وغیرہ کی خاص خاص صورتوں کا ان حضرات کو کتابِ سنت کی عام و مخصوص تعلیمات میں بظاہر نام و نشان نہیں ملتا اور منالطریقہ ہو گیا ہے کہ تصوف و طریقت کی اصل و حقیقت یہی ”بدعات“ ہیں۔“ (تجدیدِ تصوف و سلوک، ص ۲۵)

چنانچہ اشرف علی تھانویؒ نے تصوف و سلوک کو شریعت سے ہم نوا بنانے اور اس کی تجدید کرنے کی ہم کا آغاز کیا۔ آپ کے فیض یافتہ عبدالباری صاحب موصوف لکھتے ہیں :

”اسلامی تصوف کی خود صوفیاء و محققین کے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ وہ نام ہے عین اسلام و شریعت کا۔ حتیٰ کہ ہمارے صوفیاء اپنے سب سے بڑے صوفی حضرات صحابہ، بکرم رسول اللہ ﷺ کو قرار دیتے ہیں۔ اور یہی خلاصہ ہے اس باب میں حضرت مجدد علیہ الرحمۃ (مولانا اشرف علی تھانوی) کی تجدید کا۔۔۔ جیسا کہ اوپر پوری طرح معلوم ہو چکا۔“

یعنی دینِ طریقت اور شریعت میں مطابقت کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ صحابہ کو بھی "صوفی" ثابت کیا جائے اور حضور اکرم ﷺ کو صوفی اکبر۔ چنانچہ یہ مرحلہ بھی سہ کر لیا گیا اور حضرت حسن بصری کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت ثابت کر کے حضور اکرم ﷺ تک شجرہ طریقت ملا دیا گیا۔ اس ہم کے لئے جو دوسرا اہم کام کیا گیا اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

”اتنا ہی نہیں۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے تو قرآن و حدیث سے تصوف کے تقریباً دو ہزار مسئلے صاف صاف دلالت سے ثابت کر دیئے ہیں (الافاضات الیومیہ، حصہ ہفتم، ص ۱۰۰) اور فرمایا اگر غور کرتا تو اتنے ہی اور ثابت کر دیتا۔“ (تجدید تصوف و سلوک، ص ۱۲۰)

غور فرمائیے کہ ایسے مسائل جن کے متعلق وہ خود اعتراف کر رہے ہیں کہ بظاہر ان کا کتاب و سنت میں نشان نہیں ملتا۔ پھر وہ خود ہی دو ہزار مسائل قرآن و حدیث سے صاف صاف دلالت سے ثابت کر رہے ہیں، تو یہ دلالت کس قدر صاف صاف ہوگی اور اس کے لئے حضرت مجدد علیہ الرحمۃ کو کس قدر کھینچنا پڑا کی پڑی ہوگی۔ کیا اس سے یہ بہتر نہیں تھا کہ صرف ایک دو ہی نصوص ہوتیں، جو اس قدر قطعی ہوتیں کہ ان میں کھینچنا تانی کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوق کے رکن مولانا احمد سید اکبر آبادی اپنے ماہنامہ ”برہان“ دہلی میں تھانویؒ کے متعلق لکھتے ہیں:

”اپنے معاملات میں تاویل و توجہ اور اغماض و مسامحت کی مولانا میں جو خوبی تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی مرید نے مولانا کو کچھ رات خواہش میں میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ سرچند کلمہ شہیدِ صبح صبح ادا کرنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن ہر بار یہ ہوتا ہے کہ لا الہ الا اللہ کے بعد اشرف علی رسول اللہ منہ سے نکل جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس کا صاف اور سیدھا جواب یہ تھا کہ یہ کلمہ کفر ہے شیطان کا فریب اور نفس کا دھوکہ ہے تم فوراً توبہ استغفار کرو، لیکن مولانا تھانوی صاحب صرف یہ کہہ کر بات اُنی گئی کر دیتے ہیں کہ ”تم کو مجھ سے غایت محبت ہے یہ سب کچھ اسی کا نتیجہ و ثمرہ ہے۔“ (برہان، فروری ۱۹۵۲ء، ص ۱۰۷)

سو یہ ہے ان کو ششوں کا خلاصہ اور مختلف ہدایہ جن کے ذریعہ شریعت اور طریقت کو متحد کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے مگر ہمارے خیال میں یہ مشرق و مغرب کو اکٹھا کرنے والی بات ہے۔ تا آنکہ موجودہ تصوف سے باطل

نظریات کو کمیۃ خارج نہ کر دیا جائے اور ان باطل نظریات کی بھرپور تردید نہ کی جائے اور بدنام اکابر صوفیہ سے بدنامی کا داغ دھونے اور ان کے نظریات کو صحیح ثابت کرنے کی روش کو ترک نہ کیا جائے۔

شریعت اور طریقت میں موافقت کی کوشش

تصوف کی اصلاح و تطہیر کے سلسلہ میں تجدید تصوف و سلوک کے مصنف عبدالباری صاحب اور ان کے مرشد حکیم الامت اشرف علی تھانوی نے کئی پہلوؤں سے قابلِ قدر کوشش بھی فرمائی ہے اور ان سے ہمیں مکمل اتفاق ہے۔ لہذا اس عنوان کے تحت ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھیں گے۔ صرف ان حضرات کے اقتباسات بمعہ حوالہ جات پیش کریں گے۔ کیونکہ یہ اقتباس ہمارے خیالات کی پوری ترجمانی کرتے ہیں۔

۱۔ ذکر کیا ہے؟ حصن حصین میں ہے بدل کحل مطیع اللہ فہوذاکر۔ اس لئے ذکر کے معنی یاد تو سب طریقہ سے ہوتی ہے، نہ کہ محض زبان ہی سے نام لے لے کیا یہ یاد ہے کہ جس کی یاد کا دعوے ہو نہ اس سے بات کرے، نہ اس کے خط کا جواب دے، نہ اس سے ملے نہ اس کا کہنا مانے۔ یہ ہرگز یاد نہیں، تو جو ذکر بدل اصلاح کے ہو، وہ ایسی ہی یاد ہے۔ (تجدید تصوف سلوک، ص ۵۰)

بحوالہ افاضات الیومیہ، ص ۱۹۵، حصہ ۷

۲۔ مجاہدہ نفس کے مطالبات و قوم کے ہیں حقوق اور مخلوط۔ حقوق وہ جن سے قوام بدن اور بقائے حیات ہے اور مخلوط وہ، جو ان سے زائد ہوں۔ پس مجاہدہ کا خلاصہ یہ ہے

کہ حقوق باقی رکھے اور مخلوط کو فانی کرے۔ (تجدید، ص ۵۱)

۱۰۔ افسوس! ستیا ناس کر دیا تصوف کا ان جاہل صوفیوں نے اور فقیروں کو ہاؤ دھو بنا رکھا ہے۔ کہتے ہیں چٹے کپنبو۔ بیوی کو طلاق دے دو۔ اولاد کو حاق کر دو۔ دروازہ کو تیفہ کر دو اور ایک چٹا روز کھاؤ۔ بدوں اس کے اصل فقیروں نے نہیں مٹی۔ میں کہتا ہوں اللہ دوشالوں میں۔ گدے میگوں میں، سلطنت میں، مرغن غذاؤں میں، فقیروں میں ہے، مگر گھر میں نہیں، شیخ کامل کی خدمت میں۔ (اشرف السوانح، حصہ ۲، ص ۱۶۱)

۲۔ زہد کی حقیقت بہت کم کھانا بھی زہد نہیں نہ یہ مقصود ہے کہ ہمارے کم کھانے سے نفوذ با اللہ خدا تعالیٰ کے خزانہ میں توفیر تھوڑا ہی ہو جائے گی۔ ہاں اتنا بھی نہ کھائے کہ پیٹ میں درد ہو جائے۔ ہمارے حاجی (انداد اللہ، اشرف علی کے پیر) کا مذاق تو یہ تھا کہ نفس کو خوب آرام

سے رکھے لیکن اس سے کام بھی خوب لے۔“ (تجدید، ص ۵۷)

”اس لئے صحت کی بہت حفاظت کرے۔ دماغ اور قلب کی تفریح و تقویت غذا و دوا کرتا ہے۔ غذا میں اتنی کمی کرے کہ ضعف و یسوست ہو جائے۔ نہ اس قدر افراط کہ مہضم میں فطور ہو جائے۔ جب تک صادق رغبت نہ ہو۔ کھانا نہ کھائے اور ایک آدھ لقمہ کی کسر باقی رہنے پر چھوڑ دے..... اسی طرح سونے میں اعتدال رکھے۔ نہ بہت زیادہ سوتے کر کسل ہو۔ نہ بہت کمی کرے کہ یسوست ہو جائے۔“ (تجدید، ص ۶۱)

۴۔ استغراق (سکر) ”لوگ استغراق کو بڑی چیز سمجھتے ہیں کہ جب تک ہم بے عقل و مدہوش نہ ہونے تو کمال ہی کیا ہے۔ صاحبو! اللہ تعالیٰ کا نام ہوش بٹھانے کے لئے لیا

جاتا ہے نہ کھولنے کے لئے..... خواجہ عبید اللہ احرار فرماتے ہیں کہ استغراق میں قرب نہیں بڑھتا۔ کیونکہ اس میں عقل نہیں ہوتا، جو مدارِ قرب ہے۔“ (تجدید، ص ۶۲)

”حقیقت میں، جو ذی استعداد کامل ہیں، ان پر نفسیاتی کیفیات (تاثر و انفعال یا سکر) طاری نہیں ہوتیں ہاں روحانی جن کا اثر روح پر ہوتا ہے، اکالین پر طاری ہوتی ہیں جن کا عوام کو نہ بھی نہیں اور ان دونوں میں فرق جیسے گڑ اور فرنی کی شرنبی میں ہوتا ہے..... تو واقعی جو سالکین متمنی کیفیات کے ہیں وہ دیہاتی گڑ خوار ہیں“ (تجدید، ص ۶۷)

۵۔ کشف و کرامات کی حقیقت ”فرمایا لوگ کشف کو بڑا کمال سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس کو قرب میں کچھ دخل نہیں..... بعضوں کو کشف سے فطرتاً بہت

نہیں ہوتی۔ لاکھ ریاضت و مجاہدہ کریں، عمر بھر کشف نہیں ہوتا۔ اصل چیز تو عبودیت ہے۔ واللہ اگر کسی کو لاکھ کشف ہوں اور پھر وہ اپنے وجدان کی طرف رجوع کرے، تو محسوس کرے گا کہ ذرہ برابر ترقی نہیں ہوئی۔ بخلاف اس کے اگر وہ دو چار مرتبہ سبحان اللہ سبحان اللہ پڑھ کر اپنے وجدان کو دیکھے تو صاف محسوس ہوگا کہ کچھ نہ کچھ اللہ تعالیٰ کے ساتھ قرب بڑھ گیا۔“

”غرض کشف کوئی بڑا کمال نہیں۔ اگر کافر بھی مجاہدہ و ریاضت کرے تو اس کو ہونے لگتا ہے مجنون (دیوانے) کو بھی کشف ہوتا ہے۔ صاحب شرح اسباب نے لکھا ہے کہ مجنون کو کشف ہوتا ہے۔ میں نے خود دیکھا کہ ایک مجنون کو اس قدر کشف ہوتا تھا کہ بزرگوں کو بھی نہ ہوتا تھا، لیکن اس کا مہسل ہوا تو مادہ کے ساتھ کشف بھی نکل گیا۔“

”خوارق کا ہونا ولایت سے گئے ضروری نہیں۔ بعض صحابہ سے عمر بھر ایک خرق عادت بھی واقع نہیں ہوا۔ خوارق اکثر جوگیوں سے واقع ہوتے ہیں۔ یہ ثمرہ ریاضت کا ہے۔ خرق عادت کا مرتبہ ذکر قلبی سے بھی کم ہے صاحب عوارف نے غیر اہل خوارق کو اہل خوارق سے افضل لکھا ہے۔ عارفین کی بڑی کرامت یہ ہے کہ شریعت پر مستقیم ہوں اور بڑا کشف یہ ہے کہ طالبانِ حق کی استعداد معلوم کر کے اس کے موافق ان کی تربیت کریں“ (تعلیم الدین، ص ۱۰۸، بحوالہ تجدید، ص ۹۰)

”بعض صاف گو محضرات کا فیصلہ ہے کہ الحکامات حیض الرجال، یعنی جیسے عورت حیض سے شرماتی ہے اور اس کو چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ اسی طرح اہل اللہ اپنی کرامتوں سے شرماتے ہیں۔ بہت سے اہل کرامت بزرگوں نے تنہا کی کہ کاش! ہم سے کرامت کا صدور نہ ہوتا۔ وجہ یہ کہ انہوں نے بقدر اپنی کرامت کے درجات آخرت میں کمی محسوس کی۔“ (تجدید، ص ۹۱، بحوالہ الریق فی سوار الطریق، ص ۳۱)

”پس کرامت وہ کھلا ہے گی جب ایسے فعل کا صدور متبع کامل المقول سے ہو۔ اب ہمارے زمانہ میں جس شخص سے کوئی عجب فعل سرزد ہو جاتا ہے اس کو غوثِ قطب قرار دے دیتے ہیں۔ خواہ اس کے عقائد و اعمال کیسے ہی ہوں۔ بزرگوں نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر کسی کو ہوا میں اڑتا ہوا دیکھو یا پانی پر چلتا، مگر شریعت کا پابند نہ ہو، تو اس کو بالکل بیچ سمجھو۔“ (تجدید، ص ۹۲)

۶۔ توجہ و تصرف کی حقیقت

”توجہ و تصرف بھی نہ کوئی مقصود و ناموا امر ہے۔ نہ فی نفسہ کوئی کمال و قرب اور ولایت و مقبولیت کی علامت۔ بلکہ نفس و خیال کی ایک قوت ہے۔ جو خیال و توجہ میں کیونئی کی مشق سے مقبول کیا مردود سے مردود شخص بھی حاصل کر سکتا ہے۔ پرانے زمانے میں سحر یا جادوگری اور اُجکل کے مسمریزم اور عملِ تنویم (ہینا ٹزم) کا بڑا مدار یہی ہے۔ اسی نفس یا باطن کی قوت سے کسی پر کوئی اثر ڈالنے کا نام صوفیوں کی اصطلاح میں توجہ و تصرف یا جہمت ہے۔..... لیکن یہ قوت کوئی دینی کمال نہیں۔ نہ مقبول و مقرب ہونے کی علامت ہے۔ ہر فاسق و فاجر بھی مشق سے اپنے اندر یہ قوت پیدا کر سکتا ہے۔“ (تجدید، ص ۹۲، ۹۳، بحوالہ بلاد القواعد، ص ۳۲۲)

”نیز اس (توجہ و تصرف) کے استعمال میں بعض دینی و دنیوی مضمرات بھی ہیں خصوصاً اس زمانہ میں حضرت معبد کا مشورہ اس کے ترک ہی کا ہے۔

دنیوی مضرت تو اس میں یہ ہے کہ اس کے استعمال کی کثرت سے عامل کے دماغی و قلبی قویٰ ضعیف و

مضعل ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے بہت سے امراض پیدا ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ دینی مضرت یہ ہے کہ دام اس کو ولایت و بزرگی کی علامت سمجھتے ہیں جو اعتمادی ضرر ہے اور مریدوں کا ضرر یہ ہے کہ اکثر اسی پر قناعت کر بیٹھتے ہیں اور اصلاح کا اہتمام چھوڑ دیتے ہیں، جو عملی ضرر ہے۔ ان ہی مضرتوں کی وجہ سے محققین نے اس کا استعمال چھوڑ دیا ہے۔ سلف کے زمانہ میں یہ مضرتیں قوی کی مضبوطی، فطرت کی سلامتی اور خوش فہمی کے سبب موجود نہ تھیں۔ (حوالہ: ایضاً)

"اس کے علاوہ جو لوگ محض شیخ کی توجہ یا تصرف پر قناعت کر لیتے ہیں، تو اس تصرف سے جو کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ نہ تو ان کا کچھ نفع ہوتا ہے اور نہ ان کو بقا نصیب ہوتا ہے۔ اصلی نفع و بقا اپنی ہی محنت کی چیزوں میں ہے۔" (تجدید، ص ۹۴)

"چنانچہ بزرگی کا معیار لوگوں نے یہ بھی تراش رکھا ہے کہ جو شخص آنکھیں چار ہوتے ہی مدہوش کر دے اٹھا کر زمین پر پٹک دے، وہ بڑا بزرگ ہے۔ حالانکہ یہ بالکل لغو ہے۔ اگر یہ بزرگی ہے تو حضور اکرم ﷺ کو تو حضور اس کو برتنا چاہیے تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ جب کفار نے آپ کو قتل کرنا چاہا، تو آپ اس کے فتنہ پر کر یہ لوگ غافل ہو جائیں، تو میں نکل جاؤں۔ کہو نہ آپ نے ایک ہی نگاہ میں سب کو مدہوش کر دیا۔" (تجدید، ص ۵۲)

۱۔ بعضے مرید صاحب کشف و کرامت بننا چاہتے ہیں، تو اس کا خود شیخ میں ہونا ضرور نہیں، تو مرید اس کی کیا ہوس کرے۔

۷۔ بیعت کی اغراض

۲۔ بعضے سمجھتے ہیں کہ ہر شخص کے ذمہ دار ہو جائیں گے۔ حالانکہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ تک کو فرمادیا تھا:

يَا فَاطِمَةُ اَنْقِذِي نَفْسَكَ مِنَ النَّارِ فاطمہؓ! اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ تو بھلا اور کون پیر کی مرید کو بچا سکتا ہے۔

۳۔ بعضے چاہتے ہیں کہ پیر صاحب ایک ہی نظریں کامل کر دیں گے۔ اگر اس طرح کام بن جاتا، تو صحابہؓ کو بھی کچھ نہ کرنا پڑتا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کون کامل النظر ہوگا۔ کہیں بطور خرق عادت

ایسا بھی گیا، تو خوارق میں دوام و لزوم نہیں اور اس بھروسہ پر رہنا بڑی غلطی ہے۔

۴۔ بعضے چاہتے ہیں کہ خوب جوش و خروش، شورش و متی پیدا ہو۔ نگاہ آپ سے آپ چھوٹ جائیں، خواہش

ہی مٹ جائے۔ ایک کاموں میں ارادہ ہی نہ کرنا پڑے۔ بس ایک محویت کا عالم رہا کرے۔ یہ خیال پہلے خیالوں سے پاکیزہ سمجھا جاتا ہے، لیکن مثلاً اس کا بھی ناواقف ہی ہے۔ یہ اموں بھلا کیفیات و احوال کے ہیں، جو اختیار سے خارج ہیں اور اگر چہ محمود ہوں مقصود نہیں بلکہ ایسی خواہشوں میں نفس کا ایک نخی کید ہوتا ہے کہ وہ طالب ہے راحت و لذت و شہرت کا اور ان کیفیات میں یہ سب امور حاصل ہیں۔۔۔۔ پھر ایسا شخص دو قسم کی خرابیوں میں مبتلا ہوتا ہے۔ اگر کیفیات حاصل ہو گئیں، تو اپنے کو صاحبِ کمال سمجھنے لگتا ہے یا کم از کم طاعات کو حقیر سمجھنے لگتا ہے اور اگر حاصل نہ ہوئیں، تو ان کے غم میں مر لے لگتا ہے اور جو غیر اختیاری امور کا طالب ہوگا ہمیشہ مبتلا غم و پریشانی رہے گا۔“

۵ ”بعض سمجھتے ہیں کہ پیر صاحب کے عبادت بڑے مجرب ہیں، بوقت ضرورت ان سے تعویذ گنڈے لے لیا کریں گے یا پیر صاحب بڑے مقبول الدعوات ہیں۔ معالط و مقدمات میں ان سے دعا کریں گے۔ سب کام ہو جایا کریں گے۔ گویا ساری خدائی پیر صاحب کے قبضہ میں ہے۔ یا خود ہم ایسی ہی چیز سمجھ لیں گے۔ بلکہ ایسے لوگ تمام تر بزرگی کا میار انہی عبادت اور ان کے آثار کو سمجھتے ہیں، جو محض دنیا کی طلب ہے اس لئے فاسد و رفاہ ہے۔“

۶ ”بعض یہ سمجھتے ہیں کہ ذکر و شغل کرنے سے کچھ انوار نظر آیا کریں گے یا کچھ آوازیں سنائی دیں گی۔ اول تو ذکر و شغل پر نہ ان آثار کا مرتب ہونا ضروری ہے اور نہ ذکر و شغل سے یہ مقصود ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ انوار و اصوات وغیرہ بعض اوقات خود اس کے دماغ کا تصرف ہوتا ہے۔ عالم غیب کی اشاریں سے نہیں ہوتی (محض اس کا تخیل اور وہم ہوتا ہے) تیسرے بالفرض اسی عالم کی چیزیں منکشف ہو گئیں، تو فائدہ کیا۔ کسی عالم کے منکشف ہو جانے سے قُرب نہیں بڑھتا۔ قُرب کے لئے تو اطاعت بنائی گئی ہے۔ بعض اوقات شیاطین کو طابحہ نظر آنے لگتے ہیں مگر وہ شیطان کے شیطان ہی ہتے ہیں۔ پھر مرنے کے بعد تو مومن کا فرسب ہی کو اس عالم کے بہت سے حقائق منکشف ہو جائیں گے۔ تو کیا اس سے قُرب مقصود سب کو حاصل ہو جائے گا۔“ (تجذیب ص ۱۰۴ تا ۱۰۷۔ بحوالہ: قصہ اسبیل)

اس معاملہ میں فریقین نے افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ ایک فریق اس کو سرے سے بدعت قرار دیتا ہے۔ دوسرا اسے لازم سمجھتا ہے۔

۸ بیعت کی ضرورت

بیعت سے اصل مقصد رضائے حق کو سمجھنا اور اس پر کاربند رہنا ہے۔ بیعت و راصل پیر اور مرید کے درمیان

ایک معاہدہ ہوتا ہے کہ پیرائے احکام شرعیہ کے بجالانے اور ذکر کی مداومت کی تاکید کرے اور مرید اس کا نیتنا زیادہ خیال رکھے۔ مجدد علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں :

”شیخ اسی کی تعلیم کرتا ہے اور مرید کاربند ہوتا ہے۔ اگرچہ کوئی کیفیت معلوم نہ ہو۔ نہ اس کے زعم کے مطابق کوئی کمال حاصل ہو۔ تب بھی آخرت میں اس کا ثمرہ، جو کہ رضا ہے ظاہر ہوگا اور اس رضا سے دخول جنت و لقائے حق اور دوزخ سے نجات میسر ہوگی۔ شیخ کی طرف سے اس کی تلقین کا وعدہ اور مرید کی طرف سے اس کے اتباع کا عہد ہی حقیقت ہے پیری، مریدی کی اور گویہ تعلیم اور اس پر عمل بدول بیت کے بھی ممکن ہے لیکن بیت میں طبعیہ خاصہ ہے کہ شیخ کو توجہ زیادہ ہو جاتی ہے اور مرید کو فرائز داری کا پاس زیادہ ہو جاتا ہے۔ مگر لوگوں نے یوں سمجھ رکھا ہے کہ جو بھید ہیں فقیری کے، وہ جمانچہ ہیں پریم کے۔ وہ مریدوں کو ہی بتائے جاتے ہیں۔ مرید کرتے ہی پیر بس پریم کے دوا نچھرتا دے گا اور ہم اللہ والے ہو جائیں گے۔ میاں خدا و رسول کا نام لو اور احکام بجالاؤ۔ بس یہی نچھرتے ہیں۔ اصلاح نفس کے طریقے پیر سے پوچھو۔ یہی بھید ہیں۔ اگر کوئی کہے کیا باطنی طریقہ بس یہی ہے، تو ہم باوازدہل کہیں گے کہ ہاں یہی ہے اور اس طریق میں کمی کبھی بڑے بڑے حالات پیش آئیں گے۔ بڑی بڑی کیفیات بھی طاری ہوں گی مگر یہ مقصود نہیں۔“ (نہ ضروری ہے)

(تجدید، ص ۱۰۹، سراج : اشرف السوانح، ص ۲۵۰، ۱۶۱)

”بیت کی اصلی بڑی ضرورت یہی خافت یا پیر کی صحبت و تعلق ہے تاکہ راستہ کے خطرات یا الٹھوکوں سے حفاظت ہو..... اور ہمارے لئے تو صحبت کی حاجت کی سب سے بڑی دلیل صحابیت ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کی فضیلت بھی اعلیٰ سے اعلیٰ محدثین و فقہاء پر تسلیم ہے..... اور اس فضیلت کا مدار رسول اللہ کی صحبت پر ہے۔“ (تجدید، ص ۱۱۱، ۱۱۲)

”تقوے پر ایک معظ میں اللہ کی محبت پیدا اور قائم رہنے کے سلسلے میں فرماتے ہیں :

”اس محبت کے قائم رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کیجئے۔ زیادہ نہ ہو تو کم از کم ہفتہ میں ایک بار یا مہینہ میں ایک بار۔ اس میں خاصیت یہ ہے کہ اس کے اندر جو چیز ہے، وہ شدہ شدہ آپ کے اندر بھی آوے گی۔“ (تجدید، ص ۱۱۷)

”البتہ حق تعالیٰ کی محبت میں شانِ عقلیت غالب ہوتی ہے اور اپنے ہم جنس کی محبت میں شانِ طبیعت (عشق) غالب ہوتی ہے اور دوسری نظر میں

۹۔ محبت اور عشق

محبت عقلی، محبت طبعی کے سامنے مضاعف معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ امر بالمعسوس ہے۔ چنانچہ اسی محبوب طبعی سے نمود باللہ حق تبار کی شان کے خلاف کوئی معاملہ قولی یا فعلی صادر ہو تو وہی محبوب فوراً مغضوب ہو جائے۔“ (تہذیب، ص ۱۳۳، بحوالہ: اشرف السوانح، ج ۲، ص ۱۷۷)

یہ اور ایسی ہی اور بھی کچھ مفید باتیں ہیں، جن سے موجود اشرف علی تھانوی کی مساعی جمیدہ پر تبصرہ

تصوف کی کسی حد تک اصلاح ہو سکتی ہے۔ لیکن

یہ تمام باتیں صرف ایک پہلو سے تعلق رکھتی ہیں یعنی ”پیر پرستی“ کے سلسلہ میں اصلاح ہو سکتی ہے۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ آپنے بیت کے عنوان میں جن اغراض کی نشاندہی فرمائی ہے۔ یہی باتیں تو عوام کے لئے باعث کشش ہوتی ہیں۔ اگر باتیں ختم ہو جائیں، تو کتنے لوگ ایسے رہ جائیں گے جو خصوص کے ساتھ اور محض اتباع سنت کی غرض سے کسی بزرگ کے در دولت پر بیت کے لئے حاضر ہوں گے؟

اور اس سے بھی بڑا محاذ قبروں کا وجود ہے۔ جہاں سب اکابر صوفیاء جگہ کشی کرتے چلے آئے ہیں۔ حالانکہ حضور اکرم ﷺ نے قبروں کے پختہ بنانے ہی سے سختی سے منع فرمایا۔ کیونکہ اکثر شرکیہ افعال کی جڑ تو ہی قبروں اور مزارات کا وجود ہے۔ اس سلسلہ میں تھانوی صاحب اور ان کے شاگرد رشید خاموش نظر آتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جاہل عوام کو زندہ پیروں سے اتنی دل بستگی نہیں ہوتی، جتنی قبروں سے ہوتی ہے۔ قبروں پر جا کر لوگ چلے کاٹتے، نذریں نیازیں چڑھاتے، طواف کرتے، مرادیں مانگتے، سجدے کرتے اور سالانہ حج بھی ادا کرتے ہیں۔ کیا یہ بات قابل اصلاح نہیں۔ کیا یہ بانی بزرگ صوفیاء سے تعلق نہیں رکھتیں یا یہ اتباع سنت میں نہیں آتیں؟

پھر اس سے بھی بڑا محاذ نظریات کا محاذ ہے۔ جہاں اگر سب کی زبانیں لنگ ہی نہیں ہوتیں بلکہ اکثر یا تو ان اکابر صوفیاء کے ہمنوا بن جاتے ہیں۔ بعض دوسرے ایسے مشرکانہ عقائد کو اپنی سمجھ سے بالاتر قرار دے کر اپنا پہلو بچا جاتے ہیں۔ کچھ دوسرے تاویلات کے ذریعہ ان کے نظریات کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا ان اکابر کی خلاف شرع باتوں کے مقابلہ کے ان کی موافق شرع کی باتیں پیش کر کے ان کی تزیہ کرنے لگتے ہیں۔ قرآن نے تو اپنی حقانیت کی سب سے بڑی دلیل ہی یہ پیش کی ہے کہ اس میں آپ تضاہ نہیں پائیں گے، تو پھر جس کے کلام میں صریح تضاد پایا جاتا ہو، اسے حق کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ نظریاتی پہلو ہی دراصل سب سے خطرناک پہلو ہے، جس نے بے دین اور مجرم قسم کے پیرو فقیر پیدا کئے، جن سے

کرامتیں وقوع پذیر ہوئیں۔ اور ہمارے خیال کے مطابق صوفیاء اس محاذ پر سب سے زیادہ بدنام ہوئے ہیں، تو کیا یہ پہلو اصلاح یا تطہیر کے قابل نہیں؟

پھر ایک وہ محاذ بھی ہے جہاں سے اکابر صوفیاء یوں بولتے ہیں ”حدثنی قلبی عن ربی“ تو بھلا ایسے بلند مقام پر فائز حضرات احادیث کی کیا پرواہ کرتے ہیں۔ جس چیز کو چاہا حلال اور مباح قرار دے لیا۔ دعویٰ تو وہ اتباع سنت کا کرتے ہیں۔ کیا اسی کا نام اتباع سنت ہے؟ بالآخر تمبیہ ہی نکلتا ہے کہ ۷

پنبہ کجا کجا ہم تن ہمہ داغ داغ شد

سید خورشید احمد گیلانی اور روح تصوف

جب میں اس کتاب کا مسودہ مکمل کر چکا، تو جناب سید خورشید احمد گیلانی صاحب کی کتاب ”روح تصوف“ پر نظر پڑی، جس پر آپ نے موجودہ تصوف پر اعتراضات دُور کرنے اور اسے خوبصورت انداز میں پیش کرنے کی کوشش فرمائی ہے اور آپ نے مشورہ دیا ہے کہ اصلی تصوف کو جاننے کے لئے اہمات کُتب تصوف کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ پھر آپ نے چند مشہور اہمات کُتب سے تعارف بھی کرایا ہے اور ان کے بعض مندرجات بھی پیش فرمائے ہیں اور اس بات پر زور دیا ہے کہ تصوف کے اصل مسائل اور موضوعات اللہ کا ذکر، تقویٰ، توبہ، صبر، توکل، رجا، فقر، محاسبہ، تزکیہ نفس، نجیئت، امانت، اخلاص، سادگی، قناعت، دنیا سے نفرت اور اللہ تعالیٰ کے لئے خیف ہونا ہی تو ہیں۔ بتلایئے! ان موضوعات میں سے کس چیز کی بنیاد شریعت اسلامیہ میں موجود نہیں۔ پھر انہی مسائل پر مختلف اہمات کُتب کے تراجم سے اقتباسات بھی پیش کئے گئے ہیں۔

ہم آپ کے اس جذبہ کی قدر ضرور کرتے ہیں، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ آپ نے اس طرح سے تصوف کی تطہیر میں جانبداری سے کام لیا ہے۔ جس کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ آپ لکھتے ہیں ابو النصر سراج (م ۷۴۷ھ) نے اپنی کتاب ”اللمع“ میں اتحاد و حلول جیسے باطل نظریات کی

ترویج و تفلیط فرمائی ہے۔ (ص ۸۱)

اب سوال یہ ہے کہ اس صوفیاء کے طبقہ نے ابو النصر کی اس بات کو تسلیم کیا ہے؟ اگر یہ حضرات خود ہی تسلیم نہ کریں، تو دوسرے کیسے کر سکتے ہیں اور جناب خورشید احمد صاحب جانبداری یہ کی ہے کہ جن اہمات کُتب میں یہ نظریات بالوضاحت مذکور ہیں ان کو اہمات کُتب کی فہرست سے ہی خارج کر دیا ہے۔ مثلاً:

۱۔ حسین بن منصور حلاج (م ۷۳۰ھ) کی کتاب ”الطواسین“ و حارث محاسبی (م ۷۴۳ھ) کے رسالہ ”الوعایۃ“

کے بعد دوسری کتاب تصوف۔

۲ ام غزالی دم ۵۰۵ھ کی کتاب "المقصد من الفضل"

۳ شیخ ابوجری الدین ابن عربی دم ۳۸۰ھ کی کُتب فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم۔

۴ عبد الکریم جیلی کی کتاب "الانسان الکامل"

۵ مولانا جلال الدین رومی دم ۶۷۳ھ کی کتاب مثنوی مولانا روم

۶ شیخ فرید الدین عطار دم ۷۰۰ھ کی کتاب منطق الطیر، وغیرہ وغیرہ بے شمار کُتب ہیں، جو اہمات کُتب میں شمار ہوتی ہیں، لیکن ان کا ذکر آپ اس لئے چھوڑ گئے کہ ان کُتب میں اس نظریہ کو بنیاد کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور یہی نظریہ دراصل دین طریقت یا تصوف کی جان ہے، جو شرعی نقطہ نگاہ سے مردود اور باطل ہے اور اسلام سے ہزار ہا سال پہلے کی پیداوار ہے۔

۲۔ پھر اس حقیقت کا اعتراف پیش لفظ لکھنے والے حبیب سید محمد فدوق القادی صاحب نے بھی ان الفاظ میں کیا ہے، "ہمیں داراشکوہ کی اس بات سے اتفاق ہے کہ تصوف اسلام سے بہت پہلے انسانی فکر میں اچکا تھا۔ اور اُنہندوں میں اس کی مستند تصدیقات ملتی ہیں لیکن اے اس تصوف سے کیا واسطہ ہے جس کے داعی اپنے تمام معتقدات و معمولات کی بنیاد صرف قرآن کو ٹھہراتے ہیں۔"

اب دیکھئے! جس داراشکوہ کے حوالہ سے آپ نے بات چلائی ہے۔ اسی داراشکوہ کے مرشد ملا بخشی کا یہ شعر کیا قرآن کے مطابق ہے؟ ۷

پنجہ دینچہ خدا دارم من چہ پروائے مصطفیٰ دارم
لیکن بایں ہمہ اس اسلامی تصوف کے طبقہ میں داراشکوہ بھی ایک معزز رکن ہیں اور اس کے استاد ملا بخشی بھی۔

۲ ائمہ اُہندوں میں تصوف کی مستند تصدیقات کو اسلامی تصوف سے کوئی واسطہ نہیں تو کیا وجہ ہے کہ ان اہمات کُتب کے مصنفین عوام کو شرعاً سے لے آج تک یہ یقین دلاتے چلے آ رہے ہیں کہ طریقت بھی شریعت ہی سے مانوڑ ہے لیکن ان کی یقین دہانیوں کے باوجود بھی عوام کو یقین نہیں آتا۔ بات واضح ہے کہ کچھ صوفیاء تو تصوف کو کتاب سنت سے آزاد رکھنا چاہتے ہیں اور جو کتاب سنت کا نام لیتے ہیں ان میں سے بھی اکثر کے اعمال شریعت کے مطابق نہیں ہوتے۔

۴۔ پھر جن اہمات کتب کاغور شیدہ صاحب نے ذکر فرمایا ہے ان کے مندرجات میں سے متنازعہ مسائل کو سمجھنا چھوڑ گئے ہیں۔ ہم نے اس کتاب میں آپ کی پسندیدہ مکتب میں سے اکثر کتب کے حوالوں سے ہی یہ وضاحت پیش کی ہے کہ طریقت اور شریعت آپس میں متصادم ہیں۔

گویا آپ نے یہ کیا ہے کہ تصوف کے جو پہلو مسخ یا گوارا تھے انہیں تو خوب صحت بنا کر پیش کر دیا ہے لیکن جتنے پہلو قابل اعتراض تھے ان پر پردہ پوشی کی گئی ہے۔ ایسے انداز کو تحقیقی نہیں کہا جاسکتا۔ علاوہ ازیں جو باتیں اس کتاب میں جواب طلب یا بحث طلب تھیں، وہ چونکہ پہلے ہی زیر بحث آچکی ہیں، لہذا مزید کچھ لکھنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی گئی۔

اب ہم شریعت اور طریقت کا ایک تقابلی خاکہ پیش کرتے ہیں تاکہ ایک نظر میں معلوم ہو جائے کہ ان دونوں کا تصادم کون کون سے مقام پر ہوتا ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ طریقت اور شریعت میں مکمل سمجھوتہ قابل عمل ہے بھی یا نہیں؟

شریعت و طریقت کا تقابلی جائزہ

۱۔ طریقت کی توجہ یہ ہے کہ جملہ موجودات خدا کا حصہ ہیں۔ پھر کوئی انسان اپنی ذات کو خدا میں مدغم بھی کر سکتا ہے اور کسی انسان میں خدا خود بھی حلول کر سکتا، جس کی وجہ سے اس میں خدائی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ ۲۔ نبوت سے نبی کی ولایت افضل ہے بالفاظ دیگر نبی سے ولی افضل ہوتا ہے۔ اسی طرح خاتم الانبیاء سے خاتم الاولیاء افضل ہوتا ہے۔ ۳۔ دیدار الہی ممکن ہی نہیں ضروری ہے اور اسی بنیاد پر ان بدین کا دار و مدار ہے۔ مشاہدات اور مکاشفات ہی اس دین کے سرچشمے اور بنیاد ہیں۔ ۴۔ وحی الہی کی ابتداء ریاضت و مجاہدہ ہے اور یہ	۱۔ توجہ : اسلام میں توجہ یہ ہے کہ ساری کائنات اللہ کی مخلوق اور اس کی مطیع فرمان ہے۔ حاکمیت اور فرمانروائی بھی اسی کی ہے جس میں دوسرے کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ ۲۔ رسالت : نبی اور رسول اپنے وقت کے تمام انسانوں میں سے افضل ہوتا ہے۔ ۳۔ مشاہدہ الہی : اس دنیا میں ناممکن ہے نہ ظاہری آنکھوں سے نہ دل کی آنکھوں سے اور اگر کوئی ایسا محسوس کرتا ہے تو وہ شیطانی فریب ہے۔ ۴۔ وحی الہی : اکتسابی نہیں بلکہ وہی چیز ہے اور

نبی کو وحی آنے سے بیشتر خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ نبی بننے والا ہے۔

۵۔ معیارِ حق : وحی الہی ہے یعنی قرآن و سنت سے شرعی احکام مستنبط ہوتے ہیں اور یہی چیزیں تحقیق اور جانچ کا معیار ہیں۔

۶۔ نبی یا رسول کی غیر مشروط اطاعت لازم ہے۔

۷۔ نبی کے صحیح جانشین علماء ہوتے ہیں اور علماء زاہد دل اور عبادت گزاروں سے بہت افضل ہیں۔

۸۔ روحانی ترقی کا راستہ دنیا کے اندر سے ہو کر جاتا ہے اور اسلام معاشرتی زندگی گزارنے پر زور دیتا ہے۔

۹۔ زُہد : حصولِ دنیا اور طلالِ کھائی کرنا بہت نیک عمل ہے البتہ حُبِ دنیا ناپسندیدہ چیز ہے اسی چیز کا نام زُہد ہے۔

۱۰۔ نکاح : معاشرتی زندگی اصل بنیاد اور فطری چیز ہے، لہذا ضروری ہے۔ وہ ایک عہد و پیمان ہے نکاح کے علاوہ دوسرے راستے حرام ہیں۔

۱۱۔ جہاد : قومی زندگی کی حیات کے لئے جہاد بالسیف افضل الاعمال قرار دیتا ہے۔

کبھی چیز ہے۔ انسان کو وحی کی توقع ہوتی ہے اور یہ ایک تدبیرِ الہی ہے۔

۵۔ اصل معیارِ مشاہدہ و مکاشفہ ہے کیونکہ یہ علم قرشتہ سے واسطہ کے بغیر براہِ راست خدا سے حاصل ہوتا ہے۔

۶۔ نبی کے بجائے اپنے پیر کی غیر مشروط اطاعت لازم قرار دی گئی ہے۔

۷۔ نبی کے اصل جانشین زاہد اور عابد (صوفیاء) ہیں اور یہ علماء سے افضل ہیں اور مقررینِ حق یہی لوگ ہیں۔

۸۔ روحانی ترقی دنیا کو ترک کرنے سے ہی ہو سکتی ہے، لہذا صوفیاء اپنا راستہ دنیا سے باہر رکھ کر تلاش کرتے ہیں۔

۹۔ حصولِ دنیا اور اس کے متغیاع ترقی کے راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے اس میں زُہد کا نقصِ اسلامی زُہد سے بالکل مختلف ہے۔

۱۰۔ نکاح اور عاقلی زندگی سے سخت بیزار ہے۔ بعض استعمادی ہر عورت سے زنا کو جائز سمجھتے ہیں اور جماع کو مشاہدہ حق کا بہترین موقع قرار دیتے ہیں۔ بعض دوسرے بزرگ تفسن طبع کے لئے بھی نکاح کرنے ہیں۔

۱۱۔ جہاد بالسیف کو کمتر سمجھتا اور اس کے بجائے مجاہدہ نفس پر زور دیتا ہے اور روحانی ترقی کی آڑ میں انسانیت کو ذلیل ترین مقام پر لاکھڑا کرتا ہے۔

۱۲۔ تقدیر: انسان اپنے اعمال میں نہ تو مختارِ مطلق ہے نہ مجبورِ محض۔ البتہ ہر عملِ شیت الہی کے تابع ہوتا ہے۔

۱۳۔ معاشی اور سیاسی نظام کے لئے مکمل ہدایت دینا اور کلمہ حق کے استیلاء کے لئے سلطنت کے حصول پر زور دینا ہے۔

۱۴۔ جزا و سزا: اسلام، اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہوئے اور اس کے انعامات کی امید رکھتے ہوئے اس کی عبادت کو ایک مستحسن فعل قرار دیتا ہے۔ اخروی زندگی میں نجات کا انحصار اعمال پر ہے۔ بُرے ہوں گے، نو دوزخ ٹھکانہ ہوگا اور اچھے ہوں گے، نو بہشت۔ رضائے الہی اور دیدارِ الہی صرف اہل جنت کو حاصل ہوگا۔

۱۵۔ اتباعِ رسول اور محبت کے تقاضے: اسلام دینی اور دنیوی ترقی کے لئے اتباعِ رسول کو بنیاد اور اسی کو اللہ اپنی اتباع قرار دیتا ہے۔ اللہ سے اُمید اس کے رسول سے محبت ایمان کا بنیادی تقاضا ہے پھر رسول کے اہل بیت سے محبت بھی رسول کی محبت کا تقاضا قرار دیتا ہے، لیکن اس محبت کا مقصد محض اتباعِ رسول میں عزم ہے نہ کہ عقائد، اصول و اقدار شرعیہ

۱۲۔ نظریہ وحدت الوجود کے مطابق انسان اعمال میں مجبورِ محض ہے۔ اس کی حیثیت محض ایک آلہ کار کی ہے، جو مشیتِ الہی کے ہاتھوں کھلونا بنا ہوا ہے۔

۱۳۔ ظاہری حکومت کو بیکار سمجھنا اور اس کے بجائے باطنی نظام پر زور دینا ہے، غوث، قطب، ابدال، افتاد، نجیب وغیرہ کے مناصب مقرر کرنا ہے اور ان کے نصب و عزل کا نظام جاری کرنا ہے۔

۱۴۔ صوفیا۔ اس نظریہ عبادت کی توہین کرتے اور اس کو "سودا گری" قرار دیتے ہیں۔ وہ اعمال میں انسان کو مجبور سمجھتے اور جنت اور دوزخ کو بے معنی چیزیں قرار دیتے ہیں۔ ان کے ہاں میاں و رضاء الہی ہے۔ رضا الہی کی خاطر وہ دوزخ میں بھی بخوشی جانے کو تیار ہیں۔ وہ اسے ایک آہِ سرد سے ٹھنڈا کر کے بیکار بنا سکتے ہیں اور جنت کو بچھونک مار کر دوزخ بنا سکتے ہیں۔

۱۵۔ یہاں مقصود صرف روحانی ترقی اور معرفت حق اور اس کی بنیاد عشق ہے، جو اللہ کے سوا ہر چیز کو جلا دیتا ہے اور انسان کو بے نیاز کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ گروہ سخت ذہنی انتشار میں مبتلا ہو کر رہ گیا ہے۔ ایک فرقہ رسول کی اتباع کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا دوسرا اتباعِ رسول کے بجائے عشقِ رسول میں اتنا غلو کر گیا کہ حضور اکرم ﷺ کو یونانی فلسفہ کے مطابق عقلِ کل قرار دیتا ہے اور انہیں ازل سے

کی قربانی۔

۱۳۔ مزارات کا وجود۔ اسلام انسان کے مرنے کے بعد روح کے اس دنیا میں آنے کی سخت مخالفت کرتا ہے۔ فلہذا سماع موتی، رُوحوں سے سوال و جواب، ان رُوحوں کا تصرف سب کو باطل قرار دیتا ہے اور اگر ایسی چیزوں کا ظہور ہو تو اسے شیطانی عمل قرار دیتا ہے۔ لہذا اسلام میں پختہ قبروں کے جواز کے سبب چور و کوائسے بند کر دیئے گئے ہیں، جو کہ ایسے شرک و افعال کا اصل منبع ہیں۔

۱۴۔ اعتکاف: اسلام نے روحانی ترقی اور خالص توجہ الی اللہ کے لئے مساجد میں اعتکاف کرنے کی راہ دکھلائی ہے۔

۱۵۔ حج: اسلام نے حج بیت اللہ کو فرض اور اسلام کا رکن قرار دیا کیا ہے اور مناسک حج کو شمار کے نام سے موسوم کیا ہے۔

لے کر اب تک ماضی تاظر، عالم الغیب اور تصرف کائنات پر قادر سمجھتا ہے۔ ایک تیسرا فرقہ حُب اہل بیت میں شیعوں سے بھی آگے نکل گیا ہے۔ اور ان کے دلائل محض اپنے مشاہدات یا بزرگوں کے ملفوظات ہیں۔

۱۶۔ صوفیاء کے نزدیک رُوحوں کا واپس دینا میں آنا، سماع موتی، ان سے سوال و جواب اور تصرفات ان کے شاہوں کے مطابق سب برحق ہیں۔ لہذا اس مذہب کے لئے پختہ قبریں، مقبرے، روضے، مزار، خانقاہیں بنیادی ضرورت کی چیزیں ہیں۔

۱۷۔ صوفیاء مساجد میں اعتکاف کے بجائے مزارات پر مراقبہ کرنے کو اصل نیکی سمجھتے ہیں۔

۱۸۔ اہل طریقت کے نزدیک اتنی ہی رقم سے غریبوں کی امداد کر دینا زیادہ مستحسن عمل ہے۔ بیت اللہ کا درجہ عارف سے کمتر ہے۔ فلہذا بیت اللہ خود عارف لوگوں کے گرد طواف کرتا ہے۔ بیت اللہ کی زیارت سے کسی بزرگ کے مقبرہ کی زیارت افضل ہے اور وہاں مناسک حج کی ادائیگی زیادہ کارِ ثواب ہے سالانہ عرس حج کا بل یا اس سے افضل سمجھے جاتے ہیں

۱۹۔ صوفیاء کی کرامات لامحدود ہیں۔ وہ ازل سے اب تک کے حالات کی خبر لاتے اور تصرف فی الانوار میں کافی دسترس رکھتے ہیں زبانی اقرار کے باوجود اتباع رسول کو بے معنی اور اپنی کرامات کو دعوے

۱۹۔ کرامات: اولیاء اللہ سے کرامات کا ظہور برحق ہے۔ اولیاء اللہ وہ ہیں، جو اتباع رسول کا مکمل نمونہ ہیں۔ کرامت کا مقصد کسی اہم دینی یا دنیوی غرض کو پورا کرنا ہے۔ ولی کو اس کے ظہور سے

پہلے سے علم نہیں ہوتا۔ زندہ اس کے صدور کا
دعوے کر سکتا ہے اور یہ بھی شاذ و نادر ہی وقوع
پذیر ہوتی ہے۔

۲۰. علم غیب کئی اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے وہ اپنے
رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے اور جتنا
چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

۲۱. وفات کے بعد تمام انبیاء و اولیاء کی زندگی
برزخی ہے جس کو ہم سمجھ نہیں سکتے۔

۲۲. تصرف فی الامور کا رتبہ صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ باقی
سب اس کی مخلوق، اس کی محتاج اور اس کے
آگے بے بس ہے اور اسی کے رحم و کرم پر ہے۔

۲۳۔ قیامت کے دن شفاعت صرف وہی کر سکے گا
جس کی اپنی مغفرت ہو چکی ہو اور پھر اُسے اللہ
کی طرف سے اس کی اجازت بھی مل جائے۔

۲۴۔ حاضر و ناظر صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ وہی
ہر ایک کی پکار سناتا اور اسے قبول کرتا ہے اس
کے بغیر کسی دوسرے کو پکارنا صریح شرک قرار دیا
جاتا ہے۔

سے پیش کرتے اور اپنی بزرگی کی دھاک بٹلاتے
ہیں اور یہ سب کسب کتاب سے حاصل کیا جاتا
ہے۔

۲۰. علم غیب رسول اللہ ﷺ کو کئی حال تھا۔ فرق
صرف یہ ہے کہ خدا کا علم ذاتی ہے اور رسول کا عطائی
پھر یہ عطائی علم غیب اکثر اوقات اولیاء اللہ کو بھی ہوتا
ہے اور بعض کو تو کئی ہوتا ہے۔

۲۱. رسول اکرم ﷺ اور تمام انبیاء و اولیاء زندہ
ہیں وہ مرنے نہیں بلکہ صرف مام دنیا والوں سے روپوش ہو جاتے ہیں
اولیاء دنیا کی حاجت برائی میں مشغول رہتے ہیں۔

۲۲. انبیاء، اولیاء سب کو تصرف فی الامور کا رتبہ حاصل
ہے اور یہ اولیاء لوح محفوظ میں اللہ کے لکھے جوئے
فیصلوں تک کی تبدیلی بھی کروا سکتے ہیں۔

۲۳۔ اولیاء اللہ دعوے سے مریدوں کی شفاعت اور
مغفرت دونوں کا ذمہ اٹھاتے ہیں۔ حتیٰ کہ قبر میں
مکمل نیکمر کے سوال کے وقت بھی اپنے بے دین
مریدوں تک کو حکماً بخشوا سکتے ہیں۔

۲۴۔ تمام انبیاء و اولیاء ہر وقت حاضر و ناظر ہوتے ہیں
پہلے کے وقت مرید کی جائے مصیبت پر پہنچ کر
اس کی مشکل کشائی بھی کر دیتے ہیں۔ خواہ یہ پیر صاب
زندہ ہوں یا مردہ۔

۱۔ پیغمبر بھی جب تم کا قصہ دہکتا ہے۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور اولیاء ہر لمحہ حاضر و ناظر ہیں۔ اور اس کا دوسرا
حصہ یہ ہے کہ مرید کے پکارنے پر وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حاضر و ناظر تو وہ پہلے ہی ہیں یہ کون کہاں سے جانتے
ہیں۔ اگر حاضر و ناظر ہیں، تو پہنچنے والی بات غلط اور لغو ہے۔ اور پہنچنے والی بات ٹھیک ہے، تو حاضر و ناظر والی بات لغو اور باطل ہے۔

مشائخ عظام سے چند سوالات

اس کتاب میں دو باتوں کی وضاحت کی گئی ہے :

- ۱۔ دین طریقت بذاتِ خود ایک الگ دین ہے جس کے اپنے مخصوص عقائد و نظریات ہیں۔
- ۲۔ جو شخص یہ دین اختیار کرتا ہے، تو اس پر اسی کا ذمہ غالب آجاتا ہے اور اس کے پہلے دین (مثلاً اسلام، عیسائیت یا ہندومت وغیرہ) کی حیثیت ثانوی بن کر رہ جاتی ہے۔ اگرچہ وہ زبانی اس کی تردید بھی کرتا رہے۔

- اب ہمارے صوفیاء کو اصرار ہے کہ طریقت شریعت ہی سے ماخوذ ہے۔ شریعت سے الگ کوئی چیز نہیں۔ اگر ان کا یہ دعوے صحیح ہے تو کیا براہِ کرم درج ذیل سوالات کا جواب دینے کی تکلیف فرمائیں گے۔
- ۱۔ کیا وحدت الوجود کا عقیدہ یا حلول و شہود کے عقائد کی از روئے شرع گنجائش ہے؟ اگر ہے تو دلائل سے مطلع فرمائیں۔ ورنہ یہ بتلائیں کہ ایسے عقائد کے حامل صوفیاء کی حمایت کیوں کی جاتی ہے؟
 - ۲۔ کیا اسلام میں پختہ قبریں بنانے، ان پر سرفرازیں عمارت تعمیر کرنے، ان پر چراغ جلانے، روشنیاں کرنے جھاڑو دینے، خلاف چل دھالے، اعسکاف بیٹھنے، طواف کرنے کا جواز ہے؟
 - ۳۔ قبروں پر چڑھ کٹی کرنے، حبس دم، ہمیشہ روزہ رکھنے، پوری رات قیام کرنے اور ہمیشہ قیام کرنے، نفس کو اذیتیں پہنچا کر مضمل کرنے، نکاح نہ کرنے کو بہتر سمجھنے اور ترکِ علاحی کی از روئے شرع گنجائش ہے؟

- ۴۔ کیا عینی وحی رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی تھی خصوصاً جس کا تعلق دین سے تھا۔ وہ آپ نے سب کی سب اُمت کو پہنچا دی تھی یا اس میں سے کچھ باطنی حصہ عوام کو نہیں بتلایا گیا؟ زیادہ واضح الفاظ میں کیا دین کا کچھ حصہ اسرار و رموز کی صورت میں حضرت علیؓ کو دیا گیا تھا، جو اس طبقہ کے پیشوا تسلیم کئے گئے ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو اس کی دلیل درکار ہے، اگر نفی میں ہو تو تصوف میں باطنی علوم کے ماخذ کیا ہیں؟ اور صوفیاء جو اپنے ہم زبہ لوگوں سے خلوت میں اسرار و رموز کی باتیں کرتے ہیں، وہ دین کی باتیں ہوتی ہیں یا کچھ اور؟ اور اگر دین کی باتیں ہوتی ہیں، تو انہیں عوام سے چھپایا کیوں

جانتا ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”بَقُوا عَمِّيْ وَكُلُوْا اَيَّهٖ“ یعنی کسی کے پاس دین کی صرف ایک بات بھی ہو تو اسے لوگوں تک پہنچانا چاہیے۔

۵۔ کیا تصور شیخ کی از روئے شرع گنجائش ہے؟

۶۔ کیا اخروی نجات کے لئے سلوک کی منازل طے کرنا ضروری ہے؟ اگر جواب نفی میں ہو تو کیا اس کا ترک بہتر نہیں جبکہ اس کے مصاحب سے اس کے مفاسد بہت زیادہ ہیں، خصوصاً ایسے ادوار میں جبکہ تحریکِ باطنیت اس تصوف پر بری طرح محیط ہو چکی ہے۔

۷۔ کیا کشف کا علم یقینی ہے۔ اگر جواب نفی میں ہے تو جن صوفیاء نے شریعت کے بہانے اپنے کشف پر زیادہ اعتماد کیا ہے۔ ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

۸۔ جس رہبانیت کو اسلام نے ناپسند فرمایا تھا اس رہبانیت اور موجودہ تصوف میں ماہ الامتبیاز فرق کیا ہے؟

۹۔ محض صلح و وجہ اور حال کی کوئی مثال دو صحابہ میں ملتی ہے اگر یہ چیزیں کچھ فضیلت رکھتی ہیں تو صحابہ کا دور ان سے کیوں خالی ہے؟ اور اگر مذموم ہیں تو ان کو اختیار کرنے کے مصاحب کیا ہیں؟

۱۰۔ کیا وجہ ہے کہ تین چار لاکھ صحابہ سے، جو پوری ایک صدی پر پھیلا ہوا ہے، تو دس بارہ سے زیادہ کرامات وقوع پذیر نہیں ہوئیں۔ لیکن صوفیاء کے ایک ایک بزرگ سے بیسیوں بلکہ سینکڑوں کرامات وقوع پذیر ہونا تذکرہ سے ثابت ہوتا ہے۔ اور بسا اوقات یہ کرامات اتنی رفیع الشان ہوتی ہیں کہ ان کے مقابلہ میں انبیاء کے معجزات بیچ نظر آنے لگتے ہیں؟ کیا یہ اسنادِ راجح تو نہیں ہوتا؟

۱۱۔ ایسی قبور یا مزارات جہاں کسی انسان کے بجائے مردہ حیوان کی ہڈیاں دفن کی جاتی ہیں یا وہ بھی نہیں ہوتیں۔ ایسے مزارات سے لوگوں کی حاجت وائی کی کیا وجہ ہیں؟

۱۲۔ اہل طریقت نے جو باطنی نظام مقرر کر کے غوث، قطب، ابدال، اوتار وغیرہ کے مناصب کی تعیین کر رکھی ہے اور ایک بڑا ولی، چھوٹے ولی کی پل بھر میں ولایت ختم کر دیتا ہے اور کسی نئے شخص کو

ان واحد میں ولایت عطا کر دیتا ہے۔ ان باتوں کا عہد نبویؐ میں کہیں سراغ ملتا ہے؟

۱۳۔ کیا وجہ ہے کہ علمائے تصوف، آغاز تصوف سے ہی علمائے شریعت کو یہ یقین دہانی کراتے چلے

آئے ہیں کہ طرہیت یا تصوف شریعت ہی سے مانوڑ ہے اور شریعت کے اتباع کے بغیر چارہ نہیں مگر علمائے شریعت نے کسی دور میں بھی ان کی اس بات کا اعتبار نہیں کیا۔ اور ہمیشہ گرفت کرتے چلے آئے ہیں؛

۱۴۔ جن ”اولیاء اللہ کے متعلق تذکرہ نگاروں کی یہ شہادت موجود ہے کہ وہ خلاف شریعت کام کیا کرتے تھے۔ ان کو عزت و محترم کا معنی کیوں سمجھا جاتا ہے؛ ان کو قدس سرہ کیوں لکھا جاتا ہے؛ اور انہیں اولیاء اللہ کی فہرست سے خارج کیوں نہیں کیا جاتا؛

۱۵۔ کیا ایسے صوفی جو لاندہب تھے ان کو مسلمان کہنا یا اولیاء اللہ سمجھنا درست ہے؛

محترم قارئین! آپ نے ساری کتاب کا بغور مطالعہ کیا۔ محترم والد صاحب نے یہاں مشائخ عظام سے 15 سوالات کئے ہیں۔ ان کے جوابات آج تک نہ ہی کسی رسالے کی معرفت اور نہ بالمشافہ ہمیں موصول ہوئے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب فضولیات آج بھی اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر ہو رہی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں رسول اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔ ایک آدمی نے دوران گفتگو عرض کیا کہ ”جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں“ آپ ﷺ نے سن کر فرمایا ”کیا تو نے مجھے اللہ کا شریک بنا دیا ہے؟“ (مسند احمد) ایک آدمی نے آپ ﷺ سے بارش کی دعا کرنا چاہی اور عرض کیا کہ ”ہم اللہ تعالیٰ کو آپ ﷺ کے ہاں سفارشی بناتے ہیں۔“ آپ ﷺ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور فرمایا ”افسوس تجھے معلوم نہیں۔ اللہ کی شان کتنی بلند ہے اسے کسی کے حضور سفارشی نہیں بنایا جاسکتا۔“ (ابوداؤد) آپ ﷺ نے حیات طیبہ کے آخری ایام میں مرض الموت میں جو خطبہ دیا وہ محتاج وضاحت نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ”یہود و نصاریٰ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو کہ انہوں نے اپنے انبیاء (علیہم السلام) کی قبروں کو مساجد بنا لیا۔“ (صحیح بخاری)

اس کے بعد یہ مزارات، عرس، اسلام کے نام پر دین خانقاہی اور صوفیاء کی خود ساختہ کرامات، چہ معنی دارد؟ ہماری کسی سے ضد بازی یا عناد نہیں ہے۔ اگر کوئی ایک آدمی بھی اس تحریر سے راہ ہدایت پا جائے تو یہ ہمارے لئے باعث سعادت ہے۔ ورنہ کتاب سے مالی منفعت حاصل کرنا نہ تو محترم والد صاحب کی سوچ تھی اور نہ ہی ہمارا شیوہ۔ اگر والد صاحب کی یہ تصنیف واقعی آپ کے دل کو اپیل کرتی ہے تو میری گزارش ہے کہ ان کے لئے دعائے مغفرت ضرور کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ہم سب پر بھی اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین۔

پروفیسر نجیب الرحمن کیلانی

جامع مسجد الایمان، شاہ فرید آباد، ملتان روڈ، لاہور۔ فون: 7844157

WWW.DEENEKHALIS.COM

کتابیات

۱ قرآن مجید ، تراجم و تفسیر حسب ضرورت۔	۲ متفرق کتب احادیث ، حسب ضرورت۔
۳ تعارف ، محمد بن ابراہیم کلابازی ، ترجمہ پیر محمد حسن ،	المعارف ، گنج بخش روڈ ، لاہور۔
۴ انسان کامل ، عبدالکبیر جمیلی ،	نفیس ایڈمی ، کراچی۔
۵ کشف المحجوب ، علی مجوبی ،	ملک دین محمد اینٹ سٹور ، لاہور۔
۶ الفقر والتصوف (عربی)	امام ابن تیمیہ
۷ الفکر الصوفی (عربی)	عبد الرحمن عبد الخالق
۸ فضائل صوفیہ	"
۹ غایۃ الامانی فی الرد علی النہانی	عماد شکر آلوسی (اردو ترجمہ زبر طبع)
۱۰ ذکر الہی و اہل الصیبت	امام ابن قیم
۱۱ البلاغ المبین (فارسی)	شاہ ولی اللہ
۱۲ دائرہ المعارف الاسلامیہ	پنجاب یونیورسٹی ، لاہور
۱۳ تصوف اسلام	عجلال جدی آبادی
۱۴ خلاصہ تصوف اسلام	آقا بیدار بخت
۱۵ روح تصوف	نور شید احمد گیلانی
۱۶ دلائل السلوک	مولانا احمد یار خان
۱۷ تزکیہ نفس	ابن حسن اصلاحی
۱۸ سوانح امام ابن تیمیہ	کرم علی ایم اے
۱۹ تاریخ مشائخ چشت	خلیق احمد نظامی
۲۰ " " "	شیخ الحدیث مولانا زکریا
۲۱ تاریخ دعوت و عزیمت	ابوالحسن علی ندوی
۲۲ مذہب و تجدید مذہب	پروفیسر عبد الباقی صدیقی
۲۳ توحید خالص	کیپٹن مسعود عثمانی
۲۴ احسان ربی	شبلی نعمانی
۲۵ تفسیر حق (اردو ترجمہ)	ام غزالی
المنقذ من الضلال	خالد حسن قادری (مترجم)
	محکمہ اوقاف ، پنجاب ، لاہور

- ۲۶ ترجمہ تصوف و سلوک عبد الباری، استاد فلسفہ و دنیا
- ۲۷ اسلامی نظریات میں غیر اسلامی {
نظریات کی آمیزش } پروفیسر یوسف سلیم چشتی
- ۲۸ سیر الاولیاء، محمد بن مبارک میر خورشید محمد غلام احمد بریلوی
- ۲۹ گلزار ابرار، محمد غوثی شطاری، ترجمہ فضل احمد
- ۳۰ اختلاف امت کا المیہ فیض عالم صدیقی
- ۳۱ حضرت محمد کا نظریہ توحید برہان احمد فاروقی
- ۳۲ حقیقت وحدت الوجود خواجہ عبد الحکیم انصاری
- ۳۳ نظریہ حلول احد اسلام فضل الرحمن کلیم
- ۳۴ ریاض السالکین عبدالغفور عرشى قادری
- ۳۵ خزینۃ الاصفیاء، غلام سرور مفتی، ترجمہ مفتی محمود عالم ہاشمی
- ۳۶ صوفیئے نقشبند سید امین الدین
- ۳۷ سیرت غوث الثقلین ضیاء اللہ قادری
- ۳۸ حدیقۃ الاولیاء غلام سرور مفتی
- ۳۹ مغربان حق (خلاصہ تذکرۃ الاولیاء)، حافظ احمد دین چشتی
- ۴۰ الاولیس (تذکرہ اولیس قرنی) ارشد اولی
- ۴۱ سرچشمہ حیات عبدالعزیز قادری
- ۴۲ تعین مرشد کامل {
اردو ترجمہ حقائق الاخیار } محمد صادق فرغانی
- ۴۳ معین الہند ڈاکٹر ظہیر الحسن ثناب
- ۴۴ نور مبین لے۔ جے چنار
- ۴۵ بریلویت (اردو) علامہ احسان الہی ظہیر
- ۴۶ تاریخ پاک ہند اساتواں ایشیائی پروفیسر عبدالقدوس ملک
- ۴۷ رضا خانی مذہب سعید احمد قادری
- ۴۸ تصوف کی حقیقت غلام احمد پرویز
- کتب خانہ الفرقان کھنؤ
- مرکز انجمن خدام القرآن، لاہور
- المکتب، گنج بخش وڈ، لاہور
- اسلامک بک فاؤنڈیشن، سن آباد، لاہور
- چٹان پرنٹنگ پریس، لاہور۔
- مقبول اکیڈمی، لاہور
- قاسم سنز، انارکلی، لاہور
- ادارہ دعوت سلفیہ مٹان
- ادارہ سہروردیہ اعظم ہارکیٹ، لاہور
- المعارف، گنج بخش وڈ، لاہور
- مقبول اکیڈمی، لاہور
- قادری کتب خانہ سیالکوٹ
- المعارف، گنج بخش وڈ، لاہور
- قرآن سوسائٹی، لاہور۔ ساہیوال
- اولیسیہ پبشرز، بلال گنج، لاہور
- جیلنگ سوسائٹی، قصور پورہ، لاہور
- محمد بشیر اینڈ سنز، اردو بازار لاہور
- المعارف، گنج بخش، لاہور
- اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے ہندوستانی
- ادارہ ترجمان السنۃ۔ لاہور
- قریشی برادرز۔ اردو بازار لاہور
- تنظیم اہل السنۃ والجماعۃ نوائی کوٹ لاہور۔
- ادارہ طلوع اسلام۔ لاہور



شریعت و طریقت

اس کتاب میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اسلام میں تصوف کا آغاز کب
 اور کیسے ہوا اور آج تک اس میں کیا کچھ آمیزشیں ہو چکی ہیں؟
 کیا طریقت کے عقائد و نظریات وحدت الوجود، وحدت الشہود اور حلول کا
 شریعت کے سیدھے سائے عقائد کے ساتھ سمجھوتہ ممکن ہے؟
 طریقت کا باطنی نظام کیا چیز ہے؟ اور کیا طریقت شریعت کے
 تابع ہے یا اس کے متوازی اور اس سے متضاد
 ایک الگ دین ہے؟

ڈسٹری بیوٹر



دارالسلام

پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز
 الریاض الحسین لاهور